تکمیل رسالت ونبوت
و
حیات خاتم النّبیّین

(تاریخ واستخراج)

ترجمہ وتحریر
لیفٹیننٹ کمانڈر (ر) محسن اختر پی این
ایم اے (فل)، ایل ایل بی

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ!

کتاب : تکمیل رسالت ونبوت وحیات خاتم النبیین (تاریخ واستخراج)
Oracle of the Last and Final Message

مصنف ومترجم : لیفٹیننٹ کمانڈر (ر) محسن اختر پی این
ایم اے (فل)، ایل ایل بی

ناشر : اسلامک ریسرچ اکیڈمی۔کراچی
(ادارہ معارف اسلامی کراچی)

تقسیم کنندہ : اکیڈمی بک سینٹر (A.B.C.)
ڈی۔۳۵ بلاک۔۵ فیڈرل بی ایریا
کراچی۔۷۵۹۵۰
فون ۳۳۴۹۷۳۰۔۳۶۸۰۹۲۰۱ (۹۲+)

رابطہ مصنف : cdrmohsin@hotmail.com

اشاعت : رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ ۔ اگست ۲۰۱۱ء

قیمت : ۷۰۰ روپے

(History & Philosophical Deductions)

فہرست مضامین

تعارف ۱۴

۱۔ ابتدائیہ ۳۵

(الف) جبلت ۳۵

(ب) ادراک ۳۶

(ج) الہام ۳۶

۲۔ قرآن وسنت کی اہمیت ۳۷

۳۔ الہام اور تہذیبوں کا متوازی ارتقاء ۳۸

۴۔ سنت رسولؐ کے بارے میں احکام خداوندی ۳۹

۵۔ قبل از اسلام مذاہب عالم کے بنیادی اصول ۴۳

(الف) مذہب ۴۳

(ب) مذہب کی خصوصیات ۴۴

(i) مذہبی رسومات ۴۴

(۱) سالانہ معاشرتی میلے اور تہوار ۴۴

(۲) سالانہ مذہبی تہوار ۴۵

(۳) انسانی زندگی کے متعلق تہوار ۴۵

(۴) بحران کے موقع پر دعائیں ۴۵

(ii) ماورائی علوم کے قصے ۴۵

(۱) کائناتی تصور ۴۶

(۲) سماجی و اخلاقی تصورات ۴۶

(۳) تاریخی قصے ۴۶

(iii) پیشہ ور مذہبی گروہ ۴۶

۶۔ طلوع اسلام کے وقت عرب کے علاوہ تمدن ۴۷

(الف) اہل روم ۴۷

(ب) اہل فارس ۴۸

(ج) اہل چین ۴۹

(i) کنفیوشی ازم ۵۰

(ii) تاؤ ازم یا ڈاؤ ازم ۵۰

(د) تہذیب ہند ۵۰

(i) ہندومت ۵۰

(ii) جین مت ۵۳

(iii) بدھ مت ۵۳

۷۔ خطہ عرب میں طلوع اسلام کے وقت کا تمدن ۵۴

(الف) ریگستانی تہذیب ۵۴

(i) اہل شہر ۵۴

(ii) اہل غار ۵۵

(iii) اہل عرب ۵۵

(iv) مذاہب ۵۷

(۱) حنفاء ۵۷

(۲) مشرکین ۵۸

(۳) صابئی یا صبائی ۵۸

(۴) اہل یہود ۵۹

(۵) مسیحی یا نصاریٰ ۶۰

۸۔ بدوؤں کی خصوصیات ۶۳

۹۔ عرب تہذیب و تمدن کا مرکز ۶۴

۱۰۔ ظہور نبی آخر الزماں و تکمیل ہدایت ربی ۶۴

۱۱۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے اجداد اور گھرانہ ۶۷
۱۲۔ رسول اللہ ﷺ کے چند مشہور اجداد ۶۹
(الف) فِہر بن مالک (قریش) ۶۹
(ب) قُصَی بن کلاب ۶۹
(ج) عبد مناف (مغیرہ) ۷۰
(د) ہاشم (عمرو) ۷۱
(ہ) عبد المطلب (شیبہ) ۷۱
(i) زمزم کے کنوئیں کی کھدائی ۷۲
(ii) ہاتھی والوں کے لشکر کی مکہ پر چڑھائی ۷۳
(iii) ایک بڑی قربانی کا قصہ ۷۵
(و) عبد اللہ ۷۶
۱۳۔ صاحب الہام، نبی آخر الزماں کی آمد ۷۷
(الف) رسول اللہ ﷺ کی پرورش ۷۸
(ب) سینہ کشائی ۷۹
۱۴۔ مادر رسول کا رختِ سفرِ آخر ۸۱
۱۵۔ دوہری یتیمی ۸۳
۱۶۔ رسول اللہ کی سب سے لمبی رفاقت ۸۳
۱۷۔ رسول اللہ کا پہلا سفر ۸۴
۱۸۔ جنگ فُجار ۸۵
۱۹۔ رسول اللہ کی پہلے سماجی عہد میں شرکت ۸۶
۲۰۔ پیغمبر اسلام کا عالم شباب ۸۷
(الف) تجارت قدری ۸۷
(ب) محترمہ خدیجہ سے تعلق ۸۷
(ج) مبارک رفاقت ۸۸

(د) رسول اکرم کی فیاضی ۹۰
(ہ) رسول اللہ ﷺ کی اپنے غلام کے لیے شفقت و محبت ۹۱
(و) رسول اللہ ﷺ کا علی بن ابو طالب کی پرورش کا ذمہ لینا ۹۲
(ز) آنحضرت پیغمبر ﷺ کی شادیاں ۹۳
۲۱۔ چند متعلق اخراجات ۹۳
(الف) جہیز ۹۳
(ب) مہر ۹۴
(ج) مہر رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ۹۴
(د) فی زمانہ مہر کی مالیت ۹۶
(ہ) ولیمہ ۹۸
(و) نچھاور کرنا ۹۸
۲۲۔ رسول اللہ ﷺ کی حجر اسود کے بارے میں ثالثی ۹۹
۲۳۔ جناب محمد ﷺ سچائی کی تلاش میں ۱۰۰
۲۴۔ آمد الہام ۱۰۳
۲۵۔ لفظ "پڑھ" کا منطقی تجزیہ ۱۰۵
۲۶۔ دعوتِ حق قبول کرنے والے اصحاب ۱۱۱
(الف) دعوت سے قبل حق قبول کرنے والے ۱۱۱
(i) سیدہ خدیجہؓ ۱۱۱
(ii) ورقہ بن نوفل ۱۱۲
(ب) اعلان نبوت کے فوری بعد حق قبول کرنے والے ۱۱۲
(ج) احباب میں سے سابقین اولین ۱۱۲
(د) دیگر سابقین اولین ۱۱۳
۲۷۔ صلوٰۃ کی ادائیگی ۱۱۴
۲۸۔ قرار و شہادت یا ایمان و عقیدہ ۱۱۴

(الف) اللہ کی واحدانیت کا اقرار کائنات کی ملکیت کے سلسلے میں ۱۱۵
(ب) اللہ کی واحدانیت کا اقرار اس کے الٰہ ہونے کے بارے میں ۱۱۵
(ج) اللہ کی وحدانیت کا اقرار اس کے اسماء اور صفات کے بارے میں ۱۱۵
(د) محمدؐ کی رسالت کا اقرار ۱۱۶
(ہ) الہامی کتابوں کی سچائی کا اقرار ۱۱۶
(و) فرشتوں کے وجود کا اقرار ۱۱۷
(ز) روز قیامت کا اقرار ۱۱۷
(ح) قسمت پر یقین کا اقرار ۱۱۷
۲۹۔ جناب رسول اللہ ﷺ کو دعوت عام کا حکم ۱۱۸
۳۰۔ جناب رسول اللہ کی اپنی قوم کو تنبیہ ۱۲۰
۳۱۔ جناب رسول اللہ ﷺ کو قریش کی شدید دشمنی کا سامنا ۱۲۱
۳۲۔ داعی حق کو "مجنون" پکارنا ۱۲۲
۳۳۔ کفار کا بتوں سے جنون محبت ۱۲۳
۳۴۔ بت پرستوں کی رسول اللہ ﷺ کو بدنام کرنے کی سازش ۱۲۴
۳۵۔ نافرمانوں سے اللہ کی ناپسندیدگی ۱۲۵
۳۶۔ بت پرستوں کی بے وقوفی ۱۲۶
۳۷۔ مشرکین کی طرف سے مفاہمت کی پیشکش ۱۲۷
۳۸۔ کفار کا طنزیہ و مزاحیہ ردعمل ۱۲۸
۳۹۔ ابوجہل کا جناب رسول اللہ ﷺ کو دھمکی دینا ۱۲۹
۴۰۔ جناب حمزہؓ کا رسول اللہ ﷺ کی حمایت میں جوش محبت ۱۳۱
۴۱۔ عتبہ بن ربیعہ کی سودے بازی ۱۳۱
۴۲۔ نضیر بن حارث کی حماقت ۱۳۳
۴۳۔ قریش کا اہل کتاب سے مشورہ ۱۳۴
۴۴۔ اہل قریش کا کمزور اور غریب ایمان لانے والوں پر ظلم ۱۳۶

۴۵۔ مسلمانوں کی ابی سینیا میں پناہ ۱۳۸
۴۶۔ جناب عمرؓ کا رسالت مآب کی رفاقت میں آنا ۱۴۴
۴۷۔ اہل قریش کی بڑھتی ہوئی مایوسی ۱۴۵
۴۸۔ اہل قریش کا ہاشمیوں سے قطع تعلق ۱۴۶
۴۹۔ ہاشمیوں کے سردار کا رخت سفر آخر ۱۴۹
۵۰۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے عزیز ترین ساتھی کا جدا ہونا ۱۵۱
۵۱۔ رسول اکرم ﷺ کا سیدہ سودہؓ سے نکاح ۱۵۲
۵۲۔ رسول اللہ ﷺ کا سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے نکاح ۱۵۲
سیدہ کی عمر میں اختلاف اور منطقی تجزیہ ۱۵۳
۵۳۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو دعوت کے لیے لوگوں کی تلاش ۱۵۴
۵۴۔ جناب رسالت مآب کی اپنے مالک سے التجا ۱۵۵
۵۵۔ پیغمبر اسلام کا غم کی حالت میں مکہ لوٹنا ۱۵۶
۵۶۔ دعوت حق کے لیے ایک اور مسرت انگیز کوشش ۱۵۸
(الف) طفیل دوسی ۱۵۹
(ب) ضماد الازدی ۱۵۹
(ج) ابوذر غفاری ۱۶۰
(د) سوید بن صامت ۱۶۱
(ہ) ایاس بن معاذ ۱۶۱
۵۷۔ قبائل کا اسلام سے منہ موڑنا ۱۶۱
۵۸۔ اسلام نے اہل مدینہ کا دل موہ لیا ۱۶۲
۵۹۔ بیعت عقبہ اول ۱۶۳
۶۰۔ بیعت عقبہ دوم ۱۶۴
۶۱۔ مالک کا اپنے بندے کو عروج و رفعت عطا فرمانا ۱۶۶
۶۲۔ اللہ کا اپنے عام بندوں کو معراج عطا فرمانا ۱۷۱

۶۳۔ ذکر اللہ ۱۷۲
۶۴۔ بیعت عقبہ کے نتائج ۱۷۷
۶۵۔ جناب رسالت مآب ﷺ کی مکہ سے ہجرت ۱۷۹
۶۶۔ سراقہ جناب رسالت مآب ﷺ کی تلاش میں ۱۸۲
۶۷۔ مبارک قافلے کا اُم معبد کے پاس قیام ۱۸۲
۶۸۔ خوش بختی کا آ پہنچنا ۱۸۳
۶۹۔ اللہ کے پہلے گھر کا قیام ۱۸۵
۷۰۔ یثرب شہر نبی بن گیا ۱۸۶
۷۱۔ شہر یثرب میں آمد رسول ۱۸۸
۷۲۔ مسجد النبی مسلمانوں کا پہلا دارالندوہ ۱۹۰
۷۳۔ جناب رسالت مآب کا پہلا خطبہ جمعہ ۱۹۱
۷۴۔ جناب رسالت مآب کا مدینہ میں پہلا خطبہ ۱۹۳
۷۵۔ انصار و مہاجرین کا شریک وسائل ہونا ۱۹۴
۷۶۔ مہاجرین کے گھرانوں کو مدینہ لانا ۱۹۵
۷۷۔ پہلا آئینی مسودہ جو جناب رسول اللہ نے رقم کرایا ۱۹۶
۷۸۔ میثاق مدینہ کا ماحاصل ۲۰۰
۷۹۔ اسلامی سماجی اصولوں کا نفاذ ۲۰۱
(الف) اذان (اعلان وقت صلوٰۃ) ۲۰۲
(ب) صوم (روزہ) ۲۰۲
(ج) زکوٰۃ ۲۰۳
(د) الحدود (قانون سزا) ۲۰۴
۸۰۔ جناب رسالت مآب ﷺ کا طرز عمل و رویہ ۲۰۵
۸۱۔ اہل مکہ کی اہل ایمان اور رسول اللہ سے بڑھتی ہوئی نفرت ۲۱۰
۸۲۔ مدینہ کی معاشی ناکہ بندی ۲۱۱

۸۳۔ سریہ حمزہ اور قریش کو تنبیہ ۲۱۱
۸۴۔ سریہ سعد بن ابی وقاص ۲۱۲
۸۵۔ قریش اور یہودیوں کے معاہدے کا توڑ ۲۱۲
۸۶۔ غزوہ ابوا یا غزوہ ودان ۲۱۳
۸۷۔ مدینہ پر پہلا حملہ ۲۱۵
۸۸۔ سریہ عبیدہ بن حارث بن مطلب ۲۱۵
۸۹۔ غزوہ بواط ۲۱۶
۹۰۔ غزوہ بدر اولیٰ یا غزوہ صفوان ۲۱۶
۹۱۔ غزوہ ذوالعشیرہ ۲۱۶
۹۲۔ سریہ عبداللہ بن جحش ۲۱۶
۹۳۔ جہاد کے بارے میں مختصر تعارف ۲۱۹
۹۴۔ جہاد کے مختلف پہلو ۲۲۰
(الف) معنیٔ جہاد ۲۲۰
(ب) اقسام جہاد ۲۲۱
(i) شیطان سے جہاد ۲۲۱
(ii) جہاد نفس ۲۲۱
(iii) مظلوموں کے لیے جہاد ۲۲۲
(iv) اسلامی معاشرے یا علاقے کے لیے جہاد ۲۲۲
(ج) جہاد کے بنیادی اصول ۲۲۳
(i) نیت (مقصد و محرک) ۲۲۳
(ii) جہاد میں شمولیت کا فرض ۲۲۴
(iii) صحیح یا قانونی حکم دینے کا مجاز ۲۲۴
(iv) لڑنے کی صلاحیت ۲۲۶
(v) جنگ میں لازم اوصاف ۲۲۷

(۱) ثابت قدمی ۲۲۷
(۲) رویے میں صبر اختیار کرنا ۲۲۸
(۳) تنظیم اور خلوص ۲۲۸
(۴) اللہ کے سامنے عاجزی و انکساری ۲۲۸
(۵) آداب جنگ ۲۲۹
۹۵۔ تبدیلی قبلہ ۲۳۰
۹۶۔ جنگ بدر ۲۳۲
(الف) قریش کی ناراضی اور خوف ۲۳۲
(ب) ابوسفیان کا تجارتی قافلہ ۲۳۲
(ج) رسول اللہ کا دشمن کو گھیرنے کا فیصلہ ۲۳۲
(د) ناپسندیدگی کا اظہار کرنے والوں کے لیے اللہ کا حکم ۲۳۳
(ہ) ابوسفیان کا حفظ ماتقدم ۲۳۳
(و) اہل قریش کا کاروان کے لیے انتظار و اضطراب ۲۳۳
(ز) مکہ کے لوگ بڑی متکبرانہ شان سے آگے بڑھے ۲۳۴
(ح) جناب رسول اللہ ﷺ کی قافلے کی طرف روانگی ۲۳۵
(ط) جناب رسول اللہ کا اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورے ۲۳۵
(ی) قریش فوج کی حالت زار اور سوچ و بچار ۲۳۷
(ک) مسلمان فوج کی جنگی حکمت عملی ۲۳۸
(ل) جناب رسالت مآب ﷺ کی اللہ کی مدد کے لیے مناجات ۲۴۰
(م) مسلمانوں پر نزول سکینت ۲۴۱
(ن) جناب رسولؐ اللہ کو کافروں کی تعداد بہت کم لگی ۲۴۲
(س) جناب رسول اللہ نے اپنے تصور میں قریش کا قتال دیکھا ۲۴۲
(ع) جنگ کے قوانین و آداب ۲۴۳
(ف) اللہ کی مدد بارش کے ساتھ ۲۴۴

(ص) ابتدائے جنگ ۲۴۵
(i) دونوں افواج روبرو ۲۴۵
(ii) شیطانی دھوکہ اور قریش کا غرور ۲۴۶
(iii) دونوں افواج کی مڈبھیڑ ۲۴۷
(iv) فرشتوں کی شرکت ۲۴۸
(v) کافروں کی گردن زنی ۲۴۸
(vi) قرآنی آیات کو غلط طریقے سے پیش کرنا ۲۵۰
(ق) حق کی باطل پر فتح ۲۵۳
(ر) اسیران حرب ۲۵۴
(ش) بدر کی فتح پر مسلمانوں کا ردعمل ۲۵۶
(ت) حبشہ کے عیسائی بادشاہ کی خوشی ۲۵۶
(ث) منافقوں کی حیرانگی ۲۵۷
(خ) اہل مکہ کا غم و پریشانی ۲۵۷
(ذ) ابوالعاص کی رہائی ۲۵۸
(ض) شرکائے بدر کی فضیلت ۲۵۹
۹۷۔ غزوۂ بنی سلیم و غزوۂ سویق ۲۵۹
۹۸۔ جناب رسالت مآب کا یہود مدینہ سے خطاب ۲۶۰
۹۹۔ قینقاع کی عہد شکنی ۲۶۱
۱۰۰۔ یہودیوں کی مسلمان خاتون کے ساتھ بیہودگی ۲۶۳
۱۰۱۔ قلعہ بند یہودیوں کا محاصرہ اور منافقوں کا کردار ۲۶۳
۱۰۲۔ مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں اور مشرکین کی دشمنی ۲۶۴
۱۰۳۔ جناب رسالت مآب پر قاتلانہ کوشش ۲۶۵
۱۰۴۔ یہودیوں کی جناب مسیح کو قتل کرنے کی سازش ۲۶۶
۱۰۵۔ جناب رسالت مآب ﷺ کی سیدہ حفصہ سے شادی ۲۶۷

۱۰۶۔ دختران نبی کی شادیاں ۲۶۸
۱۰۷۔ جناب رسالت مآب کے قریب ترین ماکین اور ان سے تعلقات ۲۶۸
۱۰۸۔ غزوۂ نجد یا ذی امر ۲۶۹
۱۰۹۔ غزوۂ بحران ۲۷۰
۱۱۰۔ سریہ زید بن حارثہ ۲۷۰
۱۱۱۔ جناب رسالت مآب کے دشمنوں کا قتل ۲۷۱
۱۱۲۔ جنگ اُحد ۲۷۳
(الف) جنگ کے وجوہ ۲۷۳
(i) قریش کی بدر کے مقام پر شکست ۲۷۳
(ii) قریش کا مستقبل اندھیرے میں ۲۷۳
(iii) قریشی خواتین کی اشتعال انگیزی ۲۷۴
(ب) جنگ کی تیاری ۲۷۴
(i) اُمرائے قریش کا فیصلہ ۲۷۴
(ii) قریش نے مہم شروع کر دی ۲۷۵
(iii) قریش خواتین کی جنگ میں شرکت ۲۷۵
(iv) قریش فوج کی تفصیل ۲۷۶
(ج) قریش فوج کا مدینہ میں ورود ۲۷۶
(د) اللہ کے رسول کو اطلاع ۲۷۷
(ہ) جناب رسالت مآب ﷺ کا اپنے ساتھیوں سے مشورہ ۲۷۷
(و) جناب رسالت مآب کا فیصلہ ۲۷۸
(ز) جناب رسول اللہ ﷺ کا اپنے سپاہ کا معائنہ کرنا اور آگے بڑھنا ۲۷۹
(ح) عبداللہ بن ابی کا کردار ۲۸۰
(ط) منافقین اور ایمان والوں کی پہچان ۲۸۱
(ی) مسلمان فوج کو اُحد میں متعین کرنا ۲۸۴

(ک) شمشیر اعزازی ۲۸۵
(ل) قریش فوجیوں کی حالت ۲۸۶
(م) قریش کی خواتین کا کردار ۲۸۶
(ن) دونوں افواج حرکت میں آ گئیں ۲۸۷
(س) شہادت حمزہ ۲۸۷
(ع) قریش کی شکست ۲۸۸
(ف) تیراندازوں کی نافرمانی ۲۸۹
(ص) مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی ۲۸۹
(ق) جناب رسالت مآب کی رحلت کی افواہ ۲۹۰
(ر) ابو دجانہ کی ناقابل یقین و ناقابل فراموش قربانی ۲۹۲
(ش) سیدہ اُم عمارہ کی مثالی ہمت و جرأت ۲۹۳
(ت) جناب رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر ایک اور حملہ ۲۹۳
(ث) ہندہ کا وحشیانہ پن ۲۹۴
(خ) جنگ میں مسلمان خواتین کا کردار ۲۹۴
(ذ) ابوسفیان کا فخر ۲۹۵
(ض) شہدا کا کفن دفن ۲۹۵
(ظ) جناب رسالت مآب کی اللہ کے سامنے عاجزی اور التجا ۲۹۶
(غ) جناب رسالت مآب کی جناب حمزہؓ و دیگر شہدا سے اظہار محبت ۲۹۷
(الف الف) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو تسلی ۲۹۸
(اب) شہدائے احد کے مراتب ۲۹۹
(اج) ابوسفیان فتح کا جشن منائے بغیر کیوں چلا گیا؟ ۳۰۱
۱۱۳۔ جنگ حمراء الاسد ۳۰۲
۱۱۴۔ سریہ ابوسلمہ ۳۰۵
۱۱۵۔ سریہ عبداللہ بن انیس ۳۰۶

۱۱۶۔	سریہ الرجیع	۳۰۶
۱۱۷۔	حادثہ بئر معونہ	۳۰۷
۱۱۸۔	بئر معونہ کے اثرات اور نتیجہ	۳۰۹
۱۱۹۔	غزوہ بنو نضیر	۳۱۱
۱۲۰۔	جنگ بدر دوم	۳۱۴
۲۱۔	غزوہ دومۃ الجندل	۳۱۵
۲۲۔	جناب رسول اللہ ﷺ کا سیدہ زینب بنت خزیمہ سے نکاح	۳۱۵
۱۲۳۔	جناب رسول اللہ ﷺ کا سیدہ اُم سلمہ سے نکاح	۳۱۶
۲۴۔	غزوہ بنو مصطلق یا غزوہ مُریسیع	۳۱۶
۱۲۵۔	اُبَی کے جناب رسول اللہ کے متعلق نازیبا الفاظ	۳۱۷
۱۲۶۔	جناب رسالت مآب کی سیدہ جویریہ سے شادی	۳۱۹
۲۷۔	افک (جھوٹی افواہ) سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے خلاف	۳۲۰
۱۲۸۔	اسلامی فقہ میں قوانین کا اجرا	۳۲۷
۱۲۹۔	جنگ احزاب (حلیف قبائل) یا جنگ خندق	۳۲۸
	(الف) ریاست مدینہ کے خلاف کفار کا اتحاد	۳۲۸
	(ب) اتحادیوں کی تیاری	۳۲۹
	(ج) جناب رسالت مآبؐ کا ردِ عمل	۳۳۰
	(د) بنو قریظہ کی غداری	۳۳۱
	(ہ) مدینہ کی ناکہ بندی	۳۳۲
	(و) دشمن کا خندق کو پار کرنا	۳۳۳
	(ز) رسالت مآب کی کافروں پر لعنت اور اہل ایمان کے لیے خوشخبری	۳۳۳
	(ح) اللہ کا عذاب دشمنوں پر	۳۳۴
	(ط) سیدہ صفیہ کی بہادری	۳۳۴
	(ی) نعیم بن مسعود کا منصوبہ	۳۳۵

	(ک) دشمن کا فرار	۳۳۵
	(ل) اللہ کے رسول کا ادائے شکر	۳۳۶
۱۳۰۔	بنو قریظہ کی غداری	۳۳۶
	(الف) اس غداری کے متعلق اللہ کا حکم	۳۳۷
	(ب) غزوہ بنو قریظہ	۳۳۷
	(ج) ابولبابہ کی غلطی	۳۳۸
	(د) سعد بن معاذ کی ثالثی	۳۳۹
	(ہ) سعد کے فیصلے پر عمل درآمد	۳۳۹
	(و) اس واقعہ کا قرآن میں ذکر	۳۴۰
	(ز) ریحانہ اللہ کے رسول کی کنیز بن جاتی ہے	۳۴۰
۳۱۔	جناب رسول اللہ کا سیدہ زینب بنت جحش سے عقد	۳۴۱
۳۲۔	پیغمبر کسی مرد کے والد نہیں	۳۴۳
۳۳۔	محمد مہر نبوت ہیں	۳۴۳
۳۴۔	جناب رسالت مآب کے لیے صلوٰۃ و سلام کہنے کا حکم	۳۴۵
۱۳۵۔	عمرہ ادا کرنے کا حکم	۳۴۸
۱۳۶۔	صلح حدیبیہ	۳۴۸
۳۷۔	بیعت الرضوان	۳۵۵
۱۳۸۔	نزول سورۃ فتح	۳۵۶
۱۳۹۔	مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے غیر مسلموں سے شادی کی ممانعت	۳۵۹
۱۴۰۔	اہل کتاب خاتون سے شادی کرنے اور اہل کتاب کا کھانا کھانے کا قانونی پہلو	۳۶۱
۱۴۱۔	صلح حدیبیہ کے نتائج	۳۶۴
۱۴۲۔	عرب سے باہر دعوت اسلام	۳۶۶
	(الف) قیصر کے نام خط	۳۶۶
	(ب) کسریٰ یعنی خسرو یا Chosroes شاہ فارس کے نام خط	۳۶۸

(ج) مقوقس (Muqawqas) اسکندریہ یا مصر کے گورنر کے نام خط ۳۶۸
(د) نجاشی (Negus) شاہ حبشہ یا ایتھوپیا Abyssinia کے نام خط ۳۷۰
(ہ) یمن کے گورنر کے نام خط ۳۷۲
(و) شام کے گورنر کے نام خط ۳۷۲
(ز) والیٔ اومان کے نام خط ۳۷۳
(ح) بحرین کے گورنر کے نام خط ۳۷۳
۱۴۳۔ نشہ آور اشیاء کے استعمال کی ممانعت ۳۷۴
۱۴۴۔ تیمم (Tayammum) ۳۷۶
۱۴۵۔ متعہ اور گدھوں کے گوشت کی ممانعت ۳۷۷
۱۴۶۔ جناب رسالت مآب ﷺ پر جادو سے وار ۳۷۸
۱۴۷۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اہل مکہ کی مدد ۳۷۹
۱۴۹۔ رسالت مآب ﷺ کا ابوسفیان کی بیوہ بیٹی سے نکاح ۳۷۹
۱۵۰۔ خیبر میں اہل یہود کی سرگرمیاں ۳۸۱
۱۵۱۔ جناب رسالت مآب ﷺ کا یہودیوں کے خلاف ردعمل ۳۸۲
۱۵۲۔ خیبر مسلمانوں کے محاصرے میں ۳۸۴
۱۵۳۔ شراکتی بٹوؤں کا بندوبست ۳۸۵
۱۵۴۔ قضا عمرے کی ادائیگی ۳۸۶
۱۵۵۔ جناب رسالت مآب ﷺ کا خواب پورا ہوا ۳۸۸
۱۵۶۔ قریش مکہ پر عمرے کے اثرات ۳۸۹
(الف) جناب رسالت مآب ﷺ کا سیدہ میمونہؓ سے نکاح ۳۸۹
(ب) خالد بن ولید کا اسلام قبول کرنا ۳۹۰
۱۵۷۔ عیسائی شخصیتیں جنہوں نے جناب محمد ﷺ کو رسول کی حیثیت سے پہچانا ۳۹۱
(الف) عیسائی راہب بحیرہ ۳۹۱
(ب) ورقہ بن نوفل ۳۹۲

(ج) نجاشی آشامر (شاہ حبشہ) ۳۹۳
(د) حبشہ کا عیسائی وفد ۳۹۴
۱۵۸۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کا غیر متوقع ٹکراؤ ۳۹۴
۱۵۹۔ جنگ موتہ ۳۹۵
۱۶۰۔ مسلمان اور رومی افواج کا ٹکراؤ ۳۹۷
۱۶۱۔ غزوہ ذات السلاسل ۴۰۰
۱۶۲۔ معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی ۴۰۱
۱۶۳۔ ابوسفیان کا مدینہ آنا ۴۰۲
۱۶۴۔ جناب رسالت مآب ﷺ کا مکہ پر لشکر کشی کا فیصلہ ۴۰۳
(الف) لشکر کشی کی وجہ ۴۰۳
(ب) مشن کا خفیہ رکھنا ۴۰۴
(ج) حاطب کی نافرمانی اور معافی ۴۰۵
۱۶۵۔ مکہ پر لشکر کشی کا آغاز ۴۰۶
(الف) قافلہ رسالت کی روانگی ۴۰۶
(ب) جناب رسول اللہ ﷺ کا قبل از مکہ خیمہ زن ہونا ۴۰۶
(ج) رسالت مآب ﷺ کے چچا کا مکہ والوں کے لیے پریشان ہونا ۴۰۷
(د) ابوسفیان کا دائرہ اسلام میں داخل ہونا ۴۰۷
(ہ) مکہ میں داخل ہونے سے پہلے جناب رسالت مآب کی ہدایات ۴۰۸
(و) ابوسفیان کے سامنے رسالت مآب کی مکہ میں فقید المثال آمد ۴۰۹
(ز) جناب رسالت مآب کا نہایت عاجزی سے مکہ میں داخلہ ۴۱۰
(ح) کعبۃ اللہ کی طہارت ۴۱۲
(ط) کعبۃ اللہ میں اذان بلالی ۴۱۲
(ی) رسالت مآب کا قوم سے خطاب ۴۱۳
(ک) جناب رسالت مآب کا دوسرا خطبہ اہل مکہ سے ۴۱۵

(ل) نہ ہجرت، نہ فتح سے قبل کے مسلمانوں سے برابری ۴۱۷
(م) جناب رسول اللہ کا خالد بن ولید کے عمل سے اظہار بیزاری ۴۱۹
(ن) جناب رسول اللہ ﷺ کا بتوں کو تباہ کرنا ۴۲۱
(س) عرب میں بت پرستی کی ابتدا ۴۲۳
(ع) بت پرستی یا اسلام اختیار کرنے کا اختیار ۴۲۴
(ف) جناب رسالت مآب کا وعدہ انصار کے ساتھ مرنے جینے کا ۴۲۴
(ص) مکہ کی سربراہی ۴۲۵
۱۶۶۔ جنگ حنین ۴۲۶
۱۶۷۔ طائف کا گھیراؤ ۴۳۰
۱۶۸۔ ہوازن کے جنگی قیدیوں کی واپسی ۴۳۱
۱۶۹۔ نومسلموں نے بیوقوفی کا مظاہرہ کیا ۴۳۲
۱۷۰۔ جناب رسالت مآب ﷺ کی طرف سے اپنی رضاعی بہن کی عزت افزائی ۴۳۳
۱۷۱۔ مال غنیمت کی تقسیم ۴۳۴
۱۷۲۔ ہوازن کا سربراہ دائرہ اسلام میں ۴۳۶
۱۷۳۔ حنین، احد اور بدر کی مشابہتیں ۴۳۶
۱۷۴۔ رسول اللہ کی واپسی ۴۳۷
۱۷۵۔ مکہ میں کافروں کا داخلہ ممنوع کر دیا گیا ۴۳۸
۱۷۶۔ الفاظ "حلال" و "حرام" کی تشریح ۴۴۰
۱۷۷۔ زکوٰۃ و جزیہ کا نفاذ ۴۴۳
۱۷۸۔ معرکہ تبوک (العسرہ) ۴۴۶
(الف) معرکے کی وجہ ۴۴۶
(ب) سامان حرب کی قلت ۴۴۶
(ج) اہل ایمان کی جانفشانی ۴۴۶
(د) اللہ تعالیٰ کی طرف سے خرچ کرنے والوں کی عزت افزائی ۴۴۸

(ہ) منافقین کی کارستانیاں ۴۴۹
(و) منافقین کے لیے نہ جہاد نہ صلوٰۃ الجنازہ ۴۵۱
(ز) جناب رسول اللہ ﷺ کا شر انگیزی کی منصوبہ گاہ کو جلانے کا حکم ۴۵۲
(ح) ایمان کی کمزوری کی وجہ سے پیچھے رہ جانے والے ۴۵۳
(ط) وہ جو جائز عذر کی بنا پر پیچھے رہ گئے ۴۵۴
(ی) وہ جو اپنی کاہلی کی بنا پر پیچھے رہ گئے ۴۵۵
(i) ابولبابہ اور دوسرے ۴۵۵
(ii) کعب بن مالک، مرہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ ۴۵۶
(ک) تبوک کے لیے روانگی ۴۵۸
(ل) مسلمان فوج کی تبوک آمد ۴۶۰
(م) جنگ کے بغیر کامیابیاں ۴۶۱
(ن) مسلمانوں کی مدینہ واپسی ۴۶۳
(i) منافقین کا جناب رسول اللہ ﷺ کے خلاف منصوبہ ۴۶۳
(ii) مسجد ضرار کا انہدام ۴۶۴
(iii) مدینہ واپسی ۴۶۵
۱۷۹۔ وفود کا سال ۴۶۵
۱۸۰۔ مدینہ میں نظام حکومت کا قیام ۴۶۶
۱۸۱۔ جناب رسالت مآب ﷺ کی اپنی ازواج سے علیحدگی ۴۶۸
۱۸۲۔ اللہ تعالیٰ نے ازواج رسول کے درجات و مراتب بلند فرما دیے ۴۷۰
۱۸۳۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی مزید عزت افزائی فرمائی ۴۷۲
۱۸۴۔ تصوف کا مختصر تجزیہ ۴۷۷
(الف) عقیدہ وحدت یعنی نظریہ دوئی ۴۷۹
(ب) خلوت ۴۸۱
(ج) بیعت ۴۸۳

	(د) صوفیوں کے روایتی طریقے	۴۸۷
	(ه) مدد کے لیے پکار	۴۸۸
	(و) تسبیح و ذکر	۴۹۰
	(i) ذکر کے بارے میں نظریۂ قرآن	۴۹۰
	(ii) ذکر کے نفسیاتی پہلو	۴۹۲
۱۸۵۔	پہلے حج کی ادائیگی اسلامی قانون کے تحت	۴۹۳
۱۸۶۔	جنابِ رسالت مآبؐ کی مباہلے کے لیے پکار نجران کے مسیحیوں کے لیے	۴۹۵
	(الف) لفظ "مباہلہ" کا مطلب	۴۹۵
	(ب) مباہلے کا واقعہ	۴۹۵
	(ج) مسیحؑ کی پیدائش	۴۹۶
	(د) جنابِ مسیحؑ کی پیدائش پر خوشخبری	۴۹۷
	(ه) سیدہ مریمؑ کی پارسائی	۴۹۸
	(و) مباہلہ	۴۹۹
۱۸۷۔	جنابِ رسالت مآب ﷺ کا الوداع کعبہ اور آخری حج	۵۰۰
	(الف) تعارف و تقدیسِ کعبہ	۵۰۰
	(ب) بیت المعمور	۵۰۳
	(ج) طوافِ کعبہ	۵۰۴
	(د) حجرِ اسود	۵۰۷
	(ه) رکنِ یمانی	۵۰۸
	(و) مقامِ ابراہیم	۵۰۸
	(ز) صفا و مروہ کی سعی	۵۰۹
	(ح) طوافِ صفا و مروہ کا آغاز	۵۰۹
	(ط) حج و عمرے کا حکم	۵۱۱
	(ی) حج رسالت مآب ﷺ	۵۱۱
	(ک) جنابِ رسالت مآب ﷺ کے حج کا ماحاصل	۵۱۹
۱۸۸۔	انتظامی معاملات کی تکمیل اور لشکرِ اسامہ برائے موتہ	۵۲۱
۱۸۹۔	جھوٹی نبوت کے دعوے دار	۵۲۵
	(الف) طلیحہ	۵۲۵
	(ب) مسیلمہ کذاب	۵۲۵
	(ج) اسود عنسی	۵۲۶
۱۹۰۔	جنابِ رسالت مآب ﷺ نے دنیا سے رخصت ہونا ہی تھا	۵۲۶
۱۹۱۔	اللہ تعالیٰ نے باور کرا دیا کہ رسول اللہ ﷺ اب رخصت ہوا چاہتے ہیں	۵۲۸
۱۹۲۔	جنابِ رسول اللہ کی زندگی کے آخری ایام اور علالت	۵۲۹
۱۹۳۔	جنابِ رسالت مآب کی ابوبکر کو صلوٰۃ کی قیادت کرنے کی ہدایت	۵۳۰
۱۹۴۔	جنابِ رسالت مآب ﷺ کا سفرِ آخرت	۵۳۲
۱۹۵۔	اللہ کے رسول کے لیے خوشخبریاں	۵۳۴
۱۹۶۔	جنابِ رسالت مآب ﷺ کی وفات پر صحابہ کا ردِعمل	۵۳۴
۱۹۷۔	جنابِ رسالت مآب ﷺ کی صلوٰۃ جنازہ و دفن	۵۳۷
۱۹۸۔	جنابِ رسول اللہ ﷺ کا جسدِ مبارک و لحدِ مبارک	۵۳۷
۱۹۹۔	جس سے اللہ کے رسول نے محبت فرمائی ان کی صفات	۵۳۸
	(الف) مدینہ اور اس کے مکینوں سے محبت	۵۳۹
	(ب) مسجدِ نبوی	۵۴۰
	(ج) ام المومنین سیدہ عائشہؓ، خدیجہ الکبریٰ اور سیدہ فاطمہؓ	۵۴۰
	(د) جنابِ رسول اللہ کے قریب ترین ساتھی	۵۴۱
۲۰۰۔	جنابِ رسالت مآب کے قریب ترین ساتھی نے قوم کی قیادت سنبھال لی	۵۴۲
۲۰۱۔	اقوالِ قرآن برائے جنابِ رسول اللہ ﷺ	۵۴۳
	(الف) مہرِ نبوت	۵۴۳
	(ب) جنابِ رسول اللہ ﷺ کا اخلاق و پارسائی	۵۴۳

(ج) سب کے لیے رحمت ۵۴۴
(د) جناب رسول اللہ کی اپنی قوم کے لیے بخشش کی دعا ۵۴۴
(ہ) رسول روشن چراغ ہیں ۵۴۴
(و) اللہ تعالیٰ کی اپنے نبی پر نظر کرم ۵۴۷
(ز) رسول اللہ پر اللہ کی برکتیں و رحمتیں ۵۴۷
(ح) اللہ نے اپنے رسول کو سب سے اونچے درجے پر فائز کر دیا ۵۴۸
(ط) جناب رسول اللہ کے لیے ادب ۵۴۸
(ی) اپنے معاملات میں رسول اللہ کو منصف بناؤ ۵۴۹
(ک) جناب رسول اللہ ﷺ کی مکمل پیروی کا حکم ۵۴۹
۲۰۲۔ تکمیل دین اور ضرورت اجتہاد ۵۵۱
۲۰۳۔ کسی ایک مکتبہ فکر یا فرقے سے منسلک ہونا ۵۵۷
۲۰۴۔ جہالت ایمان کی روشنی کو تاریکی میں بدل دیتی ہے ۵۶۱
۲۰۵۔ انسان کا انسان کو غلام بنانا ۵۶۵
(الف) غلامی کیسے وجود میں آئی ۵۶۷
(ب) ساتویں صدی عیسوی میں عرب میں غلامی ۵۶۹
(ج) اسلام میں غلامی کا تصور اور غلاموں کے حقوق ۵۷۰
(د) غلاموں کے لیے حکم مکاتبت ۵۷۱
(ہ) غلاموں کی آزادی کا حکم کیوں نہیں دیا گیا ۵۷۳
(و) غلاموں کو آزاد کرنے کی نصیحت ۵۷۵
(ز) کسی آزاد فرد کو فروخت کرنا گناہ کبیرہ ہے ۵۷۶
(ح) اسلام میں داشتہ اور کنیز کی حیثیت ۵۷۶
(ط) کنیزوں سے ازدواجی تعلقات کی وجہ ۵۷۸
(ی) کنیزوں کے حقوق ۵۷۸
(ک) غلاموں سے شادی ۵۷۹

(ل) اختتامی نتیجہ ۵۷۹
۲۰۶۔ اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی ۵۸۰
۲۰۷۔ اللہ کے قوانین کے خلاف رسم و رواج ۵۸۱
(الف) خواتین کا قرآن کے ساتھ نکاح ۵۸۲
(ب) غیرت کے نام پر عورتوں کا قتل ۵۸۳
(ج) ونی اور سوارا کی رسم ۵۸۴
(د) بیواؤں کے ساتھ سلوک ۵۸۵
(ہ) شغار کی شادی ۵۸۵
(و) عورتوں کے خلاف سماجی جرائم اور تشدد ۵۸۶
۲۰۸۔ علم الحدیث کی اہمیت اور تعارف ۵۸۷
(الف) علم الحدیث کی اہمیت ۵۸۷
(ب) احادیث کی ترسیل کا طریقہ کار ۵۸۹
(ج) احادیث کی صداقت جانچنے کی ضرورت ۵۹۰
(د) جانچ کا طریقہ کار ۵۹۳
(۱) روایت ۵۹۳
(۲) درایت ۵۹۳
(۳) تاویل ۵۹۳
(ہ) احادیث کی قلمبندی کے سلسلے میں کاوشیں ۵۹۳
(و) حدیث کے راوی کی جانچ ۵۹۷
۲۰۹۔ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحم کا مستحق کون؟ ۵۹۸
۲۱۰۔ انسان کے بدترین دشمن ۶۰۰
۲۱۱۔ شیطانی ترغیب کا محور ۶۰۱
۲۱۲۔ شیطانی ترغیب کے تدارک کا محور ۶۰۳
۲۱۳۔ شیطانی پنجے سے بچنے کے لیے علم حاصل کرو ۶۰۹

(الف) سائنس کے اصولوں پر مبنی علم ۲۱۰
(ب) اخلاقی اصولوں پر مبنی علم ۲۱۰
(ج) دینی مشقیں ۲۱۱
۲۱۴۔ انسان کو ہمیشہ کی محبت اور اطمینان کیسے مل سکتا ہے؟ ۲۱۲
(الف) جہالت کا عنصر ۲۱۳
(ب) تکبر کا عنصر ۲۱۴
(ج) اللہ کی تابعداری اور اس پر بھروسہ ۲۱۵
(د) تقویٰ و پرہیزگاری کا اختیار کرنا ۲۱۷
(ہ) تجدید ایمان ۲۱۹
(و) ایمان سے غفلت اور بھٹکنے کا عنصر ۲۲۲
۲۱۵۔ مسلم معاشرے میں احیائے علوم و نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ۲۲۳
(الف) کلیسائیت (Clericalism) کا جنون ۲۲۴
(ب) جاگیرداری نظام ۲۲۵
۲۱۶۔ مسلمان اقوام کا زوال ۲۲۶
۲۱۷۔ مسلم معاشرے کے بگڑنے کی وجوہات ۲۲۹
(الف) مسلمانوں میں ملوکیت اور ملائیت کی ابتدا ۲۲۹
(ب) قرآن اور سنت کے خلاف نظریات ۲۳۰
(۱) نظریہ جبریہ و قدریہ ۲۳۰
(۲) معبود بادشاہوں کی تمنا ۲۳۲
(۳) تقدیر باطنیت ۲۳۳
(۴) تخلیق القرآن ۲۳۴
(۵) نظریہ وحدت الوجود ۲۳۵
۲۱۸۔ اللہ کے احکامات کی نافرمانی کا نتیجہ ۲۳۷
۲۱۹۔ بارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کا پہلا اجتماعی زوال ۲۴۰

۲۲۰۔ مسلمان معاشرے میں دوسرا اجتماعی زوال ۲۴۳
۲۲۱۔ چند اصلاحی تجاویز ۲۴۶
(الف) سماجی اصلاح ۲۴۶
(ب) دینی اور اخلاقی اصلاح ۲۴۷
۲۲۲۔ شکر الحمد للہ ۲۴۸

بسم اللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ

تعارف

اللہ سبحانہٗ نے تخلیق آدم فرمانے کے بعد اس کی بساط اور مرتبے کو اعلیٰ مرتبہ پر فائز کرنے کے لیے اسے مخزن علم سے مالا مال فرمایا۔ ایسا علم جو فرشتوں کے پاس بھی نہ تھا۔ پھر اسے ایک عارضاتی عالم میں زمین پر اس شرط کے ساتھ اتار دیا، کہ وہاں اس کے قیام کا مقصد امتحان کی آزمائشوں اور منزلوں سے گزرنا ہوگا۔ تا کہ وہ دوبارہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کو واپس جنت میں پا لے، اور وہی معاملہ اس کی اولاد کے لیے بھی طے پایا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت آدمؑ کا زمین پر منتقل ہونا عین رضائے ایزدی تھی، لیکن اس عمل کی پذیرائی میں شیطانی عمل دخل کارفرما تھا۔ چونکہ وہ اپنی زوال پذیری کا ذمہ دار حضرت آدمؑ کو سمجھتا ہے، اس لیے وہ حضرت آدمؑ کو کسی نہ کسی طریقے سے گزند پہنچانا اپنا فرض عین سمجھتا ہے۔ حالانکہ ابلیس اپنی بدبختی کا ذمہ دار بذات خود ہی ہے، کیونکہ اس کی جہالت اسے تکبر اور غرور کی منزل تک لے گئی۔ جس کی وجہ سے اسے آزمائش کی منزل سے گزرنا پڑا۔ کیونکہ خالق و مالک کائنات کسی بھی متکبر ناشکرے کو پسند نہیں فرماتا۔ ابلیس کی بدبختی اور حسد نے اسے آزمائش ربانی میں ناکام و نامراد کرادیا اور وہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہوگیا۔

بدقسمتی سے اولادِ آدمؑ عروج و زوال کی اس تاریخ کو اکثر یاد نہیں رکھتی، اسی لیے وہ اپنے خلاف شیطانی منصوبوں سے بچنے کے لیے کسی پائیدار حصار کا انتظام نہیں کرتی۔ اس لیے شیطان اولادِ آدمؑ کے خلاف وہی حربے استعمال کرتا ہے جو اس نے حضرت آدمؑ کے خلاف استعمال کیے تھے۔ برخلاف اس کے اللہ سبحانہٗ یہ کبھی بھی پسند نہیں فرماتا کہ اس کی محبوب ترین مخلوق ابلیس کے فریب میں آجائے۔ لہٰذا وقتاً بوقتاً تاریخ کے ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عزیز مخلوق کی رہبری فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے انسان کو اس کی حفاظت کے لیے علم کے

تین بنیادی ذریعے عطا فرمائے اور وہ ہیں (۱) جبلت (۲) عقل (۳) ادراک۔ اللہ تعالیٰ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس مقام کو بھی مدنظر رکھا کہ جہاں پر انسان عقل و دانش کے ان تینوں ذرائع کے استعمال کے بعد بھی ایک بندگلی کے آخری مقام پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ اور عقل و دانش اس کی رہبری سے قاصر ہو جاتے ہیں یا وہ اس قابل ہی نہیں ہوتا اور دانش کے ان تینوں ذرائع کا استعمال کرنے کا حق ادا کیے بغیر ہی بندگلی کی دیوار سے جا لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یہاں بھی بے سہارا نہیں چھوڑا بلکہ اس کی بھلائی کے لیے اپنی ذات گرامی کی طرف سے اس کی رہبری فرمادی۔ اور اسے الہامی علم عطا فرمایا۔

اولاد آدمؑ کے اکثر و بیشتر دانشمندوں کی بدبختی، کہ انہوں نے علم کے ابتدائی تین ذرائع سے استفادہ تو حاصل کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذاتی رہبری یعنی علم الہام سے منہ موڑے رکھا، اور ابلیس کے لیے اپنے ذہن کا دریچہ کھلا رکھا، تا کہ وہ انہیں اپنی راہ پر لا سکے۔ لہٰذا تمام دانشور، فلاسفر اور رہبر اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود انسانی بیماری، فقر الفقری، غم اور مصائب کو نہ روک سکے۔ اس بات کا ایک اور بنیادی سبب یہ بھی تھا، کہ وہ مقصد تخلیق آدمؑ ہی نہ سمجھ سکے اور نہ ہی مقصد حیات آدمؑ۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں تو صرف خالق ہی بتا سکتا ہے۔ مخلوق اپنی تخلیق کا مقصد کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ بلکہ خالق و مالک کائنات ہی اس معاملہ میں اپنی محبوب ترین مخلوق کی رہبری فرما سکتے ہیں۔ اسی لیے اللہ نے تاریخ کے ہر موڑ پر انسانی رہبری کے لیے اپنی طرف سے ہدایت کا انتظام فرمایا، اور اس ہدایت کو پہنچانے کا ذریعہ انسانوں میں سے ہی کسی ایک منتخب انسان کو بنایا تا کہ وہ بذات خود ہدایات ربانی کے مطابق اپنی زندگی کو اپنی قوم کے سامنے پیش کر کے ان کی رہبری کر سکے۔

لہٰذا امر واقع یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ نسل آدمؑ کے لیے اللہ سبحانہٗ کی طرف سے آخری الفاظ ہیں جو اس کی طرف سے انسان کے لیے ہدایت کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عقل و دانش کے وہ بندے جو اس ہدایت سے استفادہ حاصل نہیں کرتے اور فلسفیانہ اختراع میں مصروف رہتے ہیں، وہ نسل انسانی کو الجھن، پریشانی اور پشیمانی کے علاوہ کچھ نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ دین حق میں فلسفیانہ قیاس کے تحت جو اصول قائم کیے گئے ہیں، ان کی وجہ سے شیطانی وساوس کو کافی استحکام پہنچا اور ان کی وجہ سے امت کے اکثر کم علم لوگ الہامی ہدایت کو چھوڑ کر

شیطانی وطاغوتی طاقتوں کا شکار ہو گئے۔

لہٰذا ہمیں اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت انسانی کے لیے آخری الفاظ جن کے ذریعہ سے ہدایت ربانی کی تکمیل ہوئی، وہ صرف قرآن ہی کے الفاظ ہیں۔ لیکن قرآن کے طالب علم اس بات سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں کہ قرآن اس وقت تک ہماری سمجھ میں مکمل طور پر نہیں آسکتا جب تک کہ ہم قرآن کے نزول کی تاریخ سے واقف نہ ہو جائیں۔ اور یہ بات ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کے نزول کی تاریخ کا تعلق رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ سے منسلک ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ نزول قرآن کی تکمیل ۲۳ برس میں ہوئی۔ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ رسول اللہؐ نے اپنی ۲۳ سالہ زندگی قرآن کی ہدایت کے مطابق گزاری یا یہ کہ قرآن نے رسول اللہؐ کی رہبری مسلسل ۲۳ برس تک کی اور ان ۲۳ برسوں میں حضرت انسان کو ارشادات ربانی کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ وسلیقہ سکھلایا اور رہتی دنیا تک اہل انسان کو زندگی گزارنے کا ایک اعلیٰ و ارفع نمونہ مل گیا اور اسی کو قرآن نے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔

بدقسمتی سے امت مسلمہ عام طور سے یہ بھول چکی ہے کہ ہمیں رسول اللہؐ کی زندگی کے ان ۲۳ برسوں سے استدلال و استخراج حاصل کرنے اور قرآن کے الفاظ و معنی کی روح سمجھنے کے لیے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ، ان کے اعمال حسنہ، الفاظ، طور طریقے حتیٰ کہ آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو اپنے لیے مشعل راہ بنانا چاہیے۔ مجھے اس موقع پر شیخ محمد اقبالؒ کا ایک قول یاد آ رہا ہے کہ "قاری کو قرآن اس طرح سے پڑھنا چاہیے جیسا کہ قرآن کے الفاظ عین اسی وقت قاری پر نازل ہو رہے ہوں، جس وقت کہ وہ انہیں پڑھ رہا ہو" اور اسی طرح سے رسول اللہؐ کے قول و فعل کو اس وقت کے اعتبار کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ رسول اللہؐ آج کے وقت آج کی سوسائٹی میں قرآن کی روشنی میں یا اپنی حکمت کے اعتبار سے کیا فرماتے۔ لیکن افسوس کہ قرآن کا پڑھنا ایک مذہبی رسم بن کے رہ گیا ہے اور قاری کو اسے سمجھنے سے کوئی مطلب نہیں رہا، فقط ثواب حاصل کرنا ہی مقصد رہ گیا ہے اسی طرح سے رسول اللہؐ کی زندگی اور ان سے محبت فقط ان کی تعریف تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ جبکہ اطاعت قرآن و رسول اللہؐ مفقود ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ ہم نے قرآن اور ارشادات رسول اللہؐ کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

اس کے علاوہ الہامی اقوام کے رہنماؤں اور دانشوروں نے اس بنیادی حقیقت کو بھلا دیا ہے کہ دنیا کے تینوں بڑے الہامی مذاہب کی بنیاد ایک ہی اصول، ایک ہی تصور اور ایک ہی ذریعہ پر رکھی گئی۔ یعنی یہ تینوں مذاہب اور اس کے الہامی احکامات اللہ کی منشا کے مطابق اس کے انبیاء کے ذریعہ سے نسل آدمؑ تک منتقل کیے گئے۔ اور ان تینوں کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی حقانیت و وحدانیت کو تسلیم کرنا اور اپنے آپ کو روز قیامت کے حساب اور جزا و سزا کے لیے تیار کرنا ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان تینوں مذاہب کے بنیادی اصول اور انکی نافذ کرنے والی ہستی ایک ہی ہے تو پھر ان تینوں حلقوں میں تقسیم اور مخالفت کیوں؟ یہ تینوں کے تینوں کیوں اللہ کے مخلص اور تابعدار بندے نہیں بن جاتے اور آپس کی نفرت اور کدورت، لڑائی جھگڑے و فساد کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ انہوں نے صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان میں آپس میں بھی متعدد گروہ اور فرقے بن چکے ہیں جو ایک دوسرے کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ تمام کے تمام صرف اللہ تعالیٰ کی تابعداری اختیار کر لیں تو ان کے درمیان تمام جھگڑے اور تمام فرقے ختم ہو جائیں گی۔

تاریخ ہم لوگوں سے سوال کرتی ہے کہ آخر کیوں کہ حبشہ کا مسیحی بادشاہ نیگسؒ قرآن کے وہ الفاظ جو جعفر بن علیؓ نے ان کے سامنے تلاوت فرمائے تھے سن کر آبدیدہ ہو گیا؟ اور اس نے ان الفاظ کے سچ ہونے کا اقرار کیا اور یہ کہ اس نے رسول اکرمؐ کی سچائی اور ان کے نبی ہونے کو قبول کر لیا۔ اور یہ کہ رسول اکرمؐ نے نیگسؓ کی وفات پر کیوں اس کے لیے مغفرت کی دعا مانگی اور اس کے لیے نماز غائبانہ ادا کی؟ اس حقیقت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نیگسؓ کو گذشتہ الہامی کتابوں کے ذریعے سے یہ علم ہو گیا تھا کہ اللہ کے آخری رسول محمدؐ نے اسی دنیا کی رہبری کے لیے آنا ہے، اور یہ کہ ان پر نازل ہونے والی الہامی کتاب حضرت انسان کے لیے ہدایت کی آخری کتاب ہوگی۔

انسان کو یہ بات معلوم ہونا ضروری ہے کہ محمد رسول اللہؐ ان کے لیے کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے بلکہ یہ تینوں ادیان یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام ایک تسلسل کے ساتھ دین ابراہیمی کی ترویج و تکمیل کرتے نظر آتے ہیں اور اس کام کے لیے پیغمبروں کے ایک بہت بڑے سلسلے کو کام کرنا پڑا، ان میں سے چند چیدہ چیدہ کے نام قرآن میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر ابراہیم

کے بعد اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ وغیرہ، اور سب سے آخر میں محمدؐ، جن کے بعد نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دین ہمیشہ ایک ہی دین ہے جس کا آغاز آدمؑ و نوحؑ سے ہوا تھا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہؐ تک اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر ایک ہی مذہب بھیجا تو پھر اقوام الہامی مذاہب میں بنیادی اختلافات کیونکر رونما ہوئے۔ حقائق سے پتا چلتا ہے کہ پچھلی تمام الہامی کتابوں میں علماء سوء نے اپنی مرضی کے مطابق بیشتر تبدیلیاں کیں۔ حتیٰ کہ وہ تمام کتابیں اپنی اصلی حالت میں اس وقت ناپید ہو گئیں اور ایک ہی کتاب مختلف متن کے ساتھ لکھی اور پڑھی جا رہی ہے۔ جبکہ صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو من وعن ہمارے سامنے موجود ہے اور رہتی دنیا تک رہے گی۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ صاحبِ کلام نے خود لے لیا، ورنہ ابھی تک تو یہ بھی بدل گیا ہوتا۔ اگر آپ قرآن کریم کی ایک کاپی الاسکا سے لیں اور دوسری کاپی دنیا کے دوسرے کونے یعنی آسٹریلیا سے تو متن قرآن میں زیر، زبر کا فرق بھی آپ کو نہیں ملے گا۔

لہٰذا مصنف اہلِ انسان کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ آپس کی نفرت و کدورت، لڑائی اور جھگڑے میں کیوں الجھے رہتے ہیں جبکہ وہ تمام کے تمام ایک ہی مالک کے غلام اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں؟ علاوہ ازیں انہیں ہر دور میں ان کے مالک کی طرف سے ہدایت بھی ملی۔ پھر اس بات کا جواب کس شخص کے پاس ہے کہ حضرت انسان نے کیونکر اپنے ہی بھائی بندوں کی ایک کثیر تعداد کو بے دردی سے ہلاک کیا؟ یہ ہمارے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے کہ گذشتہ صدی یعنی بیسویں صدی میں حضرت انسان نے اپنے تقریباً 4.026 ارب بھائی بہنوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ قتل و غارت کسی مذہبی بنیاد پر نہیں ہوا (سوائے چند لاکھ کے)۔ ورنہ تو بہت سے عیسائیوں نے عیسائیوں کو ہی قتل کیا، کچھ مسلمانوں نے مسلمانوں کو قتل کیا اور کچھ نے تو روٹی کپڑا دینے کے وعدے پر اپنے بھائیوں کو اکٹھا کر کے قتل کر دیا۔ کیا کسی قوم نے یا کسی مفکر نے ابھی تک یہ سوچا کہ اس قتل و غارت کی وجہ کیا تھی؟

اگر آپ قرآن میں غور و فکر کریں تو معلوم ہوگا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہر بندے اور آدمؑ و حواؑ کے ہر بچے اور اس کے ہر پیغمبر کے پیروکار کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اہل آدمؑ میں یہ قتل و غارت

صرف اس وجہ سے ظہور پذیر ہوا کہ اولادِ آدمؑ اپنے مالک و خالق کے فرمودات سے لاپرواہی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی، بلکہ بغاوت پر آمادہ ہوئی اور ہنوز ہے۔ جب ہم اللہ کی رسی کو چھوڑ دیتے ہیں تو شیطان کو موقع اور آسانی فراہم کرتے ہیں کہ وہ ہمارے گرد اپنی چالوں کا جال بن سکے اور اس طرح سے ہم شیطان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق ہمیں ہانکتا پھرے اور نتیجتاً ہم اللہ کے عذاب کو بھی دعوت دیتے ہیں اور اس بات کی آگاہی تاریخ ہمیں فراہم کر رہی ہے۔

لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ اللہ کے بندے اور غلام ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں اور یہ سمجھ لیں کہ وہ ایک آقا کے غلام، ایک ہی ماں باپ کی اولاد اور ایک ہی راستے پر بلائے جانے والے ہیں۔ وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ خالق و مالک نے انہیں کیوں پیدا کیا؟ اور وہ ان سے اس دنیا میں کیا چاہتا ہے؟ بے شک ہر انسان کا مقصدِ حیات ایک ہی ہے۔ مصنف اپنے بھائی بہنوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں اور کسی سے بھی نفرت نہ کریں اور سب اپنے آقا کی تابعداری میں لگ جائیں اور ابلیس کی مکاریوں سے بچتے رہیں۔ بے شک وہ ہمیں جہنم کی طرف ہانکنا چاہتا ہے جبکہ ہمارا آقا ہمیں جنت کی طرف بلا رہا ہے، جہاں نہ ختم ہونے والی خوشیاں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔ اے اولادِ آدمؑ اپنے مالک کی طرف رجوع ہو جاؤ، ابھی وقت ہے کہ تمہارا آقا ابدی محبت کے ساتھ تمہارا منتظر ہے۔ ایسی محبت کے ساتھ جس میں کسی کمی کھانے کا امکان نہیں۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر مصنف نے کوشش کی ہے کہ وہ اپنے تجربہ اور علم جو اس کے مالک نے اپنے فضل سے اسے عطا کیا ہے، اُسے فلسفہ، قانون و مذہب کی روشنی میں اپنے بھائیوں تک پہنچائے اور اس کی بنیاد حیاتِ نبیؐ اور اس کے استخراج پر رکھی جائے۔ بے شک حیاتِ نبیؐ اور قرآن دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب بنیادی طور پر اہل مغرب کے لیے انگریزی زبان میں لکھی گئی جو امریکہ میں شائع ہوئی، لیکن کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس کتاب کا فائدہ ہم وطنوں کو بھی پہنچنا چاہیے۔ لہٰذا مصنف نے فیصلہ کیا کہ وہ کتاب کا ترجمہ خود ہی کرے تاکہ اصل کتاب کا متن اور روح قائم رہے۔ انشاءاللہ یہ کتاب نوجوان طالب علموں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ اگر حکمران طبقہ چاہے تو اسے بھی خیر و شر کی تمیز کرنے میں کافی

آسانی ہو جائے گی۔

میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میرے ذمہ ان تمام حضرات کے لیے دعائے خیر کرنا اور ان کا شکریہ ادا کرنا فرض ہے جنھوں نے کسی بھی طرح سے اس کتاب کی اشاعت کرنے میں مدد فرمائی۔ میں اپنے آقا و خالق و مالک جو منبعِ علم و دانش ہے، کے حضور عاجزانہ اور رندانہ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی ذاتِ پاک نے اس غلام کو اپنی تمام تر محبت اور عطا کے ساتھ یہ اعزاز عطا فرمایا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ عزت مآب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال کو استخراج کے ساتھ قلمبند کر سکے۔

اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ خاکسار کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور اس سے میرے بھائی بہنوں کو استفادہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، نیز یہ کہ اولادِ آدم میں محبت اور اتفاق پیدا فرمائے۔

احقر العباد

محسن اختر

۳۰ اکتوبر ۲۰۰۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ نبی الکریم

وہی (اللہ) ہے جو تم پر (صلوٰۃ) رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ وہ تمھیں اندھیروں سے اجالوں کی طرف نکالے اور وہ ایمان والوں پر (بہت) مہربان ہے۔ (الاحزاب:۴۳)

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے ان نبی پر (صلوٰۃ) رحمت بھیجتے ہیں، (تو) اے مومنو (تم بھی) ان پر (صلوٰۃ) رحمت بھیجو اور سلام بھی۔ (الاحزاب:۵۶)

(۱) ابتدائیہ

کہو (اے محمد): اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف (انس و جن) بھیجا گیا ہوں اللہ کے پیغمبر کی حیثیت سے۔ (اس اللہ) جس کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین پر۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے سوائے اس (اللہ) کے۔ وہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور موت واقع کرتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے پیغمبر پر۔ اس پیغمبر پر جو پڑھا لکھا نہیں ہے اور وہ ایمان لاتا ہے اللہ پر اور اس کے کلام پر (قرآن، انجیل اور تورات پر)، پس اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ الاعراف (۱۵۸)

بہت بابرکت ہے وہ، جس کے ہاتھ میں ہے وہ تمام ملک (جو وجود میں ہے) اور وہ (اللہ) اس قابل ہے کہ جو چاہے وہ کرے۔ جس نے موت اور زندگی کو بنایا تاکہ تمہیں جانچے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہی ہے تمام طاقتور اور معاف کرنے والا۔ الملک (۱-۲)

اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو زمین پر بھیجتے وقت صراحت کے ساتھ یہ واضح کر دیا تھا کہ وہاں پر اس کی آزمائش کی جائے گی اور جو بھی اس آزمائش میں پورا اترے گا، وہ حقدار ٹھہرے گا کہ اسے اپنے اس مقام پر واپس بھیج دیا جائے جہاں سے وہ نکالا گیا اور یہی اس کا انعام ہوگا۔ برعکس اس کے ناکام و نامراد لوگوں کے لیے سزا کے طور پر جہنم مقرر کر دی گئی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جو حقیقی منصف ہے اس بات کا انتظام کیا کہ اپنے بندوں کا امتحان لینے سے پہلے ان کی مکمل طور پر راہبری فرمائے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کی راہبری علم کے درج ذیل طریقوں سے فرمائی۔

(الف) جبلت (Instinct):

جبلت علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو پیدائشی طور پر انسانی ذہن کا حصہ ہوتا ہے۔ خالق حقیقی نے اپنی مخلوق کی بقا کے لیے اس کے ذہن میں ایسا شعور پیدا فرمایا ہے کہ مخلوق اپنی بقا کے لیے اس علم کو بغیر کسی تربیت کے استعمال کرتی ہے۔ یہ بنیادی ذریعہ علم ہر جاندار میں حسب مرتبہ پایا

جاتا ہے اس لیے انسانی جبلت تمام جانداروں میں اعلیٰ درجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ انسانی جبلت میں اخلاقی اقدار شامل ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر جبلت ہر جاندار کو زندگی کے قائم رکھنے کی ترغیب و جذبہ پیدا کرتی ہے یعنی کہ زندہ رہنے کی خواہش اور اس کی جدوجہد۔ لیکن ایک عام عقل رکھنے والا انسان اپنی زندگی کی بقا کے علاوہ ایک حد تک اور آگے بڑھ جاتا ہے اور اس میں کچھ اخلاقی اقدار مزید جنم لیتی ہیں۔ مثلاً وہ فطری طور پر دھوکہ دہی پسند نہیں کرتا، جھوٹ بولنا، چوری کرنا، کسی کو نقصان پہنچانا بھی پسند نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں وہ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے موسیقی کی دھنیں اسے اپنی طرف راغب کرتی ہیں، خوشبو اور رنگوں کی دلکشی اسے اپنی طرف مائل کرتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

(ب) اِدراک (Intuition):

اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ و محبوب ترین تخلیق کو بغیر کسی تدبر کے سمجھنے کے لیے قیاس اور شعور کی ایک ایسی حس عطا فرمائی، جو اسے علم عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی روح کو بھی منور کرتی ہے اور اسی بنیاد پر انسان دوسری مخلوق سے اعلیٰ درجہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ علم کی اس عطا کے ساتھ صحیح و غلط، اچھائی و برائی میں تمیز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ علم کی اس صنف کو اگر مزید نکھارا جائے تو ادراک کی یہ عطا انسان کو مزید روحانی منزلیں طے کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس کسی بھی وجہ سے، خواہ وہ اپنی غفلت ہی کیوں نہ ہو، انسان جب ادراکی علم کو نظر انداز کر دیتا ہے یا اسے پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیتا تو علم کا حصول اس کے لیے محدود ہو کے رہ جاتا ہے کیونکہ تصورات کی بلندی ہی ادراکی آگہی پیدا کرتی ہے۔

(ج) الہام (Revelation):

جہاں پر جبلت اور ادراک کی منزلیں طے ہو جاتی ہیں اور انسانی عقل عاجز ہو جاتی ہے تو اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنی محبوب مخلوق کو اپنی طرف سے خاص علم جو کہ انسانی عقل کی ترویج و تشریح کے لیے ضروری ہوتا ہے، عطا فرما دیتا ہے۔ بے شک ایسا علم عقل انسانی سے ماورا ہوتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ اس علم کو انسان تک پہنچانے کے لیے انہی میں سے ایک بندہ منتخب فرماتا اور اس کے ذریعہ سے اپنا خاص علم انسان تک منتقل فرماتا رہا۔

چنانچہ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اب تک کل تقریباً سوا لاکھ انبیاء کے ذریعہ نقل

انسان کو اس کی ہدایت و راہبری کے لیے اپنا خاص علم منتقل فرمایا اور اس علم سے دنیا کے کسی خطے، قوم یا نسل کو محروم نہیں فرمایا۔ بیشک یہ علم انسانی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کے درجے کے مطابق عطا کیا گیا۔ حتیٰ کہ جب انسانی تہذیب و تمدن اپنی تکمیل کی انتہا کو پہنچ گیا اور اسے تکمیل کا درجہ حاصل ہو گیا، اسی طرح سے علم کی یہ معراج، اللہ کے آخری نبی محمدؐ پر تکمیل کا رتبہ پائی اور علم کا یہ ذریعہ ہمارے مقصدِ حیات کی تکمیل کا ذریعہ بنا۔

(۲) قرآن و سنت کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے جبلی اور ارادی علم کے علاوہ اپنے ذاتی علم میں سے کچھ الہام کے طور پر عنایت فرمایا ہے تاکہ اس کی تخلیق کے مقاصد اس پر صحیح طریقے سے عیاں ہو جائیں اور روزِ حساب اسے یہ کہنے کا موقع نہ مل سکے کہ اس کا علم ناقص اس کی صحیح طور پر راہبری نہیں کر سکا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیں گمراہ دیکھنا پسند نہیں فرماتا، اس غرض سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نصاب عطا فرمایا اور ایک کتاب اور ایک استادؐ جو قیامت تک ہماری راہبری فرماتے رہیں گے۔ اس استادِ محترمؐ نے اس نصاب کو عملی طور پر اپنا کر اپنی امت کو باور کرا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا میں زندگی بسر کرنے کا آسان طریقہ جو اسے راہِ مستقیم کی طرف لے جائے گا، وہ ہر شخص کی دسترس میں ہے اور اس کا عملی نمونہ انسانیت کے استادِ اعلیٰ نے ہمیں بتا دیا اور اب وہ ان کے اقوال و اعمال اور قرآن کے الفاظ کے ساتھ ہماری راہبری کے لیے قیامت تک دستیاب رہے گا۔

لیکن ہماری قوم کے زیادہ تر لوگوں یعنی امتِ مسلمہ کی بدقسمتی کہ اس نے رسولِ اکرمؐ کی سنت سے منہ موڑ کر اور قرآن حکیم کو غلافوں میں لپیٹ کر صرف حرمت کا ایک نشان بنا رکھا ہے۔ زیادہ تر لوگ قرآن حکیم کو مذہبی رسم کے طور پر صرف ثواب حاصل کرنے کی غایت سے پڑھتے ہیں اور قطعی طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ ہمیں کیا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ جہاں تک سنتِ رسولؐ کا تعلق ہے، عام حضرات کو اس کی اہمیت اور اس کے علم کے بارے میں کچھ معلومات نہیں۔ بے شمار ضعیف حدیثیں زبانِ عام پر گردش کر رہی ہیں، اس لیے قرآن اور سنت کو احسن طریقے سے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ رسول اللہؐ کی زندگی کا

مطالعہ کیا جائے۔ خاص طور پر آپؐ کی زندگی کے ان ۲۳ برسوں کا لمحہ بہ لمحہ مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے جن میں آپؐ پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کا نزول فرمایا۔ بے شک رسول اللہؐ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مالک و خالق کی حکمت اور حکم کے تابع گزرا، اسی لیے تو مالک نے آپؐ کی زندگی کو رہتی دنیا تک کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔

پس یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان الہامی علم کی آگاہی کے بغیر نہ تو اپنی تخلیق کے مقصد سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی انسانیت کے اعلیٰ مقام کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس لیے انسانی منزل کا محور ہمیشہ اللہ کے پیغمبروں کی ذاتِ گرامی ہی رہی اور اب رہتی دنیا تک اللہ کے آخری نبی محمدؐ کی ذاتِ بابرکت منبہ نور ہدایت رہے گی۔

(۳) الہام اور تہذیبوں کا متوازی ارتقا

ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ الہامی علوم اپنی بنیاد پر رہتے ہوئے متمدن اقوام کے ارتقا کے ساتھ ارتقا پا چکے ہیں۔ بلکہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ رسالتِ محمدؐ کے احیاء کے ساتھ احیائے علوم کا سلسلہ تکمیل کی راہ پر گامزن ہو گیا اور نتیجتاً تکمیل نبوت و الہام، تکمیل تمدن و علوم کی وجہ بنی اور اب انسانی معاشرے کو مزید کسی راہبری کی احتیاج نہیں رہی۔ اسی لیے رہتی دنیا تک مزید الہام و نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ کیونکہ ایک کامل انسان کا نمونہ اور رہنمائی ہمیشہ نسلِ آدم کی راہبری کرتے رہیں گے اور رہتی دنیا تک دنیا کے طول و عرض میں ہر جگہ اس بات کا اعلان ہر روز پانچ بار ہوتا رہے گا، کہ بے شک اللہ ہی حاکمِ اعلیٰ اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ اور یہی اعلان ہمارے اندر اللہ اور رسول کی اور ان کی ہدایت کی موجودگی کا سبب بنتا رہے گا۔ اس طرح سے اللہ اور اس کے رسول ہمیشہ ہمہ تن ہمارے ساتھ رہیں گے لہٰذا الہامی کتاب کو غلاف میں بند رکھنا اور دن میں پانچ مرتبہ اذان کی پکار پر لبیک نہ کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم نے الہام کا دروازہ بند کر کے اس سے اپنا منہ موڑ لیا اور محمدؐ سے اپنا واسطہ اور تعلق قطع کر لیا۔ ہمارا اللہ اور اس کے رسول سے صرف ایک ہی صورت میں واسطہ بنتا ہے کہ ہم ان کے حکم پر اپنی گردن فوری طور پر جھکا دیں اور جھکاتے رہیں، یہاں تک کہ ہم اس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔

(۴) سنت رسولؐ کے بارے میں احکام خداوندی

مسلم اُمّہ کے نزدیک عام طور پر سنت کا مطلب محمد رسول اللہؐ کے زندگی گذارنے کے طور طریقے اور عوام الناس کے ساتھ ایک عام شخص کی طرح اور ایک رہبر کی طرح زندگی گذارنے کے قواعد وضوابط اور حدیث کا مطلب اس ضمن میں آپؐ کے اقوال ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے فرمان مبارک کی تائید وتشریح فرماتے ہیں۔

فرمان باری تعالیٰ ہے کہ (۱) جو کچھ تمہیں رسول (محمدؐ) دیں، لے لو (یعنی جس بات کا حکم دیں، مانو) اور جس سے منع فرمائیں، اس سے رک جاؤ۔ (الحشر۔۷)

(۲) جیسا کہ ہم نے (اللہ نے) بھیجا تم میں، تم ہی میں سے رسول، تا کہ وہ تمہارے سامنے ہماری آیات (احکامات) بیان کرتا رہے اور (اس طرح سے) تمہیں پاک کرتا رہے (برائیوں سے) اور سکھلاتا رہے تم کو کتاب (قرآن) اور حکمت۔ اور وہ سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے۔ (البقرۃ۔۱۵۱)

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ انسان کو یاد فرما رہے ہیں کہ اس نے اپنے نبی کو نوعِ انسان کے لیے ایک نعمت بنا کے بھیجا جو اللہ کی آیات (احکامات) ان کے سامنے بیان فرماتا ہے تا کہ ان سے دورِ جاہلیہ کی تاریکیاں اور گمراہیاں دور ہوسکیں اور نور کی اس روشنی سے جو اللہ کے علم اور نبی کی پُرحکمت زندگی سے عمل پذیر ہوئی، ان کے پراگندہ اذہان پاک ہوسکیں۔ اور وہ ایمان کی روشنی میں پاک وصاف زندگی گزار سکیں۔ بے شک وقت نے ثابت کر دیا کہ رسول اللہؐ کی حکمت عملی اور پاکیزہ ترین صحبت نے اس دور کے جاہل بدوؤں کو علم اور فضیلت کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچا دیا۔ وہ غلاموں سے حاکم، جہلا سے دانشمند اور بے راہ روی سے ہٹ کر اللہ کے ولی بن گئے۔

اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان مبارک ہے کہ ”بے شک اللہ نے بڑا احسان فرمایا ایمان والوں پر، جبکہ ان پر انہی لوگوں میں سے ایک رسول جو انہیں آیات پڑھ کے سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں سکھلاتا ہے کتاب وحکمت (یعنی قرآن اور وہ دانش جو اللہ نے رسولؐ کو عطا کی) بے شک اس سے قبل تو وہ بہت بڑی گمراہی میں مبتلا تھے“۔ (آلِ عمران۔۱۶۴)

اسی طرح سے سورۂ البقرہ کی آیات (۱۲۹، اور ۲۳۱) اور سورۃ النساء کی آیت (۱۱۳) واضح

طور پر اللہ تعالیٰ کی نعمت کتاب اور حکمت کا تذکرہ کرتی ہیں ان آیات کریمہ میں لفظ کتاب تو بغیر کسی تردد کے سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بالواسطہ الہامی ہدایت کی کتاب قرآن حکیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن لفظ حکمت کا مطلب وہ دانشمندانہ بصیرت وہدایت ہے جو رسول اللہؐ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بالواسطہ اور بلاواسطہ الہام کے ذریعہ عطا فرمائی جو قرآن کے علاوہ ہے اس بالواسطہ الہام کو جو قرآن کا حصہ نہیں ہے حدیث قدسی کہا جاتا ہے اور ایسا الہام جو رسول اللہؐ کو بلاواسطہ عطا ہوا وہ رسول اللہؐ کے اقوال یعنی حدیث اور ان کے اعمال وافعال یعنی آپ کی سنت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن، حدیث اور سنت رسول اللہؐ عین اللہ تعالیٰ کا حکم وہدایت سمجھے جائیں گے اور ان تمام احکامات کی تعمیل ہمارے لیے فرض عین کا درجہ رکھتی ہے۔

تاریخ ہمیں یہ یاد دلاتی ہے کہ جب بھی رسول اللہؐ یا ان کے جانشین یا وزرا نے، جب وہ حاکم بنے اور انہوں نے مملکت اسلامیہ کے دوردراز علاقوں میں ریاستی فرائض کی انجام دہی کے لیے منتظم، قاضی یا استادوں کا تقرر فرمایا تو انہیں یہ ہدایات دیں کہ ان کے لیے قرآن اور رسول اللہؐ کی سنت کی پیروی کرنا لازم ہوگا، خاص طور پر جبکہ وہ اپنی ذمہ داریاں سر انجام دے رہے ہوں گے۔

لہٰذا یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ رسول اللہؐ کی حیات مبارکہ کا ہمارے لیے جاننا اشد ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ہمارے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ ہم اپنی زندگی کو صحیح طور پر گذارنے کے لیے رسول اللہؐ کی زندگی سے استخراج واستنباط حاصل کر کے استفادہ حاصل کرسکیں۔ اس ضمن میں سورۃ الانعام کی آیت (۵۰) میں اللہ سبحانہٗ کا فرمان مبارک ہے کہ: ”کہو (اے محمدؐ) میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں کہتا ہوں کہ مجھے غائب کا علم ہے اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، میں تو بس اس بات کی پیروی کرتا ہوں جس کا مجھے الہام (کے ذریعے علم) ہوتا ہے، کہو: کیا اندھے اور دیکھنے والے ایک جیسا رکھتے ہیں (اس لیے) کیا تم غور نہیں کرو گے“۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ عوام الناس کو یہ بات یاد کرا دیں کہ انہیں صرف اتنا ہی علم حاصل ہے جتنا کہ اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرماتے ہیں یا عطا فرما چکے ہیں اور یہ کہ وہ لوگوں سے اپنی ذات کی طرف سے کچھ بھی نہیں کہتے۔ یعنی کہ وہ صرف

اللہ تعالیٰ کے فرامین کو ہی لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور یہ کہ وہ (محمدؐ) اللہ کے خالص بندے اور ایک انسان ہیں اور انسان کے سوا کوئی اور مخلوق نہیں ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ہی منتخب فرما کر پیغمبری کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز کیا ہے۔ اس طرح سے وہ عہدہ و مرتبہ کے اعتبار سے دیگر انسانوں سے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف سے خاص علم بذریعہ الہام عطا فرمایا ہے۔ تا کہ اس علم و دانش کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام اور ہدایت انسانوں میں عام کریں اور خود اس پیغام کا عملی نمونہ بن کر ان کے سامنے مشعل راہ بن جائیں۔

آیت مذکورہ بالا کے علاوہ سورۃ جمعہ کی آیت (۲) پھر اسی مضمون کی تائید کرتی ہے کہ ''یہ وہی (اللہ ہے) جس نے بھیجا اُن اَن پڑھ لوگوں میں سے ایک رسول جو اس کی (اللہ کی) آیات پڑھ کر سناتا ہے ان کو، اور پاکیزہ کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو، کتاب (قرآن) اور حکمت، اور بے شک وہ لوگ اس سے قبل کھلی گمراہی میں مبتلا تھے''۔

یہ آیت مبارکہ اس بات کی تصدیق بھی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ابراہیمؑ کی اس دعا کو بھی قبولیت عطا فرمائی جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ وہ مکہ کے لوگوں کے لیے انہی میں سے ایک رسول بھیجیں جو انہیں اللہ کے احکامات پڑھ کر سنائے، اور پاکیزہ کرے ان کو کتاب اور حکمت کے ذریعے سے۔ پس اللہ تعالیٰ نے جو ہر قسم کی تعریف کے لائق ہے اور سزاوار ہے اس امر کا کہ ہر طرح سے اور ہر حال میں اس کا شکر ادا کیا جائے، جس نے اس عہد جہالت میں علم و دانش کی روشنی پھیلانے کے لیے اپنے رسول کو بھیجا۔ بیشک وہی وقت تھا جب اہل زمین کو رشد و ہدایت کی بے انتہا ضرورت تھی۔ کیونکہ بیشتر لوگ الہامی تعلیمات کو بھلا چکے تھے۔ صرف معدودے چند لوگ باقی تھے، جنہوں نے توریت اور انجیل کی صحیح تعلیمات کو محفوظ رکھا ہوا تھا۔ اہل عرب نے شروع شروع میں تو دین ابراہیمی پر عمل جاری رکھا، لیکن بعد ازاں میں کفر و شرک کو شامل کر کے اصل مذہب الہامی سے دور ہو گئے اور بت پرستی کے دور میں داخل ہو گئے۔ اس طرح سے اہل عرب اور یہود و نصاریٰ نے اللہ کے ادیان سے منہ موڑ کر ایسے مذہب کو اختیار کیا جو اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند و ناگوار تھا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے روگردانی کر کے شرک میں مبتلا ہوئے۔

پس اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمدؐ کو بھیجا ایک مکمل دین یعنی ضابطہ حیات کے ساتھ۔

جو تمام غلط اور ناپسندیدہ افعال اور قوانین کی نفی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی منشا و مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے قوانین کا نصاب تھا، اور رسول اللہؐ نے ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کر کے، بہترین نمونہ اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ تا کہ رہتی دنیا تک اولادِ آدم ایسی ہی زندگی کو اختیار کر کے ابدی مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور یہی انسان کا مقصد حیات بھی ہے۔ اگر اس امر کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ انسان کی تمام تر زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اور اسی خوشنودی کی بنا پر انسان واپس جنت میں اپنے مقام کو حاصل کر پائے گا جہاں سے اس کے جد امجد جناب آدمؑ اور حواؑ زمین پر آزمائش کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ لہٰذا اپنے مالک و خالق کو راضی کرنا ہی زندگی کی کامیابی کا بہترین نسخہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر محمدؐ کی ذات گرامی میں پچھلے تمام انبیاء کی صفات سے لے کر رہتی دنیا تک کے کامیاب انسان کی خوبیاں سمو دیں۔ تا کہ ان کا اسوۂ حسنہ رہتی دنیا تک قابل عمل رہ سکے۔ اور یہ کہ کسی شخص کو کہنے کا موقع نہ مل سکے کہ ان نبیؐ سے پہلے کے اصول اچھے تھے یا یہ کہ ان کے بتائے اصول ان کے بعد کے زمانہ میں قابل عمل نہیں رہے۔ رسول اللہؐ کے کردار کے بارے میں ارشاد باری (آیت ۴ سورۃ القلم میں) ہوا ہے کہ ''بے شک تم (اے محمدؐ) کردار کے اعلیٰ نمونہ پر فائز ہو''۔

اس ضمن میں امام مسلمؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کے راوی حضرت قتادہؓ ہیں کہ سعد بن ہشام نے محترمہ عائشہؓ سے عرض کیا کہ رسول اللہؐ کا کردار کیسا تھا؟ انہوں نے جواب دیا ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا''۔ سعدؓ نے کہا بے شک پڑھا۔ پھر ام المومنین بی بی عائشہؓ نے فرمایا ''بے شک اللہ کے رسولؐ کا کردار قرآن کے عین مطابق تھا''۔

اسکا مطلب یہ ہوا کہ آپؐ نے عین قرآن کی حکمت اور حکم کے مطابق اور اس کے علاوہ جو حکمت و دانش اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کی تھی، اس کے مطابق اپنی زندگی گزاری اور دوسروں کو اسی حکمت کے تحت احکامات صادر فرمائے اور دروس دیے۔

قرآن و حکمت نے رسول اللہؐ کو جو بصیرت عطا کی اس کی وجہ سے جناب رسول اللہؐ نے اپنی خواہشات کی نفی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مکمل بندگی و اطاعت اختیار کی۔ جس بات کے کرنے کا حکم ملا وہ انہوں نے کیا اور جس کو چھوڑنے کا حکم ملا وہ چھوڑ دیا۔ اس طرح سے اللہ

تعالیٰ نے آپؐ کو کردار کی پاکیزگی عطا فرمائی اور انسانیت کی اعلیٰ ترین خصوصیات عطا فرمائیں۔ مثال کے طور پر پاکدامنی، طہارت، صلہ رحمی، شائستگی، بہادری اور معاف کرنے کی قوت وغیرہ۔

امام بخاریؒ و مسلمؒ کی روایت ہیں کہ انسؓ نے فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ کی خدمت گزاری میں دس برس گزار دیے لیکن آپؐ نے مجھے کبھی "اف" تک نہ کہا، نہ کبھی آپؐ نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کوئی کام کیوں نہیں کیا یا کیوں کیا ہے؟ آپؐ کا کردار بہترین درجے کا تھا۔ اور میں نے کسی ریشم یا کسی اور شے کو رسول اللہؐ کی ہتھیلی سے زیادہ ملائم نہیں پایا اور نہ ہی میں نے کسی مشک یا خوشبو کو سونگھا جس کی خوشبو رسول اللہؐ کے پسینہ سے بہتر ہو"۔ (اللہ کی رحمتیں، برکتیں اور سلام ہو ان نبی پر)۔

اس کے علاوہ امام بخاریؒ نے البراؓ کی روایت سے قلمبند کیا ہے کہ "رسول اللہؐ کا چہرہ مبارک سب سے زیادہ خوبصورت اور آپؐ کا اخلاق سب سے اعلیٰ تھا وہ نہ تو زیادہ لمبے قد کے تھے اور نہ ہی چھوٹے"۔

امام احمدؒ نے حضرت عائشہؓ کی روایت قلمبند کی ہے کہ "رسول اللہؐ نے نہ تو کبھی کسی ملازم کو اپنے ہاتھ سے سرزنش کی اور نہ ہی کسی خاتون کو۔ بلکہ آپؐ نے کبھی بھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا نہ ہی گزند پہنچائی۔ سوائے اس موقع پر جبکہ آپؐ اللہ کی خاطر لڑ رہے ہوں۔ آپؐ کو جب بھی اپنے لیے کسی دو چیزوں میں سے ایک کے انتخاب کا موقع ملا تو آپؐ نے اپنے لیے ہمیشہ معتدل راہ پسند فرمایا، وہ ہمیشہ گناہ آلودہ کاموں سے بہت دور رہتے۔ انہوں نے کبھی کسی سے ان کے خلاف کیے گئے کام کا بدلہ نہیں لیا سوائے اس وقت جبکہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی حدود کو پار نہیں کیا گیا۔

(۵) قبل از اسلام مذاہب عالم کے بنیادی اصول

(الف) مذہب:

مذہب بنیادی طور پر ہر دور میں اور ہر قوم میں یا معاشرہ میں ایک ضرورت کے طور پر قائم رہا ہے۔ حالانکہ اس کی تشریح اہل دانش اپنے اپنے ادوار کے اعتبار سے کرتے رہے لیکن عام طور پر یہ نظریہ متفق طور پر قابل قبول رہا ہے کہ مذہب زندگی گذارنے کے بنیادی اصول فراہم

کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور یہ کہ مذہب زندگی کے بنیادی مقصد کا تعین بھی کرتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہر مذہب نے زندگی کے مقاصد اور اصولوں کو اپنے اپنے دور میں اپنی عقل کے مطابق بیان کیا۔ اس کے علاوہ انسان میں ہمیشہ سے یہ جستجو پائی گئی ہے کہ وہ اپنے خالق کے متعلق معلومات حاصل کرے اور اس کو اپنے مقدر سنوارنے کا ایک ذریعہ سمجھ کر اس کو راضی کرنے کی کوشش کرے۔ انسان کو یہ بھی پتا چل گیا کہ اس کا خالق زماں و مکاں اور وقت کی اکائیوں سے ماورا ہے۔ جب کچھ اہل دانش نے کسی خالق و مالک کی حقیقت سے انکار کر کے اسے نیچر کا نام دیا تو ایک جرمن فلسفی امینول کانٹ نے یہ دلیل دے کر نوع آدم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمارا ایک خالق و مالک پر یقین رکھنا صرف اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہماری اخلاقی اقدار قائم رہیں۔ یعنی کوئی ہستی ہم سے حساب لینے والی ہو کہ کیا ہم نے اپنی زندگی اخلاقی قواعد و ضوابط کے مطابق گزاری یا نہیں۔ کیونکہ کسی بھی معاشرے میں اخلاقی اقدار کا فقدان معاشرتی بے راہ روی اور فساد کا سبب بنتا ہے۔

(ب) مذہب کی خصوصیات:

مختلف مذاہب نے مختلف قسم کے تصورات کو مذہبی لوازمات کے طور پر جنم دیا یعنی مذہبی رسومات اور مذہبی کتابی نسخوں میں مذہبی دیوتاؤں کے قصے کہانیاں اور ان پر مبنی رواج اور ایسے نقوش جو دیوتاؤں سے منسلک کیے گئے، اور ان کو مقدس جان لیا گیا۔ یہاں پر یہ بات ذکر کرنا ضروری ہے کہ ایسے ہی نقوش بعد ازاں بتوں کے روپ میں ڈھال دیے گئے۔ اس کے سب سے زیادہ ذمہ دار وہ مذہبی پیشوا تھے جنہوں نے یہ تمام گمراہیاں پھیلائیں اور جن کا مقصود یہ تھا کہ ان کی ذات مذہب میں ایک بہت بڑا مقام رکھتی ہے اور وہی انسانوں کو ان کے مالک اور خالق کی خوشنودی و رضا حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ آپ اگر غور فرمائیں تو اس قدر سے شاید ہی کوئی مذہب بچ سکا ہو، ہر ذی شعور انسان اس کو سمجھ سکتا ہے۔

(i) مذہبی رسومات

تاریخ ہمیں چار طرح کی مذہبی رسومات بتلاتی ہے

(ا) سالانہ معاشرتی میلے اور تہوار:

کچھ رسومات سال میں ایک مقررہ تاریخ یا دن اور سال کے کسی خاص موسم کے لحاظ سے

دہرائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر فصلوں کی کٹائی کے موقع پر، سال کے شروع ہونے پر، موسم بہار کے شروع ہونے پر، رسومات کا ادا کرنا، مثلاً ایران میں نوروز کا منانا، ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں فصلوں کی کٹائی پر خوشی کا اظہار کرنا، جیسے ہولی اور بسنت کا منانا وغیرہ۔ قل مغرب میں شکر ادا کرنے کا دن، نئے سال کے آغاز پر خوشی کا اظہار وغیرہ وغیرہ۔

(۲) سالانہ مذہبی تہوار:

اس طرح کے تہوار مذہبی رنگ لیے ہوئے کسی خاص موقع کی یاد میں وقت مقررہ پر منعقد کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کرسمس، ایسٹر، عاشورہ محرم، عیدین، حج وغیرہ۔

(۳) انسانی زندگی کے متعلق تہوار

اس طرح کے تہوار سماجی ہوتے ہیں اور ان کا تعلق اور محور انسان کی اپنی زندگی ہوتے ہے۔ اس موقع کے اعتبار سے سماجی طور پر خوشی یا غم کا اظہار کیا جاتا ہے، مثلاً انسانی پیدائش کے موقع یا اس سے قبل یا بعد کی رسومات جس میں اجتماعی خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ پھر شادی بیاہ کے موقع پر مختلف رسومات اور اجتماعی رسومات کا ادا کرنا اور پھر موت کے موقع پر میت کو آخری مقام تک پہنچانے کی رسومات اور اجتماعی غم کا اظہار کرنا وغیرہ۔

(۴) بحران کے موقع پر خاص دعائیں:

کسی بھی معاشرہ میں جب کبھی کسی مصیبت، بحران یا قدرتی آفات کا ظہور ہوتا ہے تو اس بستی یا معاشرے کے لوگ اجتماعی دعائیں مانگتے ہیں تاکہ اس بستی یا شہر یا ملک کے لوگ ان آفات سے محفوظ رہ سکیں۔ قحط کے زمانہ میں یا خشک سالی کے موقع پر بارش کی دعا، آندھی طوفان کے موقع پر دعائیں، دشمن کی یلغار پر اجتماعی دعائیں وغیرہ وغیرہ۔

(ii) ماورائی علوم کے قصے

پچھلے زمانے کی کہانیاں اور قصے جس کا تعلق تخلیق کائنات یا ارض و سما اور ان سے متعلق مخلوق اور خالق کے رشتوں کو ظاہر کرنا مقصود ہو۔ ان میں خالق کائنات اور اسی ضمن میں مختلف دیوتاؤں یا دیویوں کی کہانیاں جن کے سپرد خالق کائنات نے بہت سے کام سونپے ہوں، ان کے متعلق کہانیاں اور انسانوں کی صورت میں اعلیٰ ترین انسان کا تصور۔ ایسے ہی تصور کو فلسفیوں اور شاعروں نے بھی پیش کیا، ایسے قصے کہانیاں اور تصورات کی تقسیم تین حصوں میں کی گئی ہے۔

(۱) کائناتی تصورات:

اس طرح کے حصوں میں ایسے تصورات پیش کیے گئے ہیں جن میں کائنات، زمین اور آسمان کی تخلیق کے متعلق عقائد پیش کیے گئے ہیں اور اس میں ارتقا کی منظر کشی کی گئی ہے۔

(۲) سماجی و اخلاقی تصورات:

ایسی کہانیاں سماجی و اخلاقی تصورات پیش کر کے عوام الناس میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرتی ہیں تاکہ معاشرہ سماجی طور پر خوشگوار تعلقات کی طرف راغب ہو سکے۔

(۳) تاریخی قصے:

ان کہانیوں میں ہر قوم، نسل، ملک اور معاشرے کے اعتبار سے قصے و کہانیاں وجود میں لا کر نسل در نسل منتقل کیا گیا تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اجداد کو پیار اور بہت سی خوبیوں سے مالا سمجھ کر ان کی تقلید کریں اور اپنے لیے فخر کا ذریعہ بنائیں۔ ایسے قصے یہ بھی بتاتے ہیں کہ مختلف نسلیں زمین کے مختلف علاقوں میں کیونکر آباد ہوئیں اور وہاں ان کی کیا حیثیت تھی۔

(iii) پیشہ ور مذہبی سواعظ

معاشرے کا ایسا طبقہ جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ عوام الناس کا ربط مالک کائنات سے استوار کرنے میں مدد دیتا ہے اور عوام الناس کے لیے مالک کائنات کی خوشنودی کا باعث بنتا ہے۔ یہ لوگ روحانی علاج معالجہ بھی کرتے ہیں، اور ارواح اور ماورائی طاقتوں سے تعلق بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیوی اور دیوتاؤں کو خوش رکھنے کا طریقہ ان کے بقول ان کو آتا ہے۔ ایسے لوگوں میں صحیح اور غلط دونوں طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں مثال کے طور پر پیغمبر، اولیاء، مرشد، پیر، پادری، پجاری، راہب، پنڈت، ربائی (یہودی پادری)، اُتسی (جادو کے ذریعہ عمل کرنے والا)، بھنت، ٹوٹکہ وغیرہ وغیرہ۔

ان لوگوں میں سے صرف پیغمبر ہی ایسے حضرات ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص علم کے لیے منتخب فرماتا ہے اور انہیں یہ علم بالواسطہ اور بلاواسطہ الہام کے ذریعہ عطا فرماتا ہے۔ جبکہ دوسرے حضرات اپنے ادراک کے ذریعہ سے ہی علم کی اعلیٰ منزل تک پہنچتے ہیں۔ ایسے لوگ ادراک کی منزلیں مختلف قسم کی مشقوں اور ریاضتوں کے ذریعہ سے وجدانی کیفیت پر پہنچ کر حاصل کرتے ہیں اور اس سے مقصود کے مطابق استنباط حاصل کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو پا لیتے ہیں۔

(۲) طلوعِ اسلام کے وقت عرب کے علاوہ تمدن

(الف) اہلِ روم:

طلوعِ اسلام کے وقت یعنی چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی تک سلطنتِ روما تقریباً تمام یورپی ممالک بشمول ترکی، شام اور مصر تک پھیل چکی تھی۔ اور پھر اس میں طاقت کی تقسیم اس طرح سے ہوئی کہ رومی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی یعنی مغربی روم اور مشرقی روم۔ ابتدائی طور پر رومن یونانی (mythology) دیوتاؤں کے مذہب پر ہی یقین رکھتے تھے۔ یہ لوگ سات سیاروں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اور قطب شمالی کی طرف منہ کر کے عبادت کیا کرتے تھے انہوں نے ہی دمشق میں ایک ایسا گرجا گھر بنایا تھا جس میں اس کا محراب شمال کی جانب تھا اہلِ روم اس یونانی مذہب کے تقریباً 300 عیسوی تک پیروکار رہے۔

اہلِ روم کی مشرقی سلطنت رومن نہیں بلکہ بازنطینی سلطنت کہلاتی تھی، لیکن اس کے عوام بدستور اپنے آپ کو رومن ہی کہلواتے تھے۔ مشرقی روم اور مصر، شام تک پھیلا ہوا تھا، جبکہ موجودہ عراق اہلِ فارس کی سلطنت کے ساتھ منسلک تھا۔ اس مملکت کا بادشاہ قیصر روم (Caesar) کہلاتا تھا۔ ان بادشاہوں میں سے پہلا بادشاہ جس نے عیسائی مذہب اختیار کیا تھا اس کا نام کنسٹنٹائن تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے دل سے عیسائی مذہب قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے زمانہ میں مذہبی اختلافات نے شدت اختیار کر لی تھی اور بااختیار اہلِ روم کسی مصالحت پر نہیں پہنچ سکے، جس کے نتیجہ میں (۳۱۸) عیسائی مذہبی رہبروں کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں انہوں نے متفقہ طور پر بنیادی حقائق کو طے کر کے قلمبند کیا اور کنسٹنٹائن کو پیش کیا۔ ان متفقہ اصولوں کو بہت سراہا گیا اور اس دستاویز کو نہایت قابلِ بھروسہ قرار دیا گیا۔ جبکہ دوسری طرف حقیقت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اس دستاویز کی بنیاد دین کے ساتھ ایک بہت بڑی غداری کے مترادف ہے، کیونکہ اس دستاویز میں ان عیسائی علماء نے جائز و ناجائز ہونے یا نہ ہونے کے قوانین کا مجموعہ پیش کیا تھا اور ان قوانین کو طے کرنے میں انہوں نے مسیحی مذہب کو اپنی خواہشوں کے مطابق تبدیل کر دیا۔ کچھ اصول جو دین میں نہیں تھے انہوں نے شامل کر لیے اور کچھ اصول دین سے خارج کر دیے۔ انہوں نے بیت المقدس کے

بجائے مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کرنا شروع کر دیا اور سابتھ (Sabbath) یعنی ہفتہ کے دن کی عبادات کو تبدیل کر کے اتوار کا دن منتخب کر لیا۔ انہوں نے صلیب کی پرستش شروع کر دی اور خنزیر کھانے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے مذہب میں نئی نئی رسومات کو داخل کر لیا۔ مثلاً صلیب کے میلے، رومن چرچ میں عبادات کے نئے طریقے مثلاً (Baptism) قلبی صفائی کی رسم، پوپ کو گرجا گھروں کا سربراہ مقرر کرنا یعنی (Patriarch) اور اسے مقدس باپ کے نام سے پکارا جانے لگا (Revered Father)۔ گرجوں میں مذہبی افسروں کا تقرر یعنی Priests، Deacons اور Bishops وغیرہ۔ کنسٹنٹائن نے اپنے نام سے ایک شہر آباد کیا جس کا نام Constantinople یعنی قسطنطنیہ رکھا، جو موجودہ استنبول ہے۔ اس نے گرجا گھروں کی تعمیر بڑے ذوق وشوق سے کروائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے تقریباً بارہ ہزار گرجے تعمیر کرائے۔

اس طرح سے جب مسیحی مذہب کی تشکیل نو مسیحی علماء نے اپنی مرضی سے کر لی تو اس کے بعد مسیحیت میں فرقہ بندی کی ابتدا ہوئی۔ ابن کثیرؒ کے مطابق رسول اللہ کا فرمان ہے کہ "مسیحی ۷۲ (بہتر) فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے"۔

مزید براں شاہ روم نے گرجا گھروں پر دولت کثیر خرچ کر کے ان کے بنائے ہوئے قوانین اپنی گرفت میں لے لیے اور ساتھ ہی مذہب پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے یونانی فلسفے کے مذہبی عقائد کا دروازہ بند کر دیا۔ نتیجتاً چرچ کے نافذ کردہ قوانین جو کفر و الحاد پر مبنی تھے فروغ پا گئے۔

روم کے آخری قیصر (Caesar) کا نام Heracles ہرکلس (۶۱۰–۶۴۱ عیسوی) تھا جو بہت چالاک حکمران تھا اور اس وجہ سے ۶۱۰ عیسوی سے ۶۴۱ عیسوی تک عنانِ حکومت پر قابض رہا۔ قیصر روم کو ہمیشہ فارس کے بادشاہ جو (Chosroes) کسریٰ کہلاتا تھا، کے خلاف دفاعی حکمت اختیار رکھنی پڑتی تھی۔ یہ دونوں اس وقت کی سب سے بڑی اور طاقتور حکومتیں یعنی بڑی طاقتیں تھیں اور ان کی آپس میں ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔

(ب) اہلِ فارس:

اہلِ روم کے بعد اہلِ فارس دنیا کی بڑی طاقت شمار ہوتی تھی اور یہ دونوں طاقتیں آپس میں برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ فارس کا بادشاہ کسریٰ جس کا نام سپور ذوالاکتاف تھا، اس کی حکومت

میں عراق، خراسان اور موجودہ ایران کا تمام علاقہ شامل تھا۔ اہل فارس کا مذہب (Zoroastrian) یعنی زرتشت تھا۔ بنیادی طور پر ان کے ہاں صرف ایک ہی خدا کا تصور تھا لیکن بعد میں وہ اپنے اصلی مذہب سے ہٹ کر آتش پرست بن گئے۔ اس کی وجہ شائد یہ تھی کہ انہوں نے آگ کو سب سے زیادہ طاقتور سمجھ کر خدا کی ذات کا رُتبہ جانا اور یوں شرک و کفر میں مبتلا ہو گئے۔

زرتشت کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ شائد وہ اللہ کا پیغمبر ہو کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا درس دیا۔ لیکن یہ بات دعوٰی کے ساتھ نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس بات کی تصدیق اللہ اور اس کے رسولؐ کے ذریعہ سے نہیں ہوئی۔ زرتشت کا زمانہ ایران میں، گوتم بدھ کا زمانہ ہندوستان میں اور کنفیوشس کا زمانہ چین میں تقریباً ایک ہی ہے اور یہ زمانہ پانچویں اور چھٹی صدی قبل از مسیح کا زمانہ ہے۔

چھٹی صدی میں سیستانی بادشاہ (Chosraes 590-628 AD) خسرو نے مشرقِ قریب کے علاقہ پر حکمرانی کی اور اس کے لیے اس کی مدد بازنطینی فوجوں نے بھی کی۔ بازنطینیوں کی اندرونی خلفشاری کی وجہ سے خسرو کو یہ موقع ملا اور اس نے یروشلم اور الیگزینڈریا پر قبضہ کر لیا اور دوسری طرف وہ قسطنطنیہ کے نزدیک پہنچ گیا، لیکن ہرکولیس نے اہل فارس کو شکست دے دی، جبکہ سیستانیوں کی حکمرانی مسلمانوں کے طاقتور ہونے پر ختم ہو گئی۔

(ج) اہل چین:

۵۸۱ عیسوی میں یانگ جیان (Yang Jian) (متوفی ۶۰۴ء) سوئی (Sui) کے شاہی خاندان کی بنیاد رکھتے ہوئے چین کا حکمران بنا۔ اس کی اولاد میں سے ٹینگ (Tang) چین میں ایک مرکزی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس خاندان کا دورِ حکومت ۶۱۸ عیسوی سے لے کر ۹۰۷ تک رہا۔ اس دور میں سائنسی طور پر چین میں کافی ترقی ہوئی۔ بین الاقوامی تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور بدھ مت جس کا آغاز ہندوستان کے شمالی علاقہ سے ہوا تھا، چین تک پھیلتا چلا گیا۔ اس دور میں ذرائع آمد و رفت کو سڑکوں اور پانی کے راستوں کے ذریعہ بہت فروغ ملا، خاص طور پر شاہراہ ریشم جو واحد بین الاقوامی سڑک تھی اس کے ذریعہ تجارت کو ترقی ملی۔ آج کل یہ سڑک پاکستان اور چین کے درمیان ایک شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی راستے سے بین

الاقوامی تجارتی و معاشرتی وفود چین جاتے تھے، جو چین کے لیے مالی اور سماجی اعتبار سے فائدہ مند ثابت ہوئے۔ اس دور کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے اور یہ قوی گمان کیا جاسکتا ہے کہ جب کسی قوم میں مذہبی اور معاشرتی طور پر غرور و تکبر کے عنصر کو فروغ نہ ملے تو اس قوم میں محبت اور بھائی چارے کی فضا پھیلنے میں زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑتی۔ اسی لیے بدھ مت کی بنیاد چونکہ انکساری اور عاجزی پر رکھی گئی تھی، لہٰذا اہل چین پر ترقی کے دروازے کھل گئے۔

(i) کنفیوشیزم (Confucianism)

کنفیوشس ۵۵۱ قبل مسیح میں پیدا ہوا، اس کی تعلیمات چین کے بعد کوریا اور جاپان تک پہنچیں۔ اس کی اخلاقی تعلیمات میں چند مذہبی اصول اور رسومات، سماجی تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے طور طریقے، محبت کی بنیاد پر حکمرانی کرنے کی بنیاد، معاشی استحکام، سچائی اور دیانتداری، ایک دوسرے پر بھروسہ اور دیانت سے وفاداری کے اصول شامل تھے۔

(ii) ٹاؤازم یا ڈاؤازم (Taoism or Daoism)

اس مذہب کی بنیاد لاؤتزے (Lao-Tse ۶۰۴-۵۳۱ قبل مسیح) نے رکھی جو گوتم بدھ اور کنفیوشس کا ہمعصر تھا۔ وہ اس بات کا متمنی تھا کہ کسی طرح سے جاگیرداروں کی مسلسل رسہ کشی سے چھٹکارہ پا کر یا کسی طرح سے بچ کر معاشرے کو امن و سکون کا گہوارہ بنایا جا سکے۔ اس کے پیروکاروں نے اس کے نظریہ کی بنیاد ۲۰۰ قبل از مسیح میں رکھی اور اس کی کامیابی کی جدوجہد میں لگ گئے۔ اہل چین میں یہ نظریہ بدھ مت اور کنفیوزم کے ساتھ ساتھ مقبول عام ہوا۔

(د) تہذیب ہند:

(i) ہندومت (Hinduism)

ہندومت چونکہ کوئی باقاعدہ ضابطہ حیات پیش نہیں کرتا چنانچہ اسے دین کا درجہ حاصل نہیں بلکہ یہ دیوتاؤں اور دیویوں پر مبنی عقائد کا ایک مجموعہ ہے اور نہ ہی اس کا کوئی بانی ہے، جس سے اس کا کوئی مذہبی دھارا نکلتا ہو۔ یوں کہنا حق بجانب ہوگا کہ یہ مذہبی عقائد، رسم و رواج کا ایک مجموعہ ہے گو کہ ان کے ہاں ایک اعلیٰ ترین حاکمیت یعنی خدا کا تصور بھی موجود ہے۔ لیکن انہوں نے اس کے اختیارات کی تقسیم کر رکھی ہے اور ہر اختیاری طاقت کو دیوتا یا دیوی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور اس طرح سے خدا کی حاکمیت کی تقسیم کر کے اس کے بے شمار شریک طاقت بنا

رکھتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندومت میں خدا کی حاکمیت کی یہ تقسیم یہانی نظریہ کے عین مطابق ہے اور مصنف کا خیال ہے کہ یہ انہی کی تہذیب و تمدن کے زیر اثر ہندوستان تک پہنچی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ممکنات میں سے ہے کہ یہودیوں کے بارہ قبیلوں میں سے ایک گم گشتہ قبیلہ ہندوستان میں آباد ہو گیا ہو، کیونکہ ان کے نشانات ہمیں ہندومت میں ملتے ہیں اور اس کی چیدہ چیدہ مثالیں ہمارے گمان کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ اس بارے میں مصنف کا خیال یہ ہے کہ یہودی گروہ ہندوستان میں سمندری راستے سے جنوبی ہند کی مشرقی بندرگاہ مدراس کے مقام تک پہنچا اور وہاں انہوں نے اپنے مرکز کی بنیاد ایک مدرسے کی صورت میں رکھی۔ کیونکہ یہودی اپنے مدرسہ یا اسکول کو 'مدراس' کہتے ہیں چنانچہ گمان یہ ہے کہ اس پورے علاقے یا شہر یا بستی کا نام مدراس کے نام سے لیا جانے لگا۔ دوسری بات یہ کہ مدراس، جس کا نام پرانے زمانہ میں چینائی تھا اور وہ علاقہ چند چھوٹے دیہاتوں کا مجموعہ تھا اور کپڑا بنانے کی گھریلو صنعت کا مشہور مرکز بن کے سامنے آیا، جبکہ وہ چیک کپڑا ابھی مدراس کہلاتا تھا۔ یہ بھی گمان ہے کہ کپڑا بنانے کے کاریگر بھی اسی یہودی قبیلہ کے ساتھ اس جگہ وارد ہوئے ہوں۔ علاوہ ازیں تامل ناڈو کا یہ علاقہ یعنی چینائی یا مدراس کی بندرگاہ اقوام عالم کی آمدگاہ بھی رہی، مثال کے طور پر ۱۵۲۲ عیسوی میں پرتگیزی وہاں آئے اور وہاں ایک بندرگاہ تعمیر کی، اس کے بعد ۱۶۱۲ عیسوی میں فرانسیسی بھی وہاں اپنی کالونی بنانے کی غرض سے آئے اور پھر ۱۶۳۹ عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے وہاں اپنا ڈیرہ جمایا۔ ایک اور بات قابل غور ہے کہ ۵۲ سے ۷۲ عیسویں تک جناب عیسیٰؑ کا ایک حواری سینٹ تھومس اس جگہ عیسائیت کی تبلیغ کی غرض سے قیام پذیر رہا۔ اس لیے یہ گمان قوی ہو جاتا ہے کہ قبل از مسیح یہودیوں کا وہ گم گشتہ قبیلہ جسے Lost Tribe کہا جاتا ہے وہ یہاں آ کے آباد ہو گیا ہو اور پھر اسی تہذیب میں گم ہو گیا ہو لیکن اپنی برتری کے ساتھ۔ قوی خیال یہ ہے کہ گورے رنگ کے پنڈت جنہوں نے ہندوستان کے لوگوں پر مذہبی حکمرانی کی، اسی قبیلے کے لوگ تھے۔

ایک اور بات قابل غور ہے کہ امریکہ کی ریاست اوریگن کی جیفرسن کاؤنٹی میں ایک چھوٹا سا شہر مدراس نامی ہے۔ جہاں یہودیوں کا اثر و رسوخ کافی ہے اور بیشتر وہی لوگ وہاں آباد ہیں، یہ شہر صرف پانچ ہزار کی آبادی پر مشتمل ہے۔ 1903ء عیسویں میں اس کی بنیاد رکھی گئی، گویا پہلی

جنگ عظیم سے کچھ پہلے۔ اس شہر کی تاریخ بھی ہندوستان کے شہر 'مدراس' سے اس طرح مماثلت رکھتی ہے کہ اس بستی کا نام 1903ء میں (مدراس) کپڑا بنانے کی مناسبت سے رکھا گیا۔ اس کو شہر کا درجہ 1914 میں ملا گو کہ ابھی تک آبادی کے اعتبار سے یہ ایک چھوٹا سا دیہات ہی ہے۔

ہندوؤں کا بنیادی سماجی ڈھانچہ انسانوں میں ذات پات کی تقسیم کے ذریعہ سے رکھا گیا، بنیادی طور پر وہ چار ذاتوں میں منقسم ہیں۔ (۱) مذہبی اور حکمران جماعت یعنی پنڈت (۲) تاجر جن کے قبضے میں معیشت کے تمام اسباب تھے (۳) جنگجو یعنی ملک کی حفاظت پر معمور بہاری کے نام پر اپنی جان دینے والے اور (۴) شودر یعنی کمترین لوگ جنہیں کمی یا کمین یعنی حقیر اور معمولی سمجھا اور کہا جاتا تھا۔ تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ دراصل یہی لوگ اصلی ہندوستانی تھے۔ جن کو دراوڑ کے نام سے تاریخ میں جانا جاتا ہے اور بیرونی اقوام نے آ کر ان کو اپنا غلام بنا لیا۔ ان لوگوں کے ذمہ دیگر تمام طبقات کی خدمت کرنا تھا اور ان کے ساتھ دیگر طبقات غلاموں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتے تھے۔ سرکاری طور پر اس کمترین جماعت کا اختتام 1948ء میں ہوا جب ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا، لیکن ابھی تک ان لوگوں کو معاشرے میں قابل احترام مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ اس طرح سے ہندوستانی معاشرہ معاشرتی ناانصافی اور ظلم پر مبنی تھا۔ سب سے زیادہ ذلیل رسم اس ناانصاف معاشرے میں "ستی" کے نام سے موجود تھی، جس میں ایک بیوہ عورت کو اپنے مردہ خاوند کے ساتھ آگ میں زندہ جلنا پڑتا تھا۔ اس ظالمانہ رسم کو برطانوی حکومت نے سرکاری طور پر بیسویں صدی کے اوائل میں ختم کیا لیکن معاشرے کے کچھ لوگ اب بھی اس رسم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یہ لوگ دیوی دیوتاؤں کے اصنام کے علاوہ جانوروں کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ ان میں ہاتھی، بندر اور سانپ وغیرہ شامل ہیں گائے ان کے لیے ایک مقدس مخلوق کا درجہ رکھتی ہے اور خاص طور پر گائے کے لیے ان کا پیار و محبت اور اس کی تقدیس بالکل ایسی ہی ہے جیسا کہ یہودیوں میں تھی۔ اس کے علاوہ ہندوؤں میں چلے یا چالیسویں کا تصور جس میں وہ چالیس روز تک خلوت میں رہ کر اپنے کسی خاص مقصد کو پانے کے لیے خصوصی عبادات کرتے ہیں اور اس کے علاوہ چالیس روز بعد کی رسومات وغیرہ بھی یہودیوں سے اخذ کی گئی معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے چالیس روز کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے گزارے تھے۔ علاوہ ازیں مو

یہی تصور ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی آیا۔ تیسری بات ہندوؤں کا اپنے سر پر چھوٹی سی بودی یعنی اپنے تمام بالوں کو منڈوا کر درمیان میں ایک چھوٹی سی پونی ٹیل بنا لینا بھی یہودیوں سے اخذ شدہ ہے کیونکہ یہ طریقہ کار کسی اور قوم میں نہیں پایا جاتا۔

بہرحال ہندو تہذیب مختلف عقائد، رسم و رواج، دیوی اور دیوتاؤں کی پرستش اور ذات پات پر مبنی معاشرتی تقسیم ایک عام طبقے کو اپنے ظلم میں جکڑے رکھنے کا نام معلوم ہوتا ہے۔

(ii) جین مت Jainism

ہندو اور بدھ مت کے ساتھ ساتھ جین مت بھی ہندوستان کا ایک مذہب رہا ہے اس مذہب کا بانی مہاویر تھا جو ۵۹۹ قبل مسیح پیدا ہوا۔ وہ تیرہ برس تک رہبانیت کے ساتھ گزارنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچا اور پھر اس کے بعد سلیکھنا کا عمل کیا۔ یعنی تا دم مرگ روزہ رکھ لیا اور اس طرح سے دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس نے جو کچھ نصیحت اپنے پیروکاروں کو کی وہ بدھ مت اور ہندو مت سے کچھ مختلف نہ تھی۔

(iii) بدھ مت

بدھ مت کا بانی سدھارتا گوتما تھا جو نیپال کی مملکت کا شہزادہ تھا اور ۵۶۳ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کے مذہب کا محور رحم تھا کیونکہ وہ عام لوگوں کی، حتیٰ کہ جانوروں کی، مصیبتوں اور بیماریوں کو اور موت کی تلخیوں کو دیکھ کر پژمردہ رہتا اور خود کو اور دیگر انسانوں کو اس صدمہ سے بچانے کا مداوہ ڈھونڈتا رہا کہ کیونکر انسان اس تکلیف دہ زندگی سے بچ کر ابدی آرام حاصل کر سکے۔ سو اسی سوچ و بچار کے سلسلہ میں اس نے کئی برس تک جنگل کی تنہائی میں اعتکاف کیا اور پھر محبت و امن کا درس دیا۔ لیکن اس کے مذہب میں خدا کے تصور کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی، یوں کہنا بہتر ہوگا کہ اس نے سماجی خوشگواری کے لیے اخلاقی اصول وضع کیے اور معاشرے کو محبت اور بھائی چارے کی تلقین کی۔

ان کے لیے نجات کا محور نروانہ ہے یعنی وہ شخص جو اپنی خواہشات پر قابو پا لے گا وہ نروانہ یعنی سکون حاصل کر لے گا اور دیگر یہ کہ ان کے مطابق انسان کو زندگی کے بہت سے ادوار سے گزرنا پڑے گا۔ یعنی کئی دفعہ اسے زندگی اور موت کے دوراہے پر آنا پڑے گا حتیٰ کہ وہ نروانہ حاصل کر لے۔

ہندوستان کے عام لوگوں نے جو زیادہ تر ذات پات کی چکی میں پس رہے تھے اور ایک ذلیل زندگی بسر کر رہے تھے، انہوں نے بہت اعتقاد کے ساتھ اس مذہب کو اختیار کیا حتیٰ کہ یہ مذہب چین، جاپان اور مشرق بعید تک پھیل گیا اور ابھی تک قائم ہے۔

(۷) خطہ عرب میں طلوع اسلام کے وقت کا تمدن

(الف) ریگستانی تہذیب:

(i) اہل ثمود

یہ لوگ ثمود بن آثر بن ارم بن سام بن نوحؑ کی اولاد میں سے تھے۔ یہ قبیلہ مدینہ اور تبوک کے درمیان وادی القراء کے نزدیک الحجر کے مقام پر آباد تھا۔ ان کے مکانات پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بنائے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم میں اپنا ایک پیغمبر بھیجا جس نے اس قوم کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا کہ وہ شرک چھوڑ کر واحد لاشریک کے تابع ہو جائیں اور صرف اسی کی عبادت کریں اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کریں۔

لیکن اس قوم کی بدبختی کہ انہوں نے کہا "اے صالحؑ! اب تک تم ہم میں ایک اچھے انسان بن کر رہ رہے تھے، کیا اب تم ہمیں ان کی پرستش سے منع کرتے ہو جنہیں ہمارے اجداد پوجتے تھے ہمیں اس چیز پر شک ہے جس کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو"۔ (آیہ ۶۲ سورۃ ہود)

اس بارے میں امام ابن کثیرؒ نے سورۃ نمل کی آیات ۴۹-۵۰ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل ثمود کے نو بدبختوں نے اس اونٹنی کو قتل کر دیا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی کے طور پر ایک پہاڑ سے ظاہر کیا تھا اور پھر اس کے بعد انہوں نے حضرت صالحؑ کو قتل کرنے کا منصوبہ بھی بنایا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے منصوبے کو ناکام کرنے کی غرض سے اور ان کو سزا دینے کے لیے ان پر پتھروں کی بارش کر دی۔ اس طرح سے تمام قبیلے کے سامنے ان لوگوں کے سر پاش پاش ہو گئے لیکن پھر بھی اس نادان قبیلے کے باقی ماندہ لوگوں نے نشان عبرت نہ پکڑا لہٰذا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کی نذر ہو گئے اور ان پر یہ عذاب ایک زوردار بجلی کی کڑک کے ذریعہ آیا۔

امام احمدؒ کے مطابق ابن عمرؓ نے فرمایا کہ جب رسول اللہؐ اپنے رفقاء کے ساتھ جنگ تبوک

کے موقع پر الحجر کے علاقے سے گذر رہے تھے تو آپؐ نے اہل ثمود کی آبادی کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اس دوران کچھ صحابہ ثمود کے کنوؤں سے پانی لائے اور اس سے آٹا گوندھا۔ جب رسولؐ اللہ کو اس بات کا پتا چلا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ آٹا اونٹوں کے آگے ڈال دیا جائے۔ پھر اس علاقے سے کوچ کا حکم فرمایا اور اس کے بعد آپؐ نے اصحاب کو نصیحت فرمائی کہ وہ کبھی بھی ایسے علاقے میں نہ جائیں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا عذاب نازل فرمایا ہو اور مزید یہ کہ مجھے خوف آتا ہے کہ کہیں تم پر بھی وہی عذاب نہ نازل ہو جائے۔

(ii) اہل عاد

یہ لوگ عاد بن ارم بن اوس بن سام بن نوحؑ کی اولاد میں سے تھے اور یمن کے علاقے احقاف (ریت کے ڈھیر) میں رہتے تھے۔ محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ ابو طفیل عامر بن واثلہ نے کہا کہ اس نے علیؓ بن ابی طالب سے سنا ہے کہ جب وہ حضرموت کے ایک شخص سے کہہ رہے تھے کہ کیا اس نے سرخ ریت کا ایک ٹیلہ اومان اور حضرموت کے درمیان جہاں درختوں کا ایک جھنڈ ہے، دیکھا ہے؟ اس شخص نے جب ہاں میں جواب دیا، تب علیؓ نے فرمایا کہ وہاں پر اللہ کے پیغمبر ہودؑ کی قبر تھی۔ ہودؑ اہل عاد کی طرف بھیجے گئے تھے کہ ان کو نصیحت کریں کہ وہ شرک چھوڑتے ہوئے بتوں کی پرستش سے باز آجائیں اور اللہ کے حکم کے تابع ہو جائیں۔ لیکن اہل عاد نے ان کی دعوت حق کو ٹھکراتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا بالکل اسی طرح جس طرح اہل قریش نے محمد رسول اللہؐ کے حکم سے انکار کیا تھا۔ اہل عاد جسامت کے اعتبار سے بہت مضبوط اور دل کے سخت اور متکبر لوگ تھے، اس لیے اپنے انکار پر ڈٹے رہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی جوہری طاقت سے آلودہ ہوا کا جھکڑ چلایا کہ وہ سارے کے سارے تباہ ہو گئے، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے اپنے پیغمبر ہودؑ کو ان کے ساتھیوں سمیت بچا لیا۔

(iii) اہل عرب

جزیرہ نما عرب کو انسانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ علاقہ یا تو پانی کی موجودگی کا مظہر ہے یا پانی سے بالکل محروم۔ کیونکہ اس کے تین اطراف پانی ہی پانی یعنی سمندر اور درمیان میں لق و دق صحرا اور لاوے کے بنے ہوئے کنکر دار پتھر اور کہیں کہیں نخلستان۔

قدرتی طور پر جزیرہ نما عرب دو حصوں میں منقسم ہے یعنی شمالی اور جنوبی۔ جنوبی حصہ جس میں یمن کا علاقہ شامل ہے مسلسل بارش کے سبب زرعی اعتبار سے مالا مال جو کثیر شہری آبادی کا سبب تھا۔ اس کے برعکس شمالی علاقہ کا شمار دنیا کے بڑے ریگستانی علاقوں میں ہوتا ہے۔ جہاں خشک سالی گرمی اور ریت کے علاوہ کہیں کہیں چند نخلستانوں کا وجود تھا۔ لہٰذا اس کی آبادی خانہ بدوش بدوؤں پر مشتمل تھی۔ وہ جہاں بھی پانی پاتے وہیں براجمان ہو جاتے۔ اس طرح اس صحرا میں عرب قوم چھوٹے چھوٹے قبیلوں پر مشتمل تھی اور کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے شہر آباد تھے۔ شمالی عرب کے لوگ عرب کہلاتے تھے اور جنوبی حصے کے لوگ صبائی (Sabaens) کہلاتے تھے۔ شمالی عرب میں قبائل کی اپنی اپنی حکومت ان کے سرداروں کی صورت میں تھی اور ان کے رسم و رواج ہی ان کے قوانین تھے اور وہ کسی بھی مرکزی طاقت کے ماتحت نہیں تھے۔ اس کے برعکس جنوبی عرب میں شہری حکومتیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چھوٹی چھوٹی ریاستی حکومتیں جن کے سربراہ مذہبی پیشوا یا بادشاہ ہوتے جو مکارب Mukaribs کہلاتے تھے۔

ان ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور ریاست صبا تھی جس کا اثر و رسوخ تمام جنوبی عرب پر تھا۔ اس ریاست کی ایک ملکہ کا ذکر ملکہ صبا کے نام سے قرآن میں بھی آتا ہے جس کے پاس حضرت سلیمانؑ نے پیغام حق بھیجا تھا۔ جب یہ ریاست بے نظمی کا شکار ہوئی تو سن ۵۲۰ عیسوی میں عیسائی ریاست ایتھوپیا کے زیر اثر آ گئی۔

شمالی اور جنوبی عرب کے مکین، گو کہ ایک ہی قبیلہ کی نسل تھے لیکن ان کی تہذیب و تمدن اور ثقافت میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ جیسا فرق عام طور سے بڑے شہر اور دیہات میں رہنے والے ایک ہی خاندان کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ جنوبی عرب میں زرعی پیداوار کی کثرت کی وجہ سے تجارتی منڈیوں نے جنم لیا اور پانی کی جگہ پر شہر وجود میں آئے اور لوگوں نے مستقل رہائش اختیار کر لی اور پھر نسل در نسل ایک ہی جگہ رہنا شروع کر دیا۔ لیکن اس کے برعکس بدو قبیلے پانی کی تلاش میں اپنے اپنے جانوروں کے ریوڑوں کے ساتھ نقل مکانی اختیار کرتے رہتے۔

طلوع اسلام کے وقت عرب کے شہر معاشی طور پر اس وقت کی دو بڑی پڑوسی مملکتوں کے دست نگر رہتے تھے۔ اس وقت دنیا کی دو بڑی ترقی یافتہ طاقتیں فارس اور روم کی سلطنتیں تھیں۔ اہل عرب انہی مملکتوں کے سونے اور چاندی کے سکے اپنے استعمال میں رکھتے تھے اور ان سے

اپنے تجارتی تعلقات بھی استوار رکھے تھے۔ جنوب میں اہل صبا سے بھی ان کے تجارتی تعلقات تھے لیکن سیاسی اور انتظامی معاملات میں یہ خود مختار تھے۔ زبان اور رسم و رواج کے اعتبار سے بھی خود کفیل تھے بلکہ زبان کے اعتبار سے ان کی زبان اور ان کی یادداشت بہت اعلیٰ وسعت کا درجہ رکھتی تھی۔ اس وقت یہودیت اور عیسائیت بھی عرب میں پھیل رہی تھی۔ خاص طور پر عرب کا مشہور شہر یثرب (مدینہ) یہودی بستیوں سے گھرا ہوا تھا۔ جبکہ جنوب میں نجران اور یمن پر عیسائی قابض تھے۔ لیکن دنیا کا قدیم ترین شہر مکہ اہل عرب کے بدوؤں کی آماجگاہ تھی، اور ان کے تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ مکہ ان کا بہت بڑا فوجی اور تجارتی مرکز بھی تھا۔ تقریباً ۵۰۰ عیسوی میں قریش خاندان مکہ پر قابض ہو گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ شہر مکہ پہلے ہی سے ایک بہت بڑے مذہبی مرکز کا درجہ رکھتا تھا اور یہ درجہ اس شہر کو کعبہ کی مذہبی حیثیت کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ مزید یہ کہ اس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ کے ذریعہ ہوئی تھی اور اہل عرب انہی کی اولاد اور انہی کے دین پر تھے۔ اور اسی وقت سے عربی زبان ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی اعلیٰ درجہ پر فائز ہوئی۔ چنانچہ عرب لوگ شاعری کے ماہر تھے اپنے حسب و نسب اور تاریخ کو شعروں میں کہتے اور اسے نسل در نسل یاد رکھتے۔ ان کا حافظہ ان کے لیے عطیہ خداوندی تھا۔

(iv) مذاہب

قبل از اسلام عرب بدوؤں کے مذہب اور رسم و رواج میں مشرکانہ عقائد و رسومات کے علاوہ یہودی اور عیسائیوں کے رسم و رواج بھی شامل تھے۔ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ خطہ عرب میں مذہب کے اعتبار سے یہودی، عیسائی، صبائی، مشرکین اور حنفیہ عقائد کے لوگ موجود تھے۔

(۱) حنفیہ: حنفیہ وہ لوگ تھے جو کردار کے اعتبار سے بہت اچھے تھے لیکن کسی خاص مذہب کی پیروی نہیں کرتے تھے، لیکن وہ ہمیشہ سے راہ حق کی تلاش میں رہے۔ ہر چند کہ وہ اس وقت کی معاشرتی برائیوں سے دور تھے اور نہ ہی اصنام کی پرستش میں ملوث تھے ایسے حضرات میں سب سے بڑی مثال تو خود رسول اکرمؐ کی ذات گرامی ہے پھر ان کے والدین، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ۔ بنیادی طور پر وہ حضرت ابراہیمؑ کے مذہب کے ہی پیروکار تھے لیکن ان کے پاس اس مذہب کی تفصیلات دستیاب نہ تھیں۔

(۲) مشرکین: عرب کے بدو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے پیروکار تھے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ اصل مذہب کے بنیادی اصولوں سے ہٹتے چلے گئے۔ سب سے بڑھ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات واحدہ کے ساتھ شرک شروع کر دیا اور یونانی اور ہندوستانی عقائد کے مطابق دیوی اور دیوتاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ قبل از اسلام ان میں تین دیویاں لات، عزیٰ اور منات کے نام سے مشہور تھیں انہیں (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو قرآن میں مشرکین کے نام سے پکارا ہے۔

تاریخ بتلاتی ہے کہ اہل عرب تیسری صدی عیسوی تک یعنی اولاد اسماعیلؑ میں سے لوئے (Luayy b. AD 274) کے زمانہ تک ابراہیمؑ کے دین پر قائم رہے لیکن لوئے کے بیٹے عمر نے عرب میں بت پرستی کی ابتدا کی، چونکہ اس وقت دین ابراہیمی کی گرفت ان لوگوں پر ڈھیلی ہو چکی تھی۔ جب عمر ایک مرتبہ ملک شام کے دورے پر تھا جہاں اس نے لوگوں کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا، پس شیطان نے اس پر بھی وار کیا اور وہ اس مشرکانہ فعل سے متاثر ہو کر اپنے ساتھ ہبل (Hibble) نامی ایک بت لے آیا۔ یوں اصنام پرستی کا دور اہل عرب میں شروع ہوا اور آہستہ آہستہ ہر قبیلہ نے اپنے اپنے لیے علیحدہ علیحدہ صنم منتخب کر لیے۔ خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے بتوں کی پوجا کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی اپنا مالک جانا، فرق صرف یہ تھا کہ انہوں نے ان بے شمار بتوں کو اللہ تعالیٰ کا کسی نہ کسی طرح سے شریک ٹھہرا لیا اور دین خالص سے باہر ہو گئے اور مشرک کہلائے۔

(۳) صابئین (Sabaens): معلوم ہوتا ہے کہ لفظ صابئین کا تعلق لفظ صبا یا صابی سے ہے۔ صابی کا لفظی ترجمہ ایسا شخص ہے جو اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لفظ صابی یا صبائی لفظ صبا سے متعلق ہو۔ کیونکہ یمن کی ایک بہت مضبوط حکومت ریاست صبا کی تھی۔ قرآن میں بھی ریاست صبا کا ذکر ملکہ صبا کے حوالے سے آیا ہے اس وقت صبا کی ملکہ بلقیس (Sheba) تھی جو اپنی قوم کے ساتھ صبح و شام کے وقت سورج کی پرستش کرتی۔ یہ لوگ ستاروں اور فرشتوں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ بہرحال یہ لوگ جو حضرت سلیمانؑ کے ایما پر راست پر تو آ گئے تھے، لیکن اس کے باقیات ابھی تک ان میں موجود تھے جو طلوع اسلام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے مٹ گئے۔

(۴) اہلِ یہود: یہودی قوم یہوداہ یا یہوذا یا جوذی جو یعقوبؑ کا بڑا بیٹا تھا، اس کی نسل میں سے ہیں۔ لفظ "یہود" کا مطلب ہے کہ ایسا شخص جو اپنے گناہوں سے توبہ کر کے صحیح راستے پر گامزن ہو جائے۔ یہودی بنیادی طور پر موسیٰؑ کے پیروکار ہیں جن کا زمانہ تیرھویں صدی قبل مسیح کا زمانہ تھا۔ موسیٰؑ کی قوم فرعون مصر کے غلاموں میں سے تھی۔ جنہوں نے موسیٰؑ کی پیروی کر کے فرعون مصر سے آزادی حاصل کی۔ موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے بہت چہیتے پیغمبر تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے الہامی احکامات اور ہدایات تورات کے ذریعہ نازل فرمائے۔ تورات یہودی قوم کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات لائی اور وہی ضابطہ آگے چل کر عیسائیوں کے لیے بھی نافذ العمل رہا۔ لیکن بعد ازاں یہودی عالموں نے اس الہامی کتاب میں اپنی مرضی سے تبدیلیاں کیں اور ساتھ ہی موسیٰؑ کے احکامات کو بھی تبدیل کیا، انہوں نے کچھ قانونی کو غیر قانونی اور کچھ غیر قانونی کو قانونی حیثیت دے دی۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اپنے ایک پیغمبر عزیرؑ (Ezra) جو تقریباً ۴۰۰ قبل مسیح میں آئے ان کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا۔ اس معاملہ میں قرآن کی سورۃ توبہ کی آیت ۳۰ اور ۳۱ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "اور یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ صرف ان کا ہی قول ہے اور ان لوگوں سے ملتا جلتا ہے جو ان سے پہلے (اللہ کے احکامات) سے انکار کرتے تھے۔ اللہ ان لوگوں سے لڑے گا (یعنی ان کو سزا دے گا) کیونکر انہوں نے دوسروں کو دھوکہ دیا اور سچ بات سے پھر گئے۔ انہوں (یہودی اور عیسائی) نے اپنے عالموں اور پادریوں کو یعنی اپنے علماء کو اپنے اللہ کے سوا اپنا آقا بنا لیا (یعنی ان کی اطاعت کی اللہ کے احکامات چھوڑ کر) اور انہوں نے (اپنا آقا تسلیم کیا) مسیح بن مریم کو بھی جبکہ ان کے پاس کھلا حکم تھا (تورات اور انجیل میں) کہ وہ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کسی اور کی پرستش نہ کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہی ہیں تمام تعریفیں اور اس کے شایان شان نہیں کہ اس کا کوئی شریک ہو جیسا کہ وہ ٹھہراتے ہیں"۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہودی بنیادی طور پر اللہ وحدہٗ لاشریک کی ذات پر ہی ایمان رکھتے ہیں، یہ لوگ جن کا قرآن میں ذکر ہے، وہ اب کھلے عام شرک نہیں کرتے بلکہ وہ بہت کم رہ گئے ہیں اور ان کے مذہبی ادب میں اس عقیدہ کا ذکر نہیں ملتا۔ چنانچہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عیسائیوں کی نسبت، جن کا بنیادی مذہبی فلسفہ ہی شرک پر قائم ہے، یہودی قوم کی ایک کثیر

تعداد شرک نہیں کرتی، گو کہ وہ دوسری بہت ساری گمراہیوں میں مبتلا ہے۔ ان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا پیغمبر ماننے سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ ان کو قتل کرنے کی بہت گھناؤنی سازش کی۔ اس کے علاوہ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ یثرب کی بستی میں اللہ کے آخری پیغمبر کا نزول ہونے والا ہے اور اپنے اسی علم کی بنا پر انہوں نے شہر یثرب کے اردگرد کی زمین خرید کر وہاں اپنی مستقل بستیاں قائم کر لی تھیں۔ لیکن ان کی توقع کے مطابق نبی آخر الزماںؐ اہلِ اسحاقؑ میں سے نہیں بلکہ اہلِ اسمٰعیلؑ سے پیدا ہوئے۔ چنانچہ یثرب کے یہودی حسد کی آگ میں سوزاں ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی دشمنی میں اس قدر آگے نکل گئے کہ آپؐ کے قتل پر اسی طرح آمادہ ہو گئے، جس طرح انہوں نے عیسیٰؑ کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ تین مرتبہ قتل کے منصوبے اور ایک دفعہ جادو کے وار سے انہوں نے اپنے حسد کی پیاس بجھائی لیکن آخری مرتبہ ان کی طرف سے دی گئی زہر کا اثر تادم آخر رسول اللہؐ کو محسوس ہوتا رہا۔ لہٰذا انہوں نے خود ہی اللہ تعالیٰ کے پیارے انبیاء کے قتل میں ملوث ہو کر اللہ تعالیٰ کی ناراضی کو دعوت دی اور راندۂ درگاہ ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے اپنی بدبختی کو گلے لگایا۔

(۵) مسیحی یا نصاریٰ: عیسیٰؑ ابن مریم (۴ قبل مسیح تا ۳۰ عیسوی) کے پیروکار عیسائی کہلاتے ہیں۔ یہ قوم نصرانی بھی کہلائی کیونکہ یہ ایک دوسرے کے مددگار تھے اور اب بھی ہیں، علاوہ ازیں وہ عیسیٰؑ کے بھی مددگار تھے، اس یہودی گروہ کے مقابلے میں جنہوں نے عیسیٰؑ کی مخالفت کی۔ اس کے علاوہ عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کی رہائش نصران یا نصیرہ یا ناصرت میں تھی، اور لفظ نصرانی اسی کا ماخذ ہے۔

عیسیٰؑ یا کرائسٹ یا مسیح کو اللہ تعالیٰ نے مریمؑ کے بطن سے بغیر باپ کے تولد فرمایا اور انہوں نے تمام زندگی بغیر شوہر کے پاک دامنی کے ساتھ گزاری۔ وہ بے شک اللہ تعالیٰ کی پیاری اور برگزیدہ خاتون تھیں۔ لیکن برعکس اس سچائی کے یہودیوں نے مریمؑ کی پاکدامنی پر شک کرتے ہوئے ان پر الزام لگایا اور اس بات کو تسلیم نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بغیر شوہر کے بیٹا عطا فرمایا ہے۔ قرآن حکیم حضرت عیسیٰؑ کی اس معجزانہ ولادت کا ذکر اور اہمیت بیان کرتا ہے اور ان کی والدہ کی پاکدامنی کی گواہی دیتا ہے کہ انہوں نے بیشک عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے پیدا کیا جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے آدمؑ کو بغیر کسی ماں باپ کے گیلی مٹی سے پیدا فرمایا۔ یہ اللہ

تعالیٰ کی شان اور قدرت ہے کہ جو چاہے، جیسے چاہے تخلیق فرمائے۔

جناب عیسیٰ کے متعلق درج ذیل قرآنی آیات مبارکہ قابل غور ہیں۔

ا) جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بیشک اللہ کی طرف سے تمہارے لیے خوشخبری ہے ایک کلمہ کی (کہ "ہو جا" اور وہ تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا "کن" (ہو جا) اور وہ ہو گیا) اور اس کا نام ہوگا مسیح عیسیٰ بن مریم، عزت فرمائی گئی جس کی اس دنیا میں اور آخرت میں بھی اور وہ ان میں سے ایک ہوگا جو اللہ کے قریب ہیں"۔ (آیت ۴۵ سورۃ آل عمران)

ب) "بے شک عیسیٰ کی مماثلت ہے اللہ کے نزدیک آدم جیسی، اس (اللہ) نے آدم کو مٹی کے گارے سے بنایا اور پھر اس سے کہا "کن" (ہو جاؤ) اور وہ ہو گیا اور یہی سچائی ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ پس پھر ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو شک میں پڑ گئے"۔ (آیت ۵۹-۶۰، سورۃ آل عمران)

ج) اور وہ (یہودی کے) کہتے ہیں (تحریر) کہ ہم نے عیسیٰ کو قتل کیا، جو مریم کا بیٹا اور اللہ کا پیغمبر تھا لیکن انہوں نے اُسے (عیسیٰ) قتل نہیں کیا اور نہ ہی سولی چڑھایا، بلکہ عیسیٰ جیسا ہی ایک اور شخص بنا دیا گیا (جس کو انہوں نے قتل کیا) اور جو اس بات سے متفق نہیں وہ شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کو (صحیح) علم نہیں اور وہ محض گمان میں ہیں۔ یقیناً انہوں نے اسے (عیسیٰ) قتل نہیں کیا۔ (آیت ۱۵۷، سورۃ النساء)

د) لیکن اللہ نے اُسے (مسیح) اٹھا لیا اپنے پاس اور اللہ ہر شے پر قادر ہے اور تمام تر دانش مند۔ (آیت ۱۵۸ سورۃ النساء)

ہ) "مسیح اس بات پر بالکل فخر نہیں کرے گا کہ وہ اس بات سے انکار کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا غلام ہے اور نہ ہی وہ فرشتے جو (اللہ تعالیٰ) کے نزدیک ہیں اور جو کوئی بھی انکار کرتے ہیں اس کی (اللہ) عبادت سے اور غرور کرتے ہیں، پھر وہ (اللہ) ان کو جمع کرے گا اپنے پاس (روزِ قیامت سزا کے لیے)۔ (آیت ۱۷۲، سورۃ النساء)

و) "یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا، جو کہتے ہیں کہ اللہ مسیح ہے بیٹا مریم کا، حالانکہ مسیح نے خود کہا اے بنی اسرائیل اللہ کی پرستش کرو، جو میرا مالک ہے اور تمہارا بھی۔ بے شک جو کوئی بھی اللہ کے شریک ٹھہراتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت کو حرام قرار دے دیا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ

ٹھہرا دیا اور ایسے ظالموں (گنہگاروں) کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ (آیت ۷۲ سورۃ المائدہ)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابھی تک عیسائیوں میں صرف ایک ایسا فرقہ موجود ہے جو اللہ کے شریک نہیں ٹھہراتا اور اللہ کو واحد لاشریک مانتا ہے۔ لیکن یہ لوگ آٹے میں نمک کے مانند ہیں۔ یہ فرقہ Unitarian کہلاتا ہے یعنی وحدانیت کا ماننے والا۔

(۸) بدوؤں کی خصوصیات

عرب کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ جہاں گھاس ہوگا وہاں بدو ہوں گے یعنی لق و دق صحرا میں جہاں جہاں نخلستان تھے وہیں وہیں بدوؤں کا ڈیرہ تھا۔ اس طرح سے پانی کی تلاش میں ان کی زندگی خانہ بدوشی کی حالت میں گزرتی تھی۔ ایک بدو خاندان کی جائیداد، ایک خیمہ، ایک اونٹ اور ایک بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پر مشتمل ہوتی۔ ایک بدو خاندان کے لیے اونٹوں کی ملکیت اس کے مرتبے کو ظاہر کرتی۔ اونٹ کی خاص خصوصیات اور اہمیت کے اعتبار سے اس کو ریگستانی جہاز کہا جاتا اور خطہ عرب اونٹوں کی افزائش نسل کے لیے بہترین علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اونٹ اہل عرب کے لیے ایک بہت اچھے خادم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ اپنے جسم میں وافر پانی ذخیرہ کر سکے اور اس طرح سے بغیر کچھ کھائے پیئے کافی دنوں تک سفر کر سکے۔ اونٹ بہت صابر جانور ہے بالکل اسی طرح سے جس طرح ایک بدو۔ وہ بھی اونٹ کی طرح بھوکا رہ سکتا اور اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ اُسے روزانہ روٹی یا کھجوریں باقاعدگی سے ملیں۔ خاص طور پر جب ان اشیاء کا میسر ہونا مشکل ہو۔ وہ صرف اونٹ کے دودھ پر اپنی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے، کبھی کبھار جب انہیں میسر ہوتا تو اونٹ کا گوشت ان کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔

ایک بدو خاص طور پر مندرجہ ذیل تین خوبیوں کا مالک تھا:

۱۔ کسی مہمان کو کھانا کھلانا۔
۲۔ کسی مظلوم کو پناہ دینا۔
۳۔ اور اپنے قبیلے کے رسم ورواج کی تکریم کرنا۔

ان کے علاوہ درج ذیل خواص پر بھی وہ فخر کرتا تھا:

۱۔ بہادری

۲۔ اپنے قبیلے کا ساتھ دینے کے لیے دشمن سے لڑنا۔

۳۔ اور جنگ میں "مر جانے کی پروا نہ کرتے ہوئے دشمن کو مار دینے کی نیت سے لڑنا۔ بدوؤں کا یہ نظریہ "فنائے زندگی" بے شک اہل مغرب کے فلسفہ "وجودیت" یعنی زندگی کو قائم و دائم رکھنے کے نظریے کے بالکل برعکس تھا۔

بنیادی طور پر بدو جمہوریت پسند ہوتا ہے، کیونکہ وہ جمہوری معاشرہ میں جنم لیتا ہے اور اسی آزاد معاشرے میں پروان چڑھتا ہے۔ بدو اپنے سردار سے برابری کی سطح پر ملتے اور بات کرتے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ مہذب قوم سمجھتے تھے اور وہ قبائلی معاشرہ میں ایک دوسرے سے تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے تھے، انہیں کسی ایک قبیلے کا فرد یا حصہ ہونے پر فخر ہوتا تھا۔ انہیں اس حقیقت کا علم تھا کہ ایک بدو کی حیثیت اس کے قبیلے کے بغیر کچھ بھی نہیں، اگر وہ اپنے قبیلہ کو چھوڑ دیتا یا اسے قبیلے سے نکال دیا جاتا یا وہ اپنے قبیلے سے گم ہو کر علیحدہ ہو جاتا تو اسے اس بات کا خوب احساس رہتا کہ اب وہ محفوظ نہیں رہا۔ اب اسے کوئی بھی لوٹ سکتا ہے قتل کر سکتا ہے یا اسے اپنے قبضہ میں لے کر غلام کی حیثیت سے فروخت کر سکتا ہے۔ اس لیے ہر بدو کو اس بات کا احساس رہتا کہ وہ اپنے قبیلے سے کبھی علیحدہ نہ ہو جائے۔

ہر بدو عربی زبان میں ماہر لسانیات کا درجہ رکھتا، اپنی شاعری کے ذریعے اپنے رسم و رواج کو زندہ رکھنے والا اور اپنے قول کی حفاظت و پاسداری کرنے والا۔ وہ بے پناہ قوت حافظہ کا مالک تھا، وہ اپنی تاریخ اور اجداد کو اپنے اشعار کی مدد سے یاد رکھتا۔ وہ اپنے آباء کی محبت اور جنگ کے قصوں کو اپنی یادوں میں محفوظ رکھتا، وہ موت سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی موت کی منزل کو پہچان جاتا اور اپنے حواس کو قائم رکھتا، یہاں تک کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بلاتا اور ان سے کہتا کہ وہ اب رونا شروع کر دیں، کیونکہ اس کی موت کا وقت آن پہنچا ہے۔

ایک بدو شراب، عورت اور جوئے کا دلدادہ ہوتا، وہ جتنی چاہتا اتنی عورتوں سے شادی کر لیتا لیکن وہ ایک لڑکی کا باپ بننا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے چند بے رحم بدو اپنی بیٹیوں کو بچپن ہی میں قتل کر دیتے لیکن اس کے ساتھ ہی چند رحم دل بدو ایسی بچیوں کی زندگی بچانے کے لیے انہیں خرید بھی لیتے۔

انسانوں کو غلام بنا کر ان کی خرید و فروخت کرنا اور انہیں اسی حیثیت سے اپنے پاس رکھنا

عام تھا۔ غلاموں کے ساتھ عام طور پر اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ آقاؤں کو غلاموں پر مکمل دسترس حاصل تھی، حتیٰ کہ وہ انہیں قتل کرنے کا اختیار بھی رکھتے تھے۔ چونکہ ان میں سماجی اور اخلاقی قوانین کا فقدان تھا، لہٰذا ان میں بہت ساری برائیوں نے جنم لے لیا تھا، مثلاً چوری، ڈاکہ، لوٹ مار وغیرہ ان میں عام تھا۔ یہ لوگ چونکہ لق و دق صحرا اور پوشیدہ نخلستانوں میں رہتے تھے اس لیے کوئی بیرونی طاقت ان کو زیر کرنے کے لیے ہمت نہ کرتی اور یہ ان کی تنہائی پر مبنی زندگی ان میں آزادی اور برابری کا جذبہ قائم رکھے ہوئے تھی۔

(۹) عرب تہذیب و تمدن کا مرکز

کعبۃ المشریف کی وجہ سے شہر مکہ اہل عرب کی تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا۔ کیونکہ کعبۃ اللہ تمام اہل عرب کے لیے محترم اور مقدس تھا۔ قرآن میں اس شہر کو "بکہ" کے نام سے پکارا گیا ہے اور اسے "ام القراء" یعنی شہروں کی ماں اور "البلد الامین" یعنی امن کے شہر کا درجہ بھی دیا گیا۔ کعبۃ اللہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی عبادت کی غرض سے بنایا گیا پہلا گھر تھا، جسے ہمارے جد اعلیٰ آدمؑ نے تعمیر کیا تھا لیکن طوفان نوحؑ میں دنیا کی دوسری عمارتوں کے ساتھ یہ بھی تباہ ہو گیا اور پھر اس کے بعد اس گھر کی تعمیر نو ہوئی، حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے ہاتھوں۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ گھر حضرت اسماعیلؑ اور ابراہیمؑ کے پیروکاروں کے لیے حج اور عبادات کے لیے مرکز قرار رہا ہے۔

رفتہ رفتہ حج پر آنے والے قبائل کی وجہ سے یہ مقام ایک بہت بڑا تجارتی مرکز بننے کے بعد اہل عرب کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گیا اور اس شہر نے ایک ریاستی شہر یعنی City State کا درجہ حاصل کر لیا۔ کعبۃ اللہ بہر حال ایک وقف یعنی Trust کی حیثیت اختیار کر گیا اور اولاد اسماعیلؑ اس کے متولی یعنی Trustee تھے اور انہی میں سے اللہ کے آخری رسول جناب محمدؐ اس دنیا میں چھٹی صدی عیسوی میں تشریف لائے۔

(۱۰) ظہور نبی آخر الزماں و تکمیل ہدایت ربی

اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ اس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ وہ

انسانوں کے اعمال کا امتحان لے سکے یہ جاننے کے لیے کہ ان میں سے کس کس نے اپنے مالک کے احکامات اور ہدایات پر عمل درآمد کیا ہے۔ اللہ رحیم و کریم نے اس غرض سے اپنی مخلوقِ اعلیٰ پر وقتاً فوقتاً اور جگہ جگہ اپنے پیغمبر بھیجے تاکہ ان کے ذریعہ سے اپنے احکامات اور ہدایات انسانوں تک پہنچا سکے۔ چونکہ انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقا بتدریج ہوا اور اس کا انحصار انسانی ذہن کی نشو ونما پر تھا، لیکن مغرب میں انسانی ذہن کی بالیدگی پندرہویں صدی عیسوی میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے بعد غیر معمولی سبقت لے گئی اور اسی طرح سے صنعتی انقلاب اور تہذیب و تمدن کی تشکیلِ نو، جاگیرداروں اور مذہبی اجارہ داروں سے اختیارات اور طاقت کا عام لوگوں کی طرف منتقل ہونا، ان سب حالات نے عام انسانی اذہان کے قفل کھول دیے اور ان کو ذہنی جلا بخشی۔ بالآخر انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے دوران سائنسی ایجادات اور پھر خلا نوردی، کمپیوٹر کی ایجاد اور استعمال نے انسانی شعور کو بیدار کیا اور ترقی کی منزلیں بہت سرعت کے ساتھ طے کرائیں۔ حتیٰ کہ انسانی ذہن اپنے کمال کی حد تک پہنچ گیا۔ بیشک یہ تمام ترقی انسانیت کے عروج کا اظہار ہے۔

یقیناً انسانی ارتقا کی یہ منزلیں خالقِ کائنات کے پروگرام کا حصہ ہوں گی اور اسی ارتقا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے علوم ہدایت کا انتظام کیا ہوگا اور اس کی تکمیل کا پروگرام بھی پہلے سے طے شدہ ہوگا۔ لہٰذا جب ساتویں صدی عیسوی میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان صادر فرمایا کہ اس نے اپنی مخلوقِ اعلیٰ میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے اپنی طرف سے قوانین کی فراہمی کی تکمیل فرما دی اور اس وقت کے بعد انسان کے لیے الہامی علم کے دروازے بند کر دیے، لہٰذا اس کے بعد کسی نبی یا پیغمبر کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب یہ احکامات ساتویں صدی عیسوی میں جاری کیے گئے تھے تو بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے الہامی فرامین اور نبی کی حکمت، اس اکیسویں صدی اور اس کے بعد کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ انسانی ذہن کی بالیدگی اور الہامی علم کا ارتقا جس کے ذریعہ سے تہذیب و تمدن کا ارتقا اور نشو ونما ہوئی اس کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کا عرصہ لگا ہوگا، کیونکہ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ سے زیادہ الہامی منزلیں رکھیں اور ہر منزل کے لیے ایک نبی یا پیغمبر بھیجا۔

لہٰذا انسانی ارتقا کی طویل منزل طے کرنے کے بعد خالقِ کائنات نے اپنا آخری پیغام جس نے الہامی علم کی تکمیل بھی کر دی اور اس کے ساتھ ساتھ نبوت کے عمل کو کامل کر کے اس کے

آخری درجے پر بھی ٹھہرایا۔ یعنی محمد رسول اللہؐ کی نبوت ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کی تکمیل ہوئی، جو قیامت تک انسانیت کے لیے جاری و ساری رہے گی۔ اسی وجہ سے اس آخری الہامی کتاب میں معجزات کا سہارا نہیں بلکہ سائنسی اور منطقی قواعد و ضوابط کے مطابق استدلال کیا گیا تاکہ ہر دور کا انسان اس سے مستفید ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ آخری پیغام دنیا کی تقریباً ہر زبان میں مترجم ہو کر محفوظ ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں یہ دنیا کے لاکھوں انسانوں کے دلوں میں جوں کا توں سمایا ہوا بھی ہے۔ یہ پیغام آخر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمدؐ پر ۶۰۹ سے ۶۳۲ عیسوی کے تیئیس سالہ دور میں نازل فرمایا اور اس کے تمام اصول، قواعد و ضوابط آپؐ نے اپنی زندگی میں اپنے آپ پر جاری کیے اور آپؐ کے اصحاب نے ان کی پیروی کی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ اللہ تعالیٰ کے پچھلے احکامات جو انہوں نے موسیٰ اور عیسیٰ کے ذریعے لوگوں تک پہنچائے تھے، اپنی اصلی حالت میں نہیں رہے تھے۔ بجز اس کے کہ چند یہودی اور عیسائی ایسے تھے جو اپنے اصل مذہب کے پیروکار تھے، لہٰذا یہی مناسب وقت تھا کہ دینِ الٰہی کی تجدید کی جاتی تاکہ اس کی تصدیق کرنے والے بھی موجود ہوں اور دیگر بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح بھی ہو جائے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے اولادِ اسماعیل میں سے شہرِ مکہ کے ایک شخص کو منتخب کیا جو دنیا کے مرکز میں آباد تھا، کہ وہ اللہ کا آخری پیغام وصول کرے اور اسے دوسروں تک پہنچائے اور اپنے آپ کو ایک مثالی کامل انسان بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرے تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کو کس قسم کے لوگ پسند ہیں۔ اس لیے رہتی دنیا تک ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس پیغام پر توجہ دے۔ اس پیغام کو سمجھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس شخص کے کردار، طرزِ زندگی، ان کی ذاتی حیثیت، خاندانی رتبہ، ان کے اعمال و افکار کے متعلق اچھی طرح سے جان لیا جائے جس کے ذریعہ سے ہم اللہ تعالیٰ کا پیغام حاصل کریں گے اور اس شخص کی حکمت و افکار کو اپنی زندگی کا محور بنائیں گے تاکہ ہمیں اس پیغام سے جو ان سے ہم تک پہنچا ہے، سمجھنے میں اور اس پر عمل کرنے میں آسانی ہو۔

شاعرِ مشرق شیخ اقبالؒ نے اپنے والد کا ایک صوفیانہ نظریہ اپنی کتاب بالِ جبریل میں قلمبند کیا اور پھر اسے انہوں نے اپنی کتاب Reconstruction of Religious Thoughts in Islam میں بیان کیا ہے کہ:

"تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحبِ کشاف"

یعنی جب تک قرآن حکیم کی ایک ایک آیت تمہارے دل پرنازل نہ ہو جائے، اس وقت تک تم قرآن حکیم کی حقیقت اور نتائجات تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے کہنے کا مطلب ہے کہ قرآن مجید کی حکمت اور مقصد کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک کہ اس کا قاری اسے اس طرح نہ سمجھے، جیسا کہ اور جن حالات میں، وہ آیت رسول اکرمؐ پر آج، اس وقت یعنی قاری کے زمانہ میں نازل ہوئی ہوتی، جیسا کہ وہ آیت خاص حالات اور خاص وقت پر رسول اللہؐ پر نازل ہوئی تھی۔ اقبال کا مطلب دراصل یہ تھا کہ ہر قاری انفرادی طور پر اس لمحے کو ذہن نشین رکھتے ہوئے کہ جس میں رسول اللہؐ نے اس الہام کو وصول کیا، اس آیت کے مطلب و معنی کو قیاس کرے صرف اسی حالت میں وہ قرآن حکیم کے اصل مطلب، مقصد اور حکمت سے روشناس ہو سکے گا۔ لیکن حقیقتاً یہ قیاس آرائی ممکن ہی نہیں کیونکہ مذہبی تجربہ و تخیل، خاص طور پر وحی کے اعتبار سے جو رسول اللہؐ کو یعنی وحی وصول کرنے والے کو حاصل ہوا ہوگا، اس تجربے میں کسی دوسرے کا شریک ہونا ممکن نہیں۔ اس لیے ہمارے واسطے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم رسول اللہ کی اطاعت ان کے قول اور فعل کے ذریعہ سے کریں اور قرآن یا الہام کو اسی طرح سمجھنے کی کوشش کریں، جس طرح رسول اللہؐ نے ہمیں سکھلایا، یا اس آیت یا حکم کے مطابق اپنے افعال کو اور اپنے اقوال کو طالع کیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بار بار ہمیں یہ حکم دیا کہ "اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی"۔

(۱۱) محمد رسول اللہؐ کے اجداد اور گھرانہ

ابراہیم --- ان کے پہلے بیٹے اسحاقؑ کی مشہور اولاد

یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، یحییٰؑ، زکریاؑ، سلیمانؑ، عیسیٰ وغیرہؑ (یہ تمام پیغمبر تھے) اور ان کے علاوہ تمام معروف پیغمبر

دوسرے بیٹے اسماعیلؑ کی وہ اولاد جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے

عدنان (پیدائش ۱۲۲ قبل مسیح)، معد (پیدائش ۸۹ قبل مسیح)، نزار (پیدائش ۵۶ قبل مسیح)، مضر (پیدائش ۲۳ قبل مسیح)، الیاس (پیدائش ۱۰ عیسوی)، مدرکہ (پیدائش ۴۳ عیسوی)، خزیمہ

(پیدائش ۷۶ عیسوی)، کنانہ (پیدائش ۱۰۹ عیسوی)، نضر (پیدائش ۱۴۳ عیسوی)، مالک (پیدائش ۱۷۵ عیسوی)، فہر (پیدائش ۲۰۸ عیسوی)، (جد امجد قریش کا) غالب (پیدائش ۲۴۱ عیسوی)، لوئے (پیدائش ۲۷۴ عیسوی)

عدی (لوئے کا بیٹا اور کعب کا بھائی) اور (عمر بن خطابؓ کے جد امجد)

کعب (پیدائش ۳۰۷ عیسوی)، مرہ (پیدائش ۳۴۰ عیسوی)، (تیم بن مرہ جد امجد تھا ابو بکرؓ کا) کلاب (پیدائش ۳۷۳ عیسوی)، حکیم (جد امجد آمنہ کا)

حکیم بن کلاب --- زہرہ --- عبد مناف --- وہب --- آمنہ (رسول اللہؐ کی والدہ ماجدہ)

قصیٰ (۴۰۰ -- ۴۸۰ عیسوی)، عبد مناف (پیدائش ۴۳۰ عیسوی)، ہاشم (۴۶۴–۴۹۷)، عبدالمطلب (شیبہ) (۴۹۷–۵۷۹ عیسوی)، عبداللہ (۵۴۵ -- ۵۷۰) (رسول اللہؐ کے والد ماجد)

حضرت عبداللہ کے بھائی اور بہنیں (عبدالمطلب کی اولاد)

حارث --- زبیر --- ابولہب (عبد عزہ) --- حمزہؓ --- ابو طالب (عبد مناف) --- عباس --- حجل --- مقوم --- ضرار، اور

صفیہ۔ اُم حکیم۔ بیداء۔ عاتکہ۔ اُمیمہ۔ اروہ۔ برّہ (کل دس بھائی اور سات بہنیں)

ہاشم کے علاوہ عبد مناف کی دوسری اولاد

عبد شمس --- اُمیہ۔ حرب --- ابو سفیان۔ معاویہ۔ یزید (یزید ابو سفیان کا بیٹا بھی تھا اور پوتا بھی)

اُمیہ کی دوسری اولاد سے العاص --- عفان --- عثمانؓ

ابو طالب سے طالب --- عقیل --- جعفرؓ اور علیؓ۔ علی سے --- حسنؓ --- حسینؓ --- محسن

وہب کی بیٹی حضرت آمنہ اور عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ سے واحد اولاد جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور ان کی اولاد قاسم، عبداللہ (بچپن میں فوت ہوئے)، زینبؓ، رقیہؓ، اُم کلثومؓ اور فاطمہؓ یہ محترمہ خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن مبارک سے پیدا ہوئے۔ جبکہ ابراہیم (بچپن میں فوت ہوئے) کنیز ماریہ قبطیہؓ سے پیدا ہوئے۔ رسول اللہؐ کے صاحبزادے عبداللہ کو طاہر و طیب بھی کہہ کر پکارا گیا اور رسول اللہؐ نے اپنے صاحبزادے قاسم کی نسبت سے کنیت اختیار کر کے ابوالقاسم کہلوایا۔

عبدالمطلب کی اولاد میں سے رسول اللہؐ کے والد گرامی عبداللہ، ابو طالب، اور زبیرؓ اور ان

کی ہمشیرگان اُم حکیم، بیضاء، عاتکہ، آمنہ، اروی اور برہ وا ایک ہی والدہ فاطمہ بن امر میں سے تھے۔ جبکہ حمزہؓ، مقوم، حجل اور سیدہ صفیہؓ دوسری والدہ ہالہ بنت وھب میں سے تھے اور انہی کے بھائی عباسؓ اور ضرار تیسری والدہ نطلہ بنت خباب میں سے تھے۔ انہی کے اکلوتے بھائی حارث چوتھی والدہ سمرا بنت جندل میں سے تھے اور آخری بھائی ابولہب لبنہ بنت ہجر میں سے تھے۔

رسول اکرمؐ اور ان کے چچا حمزہؓ نے ایک خاتون ثویبہ کا دودھ پیا تھا جو ابولہب کی کنیز تھی (دونوں کی عمر تقریبا ایک جیسی تھی) اس طرح سے یہ دودھ شریک بھائی بھی ہو گئے۔

(۱۴) رسول اللہؐ کے چند مشہور اجداد

(الف) فہر بن مالک (قریش) [پیدائش ۲۰۸ عیسوی]:

جناب رسول اللہؐ کا شجرہ نسب نوحؑ تک اور پھر آدمؑ تک معلوم کر لیا گیا ہے۔ لیکن ہم یہاں پر ان کے جد قریش سے شروع کرتے ہیں جو قریش قبیلہ کے بانی تھے۔ ان کا نام فہر بن مالک اور لقب قریش تھا۔ انہی کی اولاد بعد میں قریش کہلائی۔ رسول اللہؐ کی پیدائش کے وقت قبل قریش مکہ کے معزز ترین لوگ تھے، ان لوگوں میں چند ان غیر معمولی خصوصیات تھیں، جن کی وجہ سے یہ مشہور ہو گئے تھے۔ یہ لوگ مدبرانہ فراست کے مالک، معتبر، سچے، بہادر اور عزت دار اور عقلمند تھے۔ عرب کے تمام دیگر قبائل قریش کی ان خوبیوں کو سراہتے تھے۔

(ب) قصیٰ بن کلاب [۴۰۰ — ۴۸۰ عیسوی]

قصیٰ اپنے وقت میں تمام عربوں میں نمایاں حیثیت کا مالک تھا اس نے قریش قبائل کو یکجا کیا اور پھر باقی قبائل کے ساتھ جنگ آزمائی کرنے کے بعد وہ مکہ کا حکمران بن گیا، وہ مندرجہ ذیل حیثیتوں کا مالک تھا

۱۔ کعبہ کا نگہبان اور سرپرست
۲۔ کعبہ کے حاجیوں کو پانی اور کھجوریں بہم پہنچانے والا
۳۔ ضرورت مند حاجیوں کی مدد کرنے والا
۴۔ شہری کونسل کا سربراہ

۵۔ سپہ سالار اعظم
۶۔ اپنے قبیلے کے جھنڈے کا رکھوالا

(ج) عبد مناف (مغیرہ) [پیدائش ۴۳۰ عیسوی]:

قصیٰ نے مکہ کے سربراہ کی اہم ذمہ داری اپنے بڑے بیٹے عبد دار کو اپنی زندگی میں ہی سونپ دی تھی۔ لیکن اس کی وفات کے بعد قریش کی سربراہی عبد مناف کے پاس آ گئی جو عبد دار کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس لیے کہ وہ زیادہ قابل تھا اور بیشتر لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ قصیٰ کی وفات کے بعد دونوں بھائی عبد دار اور عبد مناف مکہ کی سربراہی اور دیگر اہم مراتب حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہے اور بالآخر وہ درج ذیل معاہدہ پر راضی ہو گئے۔

۱۔ عبد مناف کی اولاد مندرجہ ذیل ذمہ داریوں کی حامل ہوئی۔
i۔ حاجیوں کی خدمت اور مدد کرنا
ii۔ قبیلہ قریش کے لوگوں سے سالانہ ٹیکس وصول کرنا
۲۔ عبد دار کی اولاد مندرجہ ذیل ذمہ داریوں کی حامل ہوئی
i۔ کعبہ کے متولی بننا
ii۔ قبیلہ کے پرچم بردار بننا
iii۔ سٹی کونسل یعنی دارالندوہ کے سربراہ کی ذمہ داری سنبھالنا

کچھ مورخ ان اس بات پر متفق ہیں کہ حاجیوں کی خدمت اور ٹیکس کی وصولی عبد شمس بن عبد مناف جو ہاشم کا بھائی تھا، اس کے ذمہ تھی۔ لیکن عبد شمس ان ذمہ داریوں سے اپنے بھائی ہاشم کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ لیکن عبد شمس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا امیہ اپنے چچا ہاشم سے حسد کرنے لگا، چونکہ ہاشم ان ذمہ داریوں کو نبھانے کی وجہ سے اہل عرب میں اور خاص کر قریش میں بہت با عزت مقام پا کر مقبول ہو گیا تھا۔ اس لیے امیہ نے وہ ذمہ داریاں حاصل کرنے کا حق جتلایا۔ لیکن وہ اس دعویٰ میں ناکام ثابت ہوا، بلکہ دارالندوہ نے اسے دس برس کے لیے جلاوطن کر دیا۔ گمان قوی ہے کہ یہی وجہ بنیادی طور پر امیہ خاندان اور ہاشمی خاندان کی دشمنی کا سبب بنی جو امیہ اور ہاشم کے بعد نسل در نسل چلتی رہی اور اسکا اظہار عملی طور پر حرب کی دشمنی عبد المطلب سے، ابوسفیان کی دشمنی جناب محمدؐ رسول اللہ سے، معاویہ کی دشمنی علیؓ سے اور یزید کی دشمنی حسینؓ بن علیؓ سے ہوا۔

امیہ خاندان کو جب ان کا من پسند مقام نہ ملا تو انہوں نے تجارت کے شعبہ میں محنت کی اور دولت سے مالا مال ہو کر دولتمندی میں اپنا مقام بنایا۔

(و) ہاشم (امر) [۴۶۴-۴۹۷ عیسوی]:

عبد مناف کے ایک بیٹے کی حیثیت سے ہاشم کے ذمے اپنے دادا قصی کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری حصے میں آئی اور وہ ذمہ داری حاجیوں کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے کی تھی، جبکہ بقیہ ذمہ داریاں عبد دار اور عبد مناف کے دوسرے بیٹوں کے ذمہ آئیں۔ ہاشم ایک متمول، دانشمند، دیانتدار اور سخی شخص تھا، ان کا نام امر تھا لیکن وہ اہل عرب میں حاجیوں کو عمدہ کھانا کھلانے کی وجہ سے ہاشم کہلائے۔ اس وقت اہل عرب میں سب سے عمدہ کھانا گوشت کے شوربے میں ڈلی ہوئی روٹی ہوا کرتی تھی۔ اس سے قبل اور بعد ازیں بھی صرف روٹی یا کھجور مہیا کی جاتی۔ خیال قوی یہی ہے کہ آج کے دور میں بھی حکومت کی طرف سے حاجیوں کو عرفات کے میدان میں جو کھانا مہیا کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ جو خاطر تواضع کی جاتی ہے وہ اسی سنت ہاشمی کے تحت کی جاتی ہے۔

ملک شام کے ایک کاروباری دورے کے دوران ہاشم یثرب میں چند روز کے لیے قیام پذیر ہوئے اور اسی دوران انہوں نے قبیلہ بنی نجار کے بنی عدی خاندان کے امر کی دختر سلمہ سے شادی کر لی اور پھر چند روز قیام کے بعد شام کے سفر پر روانہ ہوئے اور اسی سفر کے دوران فلسطین کے مقام پر وفات پا گئے۔ اسی دوران ان کی بیوہ نے ان کے بیٹے شیبا کو جنم دیا جو بعد میں عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوئے۔

(ہ) عبدالمطلب (شیبا) [۴۹۷ — ۵۷۹ عیسوی]:

ہاشم کی وفات کے بعد حاجیوں کے متعلق ان کی ذمہ داریاں ان کے بھائی مطلب بن عبد مناف کی طرف منتقل ہو گئیں، ان کی طرح وہ بھی دیانتدار اور سخی انسان تھے۔ جب انہیں اپنے بھائی کے بیٹے شیبا کے متعلق علم ہوا تو وہ اسے لینے کی غرض سے اس کی والدہ کے پاس یثرب پہنچے اور ان کی والدہ کو راضی کیا یہ سمجھانے کے بعد کہ اگر ان کا بھتیجا مکہ چلا گیا تو حقیقی طور پر اپنے والد کے مقام کا وارث بنے گا۔ یعنی اپنے والد جیسی عزت پائے گا اس طرح سے وہ اپنے بھتیجے کو اپنے ساتھ لے آئے۔ جب وہ شہر مکہ میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ ایک لڑکا دیکھ کر

لوگوں نے گمان کیا کہ وہ بچہ ان کا غلام ہے جسے وہ خرید کر اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ اس طرح سے عام لوگوں نے ان کو مطلب کا غلام، یعنی عبدالمطلب کے نام سے پکارنا شروع کر دیا جو تاریخ میں آج تک مشہور ہے۔ اور ان کے اصل نام شیبا سے بہت کم لوگ واقف ہیں، جیسا کہ ہاشم کے نام امر سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

جلد ہی مطلب کی وفات (۵۲۰ عیسوی) ہو گئی اور اس طرح سے عبدالمطلب نے اپنے چچا کی ذمہ داریاں بلکہ حقیقی طور پر اپنے والد ہاشم کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور بنو ہاشم کے سردار بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی اہل قریش سے ٹیکس وصول کرنے اور حاجیوں کی خدمت کی ذمہ داریاں بھی ان کے حصہ میں آ گئیں۔ اسی دوران ایک مشکل انہیں درپیش ہوئی، وہ یہ کہ ان کی وراثت پر ان کے چچا نوفل نے قبضہ کر لیا اور انہیں دینے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا نوفل سے اپنی وراثت واپس لینے کی غرض سے عبدالمطلب نے اپنے ماموں (ابو سعد بن عدی جن کا تعلق مدینہ کے بنو نجار میں سے تھا) کو بلایا جو فوری طور پر اسّی (۸۰) جنگجو گھڑ سواروں کو لے کر پہنچ گئے اور انہوں نے اپنے بھانجے کو اس کی وراثت واپس دلوائی۔

دوسرا معاملہ جو انہیں پیش آیا وہ یہ کہ ان کا چچا حرب بن اُمیہ جو ابو سفیان کا والد تھا، عبدالمطلب کی سماجی حیثیت سے ناخوش اور متعصب ہو گیا اور اس لیے عبدالمطلب کی اس حیثیت کا دعویدار بن گیا۔ لیکن دارالندوہ نے اس کے دعویٰ کو رد کر دیا، اس شکست سے امیہ خاندان اور ہاشمی خاندان کی رنجش اور دشمنی اور زیادہ سنگین اختیار کر گئی اور نسل در نسل چلتی رہی۔

عبدالمطلب بہرحال اہل قریش میں مقبول رہا اور اس طرح سے اس نے مکہ پر تقریباً انسٹھ (۵۹) برس حکومت کی۔ انہوں نے اپنے اس دور میں تین بڑے حادثات و واقعات کا سامنا کیا جن کا مختصراً ذکر درج ذیل ہے:

<u>(i) زم زم کے کنویں کی دوبارہ کھدوائی</u>

جب جناب ابراہیمؑ اپنے بیٹے جناب اسماعیلؑ کو جب کہ وہ اپنی والدہ ماجدہ حاجرہؓ کی گود میں تھے عرب کے لق و دق صحرا میں چھوڑ کر چلے گئے، جہاں پھر سے مکہ آباد ہوا اور کعبہ کی دوبارہ تعمیر ہوئی تو وہاں یعنی ٹھیک کعبۃ اللہ کے سامنے اللہ تعالیٰ نے پانی کا ایک چشمہ ظہور پذیر فرمایا۔ لیکن بعد میں یہ چشمہ ریت سے بھر گیا اور غائب ہو گیا۔

چونکہ عبدالمطلب کو، حاجیوں کو پلانے کی غرض سے، پانی کا ذخیرہ کرنے میں بہت زیادہ مشقت کرنی پڑتی تھی لہٰذا انہوں نے کعبہ کے نزدیک پانی ذخیرہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا مسئلہ حل نہیں ہوا کیونکہ ہنوز انہیں مکہ کے دور دراز کنوؤں میں سے پانی لا کر ذخیرہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح سے ان کی مشقت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور ان کو خواب میں وہ جگہ نظر آئی جہاں پر زمزم کا چشمہ ریت میں دفن ہو گیا تھا۔ نتیجتاً انہوں نے اس جگہ کو کھود کر چشمے کو پھر سے ظاہر کر کے محفوظ کر دیا۔ تقریباً پندرہ صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی وہ چشمہ فیض عام بنا ہوا ہے۔

(ii) ہاتھی والوں کے لشکر کی مکہ پر چڑھائی

چونکہ مکہ کعبہ کی وجہ سے عرب کی تہذیب و تمدن کا مرکز بن چکا تھا، اس کے علاوہ یہ حاجیوں کے لیے متبرک تکریم گاہ بھی تھا، چنانچہ یہ ایک تجارتی منڈی کی حیثیت سے ابھر کر دنیا کے سامنے آیا۔ اس وجہ سے کچھ قبیلوں کے سردار اور ایک قریبی ریاست کے امیر مکہ کی اس معاشی حیثیت کے حاسد اور رقیب بن گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مکہ کی اس معاشی اور تجارتی برتری ان کی معاشی حالت کو متاثر کر رہی ہے اور ساتھ ہی وہ خوب سمجھتے تھے کہ مکہ کی یہ حیثیت کعبہ کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا انہوں نے کعبہ کی قدر و منزلت کو کم کرنے کی غرض سے اپنے علاقوں میں بہترین اور نادر قسم کے مندر تعمیر کرائے تاکہ ان کی شان و شوکت ان بدو عربوں کو متاثر کر سکے اور وہ لوگ کعبہ کو چھوڑ کر ان کے مندروں کا رخ کر لیں۔ کیونکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ شان و شوکت کے اعتبار سے کعبہ کی عمارت دنیا کی عبادت گاہوں میں سب سے سادہ تھی اور آج بھی یہ عمارت سب سے زیادہ سادہ لیکن پرشکوہ و پرجلال ہے۔

ان پرشکوہ مندروں میں قابل ذکر کعبہ کے شمال کی جانب قبیلہ غسان کے سردار نے حیرا کے مقام پر ایک مندر تعمیر کرایا، جبکہ جنوب کی جانب یمن کے گورنر ابرہا نے شہر صناء میں بہت ہی پرشکوہ مندر کی تعمیر کرائی۔

لیکن معمولی پتھروں سے بنا ہوا ایک مستطیل نما کمرہ عرب کے بدوؤں میں ہی نہیں بلکہ یمن کے باسیوں میں بھی اپنی وقعت، وقار اور کشش کم نہیں کر سکا۔ ابرہا اس بات سے اس قدر آگ بگولا ہوا کہ اس نے کعبہ کو مسمار کرنے کی ٹھان لی۔ لہٰذا اس نے ۵۷۰ عیسوی میں ساٹھ

ہزار فوج کا ایک لشکر کثیر تیار کیا اور اس کے آگے ایک دیوہیکل ہاتھی رکھا تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس پیدا کیا جا سکے۔ وہ یہ لشکر لے کر خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کی نیت سے مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ کچھ مورخ دان لکھتے کہ ہاتھیوں کی تعداد (۹) نو سے لے کر (۱۳) تیرہ تک تھی اور کچھ نے ایک ہی لکھا۔ قرآن حکیم میں بھی سورہ فیل میں ہاتھی کے متعلق جمع نہیں بلکہ واحد کا صیغہ ہی استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس لشکر نے مکہ سے نو (۹) میل قبل طائف اور مکہ کے راستے پر مُغمّس کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں سے ابرہا نے مکہ کے مکینوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کی خاطر اور اپنے سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ مکہ کے گرد و نواح کے علاقوں میں بھیجے تاکہ وہ لوٹ مار کر کے خوف کی فضا قائم کر دیں۔ اس لوٹ کے سامان میں مکہ کے سردار عبدالمطلب کے دو سو اونٹ بھی شامل تھے۔

بعد ازیں ابرہا نے مکہ کے سربراہ کو پیغام بھیجا کہ اس کا مقصد صرف کعبہ کو ڈھانا ہے، اس کے علاوہ وہ کسی اور کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ لیکن اگر کسی نے مداخلت کی تو وہ بھی ہماری زد میں آ جائے گا۔ اس موقع پر عبدالمطلب اپنے بیٹوں سمیت ابرہا سے ملنے آیا۔ عبدالمطلب جب ابرہا سے ملا تو ابرہا ان کی شخصیت سے انتہائی متاثر ہوا اور ان کی بہت عزت افزائی کی۔ لیکن اس کی توقعات کے برعکس عبدالمطلب نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے اونٹ واپس کر دے۔ ابرہا کو حیرت ہوئی کہ امیر مکہ کو صرف اپنے اونٹوں ہی کی فکر کیوں ہے اور اس نے اپنے بہت ہی زیادہ متبرک کعبہ کی فکر کیوں نہیں جتائی۔ جب ابرہا نے یہی سوال عبدالمطلب سے کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو صرف اونٹوں کا ہی مالک ہے، جبکہ کعبہ کا مالک اپنے گھر کی حفاظت خود کرے گا۔ اس کے بعد ابرہا نے ان کے اونٹ لوٹا دیے اور وہ اپنے اونٹ لے کر واپس آ گیا اور اپنے قبیلے کے لوگوں کو لے کر کعبہ کے دروازے پر حاضر ہوا جہاں اس نے اللہ کے حضور دعا مانگی اور عرض کیا کہ اے اللہ! آپ کے غلام اپنی ملک کی خود حفاظت کرتے ہیں لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے گھر کی حفاظت خود فرمائیں۔

بہرحال ابرہا اپنے لشکر سمیت مکہ کی طرف بڑھا جب وہ مکہ کے بالکل نزدیک وادی مُحَسِّر (منا اور مزدلفہ کے درمیان) پہنچے تو لشکر کی سربراہی کرنے والا ہاتھی وہاں بیٹھ گیا اور اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا، وہ کعبہ کی سمت کے علاوہ ہر طرف جانے کے لیے تیار تھا مگر جب

اسے کعبہ کی سمت ہانکتے تو وہ بیٹھ جاتا۔ اسی اثنا میں چھوٹے چھوٹے پرندوں کا ایک بہت بڑا غول جن کے دونوں پنجوں اور چونچ میں کنکر تھے ابرہا کی فوج کے اوپر نمودار ہوا، وہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں ان پرندوں نے لشکر پر چھوڑ دیں۔ ان معمولی کنکریوں کا اثر ان لشکریوں پر ایسے ہوا جیسا کہ کسی کیمیائی اور جوہری توانائی کی تباہ کاریوں سے ہوتا ہے۔ وہ کنکر لشکری انسانوں اور حیوانات کے جسم کے اندر پیوست ہو جاتے اور اپنے تابکاری اثر سے اس جگہ کو جلا دیتے۔ لہٰذا زیادہ تر لشکری اور جانور یا تو اس تابکاری اثرات سے مر گئے یا اپاہج ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر ابرہا اور اس کے بچے کچھے سپاہی واپس پلٹے لیکن راستے میں ہی مر گئے۔

ابرہا کے لشکر کا یہ عبرتناک واقعہ قرآن حکیم کی سورہ (۱۰۵) میں بیان کیا گیا ہے۔ اہل عرب کے لیے یہ ایک تاریخی اہمیت کا حامل واقعہ تھا، جس نے ان کے دلوں میں کعبہ کی عظمت اور عبدالمطلب کی بزرگی کو اور بڑھا دیا۔ اہل مکہ کو اس بات پر بہت فخر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو خود بچالیا۔ لہٰذا اس یادگار واقعہ کو تابندہ رکھنے کے لیے اہل مکہ نے ابرہا کے اختیار کردہ راستے کا نام "محط الفیل" جہاں سے اس کے لشکریوں نے پانی پیا اس کا نام "عین الفیل" اور جس جگہ سے وہ مکہ میں داخل ہوا اس کا نام "باب الفیل" اور جس سال یہ واقعہ پیش آیا اس سال کا نام "عام الفیل" رکھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہی سال رسول اللہ کی پیدائش کا سال بھی ہے علاوہ ازیں سیدہ عائشہؓ کی روایت کے مطابق انہوں نے اس ہاتھی کے دو مہاوتوں کو دیکھا جو اپاہج اور اندھے ہو چکے تھے اور مکہ کے شہر میں بھیک مانگ کر گذارہ کرتے تھے۔ اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان مہاوتوں نے عذاب الٰہی کو دیکھنے کے بعد بہت لمبی زندگی پائی یعنی پچاس برس کے قریب یا زیادہ تاکہ آنے والی نسل میں بھی نشان عبرت بنا رہے۔

(iii) ایک بڑی قربانی کا قصہ

جب عبدالمطلب زم زم کا کنواں کھود رہے تھے تو انہیں وہاں سے کچھ بیش قیمت بتک ملی۔ جس کے بہت سے دعوے داروں کی وجہ سے انہیں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال جب وہ کھدائی کے سلسلے میں انتھک محنت کر رہے تھے اور انہیں یہ بھی احساس تھا کہ انہیں مزید بہت سی محنت درکار رہے گی تاکہ وہ حاجیوں کے لیے پانی مہیا کرنے کا خاطر خواہ انتظام کر سکیں اور یہ کہ

اس خدمت کو احسن طریقے سے ادا کر سکیں تو یہ سوچ کر ان کے دل میں ایک خواہش جاگی کہ ان کے ہاں ایک سے زائد بیٹوں کی پیدائش ہوتا کہ وہ ان کے مددگار بن سکیں۔ سو اس خواہش کو پورا ہوتے دیکھنے کے لیے انہوں نے قسم کھائی کہ اگر ان کے دس بیٹے پیدا ہوئے اور جوان ہو کر شانہ بشانہ ان کے ساتھ کھڑے ہوئے تو وہ ان میں سے ایک بیٹے کو کعبہ کے سامنے اللہ کے نام پر قربان کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبولیت کا درجہ عطا فرمایا اور دس بیٹے عطا کر دیے، چنانچہ جب ان کے بیٹے جوان ہو گئے تو انہوں نے سب کو اپنی قسم اور ارادے کے متعلق بتایا۔ جس پر ان تمام بیٹوں نے حضرت اسماعیل کی سنت کے مطابق اپنے باپ کی خواہش کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا اور اپنے والد کو ان کی قسم پورا کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد عبدالمطلب نے قرعہ نکالا، جس میں ان کے سب سے زیادہ چہیتے اور چھوٹے بیٹے عبداللہ کا نام آیا۔ لہٰذا وہ عبداللہ کو لے کر کعبہ کے بالمقابل اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں جانوروں کی قربانی کی جاتی تھی۔

جب اہل قریش کو عبدالمطلب کے اس ارادے سے آگہی ہوئی تھی تو وہ پہلے سے ہی اس مقام پر جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے عبدالمطلب کے اس ارادے کی مخالفت کی اور کہا کہ اس طرح کرنے سے اہل قریش میں یا دیگر قبائل میں یہ رسم اختیار کر لی جائے گی اور لوگ اپنے بچوں کی قربانیاں کرنی شروع کر دیں گے۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ یثرب کی مشہور راہبہ سے مشورہ کیا جائے کہ قربانی کی اس قسم کو کس طرح سے ٹالا جائے کہ قسم بھی پوری ہو جائے اور عبداللہ کی قربانی بھی نہ ہو۔ اس پر اس راہبہ نے تجویز پیش کی کہ عبداللہ اور دس اونٹوں کے درمیان قرعہ نکالا جائے اور جب تک قربانی کے لیے اونٹوں کا نام نہ آئے مزید قرعے میں دس مزید اونٹ شامل کر دیے جائیں۔ اس طرح سے عبداللہ کی ایک سو اونٹوں کے بدلے جان خلاصی ہوئی۔

اسی موقع کے اعتبار سے ایک مرتبہ جناب رسول اللہ ؐ نے فرمایا تھا کہ میں دو قربانیوں کے بعد کی پیدائش ہوں۔ ان کا مطلب ان کے والد عبداللہ کی قربانی اور جد امجد اسماعیل کی قربانی سے تھا۔

(و) عبداللہ [۵۴۵ — ۵۷۰ عیسوی]

جناب عبداللہ بہت ہی زیادہ خوبصورت با وقار بردبار شریف اور اپنے والد کے بہت ہی زیادہ چہیتے تھے۔ جب سے ان کی قربانی کے متعلق واقعہ پیش آیا تو وہ اہل مکہ کا موضوع گفتگو

بن گئے تھے۔ ان کے والد نے ان کی شادی بنو زہرہ کے سردار وہب بن عبد مناف کی بیٹی آمنہ سے کرادی۔ اللہ تعالیٰ کی منشا و مرضی کہ جناب عبداللہ اپنی صاحبہ آمنہ کے ساتھ ان کے ہی گھر میں صرف تین روز قیام پذیر رہے اور پھر ملک شام تجارت کی غرض سے رخصت سفر ہو گئے۔ جب وہاں سے واپس لوٹے تو راستے میں ہی انہیں کسی بیماری نے آگھیرا اور اسی حالت میں وہ یثرب پہنچے اور کچھ عرصہ اس بیماری میں رہتے ہوئے اس دنیا سے کوچ فرما گئے۔ انہوں نے اپنی بیوہ کی وراثت میں ایک کنیز اُم ایمن، پانچ اونٹ اور بکریوں کا ایک غلہ چھوڑا۔ پس آپ کی ازدواجی زندگی کا سفر صرف تین یوم رہا۔

(۱۴) صاحبِ الہام نبی آخر الزماں کی آمد

جناب عبداللہ کی وفات کے دو ماہ بعد محترمہ آمنہ کے ہاں انسانیت کے نجات دہندہ، الہام اور دین کو کامل کرنے والا اور نبوت کو کامل کر کے تا قیامت نبی رہنے والا، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ساتھ لانے والا اپنے مالک و خالق کا چہیتا اور برگزیدہ جناب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لایا۔ ان کی والدہ ماجدہ نے ان کا نام احمد رکھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے دادا نے ان کا نام محمد رکھا اور یہ دونوں نام آپ کے لیے قائم و دائم ہو گئے۔

احمد کسی بھی عرب بچے کا پہلا نام تھا لیکن عرب اس لفظ سے آشنا تھے بیشتر تاریخ دان رسول اللہ کی تاریخ پیدائش ۲۲ اپریل ۵۷۰ عیسوی بتاتے ہیں اور قمری ماہ کے مطابق نویں ربیع الاول عام الفیل والے سال کی۔ لیکن اگر اس وقت اس عیسوی تاریخ کو ہجری میں تبدیل کیا جائے تو وہ تاریخ ۲۹ صفر بنتی ہے ۵۴ ویں سال قبل از ہجری کے۔ لیکن کچھ تاریخ دان یہ کہتے ہیں کہ اگر ہجری سال یعنی یکم محرم یکم ہجری بروز جمعہ ۱۶ جولائی ۶۲۲ عیسوی سے شروع مانا جائے تو رسول اللہ کی پیدائش بنتی ہے ۲۰ اپریل ۵۷۱ عیسوی اور جب اس تاریخ کو ہجری میں تبدیل کیا جائے تو یہ بنتی ہے بروز پیر ۹ ربیع الاول ۵۲ واں سال قبل ہجری۔ لیکن رسول اللہ کی صحیح تاریخ پیدائش بروز پیر ۲۹ صفر ۵۳ قبل از ہجری یعنی ۲۲ اپریل ۵۷۰ عیسوی بنتی ہے کیونکہ اس تاریخ کے حساب سے ہجرت سے پہلے کا عرصہ بنتا ہے ۵۳ سال ایک ماہ ۲۹ دن۔ جبکہ رسول اللہ کا یوم وفات ہے ۲ ربیع الاول گیارہ ہجری یعنی ۶ جون ۶۳۲ عیسوی۔ یہ عرصہ ہجرت کے بعد بنتا ہے ۱۰ برس ۲ ماہ اور

۱۲ روز۔ اس طرح سے رسول اللہ کی عمر مبارک ۶۳ سال ۲ ماہ اور گیارہ روز بنتی ہے۔ امام بخاری نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ کی عمر مبارک ۶۳ برس تھی۔ اس کے علاوہ رسول اللہؐ نے اپنی وفات سے تین ماہ قبل اپنے حج کے بعد اپنے ہاتھوں سے ۶۳ اونٹ نحر فرمائے جو آپ کی زندگی کے سالوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اس طرح سے آپ کی پیدائش کی صحیح تاریخ ۲۲ اپریل ۵۷۰ ہجری بمطابق بروز پیر ۲۹ صفر ۵۳ قبل از ہجرت بنتی ہے اور یوم وفات ہے ۶ جون ۶۳۲ء بمطابق ۲ ربیع الاول ۱۱ھ۔

(الف) رسول اللہ کی پرورش:

اہل عرب کے مروجہ دستور کے مطابق وہاں کے معزز گھرانے جو شہری آبادی میں رہتے تھے، وہ اپنے شیر خوار بچوں کو کسی خانہ بدوش بدو قبیلے کی خاتون کے سپرد کر دیتے جو اس بچے کو اپنا دودھ پلاتی اور اپنے بچوں کے ساتھ تربیت کرتی۔ وہ ماں اس بچے کی رضائی ماں اور اس کے بچے اس کے رضائی بھائی بہن کہلاتے اور وہاں کے سماجی قوانین بھی اس قانون کو مانتے۔ اس طرح سے وہ بچہ ایک کھلے ماحول میں اخلاقی اقدار کے ساتھ عربی رسم و رواج کے مطابق پرورش پاتا۔ اہل عرب چونکہ زبان کا خاص خیال رکھتے تھے چنانچہ وہ بچہ خالص اور روایتی عربی زبان سیکھتا اور شہری عامیانہ زبان یعنی (Slangs) سے بچ جاتا۔ بچے اور رضائی ماں و بھائی بہنوں کے اس رشتے کو اللہ تعالیٰ نے بھی پسند فرمایا اور قائم رکھا۔

رضائی ماں کی سپردگی سے قبل جناب رسول اللہؐ نے ایک خاتون ثویبہ (Thawaibiah) کا دودھ نوش فرمایا تھا جو ابولہب کی کنیز تھیں۔ اسی دوران انہی کا دودھ حضرت حمزہؓ نے بھی نوش کیا تھا، جو رسول اللہؐ کے چچا تھے لیکن اس رشتہ سے وہ آپ کے رضائی بھائی بھی بن گئے۔ بہر حال جب رضائی والدہ منتخب کرنے کا وقت آیا تو ہوازن کے قبائل میں سے قبیلہ بنو سعد کی ایک خاتون حلیمہ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ رحمت دو عالم کو اپنا دودھ نوش جان کرائے۔ حالانکہ اس خاتون نے اس کو بن باپ کے یتیم ہونے کی وجہ سے محض اس لیے اپنایا تھا کہ وہ کسی اور امیر زادے کو حاصل نہ کر سکی تھی۔ کیونکہ ایسی خواتین اپنی مالی ضروریات پورا کرنے کی غرض سے خوشحال اور امیر لوگوں کے بچوں کو لینا پسند کرتیں تا کہ ان کو زیادہ سے زیادہ مدد مل سکے۔

بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ اس کا رسولؐ اس خاتون کے پاس ہی تربیت پائے۔ لہٰذا

رسول اللہؐ ان کے پاس پانچ برس تک رہے۔ حلیمہ کا قبیلہ عربی زبان کا ماہر سمجھا جاتا تھا اس لیے زبان کی دقیق فصاحت و بلاغت رسول اللہؐ کو منتقل ہوئی۔ دوسری طرف رسول اللہؐ کی موجودگی حلیمہ اور اس کے گھر والوں کے لیے باعث رحمت و برکت بھی ثابت ہوئی۔ رسول اللہؐ کی دیکھ بھال زیادہ تر حلیمہ کی بیٹی شیما کرتی تھی۔ دستور کے مطابق حلیمہ کو دو سال بعد رسول اللہؐ کو ان کی والدہ کو لوٹانا تھا لیکن ان کو اس بات پر تردد تھا چونکہ وہ اس خوش بخت کو کھونا نہیں چاہتی تھیں، اس لیے جب حلیمہ رسول اللہؐ کو ان کی والدہ ماجدہ کے پاس لے گئیں تو ان کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ بچہ صرف دیہات میں ہی اس وبائی مرض سے محفوظ رہ سکے گا جو ان دنوں مکہ میں پھیلی ہوئی تھی، لہٰذا وہ محمدؐ کو واپس اپنے ساتھ لے گئیں اور مزید تین برس تک ان کو اپنے ساتھ رکھا۔

(ب) سینہ کشائی:

رسول اللہؐ کے ساتھ جبکہ وہ اپنی دائی حلیمہ کے پاس دوسرے دور میں رہ رہے تھے تو ان کے ساتھ ایک معجزانہ واقعہ پیش آیا، اس وقت آپؐ کی عمر مبارک چار برس کی تھی۔ روایت اس طرح سے ہے کہ جب رسول اللہؐ گھر سے باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے تو اچانک دو فرشتے نمودار ہوئے اور انہوں نے رسول اللہؐ کو دبوچ لیا، اُن کا سینہ مبارک چاک کیا، پھر ان کا دل چاک کیا اور وہاں سے خون کا ایک لوتھڑا نکال پھینکا، اور دل کو دھو کر سینہ بند کر دیا اور چلے گئے۔ اس واقعہ کے بعد خوفزدہ بچے محمدؐ اور اُن کے ساتھیوں نے یہ واقعہ حلیمہ کو بتایا، جبکہ حلیمہ نے بھی دیکھا کہ محمدؐ کے چہرے پر خوف کا تاثر موجود ہے اور ان کے چہرہ مبارک کا رنگ پیلا ہو گیا ہے۔

زیادہ تر غیر مسلم اور کچھ مسلمان بھی اس واقعہ کو من گھڑت کہانی سمجھتے ہیں۔ جہاں تک غیر مسلم عالموں کا تعلق ہے وہ اس غیر معمولی واقعہ کے ہونے کا تصور ہی ذہن میں نہیں لا سکتے، جبکہ مسلمان علماء یہ سمجھتے ہیں کہ محمدؐ کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ نبی بننے کے لیے ان کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آئے۔ بہرحال زیادہ تر مسلمان علماء اس واقعہ کے ہونے سے متفق ہیں۔

اس واقعہ کے متعلق قرآن حکیم میں سورۃ (۹۴) الشرح کی آیات (۱) اور (۲) میں فرمان رب تعالیٰ ہے کہ ”کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے چاک نہیں کیا (یا کھولا نہیں) اور تم سے نکال پھینکا بوجھ تمہارے لیے“۔

اس کے علاوہ سورۃ (۶) الانعام کی آیت (۱۲۵) میں فرمان ربی ہے کہ ”جس کو بھی اللہ

چاہتا ہے کہ اس کی رہنمائی کرے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کو بھی وہ گمراہ کرنا چاہتا ہے وہ اس کا سینہ بند کر دیتا ہے اور محدود کر دیتا ہے، گویا کہ وہ چڑھتا ہے آسمان پر (یعنی سچائی کو حاصل کرنے کے لیے بڑی مشکل میں پڑ جاتا ہے) پس اللہ عذاب میں ڈالے گا ان لوگوں کو جو اس پر ایمان نہیں لائے“۔

ان آیات مبارکہ کی معنی کے اعتبار سے دوہری شکل ہے۔ یعنی ”سینے کا کھول دینا“ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جبرئیل نے جناب رسول اللہؐ کا سینہ مبارک کھولا اور دوسرا مطلب یہ کہ محاورے کے اعتبار سے آپؐ کا سینہ مبارک عقل و دانش کو وصول کرنے کے لیے کھول دیا گیا۔ خیال قوی یہی ہے کہ یہ دونوں معنی اس آیات کے معاملے میں رسول اللہؐ کی نسبت درست ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دانائی و حکمت کی بنا پر مستحکم کرنے کے واسطے ان کے دل سے حسد اور بغض کا خاصہ (چاہے وہ ذرہ برابر ہی کیوں نہ تھا) نکال کر حکمت و دانش سے بھر دیا۔ اور یہ تیاری اس لیے بھی ضروری سمجھی گئی ہوگی کہ رسول اللہؐ آئندہ جا کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام وصول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں جو ان کے قلب اطہر پر نازل کیا جاتا تھا۔ اس لیے رسول اللہؐ کے لیے یہ ضروری امر تھا کہ ان کے قلب میں سوائے سچائی کی جستجو کے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے اور کچھ نہ رہے۔ بالکل اسی طرح سے جس طرح سے کمپیوٹر کی ڈسک Disk پر وہ جگہ جس پر پروگرام کا منتقل کرنا مقصود ہوتا ہے بالکل صاف ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس ڈسک پر ایسی جگہ بھی موجود ہوتی ہے جس پر پروگرام چلانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

کیونکہ نزول قرآن کا نبیؐ کے قلب اطہر پر وارد ہونا کوئی معمولی بات نہیں، یہ بہت ہی مشکل مرحلہ تھا، اس کے لیے انہیں بہت زیادہ مضبوط دل اور مستحکم ایمان اور اللہ تعالیٰ سے کامل محبت کی ضرورت تھی۔ اللہ کے کلام کا نبی کے دل پر منتقل ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی دھات پر کسی نقش کو کندہ کرنے کا عمل، اور جس طاقت کے ساتھ یہ عمل پذیر ہوتا ہے، اس کو برداشت کرنے کی قوت اور صلاحیت۔ اس بات کا اندازہ قرآن حکیم کی سورۃ (۵۹) الحشر کی آیت (۲۱) سے لگا سکتے ہیں، جس میں فرمایا گیا ہے کہ ”اگر ہم (اللہ) اس قرآن کو پہاڑ پر نازل فرماتے تو یقیناً تم دیکھتے کہ وہ پہاڑ لرز جاتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا، اللہ کے رعب اور دبدبے کے خوف سے۔ ایسی ہی مثالیں ہم (اللہ) پیش کرتے ہیں انسانوں کو تاکہ وہ متوجہ ہوں (یعنی اللہ

کی بات سمجھیں)'' یہ تو کہا یہ آیت مبارک ظاہر کرتی ہے کہ نبیؐ کا قلب اطہر پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط اور طاقتور بنایا جاتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے الہام کو وصول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ سینہ کشائی ایک دفعہ نہیں بلکہ رسول اللہؐ کے ساتھ دو مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ تو جیسا ذکر کیا گیا ہے اور دوسری مرتبہ جب آپؐ معراج پر تشریف لے جانے والے تھے۔ دوسرے واقعہ کو بھی تسلیم کر لینے میں کوئی تردد پیش نظر معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس ماورائی سفر کے لیے یہ ضروری تھا کہ رسول اللہؐ پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانیاں اور رحمتیں ہوتیں اور اللہ تعالیٰ آپؐ کو خاص طور پر غیر معمولی اور اعلیٰ ترین حواس خمسہ کی قوت عطا فرماتے۔ ان کی جسمانی اور روحانی طاقت کو خاص قسم کی غیر معمولی قوت اور صلاحیت عطا فرماتے تاکہ رسول اللہؐ اس معجزاتی سفر کو طے کرنے کے قابل ہو جاتے۔ کیونکہ عام انسانی خصوصیات ایسے سفر کے قابل ہو ہی نہیں سکتیں۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد حلیمہ پریشان ہو گئیں اور مزید رسول اللہؐ کا ان کے لیے رکھنا موزوں و ممکن نہ رہا۔ لہٰذا وہ انہیں واپس ان کی والدہ محترمہ کے پاس چھوڑ آئیں۔

(۱۴) مادر رسولؐ کا رخت سفر آخر

بمشکل جناب رسول اللہؐ نے اپنے بچپن کا ایک ہی سال اپنی پیاری والدہ ماجدہ کی معیت میں گذارا تھا کہ ان کی والدہ کا سفر آخرت آن پہنچا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ نہایت خوش تھیں اور انہوں نے پروگرام بنایا کہ اپنے بچے کو اپنے رشتہ داروں کے پاس یثرب لے کر جائیں اور وہاں اپنے شوہر کی قبر پر بھی حاضری دیں۔ وہاں پر انہوں نے تقریباً ایک ماہ قیام کیا اور واپسی مکہ کا قصد فرمایا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے اسی دوران وہاں تیراکی سیکھی۔ اللہ کی قدرت کہ اس ذات باری تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی جان گداز تربیت کی ایک اور کڑی ملائی اور یثرب سے روانگی کے کچھ ہی وقت بعد آپؐ کی والدہ ماجدہ علیل ہو گئیں۔ اور یثرب سے تقریباً پچاس میل کی مسافت پر ابوا نامی ایک گاؤں میں رکیں اور وہیں رخت سفر آخرت ہوئیں اور وہیں مدفون ہوئیں۔ یہ واقعہ ۵۷۶ عیسوی کا ہے۔ اس وقت جناب رسول اللہؐ کی عمر مبارک کل چھ برس تھی، انہوں نے اپنی والدہ ماجدہ کے پاس صرف ایک برس کا عرصہ بسر فرمایا۔ اب وہ مکمل طور پر ماں اور باپ دونوں طرف سے یتیم ہو گئے اور ان کی دیکھ بھال کرنے والی صرف ان کے والد کی کنیز

اُم ایمن ان کے پاس رہ گئی تھیں۔

اگر آپ غور فرمائیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ دریتیمی اور بغیر محبت و پیار کی زندگی انسان اور خاص طور پر ایک معصوم بچے میں ایک خاص رویے کو جنم دیتی ہے۔ اس کے ارادے اور سوچ کو ایک خاص استحکام بخشتی ہے اور اس کے ثابت قدم رہنے پر مندرجہ ذیل خصوصیات کو اس کی شخصیت کا حصہ بنا دیتی ہے:

الف) سنجیدگی و متانت

ب) عاجزی

ج) خود انحصاری

د) قوت برداشت

ہ) سوچ و بچار

و) یقین کامل

ز) پُرعزمی و مستقل مزاجی

کیا یہی وہ خصوصیات نہیں ہیں جو ایک قومی سربراہ کے لیے ضروری ہوتی ہیں، خاص طور پر پریشانی اور مصیبت کے اوقات میں یا حالت خوف یا جنگ میں، یا کسی حادثاتی موقع پر ان معاملات کا سامنا کرنے کے لیے فیصلے کرنا اور معاملات پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے ایک رہبر میں ایسی ہی خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ صحیح اور بروقت فیصلے کر سکے۔

علاوہ ازیں آپؐ کی یتیمی نے ان کو خود بخود والدین کی اطاعت سے بچا لیا۔ کیونکہ آپؐ کے لیے تو صرف اللہ ہی کی اطاعت اور محبت لازم تھی اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی محبت، نیابت اور قربت حاصل کرنے کے لیے یتیمی کا تجربہ پیغمبر کی تربیت کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد سے ان تمام مشکلات کو بُردباری اور صبر و استقامت کے ساتھ طے کر گئے۔ اس ضمن میں قرآن کی سورۃ دوہا (۹۳) آیت ۶، ۷ میں کہا گیا کہ: "کیا اس (اللہ) نے تمہیں (اے محمدؐ) یتیم نہیں پایا اور تمہیں پناہ دی؟ اور اس (اللہ) نے تمہیں بے خبر پایا اور تمہاری راہبری فرمائی''۔

(۱۵) دورِ سرپرستی

اس وقت کے دستور کے مطابق رسول اللہ کے دادا عبدالمطلب نے آپؐ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا، لیکن یہ دور بھی کچھ زیادہ نہیں صرف دو برس تک رہا اور عبدالمطلب نے بھی اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ لیکن اپنی وفات سے قبل عبدالمطلب نے اپنے بیٹے ابوطالب کو طلب کیا اور انہیں وصیت کی کہ ان کے پوتے آٹھ سالہ محمدؐ کی، ان کے بعد، دیکھ بھال کریں۔ عبدالمطلب کے اس وقت نو بیٹے تھے ابوطالب اور زبیر سگے بھائی تھے۔ حالانکہ ابوطالب سب سے چھوٹے اور سب سے زیادہ غریب تھے لیکن وہ اہل قریش میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ بہت زیادہ رحم دل اور محبت کرنے والے انسان تھے، خاص طور پر انہوں نے جناب محمدؐ سے بہت محبت آمیز سلوک روا رکھا۔ اپنی ان خصوصیات کی بنا پر وہ ہاشمی خاندان کے سربراہ بھی بن گئے۔ لیکن اہل قریش کی سربراہی ہاشمی خاندان سے منتقل ہو کر حرب بن امیہ، جو ابوسفیان کا والد تھا، کے پاس چلی گئی۔ اس سربراہی کی ہاشمی خاندان سے منتقلی کا سبب اس خاندان کی غربت اور قیادت کرنے کی قابلیت کا فقدان تھا۔ اس معاملہ میں عبدالمطلب کی سیاسی اور قیادت کرنے کی خوبیاں اس کی اولاد میں منتقل نہ ہو سکیں اور بالآخر حرب کی وفات کے بعد قریش کی قیادت اور سرداری ابوسفیان کو منتقل ہو گئی۔

عبدالمطلب نے جس طرح سے حاجیوں کی خدمت گزاری کی تھی، اب اس کی اولاد نے اس میں کمی کر دی، ان کے بیٹے عباس نے باوجود تونگر ہونے کے، حاجیوں کو اپنے والد کی طرح کھانا مہیا کرنا بند کر دیا اور صرف پانی مہیا کرنے پر اکتفا کیا۔

(۱۶) رسول اللہؐ کی سب سے لمبی رفاقت

اللہ کے رسولؐ کی رفاقت ابوطالب کے ساتھ سب سے زیادہ رہی۔ یعنی آٹھ برس کی عمر سے لے کر ۴۹ سال کی عمر تک۔ یعنی تقریباً چالیس برس آپؐ اور ابوطالب ایک دوسرے کے رفیق، درد مند اور خیر خواہ رہے۔ ابوطالب نے ۶۲۰ عیسوی میں وفات پائی تو اس رفاقت کا خاتمہ ہوا جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ گو کہ ابوطالب ایک غریب شخص تھے لیکن پھر بھی اہل قریش میں باعزت اور فیاض کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اور عرب کے دستور کے مطابق غربت کسی شخص کی

عزت کے آڑے نہیں آتی تھی اور نہ ہی وہ سردار بننے کے مانع تھی۔ اگر کسی شخص میں قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی صلاحیتیں موجود ہوتیں تو اس کی غربت اسے اس کی قوم کا قائد بننے سے نہیں روک سکتی تھی۔

ابوطالب کی غربت کی وجہ سے اللہ کے رسولؐ ان کی مدد کرنے کی غرض سے ان کی بکریوں کے ریوڑ کی گلہ بانی فرماتے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ زیادہ تر پیغمبروں نے گلہ بانی کے فرائض انجام دیے ہیں۔ مثلاً موسیٰ نے دس برس تک گلہ بانی کی، عیسیٰ بھی گلہ بانی کرتے رہے اور حقیقت یہ ہے کہ بکریوں کے گلہ کی دیکھ بھال کرنا بہت ہی مشکل کام ہے اونٹوں، گایوں اور بھیڑوں کے گلوں کی نسبت۔ کیونکہ بکریاں بہت تیزی سے حرکت کرتی ہیں پہاڑیوں کے کونوں تک، کھائیوں کے کناروں تک آسانی سے پہنچ جاتی ہیں۔ وہ اس طرح سے تیزی کے ساتھ پُرخطر جگہوں پر آتی جاتی ہیں کہ گویا وہ اپنے گلہ بان کے صبر کا امتحان لے رہی ہوں۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کا اس طرح سے گلہ بان کی حیثیت سے کام کرنے کا عرصہ ان کی تربیت کا ایک حصہ تھا تاکہ آپؐ اپنے جذبات پر قابو پانے کے فن سے آگاہ ہو سکیں اور صبر اختیار کرنے اور برداشت کرنے کی قوت کو بڑھا سکیں اور اس طرح سے ایک عامیانہ رویہ ان کا طریقہ بن جائے۔ مزید یہ کہ ایسے حالات میں یعنی صحرا کی تنہائی اور ریت کی تپش اور بھوک پیاس اور بکریوں کی تھکا دینے والی شرارتیں، ایک انسان کی ادراکی صلاحیتوں کو اور جلا دیتی ہیں اور انسان کو عقل و دانش کا وافر خزانہ حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب عام طور پر اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے گلہ بانی کا پیشہ ہی اختیار کرتے، اور وہی وقت ان کی علمی استعداد بڑھانے کا ہوتا تھا۔ وہ کسی باقاعدہ اسکول میں تعلیم نہیں حاصل کرتے تھے لیکن انہیں شاعری میں خاصی دسترس حاصل ہو جاتی اور وہ زبان کی فصاحت و بلاغت پر قابو پا لیتے۔

(۱۷) رسول اللہؐ کا پہلا سفر

سن ۵۸۲ عیسوی میں جبکہ آپؐ گیارہ سال کے تھے تو ابوطالب نے تجارت کی غرض سے ملک شام کے سفر کا ارادہ کیا۔ جب رسول اللہؐ کو اس بات کا علم ہوا تو آپؐ نے بھی ان کے ساتھ

جانے پر اصرار کیا۔ لیکن ابوطالب اس بات پر راضی نہ تھا، کیونکہ اس مشکل سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا ایک بچے کے لیے بہت مشکل تھا۔ لیکن رسول اللہؐ نے اپنے چچا کو اس بات پر راضی کرلیا اور وہ رخت سفر ہوئے۔ جب یہ مختصر قافلہ بصرہ پہنچا تو انہوں نے ایک خانقاہ کے قریب ڈیرہ ڈالا۔ وہاں پر ایک مشہور راہب بحیرہ جس کا اصل نام جارج تھا، قیام پذیر تھا۔ جب اس راہب کی نظر اللہ کے رسولؐ پر پڑی تو وہ بھانپ گیا کہ وہ بچہ خاص شخصیت اور مرتبے کا مالک ہے کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک درخت اپنی شاخیں اس بچے پر جھکائے ہوئے ان پر سایہ کرکے انہیں گرمی کی شدت سے بچا رہا تھا۔ اس راہب نے اپنے علم کے ذریعے یہ اندازہ لگایا کہ وہ معزز بچہ آئندہ کا ہونے والا پیغمبر آخرالزماں ہے، کیونکہ اسے توریت اور انجیل کا مطالعہ بھی بتا رہا تھا کہ جزیرہ نما عرب سے ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔ اس لیے اس نے نبی آخرالزماں کی شرف دید و ملاقات کی غرض سے قافلے کے تمام لوگوں کو کھانے پر بلایا۔ چنانچہ تمام لوگ کھانے کے لیے چلے گئے لیکن محمدؐ کو بچہ جان کر وہیں مال و اسباب کی نگہبانی کے لیے چھوڑ گئے۔ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ جس کی وجہ سے انہیں مدعو کیا گیا ہے وہ انہیں ہی چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لیکن راہب نے اصرار کیا کہ اس بچے کو کھانے کے لیے فوراً لایا جائے۔ جب راہب نے آپؐ سے گفتگو کی اور چند سوالات کیے تو اسے یقین ہوگیا کہ وہی پیغمبر آخرالزماں ہیں۔

لہٰذا اس راہب نے ابوطالب کو نصیحت کی کہ وہ اس بچے کو فوراً واپس لے جائے اور اس کی حفاظت میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ ابوطالب نے اپنا سفر مختصر کرکے واپس مکہ کی راہ لی۔ نوعمر محمدؐ نے اس مشکل صحرائی سفر کے دن و رات کا تجربہ کیا۔ انہوں نے راستے میں مدائن کا علاقہ بھی دیکھا جو نبی صالحؑ کا شہر تھا اور وہاں اہل ثمود کے کھنڈرات ملاحظہ فرمائے۔ اس کے علاوہ راستہ میں ملک شام کے بہترین پھلوں کے باغات بھی دیکھے۔

(۱۸) جنگ فجار (۵۸۵-۵۸۹عیسوی)

رسول اللہؐ اور ان کے چچا جناب حمزہؓ تقریباً ہم عمر تھے اور اس کے علاوہ دودھ شریک بھائی بھی، اس لیے ان میں ان رشتوں کے علاوہ دوستانہ تعلقات بھی قائم ہوگئے تھے۔ حمزہؓ جسمانی طور پر قوی ایک اچھے شمشیر زن اور پہلوان تھے۔ جب انہوں نے اپنے بھتیجے کا رجحان تیر اندازی

کی طرف پایا تو انہوں نے رسول اللہؐ کو اس شعبے میں مہارت حاصل کرنے میں مدد دی اور ویسے بھی جناب رسول اللہؐ کی قوت بصارت غیر معمولی تھی۔

دور جہالت میں عرب نسل در نسل ایک دوسرے سے دشمنی رکھتے اور کسی بھی دشمنی کی وجہ سے اپنی لڑائی کو بھی اسی طرح جاری رکھتے۔ جب رسول اللہؐ کی عمر مبارک چودہ برس کی تھی تو عکاظ کے میلے میں قبیلہ قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان کسی اشتعال انگیزی کے سبب ناچاقی ہوگئی۔ جو چار برس تک کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی رہی۔ یہی واقعہ جنگ فجار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حرب بن امیہ اس جنگ میں قریش کی سربراہی کر رہا تھا جبکہ قریش میں بنی ہاشمیوں کی سربراہی رسول اللہؐ کے چچا زبیر کے سپرد تھی۔ چنانچہ اس جنگ میں رسول اللہؐ اپنے چچاؤں کے ساتھ شریک ہوئے۔ وہ دشمن کے چلائے ہوئے ایسے تیر جو خطا ہوجاتے، اکٹھے کرتے۔ آپؐ اپنی اس شرکت پر فخر فرماتے۔

(۱۹) رسول اللہؐ کی پہلے سماجی عہد میں شرکت
(حلف الفضول)

جنگ فجار کے فوری بعد مکہ میں ایک واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے اہل قریش اور قیس کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب یمن کے زبید قبیلہ کے ایک شخص کو مکہ کے ایک شخص العاص بن وائل السہمی نے اس کے تجارتی بقایاجات ادا کرنے سے انکار کردیا۔ جس پر اس مظلوم نے اہل مکہ سے مدد کی درخواست کی لیکن اس کی مدد کے لیے کوئی آگے نہیں بڑھا۔ اس ضمن میں آخری کوشش کے لیے وہ شخص ابوقیس کی پہاڑی پر چڑھا اور انصاف کی درخواست کی غرض سے پرزور اپیل کی۔ اس شخص کی پکار پر زبیر بن عبدالمطلب نے فوری طور پر مکہ کے لوگوں سے اس شخص کی مدد کی درخواست کی۔ ان کی درخواست پر قریش کے تمام قبائل ماسوائے عبدشمس اور نوفل قبائل کے، قبیلہ تیم کے سردار عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے، اور اس بات پر متفق ہوئے کہ حجر اسود پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھائی جائے کہ آئندہ سے مکہ میں ہونے والے کسی بھی ظلم کو روکنے کے لیے وہ مظلوم کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ اس عہد کے مطابق العاص بن وائل کو مجبور کیا گیا کہ وہ مظلوم تاجر کے بقایاجات ادا کرے۔ زبیر نے اس معاملہ کے

درمیان اپنے بھتیجے جناب محمدؐ کو اپنے ساتھ رکھا اور اس طرح سے آپؐ نے بھی اس رسم عہد میں شرکت کی اور قسم اٹھائی۔ رسول اللہؐ کو اپنی اس شرکت پر فخر تھا۔ کیونکہ یہ عہد مظلوموں کی مدد کے لیے کیا گیا تھا۔ اس عہد میں ابوبکر صدیقؓ نے بھی اپنے والد ابو قحافہ کے ساتھ شرکت کی تھی۔

(۲۰) پیغمبر اسلام کا عالم شباب

(الف) ثابت قدمی:

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اس دور میں چند حضرات ایسے تھے جو ہمیشہ سچائی کی تلاش میں لگے رہتے تھے اور وہ حنفیہ کہلاتے تھے۔ بنیادی طور پر ایسے لوگ دو طرح کے تھے، ایک تو وہ جو بت پرست تھے اور دوسرے وہ جو بت پرستی نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی عام مروجہ سماجی برائیوں سے دور رہتے تھے۔ اللہ کے رسولؐ بھی بت پرستی سے دور اور دنیاوی لذات سے لاتعلق اور برائیوں اور بدکاریوں سے دور رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ سچ کے لیے کوشاں اور مقصد حیات کو جاننے کی تگ و دو میں رہتے۔ ان کے ذہن میں ہمیشہ مابعد الطبیعات سوالات ابھرتے اور انھیں اپنی زندگی کو پر آسائش بنانے کی کبھی فکر لاحق نہ رہتی۔ انہوں نے اپنی ارادی صلاحیتوں کو اجاگر کرکے اپنے آپ کو دانشمندی، دیانتداری اور اپنے کردار کی بلندی کو اعلیٰ درجہ پر پہنچا کے قابل ستائش مقام حاصل کیا۔ یہاں تک کہ آپ کی جوانی کے عالم میں آپؐ کو مکہ کے لوگ صدوق، صادق اور امین (یعنی صادق، سچا اور قابل اعتماد دیانتدار) کے ناموں سے پکارنے لگے۔ اسی ضمن میں آپؐ کی انہی صفات کے تعلق سے قرآن فرماتا ہے "بے شک تم (اے محمدؐ) کردار کے اعلیٰ ترین مقام پر ہو"۔ (آیت ۴، القلم ۶۸)

(ب) محترمہ خدیجہ سے تعلق:

قریش کے اسد قبیلے کے خویلد اور فاطمہ کی دختر محترمہ خدیجہ مکہ کی ایک تاجر بیوہ خاتون تھیں ان کے تجارتی کارواں باقاعدگی سے ملک شام آتے جاتے۔ انھیں ایک دیانتدار شخص کی ضرورت تھی جو ان کے تجارتی قافلوں کی رہبری اور تجارتی امور کی دیکھ بھال کرسکتا۔ چونکہ رسول اللہؐ کو ان مطلوبہ امور سے واقفیت تھی کیونکہ قبل ازیں آپؐ قیس بن زید اور چند دیگر تاجروں کے

معاملات کی دیکھ بھال خوش اسلوبی کے ساتھ کرچکے تھے، اس لیے ابوطالب نے آپؐ کی رضامندی کے بعد جناب خدیجہ کو آپؐ کی خدمات بعوض چار اونٹ برائے ایک تجارتی پھیرا پیش کردیں۔ حالانکہ اس وقت فی پھیرا اجرت عموماً دو اونٹ تھی۔ اس پیشکش کو محترمہ خدیجہ نے قبول فرمایا اور اس طرح سے جناب رسول اکرمؐ ان کا تجارتی قافلہ لے کر شام روانہ ہوئے۔ خاتون نے آپؐ کے ساتھ اپنے خاص غلام میسرہ کو بھی بھیجا تاکہ وہ تمام معاملات سے آگاہ رہ سکے۔

رسول اللہؐ نے اپنے بصرہ کے سفری قیام کے دوران عیسائی اور آتش پرست پجاریوں سے بھی ملاقات کی۔ محترمہ خدیجہ کے غلام میسرہ نے جناب رسول اللہؐ کو کردار کے بہترین درجہ پر فائز پایا اور ان کے روحانی درجات کی بلندی کی بھی آگہی حاصل کی اور دیکھا کہ دوران سفر جب سورج کی تمازت اپنے عروج پر ہوتی تو بادل کا ایک ٹکڑا جناب رسالت مآب پر سایہ فگن ہوتا۔ بصرہ میں آپؐ کی ملاقات عیسائیوں کے مشہور راہب نسطورلیس سے بھی ہوئی جس نے آپؐ کی بہت مدح سرائی کی کیونکہ انہوں نے آپ جنابؐ سے مل کر آپؐ کے اوصاف کا اندازہ لگایا اور بتایا کہ آپؐ ہونے والے پیغمبر آخر الزماں ہیں۔ یہ اندازہ انہوں نے اپنی کتاب کے علم کے مطابق ہی لگایا ہوگا۔ قیاس ہے کہ یہ جگہ اور گرجا گھر وہی تھے جہاں پر ۱۳ سال قبل بحیرہ نامی راہب نے رسول اللہؐ سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا، جب وہ ابوطالب کے ساتھ وہاں تشریف فرما ہوئے تھے، اور انہوں نے بھی رسالت مآب کو اپنے علم کے مطابق آئندہ کا نبی ظاہر کیا تھا۔

(ج) مبارک رفاقت:

جناب رسول اللہؐ اپنے شام کے سفر کی واپسی پر سیدھے سیدہ خدیجہ کے گھر تشریف لے گئے۔ جب آپؐ نے تجارتی مال کی رقوم بمعہ منافع کثیر ان کے حوالے کیں اور انھیں دوران سفر کے خاص واقعات و مشاہدات سے آگاہ کیا تو آپؐ کے انداز بیان اور آپ کی پرکشش شخصیت نے سیدہ کے قلب پر شفقت و محبت کا گہرا نقش کندہ کردیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میسرہ نے بھی رسول اللہؐ کے متعلق دوران سفر کے مشاہدات اور آپؐ کے بہترین کردار اور برتاؤ کے متعلق اپنی مالکن سے ذکر کیا۔ اس تمام آگہی اور تاثر کے بعد خاتون نے فوری طور پر طے کیا کہ اُن کی رفاقت مستقل طور پر جناب محمدؐ سے ہو جانی چاہیے۔ حالانکہ انھیں درج ذیل امور کے ضمن میں اس رفاقت پر اندیشہ تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی:

(i) نا موزوں حیثیت

(ii) بڑوں کی رضامندی

(iii) نا موزوں عمر

بہر حال جب سیدہ نے ان نا موزوں سماجی امور پر غور کیا تو انہوں نے ان امور کے متعلق مشورہ لینے اور جناب محمدؐ کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے میسرہ کو آپؐ کے پاس بھیجا۔ لیکن میسرہ اس کام کو خوبی سر انجام نہ دے سکا۔ سیدہ نے اس غرض کے لیے پھر اپنی ایک عزیزہ نفیسہ کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ جنہوں نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد رسول اللہؐ کو اس بات پر راضی کر لیا۔ لیکن جناب رسول اللہؐ نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ پھر بھی سیدہ خدیجہ سے بات کرنا چاہتے ہیں، جس کے بعد وہ اس شادی پر رضامند ہوں گے۔ لیکن تا حال سیدہ کے بزرگوں کی رضامندی ابھی باقی تھی۔ چونکہ خدیجہ کے والد حیات نہ تھے اس لیے ان کی جگہ انہیں اپنے چچا عمر ابن اسد جو قبیلہ اسد کے سردار بھی تھے، اجازت لینا تھی۔ انہیں اس رفاقت پر چنداں کوئی اعتراض نہ تھا وہ جناب رسول اللہؐ کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے تھے لیکن وہ اس بات سے خوفزدہ تھے کہ مکہ کے دیگر قبائل کے لوگ انہیں جناب محمدؐ کی غربت کے متعلق طعنہ زنی کریں گے۔

اس تمام معاملہ کے بعد ابو طالب نے خدیجہ کے خاندان والوں کو کھانے پر بلایا اور کہا کہ بیشک ان کا بھتیجا غریب ہے، لیکن ان کی اعلیٰ ظرفی، خوبصورت جوانی اور ان کا ہاشمی خاندان سے تعلق ایک بیش بہا خزانے سے کم نہیں۔ ابو طالب کی اس اپیل نے اسد قبیلہ کے بزرگوں کو قائل کر لیا اور پھر جناب محمدؐ اور خدیجہ کی رفاقت مبارک صادر ہوئی اور آپ دونوں کا نکاح ۵۹۵ عیسوی میں منعقد ہو گیا۔ اس طرح سے محمد رسول اللہؐ کا خانہ مبارک آباد ہوا اور آپؐ کے گھرانے کی بنیاد رکھی گئی۔ آپؐ کی عمر مبارک اس وقت پچیس برس اور سیدہ کی عمر مبارک اس وقت چالیس برس تھی۔ عمر کے اس فرق کے بارے میں چند تاریخ دانوں نے اختلاف کیا ہے لیکن زیادہ حضرات انہی عمروں سے متفق ہیں۔ اس وقت کے رواج کے مطابق (جو بعد میں اسلامی خاندانی قوانین کا حصہ بن گیا) شوہر کو کچھ رقم جسے مہر کہا جاتا ہے زوجہ کی خاندانی حیثیت کے مطابق زوجہ کو دینی ہوتی تھی۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے مہر کی مد میں سیدہ کو بیس عدد جوان اونٹ پیش کیے۔ یاد رہے کہ اس وقت ایک اونٹ کی قیمت چار صد چاندی کے سکے (درہم) تھے اور اس

کے مقابلے میں ایک غلام کی قیمت چار صد سے لے کر آٹھ صد تک ہوتی تھی۔

شادی کے فوراً بعد سیدہ خدیجہ کی خواہش پر جناب رسول اللہؐ انہی کے گھر منتقل ہو گئے اور وہیں پر اپنا گھر بسا کر زندگی کے ایک نئے اور خوشگوار باب کی ابتدا فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کی آیت ۸، سورہ (۹۳) الضحیٰ۔ اسی موقعہ کے اعتبار سے بیان کرتی ہے کہ "اور ہم (اللہ) نے تمہیں غریب پایا تو غنی کر دیا"۔

اس خوشی کے موقع پر آپؐ کی رضاعی والدہ جناب حلیمہ آپؐ کو مبارکباد دینے کی غرض سے آئیں۔ جناب رسول اکرمؐ نے انہیں ایک اونٹ اور چالیس بھیڑوں کا تحفہ عطا فرمایا۔ آپؐ کی یہ مبارک رفاقت پچیس برس تک قائم رہی یعنی کہ اُم المومنین کی وفات تک جو ۶۲۰ء میں ہوئی۔ رسول اکرمؐ نے ان کی حیات میں کوئی اور شادی نہیں کی۔ سوائے ایک کے تمام اولاد انہی میں سے تھی۔ سیدہ خدیجہؓ ہمیشہ اپنے شوہر سے محبت کرنے والی اور غمگسار خاتون تھیں، وہ ہمیشہ مشکل کے وقت رسول اللہؐ کی ڈھارس بندھاتیں اور تسلی دیتیں۔ وہ آپ کی عظمت سے خوب واقف تھیں اور آپؐ کے مشن و مقصد کی کامیابی کے لیے ہمہ تن آپ کی مدد کے لیے تیار رہتیں۔ ان کو پتا چل گیا تھا کہ ان کے شوہر مستقبل کے معمار قوم ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ انہیں بہت بڑی عظمت اور فضیلت سے ہمکنار کرنے والے ہیں۔ اس بات کا اندازہ انہوں نے میسرہ کی باتوں سے ہی لگا لیا تھا، لیکن بعد میں ان کے چچا زاد ورقہ بن نوفل کی پیش گوئی کے مطابق یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ پیغمبر ہونے والے ہیں۔ اس طرح سے ان کو مسلمانوں میں پہلی شخصیت ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا جنہوں نے محمدؐ کو اللہ کا رسول جانا اور پھر جب آپؐ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تو سیدہ خدیجہؓ کو ہی یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ پہلی مسلمان شخصیت بنیں۔

(د) رسول اکرمؐ کی فیاضی:

جناب رسول اللہؐ نے اپنی شادی کے پہلے ہی روز اپنی کنیز جن کو انہوں نے وراثت میں اپنے والد کی طرف سے پایا تھا، آزاد کر دیا۔ ان کا نام برکہ اور کنیت اُم ایمن تھی، انہیں یہ شرف حاصل تھا کہ انہوں نے رسول اللہؐ کی بیس برس تک دیکھ بھال کی۔ جب رسول اللہؐ کی تین بڑی صاحبزادیوں کی شادی ہو گئی تو اُم ایمنؓ واپس رسول اللہ کے پاس آ گئیں اور آپؐ کے پاس گھر کے فرد کی حیثیت سے رہنے لگیں۔ یاد رہے کہ جناب رسول اللہؐ ان کا احترام ایک رضاعی والدہ

کی حیثیت سے کرتے تھے کیونکہ ایک تو انہوں نے آپ کی بچوں کی طرح دیکھ بھال کی اور دوسرے یہ کہ وہ آپؐ کے والد صاحب کی کنیز تھیں۔

(ہ) رسول اللہؐ کی اپنے غلام کے لیے شفقت و محبت:

جب آپؐ نے شادی کے پہلے ہی روز ام ایمن کو آزاد فرمایا تو سیدہ خدیجہؓ نے اسی وقت آپؐ کی خدمت میں اپنا ایک پندرہ سالہ غلام زید بن حارثہ پیش کیا۔ اس بچے کو اپنے اجداد پر فخر تھا، ان کے والد حارث کلب خاندان سے اور والدہ طئے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خاندان عراق اور شام کے درمیانی علاقے میں رہتا تھا، او رمعزز خاندانوں میں سے ایک تھا۔ رسول اللہؐ کے پاس دوران قیام زید بن حارث نے اپنے خاندان کے کچھ لوگوں کو حاجیوں کے درمیان دیکھ کر پہچان لیا اور ان کے ذریعہ اپنے گھر والوں کو وہاں اپنی موجودگی کے متعلق پیغام پہنچایا۔ چنانچہ زید کے والد فوری طور پر وہاں پہنچے اور رسول اللہؐ سے کسی پسندمعاوضے کے عوض اپنے بیٹے کی رہائی کی درخواست کی۔ جناب رسولؐ اللہ نے جو مجسم رحمت تھے، جواب دیا کہ بے شک زید تمہارا ہی بیٹا ہے اور تمہیں اس کے لیے کوئی معاوضہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے تو ضرور اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ لیکن زید نے اپنے والد کے ساتھ جانے پر رسولؐ اللہ کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دی۔ جب ان کے والد نے حیرانگی کا اظہار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ”میں نے اس شخصؐ میں ایسی چیزیں دیکھی ہیں کہ اب ان کے مقابلے میں کسی اور کو ترجیح نہیں دے سکتا''۔ ان کا یہ جواب سن کر جناب رسول اللہؐ ان لوگوں کو لے کر کعبے کے سامنے آ گئے اور اعلان کیا کہ شہادت والے گواہ رہیں کہ اب زید ان کا بیٹا بن گیا ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کی وراثت کے حقدار ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد زید کی غلامی کا دور ختم ہو گیا اور وہ اب رسول اللہؐ کے گھر کا ایک فرد بن گیا اور ان کی حیثیت گھر کے سب سے بڑے بچے کی رہی۔

اب مکہ کے لوگوں نے زید کو زید بن محمدؐ کے نام سے پکارنا شروع کر دیا لیکن بعد از یں جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کی سورہ احزاب ۳۳، آیت (۵) میں احکام صادر فرمایا کہ ہر شخص کو اس کے والد کے نام سے پکارا جائے تو اس کے بعد وہ پھر سے زید بن حارث کے نام سے پکارے جانے لگے لیکن اب بھی وہ رسول اللہؐ کو ویسے ہی عزیز اور پیارے تھے جیسا کہ اس سے قبل صرف وہی نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے اسامہ بن زید بھی رسول اللہ کو بہت عزیز تھے بلکہ ہمیشہ عزیز رہے۔

(و) رسول اللہ کا علی بن ابی طالب کی پرورش کا ذمہ لینا:

جب رسول اللہؐ کی عمر مبارک ۳۵ سال تھی اور مکہ قحط سالی کی زد میں تھا اس وقت انہوں نے چاہا کہ وہ اپنے چچا ابو طالب کی مدد کریں، کیونکہ ابو طالب مالی طور پر خوشحال نہ تھے لہٰذا جناب رسول اللہؐ نے اپنے چچا عباس جو کہ خوشحال اور امیر تھے مشورہ دیا کہ وہ اپنے بھائی ابو طالب کی مدد اس طرح سے کریں کہ ان کے ایک بچے کی پرورش کی ذمہ داری لے لیں۔ اس مشورہ پر ابو طالب نے کہا کہ جو کچھ کرنا ہے کریں لیکن عقیل اور طالب کو میرے پاس رہنے دو۔ لہٰذا باقی کے دو بیٹوں میں سے عباسؓ نے جعفرؓ کی ذمہ داری اور جناب رسول اللہؐ نے علیؓ کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس وقت علیؓ کی عمر پانچ برس تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ جناب رسولؐ اللہ کے فرزند عبداللہ کی وفات ہوئی تھی۔ لہٰذا علیؓ اپنی بہنوں زینبؓ اور رقیہؓ اور رضائی بھائی زیدؓ کے ساتھ رسولؐ اللہ کے کنبے کے فرد بن گئے۔ علیؓ اور زینب تقریباً ایک ہی عمر کے تھے۔

(ز) دختران پیغمبرؐ کی شادیاں:

رسولؐ اللہ کی سب سے بڑی صاحبزادی زینبؓ کی شادی سیدہ خدیجہؓ کی بہن ہالہ کے بیٹے ابو العاص ابن الربیع کے ساتھ ہوئی۔ بعد میں رسولؐ اللہ کے چچا ابولہب نے اپنے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے لیے دختران رسولؐ رقیہؓ اور ام کلثومؓ کو مانگا اور یوں یہ شادیاں ہو گئیں۔

لیکن جب محمدؐ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا اور بتوں کی اہمیت کو رد فرمایا تو ابولہب جناب رسولؐ اللہ کا سب سے بڑا دشمن بن گیا اور خود اس نے ان نکاحوں کو ختم کر دیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے بھی ان رشتوں کو پسند نہ فرمایا ہو گا کہ ان کے رسولؐ کی بیٹیاں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمن کے گھر رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان محترم خواتین کو بہت اعلیٰ انسان کا ساتھ عطا فرمایا، وہ یہ کہ ان دونوں کی شادی یکے بعد دیگرے جناب عثمانؓ بن عفان سے ہوئی۔ رسول اکرمؐ کی چوتھی بیٹی فاطمہؓ کی شادی رسولؐ اللہ کے لے پالک علیؓ بن ابو طالب کے ساتھ ۶۲۲ عیسوی میں ہوئی۔

(۲۱) چند منطقی استخراج

اس وقت تک جناب رسولؐ اللہ کی زندگی کا جو مطالعہ کیا گیا ہے اس میں سے چند منطقی استخراج سامنے آتے ہیں جن کا تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا معاشرے کے لیے سود مند رہے گا اور ہمیں چند اصول وضع کرنے میں مدد دے گا۔

(الف) جہیز (Dowry):

جہیز کا مطلب ہے کہ کچھ ملک خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو یعنی گھر کا ساز و سامان، جائیداد، نقد روپیہ، زیورات وغیرہ جو کہ ایک خاتون اپنے ساتھ لاتی ہے، اپنے شوہر کے گھر، ایسی تمام املاک کو جہیز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسلامی معاشرے کے کسی قانون یا رسم و رواج میں اس رسم یا دستور کا نام و نشان نہیں ہے۔ اور شرعی طور پر ایسی ملک کے لانے پر اصرار کرنا یا خواہش کرنا شرعی طور پر جائز نہیں۔ یعنی نہ یہ فرائض میں شامل ہے، نہ سنت رسول اللہؐ میں اور نہ ہی اسلامی معاشرے نے اس کی ہمت افزائی کی۔ آج بھی رسول اللہؐ کے وصال کے چودہ صد برس بعد مکہ اور مدینہ میں یہ رواج رائج نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ تمام عرب ممالک کے مسلمان اس رواج سے واقف ہی نہیں۔

بلکہ اصل معاملہ یوں ہے کہ یہ غیر شرعی رواج صرف برصغیر کے مسلمانوں میں ہی پایا جاتا ہے، جو انہوں نے ہندو معاشرتی غلبے کی وجہ سے اختیار کیا۔ بہر حال مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جہیز کی طلب قطعاً حرام و غیر قانونی اور ہندوؤں کی تقلید ہے۔

ہندو معاشرہ میں تو اس رواج کی بہت اہمیت ہے کیونکہ ہندو خواتین کو ہندو قوانین کے مطابق وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ جبکہ مسلمان خواتین خواہ وہ کسی بھی رشتہ پر ہوں یعنی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی وہ وراثت میں حقدار ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ بے دین مسلمان اپنی خواتین کو ان کی وراثت سے محروم کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب کے حقدار بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی مسلمان اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی بہن یا بیٹی کی خوشنودی کے لیے اسے اپنی زندگی میں تحفے کے طور پر جو چاہیں دے سکتے ہیں لیکن وہ بہن یا بیٹی وراثت میں سے پورا پورا حصہ پائے گی۔

رسول اکرمؐ نے اپنی کسی زوجہ سے جہیز طلب نہیں فرمایا اور نہ ہی اپنی کسی بیٹی کو دیا۔ سوائے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی فاطمہؓ کو چند تحائف دیے۔ ان تحائف میں ایک چادر بچھانے کے لیے ایک تکیہ جو کھجور کے پتوں سے بھرا ہوا تھا اور ایک بکرے کی کھال کا مشکیزہ اور ایک جو پیسنے کے لیے پتھر کی چکی اور دو عدد مٹی کے برتن۔ انہوں نے اگر دوسری بیٹیوں کو کوئی ایسا ہی تحفہ دیا ہو تو وہ تاریخ میں مذکور نہیں ہے۔

(ب) مہر:

شادی کے وقت شوہر پر لازم ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو شادی کے موقع پر کچھ زر یا ملک پیش کرے۔ یہ زر یا ملک پہلے سے طے شدہ ہونا چاہیے، دونوں کی باہم رضامندی کے مطابق، اس زر یا ملک کو مہر کہا جاتا ہے۔ یہ اصول یا رسم اہل عرب میں اسلام سے پہلے سے موجود تھی، جو بعد میں اسلامی خاندانی قوانین کا حصہ بن گئی۔ عام طور پر مہر کی رقم خاتون کی حیثیت کے مطابق یا خاتون کے خاندان کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ رقم ان تمام تحائف یعنی لباس، زیورات یا کسی اور تحفے کے علاوہ ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مہر کی مد میں زیورات دے دیے جائیں جن کی اصل مالیت طے شدہ ہو۔ وہ تمام ملک اور زر اور دیگر تمام تحائف و زیورات و نقد رقوم جو خاتون کو تحائف کی صورت میں اور مہر کی صورت میں دیے جاتے ہیں، وہ کلی طور پر خاتون کی ملکیت ہوتے ہیں، اور ان کی کسی بھی وقت کسی بھی طرح سے کسی بھی خاندانی فرد کا اپنے قبضے یا صرف میں لینا غیر قانونی اور غیر شرعی ہے۔ ایسی ملک کے صرف اور قبضے کی حقدار صرف اس کی مالک ہی ہوگی۔ اگر مہر کی رقم شادی کے موقع پر نہ ادا کی گئی ہو اور آئندہ ادائیگی کا وعدہ کیا گیا ہو تو وہ رقم کسی وقت بھی طلب کی جا سکتی ہے اور شوہر کے فوت ہو جانے کی صورت میں اس کی جائیداد سے تقسیم وراثت سے قبل اسی طرح منہا کی جائیگی، جیسا کہ قرض۔

مہر کی رقم جتنی زیادہ ہو سکتی ہے، اسی طرح سے اتنی قلیل بھی ہو سکتی ہے جتنی کہ لوہے کی ایک انگوٹھی۔ یہاں تک کہ خاوند کی خدمات کے عوض بھی مہر کی ادائیگی کی جا سکتی ہے۔ عام طور پر یہ رقم اتنی ہونی چاہیے جسے شوہر آسانی سے فوری طور پر ادا کر سکے لیکن احسن طریقہ یہ ہے کہ یہ رقم خاتون یا اس کے خاندان کی حیثیت کو مدنظر رکھ کر طے کی جائے۔

یاد رہے کہ بیان کردہ تمام قوانین شرعی طور پر جائز تو ہیں لیکن کسی بھی صورت میں جناب رسول اللہؐ کی سنت کے مطابق نہیں ہیں۔ جیسا کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں عام طور پر جانا اور مانا جاتا ہے، کہ مہر کی رقم (۳۲) بتیس روپے شرعی رقم ہے، اس وقت یہ رقم آدھے ڈالر سے بھی کم ہے اس رقم کو سنت کے مطابق ظاہر کرنا یا شرعی قانون کے مطابق کہنا سراسر غلط اور دھوکہ ہے۔

(ج) مہر، رسول اللہؐ کی سنت کے مطابق:

بیشتر تاریخ دانوں اور علماء نے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے سیدہ خدیجہؓ کو مہر کی مد میں

تیس جوان اونٹ پیش کیے تھے۔ اس وقت ایک جوان اونٹ کی قیمت چار صد درہم (چاندی کا سکہ) تھی۔ ابن ہشام نے بھی یہی لکھا ہے اور مزید یہ لکھا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنی آٹھ شادیوں کے موقع پر یعنی (۱) سیدہ عائشہؓ (۲) سیدہ سودہؓ (۳) سیدہ زینبؓ بنت جحش (۴) سیدہ حفصہؓ (۵) سیدہ اُم حبیبہؓ (۶) سیدہ جویریہؓ (۷) سیدہ میمونہؓ (۸) سیدہ زینبؓ بن خزیمہ کو چار صد درہم (چاندی کا سکہ) ادیے تھے۔

لیکن حقیقت کچھ یوں ہے کہ جناب رسول اللہؐ کا نکاح سیدہ اُم حبیبہؓ کے ساتھ حبشہ کے بادشاہ نے جناب رسول اللہؐ کی غیر موجودگی میں آپ کی خواہش کے مطابق کر لیا تھا، اور اپنے پاس سے سیدہ کو چار صد دینار (سونے کے سکے) بطور مہر جناب رسول اللہؐ کی جانب سے ادا کیے تھے۔ کچھ تاریخ دانوں نے یہ رقم بھی چار صد درہم لکھی ہے، لیکن مصنف کا قیاس قوی ہے کہ ایک بادشاہ نے درہم نہیں بلکہ دینار ہی دیے ہوں گے، کیونکہ درہم دینا اس کی شان کے خلاف تھا۔

مصنف کا یہ قیاس قوی ہے کہ سیدہ زینبؓ بن جحش کو رسول اللہؐ نے مہر کی مد میں کوئی رقم ادا نہیں کی ہوگی۔ کیونکہ یہ نکاح تو اللہ تعالیٰ کی ذات نے خود کیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس نے اس نکاح کا اعلان آیت (۳۷) سورہ (۳۳) احزاب میں اس طرح سے کیا کہ "پھر جب زید نے اپنا مقصد پورا کر لیا (یعنی جب سیدہ کو طلاق دے دی اور انہوں نے اپنی عدت پوری کر لی)، ہم (اللہ) نے اسے (سیدہ کو) دے دیا تمہیں (رسول اللہؐ کو) شادی میں اور اللہ کا حکم پورا کیا جانا چاہیے"۔

امام ابن کثیرؒ نے اس آیت مبارکہ کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ: "جب ان (زینبؓ) کی زید سے علیحدگی ہوگئی یعنی طلاق ہوگئی تو ہم نے (اللہ نے) اسے تمہارے (محمدؐ) نکاح میں دے دیا اور وہ (اللہ) جو اس (زینبؓ) کا ولی تھا اس نکاح میں، وہ (اللہ) خود تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے الہام کیا اپنے نبیؐ پر کہ وہ جائے اس کے پاس بغیر کسی ولی کے، کسی معاہدے کے، کسی مہر کے یا کسی گواہ کے (جن کی کسی نکاح کے وقت ضرورت ہوتی ہے)" اور اس اعزاز پر سیدہ کو بہت فخر تھا۔

پس یہ ثابت ہوا کہ نہ تو کوئی مہر اس نکاح میں طلب ہوا اور نہ ادا ہوا اور نہ کوئی ولی ٹھہرا نہ گواہ۔ پس یہ صرف حکم خاص تھا اللہ تعالیٰ کا اپنے رسولؐ کے لیے۔ اس کے علاوہ دو اور مثالیں ہیں جہاں مہر ادا نہیں کیا گیا۔ ایک تو خیبر کے سردار حیی بن اخطب کی بیٹی سیدہ صفیہؓ اور دوسری بنو

مصطلق کے سردار حارث بن ابو ضرار کی بیٹی سیدہ جویریہؓ۔ کیونکہ جناب رسول اللہؐ سے ان دونوں کی شادی حادثاتی طور پر ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ دونوں خواتین خیبر اور بنو مصطلق کے قیدیوں میں سے تھیں اور انہوں نے کسی شخص کی کنیز بننا پسند نہیں کیا اور احتجاج کے بعد جناب رسول اللہؐ کے پاس مدد کے لیے حاضر ہوئیں کہ وہ انہیں کنیز بننے سے بچائیں۔ جناب رسول اللہؐ نے ان پر مہربانی فرما کر انہیں یہ پیشکش کی کہ اگر وہ اسلام کو پسند کرکے ان کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں تو وہ انہیں آزاد کرنے کی رقم ادا کر دیں گے۔ لہٰذا انہوں نے اس عزت افزائی کو پسند کیا اور مہر کا معاملہ وقوع پذیر نہ ہوا۔ بلکہ یوں سمجھا جائیگا کہ ان کی آزادی کا بندوبست ہی ان کا مہر تھا۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ پانچ موقعوں پر جناب رسول اللہؐ نے چار صد درہم مہر ادا فرمایا۔

(د) فی زمانہ سنت مہر کی مالیت:

فی زمانہ سنت مہر کی مالیت لگانے کے لیے ہمیں جناب رسول اللہؐ کے زمانے کی قیمتوں کا اندازہ لگانا ضروری ہوگا یعنی کہ ایک اونٹ کی کیا مالیت تھی یا یہ کہ درہم یا دینار کی کتنی طاقت خرید تھی۔ اونٹ کو اس زمانہ میں ریت کا جہاز کہا جاتا تھا، ایک اونٹ کی اس وقت حیثیت آج کی مرسڈیز کار سے کم نہ تھی، کیونکہ ایک اونٹ عرب کے بدو کے لیے زندگی اور موت کی اہمیت رکھتا تھا۔ اس وقت ایک اونٹ چار صد درہم کی مالیت رکھتا تھا جبکہ چار صد کی اسی (۸۰) بھیڑیں یا پھر بیس (۲۰) بکریاں آتی تھیں۔ ایک انسان کی قیمت ایک غلام کی شکل میں چار صد سے لے کر آٹھ صد تک تھی، جس کا اندازہ اس کی عمر اور طاقت یا صلاحیت سے لگایا جاتا۔ لہٰذا ۲۰۰۷ عیسوی میں درہم کی قیمت کی برابری کا اندازہ کرنے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

فی زمانہ ذرائع نقل و حرکت کے وسائل کی وجہ سے اونٹ کی وہ وقعت نہیں رہی جو کہ ساتویں صدی عیسوی میں تھی، لیکن اونٹ کا متبادل ایک موٹر کار نے لے لیا ہے۔ لہٰذا اونٹ کی قیمت کا اندازہ کار کی قیمت کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ فی زمانہ ایک معمولی درجے کی پرانی کار کی قیمت پانچ ہزار ڈالر ہے اور چونکہ امریکہ میں اونٹ نہیں ہوتا وہاں اگر اونٹ کہیں سے منگوایا جائے تو وہ بھی پانچ ہزار ڈالر سے کم نہیں ملے گا، اسی طرح سے ۸۰ بھیڑیں بھی پانچ ہزار ڈالر کی ملیں گی۔ جبکہ ۲۰ بکریاں دو ہزار ڈالر میں آئیں گی۔ اس طرح سے اس رقم کا اوسط چار ہزار ڈالر یعنی دو لاکھ چالیس ہزار روپے یا پندرہ ہزار سعودی ریال ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ درہم

چاندی کا سکہ تھا جس کا وزن تقریباً بارہ گرام ہوتا تھا، جبکہ دینار تقریباً دس گرام سونے کا اور یہ چاندی اور سونے کے سکے بیسویں صدی کے وسط تک رائج الوقت رہے۔ اس لیے درہم کی قیمت فی الوقت چاندی کی قیمت کی مناسبت سے بحساب ۴۴ سینٹ ($0.44) فی گرام کے حساب سے $8.28 فی درہم بنتی ہے اس طرح چار صد درہم کی قیمت (2112) دو ہزار ایک صد بارہ ڈالر یا ایک لاکھ چھبیس ہزار سات صد بیس روپے پاکستانی یا سعودی ریال سات ہزار نو صد بیس بنتے ہیں (یہ قیمتیں ۲۰۰۷ کی ہیں)۔

اس طرح سے چونکہ جناب رسالت مآب نے اپنی پانچ شادیوں کے موقع پر چار صد درہم مہر ادا فرمایا لہٰذا سنت کے مطابق یہی مہر بنتا ہے جس کی فی زمانہ رقم کا اندازہ بتایا جا چکا ہے۔

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ بتیس روپے مہر جناب رسول اللہؐ نے اپنی دختر فاطمہؑ کے لیے رکھوایا تھا تو اس بارے میں سمجھ لینا ضروری ہے کہ جناب رسول اللہؐ کی پہلی تین دختران کے مہر کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔ جبکہ سیدہ فاطمہؑ کا مہر چار صد مثقال چاندی تھا حالانکہ جناب علیؑ درویش تھے اور کوئی کاروبار نہیں کرتے تھے اور اس وقت یعنی شادی کے موقع پر ان کی کل جائیداد میں صرف ایک ڈھال تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی شادی کا اہتمام کرنے کے لیے وہ ڈھال ہی فروخت کی گئی تھی، اب یہ پتا نہیں کہ وہ ڈھال کتنی رقم میں فروخت ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ مہر میں ادا کی جانے والی چار صد مثقال چاندی جناب علیؑ کے کسی بڑے نے دی ہو، ہوسکتا ہے کہ ام المومنین میں سے کسی نے دی ہو۔ بہر حال ایک مثقال کا وزن (۲۰) بیس قیراط کے برابر یعنی (۴) چار گرام ہوتا ہے اس لیے چار صد مثقال کا وزن سولہ سو گرام ہوا اور موجودہ چاندی کے بھاؤ کے مطابق اس کی مالیت سات صد چار ڈالر یا دو ہزار چھ صد چالیس سعودی ریال یا چالیس ہزار دو صد چالیس روپے پاکستانی بنتی ہے (یہ قیمتیں ۲۰۰۷ کی ہیں)۔

چونکہ بتیس (۳۲) روپے مہر کا رواج ہند و پاکستان میں دو صد سال سے بھی پہلے کا معلوم ہوتا ہے اگر ان بتیس روپوں کی قیمت کا اندازہ لگایا ہو تو وہ بھی تین صد چوراسی (۳۸۴) گرام چاندی کی قیمت سے لگایا جاسکتا ہے یعنی موجودہ دور میں اتنی چاندی ایک صد ستر ڈالر یا چھ صد تینتیس سعودی ریال یا دس ہزار ایک صد چالیس روپے پاکستانی ہوتی ہے۔

لہٰذا کسی بھی اعتبار سے یا کسی بھی طریقہ یا حساب سے مبلغ (۳۲) بتیس روپے مہر شرعی یا

سنت رسول اللہؐ کے اعتبار سے نہیں بنتا۔ لہٰذا اس طرح سے سنت رسولؐ کے نام پر کوئی بھی غلط کام کرنا گناہ کبیرہ کا درجہ رکھتا ہے۔

(ہ) ولیمہ:

جناب رسول اللہؐ کی حیات مبارک کے دوران اور آپؐ کے صحابہ کی زندگی کے دوران حتیٰ کہ آج بھی اہل عرب خاص طور پر مکہ اور مدینہ کے لوگوں میں یہ روایت یا رواج نہیں پایا جاتا کہ کسی شادی کے موقع پر خاتون یا اس کے گھر والے براتیوں کو یا دیگر عزیز و اقارب کو کھانے کی دعوت پر مدعو کریں۔ بلکہ شادی کے بعد دولہا اپنی طرف سے اپنے تمام عزیز و اقارب و احباب کو کھانے کی دعوت پر بلاتا تھا اور آج بھی یہی طریقہ رائج ہے۔ جہاں تک رسول اللہؐ کی سنت مبارکہ کا سوال ہے تو آپؐ ہمیشہ اپنی طرف سے اپنے احباب کو کھانے کی دعوت پر مدعو فرماتے۔ صرف ایک شادی کے موقع پر یعنی جب آپ صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ تشریف لے گئے اور وہاں آپ کے چچا جناب عباسؓ کی تجویز پر سیدہ میمونہؓ سے عقد فرمایا اور جب آپؐ نے ولیمہ کی دعوت کرنی چاہی تو حسب معاہدہ آپؐ کو مزید مکہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی، صرف اس عقد میں ولیمہ نہ ہوسکا، ہوسکتا ہے کہ مدینہ واپسی پر دعوت ولیمہ کی گئی ہو۔ اس کے علاوہ جب آپؐ کا نکاح سیدہ ام حبیبہؓ سے حبشہ کے مقام پر وہاں کے بادشاہ جناب نجاشیؓ نے ادا کیا تو انہوں نے خود جناب رسول اللہؐ کی طرف سے دعوت ولیمہ کی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دعوت ولیمہ رسول اللہؐ کی سنت مبارکہ اور آپؐ سے پہلے انبیاء کی بھی سنت رہی ہے۔

(و) متبنیٰ کرنا (Adoption):

اسلام میں کسی بچہ کو متبنیٰ کرنا ناجائز نہیں ہے لیکن اس کے لیے شرط رکھی گئی ہے کہ اس بچے کو اس کے والد کا ہی نام دیا جائے، اور یہ شرط اللہ تبارک تعالیٰ نے قرآن کی سورۃ (۳۳) احزاب کی آیت (۵) میں لگائی، یہ آیت زیدؓ بن حارثہ کے ضمن میں نازل ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ بچے کے اصلی والد کا اتہ پتہ معلوم نہ ہوسکے تو بھی اس کے نام کے ساتھ متبنیٰ بنانے والے کا نام کسی صورت نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہے۔ بلکہ ایسے بچے کی ولدیت عبداللہ (یعنی اللہ کا بندہ) رکھ دینی چاہیے اور یہ بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ ایسے لے پالک کو گود لینے والی ماں اپنا دودھ پلائے، بیشک اس کا دودھ

ہو یا نہ ہو، امکان قوی ہے کہ بار بار کوشش کرنے سے زیادہ نہیں تو ایک آدھ قطرہ ہی بچے کے منہ میں چلا جائے گا، اس طرح سے اس خاندان سے بچے کا رضاعی رشتہ بھی قائم ہو جائے گا۔

(۲۲) رسولؐ اللہ کی حجرِ اسود کے بارے میں ثالثی

اعلانِ نبوت کے پانچ سال قبل اہلِ قریش نے کعبہ کی تعمیرِ نو کا فیصلہ کیا کیونکہ اس کی دیواریں سیلاب کی وجہ سے شکستہ ہو گئی تھیں اور اس پر چھت بھی نہیں تھی۔ اس لیے اہلِ قریش نے اعلان کیا کہ لوگ چندہ اکٹھا کریں تاکہ کعبہ کی تعمیرِ نو کی جا سکے لیکن چندے کا تمام روپیہ پاک کمائی سے ہونا چاہیے۔ مشرکین بھی کعبہ کو عبادت کی پاک ترین جگہ سمجھتے تھے، حالانکہ وہ بت پرست تھے اور کعبہ کے اندر اور باہر انہوں نے بت رکھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ اللہ کو بھی مانتے تھے اور کعبہ کو اللہ کا گھر سمجھتے تھے لیکن مشرک اور بت پرست تھے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی کعبے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ قرآن حکیم کی سورۃ (۳) آلِ عمران کی آیت (۹۶) میں کہا گیا ہے کہ "بے شک، پہلا گھر (عبادت کے لیے) جو انسانوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہ بکہ (مکہ) میں تھا، برکتوں سے بھرپور اور رہنمائی کے لیے عالمین کی (یعنی جن و بشر کی)"۔

قرآن میں دوسری جگہوں پر کعبہ کو بیت العتیق (قدیم گھر) اور بیت الحرام (حرمت والا گھر) کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔

ایک سیاہ پتھر کعبے کے دروازے کے ساتھ والے کونے میں جڑا ہوا ہے اور ہر حاجی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کعبے کا طواف کرنے سے قبل اس پتھر کو بوسہ دے۔ یہ جنابِ خلیل اللہ ابراہیم کی سنت ہے۔ کعبے کی دیکھ بھال، اس کے حاجیوں کی خدمت اور بے شک کعبے کے طواف کے لیے جانا بڑے اعزاز بھرے اور برکتوں کا باعث ہے۔

بہر حال اہلِ قریش نے حلال رقم اکٹھا کر کے کعبے کی تعمیرِ نو کا کام آپس میں تقسیم کر لیا۔ دورانِ تعمیر جب حجرِ اسود کو اس کے مقام پر دوبارہ لگانے کا وقت آیا تو قریش کے قبائل میں ایک اختلاف ابھر کر سامنے آیا۔ چونکہ اس پتھر کو اٹھانا اور اس کی تعمیر کی جگہ رکھنے کا کام بہت اعزاز کی بات سمجھی جا رہی تھی، لہٰذا ہر قبیلہ اس کام کو سرانجام دینے کی خواہش کا اظہار اس شدت سے کر رہا تھا کہ ان میں باہم ایک بہت بڑے فساد و جنگ ہونے کے آثار نمایاں ہو گئے۔ چونکہ یہ صورتحال

بہت خطرناک تھی لہٰذا اس معاملہ کو رفع دفع کرنے کے لیے قریش کے ایک بزرگ نے تجویز پیش کی کہ اگلی صبح جو بھی شخص کعبہ میں داخل ہو گا اسے ثالث بنا لیا جائے تاکہ وہ اس معاملے کا فیصلہ کرے۔ تمام لوگ اس مشورے پر راضی ہو گئے۔

اگلی صبح کعبے میں داخل ہونے والا پہلا شخص ہر دل عزیز محترم و معزز محمدؐ تھے جنہیں دیکھ کر ہر کوئی پکار اٹھا کہ "یہ تو الامین ہیں یہ تو محمدؐ ہیں"۔ چنانچہ جنابِ رسولؐ اللہ نے تمام معاملہ جاننے کے بعد ان سے ایک چادر طلب کی اور اپنے مبارک ہاتھوں سے حجرِ اسود اٹھا کر اس چادر کے درمیان رکھ دیا اور پھر ہر قبیلہ سے ایک نمائندہ شخص کو طلب کر کے ہر ایک کو چادر کونوں سے اٹھانے کے لیے کہا اور پھر جنابِ رسالت مآبؐ نے خود پتھر اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دیا۔

یہ بہت ہی معاملہ فہم ثالثی تھی جسے ہر قبیلہ و شخص نے سراہا اور اس کی وجہ سے مکہ کے لوگ ایک خوفناک جنگ سے بچ گئے، اس کے علاوہ اہلِ مکہ کو جنابِ محمدؐ کی دانش اور حکمت کا بھی اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا۔

(۲۳) جنابِ محمدؐ سچائی کی تلاش میں

جنابِ محمدؐ بن عبداللہ کو زمانے اور زندگی کی سختیوں نے مجاہدہ و مشاہدہ، سوچ و بچار، قوتِ ارادہ و قیاس کو بہتر سے بہتر بنا دیا۔ اب آپؐ اس سوچ و بچار میں مشغول ہو گئے کہ وہ ان اصولوں کا پتا لگا سکیں جو ان کے ماحول کی سماجی اور اخلاقی حالت کو قابلِ قبول انسانی اقدار کے مطابق پیش کر سکیں۔ اس کے علاوہ وہ مابعد الطبیعیاتی حقیقت کے متعلق جاننے کے لیے بہت شدت کے ساتھ مائل ہو گئے یعنی وہ اس حقیقت کو جاننا چاہتے تھے کہ ہستی کیا ہے اور اس ہستی کے ظہور پذیر ہونے کی وجہ یا ذریعہ کیا ہے۔ وہ موت اور زندگی کی حقیقت جاننا چاہتے تھے، وہ خالق و مخلوق کے رشتے کو جاننے کی تمنا رکھتے تھے۔ وہ ہونے یا نہ ہونے کی حقیقت سے واقف ہونا چاہتے تھے۔

یہ سوچ و بچار کوئی نئی نہ تھی، آپؐ سے قبل بہت سے مفکر اور انبیاء ان موضوعات پر توجہ و فکر کر چکے تھے اور اپنے اپنے خیالات کا بھی اظہار کر چکے تھے لیکن اس بدوانہ معاشرہ میں، جس میں آپؐ قیام پذیر تھے، ان کے لیے یہ بالکل نئی فکر تھی۔ درحقیقت اس طرح کی اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی سوچ و فکر مسلسل ہر پروان چڑھنے والی تہذیب میں رہی ہے لیکن علماء اور فقہا اور

مفکرین کی وہ جماعت جو اس سوچ سے منسلک ہوئی وہ اپنی منزل پانے میں ہمیشہ ناکام رہی، سوائے ان حضرات کے جنہیں الہامی علوم کی آگہی نصیب ہوگئی، ایسی آگاہی خواہ بل واسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ آج تک کوئی بھی مفکر خواہ سقراط، ارسطو، ڈیکارٹ، کانٹ یا کوئی مذہبی رہنما جیسے مہدھا یا کنفیوشس وغیرہ نے الہامی علوم کی طرف نظر نہیں دوڑائی اور اس طرح سے اس سے مستفید نہ ہو سکے، حالانکہ ہر اس دور میں الہامی علم موجود تھا۔ ان کے برعکس اللہ کے پیغمبروں نے ان علوم کا احاطہ پہلے تو اپنے مراقبے اور ادراک کے ذریعہ کیا اور پھر بعد میں بل واسطہ اور بلاواسطہ الہام کے ذریعے سے اپنے علم کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ جناب محمدؐ رسول اللہ، نبوت سے پہلے تقریباً دس برس تک اسی حقیقت کو تلاش کرنے کی تگ و دو میں لگے رہے۔ وہ اس بات کا ادراک حاصل کرنا چاہتے تھے کہ ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے اور یہ کہ حیات و موت، خالق اور مخلوق، کائنات اور انسان وغیرہ کے درمیان کیا رشتے ہیں، تاکہ مقصدِ حیات معلوم کرنے کے بعد صحیح طور پر زندگی گزاری جا سکے۔ اس لیے انہوں نے اپنی ادراکی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے عرب کا روایتی طریقہ اپنایا۔ آپؐ کے دادا عبدالمطلب بھی اسی طرح کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اور اپنی روحانی قوت بڑھانے کے لیے کسی ویرانے کی تنہائی اختیار کرتے۔ اس طرح کے مراقبے کو اہلِ عرب "اعتکاف" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ طلوعِ اسلام کے بعد جب دو ہجری میں روزے فرض ہوئے تو ماہِ رمضان کے آخری عشرہ میں مسجد میں اعتکاف کرنا جناب رسولؐ اللہ کی سنت بن گیا جس کی تقلید آپؐ کے اصحابؓ نے بھی کی اور ہنوز ہو رہی ہے۔

لہٰذا جناب محمدؐ نے اپنے دادا کی طرح حق کی تلاش میں اعتکاف کی غرض سے پہاڑ کی چوٹی کے ویرانے میں ایک غار منتخب فرما لیا۔ اس پہاڑ کو جبلِ نورؔ اور غار کو غارِ حرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ مکہ شہر کے دو کلومیٹر باہر ہے یقیناً اس زمانہ میں یہ جگہ بہت زیادہ ویران ہوگی اور اس پر چڑھنا اور وہاں قیام پذیر ہونا بہت مشکل ہوگا۔ بلکہ آج اس زمانہ میں بھی کافی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی پہاڑی کی چوٹی جس کے دوسری طرف غار ہے ایک ویرانے کا منظر پیش کرتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس کی چوٹی سے کعبہ اس طرح نظر آتا ہے جیسے ماچس کی ڈبیا۔ بہر حال اپنی روحانی طاقت کو یکسو ہو کر غور و فکر کرنے کے لیے یہ بہت ہی

زیادہ موزوں جگہ تھی۔

جناب رسولؐ اللہ تقریباً سات برس کے عرصہ تک کچھ دنوں کے لیے بعض دفعہ ایک ماہ تک، وقتاً فوقتاً وہاں اعتکاف کے لیے قیام پذیر رہے۔ چند سال کے تفکر اور روحانیت کی منزلیں طے کرنے کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے سچی خوابیں دیکھنا شروع کر دیں۔ آپؐ کو ایسے اشارات بھی ملے جن سے پتا چلتا تھا کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ ایک بڑے کام کے لیے منتخب کرنے والے ہیں۔ کیونکہ غار حرا سے واپسی پر آپؐ کو کچھ آوازیں سنائی دیتی تھیں، جس میں کہا جاتا تھا "اسلام علیکم یا رسولؐ اللہ"۔ جب آپؐ ادھر ادھر دیکھتے تو آپؐ کو جھاڑیوں اور پتھروں کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ آواز پتھروں اور جھاڑیوں میں سے ہی آتی ہوگی۔ اس خیال میں شک نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ قرآن حکیم میں کہا گیا ہے کہ پہاڑ جناب داؤدؑ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کیا کرتے تھے۔ مصنف کا قیاس ہے کہ پتھر اور جھاڑیوں کے علاوہ وہ آواز جنات و ملائکہ کی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ دونوں نظر نہ آنے والی مخلوق ہیں۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف کی مشق کا وہ دورانیہ جو مراقبہ میں گذرا وہ جناب رسولؐ اللہ کا الہام وصول کرنے اور پیغمبری کے فرائض ادا کرنے کی تیاری تھی تاکہ اس سے پہلے وہؐ اپنے لاشعور کو پاک و صاف کر کے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پیغامات، احکامات اور اس کی حکمت اور کتاب کے لیے جگہ بنا لیں تاکہ اس کے علاوہ اور کوئی نقش ان کے لاشعور میں نہ رہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کو اپنا کوئی مضمون لکھنے کے لیے ایک بالکل صاف کاغذ یا ڈسک کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہی قیاس اور استنباط قرآن کی آیت (۲۶۹) سورہ بقرہ (۲) سے بھی اخذ ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے "وہ (اللہ) حکمت عطا فرماتا ہے جسے وہ چاہے (بے شک ان کو جو اس کے خواہاں ہوں اور کوشش کریں) اور اسے جسے حکمت عطا کی گئی ہو، بے شک اسے بہت اچھی بھلائی حاصل ہوئی۔ لیکن اس بات کو صرف سمجھدار لوگ ہی سمجھتے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جناب رسولؐ اللہ کی خواہش اور مراقبہ کے ذریعے کوشش نے آپؐ کو اس قابل بنا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکمت عطا فرمائی۔ اس کے علاوہ آیت (۷) سورۃ (۹۳) مزید اس قیاس کو تقویت پہنچاتی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ "اس (اللہ) نے تمہیں پایا (رسولؐ کو) لاعلم اور پھر تمہیں آگاہی بخشی"۔

(۴۴) آمدِ الہام

جب آپؐ کا سن مبارک چالیس برس کا ہوا تو آپؐ کو آمدِ الہام ہوئی۔ کیونکہ یہی عمر ذہنی پختگی کی ہوتی ہے، اسی عمر میں صلاحیت کامل ہو جاتی ہے اور انسان مابعد الطبیعاتی واقعات و مناظر کو سمجھ اور اخذ کر سکتا ہے یعنی ہونے (To be) کی حقیقت اور وجہ معلوم کر سکتا ہے یعنی کائنات اور اس کے عجائبات کا ظہور پذیر ہونا اور خلقت انسان و دیگر مخلوقات اور ان سب کے خالق کے متعلق جاننا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نزولِ الہام سے پہلے آپؐ کو عقل و دانش کی منزلوں پر فائز فرمایا اور آپؐ کو خاص احساسات اور حواس سے سرفراز فرمایا۔ کیونکہ الہام کا کسی انسان پر نازل ہونا کوئی معمولی بات نہیں، الہام اس ہستی کا کلام ہے جو تمام کائنات اور اس کے عجائبات و مخلوقات کا خالق و مالک ہے۔ الہام کوئی سننے سنانے والی چیز نہیں، بلکہ یہ قلب پر جاری کرنے یعنی اس پر منقش یا کندہ کرنے کی چیز ہے اور یہ انبیاءؑ کے لیے بہت مشقت کا کام ہوتا تھا۔ انہیں اس کے لیے بہت حوصلے اور سلیقے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس بارے میں قرآن کی آیت (۲۱)، سورۃ (۵۹) الحشر میں ارشاد ربی ہے کہ "اگر ہم (اللہ) نے قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کیا ہوتا تو تم یقیناً دیکھتے وہ لرز کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہوتا، اللہ تعالیٰ کے خوف سے۔ ہم (اللہ) ایسی ہی مثالیں بیان کرتے ہیں تا کہ انسان سمجھے اور اللہ کے طابع ہو جائے (بغیر کسی دلیل و حجت کے)"۔

بہر حال ماہ رمضان کی مبارک رات "القدر" بمطابق ۶۱۰ عیسوی، جبکہ جناب رسولؐ اللہ بہت گہرے مراقبے کی حالت میں تھے کہ آپؐ کو پہلی مرتبہ الہام کا مشاہدہ ہوا۔ سب سے پہلے الہام کا نزول سچی خوابوں سے شروع ہوا، اس ابتدا سے آپؐ میں مراقبے یا تنہائی یا اعتکاف کا ذوق و شوق پیدا ہو گیا اور آپؐ زیادہ تر غار حرا میں ہی قیام پذیر رہنے لگے، جہاں وہ مسلسل کئی کئی روز تک عبادت میں مشغول رہنے لگے۔ آپؐ اپنے ساتھ اشیائے خورد و نوش گھر سے لے آتے۔ آخر کار ایک روز غار حرا میں یکایک ان پر حقیقتِ حق کا راز کھلا اور ان کے پاس ایک معزز فرشتہ جبرئیلؑ تشریف لایا اور آپؐ سے کہا "پڑھ"۔ جناب رسولؐ اللہ نے جواب دیا "میں نہیں جانتا کہ کیسے پڑھا جاتا ہے"۔ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ:

"فرشتے نے مجھے دبوچ لیا اور اس طاقت سے دبایا کہ مجھ سے مزید برداشت نہ ہوا، اس نے پھر مجھے چھوڑ دیا اور دوبارہ مجھے پڑھنے کو کہا اور میں نے جواب دیا کہ "میں پڑھنا نہیں

جانتا"۔ اس کے بعد اس نے پھر مجھے دبوچ لیا اور پھر اتنا دبایا کہ مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے پھر مجھے چھوڑ دیا اور پڑھنے کو کہا، میں نے جواب دیا "میں نہیں جانتا کہ کیسے پڑھتا ہے" اس کے بعد اس نے مجھے تیسری بار پھر دبوچا اور چھوڑ کر کہا "پڑھ اپنے رب کے نام سے۔۔۔ جس نے پیدا کیا (وہ تمام کچھ جو ظہور میں ہے) پیدا کیا انسان کو ایک لوتھڑے سے۔۔۔ پڑھ! اور تمہارا رب بہت سخی و فیاض ہے"۔ (آیت ۱-۳) سورۃ (۹۶) العلق)

اس کے بعد فوری طور پر جناب رسولؐ اللہ سیدہ خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے ایک خاص وجدانی کیفیت میں اور کچھ گھبراہٹ کے عالم میں اور فرمایا "مجھے کچھ اوڑھاؤ! کچھ اوڑھاؤ!"۔ انہوں نے آپؐ کو لپیٹ دیا ایک کمبل میں، یہاں تک کہ آپؐ کا خوف دور ہوا اور آپؐ نے تمام واقعہ اپنی اہلیہ سے بیان فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ "مجھے ڈر ہے کہ مجھے کچھ ہو نہ جائے"۔

اس پر سیدہ خدیجہؓ نے فرمایا "کبھی نہیں! اللہ کی قسم اللہ آپؐ کو کبھی بھی بے عزت نہ فرمائے گا۔ آپ اپنے عزیز و اقارب سے اچھا برتاؤ رکھتے ہیں، غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرتے ہیں اپنے مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اور آفت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں"۔ اس کے بعد سیدہؓ آپؐ کو لے کر اپنے چچا زاد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو قبل از اسلام عیسائی ہو گئے تھے اور عیسائیت کا علم حاصل کرتے رہے۔ وہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے اور وہ انجیل کے اقتباسات عبرانی میں لکھا کرتے تھے، اس وقت وہ کافی بوڑھے تھے اور اپنی نظر بھی کھو چکے تھے۔

سیدہ خدیجہؓ نے ورقہ بن نوفل سے فرمایا "اپنے بھانجے کی کہانی سنو!"۔ ورقہ نے کہا "اے میرے بھتیجے! مجھے بتاؤ تم نے کیا دیکھا ہے؟"۔ اللہ کے نبیؐ نے وہ تمام معاملہ بیان فرمایا جو انہوں نے دیکھا تھا۔ ورقہ نے جواب دیا "یہ وہی ناموس ہے جو غیب کی خبریں لاتا ہے (یعنی جبرئیل) اور جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کے پاس بھیجا تھا۔ کاش! میں جوان ہوتا اور اس وقت تک زندہ رہتا، جب تمہارے لوگ تمہیں نکال دیں گے (یعنی قطع تعلق کر لیں گے)"۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا "کیا وہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟"۔ ورقہ نے مثبت میں جواب دیا اور کہا "جو کوئی بھی ایسی باتیں لے کر اپنی قوم میں آیا (یعنی آپؐ جیسی) تو اسے اس کی قوم نے سختی سے نمٹا۔ اگر میں اس دن تک زندہ رہتا ہوں جب تمہیں تمہاری قوم نکال دے گی تو میں ضرور تمہاری مدد کروں گا اپنی پوری طاقت کے ساتھ" (اللہ ان سے راضی ہو)۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی کہ جناب ورقہ جلد ہی

روز بعد اس جہاں سے رخصت ہوئے اور اس وقت تک نزول وحی کا سلسلہ بھی رک گیا تھا۔

جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ جب نزول وحی کے رکنے کے بعد ایک روز جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا: "جب میں (کہیں) جا رہا تھا، یکایک میں نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی۔ میں نے جب اوپر دیکھا تو اسی ناموس کو دیکھا اور اس سے خوفزدہ ہو گیا اور فوراً گھر آ کر کہا "مجھے لپیٹو"۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۃ (۷۴) المدثر کی آیت (۱-۵) کا نزول فرمایا جس میں کہا گیا ہے کہ:

"اے تم (محمدؐ) جو کمبل میں لپٹے ہوئے ہو!
اٹھو اور متنبہ کرو!
اور اپنے رب کی عظمت بیان کرو!
اور اپنے لباس کو پاک کرو!
اور بتوں سے دور رہو"

اس واقعہ کے بعد الہام کا نزول تیزی سے شروع ہو گیا باقاعدگی کے ساتھ اور تسلسل کے ساتھ۔ چند عالم کہتے ہیں کہ اس الہام کا رکنا صرف چند روز کے لیے تھا اور کچھ کافی زیادہ عرصہ کے لیے بھی کہتے ہیں۔

(۲۵) لفظ "پڑھ" کا منطقی تجزیہ (عَلَّمَ اور اِقْرَأْ)

لفظ "پڑھ" کے معنی، مطلب، مقاصد اور اہمیت جاننے کے لیے ہمیں ہمہ تن گوش متوجہ ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور اس ضمن میں خاطر خواہ سوچ و بچار کر کے نتائج اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس لفظ کا ہماری تخلیق کے بعد کی زندگی اور موت کے بعد کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اس لفظ پر توجہ مرکوز کر کے ہم مقصد حیات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ورنہ چوپایوں جیسی زندگی گزارنے کے بعد ابدی اضطراب اور ذلیل ترین زندگی کا سامنا کرنا ہوگا۔ لفظ "پڑھ" جو "اقرا" اور "علم" کی صورت اور معنوں میں قرآن میں تین بہت اہم جگہوں پر آیا ہے جبکہ جبرئیلؑ نے الہام کی ابتدا ہی تین مرتبہ لفظ "اقرا" سے کی۔

الف) جناب رسولؐ اللہ پر پہلے الہام کی آیات (۱-۵) سورۃ (۹۶) العلق میں ارشاد ہوا "پڑھ

اپنے رب کے نام سے، جس نے پیدا کیا (ہر مخلوق کو)۔ بنایا انسان کو خون کے لوتھڑے سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا اکرم کرنے والا ہے، جس نے علم سکھایا قلم سے۔ سکھلایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا"۔ گویا ان پانچ آیات میں، جو سب سے پہلی الہامی آیات ہیں، ان میں لفظ "اقرا" یعنی پڑھ دو مرتبہ اور لفظ "عَلَّمَ" یعنی سکھایا (پڑھا کر) بھی دو مرتبہ وارد ہوا۔

ب) سورہ (۲) البقرہ کی آیات (۳۱، ۳۲) میں فرمان ہے کہ "اور اس (اللہ) نے پڑھایا (عَلَّمَ) آدم کو تمام اسماء (نام) (یعنی تمام موجودات کے خواص اور عادات & Attributes Composition) پھر اس (اللہ) نے فرشتوں سے کہا کہ بتاؤ مجھے ان سب چیزوں کے نام، اگر تم سچے ہو (یعنی اگر تمہارا یہ کہنا حق تھا کہ میں کیوں تخلیق آدم کر رہا ہوں)، انہوں (فرشتوں) نے عرض کیا پاک ہے تیری ذات، ہمیں کچھ معلوم نہیں، سوائے اس کے جو آپ (اللہ) نے سکھایا یا پڑھایا ہے۔ بے شک آپ ہی کی ذات سب کچھ جاننے والی اور حکمت انگیز ہے"۔

جب فرشتوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کر لیا تو انہیں حکم ربی ہوا کہ وہ جھک جائیں سجدے میں آدمؑ کے سامنے۔ اب یہ حقیقت ہمارے سامنے عیاں ہو جاتی ہے کہ فرشتوں سے آدمؑ کو سجدہ کروایا گیا، اس کی علمی برتری کے سبب۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ صرف علم نے ہی آدمؑ کو سرفرازی بخشی، نہ کہ عبادات نے۔ اور فرشتے باوجود ہزاروں برس کی عبادات کے صرف علمی کمتری کے باعث آدمؑ سے کم درجہ پر فائز کیے گئے۔

ج) سورۃ رحمان (۵۵) کی آیت (۱-۴) جن کے بظاہر سامع تو ایمان والے ہیں لیکن ان کا خطاب عمومی تمام انسانوں اور جنات کے لیے ہے۔ ان آیات مبارکہ میں فرمایا گیا ہے:

"سب سے زیادہ مہربان (یعنی اللہ)"
"جس نے پڑھایا (عَلَّم) تمہیں قرآن"
"اس (اللہ) نے پیدا کیا انسان کو"
"اس (اللہ) نے سکھایا (عَلَّم) اسے بات کرنے کا علم یعنی سمجھنے اور سمجھانے کا، سیکھنے اور سیکھانے کا علم"

مندرجہ بالا آیات مبارکہ سے درج ذیل استنباط اخذ کیا جا سکتا ہے اگر ہم اس بات پر غور کریں

کہ آخر وہ کیا علم تھا، جو اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھایا، جس کی وجہ سے اس کی اتنی عزت افزائی ہوئی کہ وہ فرشتوں سے اعلیٰ درجہ پا گیا اور فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لیے کہا گیا۔

(i) آیت (۵) سورۃ (۹۶) ہمیں یاد دلاتی ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم سکھلایا جو اس سے قبل نہ تو وہ جانتا تھا اور نہ ہی دیگر مخلوق۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی عظمت بڑھانے کے لیے وہ علم ضروری تھا۔

(ii) سورہ رحمان (۵۵) کی آیت (۱-۴) میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بہت تاکید کے ساتھ یاد دلایا ہے کہ اس (اللہ) نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور ان میں سے اعلیٰ ترین نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں گنوا دی ہیں، اور وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ اعلیٰ ترین نعمت، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لیے نہایت مہربان (رحمان) ہونا۔

۲۔ دوسری اعلیٰ ترین کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پڑھایا، سکھلایا اس کی (a) نجات کے ساتھ (b) ادراک کے ساتھ (c) اور الہام کے ساتھ جو اپنے انبیاء کے ذریعہ پہنچایا۔

۳۔ تیسری اعلیٰ ترین نعمت یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ یعنی نائب بنایا اور اشرف المخلوقات بنایا (علم عطا کرنے کے بعد)۔

۴۔ چوتھی اعلیٰ ترین نعمت انسان کے لیے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بیان کرنے کا علم یعنی بات کرنے کا علم یعنی دانش وحکمت سیکھنے اور سکھانے کا علم عطا فرمایا۔

پس ان آیات مبارکہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کی برتری کا محور صرف علم ہے یعنی سیکھنا اور سکھانا، پڑھنا و پڑھانا اور یہ علم انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی سب سے اعلیٰ ترین نعمتوں میں سے ایک ہے لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ غلط یا نامکمل علم انسان کو ایسی نچلی سطح پر بھی لے آتا ہے جہاں پر کہ وہ نباتاتی اور جماداتی مخلوقات سے بھی کمتر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کی حیثیت حاصل کرنے کی غرض سے پیدا فرمایا ہے۔ اب اس نتیجہ کو اخذ کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کا علم انسان کو شرف اعلیٰ کے درجے پر فائز کرنے میں مدد دیتا ہے، یہاں تک کہ فرشتوں سے بھی اعلیٰ۔ اس معاملہ کو طے کرنے کے لیے ہمیں سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۳۱) مدد دے سکتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے آدم کو پڑھائے نام ہر چیز کے" یعنی ان تمام اشیاء کے خواص اور عادات کے

اصول۔ پس یہ آیت ہمیں درج ذیل نتیجہ اخذ کرنے میں مدد کرتی ہے۔

الف) یعنی آدم کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ذکر اذکار، صلوٰۃ و تسبیح یا دیگر عبادات نہیں سکھائیں۔ بلکہ سب سے پہلے آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کا تعارف کرایا، ان کے نام ان کی عادات کے اصول، ان کے خواص یعنی کہ ان اشیاء کے متعلق طبیعاتی و کیمیائی علوم و اصول سکھائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو صرف یہی نہیں بتایا کہ یہ پانی ہے، یہ ہوا ہے، یہ روشنی ہے، یہ درخت یا پودے ہیں، پہاڑ یا دریا ہیں، سمندر، زمین و آسمان، چاند و ستارے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ ان اشیاء کے خواص و عادات کے اصول بتائے ہوں گے یعنی یہ کہ پانی کو ایسے بتایا ہوگا کہ "یہ مجموعہ ہے ایک سالمہ آکسیجن کا اور دو سالمے ہائیڈروجن کے"۔ ہوا کے متعلق بتایا ہوگا کہ "یہ مجموعہ ہے آکسیجن، نائٹروجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ وغیرہ وغیرہ کا"۔ روشنی کے متعلق بتایا ہوگا کہ "اس کے سفید رنگ میں سات رنگ مضمر ہیں یا یہ کہ اس سے بہت ساری علیحدہ علیحدہ خواص رکھنے والی شعاعیں نکلتی ہیں یعنی ایکس ریز، الٹرا وائلٹ ریز۔ و دیگر کیمیائی شعاعیں"۔ درختوں اور پودوں کا کیمیائی رد وبدل مٹی سے پانی کو لا کر ایک ننھے سے بیج سے بھی شجر پیدا کرنے کا اصول بھی سکھایا، کبھی رس سے بھرے میوے اور اناج اس کے اندر مختلف قسم کی نکلنے والی ادویات یہ تمام نباتاتی علوم بھی تو اللہ نے آدم کو سکھائے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے نظام شمسی کے قوانین جس میں ہر سیارے کا اپنے محور پر گردش کرنا اور تمام کا اپنے اپنے دائرے میں سورج کے گرد گردش کرنا، مادے کی حقیقت، ایٹم کے نیوٹرون اور پروٹون کا رشتہ اور ماپ اور ایسے علوم جن کا ذکر کرنا یہاں پر مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ یہ تمام علوم اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھائے ہوں گے بلکہ اس کی جین (gene) یعنی اس کی فطرت میں رکھ دیے ہوں گے۔ جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے پیپل کے بیج (جو خشخاش کے دانے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے) میں ایک لمبا تڑنگا درخت چھپا دیا ہوتا ہے اور جیسے ہی اسے زمین کی تہ اور پانی میسر آ جاتا ہے وہ اپنی اس ہیئت کو اختیار کر لیتا ہے جو اس میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح سے یہ تمام علوم نسل آدم میں منتقل ہوتے رہتے ہیں لیکن اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوتے جب تک کہ انہیں سازگار ماحول میسر نہیں آتا۔ اس ماحول کو حاصل کرنے کے لیے کئی نسلوں کو

بہت محنت و مشقت سے حصولِ علم کے لیے محنت اور کاوش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ فرشتوں کو بمعہ ابلیس کے ان تمام اشیاء کے ناموں کا تو علم تھا جو آدم کو سکھائے گئے۔ لیکن نہ تو انہیں ان کے اصول اور بناوٹ کا پتا تھا اور نہ ہی ان کے اجزا اور خواص کا اسی لیے انہی امور کا جاننا آدم کے لیے باعث عزت و افتخار بنایا گیا۔

ب) دوسری بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے عبادات کی تعلیم اس کی برتری جتلانے کے بعد ہی دی تھی۔ یعنی یوں کہنا بہتر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو سائنسی علوم سکھانے کے بعد عباداتی علوم سے بہرہ مند فرمایا۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ جب آدم سے اپنے مکانِ اول میں رہتے ہوئے غلطی سرزد ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آدم سے جواب طلب کیا کہ اس نے کیونکر مالک کی حکم عدولی کی تو آدم چونکہ عبادات و ریاضت و معافی تلافی کے الفاظ نہ جانتا تھا، چنانچہ محض شرمندہ اور خوفزدہ ہو کے رہ گیا۔ کہ اب کیا کیا جائے مالک کہیں اس طرح سے ناراض نہ ہو جائے جیسے وہ ابلیس سے ہوا ہے۔ لیکن وہ شرمندگی اور مالک کا خوف ہی اللہ کے حضور معافی کا باعث بن گیا کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ اس کا بندہ تو اس کی حکم عدولی سے شرمسار اور خوفزدہ ہے تو اللہ نے آدم کے قلب پر نزول وحی فرما کے معافی کے الفاظ انہیں سکھا دیے اور آدم کی عباداتی تعلیم کی ابتدا ہو گئی۔ حضرت آدم پر الہام کا پہلا نزول اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی آیت (۲۳) سورۃ (۷) الاعراف میں ہمیں بتا دیا یعنی: "انہوں (آدم و حوا) نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ کو گمراہی میں ڈال دیا۔ اگر آپ نے معاف نہ فرمایا اور اپنا رحم و کرم ہم پر نہ فرمایا تو بے شک ہم بہت بڑے خسارے میں رہیں گے"۔

پس یہ معلوم ہوا ہے کہ تمام تر علم جو بنیادی طور پر طبیعات، کیمیا، نباتات، اجسام و عضویات، طبقات الارض، علم نظام شمسی و کائنات، مابعد الطبیعات وغیرہ وغیرہ کے علوم سے متعلق ہے، یہی علوم اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھا دیے اور اس کے تخم میں رکھ دیے یعنی جینز (gene) میں۔ جو نہ تو ملائکہ کو سکھائے گئے تھے اور نہ ہی ابلیس کو۔ چنانچہ انہیں علوم کے جاننے کی وجہ سے آدم کو ملائکہ پر برتری عطا فرمائی گئی اور ملائکہ کو اس کے سامنے ادب سے جھکنے کا معاملہ کرنے کو کہا گیا۔

جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو مالک کے آگے سرنگوں ہونے کا طریقہ و سلیقہ بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی جبلت میں رکھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ نباتاتی اور جماداتی اشیاء بھی عباداتی امور سے واقفیت رکھتے ہیں اور باقاعدگی سے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتے اور تسبیح کرتے ہیں۔

یہ فلسفہ قرآن کی آیت (۱۸) سورۃ (۲۲) الحج میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے یعنی: "کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو کوئی بھی ہے زمین اور آسمان میں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور تمام جاندار اور بہت سارے انسان سجدہ ریز ہوتے ہیں اللہ کے سامنے۔ لیکن بہت سے ایسے ہیں جو سزا کے مستحق ہیں اور جسے بھی اللہ تعالیٰ ذلیل کرتا ہے اسے کوئی بھی عزت نہیں بخش سکتا۔ بے شک اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے" (آیت سجدہ)۔

لہٰذا اللہ کی عبادت یعنی اس کی حضوری میں جھکنا، سجدہ ریز ہونا، ہر مخلوق کی بنیادی جبلت ہے۔ اور وہ مجبور ہے کہ اس کے سامنے جھکے خواہ وہ زمین پر ہو یا آسمان پر اور یہی اس کا جبلی یا شعوری علم ہے کہ وہ طریقہ عبادات سے واقف ہے (ہر پڑھنے والے پر سجدہ لازم ہوتا ہے)۔

لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جب ایک انسان صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر یا تسبیح کرتا ہے یا اس کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے تو وہ صرف جھاڑیوں، پودوں، درختوں اور پتھروں کی طرح جبلی طور پر اپنے مالک کی حضوری میں پیش ہوتا ہے۔ ان کی ایسی عبادات انہیں عبادات کے اعتبار سے کسی اعلیٰ مرتبہ پر نہیں لے جاتی، بلکہ وہ عبادات کے اعتبار سے صرف مادی اور نباتاتی درجے تک ہی پہنچتے ہیں۔ لیکن جب ان کا علم اس سے اونچے درجے کی طرف جاتا ہے تو ان کی عبادات کا درجہ بھی اسی لحاظ سے بڑھ جاتا ہے کیونکہ پھر وہ انسان سوچ سمجھ کر اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنی تمام تر ذہنی و قلبی حالت اور جسمانی کیفیات کو اپنے مالک کے حضور رکھ کر عاجز ترین حالت میں آ جاتا ہے۔ ایسی حالت کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کا قلب تسبیح کرتا ہے اور خون کا ایک ایک قطرہ اس قلب سے گزر کر اس سے متاثر ہوتا ہے اور تسبیح میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی حالت میں سجدے ٹپکتے ہیں، اس کی پُرغرور پیشانی زمین پر جا لگتی ہے۔ اور اس کا قلب، اس کا ذہن اور اس کی زبان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور بڑائی بیان کرتی ہے جبکہ اس کا جسم زمین کے ساتھ لگ کر اپنی گردن اور پیشانی کو عجز اور انکساری کی نشانی بنا کر اپنے مالک کے حضور پیش کرتا ہے تو عبادات کا یہ انداز اسے دوسری تمام مخلوقات سے منفرد اور اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔

(۲۶) دعوتِ حق قبول کرنے والے اصحاب

جن اصحاب کو یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ انہوں نے سب سے پہلے یہ تسلیم کیا کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں تو یقیناً ان حضرات کا مرتبہ امت میں سب سے زیادہ ہوگا۔ اور بے شک ایسے تمام حضرات ''اولین'' میں سے ہوں گے یعنی سبقت لے جانے والے ایمان والوں میں سے۔ جن کا ذکر سورۃ واقعہ (۵۶) کی آیت (۱۰) میں مذکور ہے کہ ''اور سبقت لے جانے والے سبقت لے جانے والے''۔ اور اسی سورۃ کی آیت (۱۱) میں فرمایا گیا ہے کہ ایسے ہی لوگ مقرب ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجات پانے والے اور انعامات پانے والے۔

ایسے لوگوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر جناب رسولؐ اللہ کی پیروی اختیار کی اور اہل قریش کو ان کے خداؤں سے انکار کر کے اپنا دشمن بنایا۔ جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو خوش کرنے والے لوگ تھے۔ اہل قریش ایسے لوگوں کا پیچھا کرتے ان کو ہر طرح سے اپنے مذہب پر واپس لانے کے لیے مجبور کرتے اور زیادہ سے زیادہ تکالیف پہنچاتے یہاں تک کہ ان کی جان لینے سے بھی گریز نہ کرتے۔

(الف) دعوت سے قبل حق قبول کرنے والے:

یہ بات قابل ذکر ہے کہ دو خوش قسمت افراد ایسے ہیں جنہوں نے رسولؐ اللہ کی دعوت سے پہلے ہی جناب رسولؐ اللہ کی رسالت کی تصدیق کی اور ان کی تعظیم کی، ان کو جاننا اور ان کی قسمت پر رشک کرنا یقیناً اچھی بات ہوگی۔

(i) سیدہ خدیجہؓ: جناب رسولؐ اللہ کی زوجہ سیدہ خدیجہؓ ام المومنین نے تو اسی وقت جناب رسولؐ اللہ کی رسالت کو تسلیم کر لیا تھا، جب انہیں آپ کے مرتبے کا علم اپنے غلام میسرہ کی زبانی ہوا، اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آپؐ سے فوری طور پر شادی کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد جب رسولؐ اللہ پہلے الہام کے بعد گھبرائے ہوئے ان کے پاس تشریف لائے اور اندیشہ ظاہر کیا کہ انہیں کچھ ہونے والا ہے تو آپ نے انہیں تسلی دی اور حوصلہ دیا اور کہا کہ وہ ضرور اللہ کے نبی بننے والے ہیں۔ سیدہ خدیجہؓ پہلی شخصیت ہے جنہوں نے رسولؐ اللہ کی دل جوئی کی اور کہا کہ آپؐ تو اللہ کے نبی بننے والے ہیں اس لیے آپ اپنی جگہ مضبوطی کے ساتھ اس کام کے لیے تیار ہو جائیں۔ (اللہ تعالیٰ ان پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے)

(ii) ورقہ بن نوفل: جناب ورقہؓ بن نوفل دوسرے شخص ہیں جنہوں نے رسولؐ اللہ کی نبوت کو پہچانا اور قبول کیا۔ حالانکہ ابھی تک جناب محمدؐ نے اپنی نبوت کا اعلان نہیں فرمایا تھا۔ جب رسولؐ اللہ نے اپنے پہلے الہام کے موصول ہونے پر گھبراہٹ کا اظہار اپنی رفیقہ حیات سے کیا تو وہ انہیں تسلی دینے کے بعد اپنے عم زاد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، کیونکہ وہ توریت اور انجیل کے عالم تھے۔ انہوں نے فوراً آپؐ کا معاملہ سن کر آپ کو نبوت پر فائز ہونے والا پایا اور فوراً آپؐ کے ماتھے کو بوسہ دیا، یہ بوسہ آپ کی محبت اور نیک خواہشات کا اظہار تھا، انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ ان کی ہر ممکن مدد کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، خاص طور پر جبکہ ان کی قوم اعلان نبوت کے بعد ان کی مخالفت کرے گی۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی رخت سفر آخر ہوئے۔ (اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے)

(ب) اعلان نبوت کے فوری بعد دعوت قبول کرنے والے:

(i) حالانکہ سیدہ خدیجہؓ پہلے ہی سے رسولؐ اللہ کی عظمت سے واقف تھیں اور انہیں علم تھا کہ ان کے شوہر فضیلت نبوت پر فائز ہونے والے ہیں اور وہ انہیں ہونے والا اللہ کا رسول ہی سمجھتی تھیں۔ لیکن پھر بھی جب رسولؐ اللہ نے اپنے نبی ہونے کا اعلان فرمایا تو سیدہ خدیجہؓ کو پہلی مسلمان شخصیت ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

(ii) اُم المومنین کے ایمان لانے کے بعد رسولؐ اللہ کی تمام فیملی یعنی سب کے سب افراد جو آپؐ کے گھر میں پایا تا بع رہتے تھے، آپؐ کے گھریلو افراد کی طرح سے تو وہ تمام کے تمام ایمان قبول کرنے میں سبقت لے جانے والوں میں سے تھے۔

ایسے افراد میں جناب رسولؐ اللہ کی دختران عزیزان، علیؓ، زیدؓ بن حارثہ، اُم ایمنؓ۔ یاد رہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ نبوت کے تیسرے سال ایک مسلمان کے گھر ایک مسلمان بچے کی حیثیت سے پیدا ہوئیں۔ سیدہ فاطمہؓ بھی اعلان نبوت کے بعد پیدا ہوئیں۔

(ج) احباب میں سے سابقین اولین:

اعلان نبوت کے بعد خانوادہ نبیؐ کے ایمان لانے کے بعد رسولؐ اللہ کے احباب میں سے سب سے پہلے ایمان لانے والے ابوبکرؓ تھے ان کا نام عبداللہ تھا لیکن وہ عتیق کہلائے جاتے تھے، جس کا مطلب خوبرو وشریف کے ہیں۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ

وہ شخص جو ایمان لایا، اس نے ایمان لانے سے پہلے کچھ نہ کچھ ہچکچاہٹ ضرور کی لیکن جب انہوں نے ابو بکرؓ کو دعوتِ حق دی تو انہوں نے وہ دعوت بغیر کسی ہچکچاہٹ اور بغیر کچھ وقت لگائے قبول کی اور فوری طور پر ایمان لے آئے، اور اسی وقت اہلِ مکہ میں اپنے ایمان کا اعلان کرنے کے بعد دوسروں کو دعوتِ حق دینا شروع کر دی آپ کی دعوت پر مندرجہ ذیل حضرات نے اسلام قبول کیا:

۱۔ عثمانؓ بن عفان

۲۔ زبیرؓ بن عوام

۳۔ سعدؓ بن ابی وقاص

۴۔ طلحہؓ بن عبید

(د) دیگر سابقین اولین:

ان کے بعد وہ تمام اصحاب و حضرات جنہوں نے فتح سے پہلے اسلام قبول کیا وہ تمام فرار سابقین اولین میں آتے ہیں۔ اور اللہ کے نزدیک ان کے بہت درجات ہیں قرآن کی سورۃ (۵۷) الحدید، آیت (۱۰) اسی سلسلے میں فرماتی ہے کہ: "تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے (اللہ کے نام پر) خرچ کیا اور لڑے فتح سے پہلے، وہ لوگ مرتبے میں اعلیٰ ہیں ان لوگوں سے جنہوں نے خرچ کیا اور لڑے بعد میں، لیکن اللہ نے سب سے وعدہ کیا بہترین (انعام) کا"۔

اس آیت میں لفظ "فتح" کو بہت سے عالموں نے فتح مکہ سے تعبیر کیا ہے لیکن بہت سے دوسروں نے اس "فتح" کو صلح حدیبیہ سے تعبیر کیا ہے اور اس قول کو رسولؐ اللہ کے قول سے ہی اخذ کیا ہے۔ یہ موضوع فتح مکہ کے عنوان میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ پس یہ حضرات سابقین اولین یا سبقت لے جانے والے ہیں، چونکہ انہوں نے ایمان لانے والوں میں پہل کی یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی اطاعت میں پہل اور جلدی کی۔ اس لیے وہ روزِ قیامت جزا پانے والوں میں بھی سبقت لے جانے والے ہوں گے۔ قرآن نے سورۃ واقعہ (۵۶) آیت (۱۰-۱۲) میں ایسے ہی لوگوں کو خوشخبری سنائی ہے اور کہا ہے کہ "اور وہ اولین (جو پہلے ایمان لائے) اولین ہی ہوں گے (جنت کے لیے) اور وہی نزدیک ترین ہوں گے (اللہ کے)، جنت کے باغوں میں"۔

بے شک اس مشکل ترین دور میں اسلام قبول کرنا اور اس کا اعلان کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ کیونکہ اہلِ مکہ کے لیے وہ لوگ ان کے خداؤں سے، ان کے معاشرے اور ان کے باپ

دادا کے اقوال سے بغاوت کر رہے تھے۔ اور یوں وہ بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اس لیے مشرکین مکہ نے ایسے تمام لوگوں کو ہر طرح سے تکلیف پہنچانے کی کوشش کی، اس کے بعد جب مکہ فتح ہوا تو لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔

(۲۷) صلوٰۃ کی ادائیگی

اسلام کے ابتدائی دور میں ہی صلوٰۃ (نماز) کی فرضیت کر دی گئی تھی۔ یعنی اس وقت سے جب اسلام کی تبلیغ خاموشی سے ہو رہی تھی، ابتدائی طور پر صلوٰۃ صرف دو رکعت تھی اور یہ صبح اور شام ادا کی جاتی۔ یہ حکم نامہ سورۃ (۴۰) الغافر یا مومن کی آیت (۵۵) میں صادر ہوا۔ جس میں کہا گیا کہ "پس صبر اختیار کرو (اے محمدؐ) بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنی خطاؤں کی معافی طلب کرو اور عظمت بیان کرو اور تعریفیں بیان کرو اپنے رب کی عاشی کے وقت (دوپہر سے شام تک کا وقت) اور ابکار کے وقت (صبح سے دوپہر)"۔ اس آیت کو رسولؐ اللہ کی ایک بہت اہم حدیث سے ملا کر پڑھنا بہت ضروری ہے۔ امام بخاریؒ نے سیدہ عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم فرمایا تو نماز صرف دو رکعت تھی۔ خواہ قیام کی حالت میں ہو یا سفر کی حالت میں۔ پھر قیام کی حالت والوں پر رکعتوں کی تعداد کچھ نمازوں میں بڑھا دی گئی اور نمازوں کی تعداد بھی دو سے پانچ ہو گئی۔ جب آپؐ (۶۲۱ عیسوی میں) معراج پر بلائے گئے تھے (اور یہ رسالت کا تقریباً گیارہواں برس تھا)"۔

(۲۸) اقرار و شہادۃ یا ایمان و عقیدہ

ایک مسلمان کا ایمان اقرار کے بجائے نفی سے شروع ہوتا ہے وہ سب سے پہلے ان تمام خداؤں کی نفی کا اقرار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک کے علاوہ لوگوں کے دلوں میں بسے ہوتے ہیں۔ جب ہر طرح کے الٰہ دل سے نکل جاتے ہیں تو اللہ واحد لاشریک کو الٰہ اور محمدؐ کو اس کا رسول آخر الزمان ہونے کا اقرار ایمان کا بنیادی عقیدہ ہوتا ہے۔ اس اقرار کی دل کی گہرائیوں سے سمجھ بوجھ کر زبان سے ادا کرنا ضروری ہے، یہ مسلمان کا خفیہ اور ظاہری کلمہ ہوتا ہے۔ یہی جناب رسولؐ اللہ کا بنیادی پیغام تھا، جسے سن کر اہلِ مکہ آگ بگولہ ہو گئے کہ ان کے

خداؤں کی نفی کیوں کی گئی۔ حالانکہ وہ اللہ کی حاکمیت کو بھی تسلیم کرتے تھے لیکن کچھ اوروں کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک کرتے تھے اور انہوں نے اللہ کی ذات مبارک سے متعلق بھی ایک بت کعبہ میں رکھا ہوا تھا۔

ایمان کا بنیادی عقیدہ یا اعلان یعنی کہ ''کسی کو حق نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے سوائے اللہ کے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں'' کو سمجھنے کے لیے کچھ مزید تفصیل کی ضرورت ہے تاکہ اس جملے کے صحیح مفہوم کو سمجھ لیا جائے۔

(الف) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار، کائنات کی ملکیت کے سلسلے میں:

یہ اقرار کرنا کہ اللہ تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا اور مالک ہے خواہ وہ زمین پر ہوں یا آسمانوں میں، بشمول پوری کائنات کے اور یہ کہ اللہ تمام نظام کائنات کی مخلوقات کے بارے میں منصوبہ سازی اور ترکیب و ترتیب خود تیار کرتا ہے۔ زندگی اور موت صرف اسی کے اختیار میں ہے، وہی اپنی مخلوق کی پرورش کرتا اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ یہاں یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ پرورش کے معنی کو بھی سمجھ لیا جائے، مثلاً یہ کہ بیج سے ایک بہت بڑے درخت تک پہنچنے کے تمام عمل کو پرورش کہا جائے گا۔ اس طرح سے اللہ کائنات اور اس کے ہر وجود کا مالک یعنی رب ہے اور اس کی ملک میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

(ب) اللہ کی وحدانیت کا اقرار اس کے الٰہ ہونے کے بارے میں:

یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی اور عبادت کے لائق نہیں۔ اللہ کی ملکیت میں، طاقت میں، مرضی میں یا کسی بھی اور معاملہ میں اللہ کا کوئی شریک نہیں، نہ وہ کسی سے مشورہ لیتا ہے اور نہ ہی مدد۔ پس ہم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کی ہی پرستش کریں گے اسی سے مدد مانگیں گے اور اسی کی حضوری میں اپنے آپ کو پیش کریں گے اور سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کسی بھی روحانی طاقت، کسی بھی فرشتہ، کسی بھی پیغمبر، کسی بھی اولیاء اللہ سے مدد طلب نہیں کریں گے۔

(ج) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار اس کے اسماء اور صفات کے بارے میں:

یہ اقرار کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے اسماء اور صفات کے باوجود واحد ہے، احد ہے اور تمام اچھے اور اعلیٰ نام اسی کے ہیں اور تمام اعلیٰ صفات اسی ذات کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اپنے تخت یا کرسی پر موجود ہے اور وہ کرسی زمین اور تمام آسمانوں پر محیط ہے۔ وہ ہر جگہ نہیں رہتا

بلکہ ہر شے اور تمام کائنات اس کی دسترس، نظر، علم اور حاکمیت میں ہے وہ ہر مخلوق کو دیکھتا اور سنتا ہے اور ہر شے اس کی پہنچ اور اختیار اور قابو میں ہے۔

(د) محمدؐ کی رسالت کا اقرار:

(i) یہ اقرار کہ محمدؐ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ تابعدار غلام (بندے) اور اللہ کے رسول ہیں۔ کسی کو اختیار نہیں کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کا حکم مانے سوائے اس کے رسول محمدؐ کے۔ کیونکہ جناب رسولؐ اللہ کا حکم بھی اللہ کا ہی حکم ہے اور یہ کہ آپؐ کی رسالت دنیا میں قیامت تک رہے گی اور ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔

(ii) یہ اقرار کہ تمام انبیاء جو محمدؐ سے پہلے آئے جن کے متعلق بتایا گیا یا نہیں بتایا گیا وہ تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کے نہایت تابعدار غلام (بندے) اور اللہ کے رسول تھے اور ان تمام انبیاء نے بہت سچائی اور دیانتداری سے اللہ کا پیغام اپنی اپنی قوم تک پہنچایا۔

(ہ) الہامی کتابوں کی سچائی کا اقرار:

(i) قرآن اللہ کی کتاب ہے، اس کا کلام ہے جو ہمارے نبی محمدؐ پر نازل ہوا تاکہ وہ اس کلام کو انسانوں تک منتقل کریں۔ اس لیے کہ وہ اللہ کے احکامات کی تعمیل کر سکیں اور اس کی بتائی ہوئی حکمت سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ اور یہ کہ اس کلام کا بغیر کسی ردوبدل کے قیامت تک رہنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے۔

(ii) یہ کہ اس سے قبل تمام دیگر اللہ کی کتابیں یعنی انجیل، توریت، زبور اور دیگر وہ جو صحیفے پہلے دیگر پیغمبروں پر نازل ہوئیں اور جن کا ہمیں علم نہیں، وہ تمام کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں تاکہ وہ انسانوں کی ہدایت کا سبب بنیں۔ لیکن قرآن چونکہ اللہ کی آخری کتاب ہے، جس میں اللہ نے اپنے قوانین کو تکمیل کی آخری حد تک مکمل کر کے بھیجا، اس لیے قرآن نے تمام پچھلی کتابوں کی جگہ بھی لے لی، لہٰذا تمام پچھلی کتابیں نافذ العمل نہیں رہیں۔ اس کے علاوہ خاص بات یہ کہ اس وقت کوئی بھی پچھلی الہامی کتاب اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں، یہ کتابیں اصل متن سے ہٹ کر نازل ہونے والی زبانوں کے علاوہ دیگر زبانوں میں تبدیل و تحریف شدہ متن میں پائی جاتی ہیں۔

(و) فرشتوں کے وجود کا اقرار:

یہ کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نوری مخلوق ہیں جو اللہ کے نہایت تابعدار غلام (بندے) ہیں۔ وہ ہمہ وقت اپنے مالک کی حمد و ثناء میں مصروف رہتے ہیں اور وہ تمام امور انجام دیتے ہیں جن کا انہیں اللہ کی طرف سے حکم ملتا ہے۔ انہیں اجازت نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام سر انجام دیں، جس طرح کہ جنات اور انس کو اپنی مرضی کرنے کا اختیار دیا گیا ہے لہٰذا وہ کسی انسان کی کوئی مدد یا ان کے خلاف نہیں کر سکتے، جب تک کہ انہیں اللہ کی طرف سے حکم نہ ملے۔

(ز) روزِ قیامت کا اقرار:

یہ کہ ایک وقت معین پر اس دنیا اور اس کے تمام عجائبات و مخلوقات کا خاتمہ کر دیا جائے گا، اللہ کی طرف سے اور تمام کی تمام نسل آدمؑ و حواؑ کو پھر سے وجود میں لایا جائے گا۔ اور ان کو ایک مقام پر اکٹھا کر کے ان کے ہاتھوں میں ان کا اعمال نامہ تھما دیا جائے گا۔ ان میں سے جن کے اعمال اچھے ہونگے وہ انعامات و اکرامات کے مستحق ہونگے اور جنت میں قیام پذیر کیے جائیں گے اور وہ جن کے اعمال برے ہونگے انہیں عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا اور شعلوں بھری آگ ان کا ٹھکانہ ہوگا (اللہ تعالیٰ ہمیں ہر عذاب سے محفوظ فرمائے)

(ح) قسمت پر یقین کا اقرار:

جو کچھ بھی خالق حقیقی نے طے کر لیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ سورہ نجم (۵۳) کی آیت (۴۳-۴۴) میں فرمان ربی ہے کہ "اور وہی تو ہے (اللہ) جو منظور و مقسوم کرتا ہے خوشی اور غم، اور وہی تو ہے جو لاتا ہے موت اور زیست بعد از موت"۔

اس کے علاوہ سورۃ یونس (۱۰) کی آیت (۱۰۷) میں کہا گیا ہے کہ "اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو کوئی ایسا نہیں ہے جو اسے ٹال سکے سوائے اس کے اور اگر وہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچانا چاہے تو کوئی ایسا نہیں جو اس کی مہربانیوں کو واپس لے سکے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسکو چاہے فائدہ پہنچاتا ہے اور وہی ہے معاف کرنے والا، بہت ہی رحم کرنے والا"۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم عطا فرمایا ہے تاکہ ہم اچھائی اور برائی کے درمیان فرق سمجھ سکیں اور ہمیں اچھائی منتخب کرنے اور اختیار کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور ہم برائی کو اپنانے سے گریز کریں اور اس بات کا اختیار اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ پس ہم کہہ

سکتے ہیں کہ ہماری قسمت کا فیصلہ کرنا بھی ہمارے اختیار میں اس طرح سے دیا گیا ہے کہ اگر ہم اچھائی کو چنیں گے تو ہمیں اچھائی ملے گی، اگر برائی کو چنیں گے تو برائی۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر ہم بیر کا درخت لگائیں گے تو ہمیں بیر ملیں گے اور اگر ببول کا درخت لگائیں گے تو کانٹے ملیں گے۔

اس بارے میں فرمان ربی ہے سورہ نجم (۵۳) آیت (۳۹-۴۱) کہ: "اور انسان کے پاس سوائے اس کے کچھ نہ ہوگا جو کہ اس نے کیا ہوگا (یعنی اچھائی مشقت کے ساتھ) اور اس (کام کا پھل) کا نتیجہ جلد اس کے سامنے آجائے گا اور پھر وہ اس کا مکمل انعام پائے گا"۔ یعنی اگر اس نے بھلائی حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی ہوگی تو وہ انعام کا مستحق کیسے ہو جائے گا؟ انعام کے لیئے اسے بہت محنت و مشقت کرنی پڑے گی۔

(۲۹) جناب رسول اللہ کو دعوت عام کا حکم

پہلے الہام کے بعد کی خاموشی کے بعد دوبارہ الہام کی آمد ہوئی تو اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات سورۃ المدثر (۷۴) کی آیت (۱-۵) میں نازل فرمائے اور کہا کہ "اے تم (محمدؐ) جو کمبل میں لپٹے ہوئے ہو، اٹھو اور تبلیغ کرو، اور اپنے رب کی حمد بیان کرو، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، اور بتوں سے دور رہو"۔

یہ حکم اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو آگاہ کیا کہ وہ منصب نبوت کی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے اب تیار ہو جائیں اور انہیں اب ایمان والوں یعنی کہ تابع بندوں اور غیر تابع بندوں کے درمیان تفریق کرنی چاہیے اور بتوں کے متعلق کسی کا بھی لحاظ کیے بغیر ان کی نفی کرنی چاہیے اور یہ کہ طہارت و پاکیزگی اور غلاظت و نجاست کے درمیان بھی فرق کر دینا چاہیے اور یہی پیغام انہیں دوسروں تک پہنچا دینا چاہیے خواہ انہیں اچھا لگے خواہ برا۔

کہا جاتا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے اللہ کا پیغام خاموشی کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا شروع کیا اور انہیں تین برس اسی طرح گذر گئے تو اس کے بعد حکم ربی ہوا کہ اب آپؐ اپنے احباب یعنی کنبے قبیلے والوں کو دعوت دیں۔

سورہ الشعراء (۲۶) میں آیت (۲۱۳-۲۲) میں فرمان ربی ہوا ہے کہ "پس اللہ کے

ساتھ کسی اور خدا کو شریک نہ کر دینا ہو کہ تم ان میں شامل ہو جاؤ، جو سزا کے حقدار ہو چکے ہیں۔ اور اپنے قبیلے کو متنبہ کرو اور اپنے عزیز و اقارب کو، اور ایمان والوں کے ساتھ، جو تمہاری اتباع کرتے ہیں نہایت شفقت اور محبت سے پیش آؤ۔ اور اگر پھر وہ تمہاری تابعداری نہ کریں، تو کہو میں اس بات سے بیزار ہوں اور اس کا ذمہ دار نہیں ہوں جو تم کرتے ہو اور اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو جو بہت قدرت والا اور رحم کرنے والا ہے۔ وہ دیکھتا ہے (اے محمدؐ) جب آپؐ کھڑے ہوتے ہیں (رات کو صلوٰۃ میں تنہا) اور آپؐ کی شمولیت سجدہ کرنے والوں کے ساتھ (پانچ وقت صلوٰۃ میں)، بے شک وہ اور صرف وہ یعنی اللہ ہی ہے کامل سننے والا اور کامل جاننے والا"۔

اس حکم کے ملنے کے بعد جناب رسول اللہؐ نے اپنے رشتہ داروں کو کھانے پر بلوایا جو کہ تعداد میں تقریباً چالیس تھے لیکن اس سے قبل کہ جناب رسول اللہؐ ان تک اللہ کا پیغام پہنچاتے، وہ لوگ کھانا کھاتے ہی چلے گئے۔ رسول اللہؐ نے انہیں دوبارہ بلایا لیکن کسی نے بھی ان کی بات پر کان نہیں دھرا۔

اس کے بعد رسول اللہؐ نے اپنے قبیلے اور رشتہ داروں کو یہ پیغام دینے کی غرض سے پھر بلوایا۔ اس بارے میں امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیت (۲۱۴) سورہ الشعراء (۲۶) (اور متنبہ کرو اپنے قبیلہ اور رشتہ داروں کو) کا نزول ہوا تو فوری طور پر جناب رسول اللہؐ صفا کی پہاڑی پر چڑھے اور وہاں سے آپؐ نے پورے زور سے پکارا "یا صباحا" (اے لوگو)، یہ لفظ دستور کے مطابق اس وقت پکارا جاتا تھا جب کسی کو کوئی خاص حادثاتی اطلاع دینی مقصود ہوتی۔ اس لیے آپؐ کی پکار سن کر لوگ فوراً آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ جو لوگ خود نہ آسکے انہوں نے اپنے نمائندے بھیج دیے تا کہ وہ حادثاتی خبر کا پتا ان تک پہنچا دیں۔ چنانچہ جب لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپؐ نے درج ذیل ارشاد فرمایا اور یہ آپؐ کا اپنی قوم سے پہلا خطاب یا خطبہ تھا۔

"اے بنو عبدالمطلب! اے بنو فہر! اے بنی لوئی! تمہارا کیا خیال ہے، اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے تمہارا دشمن آرہا ہے تم پر حملہ کرنے کی غرض سے تو کیا تم میرا اعتبار کرو گے؟" انہوں نے اقرار یا جواب دیا اور کہا "ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم سچے شخص ہو"۔ جناب رسول اللہؐ نے پھر فرمایا "تو پھر میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں اور انتباہ کرتا ہوں ایک بہت

بڑے عذاب کا جو بالکل قریب ہی ہے"۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا: "تمہارا آج کا دن برباد ہو جائے! تم نے ہمیں صرف یہ بتانے کے لیے بلوایا تھا"۔ ابولہب کا یہ جواب اور یہ الفاظ اس کی ہمیشہ ہمیشہ کی بدبختی کا سبب بن گئے۔ چونکہ اس کے یہ کلمات اللہ تعالیٰ کو شدید ناگوار گزرے اور اس پر اللہ کی طرف سے لعنت بھیج دی گئی، کسی بھی انسان کے لیے اس سے زیادہ بدبختی نہیں ہو سکتی۔ اس بارے میں فرمان ربی سورۃ (۱۱۱) کی آیت (۱) میں نازل ہوا جس میں کہا گیا ہے کہ "تباہ ہو جائیں دونوں ہاتھ ابولہب کے اور برباد ہو جائے وہ"۔ اس کے بعد تمام لوگ وہاں سے چلے گئے اور کسی نے بھی جناب رسول اللہؐ کی تنبیہ کا کوئی اثر نہیں لیا۔ (بخاری، مسلم و نسائی)

امام احمد نے بھی سیدہ عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب سورۃ (۲۶) الشعراء کی آیت (۲۱۴) نازل ہوئی تو جناب رسول اللہؐ نے کھڑے ہو کر کہا "اے فاطمہ، محمدؐ کی بیٹی! اے صفیہ، عبدالمطلب کی بیٹی! میں اللہ کے سامنے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تم مجھ سے میری ملک میں سے جو چاہو لے سکتی ہو"۔ یعنی اللہ کے رسولؐ نے اپنی پیاری بیٹی اور اپنی عزیز پھوپھی پر یہ واضح کر دیا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی نہیں کریں گی تو وہ انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا نہیں سکیں گے۔

(۳۰) جناب رسول اللہؐ کی اپنی قوم کو تنبیہ

اپنے پہلے خطاب کے دوران رسول اللہؐ نے صفا کی پہاڑی پر اپنے قبیلے کو بلا کر ایک بڑے عذاب کے خطرے سے آگاہ کیا اور یہ آگاہی اللہ کے اس قول اور حکم کے مطابق تھی جو سورہ الحجر (۱۵) کی آیت (۸۹) میں نازل ہوا یعنی "اور کہو (اے محمدؐ) کہ بے شک میں تم کو کھلم کھلا (عذاب ربی سے) ڈرانے والا ہوں۔ اس آیت شریفہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ وہ اپنی قوم کو آگاہ کر دیں کہ اگر انہوں نے نبیؐ کے پیغام کو ٹھکرا دیا تو ان کے لیے بڑا عذاب کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو اسی طرح کے عذاب کے لیے تیار رکھیں جیسا عذاب ان سے پہلے دوسری نافرمان قوموں پر بھیجا گیا، جیسے عاد اور ثمود کو تباہ کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کی حکم عدولی کی وجہ سے"۔

امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے ابو موسیٰؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "میری مثال اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا، ایسی ہے جیسا کہ ایک شخص اپنی قوم کے پاس آیا اور

اس نے کہا: اے لوگو! میں نے ایک فوج (حملہ آور) دیکھی ہے اپنی آنکھوں سے اور میں ایک سچا خبردار کرنے والا ہوں۔ پس اپنا بچاؤ کرلو، بچاؤ کرلو! تو اس کی قوم کے کچھ لوگوں نے اسکا حکم مانا اور راتوں رات اپنے بچاؤ کے لیے وہاں سے نکل کھڑے ہوئے، جبکہ دوسروں نے اس کا کہنا نہ مانا اور وہیں اسی حالت میں پڑے رہے اور اگلی صبح دشمن ان تک پہنچ گیا اور انھیں تہس نہس کر دیا۔ یہ ایک کہانی کی مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے میرا حکم مانا اور میری اتباع کی اور جو کچھ میں لایا ہوں (اللہ کی طرف سے) اور ان لوگوں کی مثال جنہوں نے میری حکم عدولی کی اور اس سچائی کو ٹھکرا دیا جو میں لایا ہوں''۔

جناب رسولؐ اللہ نے اپنے رشتے داروں اور قبیلہ والوں کو متنبہ کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کھلے عام شروع کردی۔ یہ تبلیغ آپؐ نے اللہ کے ایک اور حکم جو سورۃ الحجر (۱۵) کی آیت (۹۴) میں نازل ہوا، جس میں فرمایا گیا کہ ''اس لیے کھلے عام اس بات کی تبلیغ کرو جس کے لیے تمہیں حکم دیا گیا ہے، (نافرمان) مشرکین کی پرواہ کیے بغیر''۔

یہ حکم جناب رسولؐ اللہ کی ہمت افزائی کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرکین کے رویے سے اپنی امیدیں نہ توڑیں اور نہ ہی ہمت ہاریں۔ بلکہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں مشرکین کے سامنے ڈٹے رہیں اور انھیں راہ مستقیم دکھانے کی کوشش کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شامل حال رہے گی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

(۳۱) جناب رسولؐ اللہ کو اہل قریش کی شدید دشمنی کا سامنا

جب سورۃ (۱۱۱) کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابولہب پر لامت بھیجی گئی تو ابو لہب اس وقت سے جناب رسولؐ اللہ اور ان کے مصاحبوں کا شدید ترین دشمن بن گیا، اس لیے اس نے قریش کے بڑوں سے مل کر رسولؐ اللہ کو ان کے مقاصد سے روکنے کا پروگرام بنایا۔ کیونکہ ان کا نظریہ تھا کہ رسولؐ اللہ اور ان کے ساتھیوں نے ان کے خداؤں کے خلاف سازش کا منصوبہ بنایا ہے چنانچہ قریش کے چوہدریوں نے یعنی (۱) عتبہ (۲) شیبا (۳) ابوسفیان (۴) ابو البختیاری (۵) الاسود بن مطلب (۶) ابوجہل (۷) ولید اور (۸) العاص بن وائل نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور وہ سب مل کر ابوطالب کے پاس اس کے بھتیجے کی شکایت کرنے کی غرض سے

گئے، وہ یہ کہ انہوں نے یعنی محمدؐ نے ان کے خداؤں کو برا بھلا کہا ہے اور ان کے اجداد کو بھی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو یا تو اس بات سے باز رکھے یا پھر اسے اکیلا چھوڑ دے تاکہ وہ ان سے خاطر خواہ طریقے سے نپٹ سکیں۔ ابوطالب نے انھیں تسلی دی اور یقین دلایا کہ وہ اس معاملہ کو خوش اسلوبی سے طے کرلیں گے، حالانکہ اسے ابھی تک معاملے کی حقیقت اور اس ذمہ داری کا احساس نہ ہو سکا تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسولؐ کے سپرد کی گئی تھی۔

دوبارہ قریشی سربراہ ابوطالب کے پاس ایک نئی پیشکش لے کر گئے، وہ یہ کہ انہوں نے ایک بہت خوبرو نوجوان عمارہ بن ولید کو اس کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اسکو لے کر اس کے بدلے جناب محمدؐ کو ان کے حوالے کردے۔ لیکن ابوطالب نے ان کی یہ پیش کش ٹھکرا دی کیونکہ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس طرح سے وہ ان کے بھتیجے سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

قریش کو آنے والے حج کا بھی خوف تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آئندہ حج کے حاجی محمدؐ کا پیغام ضرور سنیں گے اور انھیں اندیشہ تھا کہ کافی لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ اس لیے اہل قریش دوبارہ اکٹھے ہوئے اور تدبیریں کرنے لگے کہ متوقع حاجیوں کو آپؐ سے کس طرح سے بچایا جاسکے۔ اس لیے انہوں نے جناب رسولؐ اللہ کے متعلق غیر پسندیدہ الزامات لگانے اور بے تکے سوالات کرنے شروع کر دیے مثلاً یہ کہ:

۱) محمدؐ نے ان اجداد اور خداؤں کو گالیاں دی ہیں۔
۲) انہوں نے محمدؐ سے حیرت انگیز کرامات دکھانے کے لیے کہا۔
۳) انہوں نے جناب رسالت مآب کے متعلق طنزیہ اور مسخرانہ الفاظ کا استعمال شروع کر دیا۔ انھیں یہ عجیب لگا کہ مالک کائنات صرف ایک ہی ہے۔
۴) انہوں نے جناب رسولؐ اللہ کے متعلق اور آپؐ کے جانثاروں کے بارے میں بیہودہ اور ظالمانہ رویہ بھی اختیار کر لیا۔

(۳۲) داعیٔ حق کو ''مجنون'' پکارنا

اہل قریش نے جناب رسالت مآبؐ کو لوگوں سے دور کرنے کے لیے یہ مشہور کر دیا کہ وہ مجنون ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کے حق میں سورۃ الحجر (۱۵) آیات ۶-۷ میں فرمایا کہ

"اور وہ (کفار مکہ) کہتے ہیں کہ تم (اے محمدؐ) کہ جس پر ذکر (قرآن) نازل کیا گیا! بیشک تم مجنون ہو۔ اور اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو کیوں نہیں ہمارے پاس فرشتے لاتے"۔ اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے وہ الفاظ جو انہوں نے نبیؐ کی تضحیک کے لیے استعمال کیے تھے قرآن مجید کی دستاویز میں قلمبند کر لیے اور پھر وہیں اسکا جواب بھی دے دیا۔ اس لیے سورۃ الحجر (۱۵) کی آیت (۸) میں فرمایا گیا "ہم (اللہ) فرشتوں کو نہیں بھیجتے (کسی قوم پر) لیکن صرف فیصلے کے لیے (عذاب دینے کے لیے) اور (اگر ایسا کرنا ہوتا تو) ان کو مہلت نہ دی جاتی"۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ پر واضح کر دیا کہ جب کسی قوم میں کفر اور شرک کی بغاوت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اللہ اور اس کے نبیؐ کے احکامات کی پرواہ نہیں کی جاتی تو وہ قوم کسی مزید ڈھیل کے قابل نہیں رہتی۔ اور اللہ اپنا عذاب ان پر نازل کر دیتا ہے جیسے کہ اہل قریش سے پہلے بہت سی قومیں اللہ کے عذاب کا مزہ چکھ چکی ہیں۔ مثلاً قوم نوح، قوم فرعون، قوم عاد، قوم لوط، قوم صالح وغیرہ یہ سب اللہ کے عذاب سے تباہ و برباد ہو گئیں۔ اس لیے تنبیہ کی گئی ہے اولاد آدمؑ کو کہ وہ کسی ممکنہ عذاب کا انتظار نہ کریں کیونکہ جب عذاب آتا ہے تو پھر کسی کو مہلت نہیں دیتا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو بھی تسلی و تشفی دی اور اسی سورۃ الحجر کی آیات (۱۰-۲) میں فرمایا کہ "ہم نے (اے محمدؐ) تم سے پہلے بھی پچھلی قوموں میں بھیجے (پیغمبر) اور کوئی رسول ان کے پاس ایسا نہیں آیا، جس کے ساتھ انہوں نے استہزا نہ کیا ہو (یعنی اس کے ساتھ تمسخر اپنی کر کے انہیں جھٹلایا نہ ہو) پس ہم اسی طرح سے یہ استہزا (یعنی کفر) ان کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں (ان کے کرتوتوں کی وجہ سے)"۔

(۴۳) کفار کا بتوں سے جنون محبت

کفار مکہ رسول اللہؐ کے پیغام وحدانیت کے متعلق حیرانگی کی ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گئے اور چاہتے تھے کہ اگر کوئی ایسی خبر ہے بھی تو کسی فرشتے کے ذریعہ ہم تک پہنچنی چاہیے تھی۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ فرشتے عام لوگوں کے لیے رہبر و راہنما بن کر نہیں آتے، بلکہ صرف عذاب کی تکمیل کے لیے ہی بھیجے جاتے ہیں۔ در اصل وہ رسول اللہؐ کے اس پیغام کو سننا ہی نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ بتوں کی محبت میں دیوانے ہو چکے تھے۔ قرآن حکیم کی سورۃ ص (۳۸) کی آیت

(۴-۵) میں فرمان ربی ہے کہ "اور ان کفار (قریش) نے تعجب کیا کہ ان کے پاس ان ہی میں سے ایک (پیغمبر) ڈرانے والا آ گیا، اور کہنے لگے یہ شخص ساحر (معجزہ دکھانے پر) ہے اور جھوٹا (دعویٰ نبوت میں)، کیا (یہ سچا ہو سکتا ہے) اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا، واقعی یہ بہت عجیب بات ہے"۔

اسی طرح سے سورہ یونس (۱۰) کی آیت (۲) میں کہا گیا ہے کہ "کیا ان لوگوں (مکہ والوں) کو اس پر تعجب ہوا کہ ہم (اللہ) نے ان میں سے ایک شخص کے پاس الہام بھیجا کہ سب کو (احکام اللہ کے انکار پر) ڈرائے۔ اور جو ایمان لے آئیں انہیں خوشخبری سنائے کہ ان کے رب کے پاس ان کو پورا صلہ ملے گا۔ کافر کہنے لگے کہ یہ شخص تو بلا شبہ صریحاً جادوگر ہے" (استغفراللہ)۔

اسی معاملہ کے متعلق ابوجعفر بن جریر نے لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب ابوطالب بیمار تھا تو قریش کے کچھ لوگ ابوجہل سمیت اس کے پاس گئے اور کہا کہ تمہارے بھتیجے نے ان کے خداؤں کی بے عزتی کی ہے اور وہ پھر بھی اس سے علیحدہ کیوں نہیں ہوا؟ جب اس بارے میں ابوطالب نے نبی اکرمؐ سے دریافت کیا کہ وہ کیوں ان کے خداؤں کی بے عزتی کر رہے ہیں؟ تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ وہ ان لوگوں سے صرف ایک لفظ چاہتے ہیں، جس کے کہنے پر کل عرب ان کے تابعدار اور غیر عرب انہیں جزیہ ادا کریں گے۔ یہ سنتے ہی وہ بولے ایک حرف! ہاں! تمہارے باپ کی قسم، ہم دس لفظ بولیں گے۔ بتاؤ وہ لفظ کیا ہے؟ ابوطالب نے کہا وہ کیا ہے میرے بھتیجے! جناب رسول اللہ نے جواب دیا کہ "کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں سوائے اللہ کے"۔ وہ لوگ احتجاجاً اٹھ کھڑے ہوئے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اور کہتے ہوئے "کیا اس نے بہت سے خداؤں کو ایک میں بدل دیا ہے بے شک یہ ایک عجیب بات ہے"۔

(۴۴) بت پرستوں کی رسول اللہؐ کو بدنام کرنے کی سازش

نادان بت پرستوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ یعنی محمد رسول اللہ جو کچھ بھی پڑھ کر سناتا ہے وہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ کسی اور شخص کا کلام ہے۔ ان کا مطلب مکہ کے ایک غیر عرب شخص سے تھا جو قریش قبائل میں سے ایک کا ملازم تھا اور صفا پہاڑی کے قریب سامان فروخت کرتا تھا،

چونکہ وہ غیر عرب تھا اس لیے زبانِ عربی کا ماہر نہ ہوسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی جناب رسولؐ اللہ اس کے پاس بیٹھے ہوں اور اس سے کچھ گفتگو فرمائی ہو۔

اس سازش کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل (۱۶) کی آیت (۱۰۳) میں اس طرح سے فرمایا ہے کہ "اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ (کفار مکہ) یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو ایک شخص سکھلا جاتا ہے۔ جس کی نسبت یہ اشارہ کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے، جبکہ یہ قرآن صاف عربی میں ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے الزام کی متعلق اعتبار سے نفی کر دی اور پھر ان کی نفی کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسے جاہل اور نافرمان لوگوں کی سزا بھی سنا دی یعنی اسی سورہ کی آیت (۱۰۴) میں فرمانِ ربی ہوتا ہے کہ "جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے ان کو اللہ تعالیٰ کبھی راہ پر نہ لائیں گے اور ان کے لیے دردناک سزا ہوگی"۔

(۳۵) نافرمانوں سے اللہ کی ناپسندیدگی

جب اہل مکہ نے اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی کی اور اللہ کے کلام کو بھی جھٹلا دیا، حالانکہ اللہ کے نبیؐ نے ان کے سامنے اپنی حیاتِ مبارکہ کے چالیس برس اس طرح پاکیزگی، طہارت اور شرافت میں گذارے تھے کہ لوگ انہیں صبور کے نام سے یعنی صبر کرنے والا حلیم شخص کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کا صداق اور امانت کے پاسبان ہونے کی وجہ سے انہیں صادق اور امین کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ بے عقل لوگ یہ نتیجہ اخذ کرنے سے معذور رہے کہ وہ شخص جس کو کسی چیز کا لالچ نہیں، جو امانت دار ہے، صبر کرنے والا ہے، ہمیشہ سچ ہی بولتا ہے، اسے کسی شے کی نہ ہوس ہے نہ طمع، جو شخص اپنے لیے، اپنے گھر والوں کے لیے جھوٹ نہیں بولتا تو وہ اللہ کی خاطر کیوں کر جھوٹ بولے گا، انہوں نے کیوں کر ایسے شخص کو دیوانہ کہا، یکا یک ان پر اعتبار کرنا کیوں چھوڑ دیا، انہوں نے ایسے سچے اور پاکیزہ شخص کو کیونکر بدنام کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی کہ ان کی عقل پر پردے پڑ گئے تھے اور ان کے دل پر قفل لگ گئے تھے، ان کے اذہان مردہ ہوچکے تھے اور ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بالکل مفقود ہوچکی تھیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بیزاری کا اظہار فرمایا اور کہہ دیا کہ چونکہ وہ میری نشانیوں سے انکار کر رہے ہیں اس لیے اب ان کے لیے ہدایت کے بدلے صرف عذاب کا راستہ ہی باقی رہ

گیا ہے۔ اس کے برعکس قریش کے سردار ابوسفیان نے اس بات سے بھی سبق نہیں سیکھا کہ جب وہ اپنی تجارت کے سلسلے میں ملک شام گیا ہوا تھا اور اسی دوران شام کے رومن گورنر کو جناب رسولؐ اللہ کے متعلق معلومات درکار ہوئیں تو اس نے اپنے وزیروں سے کہا کہ اسی جگہ کا اگر کوئی شخص مل جائے جہاں کے رسالت کے دعویدار محمدؐ ہیں تو اسے یہاں لے آؤ۔ چنانچہ ابوسفیان کو گورنر کے دربار میں لایا گیا اور پوچھا گیا کہ اس شخص نے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے کیا اس سے قبل کبھی جھوٹ بولا تھا۔ ابوسفیان نے اپنی انتہائی دشمنی کے باوجود انکار میں جواب دیا، اس پر اس گورنر نے کہا "جو شخص اپنے لیے جھوٹ نہیں بولتا وہ اپنے مالک کے لیے کیسے جھوٹ گھڑے گا"۔ گویا کہ اس نے جناب رسولؐ اللہ کے سچے ہونے کا ایک منطقی نتیجہ اخذ کیا۔

یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل (۱۶) کی آیت (۱۰۳) میں کفار مکہ کے الزام کی تردید کی تو ساتھ ہی دوسری آیت (۱۰۴) میں ان کافروں کے لیے اپنی طرف سے سزا کا اعلان بھی کر دیا اور مزید اگلی آیت (۱۰۵) میں فرمایا کہ "پس جھوٹ افترا کرنے والے یہی لوگ ہیں (کافرین مکہ) جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے، اور یہی لوگ کامل جھوٹے ہیں"۔

(۳۶) بت پرستوں کی بے وقوفی

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان (۲۵) کی آیت (۳) میں بت پرستوں کی بے وقوفیوں کے متعلق ان کو جتلا دیا ہے کہ وہ کتنے جاہل ہیں کہ اللہ واحد لاشریک کے علاوہ انہوں نے دوسرے بہت سے الٰہ بنا رکھے ہیں۔ حالانکہ تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا اور ان کے متعلق ہر معاملہ پر نظر رکھنے والا صرف ایک اللہ ہی ہے۔ اور وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے، اس کے برعکس یہ بت پرست جن کی پرستش کرتے ہیں وہ کچھ بھی کرنے کی صلاحیت و طاقت نہیں رکھتے۔ وہ ایک معمولی مچھر کے پَر کی بھی تخلیق نہیں کر سکتے، وہ تو خود اپنے آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے، اگر ان کے منہ پر مکھی بیٹھ جائے تو وہ اسے اڑا نہیں سکتے تو ایسے معبود اپنے پجاریوں کی کیا مدد کرتے ہوں گے اور کیسے مدد کر سکتے ہیں، وہ تو بیچارے خود بے بس ہیں۔

اسی ضمن میں سورۃ فاطر (۳۵) کی آیت (۱۳-۱۴) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات کے بارے میں فرمایا ہے کہ "وہ (اللہ) داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو

رات میں، اور اس نے سورج اور چاند کو مقرر کیا ہوا ہے اپنے اپنے کام پر ایک وقت مقررہ تک (نظام شمسی کے قوانین کے مطابق) اور وہ وقت مقررہ تک چلتے رہیں گے اور یہی ہے اللہ تمہارا مالک، اور اسی کی بادشاہی ہے (کل کائنات کی) اور اس (اللہ) کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے اوپر والی جھلی جتنی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ اگر تم ان کو مدد کے لیے پکارو تو اول تو وہ تمہاری پکار سننے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے اور اگر وہ (فرض کرو) سن بھی لیں تو تمہاری فریاد پوری کرنے کے قابل نہیں ہیں اور بروز قیامت وہ خود تمہارے اس شرک کی مخالفت کریں گے اور تمہیں (اے محمدؐ) کوئی خبر نہیں دے سکتا اس (اللہ) کی طرح، جو سب کچھ جاننے والا ہے (ہر چیز کے بارے میں)''۔

مزید یہ ایک حیرت کن بات ہے کہ جب ان لوگوں سے جو اللہ کے سوا دوسروں سے مدد مانگتے ہیں پوچھا جائے کہ اس کائنات کی تخلیق کس نے کی تو فوراً کہتے ہیں اللہ نے، اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ان کی مدد کرنے کے قابل نہیں ہیں لیکن پھر بھی ان کے سامنے جھکتے ہیں اور ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور اپنی بے انتہا بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اس بارے میں قرآن کریم سورۃ الزمر (۳۹) آیت (۳۸) میں کہتا ہے کہ ''اور اگر تم ان سے (کافروں سے) پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً یہی کہیں گے کہ اللہ نے۔ (تو پھر) کہو (اے محمدؐ) تو پھر مجھے بتاؤ کہ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا وہ نقصان دور کر سکتے ہیں؟ یا پھر اللہ کوئی فضل مجھ پر کرنا چاہے تو کیا وہ اس فضل کو مجھ تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں؟ کہو! اللہ ہی میرے لیے کافی ہے اور توکل کرنے والوں کو (کامل) توکل اسی ذات پاک پر ہے''۔

ان تمام دلیلوں کے باوجود وہ ماسوائے اللہ دوسروں کو پکارتے ہیں اس سے زیادہ جہالت اور بے وقوفی اور کیا ہو سکتی ہے؟

(۴۷) مشرکین کی طرف سے مفاہمت کی پیشکش

اہل مکہ حالانکہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے تھے لیکن انہیں شان نبوت اور پیغمبری کے فرائض کا ذرہ برابر بھی اندازہ نہ تھا۔ وہ جناب رسول اللہؐ کی دعوت کو ان کے اپنے ذاتی مفاد کا ذریعہ

سمجھ رہے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا اقرار بھی کرتے، اس کو پکارتے بھی، اور یہ بھی جانتے کہ یہ بت ان کے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہیں لیکن ان کی بدبختی کہ وہ پھر بھی ان بتوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے۔ اور اس کے رسولؐ کے متعلق یہ گمان کرتے کہ وہ اپنی کسی خاص خواہش کی تکمیل کے واسطے ان کے بتوں کی نفی کر رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ پروگرام بھی بنایا کہ وہ رسول اللہؐ کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان سے ایک مفاہمت کر لیں جس کے تحت وہ ان سے اپنی مرضی کے مطالب پورے کروالیں اور وہ (یعنی رسول اللہ) بتوں کی مخالفت سے باز آجائیں۔

لیکن ان کی یہ خواہش اللہ کے حکم اور جناب رسول اللہؐ کے بنیادی مقصد کے خلاف تھی، بلکہ برعکس تھی۔ دین اسلام تو شروع ہی انکاریہ جملے سے ہوتا ہے اور ایمان کی پہلی شرط ہی انکار سے شروع ہوتی ہے یعنی کوئی نہیں ہے الا سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے صرف وہی ہستی عبادت کے لائق ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کی سورۃ القلم (۶۸) آیت (۹) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو تسلی و تشفی دی اور فرمایا ''یہ لوگ (کفار مکہ) چاہتے ہیں کہ آپؐ اپنی نبوت کے مقاصد پورا کرنے کی کاوشوں سے بیزار ہو جائیں''۔ لہٰذا نبیؐ یا اس کے اطاعت گزار ساتھی کبھی بھی اپنی جدوجہد سے متزلزل نہیں ہو سکے اور نہ ہی کسی اللہ کے تابعدار بندے نے کفر کے مقابلے میں کوئی کمزوری دکھائی۔

(۴۸) کفار کا طنزیہ و مزاحیہ ردعمل

جب اہل مکہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود جناب رسول اللہؐ کو ان کے ارادے سے روکنے میں ناکام ہو گئے اور ان جانثار ساتھیوں کو بھی تو انہوں نے ان کے ساتھ طنزیہ طرز عمل اختیار کر لیا۔ انہوں نے اس خیال کو احمقانہ تصور کیا کہ ان کے بہت سے خداؤں کو رد کیا جائے جن کی وہ پرستش کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں صرف ایک خدا کو ہی تسلیم کیا جائے اور صرف اس کی پرستش کی جائے۔

اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کا طنزیہ مزاحیہ اور تنقیدی رویہ بالکل پسند نہ آیا اور اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس طرز عمل کو ایک بہت بڑا جرم قرار دیا اور اس کے صلے میں ان کے لیے روز قیامت ایک بڑے عذاب کی وعید سنائی۔ اس کے برعکس جن پر یہ ہنسی ٹھٹھا کرتے تھے، ان کے لیے بہت

بڑے انعام کا وعدہ فرمایا۔ اللہ نے اس بارے میں اپنا فرمان مبارک سورۃ مطففین (۸۳) کی آیت ۲۹-۳۶ میں نازل فرمایا جس میں کہا گیا کہ ”

۱۔ بے شک وہ مجرم جو ایمان والوں پر ہنستے تھے۔
۲۔ اور جب بھی وہ (ایمان والے) ان کے سامنے سے گزرتے تھے تو وہ (کافر) ایک دوسرے کو آنکھوں سے (تمسخرانہ) اشارہ کرتے۔
۳۔ اور جب وہ (کافر) اپنے لوگوں کے پاس جاتے تو اُن کے (ایمان والوں کے) بارے میں مذاحیانہ تذکرہ کرتے۔
۴۔ اور جب وہ (کافر) ان کو (ایمان والوں کو) دیکھتے تو کہتے کہ بے شک! یہ لوگ تو بے راہ رو ہیں۔
۵۔ لیکن وہ (کافر) ان پر (ایمان والوں پر) نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے۔
۶۔ پس آج کے دن (روزِ قیامت) ایمان والے ان کافروں پر ہنسیں گے۔
۷۔ مسندوں پر بیٹھے (ان کافروں کو) دیکھ رہے ہوں گے۔
۸۔ کیا کافروں کو ان کے کیے کا بدلہ نہیں ملا۔“

(۳۹) ابوجہل کا جناب رسول اللہؐ کو دھمکی دینا

سورۃ علق (۹۶) کی آیت (۹-۱۰) میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے بارے میں فرمایا۔ جب ابوجہل نے (جو اللہ کی لعنت کا مستحق ہوا) جناب رسول اللہ کو دھمکی دی کہ اگر وہ آئندہ سے کعبہ کے سامنے نماز پڑھیں گے تو وہ ان سے اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ فرمایا کہ: ”کیا تم نے (اے محمدؐ) اُسے (ابوجہل کو) دیکھا جو روکتا ہے ہمارے ایک خاص غلام کو (یعنی رسولؐ اللہ کو) جب وہ نماز پڑھتا ہے“۔ پھر اسی سورۃ کی آیات (۱۱-۱۳) میں فرمایا ”مجھے بتاؤ اگر وہ (محمدؐ) صحیح راستے پر ہے (اللہ کے) یا حکم دیتا ہے نیکی کا، مجھ کو بتاؤ تو اگر وہ (ابوجہل) منکر ہوا ہے (حق کا) اور منہ پھیر لیتا ہے اُس سے“۔ پھر آیت (۱۴-۱۹) میں فرمایا ”وہ (ابوجہل) نہیں جانتا کہ اللہ دیکھتا ہے (اس کے ارادے اور اعمال)۔ نہیں! اگر وہ باز نہ آیا (اپنے ارادے سے) تو ہم (اللہ) اس کے ماتھے کو داغ دیں گے، جھوٹا اور گناہ گار ماتھا۔ تو پھر اُسے (ابوجہل کو) اپنے مددگاروں کو بلانے دیتا اور ہم بھی (اللہ) جہنم کے پہرہ داروں کو بلائیں گے۔ نہیں! (اے محمدؐ) اس کا کہنا

کبھی نہ ماننا، بلکہ سجدے میں گر جاؤ اور (اپنے رب کے) نزدیک ہو جاؤ“ (آیت سجدہ)

بخاریؒ، ترمذیؒ اور نسائیؒ اور دوسروں نے لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس موقع پر ابوجہل نے کہا ”اگر میں محمدؐ کو کعبہ میں نماز پڑھتا دیکھوں گا تو میں ان کی گردن پر ٹھوکر ماروں گا“۔ پس جب اس کا پیغام جناب رسول اللہ تک پہنچا تو آپؐ نے فرمایا ”اگر وہ ایسا کرنے لگے گا تو فرشتے اسے پکڑ لیں گے“۔

اس کے علاوہ ایک اور روایت ہے ابن عباسؓ سے کہ جناب رسولؐ اللہ کعبہ کے سامنے مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل ان کے سامنے سے گزرا اور جناب رسولؐ اللہ سے فرمایا اے محمدؐ! کیا میں نے تمہیں ایسا کرنے سے نہیں روکا تھا (یعنی یہاں نماز پڑھنے سے) اور پھر جناب رسولؐ اللہ کو دھمکی دی۔ اس وقت اللہ کے رسولؐ غصے میں آ گئے اور اسے تنبیہ کی۔ اس پر اس نے کہا ”اے محمدؐ! اب تم نے مجھے دھمکی دی ہے، اللہ کی قسم میرے ساتھ اس وادی کے بہت سارے لوگ ہیں“۔

اس پر پھر اللہ تعالیٰ نے اسی سورۃ کی آیات ۱۷-۱۸ نازل فرمائیں جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔ ترمذیؒ نے ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”اگر وہ (ابوجہل) اپنے لوگوں کو بلاتا تو عذاب کے فرشتے اسے اور اس کے ساتھیوں کو اسی وقت دبوچ لیتے“۔

ابن جریر نے بھی ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ابوجہل نے کہا ”کیا محمدؐ اپنے منہ پر خاک ملتا ہے (یعنی سجدہ میں جاتا ہے) جب تم لوگ وہاں ہوتے ہو؟“ لوگوں نے جواب دیا، ہاں۔ پھر اس نے کہا ”لات اور عزہ کی قسم اگر میں اسے اس طرح عبادت کرتے دیکھا تو میں اس کی گردن پر مارتا (اللہ کی لعنت اس پر) اور اس کا منہ مٹی سے بھر دیتا“۔

اس کے بعد ہی جناب رسولؐ اللہ وہاں تشریف لائے اور نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اس وقت آپؐ نے ابوجہل کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ جو کہہ رہا تھا کر سکے۔ لیکن وہاں موجود لوگوں کو حیرانگی ہوئی کہ اس نے اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے اس کی وجہ اس سے پوچھی تو اس نے جواب دیا ”بے شک میرے اور اس کے درمیان (یعنی جناب رسولؐ اللہ کے) آگ کی ایک کھائی تھی اور پروں والے بھوت تھے“۔ اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا ”اگر وہ میرے نزدیک آتا تو فرشتے اس کے جسم کا ایک ایک عضو نوچ ڈالتے“۔

(۴۰) جناب حمزہؓ کا رسولؐ اللہ کی حمایت میں جوشِ محبت

ابوجہل کی بدبختی کہ وہ رسولؐ اللہ کے متعلق ایسی کرامات دیکھنے کے باوجود ان پر ایمان نہ لایا۔ بلکہ اس کی بدتمیزیاں بدستور جاری رہیں اور اس کی دشمنی اور ایذا رسانی جناب رسولؐ اللہ اور ان کے ساتھیوں کے لیے بڑھتی رہی۔ ایک روز جناب رسولؐ اللہ صفا کی پہاڑی سے گزر رہے تھے تو ابوجہل نے راستے میں آپؐ سے بدتمیزی کی۔ لیکن جناب رسولؐ اللہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور اس کی بات پر درگذر فرما کر گذر گئے۔ لیکن اس بات کا علم جناب رسولؐ اللہ کے چچا جناب حمزہؓ کو ہوا اور وہ یہ جان کر آگ بگولہ ہو گئے کہ ابوجہل نے ان کے بھتیجے کی بے عزتی کی۔ حالانکہ اس وقت تک وہ اسلام نہ لائے تھے، اُس وقت وہ کعبہ کے سامنے تھے، چونکہ وہ شکار سے لوٹے تھے اس لیے ان کے پاس تیر اور کمان موجود تھے۔ وہ یہ معاملہ جانتے ہی فوراً ابوجہل کے پاس گئے اور اپنے کمان سے اس کے سر پر زوردار ضرب لگائی اور کہا "کیا تم نے محمدؐ کو گالیاں دی ہیں"۔ اور اس کے بعد کہا "سنو! میں نے بھی اس کے عقیدے کو قبول کر لیا ہے اور میں بھی وہی کچھ کہتا ہوں جو وہ کہتا ہے اور اگر تم مجھ سے بھی وہی سلوک کرنا چاہتے ہو تو کوشش کر کے دیکھ لو"۔ ابوجہل کے ساتھیوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن اس نے انہیں روک دیا یہ کہتے ہوئے کہ "میں نے بھی اس کے بھتیجے کو گالیاں دی ہیں"۔

اب جب کہ جناب حمزہؓ نے اسلام قبول کر لیا تو قریش سمجھ گئے کہ اب رسولؐ اللہ کافی مضبوط ہو گئے ہیں اور ان کی شرارتوں سے بچ گئے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حمزہؓ بہت بہادر، طاقتور اور باہمت شخص تھا۔

(۴۱) عتبہ بن ربیعہ کی سودے بازی

قریش کا ایک سردار اپنے دیگر سرداران قریش کے صلاح مشورے کے بعد جناب رسولؐ اللہ کے پاس ایک سودے کی تجویز لے کر آیا تاکہ ان کے درمیان دشمنی کا معاملہ طے پا جائے۔ اس نے جناب رسولؐ اللہ کو اہل قریش کی طرف سے درج ذیل پیش کش کی تاکہ وہ اپنی دعوت کو چھوڑنے پر آمادہ ہو سکیں۔

۱) اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے خیالات کی پرچار کر کے تمہارا مرتبہ اور عزت بلند ہو جائے تو ہم

اس بات کے لیے تیار ہیں کہ ہم تمہیں اپنا سردار تسلیم کر یں۔

۲) اگر تمہاری یہ خواہش ہے کہ تم اپنے عقیدے کو پھیلا کے دولت مند بن جاؤ تو پھر ہم اتنی رقم اکٹھی کر کے تمہیں دے دیں گے کہ تم سب سے زیادہ امیر ہو جاؤ گے۔

۳) اور اگر تم اس طریقے سے بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں۔

۴) اور اگر تمہیں کوئی روح یا جن بھوت چمٹ گیا ہے تو ہم اس سے نپٹنے کا بندوبست کرتے ہیں۔

جب عتبہ اپنی بات کہہ چکا تو جناب رسولؐ اللہ نے جواب دیا "اے ابوالولید! کیا تم کہہ چکے ہو جو کچھ بھی تمہیں کہنا تھا؟" اس نے کہا ہاں! تو جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "تو پھر میری بات بھی سنو!" اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے قرآن حکیم کی سورۃ فصلت (۴۱) کی پہلی پانچ آیات کی تلاوت شروع کر دی۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ "یہ نازل ہوا ہے یہ کلام مہربان اور رحم والے کی طرف سے۔ یہ کتاب ہے جس کی آیات صاف صاف بیان کی گئی ہیں عربی (زبان) میں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ خوشخبری دیتے ہوئے اور تنبیہ کرتے ہوئے لیکن بہت سے لوگ ان سے منہ پھیر لیتے ہیں اور سنتے نہیں۔ اور وہ (کافر) کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہے اس بات کے لیے جو تم (اے محمدؐ) ہمیں بتلاتے ہو اور ہمارے کانوں میں سماعت نہیں اس کو سننے کی اور ہمارے اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے، پس تم اپنا کام کرو اور ہم اپنا"۔

جناب رسولؐ اللہ نے سورۃ فصلت کی تلاوت جاری رکھی یہاں تک کہ آیت سجدہ (۳۸ آیت) تک پہنچ گئے اور پھر سجدہ کی حالت میں گر گئے۔ اس آیت سجدہ میں اللہ کے نافرمانوں کو اللہ تعالیٰ نے جتلا دیا کہ: "اگر وہ (کفار) تاحال تکبر میں مبتلا ہیں (پیغام حق کو قبول کرنے میں) تو پھر (انہیں معلوم ہونا چاہیے) اللہ کے پاس ایسی ایسی مخلوق (فرشتے) موجود ہے جو (پوری تابعداری کے ساتھ) تسبیح کرتے رہتے ہیں اس کی (اللہ کی) رات اور دن اور اس حال سے کبھی نہیں تھکتے"۔ (سجدہ واجب ہے اس آیت کو پڑھنے کے بعد)

اس کے بعد پھر جناب رسولؐ اللہ نے عتبہ سے کہا "اے ابوولید کیا تم نے اللہ کا پیغام سن لیا۔ پس یہی میرا جواب ہے تمہاری اس تجویز کا جو تم نے دی ہے اب یہ تمہارے اوپر ہے کہ تم اس پیغام کو کس طرح سے لیتے ہو"۔

عتبہ بہرحال قرآن کریم کے اس پیغام سے متاثر تو بہت ہوا اور پھر اس نے اپنے لوگوں میں جا کر انہیں مشورہ بھی دیا کہ وہ محمدؐ کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اس نے اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ ”مجھے یقین ہے کہ اس شخص کی کچھ اہمیت تو ضرور ہوگی، اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو تم بھی اس کے ساتھ کامیاب ہوتے ہو، اور اس کی عزت افزائی بھی تمہاری عزت ہوگی“۔ لیکن قریش نے سوچا کہ عتبہ رسولؐ اللہ کے کلام کی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر آ گیا ہے لہٰذا اس کے مشورے پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

(۴۲) نُضَیر بن حارث کی حماقت

یہ شخص جناب رسالت مآبؐ کے دشمنوں میں سے ایک تھا اس نے ایک مرتبہ اہل قریش سے خطاب کیا اور کہا کہ وہ ایک بہت بڑے مسئلے سے دوچار ہے یعنی پیغام رسالت کے بارے میں۔ وہ یہ کہ اس نے کہا: ”وہ تمہارے سامنے ایک نوجوان لڑکا تھا، سب اس سے محبت کرتے تھے، سب سے زیادہ سچا اور امانت کے معاملے میں دیانتدار، اب وہ تمہارے سامنے ایک ایسی شے لایا ہے کہ تم نے اسے جادوگر کہہ دیا، اللہ کی قسم! وہ جادوگر نہیں۔ پھر تم نے اسے ایک پیشین گوئی کرنے والا بتا دیا، نہیں! اللہ کی قسم وہ ایسا نہیں۔ پھر تم لوگوں نے یہ سوچا کہ وہ ایک پاگل شخص ہے، نہیں! اللہ کی قسم وہ ایسا نہیں۔ پھر تم نے اسے کہا کہ وہ ایک شاعر ہے، اللہ کی قسم وہ شاعر نہیں“۔

پھر اس کے بعد اس نے اہل قریش سے خطاب کیا اور کہا ”کہ اے! قریش کے لوگوں سنجیدہ ہو جاؤ اور سوچ و بچار کرو، اس سے پہلے کہ تمہیں ایک بڑے مقابلے سے دوچار ہونا پڑے“۔ دراصل نضیر بن حارث نے کوشش کی کہ وہ جناب رسولِ خداؐ کے خلاف قریش کی دشمنی کو ہوا دے۔ نضیر نے بیرون ملک سفر کیا ہوا تھا اور وہ ایرانی تاریخی کہانیاں بھی جانتا تھا اور وہ کعبہ کے پاس اس جگہ بیٹھ جاتا، جہاں اکثر رسولؐ اللہ بیٹھتے۔ جہاں تک جناب رسولؐ اللہ کا معاملہ ہے تو آپؐ وہاں بیٹھ کر اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتے اور لوگوں کو ان نافرمان قوموں کی کہانیاں بیان فرماتے، جن پر اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا۔ اس کے برعکس نضیر وہاں بیٹھ کر لوگوں کو اہل فارس کے بادشاہوں اور نوابوں کی کہانیاں سناتا اور پھر لوگوں سے پوچھتا کہ کس کی کہانیاں زیادہ اچھی ہیں، اُس کی یا محمدؐ (رسالت مآبؐ) کی۔ نضیر کے اس فعل کا مقصد لوگوں کو صرف یہ باور

کرانا تھا کہ جناب رسالت مآبؐ کے قصے صرف پرانے زمانے کی تصوراتی کہانیاں ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی حماقتوں کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کے نازیبا اور احمقانہ تصورات کو ناگواری کے ساتھ ناپسند فرمایا اور کہا کہ جب اس کی آیات کافروں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ گزرے ہوئے زمانے کی کہانیاں ہیں۔

لہٰذا قرآن کی سورۂ فرقان (۲۵) کی آیات ۴-۶ اس معاملے کے بارے میں فرماتی ہیں کہ: ”وہ جو نافرمان ہیں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) بالکل جھوٹ ہے جسے وہ (محمدؐ) لایا ہے دوسروں کی مدد کے ساتھ۔ دراصل انہوں نے (کافروں نے) بڑا غیر منصفانہ، غلط اور جھوٹا بیان دیا ہے اور وہ کہتے ہیں: پرانے قصوں کی کہانیاں جو وہ (رسولؐ) لکھوایا ہے اور جو اسے بتائی گئی ہیں (کسی کے ذریعے سے) صبح اور دوپہر کے وقت۔ کہو: یہ (قرآن) اس نے نازل فرمایا ہے جو جانتا ہے رازِ آسمانوں اور زمین کے۔ بے شک! وہ معاف کرنے والا بہت رحم کرنے والا ہے“۔

(۴۳) قریش کا اہل کتاب سے مشورہ

محمد بن اسحاقؒ نے اکرمہ کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا کہ اہل قریش نے نضیر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہودی راہبوں کے پاس یثرب بھیجا، کہ وہ انہیں رسولؐ اللہ کے پیغام اور خیالات سے آگاہ کریں، اور اس بارے میں ان کے خیالات معلوم کریں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے، کہ اہل کتاب کا علم، پیغمبروں کے بارے میں زیادہ ہے۔ پس وہ ان کے پاس گئے اور رسولؐ اللہ کے بارے میں بتانے کے بعد، ان سے کہا کہ ”تم لوگ توریت کے ماننے والے ہو اس لیے ہم لوگ تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ اپنے ساتھی کے متعلق صحیح صحیح جان سکیں“۔ اس پر ان راہبوں نے کہا کہ ان رسولؐ سے تین چیزوں کے بارے میں دریافت کرو کہ وہ تینوں باتیں انہیں بتا دیں۔ راہبوں نے مزید کہا کہ اگر وہ ان کا جواب دے دیں تو پھر وہ اللہ کے رسولؐ ہیں، اگر نہیں تو پھر وہ سچ نہیں کہہ رہے۔ ان راہبوں نے مندرجہ ذیل سوالات بتائے۔

۱) پرانے وقتوں کے چند نوجوانوں کی کہانی

۲) ایک عجیب و غریب کہانی ایک شخص کی جس نے زمین کے مشرق سے مغرب تک کا سفر کیا۔

۳) روح کیا ہے۔

ان راہبوں نے مزید کہا "اگر وہ ان کا جواب بتا دے تو وہ پیغمبر ہے اور تم اس کی پیروی کرو، اگر نہیں تو پھر وہ اپنی طرف سے اختراع کر رہا ہے تو پھر اس سے نپٹو جیسا چاہو"۔ پس نضر اور عقبہ واپس آئے اور کہا "اے قریش کے لوگو! ہم تمہارے پاس ایک فیصلہ کن حل کے ساتھ آئے ہیں جو اس مسئلہ کو جو تمہارے اور محمدؐ کے درمیان ہے، ہمیشہ کے لیے طے کر دے گا"۔ اس کے بعد انہوں نے سارا قصہ ان سے بیان کیا۔

پھر وہ جناب رسول اللہؐ کے پاس آئے مندرجہ بالا سوالات کیے۔ جس پر جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ وہ اگلے روز تک ان کا جواب دیں گے۔ لیکن جناب رسول اللہؐ کی توقعات کے برخلاف آپؐ پر وحی کا نزول نہیں ہوا۔ حالانکہ عام طور پر جب بھی کبھی ایسی صورتحال پیش آتی تو اسی وقت یا آئندہ روز تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا نزول ہو جاتا۔ ایسی صورت میں جب کہ مسلسل پندرہ روز گزر گئے وحی کا نزول نہ ہوا تو صورتحال بہت نازک ہو گئی اور اہل مکہ کے دلوں میں شکوک و شبہات مزید تقویت پکڑ گئے۔ ادھر جناب رسول اللہؐ اس حالت پر بہت زیادہ غم زدہ اور پریشان ہو گئے اور مزید یہ کہ اہل مکہ کا طنزیہ ہنسنا بھی رسول اللہؐ کو شدید تکلیف پہنچا رہا تھا۔ آپ ذرہ غور فرمائیں کہ یہ جناب رسول اللہؐ کی زندگی کا اندوہناک واقعہ ہوگا جس کی وجہ سے آپؐ شدید بیقراری اور کرب میں مبتلا ہو گئے ہوں گے۔ لیکن پھر پندرہ روز گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ جو نہایت مہربان ہے اور بہت فضل کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، اس نے اپنا پیغمبر فرشتہ جناب رسول اللہؐ کے پاس بھیجا جو آپؐ کے پاس قرآن حکیم کی سورۃ کہف (۱۸) لے کر نازل ہوا۔ اس سورۃ مبارکہ میں پوچھے گئے پہلے دو سوالوں کے جواب تھے جبکہ تیسرے سوال کا جواب سورۃ اسراء (۱۷) کی آیت (۸۵) میں نازل ہوا۔ علاوہ ازیں اللہ (جو تمام تعریفوں کا مستحق ہے) نے اپنے نبی کی دلجوئی فرما کر آپؐ کے حزن و ملال کو بھی دور فرمایا۔ یہ دلجوئی سورۃ کہف (۱۸) کی آیت (۶) میں اس طرح کی گئی۔ فرمایا: "شاید تم (اے محمدؐ) اپنے آپ کو ہلاک کر لو گے اس غم میں کہ وہ (کفار) تم سے دور ہو گئے ہیں، کیونکہ وہ اس (قرآن) میں یقین نہیں رکھتے"۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہ بھی نصیحت کی اور حکم فرمایا کہ وہ ہمیشہ اپنے رب کی مرضی کا سہارا لے لیا کریں جب وہ کبھی کسی سے کوئی وعدہ کریں۔ اس بارے میں سورۃ کہف کی آیات

(۲۳-۲۴) میں فرمان ہوا کہ "اور کبھی بھی کسی بات کے متعلق یہ نہ کہو کہ "میں یہ کر دوں گا کل" بلکہ (جب تک یہ نہ کہہ دو) اگر اللہ کرے گا! اور اپنے رب کو یاد کرو جب تم بھول جاؤ تو کہو مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے آگاہ کرے گا، جلد ہی اس سے بہتر"۔

رسول کریمؐ کے ساتھ اس واقعہ کا پیش آنا اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح سے نصیحت اور حکم کرنا بہت ہی زیادہ اہم ہے امت مسلمہ کے ہر فرد کے لیے کہ وہ اس طرح سے اپنے ایمان کو تازہ کرے یہ سمجھ کر کہ اختیار کل کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک ہی ہے، اور ہمارے چاہنے اور ہمارے تدبر سے کچھ نہیں ہو سکتا، جب تک اللہ نہ چاہے۔ ان آیات مبارکہ کے نزول کے بعد جن میں یہود کے منتخب کردہ سوالات جو قریش نے جناب رسول اللہؐ سے کیے تھے، جب ان سوالات کا صحیح صحیح جواب انہیں مل گیا تو بقول یہودی راہبوں کے جناب محمدؐ، اللہ کے نبی ثابت ہو گئے لیکن اس کے بعد بھی ان یہود یثرب اور مشرکین مکہ کی بدبختی کہ وہ جناب رسالت مآبؐ کی رسالت پر ایمان نہیں لائے اور اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے۔ بے شک جب تک کوئی راہ حق کو خود سے اختیار نہیں کرنا چاہتا، اللہ تعالیٰ زبردستی اس کے قلب میں ایمان نہیں اتارتا۔

(۴۴) اہل قریش کا کمزور اور غریب ایمان لانے والوں پر ظلم

قریش نے دیکھا کہ ان کی بے حد مخالفت اور رکاوٹوں کے باوجود محمدؐ کے ماننے والے دن بدن بڑھ رہے ہیں اور خاص طور پر کمزور اور غریب لوگ جو سرداروں اور امیروں کے زیر عتاب تھے وہ زیادہ تر مسلمان ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں وہاں معاشرے کے معزز شہریوں کے برابر درجہ حاصل ہو جاتا۔ حتیٰ کہ غلام بھی مسلمان ہو رہے تھے کیونکہ اس نئے دین میں غلاموں کے بھی حقوق رکھے گئے تھے جبکہ اس وقت غلام کی حیثیت ایک شے کی تھی، جسے کسی بغیر وجہ کے قتل کیا جا سکتا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر اہل قریش نے فیصلہ کیا اور منصوبہ تیار کیا کہ ایسے غریب مسلمانوں کا گھیرا تنگ کیا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنے پرانے مذہب پر واپس لوٹ آئیں۔ اور ان لوگوں کے لیے نمونہ عبرت بن جائیں جو ابھی اسلام لانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ لہٰذا ایسے بے سہارا اور بے کس غلاموں اور دیگر لوگوں کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن اسلام کے ان جانثاروں نے اس بے دردی کے ساتھ ہونے والے ظلم کو برداشت کیا اور کوئی بھی

واپس اپنے مذہب پر نہیں لانا۔ یہ ظلم ان کے لیے اسلام کی طرف سے ایک امتحان بن گیا اور وہ حضرات اس میں کامیاب و کامران ہوئے۔ ان کی ثابت قدمی، اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک اعلیٰ ترین درجے کی تابعداری ان کے درجات اور مراتب بڑھانے کا باعث بنی اور انہوں نے غیر معمولی عزت پائی کہ آج تک پوری امت انہیں یاد کر کے ان کی جانثاری پر فخر کرتی ہے۔ یوں تو ایسی بہت سی مثالیں ہیں اور بہت سے جانثاروں نے اس ظلم کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر برداشت کیا لیکن ان میں سے دو شخصیتیں امت مسلمہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد رکھی جائیں گی (اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے)۔

(۱) سُمیہؓ: ابوجہل کی ایک کنیز جسے اس بدبخت نے اس ظالمانہ اور بیہودہ طریقے سے قتل کیا جسے رقم کرتے ہوئے مصنف کو شرم آرہی ہے، بلکہ اسے وہ رقم کر ہی نہیں سکتا اور یہ اخلاقی اقدار سے گرا ہوا گھناؤنا جرم ابوجہل نے کعبہ کے سامنے کیا۔ لیکن اس مومن خاتون کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر استقامت بخشا کہ انہوں نے دین اسلام کی خاطر اور اپنے ایمان کو قائم و دائم رکھنے کی خاطر اس ظلم کو برداشت کیا، اور بے حد اذیت ناک موت کو گلے لگایا۔ بے شک انہوں نے اُمتِ محمدؐ میں اس پہلے شخص کا درجہ پایا جو شہید ہوا، وہ پہلی شہید تھیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کی۔ بے شک وہ اللہ کے نہایت تابعدار بندوں میں سے ایک تھیں اور بے شک وہ سبقت لے جانے والوں میں سے سبقت لے جانے والی تھیں (اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں اُن پر)۔

(۲) بلالؓ: ایک حبشی غلام، جس پر بے دردی کے ساتھ ظلم کیا، اس کے آقا امیہ بن خلف نے لیکن انہیں جناب ابوبکر صدیقؓ نے خرید کر آزاد کر دیا۔ ان کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ جناب رسولؐ اللہ نے انہیں سب سے پہلے اذان دینے کے لیے کہا۔ اور انہیں یہ بھی اعزاز حاصل ہوا کہ جناب رسولؐ اللہ کے قریبی ساتھیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

جناب ابوبکر صدیقؓ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ آپ نے چھ غلاموں کو مختلف موقعوں پر خرید کے آزاد کیا، یہ وہ لوگ تھے جنہیں اسلام قبول کرنے کی سزا کے طور پر ظلم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح سے شہیدِ اسلام سُمیہؓ بی بی کو خرید کر آزاد کر دیں لیکن ابوجہل نے انہیں فروخت نہیں کیا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ مسلمان کنیز آزادی سے اپنے مذہب کی تبلیغ کرے گی۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ سُمیہؓ کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ عطا کرنے کے لیے

منتخب فرمالیا تھا، اور پھر انہیں شہادت کے مرتبہ پر فائز کر کے انہیں اپنی قربت عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کو ابوبکرؓ کی یہ ادا بھی پسند آئی کہ انہوں نے غلاموں کو خرید کر اللہ کی خاطر آزاد کیا، اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ اللیل (۹۲) آیات (۵-۷) میں فرمایا کہ ”اس (اللہ) کے لیے جو دیتا ہے (خیرات) اور اللہ کے فرائض انجام دیتا ہے اور اس سے ہمیشہ ڈرتا رہتا ہے یعنی تقویٰ اختیار کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے۔ ہم (اللہ) اس کے لیے آسانی کے راستے پیدا کر دیں گے (تاکہ وہ بھلائی اختیار اور حاصل کر سکے)“۔

اس کے علاوہ بہت سے علماء نے کہا ہے کہ اسی سورۃ اللیل کی آیات (۱۷-۲۱) بھی جناب ابوبکرؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ: ”اور وہ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان سے (دوزخ) بہت دور رکھی جائے گی۔ اور وہ جو اپنی دولت خرچ کرتا ہے اپنے نفس کی پاکیزگی کو بڑھانے کے لیے اور کسی سے بھی کوئی انعام نہیں چاہتا (یا تعریف وغیرہ) سوائے اس کے کہ وہ اپنے رب کا چہرہ مبارک دیکھے جو بہت ہی (یعنی سب سے) اعلیٰ و برتر ہے وہ یقیناً خوش ہو جائے گا (جنت میں جا کر)“۔

امام مسلمؒ نے ایک روایت ابن جریرؓ کی نقل کی ہے کہ عامرؓ بن عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا ”کہ ابوبکر قبول اسلام کے بعد غلاموں کو خرید لیا کرتے تھے، وہ جو بوڑھے ہوتے تھے اور خواتین۔ اس پر ان کے والد نے ان سے کہا اے میرے بیٹے! دیکھو تم اُن لوگوں کو آزاد کر رہے ہو جو بوڑھے اور ناتواں ہیں، لیکن اگر تم نوجوان اور توانا غلاموں کو آزاد کرو تو وہ تمہاری مدد کے لیے کھڑے ہو جائیں گے، جب بھی تمہیں ضرورت پڑے گی۔ ابوبکرؓ نے جواب دیا اے میرے والد! میں صرف اللہ کی رضا کے مطابق ہی سوچتا ہوں“۔

(۴۵) مسلمانوں کی ابی سینیا میں پناہ

جناب رسولؐ اللہ اور ان کے پیروکار قریش کی نفرتوں اور ظلم کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑی آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ اس حالت میں جناب رسولؐ اللہ کے ذہن میں ایک منصوبہ آیا، کہ کیوں نہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو ایسی جگہ جانے کا حکم دیں جہاں وہ اپنی مرضی سے اپنے دین کی پیروی کر سکیں۔ جناب رسول اللہ کا ہجرت کے متعلق یہ خیال، قیاس قوی کے مطابق قرآن

حکیم کی سورۃ الزمر (۳۹) کی آیت (۱۰) سے اخذ کیا گیا معلوم ہوتا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ "کہو (اے محمدؐ): اے میرے (اللہ کے) غلامو! جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں، انہیں اپنے رب سے ڈرنا چاہیے اور اس کا ہی حکم ماننا چاہیے، اچھائی ہے (یعنی انعام) ان لوگوں کے لیے جو اس دنیا میں بھلائی کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع ہے (چلنے پھرنے اور رہنے کے لیے)، صرف وہی لوگ جو صبر والے ہیں اپنا اجر پورا پورا وصول کریں گے، بغیر کسی حساب کے (یعنی بے شمار)"۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر تم اپنے دین پر ٹھیک طرح سے عمل نہیں کر سکتے، کسی بھی وجہ سے کسی جگہ، شہر یا ملک میں تو پھر اس جگہ کو چھوڑ دو اور کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں تمہیں اس بارے میں کوئی روک ٹوک نہ ہو۔

چونکہ جناب رسالت مآب کو یہ علم تھا کہ حبشہ کا بادشاہ بہت منصف اور مہربان شخص ہے اس لیے آپؐ نے رسالت کے پانچویں برس، ماہ رجب میں یعنی ۶۱۵ عیسوی میں ایک گروہ جو بارہ (۱۲) مردوں اور چار (۴) خواتین پر مشتمل تھا کو حکم دیا کہ وہ حبشہ کی جانب ہجرت کر جائیں۔ ان حضرات میں حضرت عثمانؓ ابن عفان ان کی اہلیہ سیدہ رقیہؓ (رسولؐ اللہ کی صاحبزادی) بھی شامل تھے۔ ان کے بارے میں جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا کہ یہ پہلے اشخاص ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بعد۔

اسی سال کے ماہ رمضان کے دوران مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ جناب رسولؐ اللہ اور معززین قریش کے ایک گروہ کا کعبہ کے سامنے آمنا سامنا ہو گیا تو آپؐ نے اچانک سورۃ نجم (۵۳) کی تلاوت شروع فرما دی۔ قرآن کی اس تلاوت نے جو جناب رسولؐ اللہ کی زبان مبارک سے آواز بلند ادا ہو رہی تھی، کفار مکہ کو حیرت میں ڈال دیا اور وہ اس تلاوت کو سن کر ان الفاظ کی دلکشی اور دلربائی میں اس قدر محو ہو گئے کہ جب رسالت مآبؐ سورۃ کی آخری آیت جو آیت سجدہ بھی ہے پر پہنچے یعنی "پس تم جھک جاؤ سجدے میں اللہ کے سامنے اور اُسی کی عبادت کرو (تنہا)" تو کفاران مکہ غیر ارادی طور پر بڑے انہماک کے ساتھ سجدہ میں گر گئے حالانکہ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بیشک وہ اللہ کو مانتے تھے لیکن وہ بتوں کو بھی پوجتے اور انہیں اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے۔ (سجدہ واجب ہوتا ہے)

اس واقعہ کے بعد فوری طور پر اس واقعہ کی تشہیر ہو گئی یہاں تک کہ مہاجرین حبشہ تک بھی اس کی خبر پہنچ گئی۔ لیکن خبر اس طرح پہنچی کہ تمام اہل قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ پس وہ خوشی خوشی واپس مکہ لوٹے، جب انہیں واپس لوٹ کر آنے کے سفر میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تو اس وقت انہیں اصل حقیقت کا علم ہوا۔ اس کے بعد ان میں سے کچھ لوگ مکہ میں داخل ہو گئے اور کچھ نے اپنی جگہ واپس جانا پسند کیا۔ اس کے برعکس جب اہل قریش کو اس بات کا احساس ہوا کہ مسلمانوں کو حبشہ میں آرام دہ ٹھکانہ مل گیا ہے تو وہ مکہ کے مسلمانوں پر اور زیادہ تشدد کرنے لگے تاکہ نہ تو وہ اپنے دین پر عمل کر سکیں اور نہ ہی ہجرت کرنے کے قابل رہیں۔ لیکن ان کے اس رویے کو دیکھتے ہوئے جناب رسالت مآبؐ نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا کہ اپنے لیے ہجرت کا بندوبست کر لیں۔ لہٰذا اس مشکل ترین دور میں تراسی (۸۳) مرد اور اٹھارہ (۱۸) خواتین کا ایک گروہ مکہ سے حبشہ ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب اہل قریش کو اس امر کی خبر ہوئی تو وہ اور بھی آگ بگولا ہو گئے اور انہیں مزید اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ حبشہ میں اپنے قدم جمانے کے بعد اپنی طاقت میں اضافہ کر لیں گے اور پھر وہ طاقت ہمارے خلاف استعمال کریں گے۔ اس لیے انہوں نے اپنا ایک وفد ایتھوپیا (ابی سینیا) بھیجا جو عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ پر مشتمل تھا، یہ وفد اپنے ساتھ ایتھوپیا کے بادشاہ اور اس کے درباریوں کے لیے اہل قریش کی جانب سے تحائف لے کر بھی گیا۔

ایتھوپیا کا بادشاہ نجاشی یا نیگس (Negus) کہلاتا تھا اور مذہباً عیسائی تھا۔ اہل قریش کا مقصد ان مسلمانوں کو واپس لانا اور خاطر خواہ سزا دینا تھا کیونکہ وہ اپنے اصلی مذہب سے پھر گئے تھے۔ قریش کے وفد نے شاہ حبشہ تک رسائی حاصل کر لی اور اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ان کے مہاجر ساتھی کچھ بے وقوف لڑکوں کا ایک گروہ ہیں اور اپنے ہم وطنوں کے وفادار نہیں، اور اپنے آبائی مذہب سے پھر گئے ہیں اور ان سے یہ امید بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ حبشہ کے لوگوں کو بھی ان کے دین سے بگاڑ دیں، اس لیے وہ بادشاہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کو ان کے حوالے کر دے۔ لہٰذا بادشاہ نے مہاجرین کو اپنے دربار میں طلب کر لیا تاکہ ان سے اس بارے میں پوچھا جائے۔ مہاجرین نے جواب دینے کی غرض سے جناب جعفر بن ابوطالب کو اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ شاہ حبشہ نے ان سے ان کے نئے دین کے بارے میں پوچھا اور مزید یہ کہا کہ

انہوں نے مسیحی مذہب کیوں اختیار نہیں کیا اور ایک نیا مذہب کیوں ایجاد کر لیا۔ جناب جعفرؓ نے بادشاہ کے دربار میں ایک بااثر خطاب کیا جس سے درباری اور شاہ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے کہا ”اے بادشاہ! ہم جاہل لوگ تھے نا انصاف، بدکردار اور بتوں کو پوجنے والے۔ پس اللہ نے ہمارے درمیان ایک پیغمبر بھیجا، قابل بھروسہ، بہت ہی معزز اور مہربان، سچا، شائستہ اور دیانتدار امین۔ اس نے تمام خداؤں کی نفی کی ہے اور ہمیں صرف ایک خدا کی تعلیم دی ہے جو اللہ ہے۔ اس نے ہمیں اخلاق اور پرہیزگاری سکھائی ہے۔ ہماری قوم کے لوگ ان کی تعلیمات کو پسند نہیں کرتے، اس لیے ان کے اور ان کے پیروکاروں کے دشمن بن گئے ہیں۔ ان کا ظالمانہ رویہ ہمیں یہاں آپ کی حفاظت میں لے آیا ہے“۔ بادشاہ نے خواہش ظاہر کی کہ اسے کوئی الہامی پیغام سنایا جائے۔ اس پر جعفرؓ نے سورہ مریم (۱۹) کی آیات (۲۷-۳۴) کی تلاوت کی۔

ان آیات مبارکہ کے مطابق ”پھر وہ (مریم) لائیں اُسے (بچے کو یعنی عیسیٰ کو) اپنی قوم کے پاس۔ تو انہوں نے کہا: اے مریم! بے شک تم ایک حیران کن شے لائی ہو (ہمارے سامنے)۔ اے ہارون کی بہن! تمہارا باپ تو ایسا برا نہ تھا کہ بدکار ہو اور نہ ہی تمہاری ماں ایسی تھی۔ پھر انہوں نے (مریم نے) بچے کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے کہا ہم کس طرح سے ایک بچے سے بات کر سکتے ہیں جو ابھی گود میں ہی ہے؟ اس پر اس بچے نے خود ہی کہہ دیا کہ: ”میں تو اللہ کا غلام (بندہ) ہوں، اس نے (اللہ) مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنا دیا اور مجھے برکت والا بنایا، میں جہاں کہیں بھی ہوں اور مجھے حکم دیا صلوٰۃ (ادا کرنے کا) اور زکوٰۃ (ادا کرنے) کا جب تک میں رہوں زندہ، اور مجھے میری والدہ کا خدمت گزار بنایا اور اس نے مجھے سرکش بدبخت نہیں بنایا اور مجھ پر سلام ہے (رحمت اللہ کی) جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز میں وفات پاؤں گا اور جس دن (روز قیامت) زندہ کیا جاؤں گا۔ یہ ہے عیسیٰؑ بن مریم اور یہ قول ہے بالکل سچا جس پر یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں“۔

جناب نجاشیؓ نے یہ الفاظ قرآنی نہایت انہماک اور ادب سے سنے، یہاں تک کہ اس حقیقت کو جان کر اور کلام الٰہی سننے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ادب اور محبت میں عاجزی اور انکساری کے طور پر اُن کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی اور ان کے درباری بھی ویسے ہی عاجزی کے ساتھ آنسو بہانے لگے کیونکہ وہ ایمان والے تھے اور کلام الٰہی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے

بعد نجاشیؓ نے کہا کہ یہ وہ آیات ہیں جس کا منبع وہی ہے جہاں سے جناب عیسیٰؑ کے پاس الہامی الفاظ آئے تھے۔ پھر شاہ نے قریش کے وفد کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ان کے تحائف انہیں واپس لٹا دیے۔ وفد کے افراد نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور پھر دوسرے روز بادشاہ کے پاس دوبارہ حاضر ہوئے اور کہا ”اے بادشاہ! ان لوگوں نے مسیحؑ کے متعلق بہت بڑا جھوٹ بولا ہے“۔ بادشاہ نے دوبارہ مہاجرین کے گروہ کو بلوایا اور حضرت مسیحؑ کے متعلق وضاحت چاہی۔ پھر جناب جعفرؓ آگے بڑھے اور فرمایا ”ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو ہمارے پیغمبر فرماتے ہیں اور وہ یہ کہ مسیحؑ اللہ کے غلام (بندے) اور اس کے پیغمبر تھے اور اللہ کی روح اور اللہ کا فرمان (کہ ہو جا) جو اللہ نے عطا فرمایا کنواری مریم کو“۔ پھر بادشاہ نے جعفرؓ کے ان اقوال کی توثیق فرمائی اور ان کے لیے اعلان فرمایا ”جاؤ اپنا راستہ لو! تم میری سلطنت میں محفوظ ہو“۔

جناب رسالت مآبؐ کے دل میں حضرت نجاشیؓ کے لیے بہت عزت اور محبت تھی جیسا کہ دو خاص موقعوں سے ظاہر ہوا۔ اور اسی طرح سے جناب نجاشیؓ کے دل میں جناب رسالت مآبؐ کی تکریم و عزت ویسے ہی تھی اور انہوں نے آپؐ کی نبوت کو تسلیم بھی کیا۔ یہاں پر ان دو موقعوں کو مختصر الفاظ میں بیان کیا جانا ضروری سمجھا گیا ہے۔ ایک تو وہ موقع جب جناب رسالت مآبؐ نے جناب نجاشیؓ کو پیغام بھیجا کہ وہ ان کا عقد سیدہ اُم حبیبہؓ سے کرا دیں جبکہ وہ حبشہ میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ تو جناب نجاشیؓ نے یہ مبارک نکاح کا اہتمام اپنی جیب خاص سے کیا اور جناب رسالت مآبؐ کی طرف سے چار صد دینار حق مہر ادا کیا اور دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ دوسرا موقع وہ ہے کہ جب نجاشیؓ کی وفات ہو جاتی ہے تو جناب رسالت مآبؐ مدینہ شریف میں اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں کہ تمہارا بھائی نجاشیؓ انتقال کر گیا ہے آؤ اس کے لیے نماز پڑھیں۔ سو آپؐ نے اس طرح سے صلوٰۃ جنازہ غائبانہ پڑھ کر امت کے لیے ایک سنت بھی قائم کر دی۔ بے شک حضرت نجاشیؓ ایک سچا عیسائی اور سچا مسلمان تھا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

(۴۶) جناب عمرؓ کا رسالت مآبؐ کی رفاقت میں آنا

عمر بن خطابؓ کو یہ عزت عطا ہوئی کہ رسالت مآبؐ نے ان کے ایمان لانے کی خواہش اور درخواست اللہ تعالیٰ کے حضور کی۔ آپؐ نے اس طرح دعا فرمائی ”اے اللہ! اسلام کو طاقت عطا

فرما خاص طور پر دو میں سے ایک کے ذریعے: عمر بن خطاب یا عمر بن ہشام"۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ خاص کی دعا کیسے رد فرماتے۔ اب معاملہ یہ ہوا کہ ان دو میں سے ایک عمر جو کہ ہشام کا بیٹا تھا اور ابوجہل کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اس کی بدبختی نے اسے گھیر لیا اور جناب رسالت مآبؐ سے گستاخیوں کا مرتکب ہو کر اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہو گیا۔ اب ایک ہی عمر بچے جو عمر بن خطاب تھے خوش نصیب و خوش بخت جن کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا۔ پھر آپ کو جناب رسالت مآبؐ کا نائب دوئم (یعنی ابوبکر صدیقؓ کے بعد) بننے کا شرف حاصل ہوا اور آپ کو کفر اور اسلام میں تفریق کرنے والے کا مرتبہ ملا اور جناب رسول اللہؐ سے فاروق کا لقب حاصل ہوا۔ آپ قبل قریش کے معززین میں سے تھے چونکہ بڑے بہادر نوجوان جن کی سب عزت کرتے۔ ان کا قریش کے ساتھ ہونا یا مسلمانوں کے ساتھ ہونا ایک بہت بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

ان کے قلب میں دانش و حکمت کی ایک روشنی تھی حالانکہ وہ اپنے اجداد کے دین پر ہی اٹک گئے تھے۔ ایک مرتبہ طواف کعبہ کے دوران جناب رسالت مآبؐ کی تلاوت کردہ سورۃ الحاقہ (۶۹) کی آواز ان کے کان تک پہنچی اور جب جناب رسالت مآبؐ اس سورۃ کی آیات ۴۰-۴۳ تک پہنچے جس میں فرمایا گیا کہ "بیشک یہ الفاظ عزت والے پیغمبر کے ہیں (جو اللہ کی طرف سے آئے ہیں) یہ الفاظ کسی شاعر کے نہیں، صرف بات یہ ہے کہ تم یقین کرو! اور نہ ہی یہ الفاظ کسی پیش گوئی کرنے والے یا قسمت کا حال بتانے والے کے ہیں بات اتنی سی ہے کہ تم یاد رکھو! یہ تو الہامی الفاظ ہیں اس مالک کے جو کہ سارے جہانوں کا مالک ہے"۔ یہ کہا گیا ہے کہ یہی وہ آیات کریمہ ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ جناب عمرؓ کے قلب کو گرمایا لیکن پھر بھی ان کے قلب پر جہالت کے دور کی گمراہی مکمل طور پر چھوٹ نہ سکی بلکہ جہالت اور گمراہی کے ساتھ ساتھ ایک اور گمراہی جناب رسول اللہؐ کی دشمنی کی صورت میں ان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

دوسری قرآنی آیت جس نے عمرؓ کے قلب کو روشنی کی جانب مائل کیا وہ سورۃ طٰہٰ (۲۰) کی آیت (۱۴) ہے جس میں کہا گیا "بیشک میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو اور صلوٰۃ (نماز) ادا کرو میری یاد قائم رکھنے کی خاطر"۔

جب جناب عمرؓ نے سورۃ طٰہٰ کی آیت (۱-۱۴) سننے کے بعد یعنی جب آیت (۱۴) تک پہنچے تو آپ کی زبان سے حیرانگی کے ساتھ نکلا "کتنی بہترین ہے یہ اور کتنی خوش اسلوب"۔ اس کے

بعد ان میں جناب رسالت مآبؐ سے ملنے کی خواہش ابھری تاکہ ان کی خدمت اقدس میں اپنے آپ کو پیش کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس کلام نے عمر بن خطابؓ کے قلب و ذہن کو منور کر کے بالکل تبدیل کر دیا اور پھر وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نہایت تابعدار غلام کی حیثیت اختیار کر گئے اور با کمال جانثار بن گئے۔

جناب عمرؓ میں یہ انقلابی تبدیلی آپ کی ہمشیرہ فاطمہ اور ان کے شوہر سعید بن زید کے گھر وقوع پذیر ہوئی۔ جہاں آپ انتہائی غصے کے عالم میں ان کی بازپرس کرنے کے لیے ان کے گھر داخل ہوئے جب انہیں اطلاع ملی کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ قبل ازیں وہ ننگی تلوار تھامے ہوئے جناب رسول اللہؐ کے پاس جا رہے تھے، ایک بہت ہی بھیانک ارادہ لیے ہوئے۔ لیکن خدائے ایزدی کا کیا کہیے، انسانوں کے ارادے پست ہو کر بکھر جاتے ہیں اور اللہ کی رضا ہوتی ہے کہ دل اس جانب جھک جاتے ہیں اور رب کائنات کی مرضی یہی تھی کہ عمر بن خطابؓ اس کی تابعداری میں آ کر اس کی اور اس کے رسولؐ کی قربت اور محبت اختیار کر لے اور جس شیطان نے انہیں بہکا رکھا تھا، اس کے وہ دشمن بن جائیں اور وہ عجز و انکسار، تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کر کے اسلام کے خادم بن جائیں۔

لہٰذا جب انہوں نے اپنے آپ کو جناب رسالت مآبؐ کی خدمت اقدس میں پیش کیا تو جناب رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے خوش ہو کر اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ آپ کا شمار اسلام کے مایہ ناز سپوتوں میں اور رسول اللہؐ کے سچے جانثاروں میں ہوتا ہے۔

جب وہ رسول اللہؐ کے بعد مملکت اسلامیہ کے سربراہ مقرر ہوئے جبکہ وہ مملکت اس وقت کی واحد سپر پاور تھی جس میں اس وقت بازنطینی رومن مملکت اور سلطنت فارس اور مصر وغیرہ شامل تھے، اتنی بڑی سلطنت کے سربراہ کی حیثیت سے آپ کا بچھونا صرف ایک گدے پر مشتمل تھا جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے اور آپ کی خوراک صرف پانچ لقموں پر مشتمل ہوتی۔ اس حیثیت میں بھی وہ اتنے عاجز اور پُر انکسار تھے کہ مدینہ کی بوڑھی عورت بھی انہیں ٹوک سکتی تھی اور اس پر وہ ناراض نہیں ہوتے، بلکہ فرماتے کہ اگر عمر کوئی غلط کام کرنے کا ارادہ کرے تو ایک بوڑھی اور نادان خاتون اسے راہ راست پر لانے کے لیے کافی ہے۔ مغربی تاریخ دان انہیں دنیا کا بہترین منتظم مانتے ہیں۔

جب آپ نے اسلام قبول کیا تو مسلمانوں نے پہلی مرتبہ کھلے عام کعبہ کے سامنے نماز ادا کی ان کے ہوتے ہوئے کسی کی جرأت نہ ہوتی کہ وہ کچھ کہہ سکے۔ اسلام اختیار کرنے کے بعد آپ نے سرداران قریش کو کہہ دیا کہ آئندہ سے اگر انہیں جناب محمدؐ یا اسلام کے بارے میں کچھ دریافت کرنا ہو تو ان سے رجوع کریں۔ کفار اور شیطان جناب عمرؓ سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے (اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی رحمتیں جاری وساری رکھے)۔

(۴۷) اہل قریش کی بڑھتی ہوئی مایوسی

اہل مکہ کا مسلسل اسلام کی طرف مائل ہونا اور اس کے علاوہ دو معروف اور طاقتور شخصیتوں یعنی حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا دائرہ اسلام میں داخل ہونا، اہل قریش کے لیے باعث کرب و اضطراب ثابت ہوا اور ان کی بے چینی اور مایوسی میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ چونکہ اہل قریش جناب رسالت مآبؐ کو ان کے ارادے سے روکنے میں ناکام ہو گئے تھے لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں قبیلہ قریش سے الگ تھلگ کر دیا جائے، اس طرح سے وہ مکہ کے دیگر قبائل سے بھی الگ ہو جائیں گے اور ان کے لیے آسان ہو جائے گا کہ وہ ایک تنہا فرد کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں، کیونکہ عرب کا یہی دستور تھا۔ اس منصوبہ بندی کے بعد وہ ابوطالب کے پاس گئے اور مطالبہ کیا کہ وہ جناب رسالت مآبؐ کو ہاشمی قبیلے سے خارج کر دیں۔ ابوطالب نے ان سے کچھ وقت مانگا تاکہ وہ اپنے بھتیجے کو راضی کر لیں کہ وہ اپنے مشن سے ہٹ جائے۔ جب ابو طالب نے اس معاملہ پر جناب رسالت مآبؐ سے گفتگو کی تو آپؐ نے جواب دیا کہ وہ تو صرف اللہ پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں اور اپنے مشن کے علاوہ کسی اور چیز کو قبول نہیں کر سکتے۔ اس جواب کے سننے کے بعد ابوطالب نے قریش کو کہہ دیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو اپنے قبیلے سے نہیں نکالیں گے، لیکن ہاں! وہ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے بھتیجے کا لایا ہوا دین قبول نہیں کریں گے۔

قریش نے مزید فیصلہ کرتے ہوئے اپنا ایک نہایت نرم گو شخص عتبہ بن ربیعہ جناب رسالت مآبؐ کے پاس بھیجا جس نے آپؐ کو رشوت کے طور پر دولت، عورت اور اعزازات کی پیشکش کی، آپ کی دعوت کے عوض۔ اور اس نے جناب رسالت مآبؐ سے یہ بھی کہا کہ ان کی وجہ سے اہل مکہ بہت بڑی مصیبت سے دوچار ہیں کیونکہ آپ نے ہمارے بزرگوں اور خداؤں

کی بے عزتی کی ہے یہ پورا واقعہ اس سے پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔

جناب رسالت مآبؐ کا جواب نہایت سادہ و آسان تھا کہ وہ تو اپنی مرضی سے نہ کچھ کہتے ہیں نہ کرتے ہیں، وہ تو بس تابعدار ہیں اپنے رب کے، جو حکم انہیں ملتا ہے وہ اپنی قوم کو پہنچا دیتے ہیں۔ آپؐ نے عتبہ سے کہا ''اے ابو ولید! تم نے میرا جواب سن لیا ہے اب تم جو چاہو سو کرو''۔ واپس جا کر عتبہ نے اپنی قوم کو آگاہ کیا کہ واقعی اس نے جو کچھ سنا ان الفاظ میں ایک عظیم پیغام سنا، لیکن قریش نے ان کی بات ان سنی کر دی۔

اس واقعہ کے بعد ابوطالب نے اپنے قبائل بنو ہاشم اور بنو مطلب سے درخواست کی کہ وہ اپنے بھتیجے کی حفاظت کریں۔ ابولہب کے علاوہ ہر ایک نے تائید کی جبکہ وہ جناب رسالت مآبؐ کا سب سے بڑا دشمن بن کے قریش کے ساتھ مل گیا۔ آخر کار قریش کی مایوسی نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ تمام ہاشمی قبیلے سے قطع تعلق کر لیں تاکہ کسی نہ کسی طرح سے وہ جناب رسالت مآبؐ کو ان کے مشن سے روک سکیں۔

(۴۸) اہل قریش کا ہاشمیوں سے قطع تعلق

جب قریش جناب رسول اللہؐ کو ان کے ارادے سے متزلزل کرنے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ان سے اور ان کو پناہ دینے والے ہاشمیوں سے قطع تعلق کر لیں۔ اس معاملہ پر متفق ہونے کے لیے سرداران قریش نے ایک تحریری معاہدہ کیا، یہ معاہدہ ہاشمیوں کے خلاف تھا جسے ۶۱۶ عیسوی کے ماہ محرم الحرام کے پہلے روز تحریر کر کے کعبہ کی دیوار پر چسپاں کر دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق اس معاہدے کے تحریر کرنے والے شخص کے ہاتھ فالج کی وجہ سے معذور ہو گئے تھے۔ معاہدہ میں درج ذیل مندرجات تھے۔

۱۔ وہ لوگ ہاشمیوں کے ساتھ کوئی سماجی تعلق نہیں رکھیں گے، نہ ان سے ملیں گے نہ بات کریں گے۔

۲۔ وہ ہاشمیوں سے شادیاں نہیں کریں گے۔

۳۔ وہ ہاشمیوں سے کسی قسم کا لین دین، تجارت وغیرہ نہیں کریں گے۔

۴۔ یہ معاہدہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک محمدؐ کو ان کے قبضے میں نہیں دے دیا جاتا۔

ابو طالب نے اس صورتحال کا مکمل طور پر جائزہ لے کر فیصلہ کیا اور وہ خود اپنے گھر والوں کے ساتھ اور جناب رسول اللہؐ اپنے گھر والوں کے ساتھ مکہ سے نکل کر شہر کے باہر چلے گئے۔ وہ جگہ دو چھوٹی سی وادیوں کی ڈھلوان پر دو پہاڑیوں کے درمیان تھی۔ ایسی جگہوں کو مکہ میں شعب کہا جاتا تھا، چونکہ وہ جگہ ابو طالب کی ملک تھی لہٰذا شعب ابو طالب کے نام سے جانی جاتی تھی۔ بہر حال ابو طالب کا یہ فعل نہ تو اصولی طور پر ان کے بھتیجے کی محبت میں تھا اور نہ ہی اللہ کی محبت میں۔ یہ فعل ان کے سردار ہونے کی حیثیت سے اپنے بھتیجے کو بچانے کی غرض سے ان کی اپنی عزت نفس کی خاطر تھا۔ شعب کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ مکہ کے باہر ہر قبیلے کی اپنی ایک جگہ ہوتی تھی اور یہ جگہ کسی ایسے شخص کو استعمال کے لیے دی جاتی جو اس شعب کے مالک کے قبیلے کی پناہ میں آتا۔ یہ جگہ پناہ گاہ کے طور پر تو ٹھیک تھی لیکن بہر حال تکلیف دہ تھی۔

شعب کے قیام کا زمانہ جو تقریباً تین برس پر محیط تھا نہایت ہی تکلیف دہ اور مشکل ترین دور تھا۔ قریش کے قطع تعلق کی وجہ سے اہل شعب کو اکثر کھانے پینے سے محروم رہنا پڑتا، یہاں تک کہ کبھی کبھی ان کو پتوں پر گزارہ کرنا پڑتا اور کبھی کبھی سوکھی ہوئی کھالوں کو ابال کر ان کا پانی پی کر گزارہ کرنا پڑتا۔ ان الفاظ کو قلمبند کرنا اور پڑھنا تو آسان ہیں لیکن ذرا دل کی گہرائیوں سے سوچیں کہ جناب رسالت مآبؐ اور آپؐ کے گھر والوں نے یہ تین سال کتنی مشکل اور مشقت میں گزارے ہوں گے اور یقیناً ابو طالب نے بھی اپنے بھتیجے کی خاطر یہ تکلیف سہی۔ لیکن جناب رسالت مآبؐ کی یہ مشقت ان کی بندگی کا ایک حصہ تھی، انہوں نے جو کچھ کیا اپنے مالک کی خوشنودی کی خاطر کیا اور آپؐ کے گھر والوں نے بھی اللہ ہی کی خاطر آپؐ کا ساتھ دیا۔ آپ حضرات حرمت کے مہینوں یعنی رجب، شعبان، رمضان اور محرم میں اپنے لیے خوراک وغیرہ کا بندوبست کر لیتے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان تمام تکالیف کے باوجود جناب رسول اللہؐ ذرہ برابر بھی متزلزل نہ ہوئے، وہ اپنے مشن اور ارادے میں چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ آپ نے کعبہ جانا بھی ترک نہیں کیا اور جب کبھی بھی موقع ملتا تو آپ اللہ کا پیغام دوسروں تک ضرور پہنچاتے، خاص طور پر ان لوگوں کو جو کعبہ کے طواف کی خاطر بیرون مکہ سے آتے۔

آخر کار یہ دور آزمائش جناب رسول اللہؐ اور آپ کے گھر والوں کے لیے ختم ہونے کو آیا اور

اللہ تعالیٰ نے پانچ افراد کے ایک گروہ کے دل جناب رسالت مآبؐ کے لیے نرم کر دیے، جنہوں نے فیصلہ کیا کہ ہاشمیوں سے قطع تعلق کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن اسی موقع پر ابو طالب نے بھی اہل قریش کے سامنے اعلان کر دیا کہ اس کے بھتیجے کو الہام ہوا ہے کہ قطع تعلق کی دستاویز کو دیمک نے کھا لیا ہے۔ ابو طالب نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ دعویٰ درست نہ ہوا تو وہ محمدؐ کو چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد جب دستاویز کو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ سوائے "بسم اللہ" کے الفاظ کے دستاویز کے تمام مضمون کو دیمک نے کھا لیا ہے۔ لہٰذا جب دستاویز ہی ختم ہو گئی تو معاہدہ بھی خود بخود ختم ہو گیا، اس طرح شعب میں پناہ لینے والے افراد واپس اپنے گھروں کو چلے گئے۔

یہ کوئی معمولی نشانی نہ تھی کہ دشمن کی لکھی ہوئی جناب رسول اللہؐ کے خلاف دستاویز کو دیمک نے کھا لیا اور ظاہر ہے کہ یہ فعل صرف اللہ کے حکم سے ہی ہو سکتا تھا۔ اس سے زیادہ کیا نشانی ہوتی رسول اللہؐ کے حق میں کہ وہ سچے ہیں اور اللہ کی طرف سے حق لے کر آئے ہیں۔ لیکن اہل قریش کی بدبختی کہ ان کی عقل پر پردے اور دل پر قفل کہ اب بھی وہ حق کے قائل نہ ہوئے اور ہنوز جہالت اور بے وقوفی میں گھرے رہے۔ اور اب بھی ان تدابیر میں لگے رہے کہ کسی طرح سے اپنے خداؤں کو بچا سکیں، جناب رسول اللہؐ کی نفی سے۔ لہٰذا اہل قریش نے اپنے پچیس (۲۵) معززین کا ایک وفد ابو طالب کے پاس بھیجا جو ایک تجویز لے کر گیا، وہ یہ کہ وہ لوگ تیرے دین کے معاملہ میں خاموش رہیں گے اور اس کے سلسلے میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کریں گے۔ ان کی شرط صرف یہ ہوگی کہ محمدؐ بھی ان کے خداؤں کے بارے میں ویسے ہی خاموشی اختیار کر لیں۔ ابو طالب نے یہ تجویز تائید کے ساتھ جناب رسالت مآبؐ کو پیش کی۔ انہوں نے صرف اس تجویز کو رد ہی نہیں کیا بلکہ انہیں اللہ کے پیغام کی تعمیل کی تلقین کی۔ ان معززین نے جن میں بے شک عقل کی کمی تھی، رسول اللہؐ کی تلقین پر احمقانہ طور پر تالیاں بجائیں، اور وہاں سے چلے گئے، یہ کہتے ہوئے کہ "یہ شخص کبھی بھی کسی فیصلہ کن بات پر نہیں آئے گا۔ پس اللہ ہی اس معاملہ کو طے کرے، ہمیں اپنے نظریے پر قائم رہنا چاہیے"۔ کفار کے ان خیالات کے اظہار کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورہ ص (۳۸) کی پہلی سات (۷) آیات نازل فرمائیں، جس میں کہا گیا کہ: "قسم ہے قرآن کی جو نصیحت سے پر ہے۔ نہیں! بلکہ وہ جو انکار کرتے ہیں اپنے تکبر اور مخالفت کی وجہ سے۔ ان سے پہلے بہت سی نسلوں کو ہم (اللہ) ہلاک کر چکے ہیں (ان کے کفر کی

وجہ سے) انہوں نے اس وقت بڑی ہائے پکار کی لیکن وہ وقت (یعنی عذاب کا وقت) معافی کا نہ تھا، کہ انکیں بچاتا۔ اور ان کفار نے اس بات پر تعجب کیا کہ ایک ڈرانے والا (پیغمبر) انہی میں سے ان کے پاس آگیا۔ اور ان کے سردار یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ یہ ایک جادوگر ہے، جھوٹا۔ کیا (یہ سچا ہو سکتا ہے کہ) اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنا ڈالا۔ واقعی اس نے عجیب بات کی۔ اور ان (کفار) کے سربراہاں وہاں سے نکلے دیگر لوگوں کو بھی جانے کا کہتے ہوئے کہ اپنے معبودوں پر قائم رہو۔ یہ کوئی مطلب کی بات نہیں (یعنی پیغمبری) ہم نے تو ایسی کوئی بات نہیں سنی اپنے مذہب میں۔ یہ کوئی بات نہیں سوائے من گھڑت کے"۔

(۴۹) ہاشمیوں کے سردار کا رخت سفر آخر

جناب رسالت مآبؐ کے ساتھیوں میں سے بدقسمت ساتھی ابو طالب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ ان کی وفات سیدہ خدیجہؓ کی وفات سے چند روز قبل ہوئی۔ یہ واقعہ ۶۲۰ عیسوی اور نبوت کے دسویں سال پیش آیا۔ جناب رسالت مآبؐ اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنے چچا ابو طالب کو سمجھاتے رہے کہ وہ بت پرستی چھوڑ دیں، اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہو جائیں اور انکیں اللہ کا رسول مان لیں لیکن وہ اپنے آبائی مذہب کی جہالت پر قائم رہے۔ بے شک جناب رسولؐ اللہ کو اس بات کا رنج تھا اس بارے میں چند آیات قابل غور ہیں۔

الف) سورۃ القصص (۲۸) آیت (۵۶) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: "بیشک تم (اے محمدؐ)
ہدایت نہیں دے سکتے جسے تم چاہتے ہو۔ بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہدایت عطا فرماتا ہے
اور ہدایت پانے والوں کا علم (بھی) اسی کو ہے"۔

یعنی کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان مبارک یہ ہے کہ جناب پیغمبر علیہ السلام کا فرض تو محض اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانا ہے اور بذات خود اللہ تعالیٰ کے احکامات پر پابندی کر کے دوسروں کو دکھلانا ہے یہ بات جناب رسولؐ اللہ کے اختیار میں نہیں کہ وہ ہدایت وحکمت کافروں یا نافرمانوں کے قلوب میں داخل کر دیں۔ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک کا ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت عطا فرمائے۔

ب) سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۲۷۲) کے اول حصے میں کہا گیا ہے کہ "یہ تمہارے (محمدؐ) ذمہ نہیں لگایا گیا کہ تم ان (کافروں) کو ہدایت بہم پہنچاؤ، یہ تو صرف اللہ ہی کا کام ہے کہ

جسے چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے"۔

ج) سورۃ یوسف (۱۲) کی آیت (۱۰۳) میں فرمایا گیا ہے کہ "اور زیادہ تر انسان ایمان نہیں لائیں گے، بے شک آپ کتنی ہی خواہش کا اظہار کریں"۔

صحیح بخاری و مسلم دونوں میں منقول ہے کہ سورۃ القصص (۲۸) کی آیت (۵۶) ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ المسیب کی روایت کے مطابق اس آیت کے سلسلے میں ہے کہا گیا ہے کہ جب ابو طالب بستر مرگ پر تھا اور ابو جہل اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو جناب رسالت مآبؐ اس کے پاس گئے اور کہا "اے میرے چچا! کہو کہ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اس کی پرستش کی جائے، سوائے اللہ کے بصرف ایک جملہ جس کی بنا پر میں تمہاری پیروی کروں گا اللہ تعالیٰ کے حضور"۔ اس پر ابو جہل اور عبداللہ بن امیہ نے کہا "اے ابو طالب! کیا تم عبدالمطلب کا مذہب چھوڑ دو گے؟" اور وہ دونوں اس بات پر اصرار کرتے رہے۔ پس آخری الفاظ جو اس (ابو طالب) نے (مرنے سے پہلے) انکیں کہے وہ یہ تھے کہ "میں عبدالمطلب کے مذہب پر ہی ہوں"۔ اس پر جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے تمہارے لیے بخشش مانگتا رہوں گا، جب تک کہ مجھے اس بات سے منع نہیں کیا جائیگا"۔ اس پر سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۱۳) کا نزول ہوا۔ جس میں کہا گیا کہ "یہ پیغمبر کے لیے (صحیح) نہیں ہے اور دیگر ایمان والوں کے لیے بھی، کہ وہ مشرکین کے لیے اللہ سے معافی طلب کریں، بے شک وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ جب ان کے متعلق یہ واضح ہو جائے کہ وہ دوزخ کے مستحق ہیں"۔ یہاں پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بالکل اسی طرح کی ہدایت جناب ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی موصول ہوئی تھی جب انہوں نے اپنے والد کے لیے بخشش کی درخواست کی تھی اور یہ ہدایت اگلی آیت یعنی سورۃ توبہ کی آیت (۱۱۴) میں نقل کی گئی ہے۔

بہرحال ابو طالب کے بعد اس کا بھائی ابو لہب ہاشمیوں کا سردار بن گیا جو کہ جناب رسالت مآبؐ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ سردار بننے کے بعد اس نے حسب دستور اعلان کیا کہ وہ محمدؐ کی حفاظت اور حمایت کرنے کا ذمہ دار ہے لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ ان کے مذہب کی مخالفت کرتا رہے گا۔ اس لیے اس نے اس بات کی حمایت کی کہ جناب رسولؐ اللہ اپنے گھر والوں سمیت شعب ابو طالب کو چھوڑ کر اپنے گھر واپس چلے جائیں۔ وہ چونکہ جناب رسالت مآبؐ کے

دین کے خلاف تھا چنانچہ اس نے تمام ہاشمی خاندان کو اکٹھا کیا ایک خاص سازش کے تحت اور جناب رسولؐ اللہ سے ایک سوال کیا۔ وہ یہ کہ ان کا اپنے دادا عبدالمطلب اور چچا ابوطالب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ان کے آخرت کے ٹھکانے کے بارے میں کہ ان کے لیے جنت ہوگی یا جہنم۔

ابولہب کے اس سوال کے جواب میں جناب رسولؐ اللہ نے سورۃ توبہ کی آیت (۱۱۳) تلاوت فرمائی جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس آیت مبارکہ کا جواب کے طور پر رسولؐ اللہ کا فرمانا تمام ہاشمیوں کے لیے حیرت انگیز تھا، کیونکہ ان کے ہاں یہ رواج نہیں تھا کہ اپنے اجداد کے متعلق کچھ خلاف کہیں یا سنیں۔ سو جناب رسولؐ اللہ کے اس جواب نے کفار کے گرم لوہے پر ایک ضرب لگائی۔ ابولہب نے پھر وہاں موجود تمام سرداروں سے پوچھا کہ ان کا اس بارے میں کیا خیال ہے کیا وہ صحیح ہوگا کہ محمدؐ کو اپنے قبیلے سے نکالتے ہیں۔ ہر ایک نے اس کی تائید کی، پس ابولہب نے جناب محمدؐ کو اپنے قبیلے سے نکالنے کا اعلان کر دیا۔ اب جناب سرور عالمؐ بالکل تنہا رہ گئے اور ان کا اپنے مالک کے سوا کسی اور جگہ کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

(۵۰) جناب رسولؐ اللہ کے عزیز ترین ساتھی کا جدا ہونا

ابوطالب کی وفات کے چند روز بعد جناب رسولؐ اللہ کی عزیز ترین رفیقہ حیات ام المومنین سیدہ خدیجہؓ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ آپؐ کی رفاقت سیدہ کے ساتھ پچیس برس تک رہی۔ آپ مکہ کی امیر ترین خاتون تھیں لیکن وقت وفات ان کے لیے کفن دستیاب نہ تھا بلکہ وہ اپنی ہی چادر میں دفنائی گئیں۔ انہوں نے اپنی ساری دولت فی سبیل اللہ خرچ کر دی تھی، انہیں یہ اعزاز حاصل تھا کہ آپ نے سب سے پہلے اللہ کے نبی کی نبوت کو قبول کیا اور آپؐ کی مدد کی۔ ایک مرتبہ جناب رسالت مآبؐ آپ کی تعریف فرماتے ہوئے کہہ رہے تھے جس کا تذکرہ امام احمدؒ نے کیا ہے، کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا: "انہوں نے مجھ پر یقین کیا اور ایمان لائیں جب کسی اور نے ایسا نہیں کیا، انہوں نے میری مدد کی اور مجھے اپنی شخصیت سے آرام پہنچایا اور اپنی دولت سے بھی، اس وقت جب کوئی اور نہ تھا میری طرف مدد کے لیے رجوع کرنے والا۔ میری تمام اولاد انہیں کے بطن سے ہوئی (سوائے ایک کے جو کنیز ماریہ کے بطن سے ہوئے)، بے شک وہ اپنے وقت کی بہترین اور اعلیٰ ترین خاتون تھیں۔ (اللہ ان سے راضی ہو)

(۵۱) رسول اکرمؐ کا سیدہ سودہؓ سے نکاح

امام احمدؒ نے ابن عباسؓ سے ایک روایت منقول کی ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے سیدہ خدیجہؓ کی وفات کے بعد سیدہ سودہؓ سے نکاح کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ وہ ایک عمر رسیدہ سکران بن امرہ کی بیوہ تھیں، اور ان کے پانچ یا چھ بچے تھے، انہوں نے ابتداء میں ہجرت کی تھی اور اسلام میں اولین کا درجہ رکھتی تھیں۔ جب انہیں جناب رسالت مآبؐ کا پیغام موصول ہوا تو انہوں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ جواب دیا، کہ انہیں اپنے بچوں کے متعلق خوف ہے جو کہ رسولؐ اللہ کو پریشان کریں گے۔ علاوہ ازیں انہیں کوئی اور معاملہ درپیش نہیں کہ وہ انکار کریں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ جناب رسولؐ اللہ کے ساتھ ان کی زوجیت میں زندگی گزارنا کتنے اعزاز کی بات ہے۔ ان کے جواب میں جناب رسولؐ اللہ نے جواب بھیجا کہ اللہ کی رحمت ہو ان پر قریش کی بہترین خواتین وہ ہیں جو اپنے بچوں پر مہربان ہوتی ہیں اور اپنے خاوند کی ملک کی امین ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جناب ابوبکر صدیقؓ نے خطبہ نکاح پڑھا اور یہ شادی ۶۲۰ عیسوی میں ہوگئی۔

(۵۲) رسولؐ اللہ کا سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے نکاح

امام بخاریؒ نے قلمبند کیا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ سیدہ عائشہؓ کو انہیں خواب میں دکھلایا گیا اور پھر فرشتے نے کہا "یہ تمہاری زوجہ ہے دونوں جہانوں میں" اور یہ معاملہ مسلسل تین رات تک پیش آیا۔ اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے خولہ بنت حکیم زوجہ عثمان بن مظعون کے ذریعے پیغام بھجوایا۔ جب جناب ابوبکرؓ سے اس بارے میں کہا گیا تو انہوں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا "کیا یہ ممکن ہے؟ کیونکہ وہ تو پیغمبرؐ کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں"۔ جناب رسولؐ اللہ کو یہ جواب بتلایا گیا تو آپؐ نے فرمایا "ہاں وہ میرا بھائی ہے، مذہب میں"۔ جناب ابوبکرؓ نے پھر جناب رسالت مآبؐ کو بلوایا اور نکاح کر دیا لیکن سیدہ عائشہؓ اپنے والد کے گھر ہی مقیم رہیں۔ کیونکہ ابھی وہ سن بلوغت تک نہیں پہنچی تھیں، وہ اپنے شوہر کے گھر ہجرت مدینہ کے دوسرے سال گئیں۔

سیدہ عائشہؓ ہی صرف جناب رسولؐ اللہ کی کنواری زوجہ تھیں اور ان کے بارے میں جناب رسالت مآبؐ نے سیدہ خدیجہؓ کے بعد اعلیٰ ترین الفاظ استعمال کیے۔ جناب رسولؐ اللہ کے وصال

کے بعد انہوں نے اپنی زندگی ایک عالم اور استاد کی حیثیت سے گزاری۔ مسلمان علماء نے آپ سے بہت کچھ سیکھا۔ آپ کو سنت رسول اللہؐ کی سب سے زیادہ تحقیق و تدوین کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

سیدہ کی عمر میں اختلاف اور منطقی تجزیہ

جناب رسالت مآبؐ سے نکاح کے وقت جناب سیدہؓ کی عمر مختلف تاریخ دانوں نے مختلف لکھی ہے، کسی نے چھ برس، کسی نے سات برس۔ آج بھی یہودی و نصاریٰ جب کسی مسلمان کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تمہارے نبیؐ نے چھ برس کی بچی سے شادی کی تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا اور وہ مارے شرمندگی کے منہ جھکا لیتے ہیں ایسے ہی ایک شخص کی مصنف سے بذات خود گفتگو ہو چکی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کو غلاف میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ انہیں اپنے اصل مسیحا کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں۔ آپ کو ایک فیصد لوگ بھی مسلم امہ میں ایسے نہیں ملیں گے جنہوں نے رسالت مآبؐ کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہو۔ حالانکہ دین اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم جناب رسول اللہؐ کی حیات مبارک کا مطالعہ کریں اور پھر ان واقعات اور حالات سے متعلق نتائج اخذ کریں۔

لہٰذا یہاں مختصر طور پر بتا دینا ضروری ہے کہ جناب سیدہؓ کی عمر مبارک شادی کے وقت کتنی تھی۔ ایک بات اور بتا دینا ضروری ہے کہ عیسوی کے حساب اور ہجری کے حساب سے وقت میں فرق آ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عیسوی کے اعتبار سے جناب رسالت مآبؐ کی عمر مبارک (۶۲) باسٹھ برس ایک ماہ اور سولہ روز ہوتی ہے۔ جبکہ ہجری کے اعتبار سے آپ کی عمر (۶۳) تریسٹھ برس چار ماہ اور گیارہ روز ہوتی ہے۔ سو ہم جناب سیدہؓ کی عمر کا حساب ہجری کے اعتبار سے سالوں میں کرتے ہیں۔ اس کا حوالہ سب سے پہلے جناب رسول اللہؐ کی سوانح حیات کے دوسرے مصنف ابن ہشام سے دیا جاتا ہے۔ جبکہ پہلے مصنف ابن اسحاق کی ساری تصنیف ابن ہشام نے لے لی ہے۔ ابن ہشام کے مطابق جناب سیدہؓ کی عمر نکاح کے وقت سات برس اور رخصتی دو برس کے بعد یعنی نو برس کی عمر میں ہوئی۔ اب میں حوالہ دیتا ہوں جو کنسٹس ویرژل جارجیو کا جو ۱۵ ستمبر ۱۹۱۴ء میں رومانیہ میں پیدا ہوئے۔ یہ بخارسٹ میں فلسفہ اور ادبیات میں ریسرچ کرتے تھے، اس کے بعد رومانیہ کی وزارت خارجیہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں وہ فرانس جا کر درس و تدریس کے شعبہ سے منسلک ہوئے اور بہت سی کتابیں تصنیف

کیں۔ سب سے آخری کتاب "محمد رسول اللہ" کے نام سے لکھی اور اس کے بعد روحانیت کا ادراک پا کر صوفی ہو گئے اور گمنامی کی زندگی بسر کی۔ ان کی کتاب سے ان کے دل میں جناب رسالت مآبؐ کی محبت اور خلوص صاف ظاہر ہوتا ہے۔

انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جناب ابوبکرؓ رسالت کے تیسرے سال مسلمان ہوئے اور اسی سال ان کے ہاں ایک بچی (عائشہؓ) پیدا ہوئی یعنی سیدہ عائشہؓ نبوت کے تیسرے سال پیدا ہوئیں۔ جناب رسول اللہؐ ۲۹ صفر سن ۵۳ قبل از ہجرت پیدا ہوئے۔ ۴۰ برس بعد یعنی صفر سن ۱۳ قبل از ہجرت نبوت ملی۔ یعنی نبوت کے تیسرے برس یعنی صفر سن ۱۰ قبل از ہجرت سیدہ عائشہؓ پیدا ہوئیں۔ جناب رسول اللہؐ نے نبوت کے پہلے ۱۳ برس مکہ میں گزارے۔ ہجرت سے پہلے دوسرے سال نکاح ہوا یعنی سن دو (۲) قبل از ہجرت۔ اس طرح آپ کی عمر نکاح کے وقت تقریباً (۱۰) دس برس ہوئی اور رخصتی ہوئی ہجرت کے بعد دوسرے سال تو اس وقت آپ کی عمر ہوئی (۱۲) بارہ برس کم از کم بارہ برس کی عمر میں بلوغت کو پہنچی ہے۔ بلکہ اگر آج بھی وہی صحرائی ماحول بے فکری کھانے پینے کو اونٹ کا گوشت اور دودھ اور کھجور ہو تو آج بھی بارہ برس کی بچی سن بلوغت تک پہنچی ہوتی ہے۔ اب جس طرح سے یہود و نصاریٰ بلکہ بہت سے کم عقل مسلمان بھی سیدہؓ کی عمر چھ برس بتاتے ہیں۔ یہ بلاشبہ غلط بیانی ہے ان کی کم علمی کی وجہ سے۔ حالانکہ آج بھی دنیا کے اکثر علاقوں میں بلوغت بارہ برس میں آ جاتی ہے۔

(۵۴) پیغمبر اسلام کو دعوت کے لیے لوگوں کی تلاش

جب جناب رسول اللہؐ کو ان کے گھر والوں سمیت ان کے قبیلے والوں نے اپنے قبیلہ ہاشمی سے خارج کر دیا تو آپ مکہ کے قبائل میں تن تنہا رہ گئے۔ اس لیے آپؐ نے سوچا کہ وہ کسی دوسری قریبی جگہ جا کر طبع آزمائی کریں اور دعوت دین کے لیے نئے لوگ تلاش کریں۔ لہٰذا اس غرض سے آپ مکہ کے پڑوسی شہر طائف چلے گئے۔ جو مکہ سے (۵۰) پچاس میل دور ایک پہاڑی پر نہایت دلفریب مقام ہے۔ آپ کا متبنیٰ زید بن حارثہؓ بھی آپ کے ساتھ تھا۔ یہ واقعہ ۶۱۹ عیسوی میں ماہ شوال میں ہوا۔ آپ حضرات وہاں دس روز رہے۔ جناب رسالت مآبؐ نے بہت لگن اور کاوش کے ساتھ ان لوگوں کو پیغام حق پہنچایا لیکن کوئی خواطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بلکہ برخلاف اس کے آپ کی توہین

کی گئی آپ کا مذاق اڑایا گیا اور پتھر برسائے گئے یہاں تک کہ آپ کا خون مبارک بہہ کر آپ کی ٹانگوں تک پہنچ گیا۔ جبکہ زید بھی آپ کو بچاتے ہوئے زخمی ہوئے اور شریر لڑکوں نے اپنی بدبختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ کا پیچھا کیا یہاں تک کہ آپؐ نے شہر کے باہر ایک باغ میں پناہ لی۔

(۵۴) جناب رسالت مآبؐ کی اپنے مالک سے التجا

جناب رسالت مآبؐ اس وقت شدید دلبرداشتہ ہو چکے تھے، کہ ان کے پیغام کو کسی شخص نے بھی مشفق رحمت کو اور نہ کی بلکہ ان کی موجودگی کو بھی پسند نہ کیا۔ جب قوم نے آپؐ کو اس قدر مایوس کیا تو آپؐ اپنے مالک کی طرف متوجہ ہوئے جو سارے جہانوں کا مالک اور سب سے زیادہ قوی و طاقت رکھنے والا ہے اور آپؐ جس کے نہایت تابعدار فرمانبردار اور اس کی طرف سے مقرر کردہ فرائض کو پوری تندہی سے ادا کرنے والے لازم (بندے) تھے۔ جناب رسالت مآبؐ کی بندگی کی فضیلت ہی یہ تھی کہ آپؐ اپنے مالک کے حکم کو اپنے اوپر سراپا جاری کر لیتے اور اس کی انجام دہی کے لیے تن من اور دھن ہر طریقے سے اپنی جانفشانی کا مظاہرہ فرماتے اور ایک ذرہ برابر بھی ڈگمگاہٹ آپ کے اندر نہ آنے پاتی۔ بے شک انہوں نے ہر مشکل کا مقابلہ اور ہر شیطانی وار کا مقابلہ کرنا تھا اور کیا۔ لیکن جب کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو اپنے مالک کے سامنے مدد کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ آپؐ نے اپنے رب کی حضوری میں جس طرح سے گڑگڑایا وہ الفاظ تاحال قلمبند ہیں، جس کا ترجمہ پیش خدمت کیا جا رہا ہے: "اے اللہ! میں تو صرف تیری ہی ذات بابرکت کے سامنے اپنے بے یار و مددگار ہونے، وسائل کے کم ہونے اور اپنی کم حیثیت ہونے کی شکایت کر رہا ہوں۔ آپ بہت رحم فرمانے والے ہیں، آپ ناتوانوں اور بے یار و مددگاروں کے مالک ہیں۔ اے میرے رب! کیا آپ مجھے چھوڑ دیں گے میرے سنگدل رشتہ داروں کے پاس، جو میرے خیالات کو ناپسند اور نامنظور کرتے ہیں یا آپ مجھے چھوڑ دیں گے اس دشمن کے پاس جو مجھے اپنے ارادے کو پورا کرنے سے روک سکتا ہے۔

لیکن اگر آپ کا غصہ مجھ پر وارد نہیں ہوا اور آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوئے تو پھر مجھے کوئی غم نہیں۔ میں پناہ کا خواستگار ہوں آپ کے چہرہ مبارک کی روشنی میں، جو روشن کرتا ہے آسمانوں کو اور دور کرتا ہے اندھیروں کو اور تمام معاملات پر اپنا قابو رکھتا ہے، اس دنیا کے اور آخرت کے۔

(اے اللہ) یہ کبھی نہ ہو کہ میں آپ کی ناراضی کا سزاوار بنوں یا یہ کہ آپ مجھ سے ناراض ہوں اور (بے شک) کوئی طاقت نہیں، نہ ہی کوئی وسائل ہیں صرف آپ کی ذات تنہا کے سوا"۔ (سبحان اللہ)

جیسے ہی جناب رسالت مآبؐ نے اپنی فریاد اپنے رب کے سامنے ختم کی تو آپؐ کے سامنے انگوروں کا ایک ٹرے آ گیا جو اس باغ کے مالک نے اپنے غلام عداس کے ہاتھ بھیجا تھا۔ عداس چونکہ عیسائی تھا، اس لیے بسم اللہ کے الفاظ کو سمجھتا تھا لہٰذا جب جناب رسولؐ اللہ نے بسم اللہ پڑھ کر انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عداس نے اندازہ لگایا کہ آپ کوئی نیک انسان ہیں۔ اور پھر محبت اور عقیدت کے طور پر عداس نے آپؐ کے مبارک ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

لہٰذا جناب رسولؐ اللہ کی دعائیں رنگ لائیں، وہ ان سنی نہیں گئیں بلکہ اس نے عرش کو ہلا دیا اور پھر بادشاہوں کے بادشاہ نے اپنے بندے کی بات سنی اور اپنے مقرب فرشتے جبرائیل کو بھیجا۔ وہ جناب رسالت مآبؐ کے پاس آئے اور سلام کرنے کے بعد فرمایا کہ "اللہ سب کچھ جانتا ہے جو تمہارے اور لوگوں کے درمیان ہوا ہے، اس لیے اس نے مجھے تمہارے حکم کی تعمیل کے لیے بھیجا ہے اور میرے ساتھ پہاڑوں کے فرشتے کو بھی۔ اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتے نے بھی جناب رسالت مآبؐ کو سلام کیا اور کہا "اے اللہ کے رسولؐ! میں آپ کی خدمت پر مامور کیا گیا ہوں اگر آپ کی خواہش ہو تو میں دونوں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا سکتا ہوں اور ان تمام لوگوں کو ان دونوں کے درمیان کچل سکتا ہوں یا اس کے علاوہ اگر آپ کچھ اور چاہتے ہوں تو وہ بھی کر سکتا ہوں"۔ جناب رسالت مآبؐ (رحم سے بھرپور تکبر سے خالی) نے انکار یہ جواب دیا اور انہیں ہنوز یہ امید تھی کہ اگر یہ لوگ نہیں تو نہ سہی، ہو سکتا ہے کہ ان کی اولاد ہی اللہ کے راستے پر آ جائے۔ انشاء اللہ

(۵۵) پیغمبر اسلام کا حالتِ غم میں مکہ لوٹنا

جناب رسولؐ اللہ نے نہایت رنج و الم کے عالم میں مکہ واپسی کے لیے سفر اختیار کیا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری تھی اور وہ فتح کی امید لیے ہوئے تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ طائف میں ان کے ساتھ کوئی انہونا واقعہ پیش نہیں آیا ان سے پہلے کی قوموں کے افراد نے بھی اپنے پیغمبروں کے ساتھ ظلم و زیادتی کر کے ان کی دعوت کو ٹھکرا دیا تھا اور اسی طرح کا سلوک

ان کی قوم کر رہی تھی۔ لیکن اس کے برعکس انہیں یہ بھی یقین تھا کہ ان کا رب ان کے ساتھ ہے جس کی مدد غیر معمولی اور کسی اور سے مطابقت نہیں رکھ سکتی۔

دوران واپسی آپؐ نے ایک شب وادی نخلہ میں گزاری، جہاں پر وہ نماز کی حالت میں قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے تو جنوں کے ایک گروہ نے جو وہاں سے گزر رہا تھا، انہوں نے یہ تلاوت سنی اور مزید سننے کے لیے وہاں ٹھہر گئے۔ یہ واقعہ سورۃ احقاف (۴۶) کی آیات (۲۹-۳۲)میں آیا ہے اور اس کے علاوہ سورۃ جن (۷۲) کی آیت (۱-۲)میں بھی۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ جن بھی احکامات خداوندی کے پابند ہوتے ہیں اور پیغمبروں کے اسی طرح تابع ہوتے ہیں جس طرح کہ انسان۔ ان میں بھی مسلمان اور کافر ہوتے ہیں۔ ابلیس (شیطان) کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے۔ عربی زبان میں ''جن'' کا مطلب ایسی مخلوق ہے جو نظر نہیں آتی، اس کا مطلب ''خوف'' بھی ہے، کیونکہ اگر انسان جن کو دیکھ لیں تو خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔

بہر حال جنوں کی کہانی سورۃ احقاف (۴۶) کی آیت (۲۹-۳۲)میں آئی ہے جس کے مطابق کہا گیا کہ: ''اور یاد کرو جب ہم نے (اللہ) بھیجا تمہاری طرف (پیغمبر کی طرف) ایک گروہ جنات کا قرآن سننے کے لیے اور جب انہوں نے سنا تو انہوں نے کہا: ''خاموشی سے سنو'' اور جب تلاوت مکمل ہو گئی تو وہ اپنے لوگوں کی طرف واپس ہو گئے اور انہیں آگاہ کیا اور کہا اے ہمارے لوگو! بے شک ہم نے سنی ہے ایک کتاب جو نازل ہوئی ہے موسیٰ کے بعد۔ ان کی تائید کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہوا ہے۔ یہ راہبری کرتی ہے سچائی اور سیدھے راستے کی طرف۔ (انہوں نے پھر کہا) اے ہمارے لوگو! اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے بلانے والے کو جواب دو اور اس پر ایمان لاؤ۔ وہ (اللہ) تمہیں معاف کر دے گا، تمہارے گناہ اور تمہاری حفاظت کرے گا ایک بہت تکلیف دہ عذاب سے اور جو کوئی بھی اللہ کی طرف سے بلانے والے کی طرف رجوع نہیں کرے گا وہ زمین پر کہیں بھاگ نہیں سکتا اور وہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا مددگار، بچانے والا نہیں پائے گا، اور ایسے لوگ واضح غلطی پر ہیں''۔

ان آیات کے علاوہ سورہ جن (۷۲) کی آیات (۱-۲)میں بیان کیا گیا ہے کہ ''کہو: (اے پیغمبر) کہ مجھے یہ الہام کیا گیا ہے کہ جنات کے ایک گروہ نے سنا (اس کو) اور کہا کہ بیشک ہم نے ایک حیران کر دینے والا کلام سنا! یہ سیدھے راستے کی طرف آگاہی دیتا ہے اور ہم اس پر

یقین کر چکے ہیں اور ہم کبھی شریک نہیں کریں گے کسی کو بھی اپنے رب کے ساتھ''۔ لاحظہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر اپنے نبیؐ کی دلجوئی فرمائی جبکہ انہیں اپنی قوم سے بے حد مایوسی ہوئی جو اپنی دانش پر بیحد مغرور تھے، اور انہوں نے جناب رسولؐ اللہ کی دعوت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے ادب قوم کے مقابلے میں ایک اور مخلوق کو لا کھڑا کیا، جنہوں نے جناب رسالت مآبؐ کی دعوت کو قبول کیا اور آپؐ کے حکم کو تسلیم کیا۔

حالانکہ جنات آپؐ پر ایمان لے آئے لیکن ابھی تک مکہ میں جناب رسالت مآبؐ کے لیے کسی پناہ گاہ کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ اس لیے آپؐ کو غار حرا میں اپنا ٹھکانہ بنانا پڑا، جس سے وہ اچھی طرح آشنا تھے۔ وہاں قیام کے دوران آپؐ نے قبیلہ بنو زہرہ کے اخنس بن شریق سے ان کے قبیلے کی پناہ چاہی۔ اس کے انکار پر سہیل بن عمرو سے کہا تو اس نے بھی انکار کیا۔ پھر آپؐ نے مطعم بن عدی کو اسی بات کے لیے پیغام بھیجا تو یہ اعزاز اسے حاصل ہوا اور اس نے آپؐ کے لیے اپنے قبیلے کی مسلح نگہبانی کا انتظام کیا۔ جناب رسولؐ اللہ مطعم کے ممنون رہے اور اس کے اس احسان کو یاد رکھا۔ آپؐ نے جنگ بدر کے موقع پر مطعم کو بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا تھا جبکہ اس وقت وہ زندہ نہ تھا اور بغیر ایمان کے ہی فوت ہو گیا تھا۔ بخاری اور داؤد نے جناب رسالت مآبؐ کے ان الفاظ کو قلمبند کیا ہے کہ آپؐ نے جنگ بدر کے موقع پر اسیران بدر کے بارے میں فرمایا ''کہ اگر مطعم زندہ ہوتا اور ان قیدیوں کے بارے میں مجھے کوئی سفارش کرتا تو اس کے لیے میں ان کو آزاد کر دیتا''۔ بے شک جناب رسولؐ اللہ کے یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے الفاظ کے مطابق تھے جو سورہ رحمٰن (۵۵) کی آیت (۶۰) میں فرمائے گئے کہ ''کیا کوئی بدلہ ہے اچھائی کے لیے اچھائی کے سوا؟'' یعنی احسان کا بدلہ احسان ہی ہے، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔

(۵۶) دعوت حق کے لیے ایک اور سُرعت انگیز کوشش

جب مطعم بن عدی نے اپنے قبیلے کی طرف سے جناب رسالت مآبؐ کے لیے حفاظت کا ذمہ قبول کر لیا تو آپؐ نے اپنی ذمہ داریاں دوبارہ ایک نئے ولولے کے ساتھ سنبھال لیں۔ آپؐ نے ان لوگوں پر اپنی توجہ مرکوز کر دی، جو مکہ میں دور دراز علاقوں سے آتے۔ اور اس طرح سے آپؐ چند مزید قبائل کو اپنی دعوت کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں

سے چند ایک کا یہاں ذکر کرنا بہت مناسب سمجھا گیا ہے کیونکہ ان کے ایمان لانے سے اسلام میں ایک انقلابی تبدیلی آئی اور اسلام قبائل تک پہنچ گیا۔

(الف) طفیل دوسی Tufail Dawsi:

یہ قبیلہ دوس کے سردار تھے، اعلیٰ پائے کے شاعر، لوگ انھیں دانشمند سمجھ کر ان کی پیروی کرتے۔ ان کا قبیلہ یمن کے نزدیک آباد تھا۔ جب قریش کو خبر ملی کہ طفیل مکہ آ رہا ہے حج کی خاطر تو انھیں اس بات کا خوف لاحق ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ طفیل نیا دین قبول کر لے۔ لہٰذا انہوں نے اسے راستے میں ہی آ پکڑا اور اسے آگاہ کیا کہ مکہ میں ایک نیا دین آ گیا ہے اور اس کا لانے والا محمدؐ لوگوں کو اپنے جادوئی الفاظ کے ذریعے سحر زدہ کر دیتا ہے اور وہ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتے۔ لہٰذا ہم تمہاری بھلائی کے لیے تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ تم ان کی بات سرے سے سننا ہی نہیں۔ لہٰذا جب اس نے دیکھا کہ معززین و معتبرین مکہ اسے یہ نصیحت کر رہے ہیں تو اس نے اپنے کان روئی سے بند کر لیے اور مکہ کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اس حالت میں جب وہ کعبہ پہنچا اور اس کے گرد طواف کر رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے قلب کو روشن کر دیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس کی اپنی عقل کا کیا فائدہ، جبکہ وہ محمدؐ کے غیر دانشمندانہ قول کو بھی سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ وہ کیوں کہ اس شخص کو سمجھ نہیں سکتا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی غلط باتوں کو صحیح مان لے گا۔ اسے اپنی عقل پر بھروسہ تھا، جو چند لمحوں کے لیے کھو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے کانوں سے روئی کے پھوہے نکالے اور جناب رسالت مآبؐ کی خدمت میں پہنچ گیا تاکہ سنے کہ آپؐ کیا فرماتے ہیں۔ چنانچہ طفیل نے جناب رسول اللہؐ سے پیغام حق سنا، اس کے قلب نے اس کی سچائی کی تصدیق کی اور اس کا دل ایمان سے منور ہو گیا۔ پھر طفیل کی خوش بختی کہ اس کی وجہ سے اس کا سارا قبیلہ دوس ایمان سے سرفراز ہوا۔

(ب) ضماد الازدی Dhumad Al Azdi:

ضماد الازدی یمن کے قبیلہ ازد شنوءہ سے تعلق رکھتا تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے پاس جادوئی ماورائی قوت ہے۔ اس نے بھی جناب محمدؐ کی نبوت کے بارے میں سنا کہ ان کے قول غیر دانشمندانہ اور ماورائے عقل ہیں۔ اس لیے وہ مکہ آیا کہ وہ جناب رسالت مآبؐ پر اپنی جادوئی مہارت آزما سکے اور یہی معاملہ اسے سچائی کے دھارے تک لے آیا اور اس کی خوش قسمتی کا باعث بن گیا۔

جب اسے جناب رسالت مآبؐ نے دیکھا تو درج ذیل دانش سے بھرپور الفاظ ارشاد فرمائے: "تمام تعریفیں صرف اللہ ہی کی ذات پاک کے لیے ہیں، ہمارے ذہن میں صرف اسی کی بڑائی ہوتی ہے اور ہم صرف اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ جس کسی کو بھی اللہ ہدایت عطا فرماتا ہے اسے کوئی بھی صحیح راستے سے نہیں ہٹا سکتا اور جس کسی کو بھی اللہ گمراہی کی طرف دھکیل دے اسے کوئی بھی ہدایت نہیں دے سکتا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ کے اور محمدؐ اس کا غلام اور پیغمبر ہے"۔

جب اس نے جناب پیغمبر علیہ السلام کے الفاظ سنے تو اس نے آپؐ سے ان الفاظ کو دہرانے کی درخواست کی۔ اس پر جناب رسول اللہؐ نے وہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے۔ اس کے بعد ضماد نے جناب رسول اللہؐ کے الفاظ کی شیریں انگیزی کی تعریف کی اور اپنے آپ کو جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کر دیا ان کی اتباع کے لیے اور اللہ کی غلامی کے لیے۔

(ج) ابوذر غفاری Abu Dhar Ghafari:

ان کا تعلق بنو غفار کے قبیلہ سے تھا جو یثرب کے گرد و نواح میں مکہ کی جانب رہائش پذیر تھا۔ ان کا علاقہ ویران اور رہنے کے لیے مشکل ترین جگہ تھی۔ ایسی ہی جگہوں پر ڈاکو اور لٹیرے رہتے تھے، اور ان کے قبیلے کا بھی یہی کام تھا۔ اس زمانے میں لوٹ مار کا پیشہ برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اخلاقیات کا کوئی خاطر خواہ قانون مروجہ نہیں تھا، سوائے حرمت کے چار ماہ میں، لیکن غفاری تو ان حرمت کے مہینوں کا بھی خیال نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ذیقعد کے متبرک ماہ میں انہوں نے ایک کاروان کو لوٹا اور کئی مسافروں کو قتل کیا۔ اسی دوران عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سے صحرا سے صدائے بازگشت آ رہی تھی اور ایک پر اثر خوف زدہ منظر پیش کر رہی تھی۔ اس پر تشدد اور ظالمانہ منظر نے ابوذر کا دل بھی کھینچ لیا، جب اسے یہ احساس ہوا بلکہ اس نے ان بے کسوں کے درد کو اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کر لیا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کام کو اور اپنے قبیلے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا اور اپنے ظلم و جور سے کنارہ کشی اختیار کر لے گا۔ حالانکہ اس کے پاس پناہ لینے کے لیے اس کے اپنے قبیلے کے سوا اور کوئی جگہ نہ تھی۔ بہرحال وہ اپنی والدہ کی آبائی بستی کے لیے اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ روانہ ہوا۔ جہاں ان دونوں کو اس نے چھوڑا اور خود صحرا میں مارا مارا پھرتا رہا اور اس فکر میں رہا کہ اسے سچائی کیونکر حاصل ہو اور وہ

ایک صالح زندگی کیسے گزار سکے۔

پھر اس نے مکہ کی طرف رخ کیا اور وہاں تنہائی میں ایک ماہ گزارہ اور کسی نہ کسی طرح جناب رسالت مآبؐ کے پاس پہنچ گیا اور اسلام قبول کرنے کے بعد واپس اپنے قبیلہ میں پہنچا اور انہیں اس بات پر راضی کیا کہ وہ بھی دینِ حق کے سائے میں آ جائیں۔

(د) سوید بن صامت Suwaid Bin Samit:

یہ بہت مشہور شاعر تھا اور یثرب کے اوس قبیلے کے معززین میں سے تھا۔ ایک مرتبہ وہ حج کی غرض سے مکہ گیا جناب رسالت مآبؐ بذات خود اس کے پاس تشریف لائے اور اس کے سامنے قرآن کی کچھ آیات تلاوت فرمائیں اور اس کے بعد اسے دعوت اسلام پیش کی، جسے اس نے قبول کر لیا اس نے جناب رسول اللہؐ کو لقمان کی طرح کا دانشمند سمجھا اس کے بعد وہ واپس یثرب چلا گیا اور وہاں کے خزرج قبیلے کے ایک شخص کے ہاتھوں جام شہادت نوش جان کیا۔

(ہ) ایاس بن معاذ Eyas Bin Muadh:

ان کا تعلق بھی یثرب کے اوس قبیلے سے تھا یہ اپنے قبیلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ مکہ آیا کہ قریش سے اپنے لیے خزرج قبیلہ کے خلاف مدد حاصل کر سکے۔ جناب رسول اللہؐ نے اس گروہ کو دعوت اسلام پیش کی لیکن ان تمام لوگوں میں صرف ایک ایاس ہی وہ خوش بخت تھا، جس کا سینہ اسلام کے لیے کھل گیا۔ اس گروہ کے افراد ناکام واپس یثرب چلے گئے اور وہاں خوش قسمت نوجوان ایاس کا انتقال ہو گیا۔

(۵۷) قبائل کا اسلام سے منہ موڑنا

جیسے ہی جناب رسول اللہؐ نے اپنی کوششوں کو دعوت اسلام کے لیے تیز تر کر دیا ویسے ہی ابو جہل بھی حرکت میں آ گیا اور جناب رسول اللہؐ کے پیچھے لگ گیا۔ وہ ہمہ وقت آپؐ کی تاک میں رہتا اور جب بھی آپؐ دعوت میں مشغول ہوتے ابو جہل فوراً ہی دعوت کی نفی کر دیتا۔ اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ کو اور زیادہ چوکس اور اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے زیادہ متحرک ہونا پڑا اور تبلیغ کا کام زیادہ موثر انداز میں کرنا پڑا۔

امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ ذی المجاز کے میلے میں جاتے جو حج کے مہینے

میں عرفات کی پہاڑی کے پاس منعقد ہوتا۔ یہ میلہ کم از کم آٹھ ذی الحج تک رہتا آپؐ اس دوران یہ الفاظ پکارتے رہتے کہ ''کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے۔ پس اسی کو مانو اور کامیاب ہو جاؤ''۔

جناب رسول اللہؐ عکاظ کے میلے میں بھی نظر آتے جو طائف اور نخلہ کے درمیان ذیقعد کے مہینے میں پہلی سے بیس تاریخ تک منعقد ہوتا۔ آپؐ اس جگہ بھی وہی الفاظ پکارتے جو عرفات کے میلے میں پکارتے لیکن ان الفاظ کا اثر کسی ایک نے بھی قبول نہیں کیا۔

اس کے علاوہ حج کے موسم میں ایک مرتبہ جناب رسالت مآبؐ پندرہ مختلف قبیلوں کے سرداروں کے پاس گئے اور انہیں پیغام حق پہنچایا اور ان سے ان کے قبیلوں کی پناہ کے لیے مدد چاہی لیکن کسی نے بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ بلکہ بعض نے تو اپنی بیہودگی کا مظاہرہ بھی کیا، لیکن پھر بھی جناب رسول اللہؐ اپنے مشن سے ذرہ برابر بھی نہیں ڈگمگائے اور اپنا کام جاری رکھا۔

(۵۸) اسلام نے اہل مدینہ کا دل موہ لیا

مدینہ کے تین معززین جو ابتدا میں اسلام میں آ چکے تھے یعنی سوید بن صامت، ایاس بن معاذ اور ابو ذر غفاری جنہوں نے اہل مدینہ کو دعوت حق دی۔ اس بات سے جناب رسول اللہؐ بہت خوش اور پر امید ہوئے اور پھر آپؐ نے اہل مدینہ پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اہل مدینہ کی ان کے پڑوس میں آباد یہودیوں سے چپقلش بھی بڑھ گئی۔ یہودی اہل مدینہ کو دھمکیاں دیتے رہتے تھے کہ ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے انہی لوگوں میں سے اور وہ پھر ان کو (اہل مدینہ) عاد اور ثمود کی قوموں کی طرح تباہ و برباد کر دیں گے۔ یہودیوں کو اس بات کا قوی یقین تھا کہ آئندہ آنے والا پیغمبر انہی میں سے یعنی یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہی ہو گا، جیسا کہ اس سے پہلے ہوتا چلا آیا تھا۔

جب جناب رسول اللہؐ پندرہ سرداروں سے مایوس ہو گئے تو آپؐ نے منیٰ کے مقام پر سولہویں گروہ سے ملاقات کی، اس گروہ کا تعلق یثرب سے ہی تھا یعنی مدینہ سے۔ یہ خوش بخت گروہ قسمت کا دھنی نکلا اور جناب رسول اللہؐ کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوا اور انہوں نے دعوت حق قبول کر لی۔ ان کے دل میں یہ بھی خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اہل یہود سے سبقت لے جائیں اور ان نبیؐ کے ساتھی بن جائیں تاکہ وہ اہل یہود پر قابو پا سکیں۔ کیونکہ وہ انہیں ان نبی سے ہی

لوٹ آئے تھے۔ اس گروہ میں درج ذیل خوش نصیب شامل تھے: (۱) اسعد بن زرارہ (۲) عوف بن حارث (۳) رافع بن مالک (۴) عقبہ بن عامر (یہ حضرات قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ (۵) جابر بن عبداللہ (یہ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے) یہ پانچ خوش نصیب حضرات تہہ دل سے مدینہ جا کر دین اسلام کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔

(۵۹) بیعت عقبہ اوّل

اگلے حج کے دوران یعنی سن ۶۲۱ عیسوی میں بارہ اشخاص کا ایک گروہ حج کرنے مدینہ سے آیا، ان میں پانچ وہ حضرات بھی شامل تھے جو پچھلے برس دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ وہ حضرات جناب رسولؐ اللہ سے منا اور مکہ کے درمیان عقبہ کے مقام پر ملے، یہ جگہ تاریخی اعتبار سے بہت مشہور ہے کیونکہ یہاں پر شیطان نے ابراہیمؑ کو ورغلانے کی کوشش کی جو اپنے بیٹے اسماعیلؑ کی قربانی کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ اہل مدینہ کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ جناب رسالت مآبؐ کے پیروکار بن کر ایک تو راہ راست اختیار کر چکے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کے امتی ہونے کی وجہ سے یہود کے مقابلے میں آ کھڑے ہوئے ہیں کیونکہ یہود موسیٰؑ کے امتی ہونے کی وجہ سے فخر کرتے تھے۔

ان حضرات نے جناب رسول اکرمؐ کو بتایا کہ یثرب کے لوگ اب ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اب ان میں ایک نقطہ پر تقسیم ہونے والی ہے کیونکہ وہاں کے ایک گروہ نے اپنوں میں سے ایک شخص عبداللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ چن لیا ہے جبکہ دوسرا گروہ یہ چاہتا ہے کہ پیغمبر ان کی رہبری فرمائیں بادشاہ کے بجائے۔

اس پر جناب رسولؐ اللہ نے ان سے کہا کہ کیا وہ اس بات کا عہد کرنے کے لیے تیار ہیں، کہ وہ ان کی حفاظت کریں گے اس طریقے سے جس طرح کہ وہ حفاظت کرتے ہیں اپنی عورتوں اور بچوں کی۔ اس شرط کو انہوں نے تسلیم کر لیا اور اسی وجہ سے یہ عہد بیعت نسواں بھی کہلائی۔ یہ بیعت دراصل بنیادی مسلمانوں کے ایک سیاسی و سماجی مرکز کے قیام کی۔ لہٰذا ان تمام بارہ افراد نے رسولؐ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور قسم اٹھائی مندرجہ ذیل کاموں کے لیے:

الف) اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کریں گے۔

ب) چوری نہیں کریں گے۔
ج) زنا نہیں کریں گے۔
د) اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے۔
ہ) کسی پر تہمت نہیں لگائیں گے۔
و) جھوٹ پر مبنی کوئی کام نہیں کریں گے۔
ز) اور جناب رسولؐ اللہ کی ہر معاملہ میں تابعداری کریں گے۔

جناب رسالت مآبؐ نے ان کے ساتھ مصعب بن عمیر کو ان کا استاد اور امام بنا کر بھیجا، اس وجہ سے یثرب میں جمعہ کی نماز بھی ادا کی جانے لگی۔ معلوم ہوا کہ جمعہ کی پہلی صلوٰۃ چالیس حضرات نے ادا کی تھی اور اس کی امامت اسعد بن زرارہ نے کی جو یثرب کے سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے۔

(۶۰) بیعت عقبہ دوم

پھر دوران حج سن ۶۲۲ عیسوی میں ایک گروہ جو کہ (۷۳) مردوں اور دو (۲) خواتین پر مشتمل تھا یثرب سے مکہ آیا۔ اس وقت تک سوائے اہل یہود کے تمام اہل یثرب دامن اسلام میں پناہ لے چکے تھے۔ بے شک یہ عجیب انقلاب تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یثرب والوں کے قلوب اسلام کے لیے کھول دیے، حالانکہ پیغمبر اسلام وہاں موجود نہ تھے۔ اور جہاں آپؐ موجود تھے وہاں کے لوگوں کے قلوب کفر کے زنگ سے اتنے آلودہ تھے کہ نور کی روشنی ان تک نہ پہنچ سکی۔ اس مدنی گروہ نے جناب رسالت مآبؐ سے عقبہ کے مقام پر ۱۲ ذی الحج کو ملاقات کا بندوبست کیا۔ تا کہ آپؐ سے دوبارہ اس موضوع پر گفتگو ہو سکے کہ آپؐ مستقل طور پر یثرب میں قیام پذیر ہو جائیں۔ وہ حضرات و خواتین خاموشی کے ساتھ اس مقام پر پہنچ کر آپؐ کا انتظار کرنے لگے۔ جناب رسالت مآبؐ اپنے چچا عباس (جو ہنوز اپنے مذہب پر تھے) کے ساتھ وہاں تشریف لائے، جناب عباس نے اہل مدینہ سے خطاب کیا اور بتایا کہ "جناب رسولؐ اللہ ان کے درمیان سماجی اعتبار سے کیا درجہ و مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور مزید یہ کہ وہ ابھی تک وہاں پر غیر محفوظ نہیں ہیں لیکن تمہاری دعوت کے بعد وہ تمہارے ساتھ رہنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا

اگر آپ لوگ یہ یقین ہیں کہ اپنی بات پر مستقل مزاجی کے ساتھ قائم رہو گے اور مزید یہ کہ ان کی حفاظت کرنے کے عزم پر بھی قائم رہ سکو گے تو ٹھیک ہے اپنی اس پیشکش کو دہراؤ"۔

اہل مدینہ نے جواب دیا "اے اللہ کے نبیؐ ہم نے ان کی بات سنی، مہربانی فرما کر ہمیں آپؐ بتائیں کہ آپؐ ہم سے اپنے لیے اور اللہ کے لیے کیا عہد چاہتے ہیں؟ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ "میں تم سے یہ عہد چاہتا ہوں کہ تم اللہ کے ہر حکم کی تعمیل کرو گے"۔ نبیؐ کے اس فرمان کے بعد ایک مدنی سردار براء بن معرور نے جناب نبی اکرمؐ کا دست مبارک اپنے ہاتھ میں تھاما اور کہا "میں قسم اٹھاتا ہوں، اس اکیلے کے نام کی جس نے آپ کو نبیؐ بنا کر بھیجا، ہم آپؐ کی تمام شرائط کو تسلیم کرتے ہیں اور یقینی طور پر آپؐ کی حفاظت کریں گے ان تمام وسائل اور قوتوں کے ساتھ جن کے ذریعے سے ہم اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس لیے اے اللہ کے نبیؐ! ہم سے عہد لیجئے اس بات کا، اللہ کی قسم ہم جنگجو نسل کے لوگ ہیں، ہم ہتھیاروں سے لیس ہیں اور جنگ کے تمام طور طریقے ہمیں ورثے میں ملے ہیں"۔

ان میں سے ایک ابو الہیثم بن التیہان نے درمیان میں بات کاٹتے ہوئے کہا: "اے اللہ کے نبیؐ! ہمارے یثرب کے یہودیوں سے خاص تعلقات ہیں جو ہم آپؐ کی خاطر ختم کر دیں گے، اگر ہم ایسا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ آپؐ کو حکومت عطا فرماتا ہے تو کیا آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنے لوگوں کے پاس چلے جائیں گے؟"۔

جناب رسولؐ اللہ مسکرائے اور فرمایا "نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ میرا خون بہا تمہارا ہوگا اور میرا خون معاف کرنا بھی تمہاری خاطر ہوگا۔ تم میرے ساتھ رہو گے اور میں تمہارے ساتھ زندگی اور موت کے تمام معاملات میں۔ میں اس کے ساتھ لڑونگا جس کے ساتھ تم لڑو گے اور میں امن اختیار کرونگا جس کے ساتھ تم امن سے رہو گے۔ میری عزت و آبرو تمہاری ہوگی جبکہ تمہاری عزت و آبرو میری ہوگی"۔

اس کے بعد ان میں سے ہر ایک نے اس بات کا عہد کیا اور اس عہد کی ابتدا مدینہ کے پہلے مسلمان اسعد بن زرارہ سے ہوئی۔ پھر جناب رسالت مآبؐ کی خواہش پر انہوں نے اپنوں میں سے بارہ (۱۲) سردار منتخب کیے جن میں سے نو (۹) قبیلہ خزرج سے اور تین (۳) قبیلہ اوس میں سے تھے۔

پھر اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے ان سرداروں کے بارے میں خوشخبری سنائی کہ وہ اب عزت پائیں گے اس بات کے لیے کہ ان کے ہاتھوں ایک ایسی انقلابی تحریک برپا ہوگی کہ اس سے پہلے سرزمین عرب پر کسی نے نہ دیکھی ہوگی۔ جناب رسولؐ اللہ نے انہیں اس بات کے لیے نصیحت فرمائی کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل و ذرائع، اہلیت و قابلیت کو بروئے کار لائیں۔

یہ رنگی بیعت اور بارہ سرداروں کا انتخاب ایک جمہوری نظام کے قیام اور اسلامی ریاست کی بنیاد رکھنے کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس عمل سے بیشک ایک نئے سماجی، معاشی اور سیاسی دور کا آغاز ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ دونوں غیر تحریری معاہدے، وعدے اور وفاداریاں بے شک ایک غیر تحریری آئین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس کے تحت اللہ اور اس کے رسولؐ کی حکمرانی اور فرمانبرداری معاشرے کے ہر فرد کی ذمہ داری قرار دی گئی۔

(۲۱) مالک کا اپنے بندے کو عروج و رفعت عطا فرمانا

(اسراء و معراج)

اسراء کا مطلب ہے رات کا سفر اور معراج کا مطلب ہے کہ رفعت مراتب۔ یہ انتہائی عجیب و غریب واقعہ ہے جسے اسراء و معراج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جناب رسولؐ اللہ کی حیات مبارکہ میں سن ۶۲۱ عیسوی ماہ رجب المرجب کی ستائیسویں شب میں پیش آیا۔ اس رات آپؐ اپنی چچازاد (ابو طالب کی بیٹی) ہند جو ام ہانی کی کنیت سے مشہور ہیں ان کے ہاں قیام پذیر تھے۔ ان کا گھر کعبہ کے حجر اسود اور رکن یمانی کے متصل تھا، بعد میں یہ گھر کعبہ کے گرد مسجد کا حصہ بنا دیا گیا۔ ان کے گھر کی وہ جگہ جہاں سے جناب رسالت مآبؐ کا سفر اسراء شروع ہوا تھا اس کی نشان دہی ایک فٹ اونچی چار دیواری سے کی گئی تھی۔ اس کا رقبہ اندازاً 1x4x6 فٹ ہوگا۔ یہ جگہ باب عبدالعزیز کے بائیں ہاتھ باب ام ہانی کے نام سے یاد کی جاتی تھی لیکن اب یہ نشانیاں موجود نہیں، اور تعمیرات باب فہد میں شامل کی جا چکی ہیں، مصنف کو سن ۱۹۸۹ عیسوی میں اس جگہ بیٹھنے کا موقع ملا۔

اسراء اور معراج کے سفر کی داستان سیرت کی ہر کتاب میں کم و بیش ایک ہی انداز میں لکھی جا چکی ہے اور احادیث کی کتب میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے، اس لیے اس پورے واقعہ کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ قصہ مختصر کہ جناب رسول اللہؐ کو اس سفر کے لیے لے جایا گیا، اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی کے مطابق اس جگہ سے جہاں وہ رات کو آرام فرما رہے تھے یعنی بیت الحرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا جو یروشلم میں ہے اور پھر وہاں سے آسمانوں پر اور وہاں سے اس جگہ جہاں اللہ نے چاہا اور جہاں آج تک اور کوئی نہیں گیا اور جس جگہ کو اور کوئی نہیں جانتا نہ بیان کر سکتا ہے اور نہ ہی جناب رسول اللہؐ نے اس جگہ کے بارے میں کوئی تفصیل کسی بھی قسم کی بتلائی۔ لیکن یہ تمام کا تمام سفر وقت کے بہت ہی کم حصے میں طے پا گیا اور وقت اور جگہ یعنی Time & Space کی قیود کو پیچھے چھوڑ گیا۔ انہوں نے اپنی عشاء اور فجر کی نماز وہیں ادا فرمائیں جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ ہم کسی بھی منطقی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے، ہم اللہ کے تابعدار بندے یہ تسلیم کرتے ہیں، بلا کسی چوں و چرا اس کے، کہ جو جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا بالکل درست فرمایا اور یہ کہ اللہ کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں، وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس واقعہ کے درج ذیل وجوہات قیاس کیے جا سکتے ہیں۔

یہ جناب رسول اللہ کی رسالت کا گیارھواں برس تھا اور ان برسوں میں آپؐ زندگی کے مشکل ترین واقعات سے دو چار ہوئے اور اسی دوران آپ کی زندگی سے تعلق رکھنے والی دو شخصیتیں جو آپ کے دکھ درد میں آپ کے ساتھ شریک تھیں، آپ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں یعنی آپ کی زوجہ سیدہ خدیجہؓ اور چچا ابو طالب۔

جب رسول اللہ نہایت رنج و الم کے دور سے گزر رہے تھے، اور تنہا بھی تھے، آپؐ کے مالک نے جو بہت ہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے، آپؐ کی دل جوئی فرمائی اور اپنے نہایت ہی تابعدار بندے کو ایسا اعلیٰ مرتبہ عطا فرمایا جو اس سے پہلے کسی بھی بندے کو عطا نہیں ہوا۔ نہ تو پیغمبروں میں سے اور نہ ہی فرشتوں میں سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں رفعت و منزلت کا مقام عطا کرنے کے لیے جو کسوٹی اور معیار مقرر فرمایا ہے وہ اس بندے کی تابعداری، محبت اور اپنے مالک سے قربت کے درجے اور حیثیت کے مطابق ہے۔ اس طرح سے بندے کو جو مرتبت عطا ہوتی ہے وہ معراج کہلاتی ہے یعنی اس بندے کو اس کے مالک کا اعلیٰ ترین درجے تک لے جانا یا

پہنچا دینا۔ اس لحاظ سے سورہ البقرۃ کی آیت (۱۵۲) بہت ہی آگاہی عطا کرنے والی اور بصیرت انگیز ہے جس کا بیان یہاں بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس آیت کریمہ سے اخذ کیے گئے منطقی معنی یہ ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین مخلوق ہے، اس لیے مالک اپنے بندوں کو تابعداری اور قربانی اور خلوص کے اعتبار سے ایک خاص حد تک رفعت اور عظمت عطا فرماتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے فرماتا ہے کہ "تم مجھے یاد کرو (میری عظمت بیان کرتے ہوئے)، میں تمہیں یاد کروں گا، اور میرا شکر ادا کرتے رہو (میری ان گنت نعمتوں اور مہربانیوں کا) اور کبھی بھی میری ناشکری نہ کرنا"۔

اس آیت کریمہ کے بارے میں ایک حدیث قدسی بھی نقل کی گئی ہے کہ: "جو کوئی بھی اپنے آپ میں مجھے (اللہ کو) یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنی ذات میں یاد کرتا ہوں۔ اور جو کوئی بھی مجھے کسی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اس سے اچھی محفل (یعنی فرشتوں کی) میں یاد کرتا ہوں"۔ (فتح الباری)۔

امام احمدؒ نے بھی اسی موضوع پر ایک حدیث قدسی نقل کی ہے کہ انس بن مالکؓ کی روایت کے مطابق جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: بڑی شان والے اللہ نے فرمایا: اے آدم کی اولاد اگر تم مجھے اپنے آپ میں یاد رکھو گے تو میں بھی تمہیں اپنے آپ میں یاد رکھوں گا۔ اور اگر تم مجھے کسی محفل میں یاد کرو گے تو میں تمہیں اس سے اچھی محفل یعنی فرشتوں کی محفل میں یاد رکھوں گا، اگر تم میری طرف ایک بالشت بڑھو گے تو میں تمہاری طرف ایک ہاتھ کی لمبائی جتنا بڑھوں گا اور اگر تم میری طرف ایک ہاتھ کی لمبائی تک بڑھو گے تو میں تمہاری طرف بازو کی لمبائی جتنا بڑھوں گا اور اگر تم میری طرف چلتے ہوئے آؤ گے تو میں تمہاری طرف دوڑتا ہوا آؤں گا۔ (سبحان اللہ) تمام تر تعریفیں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لیے ہیں اور رحمتیں ہوں اللہ کے رسول محمد ﷺ پر۔ مندرجہ بالا آیت کریمہ اور نبی اکرم ﷺ کے الہامی ارشادات سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ اللہ کا ہر غلام (بندہ) جو اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری میں سبقت لے جانے کی جتنی کوشش کرتا ہے اس کے اتنے ہی درجات بلند کیے جاتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ جناب رسول ﷺ سے محبت اور تابعداری بھی اللہ ہی کی خاطر کی جاتی ہے۔ اور بندے کی زندگی کا اصل مقصد اپنے مالک کو راضی کرنا مقصود ہوتا ہے۔ بندہ جس قدر اپنے مالک کو راضی کرتا ہے اسی لحاظ سے بلکہ

اس سے بہتر طور پر اللہ تعالیٰ اس بندے کو اپنی قربت عطا فرماتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قربت سب سے زیادہ اس بندے کو عطا فرمائی جس نے سب سے زیادہ بندگی اور تابعداری اور محبت کا مظاہرہ کر کے اپنے مالک کو راضی کرنے کی کوشش کی اور وہ ہیں اللہ کے رسول محمد ﷺ اور وہ عطا معراج کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اعلیٰ اور پاک ترین جگہ پر لے گیا جہاں اور کوئی بلایا نہ گیا۔ وہاں پر جناب رسول ﷺ کو ایسا جلوہ دکھایا گیا جو نہ تو کوئی دیکھ سکا اور نہ ہی کوئی جان سکا۔ اور یہ ایسا جلوہ تھا جو موسیٰ ایک پہاڑ پر پڑتا ہوا دیکھ کر بیہوش ہو کر گر پڑے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ جبکہ جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ اکرام بخشا کہ وہ اس جلوے کو برداشت کر گئے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ اعراف (۷) کی آیت (۱۴۳) میں فرمایا کہ جب موسیٰ کو اپنے رب نے بلایا اور ان سے کلام فرمایا تو موسیٰ نے اپنے رب کے دیدار کی خواہش کر دی۔ ارشاد ربانی ہوا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔ لیکن تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم بھی دیکھ سکو گے۔ جب رب کائنات نے اس پر تجلی فرمائی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا، اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو عرض کیا، بے شک آپ کی ذات پاک بہت رفیع الاعلیٰ ہے۔ اور میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں"۔

اسی بات کو (شیخ اقبالؒ) نے اپنے ایک شعر میں بہت خوبصورتی سے سمو دیا ہے۔ اس شعر کو انہوں نے اپنی کتاب "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں بھی قلمبند کیا ہے۔ فرمایا:

"موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

یعنی کہ موسیٰ تو جلوے کی ایک جھلک سے بیہوش ہو گیا۔ لیکن آپؐ نے وہ سب کچھ دیکھا ایک مسکراہٹ کے ساتھ۔

شیخ اقبالؒ نے اپنی اسی کتاب میں معراج کے بارے میں ہی ایک صوفی بزرگ عبدالقدوس گنگوہی کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر میں اس مقام تک پہنچ جاتا جہاں جناب رسول اللہؐ لے جائے گئے تھے تو خدا کی قسم میں وہاں سے کبھی واپس نہ آتا۔ حضرت علامہؒ نے اسے یوں قلمبند کیا:

"محمدؐ مصطفیٰ بر قاب قوسین اَوْ اَدنیٰ رفت و باز گردید واللہ ما باز گردیم"

حضرت علامہؒ کا دراصل یہ کہنا ہے کہ ایک صوفی اس مقام سے جو اسے اللہ کا قرب عطا کرے کبھی واپس آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا، کیونکہ وہی تو اسکا مقصد حیات ہوتا ہے اور فرض کریں کہ وہ وہیں رہتا ہے اور واپس نہیں آتا تو انسانیت کے لیے اسکا آنا یا نہ آنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن پیغمبر علیہ سلام کی وہاں سے واپسی انکے فرائض کا تقاضا تھا اور ان کا وہاں سے واپس نہ آنا ان کی فرائض کی ادائیگی کے منافی تھا۔ کیونکہ وہ ابھی تک منصب پیغمبر کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے، اور دعوت حق کی منزل ہنوز تکمیل کی راہیں طے کر رہی تھی۔ اور تاریخ لکھی جا رہی تھی ہجرت ابھی کرنے تھے، کعبہ جو اللہ کے گھر کا درجہ حاصل کر چکا تھا اسے بتوں کی غلاظت سے پاک کرنا ابھی باقی تھا۔ سلطنت اسلامیہ کی بنیاد رکھنا ابھی باقی تھی، اہل مدینہ تا حال آپؐ کے انتظار میں تھے۔ مسلمانوں کا قبلہ تبدیل ہونا باقی تھا، مسجد نبوی کا قیام ابھی ہونا تھا، حمزہؓ نے ابھی جام شہادت نوش کرنا تھا، ابھی عمر اور عمیر کا غرور ٹوٹنا باقی تھا۔ ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوانین کا نزول باقی تھا، ابھی کتاب اللہ کی تکمیل باقی تھی، ابھی دین کا مکمل ہونا باقی تھا تو پھر یہ کیونکہ ممکن تھا کہ رسول اللہؐ اپنے فرائض کی تکمیل چھوڑ کر وہاں رہنے کا تقاضہ کرتے۔ اور دوسرا یہ کہ آپؐ کو وہاں سے جو نور کی روشنی عطا ہوئی، آپ کے علم و حکمت و بصیرت میں جو اضافہ ہوا، آپؐ اس کی برکات اپنی اُمت تک کیوں نہ پہنچاتے۔ ان کا مقصد حیات اس مقام کو حاصل کرنا نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بہترین طریقے سے تعمیل تھا، سو آپؐ نے کی۔ اس لیے پیغمبر اور صوفی کے کردار میں بہت فرق ہوتا ہے۔ صوفی کا مقصد تو اللہ کی ذات میں کھو جانا ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں فنا کر دینا چاہتا ہے اپنے وجود، اپنی ہستی، اور اپنے مقصد سے بے خبر ہو کر صرف اللہ کی ذات اقدس میں کھو جانا یا فنا ہو جانا ہی اس کا مقصد حیات ہوتا ہے۔ جب ایک صوفی اللہ کے قریب تر ہو جاتا ہے تو اپنی ذات کی نفی کر دیتا ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ جب اللہ کے نور کو پا لیتا ہے تو اس میں اسے برداشت کرنے کی طاقت ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ عالم جذب میں آ جاتا ہے یعنی سب کچھ بھول جاتا ہے حتیٰ کہ خود اپنا آپ بھی۔ اس کے برعکس پیغمبر میں قوت برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی توجہ صرف اپنے

مالک کے حکم کی تعمیل میں ہی مرکوز ہوتی ہے۔ اس لیے جب وہ اللہ کے نور کی زیارت کرتا ہے تو بے خود نہیں ہوتا، اور نہ ہی اپنے فرائض کو بھول پاتا ہے اور نہ ہی اس میں کوتاہی کرتا ہے۔ حالانکہ اس حالت سے واپس آنا پیغمبر کے لیے مشکل ضرور ہوتا ہے لیکن وہ صرف اپنی ذمہ داری کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے، اس لیے اس حالت پر برقرار رہنے کے لیے اصرار نہیں کرتا۔

بہرحال جب پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اس سفر کا بیان لوگوں سے کیا تو کافر لوگ حیران ہو گئے اور تمسخر اڑانے لگے۔ یہی نہیں بلکہ کچھ مسلمان بھی اس بات کو ہضم نہ کر سکے اور انہوں نے بھی اسے سچ نہ سمجھا۔ اس پر کافرین مکہ نے حضرت ابوبکرؓ سے مزاحیہ انداز میں معراج کے متعلق کہا تو جناب ابوبکرؓ نے فرمایا، اچھا! کیا جناب رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا ہے؟ اور اگر فرمایا ہے تو اس میں بالکل شک نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے بالکل درست فرمایا۔ جب جناب رسول اللہؐ نے سنا کہ ابوبکر نے آپ ﷺ کے اس سفر کی تائید کی تو آپ ﷺ ان سے بہت خوش ہوئے اور انہیں "صدیق" کا لقب عطا فرمایا۔ یعنی سچ کی تصدیق کرنے والا۔

(۲۲) اللہ کا اپنے عام بندوں کو معراج عطا فرمانا

اللہ تعالیٰ نے اپنے خواص میں سے یعنی اپنے مقربین میں سے بہت سوں کو معراج عطا فرمایا۔ ہم کسی کے معراج کا کسی دوسرے کے معراج سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہمارا یہ مقصد ہے۔ صرف بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیشک اپنے بندے محمدؐ کو اعلیٰ ترین معراج سے نوازا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرے مقرب بندوں کو پھر عام مومنین کو ان کے مرتبے کے مطابق معراج عطا فرمایا۔ معراج کو یوں سمجھیں کہ یہ ایک انعام ہے جو اللہ اپنے بندوں کی بندگی کی قدر دانی کے طور پر عطا فرماتا ہے۔ مثال کے طور پر جناب آدم علیہ السلام کا معراج اپنی نوعیت کا انوکھا معراج تھا، وہ یہ کہ آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے بذات خود علم سکھایا اور دوسرا یہ کہ اس علم کے ذریعے سے انکی سربلندی فرمائی اور تیسرا یہ کہ اپنی پاک مخلوق سے سجدہ کروایا۔ اسی طرح سے ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام اپنی قربانی کی وجہ سے قیامت تک مشہور رہیں گے۔ اور تمام دنیا میں ان کی قربانی کی یادگار عملی طور پر ہر سال منائی جاتی ہے۔ اسی طرح سے حضرت اسمٰعیل کی والدہ حاجرہ علیہ السلام کی یاد صفا مروہ کے طواف کی صورت میں قیامت تک منائی جائیگی۔ اور یہ یاد

گاریں ان حضرات کا معراج ہیں اور یہ معراج ان صاحب و صاحبان کو اس وجہ سے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بندگی، تابعداری، ذکر و فکر، ان کے نفس اور جان کی قربانی جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو راضی کرنے کے لیے تھی، قبول فرمائی اور ان کی یاد قیامت تک کے لیے قائم کر دی۔ اسی طرح سے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کا معراج حاصل ہوا اور عیسیٰؑ کو بغیر والد کے پیدا ہونے، بچپن میں گفتگو کرنے، بیماروں کو شفایاب کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے اور زمین سے زندہ ہی اٹھائے جانے کا اعزاز ان کے لیے معراج ہی تو ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں آپ کو ملیں گی لیکن عام مومنین کے لیے جو معراج اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے وہ بھی ہمارے لیے نہایت اعزاز کی بات ہے۔ لیکن اس معراج کو اکثر حضرات سمجھتے ہی نہیں اور نہ ہی اس پر غور کرتے ہیں۔ اس لیے اس معراج کی اہمیت کو سمجھنا اور حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ یہاں ہم ایک عام مومن کی مثال دیں گے مثلاً بہت ہی کم درجے کے مسلمان کے لیے معراج کی جو عطا اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اس کا اندازہ لگایئے، وہ یہ کہ جب یہ شخص اپنی گندگی اور اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کے باوجود اور عبادات و ریاضت میں بھی کم ترین درجے کا ہونے کے باوجود جب بھی اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہے، اس کا ذکر کرتا ہے، اسے یاد کرتا ہے، اس کے آگے سجدہ ریز ہوتا ہے، اس سے مانگتا ہے، اسے راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی غم یا کسی خوشی کے موقع پر یا عام حالات میں تو اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اسی وقت اس کی طرف محبت کے ساتھ متوجہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس جو مالک ہے خالق ہے مہربان ہے، سخی ہے، رحم فرمانے والا ہے، اور اپنے بندوں سے محبت کرنے والا ہے اس کی یہ توجہ اس بندے کے لیے معراج نہیں تو اور کیا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ "پس تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا" تو اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو یاد کرنا اور اپنے فرشتوں میں اسکا ذکر کرنا ہی بندے کا معراج ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ مرتبہ اس شخص کو مل ہی نہیں سکتا، کہ اللہ اسے یاد کرے۔ (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ)

(۲۳) ذکر اللہ

اس موضوع میں بھی اسی آیت کو مدنظر رکھا گیا ہے جو اس سے پہلے دو مضامین میں آ چکی ہے یعنی سورۃ بقرہ کی آیت (152) یعنی "مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرے مشکور رہو

اور کبھی بھی ناشکری نہ کرنا۔" اسی تعلق سے امام بخاریؒ نے ایک حدیث ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا "کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ویسا ہی ہوں جیسے کہ میرا بندہ میرے بارے میں سوچتا ہے۔ اور میں وہی اس کے لیے کرتا ہوں جو وہ میرے بارے میں سوچتا ہے کہ میں اس کے لیے کر سکتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں اگر وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اُسے اپنے آپ میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس سے بہتر محفل میں اسے یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ ایک بالشت میری طرف آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ اور اگر وہ ایک ہاتھ میری طرف بڑھتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کی طرف جاتا ہوں اور اگر وہ چلتا ہوا میری طرف آتا ہے تو میں دوڑتا ہوا اس کی جانب جاتا ہوں"۔

اب ذرہ غور فرمایئے کہ یہ سارے کا سارا معاملہ ذکر پر منحصر ہے یعنی ذکر کا عمل اتنا اہم ہو گیا کہ ہماری کامیابی کا دارومدار اس پر منحصر ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہو گیا کہ ذکر کی حقیقت کیا ہے، کیونکہ دنیا اور آسمانوں کی ہر شے اللہ سبحانہٗ کا ذکر کرتی ہے، جیسا کہ سورۃ تغابن (۶۴) کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے اس کے علاوہ بے شمار ایسی آیات ہیں اور تو اور اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو حکم دیا کہ "اے پہاڑو داؤدؑ کے ساتھ بار بار تسبیح کرو اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی حکم دیا گیا"۔ یہ حکم سورۃ سبا (34) کی آیت (10) میں دیا گیا ہے۔

اس نئے موضوع "ذکر" کی تفصیل جاننا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ مومنین و مسلمین ذکر کا مطلب و مقصد سمجھ کر اس کے مقام اور فضیلت کو جانیں تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کر سکیں۔ ذکر کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کو اپنا الٰہ مانتے ہوئے اور کلی طور پر مالک مانتے ہوئے اس کی حمد و ثنا کرنا اور اس سے اس طرح سے محبت کرنا کہ وہ راضی ہو جائے۔ اگر ذرہ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کے پانچ درجے ہیں اور وہ ہیں:

الف) مادی اشیاء کا ذکر کرنا

ب) نباتاتی اشیاء کا ذکر کرنا

ج) حیوانات کا ذکر کرنا

د) فرشتوں کا ذکر کرنا

ہ) جن و انس کا ذکر کرنا

اس سے پہلے کہ ذکر کے ان درجوں کے متعلق کچھ کہا جائے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ قرآن حکیم کی سورۃ الحج (22) آیت (18) کو ذرہ پڑھ لیا جائے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام مخلوقات کا ذکر فرمایا ہے جو اسکو سجدہ کرتے ہیں اور جب سجدہ کرتے ہیں تو اس میں ذکر ہی کیا جاتا ہے بلکہ ذکر کرنے کا بہترین وقت و مقام حقیقت میں سجدے کی حالت ہی ہوتی ہے۔ اس آیت مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ:

"کیا تم نہیں دیکھتے جو کوئی بھی ہے آسمانوں میں اور زمین پر اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت، اور دواب (یعنی تمام جگہ رکھنے والے جانور) اور رینگنے والے جانور اور بہت سے انسان سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اللہ کے سامنے۔ لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی سزا لکھ دی گئی ہے (یعنی منکر، سجدہ نہ کرنے والے) اور اللہ جس کو بھی ذلیل کرنا چاہے اسے کوئی بھی عزت عطا نہیں کر سکتا۔ بے شک اللہ وہی کچھ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ (یہ آیت سجدہ ہے پڑھنے والے سجدہ کریں)۔

اب ہم ذکر کے درجوں کے متعلق سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا ذکر کے ابتدائی تین درجے چونکہ شعور اور ادراک نہیں رکھتے کیونکہ ان کی سوچ و سمجھ بہت ہی محدود ہے۔ لہٰذا عبادات یا ذکر کا جو مادہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے رکھ دیا ہے اس کی حیثیت ان کی جبلت پر مبنی ہے اور ان کا ذکر ان کی جبلت کے تابع ہوتا ہے کیونکہ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں، انکا تو ذکر کرنا ہی ہے، سجدہ کرنا ہی ہے۔ وہ بغیر شعور کے ہی اللہ کا ذکر کرتے ہیں جیسے کہ وہ کھانا کھاتے ہیں، افزائش نسل کرتے ہیں، یہ دونوں کام جانور اور پودے ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن مادی اشیاء کا ذکر ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ مادی اشیاء چونکہ نہ کھاتی ہیں، نہ افزائش نسل کرتی ہیں بلکہ وہ تو صرف حرکت کر سکتے ہیں، لیکن اس کا شعور نہیں ہوتا جیسے مادے کے نیوٹرون اور پروٹون کی حرکت۔ لہٰذا ان کا ذکر نباتات و حیوانات کے ذکر سے بھی کم درجے کا ہے لیکن ہے با کمال۔

اب آتے ہیں فرشتے انکا ذکر بہت فضیلت رکھتا ہے۔ وہ نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ افزائش نسل کرتے ہیں، نہ سوتے ہیں بس ذکر ہی ذکر کرتے رہتے ہیں اور ہر وقت اللہ کا حکم سننے اور تعمیل کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ لیکن ان کو اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اختیار ہی نہیں دیا کہ وہ

اس کے حکم کے علاوہ وہ کچھ اور کر سکیں۔ لہٰذا ان کی عبادت و ذکر شعوری تو ہوتی ہے اور اس کا انھیں ادراک بھی حاصل ہوتا ہے لیکن انھیں اس کے سوا کوئی سوا بھی نہیں۔ اور اطاعت کے بغیر ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں۔ اس لیے ان کی عبادت و ذکر ابتدائی تین درجوں سے تو فضیلت رکھتے ہیں لیکن جن و انس کی عبادت و ذکر کی برابری نہیں کر پاتے۔ کیونکہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی مرضی پر چھوڑ رکھا ہے کہ اطاعت کریں یا نہ کریں۔ ان دونوں صورتوں میں وہ انعام یا عذاب کے حقدار ٹھہریں گے ان کا ذکر و فکر ان کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ اور سوچ سمجھ کر ہوتا ہے اس لیے ان کی عبادت و ذکر کا درجہ سب سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ لیکن سب سے اعلیٰ درجہ کی عبادت انسان کی ہوتی ہے کیونکہ تمام مخلوق پر اسے فضیلت دی گئی ہے اور ان پر فرائض بھی جنات کی نسبت بہت زیادہ رکھے گئے ہیں۔ لہٰذا انسان اپنے قلب سے، ذہن سے، جسم کے مختلف حصوں سے، اپنے مال سے، اپنی طاقت سے، اپنی عقل سے، اپنی جان سے غرض کہ ہر شے سے اپنے مالک کی عبادت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی عبادت میں اس کا شعور اور لاشعور تک شامل ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی جب وہ عبادت و ذکر کرتا ہے تو اسے بہت سی باتوں سے کاموں سے، ارادوں سے اجتناب بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اپنی خواہشوں سے لڑنا اور اپنے نفس پر قابو پانا، اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنا بھی انسان کی عبادت و ذکر کا حصہ بن جاتا ہے۔

اس لیے ہر انسان کی عبادت و ذکر اس کی محنت و کوشش اور ارادے کے مطابق درجہ حاصل کرتی ہے یعنی ان کی عبادت و ذکر کی قدر و منزلت، درجہ بندی اور اس کا انعام و اکرام انفرادی ارادے، کوشش اور عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ جب ایک شخص محض اللہ کو یاد کرتا ہے عام حالت میں تو اس کا درجہ مادی اور نباتاتی و حیواناتی مخلوقات کی عبادت و ذکر کے درجہ کے برابر ہوتا ہے اور اس کی حیثیت غیر شعوری ذکر کی سی ہوتی ہے اور ایسی عبادت اور ذکر کا ایک انسان کے لیے کم ترین درجہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی فضیلت والی ایسی بات نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دنیاوی معاملات کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، نہ وہ گھر بناتے ہیں، نہ گھر بساتے ہیں، نہ کھانے سے انھیں لگاؤ ہوتا ہے نہ ذائقے سے، نہ آرام سے ان لوگوں کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں یہ لوگ کبھی جذب کے عالم میں رس بس جاتے ہیں اور مجذوب ہو جاتے ہیں، کبھی بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں، کبھی فاقہ کشی کرتے

ہیں۔ حتیٰ کہ یہ لوگ اپنے شعور کو بھی خیرباد کہہ دیتے ہیں اور فقط اپنے مالک کے ذکر میں ہی لگے رہتے ہیں۔ چونکہ وہ یہ راستہ شعوری طور پر اختیار کرتے ہیں لہٰذا ذکر کے ابتدائی تین درجوں سے بہت فضیلت پر ہوتے ہیں بلکہ ان کا درجہ فرشتوں اور جنات کی عبادت کے برابر آ جاتا ہے، لیکن انسان کے درجہ سے کم رہتا ہے کیونکہ وہ ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتے ہیں جو ان کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے سپرد کی ہوتی ہیں یعنی وہ دنیاداری سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، گھر گرہستی چھوڑ دیتے ہیں، افزائش نسل کی پرواہ نہیں کرتے، اپنی جبلتی خواہشوں کو بھی کچل کر رکھ دیتے ہیں۔

اب ذکر و عبادت کا انتہائی درجہ آتا ہے اس کی بہترین مثال تو پیغمبروں کی عبادت اور اولیاء اللہ کی عبادت ہوتی ہے یعنی وہ اپنے شعوری اعتبار سے اور اپنے فطری اعتبار سے بھرپور زندگی بھی گزارتے ہیں لیکن ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کا تابع ہوتا ہے اور دونوں طور پر یعنی شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے جسم کے ہر ہر حصے کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی دولت اور اپنے تمام وسائل کو استعمال کرتے ہوئے عبادت کا اور ذکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ وہ گھر بھی آباد کرتے ہیں، افزائش نسل بھی کرتے ہیں، روزی بھی کماتے ہیں، اپنی بقا کی خاطر جنگ بھی کرتے ہیں۔ یعنی کہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق گزارتے ہیں اور یہی عبادت و ذکر کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔

مختصراً یہ کہ ایسے انسان اپنے مالک کا ذکر و عبادت اپنی پوری ہوشمندی اور شعور کے ساتھ اپنی پوری لگن کے ساتھ، لیکن تمام منکرات کی نفی کے ساتھ اور تمام گناہوں سے بچ کر اپنے مالک کے حضور اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں اور انتہائی عاجزی و انکساری اور اپنی ذہنی سطح اور جسمانی طاقت کو ذلیل ترین اور ادنیٰ ترین حالت میں لا کر اپنے مالک کی حضوری میں پیش کر کے اس کی عبادت و ذکر کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کے ہر لمحے کو اللہ کی اطاعت اور بندگی میں گزارتے ہیں جب انسان اس حالت میں آ جاتا ہے تو اس کا مالک اپنے آپ میں اسے چاہتا ہے، پسند کرتا ہے، محبت کرتا ہے اور اس کا ذکر اپنی پاک مخلوق یعنی فرشتوں میں کرتا ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کی محبت و چاہت و انعام و اکرام بندگی کے درجے کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے انسان بننا اور پھر مسلمان بننا بہت مشکل کام ہے، کیونکہ مسلمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایسا انسان جو اللہ کے ہر حکم پر اپنی گردن جھکا دیتا ہو، لبیک کہہ دیتا ہو، اپنی جان نثار

کر دیتا ہوں۔ اسی بات کو شیخ اقبالؒ نے اس طرح سے بیان کیا ہے کہ:

"چوں می گویم مُسلمانم بلرزم۔ کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را"

یعنی کہ میں کیونکر کہوں کہ میں مسلمان ہوں کیونکہ جب کبھی بھی میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اس لیے کہ مسلمان ہونے کا اقرار کرنے کے بعد مجھے لا الٰہ کہنا پڑتا ہے یعنی اللہ کے سوا تمام خداؤں کی نفی کرنی پڑتی ہے اور جب ان کی نفی کی جاتی ہے پھر جن مشکلات سے اور تکالیف سے دو چار ہونا پڑتا ہے وہ بھی میں جانتا ہوں، اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اپنے آپ کو مسلمان کہلوانا بہت مشکل اور بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ جب ایک انسان اللہ کی غلامی کا اقرار کر لیتا ہے تو اسے تمام دوسرے آقاؤں سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑتا ہے اور اپنے آپ کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے تابع رکھنا ہوتا ہے۔ اس لیے بقول اقبالؒ

"دلوں کو مرکز مہر و وفا کر   حریم کبریا سے آشنا کر" (بال جبریل)

یعنی کہ دلوں کو نورِ ایمان کی روشنی سے منور کر کے اپنے مالک کی عظمت سے آشنا کر کے اسکا نہایت وفادار اور تابعدار غلام بن جا۔

(۲۴) بیعت عقبہ کے نتائج

بیعت عقبہ جو اہل مدینہ نے جناب رسولؐ اللہ سے ۶۲۱ اور ۶۲۲ء میں کی تھی، اس کے نتائج سامنے آنے سے پہلے ہی اہل قریش نے محسوس کر لیا کہ اہل مدینہ اور جناب رسولؐ اللہ کے درمیان کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اس بات کا اندازہ نہ لگا سکے کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ اہل مدینہ کی طرف سے اس بات کو انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا۔ بہر حال قریش ایک انجانے شبہ کے تحت چوکنا ہو گئے کہ نہ معلوم کیا ہونے والا ہے۔ اور حفظ ماتقدم کے طور پر اس بات کا خیال رکھا کہ مکی اور مدنی مسلمانوں میں میل جول زیادہ نہ ہو جائے کیونکہ انہیں جناب رسولؐ اللہ اور آپؐ کے جانثاروں کے بارے میں خوب معلوم تھا کہ وہ کتنے نڈر اور بہادر ہیں۔

اسی دوران جناب رسالت مآبؐ نے مکہ کے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ خاموشی کے ساتھ اہل قریش سے نہایت احتیاط برتتے ہوئے، مدینہ کے لیے ہجرت کی تیاری کریں۔ قریش کو اس بات کا علم تو ہو گیا لیکن وہ ہجرت کے معینہ وقت کا اندازہ نہ لگا سکے اس لیے وہ اور زیادہ چوکس

ہو گئے اور انہوں نے بندوبست بھی کر لیا کہ کس طرح سے انہیں ہجرت سے روکا جائے۔

قریش اس خوف کو دور کرنے کی کاوش میں بھی لگے ہوئے تھے جو انہیں رسالت مآبؐ کی رسالت سے لاحق تھا۔ انہیں اپنی معاشی حالات کو دھچکا لگنے کا بھی خوف تھا، اور ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنی سماجی حیثیت کے کم ہونے کا بھی خوف تھا، جناب رسولؐ اللہ کے طاقتور ہو جانے کی صورت میں ان حالات کے پیش نظر قریش کے سربراہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان تمام اندیشوں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے جناب رسولؐ اللہ کو ہی ختم کر دیا جائے۔ اس لیے انہوں نے اس معاملہ کو طے کرنے کے لیے ایک فیصلہ کن اجلاس طلب کر لیا، یہ اجلاس حسب دستور ان کے دارالندوہ میں ہوا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس اجلاس میں قریش کے بڑے شیاطین کے علاوہ اصلی شیطان (ابلیس) بھی بنفس نفیس نجد کے ایک شیخ کی حیثیت سے پیش پیش تھا اور اہل قریش کو اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال اس اجلاس میں درج ذیل امور پر بحث کی گئی۔

(الف) جناب رسولؐ اللہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا:

یہ تجویز تو بہر حال منظور نہ ہوئی کیونکہ ان کو قبائل کی آپس میں لڑائی کا اندیشہ تھا، خاص طور پر بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب اور ان کے حمایتی اہل یثرب والے کبھی قریش سے ڈٹ کر لڑتے اور نتیجہ قتل و غارت کے سوا اور کچھ نہ نکلتا۔

(ب) جناب رسولؐ اللہ کو تا حیات مقید رکھنا:

یہ تجویز بھی منظور نہ ہوئی کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ اسی طرح کا معاملہ کر چکے تھے۔ جب جناب رسولؐ اللہ شعب ابو طالب میں تین سال تک قریش کے قطع تعلق کی وجہ سے رہے تھے لیکن آپؐ نے ہمت نہ ہاری تھی اور اپنے مقصد کی خاطر تندہی سے کام کرتے رہے۔

(ج) جناب رسولؐ اللہ کو ہمیشہ کے لیے مکہ بدر کر دینا:

یہ تجویز بھی منظور نہ ہوئی کیونکہ انہیں یہ گمان ہوا کہ مبادہ آپؐ یثرب میں مستقل طور پر نہ مقیم ہو جائیں اور اپنی ایک مستحکم حکومت نہ بنا لیں۔

(د) آخری اور قطعی تجویز:

آخری تجویز جو سب نے منظور کی وہ یہ تھی کہ مکہ کے ہر قبیلے کا ایک ایک فرد جمع کر کے ایک

ایسا رستہ نکالا جائے جو یہ ہو کہ تلواریں لے کر ایک ساتھ جناب رسول اللہ پر اچانک حملہ کر دے۔ یہ تجویز اس وجہ سے منظور ہوئی کہ ہاشمی اور بنو عبدالمطلب میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ مکہ کے تمام قبائل سے انتقام کی خاطر لڑ سکیں۔ اس لیے یہ تجویز بغیر کسی مخالفت کے منظور ہو گئی۔ اس کے بعد ہر قبیلہ میں سے ایک ایک نوجوان منتخب کیا گیا تا کہ وہ اس شیطانی سازش کی تکمیل کر سکیں۔

اس شیطانی سازش سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو مطلع کر دیا اور اس الہام کو قرآن میں محفوظ فرما دیا تا کہ وہ ان سازشیوں کے لیے سبق آموز اور ایمان والوں کے لیے اطمینان کا باعث بن جائے۔ یہ الہام سورۃ انفال (۸) کی آیت (۳۰) میں نازل ہوا۔ جس میں کہا گیا کہ ''اور (یاد کرو) جب کفار نے ایک منصوبہ بنایا تمہارے خلاف (اے محمدؐ) تمہیں مقید کرنے کا یا قتل کرنے کا یا (وہاں سے) نکالنے کا۔ جب یہ لوگ منصوبہ بنا رہے تھے تو اللہ بھی منصوبہ بنا رہا تھا، بیشک اللہ تعالیٰ بہترین منصوبہ بندی کرنے والا ہے (تا کہ ان کے منصوبوں کو ناکام بنا سکے)''۔

(۲۵) جناب رسالت مآبؐ کی مکہ سے ہجرت

جب اللہ رب العزت نے کافرین مکہ کی سازش کو دیکھا تو جبرئیل کو آپؐ کے پاس بھیجا، جنہوں نے جناب رسول اللہ کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدینہ ہجرت کے لیے اجازت عنایت فرما دی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ کوئی بھی نبی علیہ السلام اپنے قیام کی جگہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ نبی ہمیشہ اپنے فرائض اللہ کے حکم کے مطابق ہی ادا کرتا ہے چاہے اسے اپنی جان کا نذرانہ ہی کیوں نہ پیش کرنا پڑے۔ جناب رسول اللہ کو سفر کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام ہدایت مل گئیں، حتیٰ کہ گھر چھوڑنے کے وقت کا بھی حکم موصول ہوا اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ وہ اس رات اپنے بستر پر نہ گزاریں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ملتے ہی آپؐ نے ابوبکر صدیقؓ کو سفر کے بندوبست کا حکم صادر فرما دیا۔

وہ ۲۷ صفر کی رات تھی اور رسول اللہ کی رسالت کا چودھواں سال شروع ہو چکا تھا یعنی ۱۲ اور ۱۳ ستمبر ۶۲۲ عیسوی کی رات کو گیارہ شیاطین جو کہ قریش نے اپنے تمام قبیلوں سے منتخب کیے تھے، جناب رسالت مآبؐ پر حملہ آور ہونے کے لیے آپؐ کے گھر کے گرد آ کھڑے ہوئے تا کہ جیسے ہی رسول اللہ اپنے گھر سے باہر نکلیں ان پر حملہ کر دیا جائے۔ ان بدبخت لوگوں کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) ابوجہل (۲) حکم بن ابو العاص (۳) عقبہ بن ابی معیط (۴) نضر بن حارث (۵) اُمیہ بن خلف (۶) زمعہ بن الاسود (۷) طعیمہ بن عدی (۸) ابولہب (۹) اُبی بن خلف (۱۰) نبیہ (Nabih) بن حجاج اور (۱۱) منبہ (Munabih) بن حجاج۔

یہ شیاطین بہت شدت سے صبح صادق کا انتظار کر رہے تھے جو جناب رسالت مآبؐ کا عموماً گھر سے نکلنے کا وقت ہوتا تھا۔ لیکن اس رات جناب رسالت مآبؐ آدھی رات کو ہی گھر سے ان شیاطین کی موجودگی میں نکل چکے تھے۔ آپؐ نے نکلتے وقت مٹھی بھر خاک ان کی طرف پھینکی اور وہ چند لمحوں کے لیے اندھے ہو گئے اور جناب رسالت مآبؐ ان کے سامنے سے اپنے راستے پر ہو لیے۔ علاوہ ازیں جناب رسالت مآبؐ سورۃ یٰس (۳۶) کی پہلی نو (۹) آیات تلاوت فرماتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوئے۔ جبکہ ان آیات کی آخری آیت میں اس واقعہ کا تذکرہ بھی مذکور ہے وہ یہ کہ: ''اور ہم (اللہ) نے ایک رکاوٹ کھڑی کر دی ان کے سامنے اور ایک ان کے پیچھے اور ہم (اللہ) نے ان کو ڈھانپ دیا اس لیے کہ وہ دیکھ ہی نہ سکیں''۔ (سبحان اللہ)

جناب رسول اللہ سیدھے جناب ابوبکر صدیقؓ کے گھر گئے اور وہاں سے انہوں نے یثرب کے لیے رخت سفر باندھا۔ کیونکہ جناب ابوبکرؓ نے پہلے سے ہی انتظام کیا ہوا تھا۔ اس بات کے باوجود کہ جناب رسول اللہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت، مدد اور راہبری باقاعدگی کے ساتھ مل رہی تھی، لیکن پھر بھی وہ نہایت چوکس تھے اور اپنی حکمت عملی بھی اختیار کیے ہوئے تھے۔ بے شک آپ کی حکمت بھی اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا انعام تھا۔ ان کی منزل حالانکہ مکہ کے شمال کی جانب تھی، لیکن وہ اس کے برعکس جنوب کی جانب غار ثور کی طرف چل دیے۔

دوسری جانب وہ گیارہ شیاطین رسول اللہ کے گھر سے باہر آنے کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ بڑے حیران ہوئے جب صبح ہونے تک رسول اللہ کو گھر سے نکلتا ہوا نہ دیکھ سکے۔ پھر انہوں نے جھنجھلاتے ہوئے گھر کا دروازہ توڑا اور اندر جا کے جھپٹا گئے، کیونکہ آپؐ کے بستر پر انہوں نے جناب علیؓ کو پایا۔ اس صورتحال نے تمام اہل قریش کو چراغ پا کر دیا اور انہوں نے اسی وقت جناب رسول اللہ کی تلاش میں سواروں کو دوڑا دیا اور آپؐ کو پکڑ کر لانے کا انعام ایک سو اونٹ رکھ دیا اور یہ کہ یہ قیمت چالیس ہزار ڈالر چاندی کے مساوی تھی۔

جناب رسالت مآبؐ اپنے ساتھی ابوبکرؓ کے ساتھ غار ثور میں قیام پذیر تھے۔ جناب عبداللہ

بن ابوبکرؓ رات کے وقت آپ سے ملاقات کرتے اور حالات حاضرہ سے آگاہ کرتے۔ اس کے علاوہ جناب صدیق اکبرؓ کا ملازم عامر بن فہیرہ اور آپ کا ایک چرواہا اپنے ریوڑ کو لے کر غار کے دھانے پر آ جاتا، اور اس طرح سے اپنے مالکوں کو دودھ فراہم کر جاتا، اسی طرح سے جناب عبداللہؓ کے آنے جانے کے نشانات بھی ریوڑ کی آمد سے مٹ جاتے۔

اہل قریش نے جناب علیؑ اور سیدہ اسماء بنت ابوبکرؓ سے جناب رسالت مآبؐ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے بدتمیزی بھی کی۔ جناب علیؑ کو کعبہ کے سامنے مارا پیٹا جبکہ سیدہ اسماء کو ابوجہل نے ان کے دروازے پر تھپڑ امارا۔ جو اشخاص آپؐ کی کھوج لگانے کے لیے نکلے ہوئے تھے وہ غار ثور کے دھانے تک بھی پہنچ گئے تھے۔ جس پر ابوبکرؓ نے خوف کا اظہار کیا لیکن جناب رسولؐ اللہ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا "خاموش رہو ابوبکر! تمہارا کیا خیال ہے؟ اور تم ان دو کے متعلق کیا سوچتے ہو جن کے ساتھ تیسرا اللہ بھی ہے"۔ سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۴۰) میں اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ: "اگر تم اس (محمدؐ) کی مدد نہ کرو گے (تو کوئی بات نہیں) اللہ نے تو بلاشبہ اس کی مدد کی جب (تم) کفاروں نے اسے باہر نکال دیا تھا۔ ان میں سے دوسرا، جب وہ دونوں غار میں تھے، اس (محمدؐ) نے کہا اپنے ساتھی سے کہ غمگین نہ ہو اور خوف نہ کھا، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر سکینت طاری فرما دی اور ان کو مضبوط کر دیا طاقت (فرشتوں کی) کے ساتھ جن کو تم نے نہیں دیکھا اور ان کے الفاظ (بیانات) نیچے کر دیے یعنی غلط کر دیے جو حق کو تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ جب کہ اللہ کے الفاظ اونچے یعنی سچ کر دکھائے گئے اور اللہ تمام عزت طاقتور اور سب سے زیادہ دانشمند ہے"۔

جناب ابوبکرؓ نے پہلے سے ہی دو تیز رفتار اونٹ اور ایک قابل رہبر عبداللہ بن اُریقِط کا انتظام کیا ہوا تھا، جو کہ ہنوز نا مسلم ہی تھا۔ اس کے علاوہ جناب ابوبکرؓ کے پاس پانچ تا چھ ہزار درہم بھی تھے۔ تین روز غار ثور میں قیام کے بعد وہ گائیڈ اونٹوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اور اسماء بنت ابوبکرؓ بھی زادِ راہ لے کر پہنچ گئیں۔ سفر شروع کرنے سے پہلے جناب رسولؐ اللہ نے ابو بکر صدیقؓ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اس اونٹنی کی قیمت وصول کر لیں جو آپؐ کے زیر استعمال آئی تھی۔ آپؐ نے اس کے عوض چار صد درہم جناب صدیقؓ کو پیش کیے۔ اس کے فوراً ہی بعد وہ اونٹنی ایک تاریخی حیثیت اختیار کر گئی اور اس خوش بخت کی شان و شوکت بھی بڑھ گئی اور اس کا نام

قسوہ رکھا گیا۔ قسوہ اس جانور کو کہتے تھے، جس کے کان کٹے ہوئے اور وہ نہایت تیز رفتار ہوتا تھا۔

گائیڈ نے اس بابرکت اور تاریخی قافلے کو غیر معروف راستے سے سفر کرایا جو سمندر کے کنارے کے ساتھ ساتھ طویل لیکن محفوظ راستہ تھا اور قبا کی طرف جاتا تھا جو یثرب شہر سے تقریباً چھ میل پہلے ایک گاؤں تھا۔

(۲۶) سُراقہ جناب رسالت مآبؐ کی تلاش میں

ایک شخص سراقہ بن مالک بن جشم کو جب اس چھوٹے سے انمول قافلے کے متعلق علم ہوا تو اس نے بھی انعام کے لالچ میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ایک صد اونٹوں کا انعام کوئی معمولی بات نہ تھی لہٰذا وہ ایک تیز رفتار گھوڑا حاصل کر کے اس مقصد کے لیے نکل کھڑا ہوا اور مدینہ کی راہ لی، اور جلد ہی ان معززین کے عزیزوں کو آلیا جبکہ آپ حضرات راستے میں طعام و استراحت کے لیے رکے ہوئے تھے۔ جب سراقہ نے آپؐ کی جانب دو مرتبہ اپنے تیر کا رخ کیا تو دونوں مرتبہ گھوڑے کے بدکنے سے وہ گر پڑا لیکن وہ اس بات کو نہ سمجھ سکا کہ مالک ارض و سما اسے اس کام سے روک رہا ہے۔ تیسری مرتبہ پھر جب اس نے اپنے تیر کا رخ ان کی طرف کیا تو گھوڑے نے اسے پھر نیچے گرا دیا تب اسے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اس کی نیت اس کام کے بارے میں صحیح نہیں۔ اس کے برعکس اس کی خوش بختی کی انتہا دیکھیے کہ جناب رسالت مآبؐ نے اسے دور سے ہی ایک خوشخبری سے باخبر کیا اور اسے کہا اے سراقہ! میں تیرے ہاتھ میں کسرہ (ایران کا بادشاہ) کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔ اس کے فوراً بعد سراقہ نے اپنے آپ کو جناب رسالت مآبؐ کے حضور پیش کر دیا اور عرض کیا کہ "مجھے لکھ کر معافی کا پروانہ عطا فرما دیں"۔ جناب رسالت مآبؐ کی یہ پیشگوئی آپؐ کے نائب دوئم جناب عمر بن خطابؓ کے دور خلافت میں پوری ہوئی اور ایران کی فتح کے بعد مال غنیمت میں سے شاہ ایران کے کنگن سراقہ کو ملے اور اس نے پہنے۔

(۲۷) مبارک قافلے کا اُمِ مَعبد کے پاس قیام

اس ویران صحرائی راستے پر اس مبارک قافلے کو ایک جھونپڑی نظر آئی، جہاں آپؐ نے مختصراً ٹھہرنا پسند فرمایا۔ وہ جھونپڑی ایک فراغ دل خاتون کی تھی جو راستے کے مسافروں کی

خدمت کرتی تھی۔ جب اس خاتون سے کچھ دودھ کی فرمائش کی گئی تو اس نے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا، کیونکہ اس کا بھیڑ بکریوں کا ریوڑ واپس گھر آنے کو ہی تھا۔ وہاں صرف ایک ہی بکری کھڑی تھی جو خاصی لاغر تھی اور دودھ بھی نہیں دیتی تھی ویسے بھی وہ زمانہ قحط زدہ تھا اور مویشیوں کو مشکل سے ہی کچھ کھانے کو ملتا تھا۔ بہرحال جناب رحمت دو عالمؐ نے اس خاتون کی اجازت سے اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک لیتے ہوئے اس بکری کے تھنوں کو ہاتھ لگایا تو بکری نے اچھا خاصا دودھ دے دیا۔ خاتون اس بابرکت معجزے پر حیران ہوئی لیکن اسے ہنوز یہ پتا نہیں چلا کہ اس کے سامنے جو شخص کھڑا ہے اور جس کی وجہ سے بکری نے دودھ دیا ہے وہ رحمت اللعالمین ہے اور اللہ کا پیارا اور آخری نبی ہے اور وہ زمانے کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ بہرحال اس خاتون کی خوش بختی کہ وہ بعدازاں یثرب میں ایک مسلمان خاتون کی حیثیت سے تشریف لائیں۔

(۲۸) خوش بختی کا قُبا پہنچنا

قافلہ رسالت آٹھ روز کی تھکا دینے والی مسافت کے بعد قبا کے مقام پر پہنچا، یہ مبارک اور تاریخی دن بروز پیر آٹھ ربیع الاول اور رسالت مبارک کا چودھواں سال بمطابق ۲۳ ستمبر ۶۲۲ عیسوی تاریخی مندرجات کے مطابق ہے۔ یہ دن اس لحاظ سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ اس دن کی مناسبت سے سن ہجری کا آغاز ہوا یعنی اس روز جناب رسول اللہؐ مدینہ النبی کی حدود میں داخل ہوئے اور اسی دن کی تاریخ کے اعتبار سے یکم محرم کو ہجری یعنی مسلمانوں کے سال کی ابتدا یعنی ۱-۱-۱ بعد از ہجرت کا تعین عمل میں لایا گیا۔ اس لیے جب ہم آٹھ (۸) ربیع الاول کو ہجری کو عیسوی میں تبدیل کرتے ہیں تو ریاضی کے حساب سے یہ اتوار کا دن ۱۹ ستمبر ۶۲۲ء کو بنتا ہے اور جب اس کے مخالف حساب لگائیں یعنی عیسوی کی تاریخ تو ار ۲۳ ستمبر ۶۲۲ کو ہجری میں تبدیل کریں تو یہ تاریخ ۱۲ ربیع الاول بروز جمعرات یکم ہجرہ بنتی ہے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ ریاضی کا یہ حساب اس طرح سے لگایا جاتا ہے کہ ہجری سال کی ابتدا ۱۶ جولائی ۶۲۲ء سے کی گئی ہے۔ لہٰذا صحیح تاریخ کا تعین اس حساب سے ۱۹ ستمبر ۶۲۲ء بمطابق ۸ ربیع الاول یکم ہجری ہوگا۔ یاد رہے کہ حساب میں ایک یا دو روز کا فرق آسکتا ہے۔

بہرحال صحرا کی گرم ہوا اور تپتی دھوپ میں جب یہ مبارک قافلہ قبا پہنچا تو گلیاں وبازار خالی،

کوئی شخص باہر نہ تھا سوائے ایک خوش نصیب کے جو یہودی تھا اور جسے اس قافلے کے آنے کی پہلے سے خبر تھی۔ جب اس نے دو حضرات کو سفید اونٹ پر بیٹھے دیکھا تو وہ قبا کی گلیوں میں بھاگتا ہوا یہ اعلان کرنے لگا کہ "اے یہودیو! خبردار ہو جاؤ تمہاری خوش بختی آرہی ہے (کیونکہ انھیں پیغمبر کی آمد کا شدت کے ساتھ انتظار تھا) اے عربو! تمہارا دادا آرہا ہے (یعنی تمہارا بڑا آرہا ہے)"۔

یہ اعلان سنتے ہی قبا کے لوگ مرد اور عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے کہ وہ اپنے راہبر کو خوش آمدید کہیں اور ان کا دیدار کریں جن کا وہ پہلے سے ہی نہایت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جناب رسالت مآبؐ اپنے ساتھی کے ساتھ کھجور کے درختوں کے سائے میں تشریف فرما ہو گئے۔ مسلمان اور یہودیوں میں سے ہر کوئی ان کے گرد جمع ہو گیا۔ ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، حالانکہ ابھی تک انھیں یہ علم نہ ہو سکا تھا کہ ان دونوں میں سے نبی علیہ السلام کون ہیں۔ جب جناب ابوبکرؓ نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تو آپ فوراً کھڑے ہوئے اور جناب رسالت مآبؐ کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور ایک کپڑے کا ٹکڑا لے کر آپؐ کے سر مبارک کے اوپر پھیلا دیا تاکہ آپؐ دھوپ کی تمازت سے بچ سکیں۔

جناب صدیقؓ کے اس عمل سے لوگوں نے پیغمبر علیہ السلام کو پہچان لیا اور پھر خوشی اور خوش آمدید کے نعرے گونجنے لگے۔ مسلمانوں نے نیا دور اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرتے ہوئے "اللہ اکبر" کے نعرے لگائے۔ وہ جگہ جہاں پر جناب رسالت مآب تشریف فرما تھے، وہ بنو عمر بن عوف کا محلہ تھا، جناب رسالت مآبؐ نے اس جگہ کے مالک سے اجازت چاہی کہ وہ اس جگہ پر رات بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک شخص کلثوم بن ہدم (جو قبیلہ عمر بن عوف کا سردار تھا) نے جناب رسالت مآبؐ سے التماس کیا کہ آپؐ اس کے گھر قیام فرمائیں۔ اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کے گھر میں کافی جگہ موجود ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے اس کی درخواست قبول فرمائی اور اپنے ساتھی کے ساتھ وہاں چار روز تک قیام فرمایا۔

اب یثرب کے لوگوں کو بھی آپؐ کی تشریف آوری کا پتا چل گیا۔ کیونکہ وہ بھی نہایت شدت سے آپؐ کا انتظار کر رہے تھے۔ یثرب سے پہلا شخص جو جناب رسالت مآبؐ کا استقبال کرنے کے لیے آیا، وہ جناب عمر بن خطابؓ تھے اور دوسری جناب علیؓ بھی مکہ سے تشریف لا چکے تھے۔ وہ جگہ جہاں جناب رسول اللہؐ قیام پذیر تھے عقیدت مندوں سے کچھا کھچ بھر جاتی تھی لہٰذا

وہاں کے ہی ایک مقامی سعد بن خیثمہ نے اپنا بڑا گھر آپؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ جو آپؐ نے قبول فرمایا لیکن شب گذاری کے لیے آپ کلثوم کے گھر ہی تشریف لائے۔

(۶۹) اللہ کے پہلے گھر کا قیام

قبا کی سرزمین کو یہ عظمت حاصل ہوئی کہ وہاں اللہ کے رسولؐ نے ہجرت کے بعد پہلے گھر کی تعمیر فرمائی جو آج کل مسجد قبا کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ مسجد عبادت کے علاوہ مسلمانوں کے سماجی اجتماع کے طور پر بھی استعمال کی جاتی تھی۔ بعد ازیں یہ مسجد دنیا کی تین مساجد کے بعد سب سے زیادہ محترم ہو گئی یعنی بیت الحرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور پھر مسجد قبا۔ اس مسجد کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ (۹) کی آیت (۱۰۸) میں فرمایا کہ "بے شک وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے تقویٰ پر رکھی گئی تھی اس کی مستحق ہے کہ تم اس کے اندر کھڑے ہو (عبادت کے لیے)"۔

اس کے علاوہ اس مسجد کے بارے میں رسولؐ اللہ کا قول مبارک جو مسجد کی اندرونی دیوار پر لکھا ہوا ہے یہ قول امام بخاری نے عبداللہ بن دینار کے حوالے سے بیان کیا ہے، کہ جناب ابن عمرؓ نے فرمایا کہ "جناب رسولؐ اللہ (مدینہ شریف سے) ہر ہفتہ کے روز مسجد قبا تشریف لے جاتے، کبھی پیدل اور کبھی سوار" اور عبداللہ بن عمر بھی اسی طرح کرتے۔ نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح کی احادیث قلمبند کی ہیں کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "جو کوئی بھی اپنے آپ کو پاک کرے اپنے گھر (یعنی وضو کرے) اور پھر مسجد قبا آئے اور اس میں نماز پڑھے تو اسے ایک عمرہ ادا کرنے کا ثواب ملے گا"۔

بہرحال اپنی آمد کے بعد تیسرے روز جناب رسالت مآب نے اس مسجد کی تعمیر کا فیصلہ فرمایا اور ایک مقامی صاحب نے اپنی زمین اس کام کے لیے پیش کی، غالباً وہ کلثوم بن حزم ہی تھے۔ لیکن جناب رسالت مآبؐ نے قیمت دینے پر اصرار کیا اور قیمت ادا فرمائی، لیکن قیمت کا اندراج کسی ریکارڈ سے نہیں ملتا۔ تمام مسلمانوں نے یعنی انصار و مہاجرین نے جناب رسول اللہؐ کے ساتھ مل کر اس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ مشہور انصاری شاعر جناب عبداللہ بن رواحہؓ جناب رسولؐ اللہ کی مدحت میں اپنے اشعار کہتے جاتے اور تعمیری کام میں لگن اور محبت سے تمام حضرات لگے رہتے۔ یثرب کے قبیلہ بنو نجار کے افراد جو جناب رسالت مآبؐ کے ننھیال والے تھے، وہ بھی قبا پہنچ گئے تا کہ جناب رسولؐ اللہ کو اپنی نگہبانی میں لے کر یثرب لے جائیں۔

(۷۰) یثرب شہرِ نبیؐ بن گیا

جیسے ہی جناب رسول اکرمؐ یثرب تشریف لائے یہ شہر "مدینۃ النبی" یعنی نبی کا شہر بن گیا۔ پھر لوگوں نے اسے "مدینۃ المنورہ" یعنی روشنی کا شہر بھی کہنا شروع کر دیا اور مختصراً "مدینہ" یعنی شہر کے نام سے مشہور ہوا۔ حالانکہ یثرب بھی اس کا اصلی نام نہیں ہے، اس کے اصل رہنے والے اسے "طیبہ" یعنی پاک یا اچھا کے معنی میں پکارتے تھے۔ کیونکہ صحرا اور بیابان میں ایک بہت بڑا نخلستان جہاں سبزہ اور باغات ہوں یقیناً وہ رہنے کے لیے بہترین جگہ ہوگی۔ مدینہ شریف کی سبزیاں، پھل اور خاص طور پر پودینہ اور گلاب کے پھول کافی مشہور ہیں۔ لیکن جب صحرا کے بدو یہاں آتے تو انہیں صحرا کے مقابلے میں کھانے کو بہت کچھ ملتا اور پھر وہ زیادہ کھا لینے کی وجہ سے بیمار ہو جاتے۔ اس کے علاوہ زرگل یعنی پھولوں کی وہ خاک جو تولید میں مدد دیتی ہے اور ہوا میں پھیل جاتی ہے، اس سے بھی کافی لوگ بیمار ہو جاتے تھے (یعنی Pollen سے Allergy)۔ لہٰذا وہ لوگ اس شہر کو اچھے نام سے یاد نہیں کرتے تھے اور یثرب کہتے تھے یعنی غیر آرام دہ، خراب شہر۔ اس وقت شہر کا رقبہ تقریباً تیس (۳۰) مربع کلومیٹر تھا۔ شہر سے باہر کے علاقے میں بہتر (۷۲) چھوٹے چھوٹے قلعے تھے جن میں انسٹھ (۵۹) یہودیوں کے تھے۔ اس کے شمالی علاقے میں اُحد کا پہاڑ ہے جبکہ جنوب میں شہر قبا اور کوہ عیر۔ اس کے مشرق، مغرب اور کچھ جنوبی حصے میں آتش فشانی لاوے کے پتھر بکھرے ہوئے تھے جو ابھی تک ہیں۔ شمالی علاقے میں یعنی اُحد کی طرف ایک سیلابی جھیل تھی جہاں رسالت مآبؐ نے بچپن میں تیرنا سیکھا تھا۔ شہر کے مکین عرب اور یہودی تھے۔ آبادی میں تقریباً برابر برابر۔ یہودیوں کے تین قبیلے یعنی بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع تھے اور عربوں کے دو، اوس اور خزرج۔

نسل یہودی وہاں کے اصلی باشندے نہیں تھے، وہ وہاں پر ۱۳۵ء عیسوی میں اس وقت آئے تھے، جب انہیں رومن بادشاہ ہارڈن نے ملک شام سے نکالا تھا۔ انہوں نے چونکہ مجبوراً ہجرت تو کر لی تھی چنانچہ اس علاقہ کو ان لوگوں نے اس لیے منتخب کیا کیونکہ ان کے عالموں نے انہیں بتایا کہ اس علاقے یعنی یثرب کے نواح میں ایک نبی کی آمد متوقع ہے۔ انہیں اس شہر کا تو علم نہ تھا بلکہ نبیؐ کے تشریف لانے کی جگہ کے متعلق جس طرح بیان کیا گیا تھا، یثرب کے گرد و نواح بالکل ویسے ہی تھے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ آنے والا نبیؐ انہی میں سے ہوگا یعنی نسل

یہود میں سے ہے۔ کیونکہ ابھی تک تمام نبیؑ جناب اسحاقؑ کی اولاد میں سے ہی تھے ابھی تک ان کے بھائی اسماعیلؑ کی اولاد سے کوئی نبی نہیں آیا تھا۔

یثرب کے عرب زیادہ تر غلہ بانی، کھیتی باڑی اور تجارت سے منسلک تھے۔ جبکہ وہاں کے اہل یہود زمیندار تھے، اس کے علاوہ وہ سونے، چاندی اور کھالوں کو کارآمد بنانے کا کام کرتے۔ عرب کے اوس اور خزرج اپنے قبائلی جھگڑوں میں عرصہ دراز سے الجھے ہوئے تھے اور آخر کار ان دونوں میں طے پایا کہ وہ اپنے انتظامی امور ٹھیک طور پر چلانے کی خاطر ایک بادشاہ منتخب کرلیں اور اس طرح انہوں نے باہمی رضامندی سے ایک شخص عبداللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ بنانے کے لیے منتخب کرلیا اور اس کے لیے سناروں کو سونے کا تاج بنانے کے لیے کہہ دیا۔ لیکن اس کی تاج پوشی کا عمل روک دیا گیا جب اہل مدینہ کو اس بات کا علم ہوا کہ نبی علیہ السلام ان کے پاس تشریف لا رہے ہیں اور جب آپؐ تشریف لائے تو اہل یثرب کو انہیں اپنا رہنما اور سربراہ بنانا زیادہ اچھا لگا اور اہل یہود بھی آپؐ کے آنے سے خوش تھے اور سمجھ رہے تھے کہ آپؐ بھی ان ہی کے مذہب کی تجدید کریں گے جس طرح سے عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیت کی تجدید کی تھی۔ کیونکہ عیسائیوں کی مذہبی قوانین اخذ کرنے کی کتاب تو ہنوز توریت ہی ہے جسے یہ اولڈ ٹیسٹامنٹ کہتے ہیں۔ یہودیوں کی اس سوچ کو اس وقت زیادہ تقویت ملی جب آپؐ نے قبا کی مسجد کا محراب اقصیٰ کی جانب رکھا۔ یعنی جس طرف وہ بھی رخ کرکے نماز پڑھتے تھے اور دوسرا یہ کہ قرآن نے پچھلے تمام انبیاء کا ذکر ان کی تعریف سے کیا۔ اب انہیں یقین کامل ہو گیا کہ جناب رسالت مآبؐ اہل یہود کا مذہب ہی لائیں گے۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا اور ہے کہ اہل یہود اللہ کی اعلیٰ مخلوق ہیں اور پیغمبر صرف انہی میں سے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے عقائد و خیالات کا ذکر جناب رسالت مآبؐ سے قبا میں کر دیا تھا، وہ یہ کہ آپؐ انہی کا مذہب اختیار کریں۔ یہ اہل یہود کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس بات کو سمجھ نہ سکے بلکہ انہوں نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی کہ جناب رسالت مآبؐ جو دین لے کر آئے ہیں، وہ کوئی نیا دین نہ تھا بلکہ وہ تو گذشتہ ادیان جو پہلے پیغمبر لے کر آئے تھے یعنی یہودیت اور عیسائیت وہ انہی مذاہب کی تجدید تھی۔ یعنی جیسے انسانی عقل اور معاشرے کی ارتقا ہوئی اور آئندہ ارتقا متوقع تھی، اللہ تعالیٰ نے اسی لحاظ سے اپنے بھیجے ہوئے پچھلے ادیان میں ارتقائی تبدیلی کرکے رسالت مآبؐ کو نبی مقرر فرمایا۔ اس لیے جناب

رسالت مآبؐ نے یہود کے خیالات اور تجویزات کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ از خود نبوت کے مرتبہ پر فائز نہیں ہوئے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشاء و حکم ہے اور وہ قوانین جو آپؐ لائے ہیں وہ بھی آپ کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔

پس اس بات کو جاننے کے بعد یہود دل برداشتہ ہو گئے، اور انہیں ایک مزید جھٹکا اس وقت لگا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ آپؐ نے اپنی ہفتہ وار عبادات کا دن بروز جمعہ رکھا ہے، جبکہ وہ بروز ہفتہ اپنی ہفتہ وار عبادات کرتے تھے۔ اب انہیں اس بات کی قطعی امید نہ رہی کہ یہ نبیؐ انہی میں سے ہوں گے یعنی انہی کے مذہب کی تجدید کریں گے۔ یہی بات ان کی بدبختی کا باعث بنی اور نتیجتاً ان میں سے کسی نے بھی اسلام قبول نہ کیا سوائے ایک خوش بخت کے جس نے جناب رسالت مآبؐ کی آمد پر خوشی خوشی بہت ہی پرجوش طریقے سے یہ اعلان کیا تھا کہ "اے یہودیو! تمہاری خوش بختی آگئی ہے"۔ لیکن یہ تمام تر خوش بختی صرف اسی نوجوان کے حصے آئی۔ یہ صرف چند دن کا ہی دور تھا کہ اہل یہود کے تعلقات جناب رسالت مآبؐ سے ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ انہوں نے اپنی خوش بختی کو ٹھکرا دیا اور جناب رسالت مآبؐ اور ان کے پیروکاروں کے دشمن بن گئے۔

(۱۷) شہر یثرب میں آمد رسولؐ

وہ بروز جمعہ (۲) بارہ ربیع الاول بمطابق ۲۳ ستمبر ۶۲۲ء کی پرنور صبح تھی کہ جناب رسالت مآب علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ جانب یثرب روانہ ہوئے۔ اس مبارک قافلہ کو جناب رسالت مآبؐ کے ماموں اور قبیلہ بنو نجار کے دیگر افراد اپنی حفاظت اور نگہبانی میں لے کر جا رہے تھے۔ راستے میں آپؐ بنو سالم کی وادی میں ٹھہرے تاکہ نماز جمعہ ادا کی جائے۔ جب یہ تاریخی قافلہ شہر یثرب میں داخل ہوا تو دختران یثرب خاص طور پر بنو نجار کی صاحبزادیاں و صاحبزادے اپنے نئے سردار، رہبر اور سربراہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے پہلے سے موجود تھے۔ جنہوں نے خوش آمدید کے ترانے گائے، اور اس طرح سے ہجرت کا یہ سفر نبویؐ تمام ہوا۔ جس کے بعد جناب رسالت مآبؐ کی زندگی کا نیا اور بہت اہم موڑ سامنے آگیا۔

اس کے بعد سے یثرب مدینۃ النبی بن گیا اہل یثرب اہل انصار بن گئے اور ہجرت کرنے والے مہاجر کہے جانے لگے انصار نے مہاجرین کو گلے لگایا اور ان سے اپنے بھائی اور بہنوں

جیسا سلوک کیا اور اپنے وسائل ان میں تقسیم کیے تاکہ ان کو ہر قسم کے مصائب سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ہر انصاری خواہ امیر یا غریب اس بات کا متمنی تھا کہ جناب رسالت مآبؐ کی کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی طرح سے کوئی خدمت کر سکے۔ ان کی اس توجہ اور خواہش کو دیکھتے ہوئے آپؐ نے بہت پیار اور محبت سے انہیں سمجھایا کہ وہ ان کی اونٹنی قصوہ کی باگیں چھوڑ دیں اور پھر فرمایا کہ "اسے اللہ کی طرف سے ہدایات مل رہی ہیں کہ اس نے کہاں رکنا ہے جہاں وہ ٹھہرے گی وہی میرے ٹھہرنے کی جگہ ہوگی"۔ قصوہ بدستور چلتی رہی، گلی گلی، کوچہ بکوچہ اور پھر بنو نجار کے محلے میں پہنچ گئی۔ وہاں جناب رسالت مآبؐ نے اس عمارت کو پہچان لیا جہاں عبدالمطلب کی والدہ رہتی تھیں۔

لوگوں کو گمان قوی ہو گیا کہ آپؐ یہیں اپنے ننھیال کے محلے میں ہی قیام پذیر ہو گئے۔ لیکن نہیں! قصوہ پھر بھی کافی دیر تک پھرتی رہی اور آخر کار ایک خالی میدان میں بیٹھ گئی، جو کھجوریں سکھانے کے کام آتا تھا۔ اس جگہ سے نزدیک ترین گھر ایک خوش قسمت انصاری خالد بن زید کا تھا، جو ابو ایوب انصاریؓ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

جناب رسالت مآبؐ نے دریافت فرمایا کہ وہ زمین جہاں قصوہ بیٹھی تھی کس کی ملکیت ہے؟ تو ایک شخص اسعد بن زرارہ نے بتایا کہ "یہ زمین دو یتیم بچوں کی ہے جو اس کی نگرانی میں رہتے ہیں"۔ اور اس کے ساتھ ہی ان بچوں کی طرف سے انہوں نے وہ زمین آپؐ کو پیش کر دی۔ آپؐ نے اس کی قیمت دریافت فرمائی تو پتا چلا کہ اس کی قیمت مبلغ سات (۷) دینار ہے۔ مزید پتا چلانے سے معلوم ہوا کہ یہ مناسب قیمت تھی، اس پر آپؐ نے اس زمین کے مبلغ دس (۱۰) دینار ادا کر دیے اور اس کے دوسرے ہی روز جناب رسول مقبولؐ نے اس زمین پر مسجد کی تعمیر شروع کر دی جو بعد از تعمیر مسجد نبویؐ کہلائی۔ موجودہ دور میں یعنی ۲۰۰۳ء میں اس مسجد کی اتنی توسیع ہو چکی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کے دور میں مدینہ شہر کا جو علاقہ تھا وہ پورے کا پورا مسجد نبویؐ کا حصہ بن چکا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس میدان کے نزدیک ترین گھر جناب ابو ایوب انصاریؓ کا تھا تو ان خوش نصیب کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انہوں نے خوشی کے ساتھ آگے بڑھ کر جناب رسول اللہؐ کو خوش آمدید کہا اور آپؐ کو اپنا مہمان بنایا، ایسا معزز ترین اور مبارک ترین مہمان جو ان کے گھر میں نہ کبھی پہلے اور نہ بعد میں آیا۔ آپؐ ان کے گھر اس شرط پر ٹھہرے کہ وہ کھانے کا

بندوبست از خود فرمائیں گے۔ مصنف کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ 1985ء میں یہ مبارک گھر دیکھ سکا۔ یہ گھر مسجد نبویؐ کے جنوب مشرق میں بقیع قبرستان کی طرف واقع تھا بعد ازاں وہ تمام کا تمام محلہ جس میں یہ گھر واقع تھا حکومت نے خرید کر گرا دیا اور مسجد نبویؐ کا حصہ بنا دیا۔

(۷۲) مسجد النبیؐ مسلمانوں کا پہلا دارالندوہ

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اپنی مدینہ آمد کے فوراً بعد جناب رسالت مآبؐ نے زمین کا وہ ٹکڑا خرید ا جہاں قصوہ بیٹھی تھی، اور پھر دوسرے ہی روز وہاں مسجد کی تعمیر شروع کر دی۔ یہ مسجد اس وقت تقریباً سات ماہ کی مدت میں مکمل ہوئی اس کی دیواریں پتھر اور اینٹوں سے اور چھت کھجور کے تنوں اور ٹہنیوں سے بنائی گئی اور اس کا محراب بیت المقدس کی طرف رکھا گیا۔ اس طرح اس جگہ تمام مسلمان مرد و خواتین و بچے اپنے مالک کی حضوری میں پیش ہونے کے لیے پانچ وقت ہر روز پیش ہوتے۔ یہاں اجتماعی طور پر عبادات کے علاوہ سماجی معاملات پر تبادلہ خیال بھی ہوتا اور جناب رسالت مآبؐ سے علم و دانش کی روشنی حاصل کرنے کا موقع بھی ملتا۔ چونکہ بہت سے مہاجرین کے لیے جو شب گزاری کے لیے جگہ میسر نہ تھی، لہٰذا مسجد کے صحن میں ایک بڑا سا چبوترہ بھی تعمیر کر دیا گیا، اور اس پر کھجور کے پتوں کی چھت بھی ڈال دی گئی۔ چنانچہ یہ چبوترہ ایک تو ان لوگوں کے استعمال میں تھا جنہیں اور کوئی جگہ میسر نہ تھی اور دوسرے وہ حضرات وہاں قیام پذیر ہوتے جنہیں ہمہ وقت شوق ہوتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ جناب رسول اللہؐ سے علم کی روشنی حاصل کر سکیں۔ یہ حضرات اپنی مالی حیثیت کے اعتبار سے غریب ترین لیکن علم کا خزانہ حاصل کر کے امیر ترین بن گئے۔ اس طرح سے گارے اور اینٹوں کا یہ چبوترہ مسلمانوں کی پہلی تعلیمی درسگاہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ بے شک مسجد النبیؐ اس وقت سے آج تک مسلمانوں کی علمی اور روحانی درسگاہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر مسلمان جو وہاں جاتا ہے اس روشنی سے فیض یاب ہو کر آتا ہے۔ متذکرہ چبوترہ آج تک مسجد میں قائم ہے اور صفّہ کے نام سے جانا جاتا ہے اس کے بہت سے مطلب نکلتے ہیں یعنی "صوفیوں کے بیٹھنے کی جگہ" یا "روشنی کی جگہ" یا "غریبوں کی جگہ"۔

یہ بات یہاں بتا دینا ضروری ہے کہ یہ درسگاہ اب عملی طور پر وہاں سے منتقل ہو کر باقاعدہ ایک مکمل درسگاہ کے طور پر آباد ہو چکی ہے اور اس کا نام "مدینہ یونیورسٹی" ہے۔ تقریباً گزشتہ

پچاس برس سے یہاں دنیا کے کونے کونے سے علم کے پروانے آکر فیض یاب ہو رہے ہیں لیکن وہ چبوترہ ویسے ہی اپنی یادیں لیے کھڑا ہے اور منبع نور ہے۔

(۷۳) جناب رسالت مآبؐ کا پہلا خطبہ جمعہ

جناب رسالت مآبؐ نے مکہ میں اپنی نبوت کے تیرہ برس مکمل کیے لیکن وہاں اجتماع جمعہ منعقد کرنا ممکن نہ ہو سکا بلکہ وہاں باقاعدہ نماز با جماعت بھی منعقد نہ ہوئی اور اذان کا تو اجرا ہی نہ ہوا تھا۔ لہٰذا مدینہ آنے کے بعد بلکہ قبا سے مدینہ تشریف لاتے ہوئے مورخہ ۲ ربیع الاول یکم ہجری بمقام وادی بنو سالم آپ نے اپنے ساتھیوں سمیت نماز جمعہ پہلی مرتبہ منعقد فرمائی اور اپنے عوام سے خطاب فرمایا۔ بلاشبہ یہ ایک تاریخی خطبہ تھا، عقل و دانش و بصیرت سے بھرپور جس پر توجہ کی آج بہت ضرورت ہے۔ امام ابن کثیرؒ کے مطابق عزت مآب جناب رسولؐ اللہ کے خطاب کا مکمل متن درج ذیل ہے:

”تمام حمد و تعریفیں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ کے لیے ہیں۔ میں اس کے نام کی عظمت بیان کرتا ہوں، اور اس کی تعریف کرتا ہوں، میں اس کی مدد چاہتا ہوں، اس سے معافی چاہتا ہوں اور اس کی ہدایت کا خواستگار ہوں۔ میں صرف اس کی ذات کی وحدانیت کا قائل ہوں، اس کے وجود، اس کی طاقت اور اس کی صفات، غرض کہ کسی چیز میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ میں نے کبھی بھی اس کی نافرمانی نہیں کی بلکہ میں پسند نہیں کرتا اور نفرت کرتا ہوں اس کی نافرمانی کرنے سے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے سوائے اللہ کے، وہ ہی صرف واحد اور احد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اس کا غلام اور پیغمبر ہے۔ صرف اسی نے محمدؐ کو بھیجا دانش کے نور کے ساتھ انسانوں کے لیے، نبوت کے کافی لمبے عرصے کے بعد، اندھیرے کے دور میں جبکہ علم و دانش کا فقدان ہے اور لوگ سچائی سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اس کو بھیجا گیا اس دور میں جبکہ دنیا اپنے انجام پر پہنچنے والی ہے، اب جو کوئی بھی تابعداری کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف، وہی کامیاب ہے اور جو کوئی بھی پیچھے رہ جاتا ہے تابعداری کرنے میں، وہ گمراہ ہو گیا، بھٹک گیا اور اس نے گرا لیا اپنے آپ کو انسان کے مرتبے اور حیثیت سے۔

اے مسلمانو! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کی ہدایت پر عمل کرتے رہو، ایک مسلمان کے لیے سب سے اچھی نصیحت یہ ہے کہ دوسرا مسلمان اسے آخرت کی یاد دلائے اور اسے اللہ سے ڈرائے۔

اے لوگو! خبردار محتاط ہو جاؤ اور منکرات سے منع ہو جاؤ۔ تم اس سے اچھی نصیحت یا ذکر نہ پاؤ گے۔

یاد رکھو! کہ اللہ کا تقویٰ سب سے اچھی چیز ہوگی تمہارے لیے آخرت میں۔ تقویٰ ہمیشہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے خلوص اور تابعداری کی طرف لے جاتا ہے۔ تمہارے اعمال جو تقویٰ کے تحت کیے ہوں گے، قیامت کے دن تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہوں گے اور برخلاف اس کے انسان اپنے اعمال سے بیزار ہوگا اور ان سے دور بھاگے گا۔ اللہ فرماتا ہے کہ وہ اپنے حکم کو نہیں بدلتا اور وہ اپنے بندوں کے لیے ظالم نہیں ہے۔ اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو اپنے موجودہ اور آئندہ، ظاہری و باطنی اعمال کے سلسلے میں۔ کیونکہ ایسا شخص جسے اللہ کا خوف لاحق ہوگا وہ اپنے گناہوں میں کمی پائے گا اور نیکیوں میں زیادتی پائے گا، اپنے تقوے کی بنا پر۔ اللہ سے ڈرنے والے لوگ اپنے اعلیٰ مقصد کو پا لیں گے اور اللہ کے غصہ سے اور اس کی سزا سے بہت دور ہو جائیں گے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو انسان کے چہرے کو پرنور کر دیتا ہے اور اللہ کے راضی ہونے کا سبب بنتا ہے جو اس کی حیثیت کو بلند فرماتا ہے۔

اے مسلمانو! اپنے آپ کو مشقت اور تکلیف میں ڈالو لیکن اللہ کے فرائض سے غفلت مت برتو۔ اللہ نے تمہیں اپنی کتاب سکھائی اور تمہیں صراط مستقیم دکھایا۔ سچے اور جھوٹے لوگ علیحدہ علیحدہ کر دیے جائیں گے جزا اور سزا کے لیے قیامت کے دن۔

اے لوگو! اللہ نے تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے، سو تمہیں بھی دوسرے لوگوں کے سات اچھا سلوک روا رکھنا چاہیے۔ وہ جو اللہ کے دشمن ہیں، ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو اور اپنی طرف سے اپنی عقل اور قابلیت کو استعمال کرتے ہوئے انتھک کوشش کرو کہ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چل سکو۔ اس نے تمہیں عظمت عطا فرمائی ہے، انسان بنا کر اور پھر مسلمان بنا کر۔ اس لیے کہ تم اچھی زندگی گزار سکو اور تمہاری زندگی کا اچھا انجام ہو۔ صرف اللہ کی مدد سے ہی تم اچھائیاں حاصل کر سکتے ہو۔

اے لوگو! اللہ کو یاد کرو (ذکر کے ساتھ) اور اپنے آپ کو تیار رکھو آنے والی آخرت کے

لیے۔ جو کوئی بھی اللہ سے اپنے تعلقات استوار کرے گا اللہ اس کے معاملات دوسروں کے ساتھ استوار فرما دے گا۔ صرف اللہ ہی اپنے بندوں کو ہدایت عطا فرماتا ہے اور دوسرا اور کوئی یہ کام نہیں کرسکتا۔ صرف اللہ ہی اکیلا مالک ہے (ہر شے کا) اور دوسرا اور کوئی نہیں ہوسکتا (مالک، اللہ کی بادشاہت میں)۔ صرف اللہ ہی سب سے بڑا ہے اور ہم صرف اسی سے مدد چاہتے ہیں اچھا بننے کے لیے اور اچھائی کرنے کے لیے جو بہت ہی رحم کرنے والا مہربان ہے"۔

(۷۴) جناب رسالت مآبؐ کا شہر مدینہ میں پہلا خطبہ

جناب رسالت مآبؐ مدینہ تشریف فرما ہوئے تو آپؐ نے اپنے پیروکاروں کو اپنے مالک کی حمد وثنا کے بعد خطاب فرمایا۔ امام ابن کثیرؒ کے مطابق اس خطاب کا مختصر ترجمہ درج ذیل ہے:

"اے لوگو! آخرت کے لیے اپنے اچھے اعمال آگے بھیجو۔ اللہ کی قسم! تم میں سے ہر ایک کو وہ دن دیکھنا پڑے گا جو آنے والا ہے۔ جس روز تم میں سے ہر کوئی بیہوش ہو کر گر پڑے گا اور مویشیوں کے گلے ان کے چرواہوں کے بغیر ہوں گے پھر ہر شخص سے سوال کیا جائے گا، اس کے رب کی طرف سے بلاواسطہ، کہ کیا میرا رسول تمہارے پاس نہیں آیا تھا۔ میں نے تمہیں عطا کی تھیں اپنی مہربانیاں اور رحمتیں، وسائل اور نعمتیں مجھے، بتاؤ کہ تم نے اپنے لیے اس دن کے لیے کیا بھیجا ہے؟ تو پھر وہ اشخاص اپنی آنکھوں کو دائیں بائیں گھمائیں گے اور انہیں اپنے لیے کوئی اچھا عمل نظر نہ آئیگا، سوائے جہنم کی آگ کے۔ پس جناب رسولؐ اللہ نے انہیں نصیحت فرمائی کہ اپنے لیے کچھ بچائیں خیرات وصدقات کے ذریعے سے کوئی بات نہیں کہ اگرچہ صدقے کی مقدار آدھی کھجور ہی کیوں نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اتنا ہی غریب ہو کہ وہ آدھی کھجور بھی خیرات نہ کرسکتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کو کوئی اچھی بات ہی بتادے اور اگر وہ یہ بھی کرنے کے قابل نہیں تو وہ اپنے بھائی کو خوش کرنے کے لیے مسکرا ہی دے۔ بے شک ایک نیکی اس کے لیے اس سے سات صد تک نیکیوں کے ثواب لاسکتی ہے۔ اللہ کی رحمتیں ہوں تم پر اور اللہ کے رسولؐ پر اور اللہ کی برکتیں اور مدد ہو تمہارے لیے۔

اس کے تھوڑے توقف کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: "سب سے اچھے اور اعلیٰ الفاظ صرف اللہ ہی کے الفاظ ہیں، اور کامیاب شخص وہ ہے جسکو ایمان عطا ہو جائے اور اس

کا ذہن منکرات سے بالکل خالی ہو۔ بے شک قرآن بہترین کلام ہے اور بہت ہی زیادہ جامع اور مطلب سے بھرپور۔ جو کوئی بھی اللہ کا دوست رہے اسی کا دوست رہے۔ اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ اللہ سے محبت کرے۔ اللہ کے کلام سے نہ تو بیزار ہونا اور نہ ہی تھکنا، اور اللہ کے ذکر سے بھی۔ اور اپنے قلوب کو اس بات کے لیے سخت نہ کرنا۔ صرف اللہ واحد و احد کی ہی عبادت کرنا اور کسی کو بھی اس کا شریک نہ بنانا، اور اللہ سے ڈرو جیسا کہ تمہیں اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ جب بھی تم کوئی سچی بات کرو تو اسے اپنے لیے بھی اختیار کرو۔ صرف اسی بات سے ثابت ہوگا کہ تم سچے ہو۔ تمہیں چاہیے کہ اللہ کے فضل وکرم سے تم ایک دوسرے سے محبت سے پیش آؤ۔ یاد رکھو! کہ اللہ سے عہد شکنی اسے غضبناک کر دیتی ہے۔ تم پر سلامتی ہو اور فضل اور مہربانیاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے"۔

(۷۵) انصار اور مہاجرین کا شریک وسائل ہونا

قریش مہاجرین کے ساتھ کچھ اور قبائل بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے جو اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ چلے آئے، ان کے پاس گذر و بسر کے کوئی وسائل نہ تھے۔ لہٰذا جناب رسالت مآبؐ نے اہل مدینہ کو نصیحت فرمائی کہ ہر ایک فرد اہل انصار میں سے اپنے وسائل کو ایک مہاجر بھائی کے ساتھ بانٹ لے۔ چنانچہ اس واقعہ نے تاریخ میں اور معاشرے میں ایک منفرد اور انوکھی مثال قائم کردی کہ کسی بھی معاشرے نے رنگ ونسل و معاشرتی اونچ نیچ کو ختم کرتے ہوئے صرف اخلاقیات اور پرہیزگاری کی بنیاد پر اور اپنے اللہ کو خوش کرنے کی غرض سے اپنے وسائل ایک دوسرے کے ساتھ تقسیم کرتے ہوئے مسلم بھائی چارے کی بنیاد رکھی۔

اس طرح سے (۱۸۶) انصار گھرانوں نے اپنے وسائل کو اتنے ہی مہاجر گھروں کے ساتھ تقسیم کیا۔ اہل انصار کا یہ بھائی چارے کا عمل اور مہمان نوازی اور مہاجرین کا گھر بار کو قربان کرنے کا عمل اللہ تعالیٰ نے بہت پسند فرمایا اور اس کا ذکر قرآن کی سورۃ انفال (۸) آیت (۷۴) میں بیان فرمایا "اور وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں بہت جد وجہد کی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی جنہوں نے (انہیں) پناہ دی اور ان کی مدد کی، وہی لوگ حقیقت میں ایمان والے ہیں، ان کے لیے بخشش اور بہترین رزق ہے"۔

سماجی اکائی کے اس بندوبست کے بعد جناب رسول اللہؐ نے مہاجرین کو نصیحت فرمائی کہ وہ اپنا ایک روز مسجد کی تعمیر میں صرف کریں اور دوسرا دن اپنی روزی کمانے میں صرف کریں۔ جناب رسالت مآبؐ نے اپنے ساتھ جناب علیؑ کو شامل کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک روز آپؐ خود مسجد کی تعمیر میں حصہ لیں گے اور علیؑ روزی کمائیں گے جبکہ دوسرے روز علیؑ تعمیر میں حصہ لیں گے اور آپؐ خود روزی کمائیں گے۔ لیکن جناب علیؑ نے اس بات پر اصرار کیا کہ روزی کمانے کے لیے وہ خود ہی مصروف رہیں گے اور جناب رسول اللہؐ کو ہمہ وقت قوم کی رہبری کے لیے ہی وقت مختص رکھنا چاہیے۔ اس طرح سے جناب علیؑ نے پانی بھرنے کی مزدوری اختیار کی اور پورے دن کی انتھک مشقت کے بعد سولہ مشکیزے پانی بھر پاتے اور انھیں ایک مشکیزے کی اجرت صرف ایک عدد کھجور ملتی۔ اس طرح سے وہ آٹھ کھجوریں اپنے پاس اور آٹھ کھجوریں جناب رسالت مآبؐ کی خدمت میں پیش کرتے اور یہی کچھ اس معزز گھرانے کی گذر بسر کے کام آتا۔

(۷۶) مہاجرین کے گھرانوں کو مدینہ لانا

اس دوران جبکہ مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی، جناب رسول اللہؐ نے اپنی رہائش کے لیے مسجد کے بائیں طرف اس طرح سے بندوبست فرمایا کہ آپ کی رہائش گاہ اور مسجد کی دیوار ایک ہی رہی۔ دو کمرے جو اس وقت بنائے گئے تھے، ابھی تک موجود ہیں ایک کمرے میں ہنوز جناب رسالت مآبؐ کی آرام گاہ ہے اور آپؐ کے ساتھ دو نائبین جناب ابوبکر صدیقؓ اور جناب عمر فاروقؓ بھی آرام فرما ہیں۔ وہ سیدہ عائشہؓ کی رہائش گاہ تھی جہاں رسالت مآبؐ بھی رہائش پذیر ہوتے تھے۔ اور اس کے ساتھ والا کمرہ جناب علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کے زیر استعمال تھا، اس رہائش گاہ میں سیدہؑ کی پتھر کی چکی اس کمرے کی جالی سے نظر آتی تھی اور مصنف کو اسے دیکھنے کا موقع 1985ء میں ملا تھا۔

بہر حال جناب رسول اللہؐ نے اپنے اور دیگر مہاجرین کے افراد خانہ کو مکہ سے مدینہ لانے کی تدبیر فرمائی۔ اس غرض سے آپؐ جناب ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ منڈی تشریف لے گئے اور تین عدد اونٹ خرید فرمائے جس کی رقم جناب ابوبکرؓ نے ادا کی جبکہ دو اونٹ آپ کے پاس پہلے ہی سے موجود تھے جن پر آپ مکہ سے تشریف لائے تھے۔ پھر جناب رسول اللہؐ نے جناب علیؑ

اور جناب زید بن حارثہؓ کو حکم دیا کہ وہ ان پانچوں اونٹوں کو استعمال میں لاتے ہوئے جناب رسالت مآبؐ کے گھرانے کو مدینہ لے آئیں۔ یہ ریکارڈ میں لانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جناب رسالت مآبؐ کے گھرانے میں شامل افراد کا ذکر کیا جائے، ان میں سیدہ عائشہؓ جو ہنوز اپنے والد کے گھر ہی میں مقیم تھیں، سیدہ سودہؓ، سیدہ ام کلثومؓ، سیدہ فاطمہؑ، ام ایمنؓ جو زید بن حارث کی زوجہ تھیں اور ان دونوں کا فرزند جناب اسامہؓ جن کی عمر اس وقت تقریباً سات برس تھی۔ ان کے علاوہ دو دختران پیغمبرؐ یعنی سیدہ زینبؓ جو مکہ میں ہی رہیں، اپنے شوہر ابوالعاص کے پاس، اور دوسری سیدہ رقیہؓ جو جناب عثمانؓ کے ساتھ مدینہ شریف میں ہی تھیں۔ ابوالعاص چونکہ اس وقت تک ایمان نہ لائے تھے اس لیے سیدہ زینبؓ نہ آسکیں، جو بعد میں جنگ بدر کے بعد تشریف لائیں۔ جب خاندان نبی علیہ السلام مدینہ میں آپہنچے تو وہ اونٹ بقیہ مسلمان خاندانوں کو لانے کے لیے کام میں لائے گئے۔

(۷۷) پہلا آئینی مسودہ جو جناب رسول اللہؐ نے رقم کرایا

جیسے ہی مدینہ کا سماجی، معاشرتی و مذہبی تہذیب سے ہم آہنگ ایک گروہ جناب رسالت مآبؐ کی زیر نگرانی عمل پذیر ہوا تو مدینہ خود بخود ایک مسلم مملکت کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے انتظامی سربراہ کی حیثیت خود بخود جناب رسالت مآبؐ کے پاس آگئی۔ اب اس نئی ریاست کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے بنیادی قوانین کی ضرورت تھی۔ لہٰذا جناب رسول اللہؐ نے ایک دستاویز تحریر کروائی جس کے ذریعے سے ایک نئی قوم کو باہم قانونی زنجیر میں باندھ دیا گیا اور یہ گروہ مسلمانوں میں سے ایک طرف تو انصار، مہاجرین اور یہود کے ساتھ مل کر بنتی تھی اور دوسری طرف عمومی حیثیت سے مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کے درمیان تعلقات کی بنا پر مبنی ہے۔ اس دستاویز کے (۵۳) ترپن نکات تھے اُن میں سے (۲۵) پچیس مسلمانوں کے لیے اور (۲۲) بائیس اہل یہود اور کفار کے لیے اور باقی مشترک تھے۔ یہ دستاویز پہلی ہجری یعنی ۶۲۲ء کو تحریر کی گئی، مسجد نبوی کی تعمیر کے فوراً بعد۔ مکمل متن اس دستاویز کا درج ذیل ہے

اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا نہایت مہربان ہے

یہ دستاویز محمدؐ نبی اللہ کی جانب سے ہے، مومنین و مسلمین کے درمیان جو قریش اور اہل

یثرب میں سے ایمان والے اور اطاعت گزار ہیں، نیز ان لوگوں کے درمیان جو ان کے تابع ہو سکیں یا ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ مل کر اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے۔

۱) اسکے بعد وہ امت واحد ہو سکے دوسروں کے مقابلہ میں۔ (یعنی واحد امت ہے مسلم بغیر کسی تفریق کے)

۲) قریش کے مہاجرین قصاص کی رقم اور اپنے قیدیوں کا فدیہ از خود ادا کریں گے۔ اپنے لوگوں کے لیے اپنے دستور کے مطابق۔ اس لیے کہ ایمان والوں کا برتاؤ اور ان کے معاملات انصاف اور مہربانی پر مشتمل ہونے چاہییں۔

۳تا۱۰) یہی ان تمام قبائل پر یکساں لاگو ہے:۔ یعنی بنو عوف، بنو حارث، بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو نجار، بنو عمرو بن عوف، بنو نبیط۔ بنو عوف کے افراد اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ اپنے اپنے قبیلے کے رواج کے مطابق خون بہا اور فدیے کا معاوضہ ادا کریں گے اس لیے کہ ان کے معاملات اور برتاؤ انصاف اور رحم کی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔

۱۱) ایمان والے ان غریب افراد کو نظر انداز نہیں کریں گے جو قصاص اور فدیہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہو سکے بلکہ اس کی ادائیگی میں ان کی مدد کریں گے۔

۱۲) ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی مرضی کے سوا اس کی آزادی سلب نہیں کرے گا۔

۱۳) ایک مسلمان جو تقویٰ کی بھی اختیار کر چکا ہو وہ حملہ آوروں یا فساد برپا کرنے والوں یا ناانصافی کرنے والوں کے خلاف رہے گا۔ بلکہ تمام مسلمان ایسے اشخاص کے خلاف اکٹھے ہو کر اس کے خلاف کاروائی کریں گے، چاہے ایسا شخص ان ہی میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۴) ایک مسلمان کسی مسلمان کو ایک کافر کی خاطر قتل نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ اس کے خلاف کسی غیر مسلم کو کوئی مدد فراہم کرے گا۔

۱۵) اللہ کا ذمہ سب کے لیے ہے مسلمانوں میں سے کسی ادنیٰ ترین نے بھی کسی کو اگر پناہ دی ہوگی تو تمام مسلمان اس کے لیے پابند ہو سکے۔ مسلمان آپس میں بھائیوں جیسے ہیں اور دوسروں کے خلاف بھی بھائیوں کی طرح سے ایک ہو سکے۔

۱۶) یہودیوں میں سے جو ان کی پیروی کریں گے (سماجی یا انتظامی امور میں) وہ بھی مدد اور

برابری کے حقدار ہوں گے مسلمانوں کی طرف سے ان کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہ ہوگی اور ان کے کسی بھی دشمن کو مسلمان کسی طور پر مدد فراہم نہیں کریں گے۔

۱۷) مسلمانوں کی طرف سے صلح ایک ہی ہوگی اور کوئی اس میں اختلاف نہیں کرے گا، دشمن سے حالت جنگ میں، مسلمانوں میں سے کوئی شخص یا گروہ صلح نہیں کرے گا دوسرے مسلمانوں کے بغیر جب تک کہ تمام مسلمانوں کے لیے یکساں امن حاصل نہ ہو جائے۔

۱۸) تمام امن کے معاہدوں میں سب کے لیے شرائط ایک جیسی منصفانہ اور مناسب ہوں گی۔

۱۹) لڑائی کے موقع پر تمام گروہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ایک دوسرے کو استراحت کا موقع بھی بہم پہنچائیں گے۔

۲۰) مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خون کا بدلہ لینا ہوگا جو انہوں نے اللہ کے نام پر بہایا ہوگا، بے شک اللہ سے ڈرنے والے لوگ ہی صحیح راستے پر ہیں اور سب سے اچھے ہیں۔

۲۱) کوئی بھی مشرک، قریش کے جان و مال کو پناہ نہ دے گا اور نہ ہی وہ اس معاملہ میں کسی مسلمان کے آڑے آئے گا۔

۲۲) جب بغیر کسی جائز وجہ کے کسی مسلمان کو قتل کیا جائے گا تو قاتل کو قتل کر دیا جائے گا۔ الا اس کے کہ مقتول کا وارث قصاص لے کر راضی نہ ہو جائے۔ بصورت دیگر تمام مسلمان مقتول کا بدلہ لینے کے پابند ہوں گے۔

۲۳) کوئی بھی مسلمان جو اس دستاویز سے متفق ہو چکا ہے اور وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان بھی لا چکا ہے اس سے یہ توقع نہیں کی جائے گی کہ وہ قانون شکنی کرے، کہ وہ کسی فساد پھیلانے والے شرارتی کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔ اور جو کوئی بھی ایسا کرے گا اس پر اللہ کی لعنت ہوگی اور اللہ کا غضب قیامت کے روز اور اس سے کوئی بھی فدیہ یا بدلہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

۲۴) کسی بھی قسم کے اختلاف کے موقع پر وہ معاملہ اللہ اور محمدؐ کے پاس رجوع کیا جائے گا، اس معاملے کے حتمی فیصلے کے سلسلے میں۔

۲۵) اہل یہود بھی جنگ کے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالیں گے جب تک کہ وہ لڑائی میں مسلمانوں کے شریک ہوں گے۔

۲۴) بنو عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی معاشرتی قوم میں سے ہوں گے لیکن دین کے معاملہ میں وہ اپنے ہی مذہب پر رہیں گے البتہ وہ جو کسی ظلم یا جرم میں ملوث ہوں گے تو وہ اپنے اعمال کے معاملے میں بذاتِ خود یا ان کے گھر والے ہی ملوث سمجھے جائیں گے اور کوئی دوسرا ذمہ دار نہ ہوگا۔

۲۷ تا ۳۵) شق نمبر (۲۴) اسی طرح سے لاگو ہوگی مندرجہ ذیل یہودیوں کے قبائل پر: بنو نجار، بنو حارث، بنو سیدہ، بنو جشم، بنو عوف، بنو ثعلبہ، بنو شطبہ، خاندان ثعلبہ اور بنو شطیبہ۔

۳۶) وفاداری حفاظت کی حقدار ہوگی غداری کے مقابلے میں۔ ثعلبہ کے آزاد اشخاص اور غلام اپنے اپنے معاملات کے ذمہ دار ہوں گے۔

۳۷) کوئی بھی مسلمان جناب محمد رسول اللہؐ کی اجازت کے بغیر جنگ پر نہیں جائے گا لیکن اپنے ذاتی زخم کا بدلہ لینے کے لیے وہ آزاد ہوگا۔

۳۸) اور جو کسی کو بغیر تنبیہ کے قتل کرے گا، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالے گا اور اپنے مال اسباب کو، اگر وہ اکیلا ہو جس نے اس کے ساتھ غلط کام کیا تو اللہ مظلوم کے ساتھ ہے۔

۳۹) یہود کو خود اپنے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے اور مسلمانوں کو خود اپنے۔

۴۰) جو کوئی اس دستاویز کو قبول کرنے والے لوگوں کے ساتھ جنگ کرے تو وہ (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

۴۱) وہ (یہودی اور مسلمانوں) ایک دوسرے سے باہم مشورہ کریں گے اور عہد شکنی نہیں کریں گے۔

۴۲) کوئی شخص اپنے حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

۴۳) مظلوم کی ہر حال میں مدد کی جائے گی۔

۴۴) اس دستاویز کے لوگوں کے لیے وادی یثرب محترم اور مقدس رہے گی۔

۴۵) اہل یہود اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ اخراجات برداشت کریں گے جب تک کہ کوئی جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔

۴۶) کوئی بھی اجنبی جسے پناہ دی گئی ہو اس کی حیثیت ایسی ہی ہوگی جیسی کہ پناہ دینے والے کی ہے، جب تک کہ وہ کوئی جرم نہیں کرتا۔

۴۷) کسی خاتون کو اس کے گھر والوں کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائیگی۔

۴۸) اہل قریش اور ان کے مددگاروں کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

۴۹) اس دستاویز کے فریق (مسلمان اور یہود) ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند ہوں گے اگر یثرب پر کوئی حملہ ہو جائے۔

۵۰) اگر انہیں صلح اور امن کی دعوت دی جائے تو انہیں قبول کرنا ہوگا (یہودیوں کو) اور اگر مسلمانوں کو کہا جائے گا تو وہ بھی اس کے پابند ہوں گے بجز اس کے کہ وہ جہاد نہ ہو۔

۵۱) ہر شخص کے حصے میں صرف اس کی مدافعت آئیگی جو اس کے مقابلہ پر ہوگا۔

۵۲) اوس کے یہودیوں کو خواہ مالک ہوں یا غلام وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستاویز کے ماننے والوں کو حاصل ہیں۔ یہ دستاویز کسی ظالم یا مجرم کو مدد نہ دے گی، جو شخص جنگ کے لیے نکلے گا یا جو گھر میں بیٹھا رہے گا وہ دونوں امن کے مستحق ہوں گے۔

۵۳) اللہ اس شخص کا حامی ہے جو عہد و اقرار پورا کرتا ہے اور اللہ کے رسولؐ بھی۔ اور اللہ اس دستاویز کو منظور فرماتا ہے اور یہ دستاویز ظالم اور گنہگاروں کو تحفظ نہیں دے گی۔

(۷۸) میثاق مدینہ کا ماحاصل

یہ میثاق دنیا کا پہلا تحریری دستور مانا گیا ہے جس کے ذریعے سماجی، معاشی اور سیاسی، اس کے علاوہ مذہبی اعتبار سے انقلابی تبدیلیاں معاشرے میں رونما ہوئیں۔ مدینہ کو ایک ریاست کا درجہ ملا اور جناب رسالت مآبؐ اس نئی مملکت کے سربراہ ٹھہرے۔ معاشرے کو مذہبی اعتبار سے ایک ہی قانون کے تحت مملکت کا شہری تسلیم کیا گیا اور برابری کی بنیاد پر ان کے حقوق تسلیم کیے گئے اور مسلمانوں، یہودیوں اور کفار کی سماجی طور پر حد بندی کی گئی۔ بنیادی طور پر مندرجہ ذیل اثرات نمایاں طور پر ظاہر ہوئے۔

ا) حقوق اور ذمہ داریوں کو واضح طور پر مسلمان اور دیگر مذاہب کے درمیان بیان کیا گیا تاکہ نئی مملکت اسلامیہ کا انتظام احسن طور پر چل سکے۔

ب) مدینہ شہر اور اس کے نواح کو نئی مملکت کا حصہ بتلایا گیا اور اس خود مختار مملکت کے سربراہ جناب محمدؐ رسول اللہ تسلیم کیے گئے۔

ج) جناب رسالت مآبؐ کو محکمہ انصاف کا سربراہ بھی تسلیم کیا گیا۔

ر) یہ دستاویز مدینہ کی مملکت اور لوگوں کو خاص قانونی طریقے عطا کرتی ہے۔
ہ) یہ دستاویز ایک مسلم مملکت کے قیام کا اعلان کرتی ہے اور مسلمان ایک قوم کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں جناب رسالت مآبؐ کی سربراہی میں۔
و) یہ دستاویز برابری اور آزادی فراہم کرتی ہے مدینہ کے ہر گروہ کو اور یہ ایک عجیب بات تھی اہل عرب کے لیے۔
ز) فوجی ذمہ داریاں مملکت کے ہر فرد کے ذمہ تھیں۔
ح) مملکت کا ہر رکن ذمہ دار تھا کہ وہ ایک دوسرے کی خبر گیری رکھے اور ایک دوسرے کا خیال رکھے امن اور جنگ کے موقعوں پر۔

(۷۹) اسلامی سماجی اصولوں کا نفاذ

دوسری ہجری کے دوران چند ایک بہت اہم اور ضروری سماجی و دینی احکامات کا نفاذ عمل میں لایا گیا جس کی وجہ سے مملکت مدینہ میں مسلم سوسائٹی کے سماجی نظام میں انقلابی تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ جس کی وجہ سے ان کے کردار میں ایک اعلیٰ تبدیلی نمودار ہوئی اور وہ آپس میں بھائیوں کی طرح سلوک کرنے لگے۔ مندرجہ ذیل تبدیلیاں قابل ذکر ہیں:

(ا) اذان (اعلان وقت صلوٰۃ):

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الصلوٰۃ میں بیان کیا ہے کہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ جب مسلمان مدینہ پہنچے تو لوگ مسجد میں صلوٰۃ کے وقت اکٹھا ہونے کے لیے وقت کا اندازہ لگاتے، اس وقت تک نماز کے لیے اذان کا رواج نہیں ہوا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ نماز کے لیے کیسے لوگوں کو اکٹھا کیا جائے، کسی نے عیسائیوں کی طرح گھنٹی بجانے کے لیے تجویز دی، کسی نے یہودیوں کی طرح سنکھ بجانے کو کہا (یعنی سینگھ سے آواز نکالنے کو کہا)۔ لیکن عمر بن خطابؓ نے تجویز پیش کی کہ کسی شخص کو وقت مقررہ پر پکار کر نماز کے لیے بلانا چاہیے۔ پس جناب رسولؐ اللہ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ اٹھیں اور لوگوں کو پکاریں تاکہ وہ مسجد میں نماز کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔

لہٰذا ہجرت کے دوسرے سال نماز کے لیے اکٹھا کرنے کے لیے اذان کی ابتدا ہوئی اور

اس طرح سے اللہ کے رسولؐ کا نام نامی اللہ تعالیٰ کے نام کے بعد پکارنا شروع کر دیا گیا۔ اس کے بعد پوری دنیا میں دن میں پانچ مرتبہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام کی پکار کے ساتھ لوگوں کو نماز کے لیے بلایا جانے لگا اور انشاء اللہ یہ پکار قیامت تک دنیا کے کونے کونے سے آتی رہے گی۔ بے شک اللہ کے رسولؐ کے نام کی پکار کہ "محمدؐ اللہ کے رسول ہیں"، جناب رسالت مآبؐ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑا اعزاز ہے بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ آپ کے معراج کے بعد یہ ایک اور بڑا معراج ہے۔

(ب) صوم (روزہ):

ہجرت کے دوسرے ہی سال ماہ شعبان میں ایمان والوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ماہ رمضان میں ہر روز روزہ رکھیں اور یہ عمل ہر سال پوری زندگی پر محیط ہوگا۔ اس طرح سے انکی دوران روزہ یعنی صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے، پینے اور ہر قسم کے شہوانی اور نفسانی اعمال سے پرہیز لازم ہوگا۔ اس عمل سے انسان کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ از خود اللہ تعالیٰ کے حکم کی کس طرح سے پیروی کرتا ہے۔ یہ عمل انسانوں کی ہر قسم کی بیکار خواہشوں سے پاک کرنے کے لیے اور پاک رکھنے کے لیے نافذ کیا گیا۔

یہ حکم قرآن کی سورۃ بقرہ (۲) آیت (۱۸۳) میں نازل ہوا۔ اس کے مطابق فرمان ہوا "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! روزے تمہارے لیے مقرر کیے گئے ہیں جیسا کہ یہ کیے گئے تھے تم سے پہلے کی قوموں پر (یعنی عیسائیوں اور یہودیوں پر) تاکہ تم پرہیزگار بن سکو (یعنی پاکیزگی و طہارت اور اللہ کا خوف اختیار کر سکو)"۔

امام بخاریؒ نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا: "جو کوئی بھی (روزے کی حالت میں) جھوٹ بولنا اور برے کام نہیں چھوڑتا، تو اللہ کو اس کے کھانا، پینا چھوڑنے سے کوئی سروکار نہیں، (یعنی کہ اسکا روزہ اللہ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا)"۔

ماہ رمضان شروع سے ہی متبرک ماہ تھا کیونکہ تمام آسمانی کتابیں اسی ماہ میں نازل ہوئیں۔ امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ واثلہ بن الاسقعؓ نے روایت کیا کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ "صحف ابراہیم ماہ رمضان کی پہلی شب میں نازل ہوا، توریت رمضان کی سولہویں شب، انجیل رمضان کی تیرھویں شب اور قرآن رمضان کی چوبیسویں رات نازل ہوا"۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ زیادہ تر علماء کے مطابق قرآن ستائیسویں شب رمضان المبارک نازل ہوا۔ (اللہ ہی صحیح علم رکھتا ہے) لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قرآن سارے کا سارا ایک ساتھ نازل نہیں ہوا بلکہ اسے تئیس (۲۳) برس میں جناب رسالت مآبؐ پر نازل کیا گیا۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا سارے کا سارا لوح محفوظ سے بیت العزۃ پر جو زمین سے قریب تر آسمان پر واقع ہے اور پھر وہاں سے ٹکڑوں میں حسب ضرورت واقعات کے لحاظ سے جناب رسالت مآبؐ پر نازل ہوا۔

(ج) زکوٰۃ:

اللہ جل شانہ نے مسلمانوں پر زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم نازل فرمایا۔ یعنی ایک خاص رقم ایک نصاب کے مطابق اپنی بچت میں سے ہر سال ایک مقررہ وقت پر علیحدہ کر کے اپنے ضرورت مند عزیز و اقارب، محلے دار یا بستی کے افراد کی مدد کے لیے خرچ کرنا۔ قرآن حکیم کی سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۰۳) میں حکم ہوا کہ "(اے نبیؐ) صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو ان کی دولت میں سے تاکہ وہ پاک ہو جائیں اور نیک ہو جائیں اور ان کے لیے دعا کریں اللہ سے۔ بے شک تمہاری دعائیں ان کے لیے باعث تقویت ہیں اور اللہ تمام سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

اس ٹیکس کا بنیادی مقصد انسانوں میں دوسرے انسانوں کی خدمت اور دیکھ بھال کا جذبہ پیدا کرنا ہے تاکہ با حیثیت افراد نادار مساکین اور غرباء کی جو (اگے کنبے، قبیلے یا ان کی معاشرت یا سماج کا حصہ ہوں) مصیبت اور پریشانیوں کو دور نہیں تو کم کرنے کی کوشش کرنا ہے تاکہ ان میں جذبہ ترحم پیدا ہو اور ان کے قلب دوسروں کی مصیبت کا احساس کر کے ان کی مدد کرنے کی کوشش کریں۔ یہ فرض ایسے لوگوں پر ہے جن کے پاس زیادہ وسائل ہوں۔ ان کے لیے یہ امر امتحان کا درجہ بھی رکھتا ہے کہ وہ اللہ کی خاطر جس نے انہیں زیادہ وسائل سے نوازا ہے ان وسائل میں وہ اللہ کے نادار بندوں کو شریک کرتے ہیں یا نہیں اور اگر کرتے ہیں تو کس حد تک۔

بہرحال یہ حکم مسلمانوں کے معاشرے میں معاشی بہبودی کے انتظام اور دیگر معاشی نظام کی ابتدا کے طور پر سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس نظام کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان بھائی چارے کی فضا کو بہت زیادہ تقویت ملی۔ لیکن کچھ بدو قبائل نے یہ خیال کیا کہ یہ معاشی انتظام صرف جناب رسالت مآبؐ کی زندگی تک محدود تھا اور ان کے بعد کسی اور کو یہ حق نہیں پہنچتا

کہ وہ حکومت کے لیے زکوٰۃ اکٹھی کریں۔ کیونکہ مندرجہ بالا آیت میں زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم جناب رسول اللہؐ کو ہی دیا گیا ہے لیکن اس حکم کی نوعیت انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ہے یا تو مملکت زکوٰۃ وصول کرے اور تمام نادار افراد کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کا فرض نبھائے، ورنہ انفرادی طور پر ہر شخص جو اہل نصاب ہے زکوٰۃ ادا کرے اور اپنے کنبے، قبیلے، پڑوسیوں اور محلے داروں کا خیال رکھے۔ جناب رسالتمآبؐ کے بعد آپ کے جانشین جناب ابوبکرؓ نے ان لوگوں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا جنہوں نے زکوٰۃ نہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور تمام اصحاب رسول اکرمؐ نے ان کا ساتھ بھی دیا تھا۔ اس طرح سے زکوٰۃ کا نظام اجتماعی طور پر چلتا رہا لیکن اب یہ انتظام زیادہ تر انفرادی طور پر ہی چل رہا ہے۔ زکوٰۃ کے تفصیلی نصاب کے لیے فقہ کی کتاب سے رجوع کیا جائے، عمومی طور پر اس کا نصاب جمع پونجی پر اڑھائی فیصد سالانہ ہے۔

(د) الحدود:

لفظ "حدود" جمع ہے لفظ "حد" کی، اس کا مطلب ہے، وہ حدود جو اللہ تعالیٰ نے معاشرتی طور پر معاشرے کے افراد پر لگائی ہیں اور جن کی خلاف ورزی قابل سزا ہے مقررہ سزا کے مطابق۔ اور یہ مقرر کردہ سزائیں بھی حدود ہی کہلاتی ہیں۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا "کہ جب ایک بدکار کوئی شہوانی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس وقت وہ ایمان سے عاری ہوتا ہے جب وہ خمر (نشہ آور شے) استعمال کر رہا ہوتا ہے تو وہ اس وقت ایمان سے عاری ہوتا ہے۔ جب وہ چوری یا ڈاکہ کا مرتکب ہوتا ہے، اس وقت وہ ایمان سے عاری ہوتا ہے"۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ کوئی بھی شخص جو یہ دعوی کرے کہ وہ مسلمان ہے یعنی کہ اللہ تعالیٰ کا غلام ہے اور پھر دعوی کرنے کے بعد اپنے مالک کی حکم عدولی بھی کرے تو وہ کیسے اپنے دعوے میں سچا ہوگا اور دعوی چونکہ ایمان کا ہوتا ہے، اس لیے وہ شخص ایمان کے بغیر ہے یعنی اس وقت اللہ کو اپنا مالک اور خود کو اس کا تابعدار غلام مان ہی نہیں رہا۔ اسی لیے تو اس کی حکم عدولی کر رہا ہے اس لیے اسے حکم عدولی کی سزا بھی ملے گی۔

ان حدود کی سزائیں سزائے موت سے لے کر کوڑوں کی سزا تک ہے، اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے اور جناب رسول اللہؐ نے ان کی وضاحت بھی کر دی ہے، ہم یہاں صرف اہم حدود کا تذکرہ کریں گے۔

۱) قتل کی سزا
۲) زنا (شہوانی بدکاری) کی سزا
۳) چوری اور ڈاکہ کی سزا
۴) کسی کے جسم کے کسی حصے کو نقصان پہنچانا
۵) نشہ کرنے والے کے لیے سزا
۶) کسی شخص (عورت یا مرد) پر بدکاری کے جھوٹے الزام یعنی بہتان لگانے کی سزا

(۸۰) جناب رسالت مآبؐ کا طرزِ عمل و روّیہ

اپنے تیئیس (۲۳) سالہ دورِ نبوت میں سے جسکا ابتدائی دور بلکہ پہلی دھائی انتہائی مشکل تھی آپؐ ہمہ وقت قریش کی دشمنی میں گھرے ہوئے رہتے اور حالات ایسے تھے کہ آپؐ کے لیے صرف اپنی زندگی گذارنا ہی بیحد مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی آپؐ نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کسی طرح سے بھی ہمت نہ ہاری اور ہر حالت میں اپنے فرائض کے لیے ہمہ تن کوشاں رہے اور آخر کار اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نبوت کے چودھویں سال مدینہ میں مسلمانوں کی مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آپؐ نے اپنے پیروکاروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہامی ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ حکمت سے کام لیتے ہوئے ان کے کردار کی ایسی تعمیر کی اور انھیں اپنے قول اور فعل سے سکھلایا کہ وہی جاہل اور اجڈ بدو اخلاقیات کے استاد بن گئے۔ جناب رسالت مآبؐ نے اپنے ذاتی عجز و انکساری، خلوص اور اللہ کی تابعداری کے ساتھ اپنے آپ کو امت کے سامنے بہترین کردار کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ بنا کر پیش کیا۔ ایسا نمونہ جس میں کہیں بھی کوئی کمی نظر نہ آئی، ایسا نمونہ جو ہر شخص ہمہ وقت ہر دور میں اختیار کر سکتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے امت پر فرض کر دیا کہ وہ نبیؐ کے آداب، روّیے اور طرزِ عمل کو اپنائیں تا کہ وہ اچھے انسان بن جائیں۔

سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۲۱) میں بیان ہوا ہے کہ: "بے شک اللہ کے رسولؐ تمہارے لیے بہترین مثال ہیں تقلید کے لیے سو تم آپؐ کے اسوہ کو اپناؤ۔ یہ ان لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور یومِ قیامت پر بھی اور اللہ کو ہمہ وقت یاد رکھتے ہیں"۔

اسی طرح سے سورۃ القلم (۶۸) کی آیت (۴) میں اللہ کا فرمان ہے کہ "اور بے شک تم

(اے محمدؐ) اخلاق کے بہترین نمونے پر فائز ہو"۔

لہٰذا معلوم ہوا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کا اخلاق اور آپؐ کی طبع اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے ترتیب دیے تھے کہ وہ قرآن کے احکامات سے بالکل مطابقت رکھتے تھے۔ آپؐ نے کبھی بھی اپنی خواہش یا مرضی کو پسند نہیں فرمایا، اللہ تعالیٰ کی مرضی یا حکم کے خلاف۔ آپؐ کی پوری حیات اور اسوہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے حکم کے عین مطابق بسر کی اور اس طرح سے آپؐ کی سیرت عوام الناس کی تقلید کے لیے ایک کامل نمونہ بن گئی۔ اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت کے بعد آپؐ کی سیرت مبارکہ میں یا کردار میں درج ذیل خصوصیات نمایاں ہو گئیں۔

۱) اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہمہ وقت و ہمہ تن اللہ تعالیٰ کے حضور رجوع اور شفقت و محبت سے قوم کی رہبری۔
۲) شرم و حیا اور پاک دامنی تقویٰ و پرہیزگاری، دیانت داری اور امانت و صداقت۔
۳) صلہ رحمی، مہربانی و شرافت، سلیقہ، انصاف اور معاف کرنے کا جذبہ۔
۴) بہادری، ہمت، صبر اور پیار و محبت، ایثار و قربانی۔
۵) آداب، تہذیب، اخلاق اور سادگی۔

سورۃ انبیاء (۲۱) کی آیت (۱۰۷) میں جناب رسول اللہؐ سے خطاب ہے کہ "اور ہم (اللہ) نے تمہیں بھیجا (اے محمدؐ) عالمین کے لیے رحمت بنا کر"۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جناب رسالت مآبؐ کو انسانوں اور جنات کے لیے بھیجا تا کہ وہ انھیں اللہ تعالیٰ کے احکامات سے آگاہ فرمائیں اور یہ کہ اگر وہ ان احکامات کی اطاعت کریں گے تو ہمیشہ کے لیے خوشی پائیں گے اس دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ عالمین کا مطلب "انسان اور جنات بھی ہے، اور دنیا اور آخرت بھی"۔

سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۲۸) میں ارشادِ ربانی ہے کہ: "بے شک! تم لوگوں کے درمیان ایک پیغمبر بھیجا گیا جو تم ہی لوگوں میں سے ہے۔ انھیں رنج پہنچتا ہے جب تم کسی مشکل یا تکلیف میں ہوتے ہو۔ وہ تمہارے لیے (ایمان والوں کے لیے) بے چین رہتا ہے اور ہمہ وقت لبریز رہتا ہے نیکی، مہربانی اور رحم کے ساتھ"۔

بیشک اللہ کے رسولؐ ہمارے مالک کی طرف سے ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہیں جنہوں نے ہمیشہ انسانیت کی خوشی اور بھلائی کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کیا۔ اس بارے

میں امام احمدؒ نے عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ''بے شک ہر معاملہ جسے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ اسے توڑیں گے جیسی میں تمہیں تمہاری کمر سے تھامے ہوئے ہوں کہ کہیں تم آگ میں نہ گر جاؤ جیسے کہ تتلیاں اور مکھیاں اس میں گر جاتی ہیں''۔

سورہ احزاب (۳۳) کی آیات (۴۵-۴۶) میں فرمان ہے کہ: ''اے پیغمبر! بے شک ہم (اللہ) نے تمہیں بھیجا ایک گواہ کی حیثیت سے، خوشخبری سنانے والا اور تنبیح کرنے والا اور ایسا کہ اللہ کی طرف بلانے والا اس کے حکم کے مطابق اور ایک چراغ جو کہ اپنی روشنی پھیلا رہا ہو''۔ یعنی علم جو خاص طور پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آیا ہو، وہ روشنی یعنی نور ہی تو ہے جو گمراہ اور سیاہ قلوب کو منور کر دیتا ہے۔

امام احمدؒ نے لکھا کہ عطا بن یاسر نے کہا کہ وہ عبداللہؓ بن امر بن العاص سے ملے، جو قبل از اسلام یہودی تھے اور ان سے کہا کہ مجھے رسول اللہؐ کے بارے میں بتاؤ کہ توریت میں آپ کا ذکر کس طرح سے کیا گیا ہے یعنی ان کی کیا خوبیاں بیان کی گئی ہیں؟ تو انہوں نے کہا ہاں اللہ کی قسم ان کی ایسی خوبیاں توریت میں بیان کی گئی ہیں جو قرآن میں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ''اے نبی! بے شک ہم نے تمہیں گواہ بنا کر بھیجا خوشخبری سنانے والا اور تنبیح کرنے والا اور بچانے والا بے خبر لوگوں کو۔ تم میرے غلام ہو (عبد) اور میرے پیغمبر اور میں نے تمہیں کہا ہے متوکل۔ نہ تو تم سخت مزاج ہو نہ کرخت، نہ زور سے بولنے والے لوگوں سے گفتگو کرتے وقت، تم برائی کو برائی کے ساتھ نہیں لوٹاتے بلکہ تم سنی ان سنی کر دیتے ہو اور معاف کر دیتے ہو۔ اللہ تمہاری روح اس وقت تک نہیں نکالے گا جب تک کہ تم لوگوں کو سیدھے راستے پر نہیں لے آؤ گے جو پھر گئے ہیں صحیح راستے سے اور نہیں کہتے کہ کوئی نہیں الٰہ سوائے اللہ کے۔ وہ الفاظ جس سے بے نور آنکھیں، بہرے کان اور مہر شدہ قلب کھل جاتے ہیں''۔

اسی طرح سے امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے لکھا ہے کہ انسؓ نے کہا کہ ''میں نے جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں دس برس گزارے اور آپؐ نے مجھے کبھی بھی 'اُف' تک نہیں فرمایا اور نہ ہی آپؐ نے مجھے کسی کام کے بارے میں یہ فرمایا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا ہے یا یہ کہ یہ کام تم نے کیوں نہیں کیا۔ آپؐ کا اخلاق بہترین تھا اور میں نے کبھی بھی ہاتھ نہیں لگایا ایسے ریشم کو یا کسی

اور شے کو جو جناب رسالت مآبؐ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو اور میں نے کبھی بھی ایسی خوشبو نہ سونگھی یا کوئی مشک جس کی خوشبو جناب رسالت مآبؐ کے پسینے سے بہتر ہو''۔

امام احمدؒ نے جناب ابو ہریرہؓ سے روایت کی کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ''میں بہترین اخلاق کے ساتھ بھیجا گیا ہوں''۔

جنگ کے دوران اُحد کے میدان میں کفارِ قریش جب جناب رسول اللہؐ کو تکلیف پہنچانے پر قادر آ گئے یہاں تک کہ آپؐ کے دندان مبارک شہید ہو گئے، آپؐ کے چچا حمزہؓ شہادت پا چکے اور ابو سفیان کی بیوی ہند نے ان کی بے حرمتی کی، ہر ایک مسلمان غمزدہ تھا، اس پر آپؐ کے ساتھیوں نے آپؐ سے ان لوگوں کے لیے بددعا کہنے کے لیے کہا۔ جناب رسالت مآبؐ نے اس حالت میں ایسا کرنے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ آپؐ نے دعا فرمائی کہ ''اے اللہ میری قوم کو معاف فرما دے، یہ کچھ نہیں جانتے''۔

مزید چند ایک روایات جو امام بخاریؒ نے نقل کی ہیں جو رسالت مآبؐ کے کردار کے متعلق، درج ذیل ہیں:

۱) مسروقؒ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن امرؓ نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ نہ تو وہ فاحش تھے اور نہ ہی متفاحش، یعنی نہ تو آپؐ نازیبا الفاظ ادا کرنے والے تھے اور نہ ہی ایسے الفاظ ان کے آگے بڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ جناب رسول اللہؐ نے مزید فرمایا کہ ''تم میں سے بہترین افراد وہ ہیں جن کے آداب و اخلاق بہترین ہیں''۔

۲) ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ باہر تشریف لا کر ان کی طرف آئے جبکہ آپ اپنی نواسی سیدہ زینبؓ کی بچی امامہ کو اٹھائے ہوئے تھے اپنے کاندھوں پر، تو آپ نماز پڑھنے لگے۔ جب آپ رکوع میں جاتے تو آپ اپنی نواسی کو زمین پر چھوڑ دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے''۔

۳) جابرؓ سے روایت ہے کہ جب کبھی جناب رسول اللہؐ سے کسی نے کچھ طلب کیا تو آپ نے کبھی انکار نہیں فرمایا۔

۴) الاسودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے سیدہ عائشہؓ سے پوچھا کہ جناب رسالت مآبؐ گھر پر کیا کیا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے اپنے گھر والوں

کے کام کاج میں اور جب نماز کا وقت ہوتا تو آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

۵) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں (i) جب وہ بولتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے (ii) جب وہ وعدہ کرتا ہے تو اس کی وعدہ خلافی کرتا ہے (iii) جب بھی اسے کچھ ذمہ داری دی جاتی ہے تو وہ دھوکہ دیتا ہے اور اس طرح سے وہ اپنے آپ کو بد دیانت ثابت کرتا ہے۔

۶) ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسولؐ ایک کنواری دوشیزہ سے زیادہ شرمیلے تھے۔ اگر کوئی نازیبا و ناشائستہ حرکت آپؐ کے سامنے ہوتی تو آپؐ کے چہرہ مبارک پر اس کی ناگواری کے آثار نمایاں ہو جاتے۔

۷) انس بن مالکؓ نے روایت کیا کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "لوگوں کے لیے آسانیاں بہم پہنچاؤ اور ان کے لیے مشکلیں پیدا نہ کرو اور انہیں اطمینان دو (خوشخبری سنا کر) اور انہیں دور مت کرو"۔

۸) عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جناب رسول اللہؐ کے پاس آیا اور کہا کہ "اے اللہ کے پیغمبر آپ کا ایسے شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو کچھ لوگوں سے محبت تو کرتا ہے لیکن ان کے اچھے اعمال کو پا نہیں سکتا۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ "ہر شخص ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص ان جیسا تو نہیں بن سکا لیکن دوسرے کام کی طرف بھی نہیں جائے گا۔

اس مضمون کا خلاصہ حاصل کرنے کے لیے آپؐ کی خدمت میں سورۃ آل عمران (۳) کی آیات (۳۱-۳۲) پیش کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور حکم پر چلنا ہے اور اللہ کے رسولؐ کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنا ہے اور اللہ کے رسول کا حکم ماننا ہے تو ان آیات پر ہی عمل کافی ہوگا۔ ہمیں منزل مقصود پر پہنچا دینے کے لیے یہ آیات ہی کافی رہیں گی، ان آیات کے مطابق فرمان ربی ہے کہ "کہو (اے محمدؐ) اگر تم (انسان) واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو پھر میری اطاعت اور پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے بہت رحم کرنے والا ہے۔ کہو (اے محمدؐ) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اگر وہ اللہ سے پھر جائیں تو اللہ نافرمانوں کو پسند نہیں فرماتا"۔

(۸۱) اہل مکہ کی اہل ایمان اور رسول اللہؐ سے بڑھتی ہوئی نفرت

کیونکہ اہل قریش کی خواہش کے خلاف جو کہ جناب رسالت مآبؐ کی زندگی سے ہی کھیلنا چاہتے تھے، آپؐ اللہ کے حکم سے مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لانے میں کامیاب ہو گئے اور وہاں مملکت اسلامیہ کی بنیاد بہت خوش اسلوبی کے ساتھ رکھی۔ چونکہ یہ تمام معاملات قریش کی توقعات اور خواہشات کے عین خلاف اور ان کے لیے ناقابل برداشت تھے، لہٰذا قریش پاگل پن کی حد تک جناب رسول اللہ اور آپؐ کے اطاعت گزاروں کے خلاف ہو گئے۔ ان کا غصہ بڑھ گیا، ان کی نفرت میں اضافہ ہو گیا اور ان کا جذبہ انتقام جوش مارنے لگا اور وہ آپؐ کے سب سے بڑے دشمن بن گئے۔ لہٰذا انہیں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ جناب رسالت مآبؐ اور آپ کے پیروکاروں سے کس طرح سے انتقام لے کر اطمینان پا سکیں۔

لہٰذا قریش کے دو بڑے سرداروں یعنی ابو سفیان اور ابی بن خلف نے انصار مدینہ کو یہ پیغام بھجوایا اور انہیں دھمکی دی اور متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے قریش کے اس شخص کو (محمدؐ) جسے انہوں نے پناہ دے رکھی ہے اپنے سے علیحدہ نہ کیا تو اہل قریش اہل مدینہ سے ساری قطع تعلق کر لیں گے۔ قریش کی اس دھمکی کے جواب میں اہل مدینہ نے اپنے ایک شاعر کعبؓ بن مالک سے کہا کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ قریش کی دھمکی کے رد کا اعلان کرے۔ قریش کو اس جواب سے ایک اور دھچکا لگا لیکن انہوں نے ہٹ دھرمی نہ چھوڑی اور مدینہ کے ایک بہت بڑے منافق عبداللہ بن اُبی کو خط بھجوایا اور اسے بھی اس بات پر اکسایا، بصورت دیگر مدینہ پر حملہ کی دھمکی دی۔ اُبی جو پہلے ہی جناب رسالت مآبؐ سے مخلص نہ تھا خاموش رہا اور اس نے اس صورتحال سے کسی کو بھی آگاہ نہیں کیا۔ دوسری جانب جب قریش کو اُبی کا بھی کوئی جواب موصول نہ ہوا تو پھر انہوں نے مدینہ کے یہودیوں سے رابطہ قائم کیا اور ان سے انصار کے خلاف مدد مانگی لیکن اہل یہود نے بھی انہیں نامکمل اور غیر یقینی جواب دیا اور کہا کہ ٹھیک ہے جب انہیں ضرورت ہوگی وہ ان کی مدد کریں گے۔

اس طرح سے جب اہل مکہ اپنی سیاسی جدوجہد میں اہل مدینہ کے خلاف ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنی سیاسی جنگ کا رخ موڑ کر اقتصادی جنگ کا قصد کر لیا اور اب اس کوشش میں لگ گئے۔

(۸۲) مدینہ کی معاشی ناکہ بندی

اہل مکہ نے مملکت مدینہ پر ایک بھرپور معاشی حملہ کر دیا، اس طرح سے کہ قریش کے تمام قبائل نے مدینہ کے تمام راستے روک دیے اور اس طرح سے اہل مدینہ کے ساتھ تجارت کرنے والوں کو اور اہل مدینہ کی کسی اور سے تجارت کو روک دیا۔ مدینہ چونکہ زرعی پیداوار کا حامل تھا لہٰذا یہاں کی زرعی پیداوار یعنی اناج و پھل اور سبزیاں وغیرہ کی وجہ سے اہل مدینہ گذر بسر کرتے رہے۔ لیکن اس کے علاوہ ان کی معاشی حالت ابتر ہو گئی اور اشیائے خورد و نوش کے علاوہ ضرورت کی چیزوں کا نقدان ہو گیا۔ جب حالت یہاں تک پہنچ گئی تو جناب رسالت مآبؐ نے اس بات کو سلجھانے کے لیے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ دشمن کے سامنے آ کر ان کا مقابلہ کریں گے۔ کیونکہ اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ تلوار نیام سے باہر نکالی جائے اور دشمن کے مقابلہ پر آ کر ان کی بد معاشی کا بھرپور جواب دیا جائے۔

(۸۳) سریہ حمزہؓ اور قریش کو تنبیہ

اس سے پہلے کہ جناب رسول اللہ دشمن سے لڑنے کے لیے روانہ ہو جاتے، آپ نے انھیں ایک وارننگ دی اور اہل قریش کو پیغام بھجوایا کہ ان کی ناکہ بندی کے جواب میں انھیں یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ ان کے قافلوں کو محفوظ سفر ملا کرے گا خاص طور پر ان راستوں سے جو مدینہ کے نزدیک سے ہو کر مکہ جاتے ہیں اور اس غرض سے جناب رسالت مآبؐ نے پہلی ہجری کے ماہ رمضان میں یعنی مارچ ۶۲۳ء میں چالیس مسلمان جنگجوؤں کو جناب شیر خدا حمزہؓ کی سربراہی میں جو اس وقت کے بہادر ترین شخص تھے منتخب کیا اور دشمن کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا۔ اس دستے کے پرچم بردار کنزہ بن حسین غناری تھے جنھیں جناب رسول اللہ نے سفید پرچم عطا فرمایا۔ یہ مملکت اسلامیہ مدینہ کا پہلا دستہ، پہلی قیادت، پہلا پرچم بردار اور پہلا سریہ تھا (سریہ ایسے جنگی دستے کو کہتے ہیں جس کی قیادت جناب رسول اللہ نہ کرتے تھے اور غزوہ وہ جس کی قیادت جناب رسالت مآبؐ خود فرماتے)۔ اس لشکر میں بیس (۲۰) اونٹوں کا رسالہ تھا، اس لشکر کو حکم دیا گیا کہ وہ مدینہ اور بحر احمر کے راستے کو جو ایک سو تیس کلومیٹر (۱۳۰) لمبا تھا اسے قریش کے کاروانوں کے لیے بند کر دیں۔ یہ دستہ بہت دنوں تک چوکنا اور قافلے کے انتظار میں رہا،

آخر کار انھیں معلوم ہوا کہ قریش کا ایک قافلہ تین صد (۳۰۰) افراد پر مشتمل ابوجہل کی سربراہی میں آ رہا ہے۔ چونکہ جناب رسالت مآبؐ کا بہت بڑا دشمن ان کے مد مقابل آ رہا تھا، اس لیے انہوں نے قافلہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس علاقے کے سردار نے جس کا نام محمد بن عمرو تھا درمیان میں آ کر یہ بات واضح کی کہ ان کے قبیلے کا اہل قریش کے ساتھ معاہدہ ہے کہ وہ انھیں اپنے علاقے میں محفوظ سفر کی ضمانت دیں گے اور اس قبیلے کا اسی طرح سے اہل مدینہ سے بھی معاہدہ تھا۔ جناب حمزہؓ نے معاہدے کی پاسداری کی اور ابوجہل کو وہاں سے گزرنے دیا جس نے مکہ پہنچ کر قریش کو یہ تمام ماجرہ گوش گزار کیا۔ لیکن انہوں نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی کیونکہ ان کی نظر میں مملکت مدینہ کی طاقت کی کوئی اہمیت نہ تھی اور نہ ہی انہوں نے اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

(۸۴) سریہ سعد بن ابی وقاصؓ

پہلی ہجری کے ماہ ذیقعد بمطابق مئی ۶۲۳ء پچیس (۲۵) سرفروشوں کا ایک دستہ جناب سعد بن ابی وقاصؓ کی سربراہی میں (جو جناب رسالت مآبؐ کے ماموں زاد تھے) جناب رسالت مآبؐ نے الخرار کے مقام پر بھیجا تا کہ وہ کسی بھی قریش قافلے کی کھوج لگائیں۔ پانچ روز کی مسافت کے بعد انھیں قریش کا ایک قافلہ ملا، اس سے پہلے کہ وہ ان سے دوبدو ہوتے اس علاقے کے سردار نے مداخلت کی اور کہا کہ اس کے قبیلے کا اہل قریش سے محفوظ راستے کے لیے معاہدہ ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا وہ دستہ بھی بغیر کسی کاروائی کے واپس آ گیا۔

(۸۵) قریش اور بدوؤں کے معاہدے کا توڑ

اپنی واپسی پر جناب سعد بن ابی وقاصؓ نے جناب رسالت مآبؐ سے عرض کیا کہ قریش نے بدوؤں کے ساتھ جو محفوظ راستے کا معاہدہ کیا ہے اس کا کوئی توڑ ہونا چاہیے ورنہ وہ قریش کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: صحرا کے بدو قریش سے بہت ہی قلیل معاوضہ وصول کر رہے ہیں اس معاہدے کے عوض۔ لیکن میں انھیں اس معاہدے کے بدلے بیش بہا معاوضہ دوں گا۔ جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ آخر وہ کیا معاوضہ ہو گا؟ تو آپؐ نے

فرمایا: کہ میں انھیں معاوضے میں جنت کی پیشکش کروں گا۔ اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور بدوؤں سے بات چیت کا سلسلہ آگے بڑھایا اور انھیں دعوتِ دین اسلام کی پیشکش فرمائی۔

(۸۲) غزوۂ ابوا یا غزوۂ ودان

دوسری ہجری کے ماہ صفر ۲۲۳ء میں جناب رسالت مآبؐ اپنے ساٹھ (۶۰) جانثاروں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپؐ نے اپنے بعد سعد بن عبیدہؓ کو مدینہ کا نظم و نسق چلانے کی غرض سے مقرر فرمایا۔ اصولی طور پر اس دستے کی روانگی غزوہ کی غرض سے نہیں تھی کیونکہ نہ تو اس دستے کا مقصد کسی پر حملہ کرنا تھا اور نہ ہی کسی دشمن کو روکنے کی کاروائی کرنا تھا۔ دراصل جناب رسولؐ اللہ کا یہ ایک معاشی و سیاسی نوعیت کا دورہ تھا تاکہ وہ بنیادی طور پر بدو قبائل کی سیاسی حمایت حاصل کرسکیں اور اس طرح سے مدینہ کی معاشی حالت بھی بہتر ہو جائے۔ جناب رسالت مآبؐ نے اپنا یہ دورہ بنو غفار کے قبائل سے شروع کیا، جو پیشے کے اعتبار سے چور اور ڈاکو تھے، لیکن ان کی خوش بختی کا کیا کہیے کہ وہ جناب رسولؐ اللہ کی دعوت پر پہلے ہی لبیک کہہ چکے تھے۔

راستے میں یہ قافلہ رسالت ابوا کے مقام پر رکا، یہ وہ جگہ تھی جہاں پر جناب رسالت مآبؐ کی والدہ ماجدہ نے اس وقت سے تقریباً پچاس (۵۰) برس قبل وہاں دوران سفر وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئیں۔ اس وقت آپؐ کی عمر مبارک صرف چھ برس تھی، آپؐ یہ منظر بھلا کیسے بھولے ہوں گے، وہاں انھیں اپنی والدہ ماجدہ کی یاد کس طرح سے ستائی ہوگی؟ اس بات کا اندازہ اس طرح سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؐ اس جگہ سے برہنہ پا اپنی والدہ کی لحد کی طرف تشریف لے گئے۔ اس طرح سے برہنہ پا جانا، آپؐ کی طرف سے اپنی والدہ کے لیے بے پناہ عزت اور ادب کا اظہار کرنا مقصود تھا۔ آپؐ کے نائب جناب عمر فاروقؓ آپؐ کے ہمراہ تھے، آپؐ جب مرقد مادر پر پہنچے تو وہاں ادب کے ساتھ بیٹھ گئے اور اس طرح آبدیدہ ہوئے جیسے کہ ایک بچہ اپنی ماں کے فراق میں آنسو بہاتا ہے۔ جناب رسالت مآبؐ کی یہ غم زدہ تڑپ نے آپ کے جانثار ساتھیوں کو بھی مشتعل کر دیا۔ جناب عمرؓ نے آپؐ کو عرض کیا یا رسولؐ اللہ اب بس فرمائیں، نہیں تو میں بھی اسی طرح سے رونا شروع کر دونگا۔ اس پر جناب رسالت مآبؐ وہاں سے واپس

آئے اور اپنے ساتھیوں کو لے کر منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ (آپ جناب ؐ کی اس تڑپ کو حضورؐ سے محبت رکھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں) اللھم صل علی محمد

آپؐ نے مختلف قبائل سے ملاقات فرمائی اور انھیں متاثر کرنے کے بعد ان سے معاہدے کیے۔ یہاں ہم مختصراً ان معاہدوں کا تذکرہ کریں گے تاکہ صورتحال مزید واضح ہو جائے۔

معاہدہ نمبر 1:

جناب رسالت مآب ودان کے مقام پر ٹھہرے جو بنو زمرہ کا علاقہ تھا وہاں پر آپؐ نے ایک ہفتہ قیام فرمایا، وہاں کے لوگوں کو تلقین فرمائی اور ان کو راضی کیا کہ وہ آپؐ کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیں، جس کے مطابق طے پایا کہ:

الف) دونوں فریقین میں سے کسی پر بھی حملہ کی صورت میں، وہ ایک دوسرے کو مدد فراہم کریں گے، دشمن کے خلاف۔

ب) بنو زمرہ قبل مکہ کو اپنے علاقے میں سے محفوظ راستہ دینے کے پابند نہیں ہونگے۔

معاہدہ نمبر 2:

اسکے بعد آپ قبیلہ بنو غفار کے مقام پر پہنچے جو پہلے سے ہی آپؐ کے پیروکار تھے اور سچے اور سچے مسلمان ہو چکے تھے جب بھی کبھی ان سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا، وہ اپنے آپ کو جناب رسولؐ اللہ کے پاس پیش کرتے اور اعتراف جرم اور پاک ہونے کے لیے اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کرتے۔ جب بھی کبھی ضرورت ہوتی وہ از خود اپنے آپ کو جہاد کے لیے پیش کرتے اور انھیں جہاد میں شریک ہونے کا اس قدر شوق ہوتا کہ اگر کسی وجہ سے انھیں جہاد میں شریک نہ کیا جاتا تو وہ اس اعزاز سے محروم ہونے کے غم میں بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتے۔ لہٰذا انہوں نے بغیر کسی تردد کے آپؐ سے وعدہ کیا کہ بے شک وہ ویسا ہی کریں گے جیسا کہ جناب رسولؐ اللہ چاہیں گے۔

معاہدہ نمبر 3:

اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ مبوہ کے مقام پر پہنچے اور وہاں پر جہینہ کے قبیلہ سے ملے اور ان سے بھی ویسا ہی معاہدہ کر لیا۔

معاہدہ نمبر 4:

اس کے بعد جناب رسول اللہ بنو مدلف کے قبیلہ سے ملے جو ابھی تک اہل ایمان نہ تھے، لیکن انہوں نے آپؐ کو خوش آمدید کہا۔ اس قبیلے کا سربراہ سراقہ بن مالک اور جناب رسول اللہ ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ کیونکہ ہجرت کے موقع پر سراقہ انعام کے لالچ میں جناب رسالت مآبؐ کے تعاقب میں نکلا تھا اور جب وہ جناب رسول اللہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا تو وہ آپؐ پر حملہ نہ کر سکا اور جناب رسالت مآبؐ نے اسے خوشخبری سنائی کہ آپؐ اس کے ہاتھوں میں قیصرا کے کنگن دیکھ رہے ہیں۔ بہرحال سراقہ بھی فوراً اس طرح کے معاہدے پر راضی ہو گیا بعد ازیں اس قبیلے نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

(۸۷) مدینہ پر پہلا حملہ

جب رسالت مآبؐ ودان سے واپس مدینہ تشریف فرما ہوئے تو آپ کو ایک بری خبر ملی کہ آپؐ کی غیر حاضری کے دوران ایک مسلح افراد کے گروہ نے جو ابن جبیر کی سربراہی میں تھا مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ انہوں نے چند گھروں کو نذر آتش کیا اور مسلمانوں کے گھروں میں لوٹ مار کی۔ ان لوگوں کو قریش مکہ نے اسی کام کی غرض سے بھیجا تھا۔ یہ حملہ مسلمانوں کے لیے باعث تشویش تو تھا ہی، لیکن یہ فعل مدینہ اور اہل قریش کے درمیان مزید جنگی کارروائیوں کی ابتدا بھی ثابت ہوا۔

(۸۸) سریہ عبیدہ بن حارث بن مطلبؓ

جناب رسالت مآبؐ نے ساٹھ جانثاروں کا ایک دستہ عبیدہؓ کی سالاری میں بھیجا تا کہ وہ ایک قریش کارواں کو مداخلت کے لیے روکیں۔ دستے کی پرچم برداری مسطح بن اثاثہ بن مطلب کے سپرد تھی، وہ دوسری ہجری کے ماہ ربیع الاول میں روانہ ہوئے۔ دو ہفتوں کے سفر کے بعد انہوں نے اس قافلے کو وادی رابغ میں آلیا، یہ وادی مدینہ مکہ شاہراہ پر جدہ کے قریب ہے۔ یہ کاروان ایک سو چالیس افراد پر مشتمل اکرمہ بن ابوجہل کی سربراہی میں تھا جو بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان کے دو فرد مقداد بن امر اور عتبہ بن غزوان پیچھے رہ گئے۔ یہ حضرات پہلے ہی سے مسلمان تھے اور اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح جناب رسالت مآبؐ سے مل جائیں۔

(۸۹) غزوہ بواط

یہ غزوہ دوسری ہجری کے ماہ ربیع الاول اور ربیع الثانی بمطابق اکتوبر ۶۲۳ء میں پیش آیا۔ جناب رسول اللہ دو صد جانثاروں کے ہمراہ بواط کے مقام کے لیے روانہ ہوئے۔ آپؐ نے اپنے بعد سعد بن معاذؓ کو مدینہ کا نظم و نسق چلانے کے لیے مقرر فرمایا۔ آپؐ کا مقصد قریش کے ایک کارواں کو پکڑنا تھا اس کاروان میں دو ہزار پانچ صد اونٹ تھے۔ لیکن جب جناب رسول اللہ بواط پہنچے تو قریش کا یہ کارواں پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔

(۹۰) غزوہ بدر اوّل یا غزوہ صفوان

دوسری ہجری کے ماہ جمادی الاول بمطابق نومبر ۶۲۳ء مشرکین کے گروہ نے کرب بن جابر فاحری کی سرکردگی میں مدینہ کی چراگاہوں سے کچھ جانور چرا لیے۔ جناب رسالت مآبؐ نے ان لوگوں کا پیچھا کیا اپنے ستر (۷۰) اصحاب کے ساتھ۔ آپؐ نے اپنے بعد زید بن حارثہ کو مدینہ کا سربراہ بنایا اور علیؓ بن ابی طالب کو اپنے دستے کا پرچم عطا فرمایا۔ آپ نے ان لوگوں کا صفوان تک پیچھا کیا لیکن وہ لوگ بہت تیزی کے ساتھ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ آپؐ نے ان کا تعاقب چھوڑ دیا۔

(۹۱) غزوہ ذل عشیرہ

اسی ماہ جمادی الاول میں جناب رسول اللہ دو صد ہمراہیوں کے ساتھ قریش کاروان کے تعاقب کو نکلے۔ آپؐ نے مدینہ کے نظم و نسق کے لیے ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کو مقرر فرمایا۔ جب آپؐ ذل عشیرہ کے مقام پر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ کاروان قریش آگے چلا گیا ہے لہٰذا آپؐ وہاں سے واپس ہو لیے۔ لیکن واپسی پر آپؐ بنی مدلج اور ان کے مددگار بنی ضمرہ کے پاس رکے اور ان کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔

(۹۲) سریہ عبداللہ بن جحشؓ

دوسری ہجری کے ماہ رجب یعنی دسمبر ۶۲۳ اور جنوری ۶۲۴ء میں جناب رسول اللہ نے

عبداللہ بن جحش کو مہاجرین کے اسی (۸۰) حضرات کی سربراہی میں ایک خفیہ مشن پر روانہ فرمایا۔ جناب رسولؐ اللہ نے جناب عبداللہ کو ایک خط بھی دیا اور فرمایا کہ دو روز کی مسافت کے بعد وہ اس خط کو کھولیں۔ آپؐ کی ہدایت کے مطابق یہ دستہ نجد کی طرف جو مدینہ کے جنوب مغرب کی طرف تھا روانہ ہوا۔ اور دو روز کے بعد عبداللہ بن جحش نے وہ خط کھولا جس میں درج ذیل ہدایات پائیں۔

الف) نخلہ کے مقام تک چلے جائیں (یہ مقام مکہ اور طائف کے راستے پر واقع ہے)۔

ب) نخلہ کے مقام پر پہنچ کر قریش کے کاروانوں کے متعلق اطلاعات جناب رسولؐ اللہ کو بھیجتے رہیں۔

ج) اپنے ماتحتوں کو اپنا حکم ماننے پر مجبور نہ کریں۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "وہ لوگ جن کو خواہش ہو کہ وہ شہادت کی عزت پائیں وہ میرے ساتھ رہیں، بصورت دیگر وہ واپس چلے جائیں اور میں تو یقینی طور پر جناب رسولؐ اللہ کے حکم کی پابندی کروں گا۔

ان میں سے ہر شخص نے ان کے ساتھ رہنے کا عندیہ دیا۔ لہٰذا وہ آگے بڑھے۔ جب وہ حضرات گورا کے نزدیک علاقہ بحران میں پہنچے تو ان میں سے دو سعد بن ابی وقاصؓ اور عتبہ بن غزوان کے اونٹ گم ہو گئے اور وہی ان کی سواری تھی۔ لہٰذا وہ ان کی تلاش میں لگ گئے جبکہ دوسرے تمام جانب منزل رواں ہوئے اور نخلہ پہنچ گئے۔

اسی دوران انہوں نے قریش کا ایک قافلہ دیکھا جو کشمش اور کھانے کا دوسرا سامان اور مال تجارت لے کر آ رہا تھا۔ قافلے میں صرف چار شخص تھے (۱) عمرو بن حضرمی (۲) عثمان بن عبداللہ (۳) نوفل بن عبداللہ (۴) حکم بن کیسان۔ جب انہوں نے اس دستہ کو دیکھا تو بہت خوفزدہ ہو گئے لیکن انہوں نے دستہ کے بیشتر لوگوں کے منڈے ہوئے سر دیکھے تو سمجھے کہ وہ کعبہ کے زائرین ہیں۔ دوسری طرف اصحاب رسولؐ اللہ اس مسئلہ پر الجھے ہوئے تھے کہ کیا وہ اس قافلہ پر حملہ کر دیں یا نہیں۔ کیونکہ وہ رجب کا آخری دن تھا اور ماہ رجب چار محترم مہینوں میں سے ایک تھا، جس میں احترام کے طور پر کسی سے کوئی بھی زیادتی کرنا جائز نہ تھا۔ ان میں سے کچھ نے تو لڑنا پسند نہیں کیا اور کچھ نے یہ کہا کہ اللہ کی قسم اگر یہ موقع ہم نے گنوا دیا تو کل تک وہ حرم کعبہ کی حدود میں داخل ہو جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گے۔ کیونکہ حدود کعبہ میں بھی

لڑنا جھگڑنا حرام ہے، اس طرح وہ قافلہ دونوں طرح سے محفوظ رہنا چاہیے تھا۔

لیکن انہوں نے بہرحال فیصلہ کیا کہ ان چار میں سے جسے بھی قتل کر سکتے ہو کر دو اور مال اپنے قبضے میں لے لو۔ لہٰذا نتیجہ کے طور پر عمرو بن حضرمی کو واقد بن عبداللہ بن تمیمی کا تیر لگا اور وہ مر گیا۔ جبکہ ان میں سے دو نے ہتھیار ڈال دیے اور ایک بھاگ گیا۔

اس کے بعد عبداللہ بن جحش واپس مدینہ چلے گئے۔ انہوں نے مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ جناب رسولؐ اللہ کے لیے رکھ کر باقی مال آپس میں تقسیم کر لیا۔ جب وہ واپس پہنچے تو جناب رسولؐ اللہ نے ان سے ناراضی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ "میں نے تم سے محترم مہینوں کے دوران جنگ کے لیے نہیں کہا تھا اور مال غنیمت کا حصہ وصول نہیں کیا۔ جناب رسالت مآبؐ کے اس رویے سے اس سریہ میں شریک اصحاب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور شرمندہ ہوئے۔ دیگر مسلمان برادری نے بھی ان کے اس فعل پر شدید نکتہ چینی کی۔ یہودی اس واقعہ سے بہت خوش ہوئے کیونکہ ان کا اندازہ تھا کہ اب مسلمانوں اور قریش مکہ کے درمیان جنگ ہو جائے گی۔

اس ناخوشگوار موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو آگاہی بخشی اور سورۃ بقرہ کی آیت (۲۱۷) نازل فرمائی۔ جس میں کہا گیا ہے کہ "وہ تم سے (اے محمدؐ) پوچھتے ہیں محترم مہینوں میں قتال کے بارے میں: (کہ حرمت کے ماہ میں قتل کرنا بہت بڑا گناہ اور خلاف ورزی ہے) کہو! کہ قتال بہت بڑا جرم ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قانون شکنی اور خلاف ورزی وہ ہے جو اللہ سے کی جائے۔ یعنی لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا، اللہ کی حاکمیت سے انکار کرنا، کعبہ کی زیارت سے روکنا اور وہاں کے باشندوں کو وہاں سے باہر دھکیلنا اور سماج میں تفرقہ بپا کرنا، یہ سب کچھ (اس) قتل سے برا ہے اور وہ لوگ کبھی لڑنا بند نہیں کریں گے تمہارے ساتھ، جب تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین (اسلام) سے واپس نہ پھیر دیں۔ (اگر وہ ایسا کر سکیں تو) اور جو کوئی بھی تم میں سے اپنے دین سے پھر جاتا ہے اور کفر کی حالت میں مر جاتا ہے تو پھر اس کے اعمال اس کی زندگی میں پامال ہو جائیں گے اور آخرت میں ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کے ان احکامات نے مسلمانوں کو خوشی عطا کی اور ان کا پیچیدہ مسئلہ حل ہو گیا اور اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے اپنا مال غنیمت بھی وصول کر لیا۔ قریش نے اپنے قیدیوں کو چھڑوانے کے لیے فدیہ پیش کیا۔ لیکن حکم نے اسلام قبول کر لیا اور اپنی شہادت تک

جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ رہا۔ جبکہ دوسرا شخص واپس قریش کے ساتھ چلا گیا۔

عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں نے جناب رسالت مآبؐ سے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! ہماری خواہش ہے کہ اس واقعہ کو جنگ کا درجہ مل جائے تاکہ ہمیں مجاہدوں کا ثواب حاصل ہو جائے"۔ ان کی خوش قسمتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش کو منظور کر لیا اور اس بارے میں سورۃ بقرہ کی آیت (۲۱۸) نازل فرمائی۔ جس میں فرمایا گیا کہ: "بے شک! وہ جو ایمان لائے اور وہ جنہوں نے ہجرت کی (اللہ کی خاطر) اور بہت زیادہ مشقت کی اللہ کی راہ میں وہ تمام اللہ تعالیٰ سے رحم کی امید رکھتے ہیں اور (بے شک) اللہ بہت ہی معاف کرنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے"۔ یہ آیت کریمہ بھی وجہ اطمینان اور باعث مسرت تھی تمام مسلمانوں کے لیے۔

(۹۳) جہاد کے بارے میں مختصر تعارف

جہاد نام ہے ایک جدوجہد کا جس کا مقصد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو راضی کرنا مقصود ہو۔ اس جدوجہد کا طریقہ کار یہ ہے کہ انسان فرد کی حیثیت سے اور اجتماعی طور پر اپنی طاقت صحیح رخ اور صحیح مقصد کے لیے استعمال کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اعلیٰ کو فتنہ اور فساد سے بچایا جا سکے۔ یعنی مخلوق مظلوم کے بھر سے میں آتی ہے جو فتنہ و فساد کی زد میں ہو یعنی برائی، مکاری، لوٹ کھسوٹ، جھگڑا، فساد، شرارت یا ایسی کوئی بھی حرکت جو انفرادی یا اجتماعی طور پر ظلم، مصیبت اور پریشانی و بدحالی کا سبب بنے۔ جہاد کسی خاص گروہ، مذہب، فرقے، ذات یا برادری کے خلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ جہاد کے اصول خود اپنی ذات کی اصلاح کے لیے بھی ہوتے ہیں خود اپنی ذات کو برائی سے بچانے کے لیے اور اچھائی حاصل کرنے کی غرض سے اپنی روح کی صفائی کے لیے اپنے قلب اور روح کی غلاظت دور کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ روح و جسم پاکیزگی حاصل کر کے لطافت کے درجات پالے اور یہ درجہ پانے کے لیے بھی جہاد ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاد کا مقصد ایک ایسی قیمتی شے کا حصول ہے جو زندگی کی آسائشوں سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور اس سے زندگی کی اعلیٰ اقدار حاصل ہوتی ہیں اور یہی نہیں بلکہ یہ اعلیٰ اقدار آخرت کے مقصود تک پہنچاتی ہیں۔

ایک فرد جو جہاد میں اپنا قیمتی اثاثہ اللہ کی ذات کے لیے قربان کرتا ہے وہ اس دنیا میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اور جن کو وہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہ بھی اس کے

جہاد سے استفادہ اٹھاتے ہیں۔ یہ جہاد کرنے والا دوسروں کے کل کو بچانے کی خاطر اپنے آج کو قربان کر دیتا ہے۔ لیکن ان کی قربانی صرف اللہ کی رضا کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے جہاد مسلم معاشرے کے ہر فرد کے لیے فرض کر دیا گیا ہے۔ اس کی قابلیت اور ذرائع کے مطابق۔

(۹۴) جہاد کے مختلف پہلو

معلوم ہوا ہے کہ جہاد کے بنیادی طور پر تین پہلو ہیں:

(الف) مسلح:

مسلح جہاد میں بھی تین ہی پہلو ہیں:

i) جہاد اپنے دل کی گہرائیوں سے اور زبان سے

ii) جہاد مال اور دولت یا دیگر ذرائع سے

iii) جہاد اپنی ذات سے یعنی اپنی زندگی کو اللہ کی خاطر پر خطر ترین راستے پر گامزن کرنا۔

اس بارے میں سورۃ الصف (۶۱) کی آیات (۱۰-۱۳) اور جناب رسالت مآبؐ کی حدیث جو امام مسلم نے بیان کی پیش خدمت ہے: "اے تم جو ایمان لائے ہو! کیا میں تمہیں ایک کاروبار بتاؤں جو تمہیں ایک بہت بڑے عذاب سے بچائے اور وہ یہ کہ تم اللہ پر ایمان لے آؤ اور اس کے رسولؐ پر بھی۔ اور تم شدید جدوجہد کرو اور لڑو اللہ کی خاطر، اپنی دولت اور اپنی زندگیوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو (اگر تم ایسا کرو گے تو)، وہ (اللہ) تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور تمہیں داخل کرے گا جنت میں ایسے باغات کے اندر جہاں دریا بہہ رہے ہوں گے اور خوشگوار عمدہ رہائش ہوگی (تمہارے لیے)، بے شک یہ بہت بڑی کامیابی ہے"۔ (سورۃ (۶۱) کی آیت (۱۰-۲)

(حدیث) فرمایا جناب رسالت مآبؐ نے کہ "جو کوئی بھی ایمان والوں میں سے دیکھے کوئی برائی تو اس پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اس برائی کو اپنے ہاتھوں سے روک دے، اگر وہ ایسا کرنے سے معذور ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ کوشش کرے اس کام کو روکنے کی اپنی زبان سے (یعنی انہیں نصیحت کرے) اگر وہ اس عمل پر بھی قادر نہیں ہے تو (اس درجے کی معذوری کی صورت میں) اسے چاہیے کہ وہ اس کام کو دل سے برا سمجھے اور اس سے نفرت کرے بیشک یہ اس کے

ایمان کا کمزور ترین درجہ ہوگا''۔

(ب) جہاد کی اقسام:

جہاد کی چار اقسام معلوم ہوتی ہیں:

(i) شیطان سے جہاد

شیطان برائیوں کا منبع اور انسان کا بدترین دشمن ہے، ان کے ایمان و مذہب کا لحاظ کیے بغیر۔ وہ فرمانبرداروں کو اپنی گرفت میں لینا پسند کرتا ہے اور اس کا مقصد ایمان والوں کو ان کے ایمان سے متزلزل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ غیر مسلموں پر ایسا جادو چلاتا ہے کہ وہ اپنے غیر ایمانی ارادوں پر قائم رہیں۔ اس لیے ایک مومن کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ جہاد کی حالت میں رہے یعنی اپنی پوری زندگی اس جدوجہد میں گذارے کہ شیطان کی شرارتوں اور فتنہ فساد سے بچتا رہے، اور اپنے ایمان سے ذرہ برابر ادھر اُدھر نہ ہو۔

سورہ الفاطر (۳۵) کی آیت (۶) میں اس بارے میں کہا گیا ہے کہ ''یقینی طور پر شیطان تمہارا دشمن ہے لہٰذا اسے اپنا دشمن ہی سمجھو (یعنی اس کے وار سے بچو)، وہ تو اپنے ماننے والوں کو صرف اس لیے اپنی طرف بلاتا ہے، کہ وہ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں ہمیشہ کے لیے چلے جائیں''۔

(ii) جہادِ نفس

انسانی روح اس کی مرضی اور اس کی خواہشات کی دو طاقتوں کے درمیان کشمکش میں رہتی ہے یعنی قلب اور نفس کی شر اور وسوسوں سے پاکیزگی یا ان سے بھرپور۔ چونکہ قلب ہی روح کی آماجگاہ ہوتا ہے، اس لیے روح کی پاکیزگی و طہارت صرف اللہ کی بندگی اور اس کی محبت سے ہی ممکن ہوتی ہے، بصورت دیگر شیطان قلب پر حملہ کرکے اسے اپنے زیر اثر لے آتا ہے اور اسے برائی کی گندگی سے پُر کر دیتا ہے۔ اور شیطان اپنے اس گھناؤنے کام میں مسلسل مصروف رہتا ہے اور کبھی رخصت نہیں لیتا۔ لہٰذا انسان کو اسی سے سبق سیکھ کر خود کو بھی مسلسل جدوجہد میں مصروف رکھنا چاہیے اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر عقل و دانش کو بروئے کار لاتے ہوئے سختی سے عمل پیرا رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے نفس اور روح کو اپنے ہی نفس اور شیطانی وسوسوں سے بچا سکے۔

قرآن حکیم سورۃ المائدہ (۵) آیت (۱۰۵) میں بیان کرتا ہے کہ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے انفس اس کی حفاظت کرو۔ اگر تم صحیح راستے یعنی اللہ کی ہدایت کی پیروی کرو گے اور

اس کام سے رک جاؤ گے جو غلط ہے تمہیں ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکے گا جو غلط راہ پر ہیں (یعنی وہ تمہیں بہکا نہیں سکیں گے) اور تم سب کو اپنے اللہ ہی کی طرف واپس لوٹنا ہے اور پھر وہ (اللہ) تمہیں بتلادے گا اس ہر کام کے متعلق جو تم کرتے تھے''۔ لہٰذا اپنے نفس کے شر پر نظر رکھنا اور اس سے ہر دم بچنا ہی جہادِ النفس ہے۔

(iii) مظلوموں کے لیے جہاد

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جو اس کے تابعدار ہیں بلاتا ہے اس جدوجہد کی طرف جو اللہ ہی کی خاطر ہو اور پھر ان مظلوموں کی خاطر ہو جن پر معاشرے نے ظلم روا رکھے ہوں۔

قرآن کی سورۃ النساء (۴) کی آیت (۷۵-۷۶) میں رب کریم نے فرمایا کہ: ''تمہارے پاس کیا جواز ہے کہ تم اللہ کی راہ میں لڑتے نہیں اور بے کس و بے بس لوگوں کی خاطر، جن میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی اور بچے بھی، جو پکارتے ہیں کہ ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں بچائیے اس جگہ سے جس کے لوگ ظالم ہیں اور آپ ہمارے لیے ہم میں سے کسی کو نکالیے جو ہمیں بچائے اور آپ ہمارے واسطے ہم ہی میں سے کسی کو نکالیے جو ہماری مدد کرے (۷۵) وہ جو ایمان لائے لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور وہ جو ایمان والے نہیں ہیں لڑتے ہیں شیطان کے واسطے پس شیطان کے دوستوں کے خلاف لڑو، بے شک شیطان کی چال بے اثر ہوتی ہے (۷۶)''۔

(iv) اسلامی معاشرے یا علاقے کے لیے جہاد

ہر نوجوان جو اتنی صلاحیت رکھتا ہو اور اسکا تعلق کسی بھی مسلمان معاشرے یا علاقے سے ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے علاقے اور معاشرے میں سے اندرونی یا بیرونی کسی بھی خلفشار یا حملے کو خواہ وہ سماجی ہو یا اخلاقی، معاشی ہو یا سیاسی ہو یا طاقت کے استعمال کے ذریعے سے اس کو ختم کرنا یا کسی اور طرح سے نقصان پہنچانا مقصود ہو تو ایسے ہر قسم کے حملے کو ختم کرنا اس کا فرض ہے۔ اب جہاں تک اس کے لیے عمل انفرادی کی ضرورت ہو تو اسے انفرادی جہاد کرنا ہوگا۔ لیکن جہاں اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہوگی اسے اس میں شرکت کرنا ہوگی اور ایسے جہاد کو جس میں جنگ یا قتال کا روکنا اور اس کا مقابلہ کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے کچھ شرائط ہیں اور وہ یہ کہ ایسا جہاد اجتماعی اور مملکت کی زیر نگرانی ہوگا۔ اور اس کی سربراہی چیف کمانڈر ہی کرے گا اور پھر اسی کی نگرانی میں سربراہی ہدایات اور کمانڈ کا ایک سلسلہ یا ایک کڑی چلتی چلی جائے گی۔ اور یہ جہاد

ایک منظم حکمت عملی کے تحت اللہ کی بندگی، اللہ کے بندوں اور اللہ کی زمین کو اللہ کی مرضی اور حکم کی خلاف ورزی سے بچانے کی خاطر اپنے سب سے قیمتی اثاثے یعنی مال اور جان کو قربان کر دینے کا نام ہے۔ اب ایسے ہر موقع پر ان افراد کی جان کا جانا یا نہ جانا یہ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوگا، فرد و ملت کا کام اپنے آپ کو پیش کر دینا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کی سورۃ آل عمران (۳) کی آخری آیت (۲۰۰) پیش خدمت ہے: "اے لوگوں جو ایمان لائے ہو! صبر کرو اور برداشت کرو اور اپنے دشمن سے مقابلے کے لیے مستعد ہو ہمہ وقت (یعنی اپنی مملکت کی حفاظت کے لیے ہر طرح سے انتظامات مکمل رکھو اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ) اور اللہ سے ڈرتے رہو (یعنی اس کی حکم عدولی نہ کرو) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔

قرآن کے علاوہ جناب رسالت مآبؐ کے اس بارے میں دو فرمودات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) امام بخاریؒ نے سہیلؓ بن سعد کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "رباط کا ایک دن (یعنی اپنے ملک کی حفاظت کرنے میں گزارا ایک دن) جو شخص اللہ کی خاطر ہو اس شخص کی بقیہ زندگی اور اس میں جو کچھ بھی ہے اس سے بہتر ہے"۔ یعنی معلوم ہوا کہ شخص اللہ کی راہ میں دشمن کے سامنے یا اس کے انتظار میں کھڑا ہونے میں مجاہد کا گزارا ہوا ایک دن، اس کی تمام زندگی سے بہتر ہے کیونکہ اس کی زندگی کا وہ دن اللہ تعالیٰ کو بہت پیارا ہے۔

(۲) امام ترمذیؒ نے جناب ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے سنا اللہ کے رسولؐ کو یہ کہتے ہوئے کہ "دو آنکھوں کو کبھی آگ نہ چھو سکے گی ایک تو ایسی آنکھ جو روئی ہو اللہ کے خوف سے اور دوسری ایسی آنکھ جس نے اللہ کی رضا کی خاطر رات گزاری ہو جاگ کر"۔

(ج) جہاد کے بنیادی اصول:

جہاد کے چھ بنیادی اصول معلوم ہوتے ہیں:

(i) نیت (مقصد و محرک)

جہاد کی نیت، مقصد اور محرک یقینی طور پر اللہ اور رسولؐ کے احکامات سے اخذ کیے گئے اصولوں، قوانین اور قواعد کے عین مطابق اور اللہ کو ہی راضی کرنے کے لیے ہونے چاہییں۔ ایسے افراد جو جہاد میں شمولیت اختیار کریں اور جو جہاد کا اعلان کریں ان کا کوئی بھی ذاتی محرک،

مقصد یا کوئی اپنا فائدہ حاصل کرنے کی نیت نہ ہونی چاہیے۔

امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے لکھا ہے کہ جب جناب رسالت مآبؐ سے پوچھا گیا کہ مجاہد کون ہے وہ جو بہت دلیری سے لڑا یا وہ جو دکھاوے کے لیے لڑا ہو؟ تو آپؐ نے جواب میں فرمایا "وہ جو اللہ کے مقصد حاصل کرنے یا اللہ کے راستے پر چلنے کے لیے لڑا ہو"۔

اسی طرح سے قرآن کریم کی سورۃ النساء (۴) کی آیت (۷۴) ان لوگوں کی رہنمائی کرتی ہے اور انکی شاباش دیتی ہے جو صرف اللہ کی خاطر لڑتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "ان لوگوں کو جو اپنی اس دنیا کی زندگی فروخت کرتے ہیں اپنی آخرت کے عوض (اور) لڑتے ہیں اللہ کے مقصد کے لیے، ان کو لڑنے دو۔ اور جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا مارا جائے گا یا فتحیاب ہوگا، ہم (اللہ) اسے عطا کریں گے اجر عظیم"۔

(ii) جہاد میں شمولیت کا فرض

جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے اس پر لازم ہے کہ وہ ہر اس بدی کے خلاف لڑے جس کی ابتدا دشمن نے کی ہو اسلامی معاشرے کے خلاف۔ جو شخص ذاتی طور پر جہاد میں شرکت کے قابل نہیں ہے، وہ پیچھے رہ کر ان مجاہدوں کی جو محاذ پر ہوں، مدد کر سکتا ہے بلکہ اسے کرنی چاہیے۔ ہر وہ شخص جو جس طرح سے بھی جہاد میں شریک ہونے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اسی حساب سے اپنے آپ کو ولی کے لیے یا جہاد کے لیے پیش کرے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس جہاد کی پکار لگانے والا شخص قانونی طور پر اس بات کا حقدار ہو کہ وہ قوم کو جہاد کے لیے بلائے۔

اس سلسلے میں سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۲۱۶) میں فرمان رب کریم ہے کہ "لڑائی تم پر فرض کی گئی ہے (اے ایمان والو) چاہے تم اسے ناپسند کرو، یہ کہ تم ایسی چیز کو ناپسند کرتے ہو جو تمہارے لیے اچھی ہے اور تم ایسی چیز کو پسند کرتے ہو جو تمہارے لیے بری ہے (اور بس) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

(iii) صحیح یا قانونی حکم دینے کا مجاز

قانونی حکم کے اعتبار سے جہاد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا کیونکہ ہر حصے کے لیے جہاد کا حکم دینے کا اختیار علیحدہ علیحدہ شخصیتوں کو ہے۔

☆ شیطان اور نفس کے ساتھ جہاد

☆ مظلوموں یا ملک کے لیے جہاد

۱) شیطان اور نفس کے ساتھ جہاد کرنے کا صحیح حکم دینے کی مجاز درج ذیل تین طاقتیں یا ذرائع ہیں:

الف) اللہ کا حکم جسے قرآن اور اسوہ حسنہ قول و فعل جناب رسالت مآبؐ سے اخذ کیا جائے گا۔

ب) ایسے وضع کردہ قوانین جو لاگو کیے جائیں اجتہاد (علماء کے اتفاق) سے یا قیاس (ذاتی استخراج) سے جو اخذ کیے جائیں گے قرآن اور سنت سے۔

ج) اپنا ذاتی حکم اپنی ہی روح کو اور جسم کو روکنے کے لیے برائیوں سے غلط خواہشوں سے اور برے کاموں سے۔

۲) مظلوموں یا ملک کے لیے جہاد کرنے کا صحیح حکم دینے کی مجاز طاقتیں درج ذیل ہیں:

الف) اللہ کے حکم کا اطلاق ہونا ضروری ہے کسی بھی جنگ کو شروع کرنے کے لیے۔ اور پھر ان تمام قوانین کا احترام جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دوران جنگ لاگو کیے ہیں۔

ب) سربراہ مملکت کا فرض ہے کہ وہ اعلان جہاد کرے جسے اس کا اختیار ہے۔ جب اعلان جہاد ہو جائے اور وہ اعلان شرعی تقاضے بھی پورے کرتا ہو تو مملکت کے تمام جوانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے اور دیگر افراد پر ان کی مدد لازم ہو جاتی ہے۔

ج) جہاد کا حکم دینے والی طاقتوں یا افراد کا سلسلہ قائم رہنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ چیف کمانڈر سے لے کر لوکل کمانڈر تک ایک ہی حکم کی پیروی کی یقین دہانی کر لی جائے اور اس سلسلہ کا ہر حکم صحیح سمجھا جائے، جس کا تسلیم کرنا بھی فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم سورۃ النساء (۴) کی آیت (۵۹) میں بیان کیا گیا ہے فرمایا کہ "اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسولؐ کا اور ان کا جنکو تمہارے اوپر اللہ نے اختیار دیا ہو اور اگر تم کسی معاملہ میں ان سے اختلاف رکھتے ہو تو پھر اس معاملے میں رجوع کرو اللہ اور اس کے رسولؐ سے۔ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور روز آخرت پر یہی بہتر ہے حتمی فیصلے کے لیے"۔

امام بخاریؒ نے قلمبند کیا ابن عباسؓ کی روایت سے کہ یہ آیت عبداللہ بن حذیفہ کی بابت نازل ہوئی تھی جب ان کو ایک فوجی مہم کے لیے بھیجا تھا اللہ کے رسولؐ نے۔

(iv) لڑنے کی صلاحیت

کسی بھی اسلامی مملکت پر یہ لازم ہے کہ وہ ممکنہ حد تک اپنے دشمنوں کے خلاف لڑنے کی صلاحیت پیدا کرے اور ہر وقت اس کے لیے تیار رہے اور اس معاملہ میں کبھی غفلت نہ برتے۔ اس میں ہر قسم کی ایسی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے جس سے کہ وہ اپنی مملکت اور اس کے رہنے والوں کی عزت و آبرو بچا سکے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ عمل ضروری ہے کہ وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی اس حد تک کرے کہ اس کے قریب آنے کی کوئی جرأت نہ کر سکے تاکہ جنگ ہونے کا خطرہ ہی نہ رہے۔ بہر حال جنگ کوئی اچھی چیز نہیں اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے لیکن عزت و آبرو کے ساتھ۔

کسی بھی مملکت اسلامیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام جنگی ضروریات کو از خود پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کرے تاکہ وہ کسی دوسری طاقت کا مرہون منت نہ رہے۔ اور یہی کارفرمائی جنگ روکنے اور امن قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ امن قائم کرنا بھی مملکت اسلامیہ کا فرض عین ہے۔ اسے صرف اسی حالت میں جنگ کرنی ہوگی جب کہ جنگ اس پر مسلط کر دی جائے۔

اس معاملہ پر فرمان رب کریم جاننے کے لیے قرآن کی سورہ انفال (۸) آیت (۶۰) پیش خدمت ہے "اور ان (کافروں) کے مقابلے کے لیے تیار رکھو (یعنی ضروری اسباب) اور پلے ہوئے گھوڑوں کے ساتھ تاکہ اللہ کا دشمن خوف زدہ رہے اور تمہارا دشمن بھی اور ان کے علاوہ ایسے دشمن جنہیں تم نہیں جانتے لیکن اللہ انہیں جانتا ہے (اب گھوڑوں کی جگہ ٹینکوں، جہازوں، بحری جہازوں، میزائل وغیرہ نے لے لی ہے لہٰذا اب گھوڑوں کا مطلب سامان حرب لیا جائے گا) اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے اللہ کی راہ کے لیے (یعنی دفاع کے لیے وسائل و ذرائع) وہ تمہیں واپس کر دیا جائے گا اور تمہارے لیے کچھ کمی نہ ہوگی"۔

معلوم ہوا کہ طاقت حاصل کرنے کی تیاری جو قوم و ملت کے لیے کی جائے وہ فرض کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا جتنا بھی ممکن ہو تیاری کر لی جائے اور پھر اللہ کی ذات پر بھروسہ کیا جائے۔ اس کے بعد دشمن کی تعداد اور طاقت سے نہ ڈرنے کی ضرورت ہے نہ ہی گھبرانے کی۔ ضرورت صرف اچھی منصوبہ بندی اور یقین کی ہوتی ہے، جہاد کے لیے یقین محکم، تنظیم اور اتحاد کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے نہ کہ تعداد کی۔ اس کی ایک بہت بڑی مثال جناب رسولؐ اللہ نے جنگ موتہ کی صورت میں قائم کی جو آٹھویں ہجری یعنی ۶۲۹ء میں اس وجہ سے لڑی گئی کہ شام جو

مملکت روم کا حصہ تھا اس کے گورنر نے ایک مسلمان سفیر کو قتل کر دیا جو جناب رسول اللہ کا خط لے کر گیا تھا۔ اسکا انتقام لینے کی غرض سے جناب رسول اللہ نے تین ہزار جانثاروں کا ایک دستہ رومی فوج کے ایک لاکھ سپاہ سے لڑنے کی غرض سے بھیجا۔ یہ جان نثار دشمن کی یلغار کے مقابلے میں اس جرأت و بہادری سے لڑے کہ ان کے تقریباً دو ہزار جانباز شہادت پا گئے، جبکہ رومی لشکر کے مقتولوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ مسلمان اس بے جگری سے لڑے کہ رومیوں نے اپنے لیے کمک کی درخواست کر دی۔ حالانکہ جناب رسالت مآب کو علم تھا کہ ان کی فوج بہت قلیل ہے لیکن رومیوں کو صرف یہ بتانا اور جتانا مقصود تھا کہ ہم امت سے مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن اپنی تذلیل برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمیں فقط زندگی ہی عزیز نہیں بلکہ کسی مقصد کی خاطر موت کو بھی خوش آمدید کہہ سکتے ہیں تمہارا مقصد حیات تو صرف دنیا کی زندگی ہے لیکن ہم آخرت کے لیے جیتے اور جیتے بھی عزت اور آبرو کے ساتھ ہیں۔

بظاہر اگر دیکھا جائے تو ایک لاکھ تربیت یافتہ اسلحہ سے لیس منظم فوج کے ساتھ تین ہزار جانثاروں کا لڑنا، خودکشی کے مترادف تھا لیکن جناب رسول اللہ اپنی قوم کو یہ سبق دینا چاہتے تھے کہ ہمیں جینا ہے تو عزت و وقار کے ساتھ۔ اس لیے ایک مومن میں جذبہ جہاد کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اور جذبہ جہاد کا مطلب ہے "عزت کے لیے اور سچائی کے لیے مرنے تک کی خواہش" اور یہ فلسفہ برعکس ہے "جینے کی خواہش کے"۔ لیکن مومن کی موت دوسروں کے لیے امن کا پیغام لاتی ہے، ان کے لیے عزت کی زندگی لاتی ہے اور ان کی آج کی قربانی ان کے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے صبح بہاراں لاتی ہے۔

(۷) جنگ میں لازم اوصاف

۱۔ ثابت قدمی:

اس سلسلے میں قرآن کی سورۃ انفال (۸) کی آیت (۱۵-۱۶) ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اس کے مطابق فرمایا گیا ہے کہ: "اے وہ جو ایمان والے ہو! جب تم ان کافروں سے ملو کسی میدان جنگ میں تو کبھی بھی اپنی پیٹھ اُن کی طرف نہ موڑنا اور پھر جو کوئی بھی اپنی پیٹھ موڑے گا سوائے اس کے کہ وہ جنگ کی کوئی چال ہو یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملنا ہو تو بے شک اس نے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کو دعوت دی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا بے شک وہ بہت بُری جگہ ہے"۔

۲۔ رویے میں صبر اختیار کرنا:

امام بخاریؒ و مسلمؒ نے عبداللہ بن ابی عوفیؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک جنگ کے دوران اللہ کے رسولؐ نے انتظار فرمایا سورج کے غروب ہونے تک اور پھر آپؐ نے کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا "اے لوگو! دشمن سے لڑائی کی خواہش نہ کرو اور اللہ سے دعا کرتے رہو کہ وہ تمہیں مصیبتوں سے بچائے۔ اور اگر تمہیں دشمن کا سامنا کرنا ہی پڑ جائے تو پھر صبر کے ساتھ اس کا مقابلہ کرو۔ اور پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جنت تو تلواروں کے سائے میں ہی ہے"۔

۳۔ تنظیم اور خلوص:

کوئی بھی جنگ نظم و نسق اور خلوص کے بغیر نہیں جیتی جا سکتی، یہ خواص دشمن پر قابو پانے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ابن کثیرؒ نے قرآن حکیم کی سورۃ الصف (۶۱) کی آیت (۴) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے سعد بن جبیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ کوئی جنگ شروع ہونے سے پہلے جناب رسول اللہ اپنے ساتھیوں کی قطاریں سیدھی کرواتے اور ایک دوسرے کو ملا ہوا رہنے کو کہتے یعنی درمیان میں کوئی خالی جگہ نہ رہے۔ اسی طرح سے نماز میں بھی امام یہی کہتا ہے کہ کندھے سے کندھا ملا کر رکھیں اور آج بھی فوجیوں کا یہی دستور ہے کہ تختے کے سامنے کمر اور کندھے کے ساتھ کندھا اور سینہ باہر نکلا ہو۔ اور یہی حالت تنظیم و جرأت اور وقار کو ظاہر کرتی ہے۔

سورۃ الصف کی آیت (۴) میں فرمایا گیا کہ "بے شک! اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو لڑتے ہیں اللہ کے مقصد کے لیے، قطار در قطار جیسا کہ وہ ایک سخت دیوار ہوں"۔

اسی طرح سے سورۃ الحج (۲۲) کی آیت (۷۸) کے شروع میں بیان کیا جا رہا ہے کہ "شدید جانفشانی سے اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ جدوجہد کرنے کا حق ہے"۔ یعنی خلوص اور تنظیم کے ساتھ۔

۴۔ اللہ کے سامنے عاجزی و انکساری:

اللہ کے غلاموں کو ان کی طاقت اور ذرائع پر غرور و تکبر زیب نہیں دیتا اور انہیں یہ بھی نہیں سوچنا چاہیے کہ وہ دشمن سے زیادہ اعلیٰ اور طاقتور ہیں۔ لیکن ان کا کام ہے کہ وہ پوری توجہ سے اپنے تمام ذرائع استعمال کرتے ہوئے اپنی بہترین طاقت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنے کی تیاری کریں اور پھر اس کے بعد اپنے آقا و مالک، اللہ سبحانہٗ کے سامنے اپنی تمام تر عاجزی و

انکساری کے ساتھ اس کی مدد طلب کریں کہ اللہ تعالیٰ انھیں دشمن پر غالب فرمائے۔

اس دعا کے علاوہ روزانہ کی پانچ وقت کی صلوٰۃ کی پابندی جنگ میں بھی ضروری ہے اور اس کی ادائیگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص رعایت بخشی ہے۔ وہ یہ کہ دوران جنگ یا کسی آفت کے دوران یہ صلوٰۃ صرف ایک رکعت کی رہ جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ امام دو رکعتیں پڑھتا ہے اور آدھے مقتدی اپنے فرائض انجام دیتے ہیں اور آدھے ایک رکعت پڑھ کر ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور وہ دوسری رکعت پڑھ کر صلوٰۃ مکمل کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں سورۃ النساء کی آیت (۱۰۲) اس بارے میں تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے مزید تفصیل کے لیے اس آیت مبارکہ کا مطالعہ کرلیا جائے۔ اس کے علاوہ سورۃ بقرہ کی آخری آیت میں ایک خاص دعا ہے جو جنگ کی تیاریاں مکمل کر کے میدان جنگ میں پہنچ کر اللہ کے حضور مانگنا چاہیے تاکہ اس کی رضا حاصل کی جاسکے۔ اس دعا کے الفاظ یوں ہیں: ”اے اللہ! ہمیں معاف فرمادے اور بخش دے ہمارے گناہوں کو اور ہماری خطاؤں کو بھی۔ اے ہمارے رب! ہمیں کسی مشکل میں نہ ڈالیے جیسے آپ نے ہم سے پہلے لوگوں کو مشکلوں میں ڈالا تھا اور ہم پر درگزر فرمایئے۔ اور ہمیں بخشش عطا فرمائے اور ہم پر رحم فرمایئے کیونکہ آپ ہمارے مالک اور کارساز ہیں اور ہمیں نصرت عطا فرما اور ہمیں غالب فرما کافروں پر“۔

یہ دعا مجاہدوں میں تسکین، قرار، دہشت اور رہابت قدری پیدا کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ انھیں کسی بھی غلط کام سے روکتی ہے اور وہ اللہ کے خوف سے بے خبر نہیں رہتے اور کوئی بھی غیر اخلاقی یا جنگی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ کیونکہ انھیں احساس رہتا ہے کہ انھیں تو اللہ کو راضی کرنا ہے، کہیں ان کی کسی حرکت کی وجہ سے اللہ ناراض نہ ہو جائے۔

۵۔ آداب جنگ:

اسلام میں جنگ ایک ناپسندیدہ عمل ہے لیکن جب حالات ناگزیر ہو جائیں، مسلمان مملکت، مسلمانوں کا جان و مال یا دین خطرے میں پڑ جائے اور امن و آشتی کا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے تو جنگ کا سہارا لے لینا چاہیے۔ یا یہ کہ دشمن پہل جنگ ہجا کر اسکو للکارے تو پھر اس کا جواب اس شدت کے ساتھ دیا جائے کہ آئندہ دشمن آپ کی طرف رخ نہ کر سکے لیکن دوران جنگ چند اخلاقی اصول اپنانے ضروری ہیں جنھیں آداب جنگ کہنا بھی بجا ہوگا۔ یہ قوانین اور

اصول خود اپنے لیے اور دشمن کے لیے بھی ضروری ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱) جب جنگ کی تیاری شروع کردی جائے، اس وقت سے جنگ کے ختم ہونے تک اپنے تمام جنگی معاملات کو نہایت رازداری میں رکھا جائے۔

۲) وقت ضرورت پر اپنے فوجیوں کی پہچان کی خاص نشانیاں جو دوست اور دشمن میں تمیز کر سکیں صحیح اور واضح طریقے سے بتانی ضروری ہیں۔

۳) اپنے فوجی دستوں میں ہر جگہ اور ہر سطح پر تنظیم، تعاون اور رابطہ رکھنا ضروری ہے۔

۴) جنگ شروع ہونے سے پہلے قانونی طور پر جنگ شروع کرنے والے فریق اور دشمن کو واضح طور پر خلوص کے ساتھ اس کا پیغام دے اور جنگ نہ شروع کرنے کی نصیحت کرے۔ یہ اس طرح سے بھی ہوسکتا ہے کہ وہ دشمن کو اسلام کی پیشکش کرکے اپنا بھائی بنالے یا اس سے صلح کرلے یا اس کے ساتھ کوئی معاہدہ کرلے۔ ان میں سے کسی بھی پیشکش کو قبول کرنے سے جنگ و جدل، تباہی و قتل و غارت سے بچا جاسکتا ہے۔ اور ان میں سے کسی پیشکش کو قبول کرنے سے کوئی چھوٹا نہیں ہو جائے گا بلکہ اس کی عزت افزائی ہوگی۔

۵) دوران جنگ بوڑھے افراد یا معذور یا عورتیں یا بچے یا مذہبی پیشوا کرنے والے لوگ پنڈت، پجاری، راہب، ربائی وغیرہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، صرف وہ لوگ جو بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوں گے وہ جنگ کے نتائج برداشت کریں گے۔

۶) دشمن کی جائیداد اور انکی فصلیں تباہ نہیں کی جائیں گی، لیکن ایسا مال و اسباب جو جنگ میں استعمال ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ دشمن کی جائیداد کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

۷) چونکہ فی زمانہ UNO اور انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کچھ تھوڑا بہت کام کررہی ہے لہٰذا جنگ کے سلسلے میں ان کے بنائے ہوئے قواعد کی پابندی بھی دونوں فریقین پر لازم ہوگی، کیونکہ یہ اقوام عالم کا متفقہ فیصلہ سمجھا جائے گا۔

(۹۵) تبدیلی قبلہ

قبلہ یعنی صلوٰۃ میں کھڑے ہونے کی سمت مسلمانوں کے لیے بھی وہی تھی جو عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے تھی یعنی بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ کی جانب۔ لیکن دوسری صدی ہجری کے

ماہ رجب یعنی جنوری ۶۲۴ء میں قبلہ کا رخ تبدیل کر کے کعبہ (مکہ) کی طرف کر دیا گیا جو اللہ کا پہلا گھر تھا، اس دنیا میں یعنی عبادت کی جگہ۔ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ کی طرف ہجرت کے بعد تقریباً ۱۶یا۱۷ ماہ تک صلوٰۃ ادا کی، اس تبدیلی کے درج ذیل چار وجوہ معلوم ہوتے ہیں:

الف) جناب رسالت مآبؐ کی یہ خواہش تھی۔

ب) تاکہ مسلمانوں کی بحیثیت قوم ایک الگ پہچان ہو سکے۔

ج) کعبہ کے احترام کی تجدید۔ کیونکہ یہ آدمؑ کے بعد ابراہیمؑ جو ابوالانبیاء کہلاتے ہیں، ان کی عبادت کی جگہ تھی اور دنیا کی پہلی مسجد تھی اور ابراہیمؑ کے وقت سے لے کر آج تک لوگ اس کا حج کرتے ہیں یعنی دور دور سے آ کر اس کے گرد چکر لگا کر اللہ کی حمد و ثنا و تسبیح بیان کرتے ہیں۔

د) کعبہ کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہو گیا جب سے اسے اللہ نے اپنے گھر کا درجہ دے کر محترم قرار دے دیا۔ کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کی آیت (۱۴۴) میں اس طرح سے دیا کہ "بے شک ہم (اللہ) نے دیکھا تمہیں اپنا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے، یقینی طور پر ہم بدل دیں گے تمہارے چہرے کا رخ مسجد حرام (کعبہ) کی طرف اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے کے رخ کو بدل لو (نماز کی حالت میں) اس کی طرف۔ یقینی طور پر وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی (یعنی یہودی اور عیسائی) اچھی طرح جانتے ہیں کہ (تمہارا رخ بدلنا) یہ سچائی ہے تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر تو نہیں جو تم کرتے ہو"۔

یہودیوں کو یہ تبدیلی پسند نہ آئی اور انہوں نے اس تبدیلی پر نکتہ چینی کی۔ قرآن حکیم کی سورت بقرہ کی آیت (۱۴۲) میں اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ یہودیوں نے کیا نکتہ چینی کی۔ انہوں نے کہا (آیت میں لکھا ہے) کہ "لوگوں میں سے بیوقوف کہیں گے کہ کس چیز نے (مسلمانوں کو) ان کو ان کے قبلہ سے پھیر دیا۔ جس کی طرف رخ کر کے یہ صلوٰۃ پڑھتے تھے؟ کہو (اے محمدؐ) کہ اللہ ہی کے ہیں دونوں مشرق اور مغرب۔ وہ اسے ہی ہدایت فرماتا ہے جسے وہ چاہتا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر گامزن ہو"۔

(۹۲) جنگ بدر

(الف) قریش کی ناراضی اور خوف:

قریش اہل مدینہ سے بہت زیادہ ناراض تھے کہ انہوں نے ان کے قافلوں کا پیچھا کیوں کیا اور ان کا مال و اسباب کیوں ضبط کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خوفزدہ بھی ہو گئے کیوں کہ اب اہل مدینہ کے اُن بدوؤں کے درمیان دفاعی معاہدے بھی ہو چکے تھے جو مکہ و شام کی شاہراہ پر مقیم تھے۔ اس کے علاوہ ان کی حیرانگی کی انتہا اور بھی زیادہ ہو گئی جب انہوں نے دیکھا کہ اہل مدینہ نے ان کے قافلہ کو اپنی ریاست سے تین صد میل دور، وہ بھی مکہ کے نزدیک بمقام نخلہ جو مکہ و طائف کی شاہراہ پر تھا، آلیا اور اس کا اسباب لوٹ کر لے گئے۔ یہ سب کچھ اہل مکہ میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس لیے انہوں نے اس کے تدارک اور حفظ ماتقدم کے لیے سوچ و بچار شروع کر دی۔

(ب) ابوسفیان کا تجارتی قافلہ:

اسی دوران مسلمانوں کا ایک دستہ جو نگرانی کے لیے گشت پر تھا انہوں نے اطلاع دی جناب رسولؐ اللہ کو کہ ابوسفیان کی سربراہی میں ایک تجارتی دستے کا گذر ہوا چاہتا ہے۔ وہ کاروان ملک شام سے آ رہا تھا مکہ جانے کے لیے اور اس کی نگرانی و حفاظت پر چالیس شخص معمور تھے۔ یہ قافلہ ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا جو سامان تجارت سے لدے ہوئے تھے اور جس کی مالیت پچاس ہزار دینار یعنی سونے کے سکے تھے۔ مکہ کے تقریباً ہر گھرانے کا مال اس میں لگا ہوا تھا، اس لیے ہر کوئی اس کے انتظار میں تھا۔

(ج) رسول اللہؐ کا دشمن کو گھیرنے کا فیصلہ:

جناب رسالت مآبؐ نے بغیر کوئی وقت ضائع کیے مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور اس بات پر راضی کیا کہ فوراً اس کاروان کو آلیا جائے اور انہیں ایک اچھے انعام کا عندیہ بھی دیا۔ کچھ لوگ تو اس کے لیے خوشی سے راضی ہو گئے لیکن کچھ ہچکچائے۔ دوسری طرف کچھ غیر مسلم جانے کے لیے از خود تیار ہو گئے۔ لیکن رسالت مآبؐ نے قبول نہ فرمایا یہ کہتے ہوئے کہ "تمہارا ایمان تمہاری مدد سے زیادہ ضروری ہے"۔

(د) ناپسندیدگی کا اظہار کرنے والوں کے لیے اللہ کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی ناپسندیدگی کو ناپسند فرمایا جو قریش کے روبرو جانے سے کترا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ انفال (۸) کی آیت (۵) میں فرمایا کہ "جیسا کہ تمہارے رب نے (اے محمدؐ) تمہیں بھجوایا تمہارے گھر سے سچائی کے ساتھ اور بے شک تم میں سے کچھ لوگوں نے اسے پسند نہیں کیا"۔

حالانکہ ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی حکم دے چکے ہیں کہ جب تمہیں جہاد کے لیے بلایا جائے تو تم فوراً بغیر کسی ناپسندیدگی اور ہچکچاہٹ کے آگے آؤ۔

سورۃ بقرہ کی آیت (۲۱۶) میں فرمان رب العالمین ہے کہ "تم پر جہاد لازم کر دیا گیا ہے بے شک تم اسے ناپسند کرو۔ اور یاد تو یہ کہ تم ایسی چیز کو ناپسند کرو جو تمہارے لیے اچھی ہے اور یہ کہ تم ایسی چیز کو پسند کرو جو تمہارے لیے بُری ہے اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

(ہ) ابوسفیان کا حفظ ماتقدم:

اپنے سفر کو محفوظ بنانے کے لیے ابوسفیان بھی غیر معمولی حرکات و سکنات کی معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ لہٰذا اسے خبر ملی کہ مسلمان اس کے قافلے کی فکر میں ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی اس نے دو کام کیے:

i) اس نے فوری طور پر اپنا راستہ تبدیل کر کے دوسرے محفوظ راستے کا انتخاب کیا۔
ii) اس نے ایک شخص کو اجرت پر رکھا اور اسے مکہ روانہ کیا اور واقعات کی آگاہی کے ساتھ اہل قریش کو مدد کے لیے پکارا۔

(و) اہل قریش کا کارواں کے لیے انتظار و اضطراب:

مکہ کا ہر فرد بے چینی کے ساتھ اس قافلہ کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ ہر شخص کا مال و دولت اس میں لگا ہوا تھا۔ اسی دوران مکہ کی ایک لڑکی عاتکہ بن عبدالمطلب نے پکارنا شروع کر دیا کہ مکہ کے لوگ جلد ہی ایک مصیبت کا سامنا کرنے والے ہیں۔ چونکہ وہ لڑکی پیش گوئیاں کرنے کے لیے مشہور تھی، لہٰذا اہل مکہ نے اندازہ لگایا کہ آنے والی مصیبت یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے تجارتی کارواں کو کسی مصیبت کا سامنا نہ ہو گیا ہو۔ کیونکہ یہی ایک تجارتی شے تھی جس کا تمام مکہ والوں کو انتظار تھا۔ مکہ کا یہ دستور تھا کہ جب بھی قافلہ آنے کو ہوتا تو تین چار روز قبل اس کی اطلاع مکہ

پہنچا دی جاتی جو سر دار قافلہ کسی تیز رفتار قاصد کے ذریعہ بھجواتا تا کہ لوگ آنے والوں کا استقبال اور مال تجارت کو وصول کرنے کا بندوبست کر سکیں۔ لہٰذا ایک قاصد مکہ پہنچا لیکن اس کا لباس پھٹا ہوا اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے آتے ہی مکہ میں اعلان کرنا شروع کر دیا کہ "اے قریش کے لوگو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارا تجارتی قافلہ بہت خطرے میں ہے، محمدؐ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اسے لوٹ لے۔ اس لیے تم میں سے جو کوئی ذرہ بھر بھی شرم رکھتا ہو اسے اس قافلے کو بچانے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے"۔ یہی عرب کا دستور تھا کہ لوگوں کو ایسے موقع پر اسی طرح سے پیغام پہنچاتے، ایک قاصد کے ذریعے جس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے اور وہ جس اونٹ پر سوار ہوتا اس کے کان کٹے ہوئے اور ان میں سے خون ٹپک رہا ہوتا۔

(ز) مکہ کے لوگ بڑی متکبرانہ شان سے آگے بڑھے:

مکہ کے لوگ اس پکار پر اتنے جوش میں آ گئے کہ جلد ہی گھنٹوں میں نو صد سپاہی لڑنے کو جمع ہو گئے۔ اس کے علاوہ سات صد اونٹ اور ایک صد گھوڑے اور ساتھ ہی وہ خواتین جو اپنے گھر والوں کے انتظار میں تھیں وہ بھی آگے بڑھیں تا کہ اپنے جنگجوؤں کو بھڑکا سکیں۔ ابوجہل نے بھی اپنے خداؤں سے مدد مانگی اور اپنی قوم کے سامنے ایک پر جوش تقریر کی۔ اس کے بعد اس نے ان جنگجوؤں کی کمان سنبھالی اور مکہ سے اپنے قافلہ کی مدد کے لیے روانہ ہوا اور اللہ کے غلاموں کے خاتمے کی نیت سے بڑھا۔ راستے میں ہی انہیں ابوسفیان کا پیغام ملا کہ وہ اپنے کارواں کے ساتھ محفوظ طریقے سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے، اس لیے یہ لوگ واپس مکہ چلے جائیں۔ لیکن ابوجہل نہ مانا اور کہا نہیں! اللہ کی قسم! ہم لوگ واپس ہرگز نہ جائیں گے، جب تک کہ ہم بدر کے کنوؤں تک نہ پہنچ جائیں اور وہاں اپنے اونٹ ذبح کریں اور شراب پئیں اور پھر وہاں ہمارے لیے لڑکیاں گانے گائیں۔ یاد رہے کہ میدان بدر مدینہ سے نزدیک مکہ اور شام کی شاہراہ پر واقع ہے۔ اس کے بعد ابوجہل نے کہا کہ ان کے اس عمل سے عرب ان کی بہادری اور طاقت کی مثالیں بیان کریں گے۔ لیکن اس بدبخت کو علم نہ تھا اور صرف باری تعالیٰ ہی جانتا تھا کہ بدر کے کنویں اس کے ذلیل مردہ جسم کو اس کے بہت سے ساتھیوں سمیت سمونے کے لیے بیقرار ہیں۔ بلکہ وہ خود اپنے مردہ جسم کو ان کنوؤں میں ڈالنے کی کوشش میں بے چین تھا۔

قرآن کریم کی سورۃ انفال (۸) کی آیت (۴۷) اس متکبرانہ حرکت کو بیان کر رہی ہے اور

ساتھ ہی ساتھ ان اہل ایمان کو تنبیہ کر رہی ہے جنہوں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ جناب رسالت مآبؐ کا ساتھ دیا۔ آیت مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ "اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جو باہر آئے اپنے گھروں سے تکبر کے ساتھ اتراتے ہوئے، لوگوں کو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے اور اللہ سب کچھ سمجھتا ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب جانتا ہے اور ان کو گھیر لینے کے لیے کافی ہے"۔

(ح) جناب رسولؐ اللہ کی قافلے کی طرف روانگی:

جناب رسالت مآبؐ دوسری ہجری کے ماہ رمضان کی آٹھ تاریخ کو بدر کے میدان کی طرف نکلے تاکہ ابوسفیان کے قافلے کو آلیں۔ آپؐ کے ساتھ (۳۱۳) ساتھی جن میں (۱۷۳) مہاجر اور (۱۴۰) انصار تھے۔ آپؐ کے پاس کل ستر (۷۰) اونٹ اور دو (۲) عدد گھوڑے تھے۔ آپؐ نے اپنے بعد ام مکتومؓ کو جو نابینا صحابی تھے مدینے کے سربراہ کے طور پر چھوڑا۔ بعد میں آپؐ نے ابولبابہؓ کو ام مکتومؓ کی مدد کے لیے بھیجا۔ آپؐ کے رستے کے آگے تین علمبردار تھے، مصعب بن عمیرؓ کے پاس سفید پرچم، جبکہ علیؓ بن ابی طالب اور سعد بن معاذؓ کے پاس سیاہ علم تھے۔ جناب رسولؐ اللہ نے روانگی سے پہلے ایک نگران پارٹی روانہ کر دی تھی جو بسبس بن عمروؓ اور عدی بن ابی زغباءؓ پر مشتمل تھی۔ انہوں نے قریش کی نگران پارٹی کے دو لوگوں کو پکڑ لیا اور ان سے فوجی معلومات حاصل کر لیں، وہ یہ کہ ابوسفیان کا کارواں دوسرے راستے پر ہو لیا ہے اور مکہ کی فوج ابوجہل کی سربراہی میں آرہی ہے۔ یہ دونوں معلومات بہت کارآمد تھیں جن کے مطابق سوچنا اور غور کرنا ضروری تھا کہ مسلمانوں کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔

(ط) جناب رسولؐ اللہ کا اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورہ:

جناب رسالت مآبؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے لیے کہا۔ کیونکہ ان ساتھیوں کے ذہن میں اس قافلے پر حملہ بولنا تھا جس کی حفاظت صرف چالیس افراد کر رہے تھے۔ اور یہ کام (۳۱۳) افراد کے لیے معمولی تھا اور اس کے بدلے انہیں وافر مال و دولت بھی ہاتھ آتا۔ اب معاملہ الٹا ہو گیا، قافلے کا مال و اسباب بھی گیا اور سامنے (۹۵۰) بھرے ہوئے لوگ مقابلے کے لیے یعنی تین گنا لوگ۔ اس لیے ان (۳۱۳) میں سے کچھ نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی کیا اور یہ جواز پیش کیا کہ اگر انہیں اس صورتحال کا علم ہوتا تو وہ اس کے مطابق تیاری کر کے آتے۔

اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے ان کی اس پس و پیش اور متذبذبانہ کیفیت پر جو اللہ اور اس کے رسولؐ

کی مرضی کے خلاف تھی توجہ فرمائی اور امت مسلمہ کے ان بچے ہوئے لوگوں کو آگاہی بخشی اور انہیں متنبہ کیا اور اس کے لیے سورہ انفال (۸) کی آیات (۵-۶ اور ۷) کا نزول فرمایا جس میں فرمایا گیا ہے: "جیسا کہ آپ کے رب نے نکالا (اے محمدؐ) گھر سے باہر سچائی کے ساتھ (یعنی مصلحت کے ساتھ) اور بے شک ان ایمان والوں میں سے کچھ لوگوں نے اسے پسند نہیں کیا اور وہ اس کے لیے حجت کر رہے تھے تمہارے ساتھ۔ اس حقیقت کے لیے جو ہو چکی تھی (یعنی مقرر کر دی گئی تھی)، وہ اس طرح سے تکرار کر رہے تھے کہ گویا وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہوں اور وہ اسے یعنی موت کو دیکھ رہے ہوں۔ اور (یاد رکھو) جب اللہ نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا دو میں سے ایک کا (یعنی قریش کا مال یا ان کی فوج) کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گا۔ تم نے خواہش کی اس کی جو مسلح نہیں تھا (یعنی قافلے کے مال کی) لیکن اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ انصاف کرے سچائی کے ساتھ اپنے حکم سے اور کافروں کی جڑیں کاٹ دے (میدان بدر میں)"۔

اللہ تعالیٰ کے ان احکامات اور فرمودات میں مسلمانوں میں سے اُن لوگوں کے لیے آگاہی، روشنی، فتح اور نصرت ہے جو اللہ کی مرضی اور اس کی خاطر اس کے حکم پر ڈٹے رہتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے تنبیہ جو اللہ کی مرضی اور حکم پر مر مٹنے کے لیے سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور ہچکچاتے ہیں۔ محمد بن اسحاقؒ نے لکھا ہے عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے اپنے لوگوں سے مشورہ کیا اور ان کا خیال دریافت کیا، جب آپؐ کو قریش کے لشکر کے آنے کی خبر ہوئی۔ اس پر جناب ابوبکر صدیقؓ اٹھے اور آپؐ کی اطاعت کے بارے میں کچھ کہا، اسی طرح سے عمرؓ نے بھی کہا۔ جبکہ مقدادؓ بن اسود نے فرمایا "اے اللہ کے رسولؐ! قدم بڑھائیے جیسا کہ آپؐ کو اللہ نے حکم دیا ہے اور ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ اللہ کی قسم ہم یہ نہیں کہیں گے جیسا کہ اسرائیلیوں نے موسیٰ سے کہا تھا کہ "اے موسیٰ! ہم اس کے اندر نہ جائیں گے جب تک کہ وہ (قوم) وہاں پر ہے، پس تم جاؤ اور تمہارا رب اور تم دونوں لڑو۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں" (یہ واقعہ اور اقوال سورہ مائدہ (۵) کی آیت ۲۴ میں درج ہیں) بلکہ ہم کہتے ہیں جائیے آپؐ اور آپؐ کا رب اور لڑیے ہم بھی آپ دونوں کے ساتھ لڑیں گے۔ ہمیں اس کی قسم جس نے آپؐ کو سچائی کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپؐ فیصلہ کریں ہمیں ساتھ لے جانے کا، کسی دور دراز مقام کی طرف جیسا کہ برک الغماد ہے، ہم آپؐ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے"۔ رسولؐ اللہ مقدادؓ سے بہت خوش ہوئے

اور ان کے لیے دعا گو ہوئے۔

جناب رسولؐ اللہ نے دوبارہ فرمایا ''مجھے اپنا مشورہ دو، اے لوگو! میں تم سے سننا چاہتا ہوں''۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ انصار سے خاص طور پر سننا چاہتے تھے، کہ وہ کیا کہتے ہیں، کیونکہ انہوں نے آپؐ سے دو مرتبہ عقبہ کے مقام پر عہد کیا تھا کہ وہ آپؐ کی اس طرح سے حفاظت کریں گے جیسا کہ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ غالباً جناب رسولؐ اللہ کو گمان ہوا کہ کہیں انصار نے ان سے یہ عہد صرف مدینہ کے لیے ہی تو نہیں کیا تھا۔

بہرحال جب جناب رسولؐ اللہ نے دوبارہ مشورہ مانگا تو سعد بن معاذؓ نے فرمایا ''اے اللہ کے رسولؐ! کیا یہ آپؐ نے ہم لوگوں کے لیے فرمایا ہے (یعنی انصار کے لیے) تو جناب رسولؐ اللہ نے اقرار میں جواب دیا۔ پھر سعدؓ نے کہا ''ہمیں آپؐ پر پورا پورا ایمان ہے یعنی یقین اور بھروسہ ہے ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپؐ جو کچھ بھی لائے ہیں وہ سچ ہے اور آپؐ سے وعدہ اور اقرار کرتے ہیں وفاداری کا اور تابعداری کا۔ اس لیے قدم بڑھایئے اے اللہ کے رسولؐ جس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے۔ بے شک اس کی قسم جس نے آپؐ کو سچ کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپؐ فیصلہ کریں گے بحر احمر کو پار کرنے کا تو بھی ہم آپؐ کی اتباع کریں گے اور ہم میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ ہم پسند نہیں کرتے کہ ہم اپنے دشمن کو (آج کے بجائے) کل ملیں۔ بے شک ہم لوگ صبر والے ہیں اور جنگ میں غضبناک، اللہ آپؐ کو گواہ بنائے اور آپؐ کو ہم سے خوش کر دے۔ اس لیے قدم بڑھایئے ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ''۔ جناب رسولؐ اللہ سعدؓ کے اس اقرار سے بہت خوش ہوئے اور آپؐ کو بہت تقویت ملی۔

اب جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا ''قدم بڑھاؤ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ اور خوشخبری کے ساتھ کہ اللہ سبحانہٗ نے مجھ سے وعدہ فرمایا دو میں سے ایک کا یعنی کارواں کو پکڑنے کا یا بڑی فوج کو شکست دینے کا۔ اللہ کی قسم! میں تو دیکھ رہا ہوں کہ قریش کے لوگوں کا خاتمہ ہو رہا ہے''۔

(ی) قریش فوج کی حالات زار و سوچ و بچار:

قریش دستے کے نمایاں رہنما افراد کی یہ رائے تھی کہ اب انہیں لڑائی کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ان کا تجارتی کارواں خیریت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ابوسفیان نے بھی جو پیغام ان تک پہنچایا تھا اس میں بھی اس نے انہیں واپس جانے کی تلقین کی تھی۔ لیکن ابوجہل نے بہت غصہ

کے عالم میں اس تجویز کو رد کر دیا اور کہا کہ ''اللہ کی قسم! ہم اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک کہ ہم بدر میں تین روز تک قیام نہیں کرتے، اور اپنے چربی والے اونٹ ذبح نہیں کرتے اور ان کا گوشت نہیں کھاتے اور شراب نہیں پیتے، گانے اور ناچنے والی دوشیزاؤں کے ساتھ''۔

وہ دراصل مسلمانوں کو اپنی ان حرکات سے خوفزدہ کرنا چاہتا تھا اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر وہ واپس ہو گئے تو صحرا کے لوگ سمجھیں گے کہ وہ مسلمانوں کا سامنا نہیں کر پائے۔ لیکن اس کے ساتھی اب بھی ہچکچاہٹ میں تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اگر وہ واپس ہو گئے تو یہ ان کے لیے بزدلی کی کوئی نشانی نہ ہوگی۔ کیونکہ ان کے وہاں تک آنے سے ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ بہرحال قریش کے سرداروں نے بدر میں جا کر ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ وہاں وہ مسلمانوں سے جنگ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا فیصلہ دراصل اللہ کی رضا تھی اور بدر کا میدان ان لوگوں کی بدترین شکست اور ان کے متکبر سرداروں اور خود انکو اور ساتھیوں کی عبرتناک موت کا منتظر تھا۔ بے شک یہ لوگ بدقسمت ترین افراد تھے، جنہوں نے سچائی کو جھٹلایا اپنی جہالت اور متکبرانہ رویے کی وجہ سے۔

(ک) مسلمان فوج کی جنگی حکمت عملی:

جنگ بدر نے ایک فیصلہ کن معرکے کا کردار ادا کیا، دونوں فریقین کے درمیان، ہمیشہ کے لیے، حالانکہ بظاہر اور حقیقت میں بھی دونوں کے درمیان کوئی موازنہ نہ تھا۔ اہل مکہ طاقت میں بہت بہتر اور وسائل میں بھی بہت اعلیٰ تھے، ان مسلمانوں کے مقابلے میں جو بدر میں ان کے سامنے موجود تھے۔ لیکن یہ صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسے کی وجہ سے، اور اس کے رسولؐ کی برکتوں کی وجہ سے تھا اور ان کی تنظیم اور اتحاد کی وجہ سے تھا کہ وہ میدان جنگ میں اس زور آور دشمن کے سامنے بلند حوصلے سے ڈٹ گئے۔ اور سب سے بڑی بات کہ وہ جینے سے زیادہ حق کے لیے اور اللہ کے لیے اور اس کے رسولؐ کے لیے موت کی تمنا رکھتے، بلکہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتے تھے اور یہی وجہ تھی ان کی شاندار اور حیرت کن کامیابی کی۔ ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے پر خلوص تابعداری کی وجہ سے اللہ کی حمایت اور کرم فرمائی حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے غلاموں کے لیے بذات خود میدان جنگ کی حکمت عملی تیار فرمائی۔ اس بارے میں سورۃ انفال (۸) کی آیت (۴۲) میں الہام فرمایا کہ: ''(یاد رکھو) جب تم (مسلمان) وادی (بدر) کے

نزدیک والے کنارے پر تھے اور وہ (قریش) دوسرے کنارے پر دور کی طرف، اور (ابو سفیان کا) کارواں اس زمین پر جو تم سے نیچی تھی (یعنی سمندر کے نزدیک) اگر تم اور وہ مل کر کوئی بات ٹھہرا لیتے تو ضرور وہ کام ہو جاتے۔ لیکن تم اس سے ملے (یعنی فوج سے) جس کا فیصلہ اللہ نے پہلے سے کر رکھا تھا، اس لیے کہ انہوں نے جس کو تباہ ہونا تھا (اسلام ٹکرانے کی وجہ سے) تباہ ہو جائیں، کھلی نشانی آ جانے کے بعد (کہ اب وہ ایمان نہیں لائیں گے) اور جنہوں نے ابھی زندہ رہنا تھا (ایمان والے) زندہ رہ جائیں کھلی نشانی آنے کے بعد (یعنی کافروں کی شکست کے بعد)، اللہ تو تمام سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے''۔

وادی بدر دو پہاڑیوں کے درمیان پہاڑی اور ریتیلا علاقہ تھا، اس کے شمال میں اسفال کی پہاڑی جہاں پانی کے ذخائر بھی موجود تھے جہاں پر جناب رسول اللہ نے اپنے ساتھی حباب بن منذر کے مشورے پر اپنی فوج کو منتقل کیا۔ اس طرح پانی کے ذخائر آپ کے قبضے میں آ گئے اور آپ کی فوج پچھلی طرف سے پہاڑی کی وجہ سے محفوظ بھی ہو گئی۔ لہٰذا آپ نے پہاڑی ڈھلوان پر پڑاؤ ڈال دیا۔ آپ کی اس حکمت عملی سے دشمن کی پانی تک رسائی ناممکن ہو گئی اور اب وہ پہاڑ کے بالکل زیریں علاقے میں آ گئے۔

اپنی فوج کو صحیح طریقے سے پڑاؤ کر کے جناب رسول اللہ نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا اور کہا "عام طور پر اہل عرب ایک دوسرے سے دو بدو ہو کر لڑتے ہیں یعنی ایک سے ایک کا مقابلہ اور اپنی ذاتی بہادری، طاقت اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن ہم مسلمان صرف اللہ کی خاطر لڑتے ہیں جسے ہماری نیتوں کا بھی علم ہے وہ ہمیں دونوں طرح سے انعامات سے سرفراز کرے گا، چاہے ہم جئیں یا مر جائیں چونکہ ہم دشمن کے مقابلے میں ایک تہائی ہیں، لہٰذا ہمیں دشمن پر ایک ساتھ وار کرنا چاہیے''۔

چند ایک مورخین کا خیال ہے کہ جناب رسول اللہ نے مسلمانوں کو ایسی جنگی چال سکھائی جس کی ابتدا مقدونیہ کے فلپ نے کی تھی جو سکندر کا باپ تھا۔ اور جناب رسول اللہ سے ایک ہزار برس پہلے گزرا تھا، یہ جنگی چال یونانی زبان میں کلاسی (Felons) کہلاتی تھی، اس چال کے مطابق سپاہی کندھے سے کندھا ملاتے ہوئے ایک سکون بناتے یا ایک مربع یا مستطیل یا دائرہ سا کہ دشمن میں سے کوئی بھی ان کی پشت سے وار نہ کر سکے۔ لیکن ہم مسلمان یہ ایمان

رکھتے ہیں کہ یہ چال جناب رسول اللہ کی اپنی دانش کا نتیجہ تھی بلکہ اس حکمت کا نتیجہ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں الہام کے علاوہ عطا فرمائی تھی۔ ورنہ آپ نہ تو فلپ کو جانتے تھے نہ سکندر کو، ہو سکتا ہے کہ یہ حکمت آپ نے نماز سے سیکھی ہو جس میں ہم سیدھی قطاریں بناتے ہیں۔ تختے کے سامنے کھڑے اور کندھے کے ساتھ کندھا ملاتے ہیں اور یہی طریقہ دنیا کی تمام تر جدید افواج میں بھی رائج ہے جو ہم نماز میں اختیار کرتے ہیں۔ نماز میں ہمیں امام اس طرح کرنے کے لیے باقاعدہ ہدایت کر دیتا ہے اور فوج میں بھی کمانڈر اسی قسم کی ہدایت کرتا ہے۔

بہر حال جناب رسول اللہ نے اپنے ساتھیوں کو یاد کرایا کہ ان کا لڑائی سے گریز کرنا اور میدان سے بھاگنا ان کے لیے کسی کام کا نہ ہوگا کیونکہ وہ زیادہ سے زیادہ مدینہ تک چلے جائیں گے جہاں یہود اور مشرکین مل کر انہیں قریش کے حوالے کر دیں گے جو انہیں ذلت آمیز طریقے سے قتل کر دیں گے۔ اس کے بعد جناب رسالت مآب نے سورۃ انفال (۸) کی آیت (۱۵ اور ۱۶) کی تلاوت فرمائی جس کے مطابق کہا گیا کہ "جب تم کافروں کے سامنے دو بدو ہو جاؤ جنگ میں تو کبھی بھی اپنی پشت ان کی طرف نہ پھیرنا (یعنی ڈٹنا اور گھبرانا نہیں) اور پھر جو کوئی بھی ایسے موقع پر (یعنی جنگ میں) سوائے اس کے کہ وہ کوئی جنگی چال چل رہا ہو۔ یا اپنے ساتھیوں سے ملنے کے لیے جا رہا ہو۔ جو جنگ سے منہ موڑے گا وہ اللہ کا غضب مول لے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور بیشک یہ بدترین ٹھکانہ ہے''۔

اس کے بعد جناب رسالت مآب نے اپنے سپاہ کو ایک سکون کی صورت میں کھڑا کیا جس کے تینوں جانب ایک ایک علمبردار کھڑا تھا۔ بیشک یہ ایک انوکھا اور عجیب و غریب طریقہ تھا لڑائی کا، جسے اس سے قبل عربوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس طریقہ کار کو عربوں کا کیا ہی کہنا بجا ہوگا۔ اس کے بعد جناب سعد بن معاذ کی تجویز پر قدرے اونچی جگہ پر ایک سائبان باندھا گیا، مسلمان فوج کے سپہ سالار اعظم کے لیے۔ یہ سائبان ایک تو جناب رسول اللہ کی محبت اور عظمت کا مظہر تھا اور دوسرا یہ کہ آپ یہاں بیٹھ کر اپنی فوج کی کارکردگی سے آگاہ رہیں اور میدان جنگ آپ کی نظر میں رہے اور آپ خواطر خواہ ہدایات دیتے رہیں۔

(ل) جناب رسالت مآب کی اللہ کی مدد کے لیے مناجات:

امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ کیمپ نما خیمے میں قیام

پڑ رہے تھے، جنگ بدر کے روز تو آپؐ نے اللہ سے دعا مانگی: "اے اللہ! میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنا وعدہ پورا فرمائیں۔ اے اللہ! اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایمان والے تباہ ہو جائیں تو پھر آج کے بعد دنیا میں آپ کی پرستش کرنے والا کوئی نہ ہوگا"۔

اس پر جناب ابوبکرؓ نے آپؐ کے ہاتھ تھام لیے اور عرض کیا "یہ کافی ہے اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے کافی حد تک اللہ کے حضور اپنی عرض پیش کر دی"۔

اس موقع پر جناب رسالت مآبؐ ابوبکرؓ کے دونوں بازوؤں کے درمیان تھے اور سورۃ القمر (۵۴) کی آیات (۴۵-۴۶) کی تلاوت فرما رہے تھے جس کا متن ہے کہ "ان کی جماعت کی کثرت بھاگ جائے گی اور وہ اپنی پیٹھیں دکھائیں گے بلکہ قیامت کے روز ان سے اصل وعدہ پورا کیا جائے گا (یعنی جہنم کا وعدہ) اور قیامت کی گھڑی بہت شدید اور ناگوار ہوگی"۔ بے شک یہ قریش کی شکست اور ان کے قتال کی پیش گوئی تھی۔ یہ آیات واضح طور پر قریش کے قتال اور شکست کو ظاہر کرتی ہیں جو بدر کے میدان میں ہوا جبکہ اسی سورت یعنی القمر کی آیت (۴۱ اور ۴۲) فرعون اور اس کی فوج کے متعلق ہیں جن کی تباہی جناب موسیٰ کے خلاف کرنے پر ہوئی۔ اللہ نے وہاں بھی جناب موسیٰ اور ان کی قوم کو بچا کر فرعون اور اس کی قوم کو غرق کر دیا تھا۔ اسی طرح سے سورۃ القمر کی آیت (۴۳) کافروں کو خبردار کرتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نافرمانوں کا حشر ویسا ہی ہوگا جیسا کہ فرعون اور اس کی قوم کا ہوا تھا۔

(م) مسلمانوں پر نزول سکینت:

اللہ تعالیٰ نے میدان جنگ میں رات کے وقت مسلمانوں پر سکینت طاری فرما دی اور وہ بہت آرام اور سکون سے سوئے، ورنہ میدان جنگ میں نیند کا نہ آنا قدرتی امر ہے۔ اس طرح سے ایک تو وہ لڑائی کے خوف سے بچ گئے اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی نیند پوری کر کے صبح کو چاق و چوبند ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جو خاص مہربانی ان پر فرمائی اس کا ذکر سورہ انفال (۸) کی آیت (۱۱) میں اس طرح سے کیا گیا ہے کہ: "(اس وقت کو یاد کرو) جب اللہ تعالیٰ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اپنی طرف سے تمہیں چین دینے کے لیے اور (اس سے قبل) تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ اس پانی کے ذریعے سے تم کو پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسہ دور کر دے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تمہارے قدم جما دے"۔

ابن کثیر نے ابو یعلیٰ کی روایت سے لکھا کہ صرف مقدادؓ کے پاس بدر میں ایک گھوڑا تھا اور میں نے دیکھا کہ ہم میں سے سب سو گئے تھے، سوائے اللہ کے رسولؐ کے۔ جو ایک درخت کے نیچے الصلوٰۃ ادا کر رہے تھے اور اس میں زار و قطار گریہ زاری فرماتے رہے صبح تک۔

عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ "اونگھ جنگ کے میدان میں اللہ کی طرف سے حفاظت ہے جبکہ نماز میں یہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہے"۔

قتادہؓ نے کہا کہ "اونگھ ذہن کو متاثر کرتی ہے جبکہ نیند دل کو متاثر کرتی ہے اس لیے اونگھ بدر کے شرکاء کے لیے اللہ کی طرف سے رحمت تھی"۔

بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے لکھا ہے اور ابن کثیر نے حوالہ دیا ہے کہ بدر والے روز جناب رسول کریمؐ اور جناب ابوبکرؓ اللہ سے مدد کی درخواست کر رہے تھے کہ اچانک جناب رسول اللہ پر اونگھ وارد ہوئی اور آپؐ مسکراتے ہوئے جاگ گئے اور فرمایا "خوشخبری اے ابوبکر! یہ جبرئیل تھے اور ان کے کندھوں پر گرد تھی"۔ اس کے بعد آپؐ نے وہ الفاظ ادا فرمائے جو سورۃ القمر (۵۴) کی آیت (۴۵) کے تھے اس میں فرمایا گیا کہ "ان کی (کافروں کی) کثرت کو بھگا دیا جائے گا اور وہ اپنی پیٹھیں دکھائیں گے"۔

(ن) جناب رسول اللہؐ کو کافروں کی تعداد بہت کم لگی:

مجاہدؒ اور ابن اسحاقؒ نے سورہ انفال (۸) کی آیت (۴۳) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دکھایا کافروں کو تھوڑی سی تعداد میں اور پھر جناب رسول اللہؐ نے یہ خبر اپنے ساتھیوں تک پہنچائی ان کی تسلی کے لیے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ "جب اللہ نے تمہاری خواب میں ان کو (کافروں کو) بہت تھوڑا کر کے دکھایا اگر وہ (اللہ) تمہیں دکھاتا جتنے کہ وہ تھے تو تم یقیناً ہمت ہار جاتے اور پھر فیصلہ کرنے میں اختلاف کرتے لیکن اللہ نے تمہیں یقینی طور پر بچا لیا۔ وہ سب کچھ جاننے والا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے"۔

(س) جناب رسول اللہؐ نے اپنے تصور میں قریش کا قتال دیکھا:

جب قریش کے دو شخص جنگ سے پہلے پکڑے گئے تھے اور ان سے پوچھا گیا تھا کہ بدر کی طرف قریش کے کون سے سردار آ رہے ہیں تو انہوں نے پندرہ کے نام بتائے ابوجہل سمیت۔ اس پر جناب رسول اللہؐ نے اپنے تصور میں دیکھا کہ قریش کے یہ سردار کٹ رہے ہیں اس پر

آپؐ نے فرمایا کہ ''یہ مکہ ہے! اس نے اپنے بہترین بیٹے تمہارے سامنے لا رکھے ہیں''۔

اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے الفاظ جو سورہ انفال (۸) کی آیت (۴۴) میں فرمائے گئے ہیں وہ بھی جناب رسولؐ اللہ کے اس قیاس کی تائید کر رہے ہیں جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ''اس لیے وہ جن کو ہلاک کرنا ہے (اسلام کو ٹھکرانے کی وجہ سے) ہلاک ہو جائیں گے ایک کھلی نشانی کے بعد (یعنی بدر کے روز)''۔

امام بخاریؒ نے ایک روایت عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے لکھی ہے کہ ''جناب رسولؐ اللہ جب کعبے کی طرف منہ کر کے قریش کے چند لوگوں کے لیے بد دعا فرما رہے تھے مثلاً شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ اور عمر بن ہاشم (ابوجہل) کے لیے، اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں، اللہ کی قسم! کہ میں نے دیکھا ان تمام لوگوں کو بکھرا ہوا اور سورج کی تپش سے سڑا ہوا کیونکہ وہ دن (بدھ کا روز) بہت زیادہ گرم تھا''۔

(ع) جنگ کے قوانین اور آداب:

ایمان والوں پر فرض ہے کہ وہ لڑائی کے اصول و آداب کا خیال رکھیں اور لڑائی میں چاک و چوبند، ہمت اور صبر کے ساتھ رہیں اور کسی بھی اخلاقی اصول کی خلاف ورزی نہ کریں، اپنے کسی بھی دشمن کے ساتھ۔ یہ اخلاقی قوانین اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات میں مقرر فرما دیے ہیں۔

i) سورۃ انفال (۸) کی آیت (۴۵-۴۶) میں فرمایا گیا ہے کہ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم کسی دشمن کی فوج سے آمنے سامنے ہو تو استقلال اور ہمت کے ساتھ ان کے آگے ڈٹ جاؤ۔ اور یاد رکھو اللہ کو بہت زیادہ (یعنی اللہ کا ذکر بھی کرتے رہو) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اللہ کا حکم مانو اور اس کے رسولؐ کا اور آپس میں ایک دوسرے سے نہ الجھو ایسا نہ ہو کہ تم ہمت اور طاقت کھو دو اور صبر سے رہو، یقیناً اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے''۔

ii) اللہ تعالیٰ دشمن کے سامنے سے پھر جانے کو یعنی میدان جنگ سے بھاگنے کو پسند نہیں فرماتا اس سلسلے میں سورۃ انفال کی آیات (۱۵-۱۶) میں فرمایا گیا ہے کہ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم ان کے سامنے آ جاؤ جو کافر ہیں، کسی میدان جنگ میں تو کبھی بھی اپنی پشت ان کی طرف نہ پھیرنا اور جو کوئی بھی ایسے وقت میں اپنی پشت پھیرے، سوائے اس کے کہ وہ کوئی جنگی چال ہو یا وہ اپنے ساتھیوں سے مل رہا ہو تو بے شک اس نے اللہ کے

عذاب کو دعوت دی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، بے شک وہ ٹھکانہ بہت ہی برا ہے''۔

iii) سورہ البقرہ (۲) کی آیت (۱۹۰) ایک بہت ضروری قانون کی طرف اشارہ کرتی ہے جو جنگ سے متعلق ہے اس میں کہا گیا ہے کہ: ''اللہ کی راہ میں لڑو ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑیں لیکن (اخلاقی) حدوں کو پار نہ کرنا، بے شک اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں فرماتا''۔

یعنی وہ دشمن جو ہمارے ساتھ لڑنے سے رک جاتا ہے یا لڑنا نہیں چاہتا، اس کے ساتھ ہمیں بھی نہیں لڑنا چاہیے۔ لیکن جب وہ اخلاقی حدوں کو پامال کرے گا تو اس سے لڑنا ضروری ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو صرف اللہ کی وجہ سے ہی لڑنا ہے لیکن لڑائی میں لڑائی کی مروجہ اور طے شدہ اصولوں کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ الحسن بصریؒ نے فرمایا کہ ان اصولوں کو پامال کرنا یہ بھی ہے کہ لاشوں کی بے حرمتی کی جائے، دشمن کی ملک چوری کرنا، عورتوں کو قتل کرنا، ان کی بے حرمتی کرنا اور بچوں کو قتل کرنا اور بوڑھوں کو اور ان کو جو جنگ میں شریک ہی نہیں ہیں، اس میں عبادت خانوں کے مکین اور اس سے متعلق افراد بھی شامل ہیں۔ درختوں اور کھیتوں کو جلانا اور جانوروں کو قتل کرنا بغیر کسی فائدے کے (یعنی کھانے کے لیے کر سکتے ہیں) یہ اجتہاد جناب ابن عباسؓ، جناب عمرؓ بن عبدالعزیز، مقتل بن حیانؒ اور بہت سوں کا ہے۔

iv) ایک اور بہت ضروری لڑائی کا قانون یہ ہے کہ جب دشمن ہتھیار ڈال دے اور مزید لڑائی نہ کرنا چاہے یا لڑنے پر پشیمان ہو یا کوئی معاہدہ کرنا چاہتا ہو اس کے لیے ایمان والوں کو لڑائی روک دینی چاہیے اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کا حکم بہت واضح ہے۔ سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۱۹۲) میں فرمایا گیا ہے کہ ''لیکن اگر وہ (یعنی دشمن) جنگ روک دے تو پھر اللہ معاف کرنے والا بہت رحم کرنے والا ہے''۔

(ف) اللہ کی مدد بارش کے ساتھ:

ابن کثیرؒ نے امام محمد بن اسحاق بن یاسر کے حوالے سے لکھا کہ یزید بن رومان نے کہا کہ عروہ بن زبیرؓ نے کہا کہ (بدر کے روز) ''اللہ تعالیٰ نے ریتلی وادی پر بارش برسائی جس سے وہ علاقہ ٹھہر گیا یعنی مستحکم ہو گیا اور اس پر چلنا پھرنا آسان ہو گیا مسلمانوں کے لیے۔ جبکہ وادی کا نشیبی علاقہ

جہاں قریش مقیم تھے وہاں کیچڑ بھر گیا اور اس طرح سے وہ چلنے پھرنے کے لیے دشوار ہو گیا"۔
مجاہدؒ نے بھی لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر بارش بھیجی سکینت سے پہلے بارش نے ریت کو جما دیا، زمین مضبوط ہو گئی اور ان کے لیے آسانی پیدا ہو گئی تاکہ وہ اپنے پاؤں جما کر زمین پر رکھ سکیں"۔

سورۃ انفال (۸) کی آیت (۱۱) بھی اس بات کی تائید کرتی ہے "یہی بارش ایک رحمت کے طور پر نازل کی گئی مسلمانوں کے لیے اور زحمت بنا دی گئی کفار کے لیے"۔

(ص) ابتدائے جنگ:

(i) دونوں افواج روبرو

یہ رمضان المبارک کی سترہ (۱۷) تاریخ کی صبح تھی اور جمعہ کا مبارک دن اور ہجرت کا دوسرا سال یعنی ۱۳ مارچ ۶۲۴ء کہ اللہ کے غلام اور اس کا رسولؐ کفار کا سامنا کر رہے تھے، بدر کے میدان میں۔ مسلمان ایک تہائی تھے یعنی (۳۱۳) جبکہ کفار تھے (۹۵۰) اور مسلمانوں کا اونٹوں کا رسالہ (۷۰) ستر تھا سات صد (۷۰۰) کے مقابلہ میں اور گھوڑے دو (۲) تھے (۲۰۰) دو صد کے مقابلہ میں۔

امام بیہقیؒ نے لکھا کہ علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنا زیادہ وقت سجدے کی حالت میں گزارا اور آپؐ "یاحی القیوم" کا ورد فرما رہے تھے جس کا مطلب ہے "ہمیشہ رہنے والا اور سب کی حفاظت کرنے والا"۔ جبکہ آپؐ کے ساتھی نعرے لگا رہے تھے "الاحد الاحد" یعنی "اکیلی ذات، اکیلی ذات" یعنی مدد کے لیے صرف ایک ہی ذات ہے اللہ کی اور اسے ہی پکارا جا رہا تھا۔ اس کے بعد یہ بھی نعرہ لگا رہے تھے "آل غوث، آل غوث" یعنی اے مدد کرنے والے، اے مدد کرنے والے" یعنی اپنے مالک کو اس کی وحدت کا واسطہ دے کر اس سے مدد طلب کر رہے تھے۔

آج قوم کو یعنی مسلم اُمہ کو یہ پھر سے بتا دینا اور جتا دینا ضروری ہے کہ اللہ ہی کی ذات بابرکت ہر شے پر قادر ہے اور ہر ایک کی مالک ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تو اس لیے ان ہستیوں کو چھوڑ دو جن سے مدد چاہتے ہو اللہ کے سوا اور اپنے مالک کی حضوری میں پیش ہو جاؤ، اس سے معافی مانگو اور مدد بھی، وہ بے نیاز ہے معاف فرمانے والا ہے

اور تمہیں ہمیں سب کو اپنی رحمت کی چادر اوڑھا دے گا۔

امام ابن کثیرؒ نے سورۃ انفال (۸) آیت (۴۹) کے حوالے سے لکھا ہے کہ علیؓ ابن ابو طالب نے فرمایا کہ بدر کے میدان میں تو اللہ تعالیٰ نے کافروں کی نظر میں مسلمانوں کی تعداد بھی کم کر کے دکھائی تھی۔ لہٰذا مشرکوں نے کہا کہ (آیت ۴۹ کے مطابق) "یہ لوگ (یعنی مسلمان) اپنے مذہب سے دھوکہ کھا گئے ہیں"۔ انہوں نے یہ بیان اس لیے دیا کہ انہوں نے ان کو بہت ہی کم تعداد میں دیکھا یعنی محسوس کیا۔ اس لیے انہیں یقین ہو گیا تھا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کو آسانی کے ساتھ شکست دے دیں گے، بلکہ ان کا کام تمام کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے دعویٰ کے جواب میں فرمایا (آیت ۴۹ کے مطابق) "لیکن جو کوئی بھی اللہ پر اپنا بھروسہ رکھے گا پھر یقیناً اللہ سبحانہٗ تعالیٰ تمام طاقت کا سرچشمہ ہے اور عقل و دانش کا بھی"۔

یہ بھی کہا جاتا ہے قتادہؓ کے حوالے سے کہ ابوجہل نے بھی بڑھ ماری جناب رسول اللہؐ کو دیکھ کر اور کہا کہ "اللہ کی قسم! آج کے دن کے بعد یہ لوگ کبھی اللہ کو نہ پوجیں گے"۔ اور یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دانش اور جانبداری کا اعلان کر دیا اپنے ماننے والے غلاموں کے لیے۔ بیشک وہ چاہتا تھا کہ اس کے بندے اس کی عبادت کرتے رہیں اور ان کی اولاد بھی۔

(ii) شیطانی دھوکہ اور قریش کا غرور

شیطان نے قریش کو دھوکہ دیا اور انہیں اکسایا کہ وہ بغیر کسی خوف کے لڑیں کیونکہ انہیں تو کوئی شکست دے ہی نہیں سکتا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ابلیس بنفس نفیس جنگ بدر میں حاضر تھا اور اس نے سراقہ بن مالک بن جعشم کا روپ ڈھالا ہوا تھا جو بنو مدلج کا سردار تھا۔

ابن جریر نے کہا کہ ابن عباسؓ نے اس معاملہ پر سورۃ انفال (۸) کی آیت (۴۸) کے حوالے سے فرمایا کہ بدر کے روز شیطان اپنے علمبردار کے ساتھ اور اپنے سپاہ کے ساتھ آیا اور مشرکین مکہ کے ساتھ مل گیا اور اس نے مشرکین کے دلوں میں پھونکا کہ "آج کے روز تمہیں کوئی شکست نہیں دے سکتا کیونکہ میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

"لیکن جب قریش کا سامنا مسلمانوں سے ہوا تو شیطان نے فرشتوں کو آتے دیکھ لیا کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ دینے آ رہے ہیں اور ساتھ ہی اس نے جناب جبرئیل کو بھی آتے ہوئے دیکھ لیا کہ وہ اس کی طرف آ رہے ہیں، انہیں دیکھ کر وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا اپنے لوگوں کے ساتھ"

جب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا تو جناب رسالت مآبؐ نے ایک مٹھی بھر خاک لی اور دشمنوں کی طرف پھینک دی جس کی وجہ سے انکیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ جب انہوں نے شیطان کو میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے دیکھا تو ان کافروں نے اس سے کہا "اے سراقہ! تم نے تو دعویٰ کیا تھا ہمارے ساتھ رہنے اور ہمیں مدد دینے کا۔ اب تمہیں کیا ہو گیا؟" اس نے جواب دیا "بے شک جو میں دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ سکتے اور میں اللہ سے ڈرتا ہوں کیونکہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

یہ تمام معاملہ سورہ انفال (۸) کی آیت (۴۸) میں مذکور ہے اور اس کے مطابق: "اور (یاد رکھو) جب شیطان نے ان کے برے اعمال انہیں اچھے کر کے دکھائے اور کہا انسانوں میں سے کوئی بھی تم پر حاوی نہیں ہو سکتا آج کے دن اور بیشک! میں تمہارے ساتھ ہوں (تمہاری مدد کے لیے) لیکن جب دونوں فوجیں آئیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تو وہ بھاگ اٹھا یہ کہتا ہوا کہ بے شک مجھے تمہارے ساتھ کوئی سروکار نہیں ہے بے شک میں دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں کیونکہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

(iii) دونوں افواج کی مڈھ بھیڑ

عرب کے رواج کے مطابق دونوں افواج نے طلوع آفتاب کے بعد جذباتی نغمے گانے شروع کر دیے تا کہ اپنے اپنے سپاہ کے جوش کو ابھارا جائے۔ اس کے بعد قریش کے تین بہترین جانباز آگے بڑھے اور وہ نوجوان تھے (۱) عتبہ (ابوسفیان کی بیوی کا والد) (۲) شیبا (ابوسفیان کی بیوی کا چچا) (۳) ولید (ابوسفیان کی بیوی کا بھائی)۔ انہوں نے مسلمانوں کے بہادروں کو للکارا کہ آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کریں۔ ان کی للکار کے جواب میں تین انصار نوجوان آگے بڑھے جن سے قریش نے یہ کہہ کر لڑنے سے انکار کر دیا کہ ہم چونکہ معزز ین قریش میں سے ہیں، اس لیے قریش مدینہ سے ہی لڑیں گے۔ اس بات پر عمر بن خطابؓ گرجے اور کہا کہ ہم مسلمان سب برابر ہیں۔ لیکن پھر بھی قریش اپنی بات پر اڑے رہے اس پر پھر رسالت مآبؐ نے علیؓ بن ابی طالب کو بلایا اور ولید سے لڑنے کو کہا پھر جناب حمزہؓ کو پکارا اور پھر عبیدہؓ بن حارثؓ کو اور ان کو باقی دو سے لڑنے کے لیے فرمایا۔

عرب شمشیر زنی میں یونانیوں اور رومن کی طرح بہت ماہر تھے، یہ تلوار کے درمیانی حصے جبکہ دوسرے تلوار کی نوک سے لڑتے تھے۔ بہر حال ایک اچھی لڑائی کے بعد تینوں اللہ

کے غلام دشمنوں پر قابو پا گئے اور اپنے دشمنوں کو مقام آخر تک پہنچا دیا۔ یہ اچھی شروعات تھی مسلمانوں کے لیے جبکہ دشمن جوش میں آ گئے اور نعرے لگانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے تیروں کو اچھالنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ جنگ پورے جوش اور جذبے کے ساتھ شروع ہو گئی۔ یہ معاملہ دیکھ کر جناب رسالت مآبؐ اپنے مقام سے نکل کر اپنے سپاہ کے قریب آ گئے تا کہ ان کی ہمت بندھی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہیں کہ وہ بے دریغ ہو کر لڑیں اور اس بارے میں سورۃ انفال (۸) کی آیت (۶۵) کا نزول ہوا اس کے مطابق فرمان ہوا کہ "اے پیغمبر! تاکید کرو ایمان والوں سے لڑنے کی اگر ان میں بیس ثابت قدم فرار ہوں گے تو وہ دو صد پر بھاری پڑیں گے اور اگر ایک صد ثابت قدم ہوں گے تو وہ ایک ہزار کافروں پر بھاری پڑیں گے کیونکہ وہ (کافر) ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں"۔

(iv) فرشتوں کی شرکت

بدر کے روز اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ اور ایمان والے غلاموں کے ساتھ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا اس لیے اللہ تعالیٰ نے دشمن کے ساتھ لڑنے کے لیے ایک ہزار فرشتے بھیجے۔ سورۃ انفال کی آیت (۹) اس بارے میں نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ "یاد رکھو! جب تم نے اپنے رب سے مدد مانگی اور اس نے تمہیں یقین دلایا یہ کہہ کر کہ میں تمہاری مدد کروں گا ایک ہزار فرشتوں سے جو تسلسل سے چلے آئیں گے"۔

امام ابن کثیرؒ نے لکھا اس آیت مبارکہ کے بارے میں کہ علیؓ بن ابی طلحہؓ نے روایت کیا کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "اللہ نے اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی اور آپؐ کے ساتھیوں کی بھی، ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جن میں سے پانچ صد تو جناب جبرئیل کے ماتحت ایک طرف تھے اور دوسری طرف بھی پانچ صد جو جناب میکائیل کے تحت تھے"۔

سورۃ انفال کی آیت (۵۰) مزید بیان کرتی ہے اس معاملہ میں کہ "اگر تم دیکھ سکتے کہ جب فرشتے ان نافرمانوں کی ارواح قبض کر رہے تھے اور ان کے چہروں پر مارتے تھے اور پشت پر بھی یہ کہتے ہوئے اب چکھو دہکتی آگ کا مزہ"۔

(v) کافروں کی گردن زنی

دوران جنگ بدر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا فرشتوں کو کہ وہ کفار کی گردنیں ماریں۔ جیسا کہ سورۃ

انفال (۸) کی آیت (۱۲) میں فرمایا گیا ہے کہ "(یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں کو حکم دیا، بے شک! میں تمہارے ساتھ ہوں، پس تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ، میں بھی کفار کے قلوب پر رعب طاری کر دیتا ہوں، پس ان کی گردنوں پر مارو اور مارو ان کی انگلیوں پر اور پنجوں پر"۔

اس سلسلے میں سورۃ انفال (۸) کی آیت (۱۳) مزید کہتی ہے کہ "(کافروں کے لیے یہ حکم) اس لیے کہ انہوں نے انکار کیا اور حکم عدولی کی اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور جو کوئی بھی حکم عدولی کرے گا اور نافرمانی کرے گا اللہ اور اس کے رسولؐ کی تو پھر اللہ بہت شدید سزا دینے والا ہے"۔

امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ربیع بن انس نے کہا کہ "بدر کی لڑائی کے بعد لوگ آسانی سے پہچان سکتے تھے کہ مقتولوں میں سے کسے فرشتوں نے قتل کیا ہے اور کس کو ان لوگوں نے قتل کیا اور یہ مقتولوں کے زخم پہچاننے کے بعد ممکن تھا کیونکہ جن کو فرشتوں نے قتل کیا تھا، ان کی لاشوں پر ان کی گردنوں اور انگلیوں اور پنجوں کے زخم جلے ہوئے تھے بالکل اس طرح جس طرح سے جانوروں کو آگ سے داغا جاتا ہے"۔

اس کے علاوہ ایک اور حکم ہے اس بارے میں جو سورۃ محمدؐ (۴۷) کی آیت (۴) میں نازل ہوا اس کے مطابق "پس جب بھی تم ملو (کسی لڑائی میں اللہ کی خاطر) تو پھر کافروں کو مارو ان کی گردنوں پر اس وقت تک جب تک تم ان میں سے بہت سوں کو مار چکو اور زخمی کر چکو اور پھر باقی ماندہ کو اپنا قیدی بنا لو اس کے بعد ان کو چھوڑ دو (احسان کی خاطر) بغیر کسی معاوضے کے یا کوئی معاوضہ لے کر جیسا مناسب سمجھو صورتحال کے مطابق، اس وقت تک جب تک کہ دشمن ہتھیار نہ ڈال دے اور پھر اگر اللہ چاہتا تو خود ہی انکو سزا دے دیتا (تمہارے بغیر) لیکن (وہ تمہیں لڑنے دیتا) چاہتا تھا کہ تمہیں آزمائے دوسروں کے مقابلے میں۔ لیکن جو مارے گئے ہیں اللہ کی راہ میں وہ (اللہ) ان کے اعمال ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کو مقصود تک پہنچا دے گا اور ان کی حالت درست رکھے گا"۔

یہ دو آیات جو اوپر مذکور کی گئی ہیں اس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ سورۃ انفال (۸) کی آیت (۱۲) میں تو اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا ہے کہ کافروں کی گردنیں مارو۔ جبکہ سورۃ محمدؐ (۴۷) کی آیت (۴) میں مسلمانوں سے کہا ہے کہ کافروں کی گردنیں مارو۔ لیکن کب؟ جب وہ تمہارے اوپر لڑائی مسلط کر دیں اور جب ہتھیار ڈال دیں تو نہیں یا ان سے رو رہے ہوں تو

نہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ گردنیں مارنے کا حکم ایک تو ان کے لیے ہے جو تمہاری گردنیں مارنے کے لیے تمہارے سامنے آ جائیں، دوسرا یہ کہ یہ حکم نہ تو مسلمانوں کی خواہش تھی اور نہ ہی جناب رسولؐ اللہ کی۔ بلکہ یہ تو اللہ کا حکم ہے کیونکہ ان کافروں نے ایک تو اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم نہیں مانا اور دوسرا یہ کہ اللہ کے رسول اور ان کے ساتھیوں کے لیے زمین تنگ کر دی، ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا، جناب رسولؐ اللہ کو قتل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اب پھر انکو نیست و نابود کرنے بدر میں چلے آئے۔ اس لیے اب ان سے رعایت کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اس کے باوجود بھی اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں نے سب کفار کو ختم نہیں کیا بلکہ صرف ستر افراد نو صد پچاس میں سے۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ خود اس کے ایک ہزار فرشتے اور (۳۱۳) مجاہدین میدان جنگ میں تھے، وہ تمام کے تمام کفاروں کو قتل کر دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پھر ان کو اللہ نے موقع عطا کیا کہ شاید وہ یا ان کی اولاد ایمان لے آئے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ کافروں کے لیے یہ ایک اور موقع تھی کہ اب بھی وہ عقل کے ناخن لیں۔

(vi) قرآنی آیات کو غلط طریقے سے پیش کرنا

قرآن حکیم کی آیت (۱۲) سورۃ انفال کی اور آیت (۴) سورۃ محمدؐ کے وہ الفاظ جس میں کہا گیا ہے کہ ان کی گردنیں، انگلیاں اور پنجے مارو یعنی کافروں کی، یہ الفاظ اور یہ آیات کچھ غیر مسلموں نے بہت ہی غلط انداز میں پیش کی ہیں۔ اور نو گیارہ کے واقع کے بعد جو حقیقی طور پر دل سوز واقعہ تھا، ایک بہت بڑے میڈیا پر ان دو آیات کا بہت پرچار کیا گیا اور لوگوں کو بتایا گیا کہ دیکھو یہ مسلمان تمہاری گردنیں مارنا چاہتے ہیں یہ ان کی کتاب میں لکھا ہوا ہے یہ تمہارے دوست کیسے ہو سکتے ہیں؟۔

اس وجہ سے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان آیات کی مزید وضاحت کی جائے تا کہ وہ غلط فہمی جو ان آیات کے متعلق غلط بیانی سے پیدا ہوئی، اس کا تدارک کیا جا سکے۔ اس لیے مندرجہ ذیل نقاط اس سلسلے میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

۱) اللہ کے اس حکم کا مقصد جو ان آیات میں دیا گیا ہے اس کا ایک خاص پس منظر اور خاص حالات ہیں جن میں یہ حکم لاگو ہوتا ہے۔ یہ حکم صرف دوران جنگ کے لیے ہے اور وہ جنگ جو مسلمانوں پر تھوپ دی گئی ہو۔ اور یہ حکم صرف مخالف جنگجوؤں کے متعلق ہے جو

تمہاری قتل و غارت کے لیے جنگ میں شریک ہوئے ہیں اور تمہیں تو جنگ صرف اللہ ہی کی خاطر یعنی اس کے حکم کے مطابق کرنی پڑے گی اپنی ہتک اور عزت کو بچانے کی خاطر۔

۲) اس حکم کا اصل مقصد کافر کو یہ باور کرانا ہے کہ اگر اس نے مسلمانوں پر حملہ کیا تو پھر وہ تمہاری بھی حالت کرے گا جس کا اسے اللہ نے حکم دیا ہے۔اس لیے وہ امن قائم کرنے کی کوشش کریں اور جنگ شروع نہ کریں، اس طرح بہت سی جانوں اور مال کا زیاں ہونے سے بچ جائے گا۔

۳) اس حکم کا اطلاق امن کے زمانہ میں یا کسی اپنے ذاتی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بالکل نہیں ہے۔

۴) جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ جنگ بدر میں صرف ستر (۷۰) کافر مارے گئے جبکہ ان کی کل تعداد (۹۵۰) تھی اور ستر (۷۰) ہی گرفتار ہوئے اور باقی (۸۱۰) فرار ہو گئے جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف (۳۱۳) تھی اور ان میں سے (۱۴) شہید ہو گئے۔ جب (۳۱۳) کے مقابلے میں (۹۵۰) جنگ کرنے آئے تھے تو ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے تھا۔ظاہر ہے ان پر سختی سے ہی وار کیا جاتا نہ کہ انھیں پیار کیا جاتا اور پھولوں کے گلدستے پیش کیے جاتے۔

۵) اگر مسلمان اتنے ہی ظالم تھے تو جب انہوں نے اپنے سب سے بڑے دشمنوں کا شہر مکہ فتح کیا، جہاں سے کافروں نے مسلمانوں کو نکال کر ان کے مال و اسباب اور جائیدادوں پر قبضہ کرلیا تھا تو فتح مکہ کے بعد انہی مسلمانوں نے اپنے دشمنوں سے کیا سلوک کیا تھا؟۔کیا ان کی گردنیں ماری تھیں یا ان کی انگلیاں اور پوریں کاٹی تھیں؟۔تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ مفتوح کا ایک شخص بھی قتل نہیں کیا گیا بلکہ مسلمانوں نے ان سے اپنی جائیدادیں بھی واپس طلب نہیں کیں اور ان سے ایک درہم بھی بطور جرمانہ یا تاوان وصول نہیں کیا۔

۶) فتح مکہ کے بعد کسی ایک کافر کو بھی اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا گیا۔

۷) شہر مکہ کا قبضہ مسلمانوں نے نہیں لیا۔ بلکہ مکہ کا جو امیر تھا جناب رسول اللہ نے اسی کو اس عہدہ پر برقرار رکھا۔علاوہ ازیں قریش کا سردار بھی تبدیل نہیں کیا گیا بلکہ اسی ابو سفیان کو رہنے دیا۔حتیٰ کہ کلید کعبہ بھی اپنے قبضے میں نہ لی اور سابقہ کلید بردار قائم رکھا۔

جن لوگوں نے ان آیات کے حوالے سے مسلمانوں پر نقطہ چینی کی ہے، انھیں تاریخ کا یا تو علم نہیں یا وہ جان بوجھ کر الزام تراشی کر رہے ہیں۔کوئی ان سے یہ پوچھے کہ گزشتہ صدی عیسوی میں کل کتنے انسانوں کو قتل کیا گیا اور کس نے کس کو قتل کیا، اس بات کا آپ خود ہی اندازہ لگائیں۔یہاں پر چند موقعوں کے مقتولین کی تعداد کا ذکر کیا جاتا ہے تا کہ اندازہ لگایا جاسکے کہ کس قوم یا مذہب کے لوگوں نے کتنے قتل کیے۔

- ☆ جنگ عظیم اول (۱۹۱۴-۱۸)
  کل مقتولین کی تعداد 15 ملین یعنی 1½ کروڑ
- ☆ روسی سول وار (۱۹۱۷-۲۲)
  کل مقتولین کی تعداد 09 ملین یعنی 90 لاکھ
- ☆ روسی اسٹالین حکومت (۱۹۲۴-۵۳)
  کل مقتولین کی تعداد 20 ملین یعنی 2 کروڑ
- ☆ جنگ عظیم دوئم (۱۹۳۷-۴۵)
  کل مقتولین کی تعداد 55 ملین یعنی 5½ کروڑ
- ☆ چینی سول وار (۱۹۴۵-۴۹)
  کل مقتولین کی تعداد 2½ ملین یعنی 25 لاکھ
- ☆ چینی کیمونسٹ حکومت (۱۹۴۹-۷۵)
  کل مقتولین کی تعداد 40 ملین یعنی 4 کروڑ

یہ خیال رہے کہ یہ اعداد و شمار صرف مثال کے طور پر دیے گئے ہیں، ورنہ تو پچھلی صدی عیسوی یعنی بیسوی صدی میں مجموعی طور پر تقریباً چار ارب دو کروڑ اور ساٹھ لاکھ انسانوں کو ان کے ساتھی انسانوں نے قتل کیا۔اب ان نقطہ چینیوں پر ہی یہ فیصلہ چھوڑا جاتا ہے اور ان قاری حضرات پر جن تک یہ الفاظ پہنچیں کہ وہ بتائیں کہ کن انسانوں نے کن کو قتل کیا اور کیوں؟ لیکن یہ تو سب کو علم ہے کہ زیادہ تر عیسائیوں نے عیسائیوں کو ہی قتل کیا اور کچھ مسلمانوں نے مسلمانوں کو ہی قتل کیا۔کچھ انسانوں نے اپنے ہی بھائیوں کو قتل کیا آزادی کے نام پر اور ان کو روٹی کپڑا اور مکان دینے کے نام پر۔لیکن انھیں ان کی بدقسمتی نے گھیرا اور روٹی کپڑے کی فراہمی کا نظام

لانے والوں نے روٹی کپڑے ہی کے لیے کروڑوں انسانوں کو قتل کر دیا۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ بیشتر جنگیں، تباہیاں اور قتال مذہب کے نام پر نہیں ہوئیں بلکہ بیشتر روٹی کپڑا چھیننے کے لیے یہ لڑائیاں، تباہیاں اور قتال ہوئے۔ یہ ساری کی ساری معاشی جنگ تھی۔ قریش مکہ بھی تو اپنے معاش اور اپنی چودھراہٹ کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اصل جنگ معاش کے لیے ہی ہوتی ہے۔ جب انسان توکل اور محنت اور صبر نہیں کرتے اور اللہ کے دیے ہوئے قوانین سے منہ موڑ لیتے ہیں تو وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنے ہی بھائیوں کا خون بہاتے ہیں۔

لہٰذا اس مہذب دنیا سے یہی درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ آنکھیں کھولے اور اس معاملہ پر غور و خوض کرے کہ یہ فرزندان آدم کیوں اپنے ہی بھائیوں کا خون بہا رہے ہیں؟ جس کی ابتدا قابیل نے ہابیل کو قتل کر کے کی۔

(ق) حق کی باطل پر فتح:

نئی ابھرتی ہوئی مملکت اسلامیہ کے سپاہیوں نے اپنے سپہ سالار اعظم، اپنے راہبر جناب محمدؐ رسول اللہ کی زیر کمان اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ اور بہادری کے ساتھ اپنے مد مقابل آنے والوں کا سامنا کیا۔ اس مقابلے میں انہیں فقط جام شہادت نوش کر کے اپنے لیڈر جناب رسولؐ اللہ اور اپنے حقیقی مالک کو راضی کرنے کا شوق تھا۔ اس جانثاری میں ان کی عاجزی اور انکساری بھی شامل حال تھی اور اللہ پر توکل اور یقین بھی تھا اور پھر سب سے بڑھ کر اللہ کی رضا اور مدد ان کے شامل حال تھی۔ یہی وجوہات تھیں کہ بپھرے ہوئے دشمن کے بپھرے ہوئے سردار اُن میں نہ رہے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ اپنے کچھ ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ لیے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ مجاہدین اسلام کے (۳۱۳) میں سے چودہ نے جام شہادت نوش جان کیا اور سب نے اللہ کی مدد کے ساتھ دشمن کے (۹۵۰) حسد کے ماروں کے ساتھ مقابلہ کیا جو انہیں ہمیشہ کے لیے تہس نہس کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ مجاہدین اسلام نے انتہائی شدید مقابلے کے بعد اپنی قوم اپنے دین اور اپنے وطن کو بچایا اور پھر بھی ان پر متعصب لوگ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے کافروں کی گردنیں کاٹیں اور ان پر ظلم ڈھایا۔

بہرحال قریش مکہ، مدینہ کے یہودی اور مشرکین اور عرب کے دیگر قبائل اس فتح و شکست پر انگشت بدنداں رہ گئے کہ ان تھوڑے سے بے وسائل لوگوں نے کس طرح سے ان طاقتور لوگوں

کو شکست فاش دے دی۔ اللہ کے رسولؐ نے اس وقت اپنے رب کا شکر ادا کیا اور اس کے حضور دو رکعت نفل ادا کرنے کے لیے سجدہ ریز ہو گئے اور اپنی قوم کو اور دوسروں کو بھی بتایا کہ مسلمان فتح پر جشن نہیں مناتے بلکہ اپنے رب کے سامنے عجز و انکساری کا اظہار کرنے کے لیے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ تاکہ یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ طاقت اور عزت کا سرچشمہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہی ہے اور وہ یعنی مسلمان تو اللہ کے محض غلام ہیں اس کے تابعدار، اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے محبت کرنے والے۔

جب کفار میدان جنگ چھوڑ کے بھاگ گئے تو مسلمانوں نے بقیہ تمام دن اپنے بھائیوں کے کفن دفن اور دعائے خیر میں گزارا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دشمن کی ستر (۷۰) لاشوں کو بھی ٹھکانے لگایا۔ اس فتح کے ساتھ ہی شہر مدینہ سیاسی طور پر مملکت اسلامیہ کے طور پر جناب رسالت مآبؐ کی سربراہی میں تسلیم کر لیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے بھی اس فتح کو قرآن کا حصہ بنا دیا اور سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۲۳) میں فرمایا کہ "اور اللہ نے تمہیں پہلے ہی بدر میں فتح یاب کر دیا تھا جبکہ تم چھوٹی سی اور کمزور قوت کے مالک تھے، لہٰذا تقویٰ یعنی پرہیز گاری اختیار کرو اس لیے کہ تم (اللہ کے) شکر گزار بندے بن جاؤ"۔

اللہ تعالیٰ نے مزید سورۃ انفال کی آیت (۴۱) میں یوم بدر کو "یوم الفرقان" قرار دیا یعنی وضاحت کرنے والا دن یا تفریق کرنے والا دن، اسلام اور کفر میں۔ یعنی اس روز اسلام اور مسلمانوں کی برتری قائم ہو کر سب پر واضح ہو گئی اور طاقتور دشمن جس نے جناب رسالت مآبؐ اور ان کے ساتھیوں کو مجبور کر دیا تھا اپنا گھر بار چھوڑنے پر، وہ لوگ ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو گئے۔

(ر) اسیران حرب:

امام احمدؒ نے انسؓ کے حوالے سے لکھا کہ جناب رسالت مآبؐ نے اپنے ساتھیوں سے جنگی قیدیوں کے بارے میں پوچھا جو بدر میں گرفتار ہوئے تھے اور فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان لوگوں پر طاقت عطا فرمائی"۔ اس پر جناب عمر بن خطابؓ اٹھے اور کہا "اے اللہ کے رسولؐ! ان کی گردنیں اڑا دیں"۔ لیکن جناب رسولؐ اللہ نے اپنا چہرہ مبارک پھیر لیا۔ یعنی ان کے جواب کو ان سنا کر دیا۔ جناب رسولؐ اللہ نے دوبارہ اصحاب سے وہی سوال پوچھا۔ عمرؓ دوبارہ اٹھے

اور کہا "اے اللہ کے پیغمبر! ان کی گردنیں کاٹ دیجیے"۔ جناب رسالت مآبؐ نے پھر ان کے جواب کو نظر انداز کر دیا اور پھر وہی سوال تیسری بار دہرایا تو عمرؓ نے پھر اپنا وہی جواب دہرایا۔ اس کے بعد جناب ابوبکرؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا "اے اللہ کے رسولؐ! میرے خیال کے مطابق آپؐ انھیں معاف فرمادیں اور انھیں آزاد کر دیں فدیہ کے بدلے"۔ اس کے بعد جناب رسول اللہؐ کے چہرہ مبارک سے غم کے آثار دور ہو گئے تو پھر آپؐ نے ابوبکرؓ کی تجویز کے مطابق کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا اور اپنی ناراضی کا اظہار سورۃ انفال (۸) کی آیات (۶۷ اور ۶۸) میں کیا۔ وہ اس طرح کہ "یہ مناسب نہیں ایک نبی کے لیے کہ وہ جنگی قیدی بنائے جب تک کہ وہ خوب اچھی طرح سے نہ لڑے (اپنے دشمنوں کا قتال کرے) زمین پر۔ تم نے پسند کیں دنیا کی چیزیں (یعنی فدیہ) لیکن اللہ چاہتا ہے (تمہارے لیے) آخرت اور اللہ تمام تر طاقتور ہے اور حکمت والا ہے۔ اگر یہ ایک پہلے سے اللہ کا حکم نہ ہوتا تو ایک شدید عذاب آجاتا تمہارے (فدیہ) لینے پر"۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ اور اس کے ساتھیوں کے دشمنوں کے لیے کسی قسم کی رعایت نہ چاہتے تھے ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کہ ایک تو انہوں نے اللہ کے پیغام کو ٹھکرا دیا اور دوسرا یہ کہ اللہ کے نبی کے قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ لیکن برخلاف اس کے اللہ کا نبیؐ پھر بھی اپنے دشمنوں پر رحم کا مظاہرہ فرمارہا تھا اور جب آپؐ کے دشمن بے بس اور ذلیل ہو کر آپؐ کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تو آپؐ اس حالت میں انھیں آزاد کر دینا چاہتے تھے، فدیہ کے بہانے، ورنہ فدیہ لینا آپؐ کو مقصود نہ تھا اور نہ ہی آپؐ فدیہ وصول کرنے کے لیے قیدیوں کی رہائی چاہتے تھے کیونکہ آپؐ امید رکھتے تھے کہ شاید اس کے بعد ہی وہ لوگ ایمان لے آئیں۔

جناب رسول اللہؐ کی اس نیک نیتی اور نرم دلی کا یقیناً اللہ تعالیٰ کو علم تھا لہٰذا اللہ اپنے غصے اور ناراضی کا اظہار فرما کر پھر اپنی کرم فرمائی مہربانی اور رحمت کی طرف مائل ہوئے اور اپنے نبیؐ اور آپؐ کے پیروکاروں کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی کامل محبت اور فضل و کرم کے ساتھ آپؐ پر اپنا لطف و کرم فرمایا اور فدیہ لینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ جس کا حکم انھیں سابقہ آیات کے بعد والی آیت یعنی سورۃ انفال (۸) کی آیت (۶۹) میں موصول ہوا کہ "سو جو کچھ تم نے لیا اس کو حلال اور پاک سمجھ کر کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے"۔

(ث) بدر کی فتح پر مسلمانوں کا ردعمل:

جب جنگ ہو چکی تو جناب رسول اللہؐ بدر میں تین روز تک مقیم رہے اور پھر مدینہ تشریف لے آئے۔ اس دوران آپؐ نے اپنے دو ساتھیوں عبداللہ بن رواحہؓ اور زید بن حارثہؓ کو مدینہ روانہ کیا تاکہ وہ فتح کا اعلان کر دیں۔ یہ حضرات یعنی عبداللہؓ شمال کی طرف سے اور زیدؓ جنوب کی طرف سے فتح کا اعلان کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ کچھ لوگوں نے یقین نہیں کیا کیونکہ زیدؓ جناب رسالت مآبؐ کی اونٹنی پر سوار تھے۔ اس کے علاوہ عثمانؓ بن عفان اور اسامہ بن زید کو جنگ میں شرکت سے مبرا کر دیا گیا تھا کیونکہ سیدہ رقیہؓ جناب رسالت مآبؐ کی صاحبزادی اور جناب عثمانؓ کی رفیقہ حیات صاحب فراش تھیں۔ اسامہ کو جناب عثمانؓ کے ساتھ چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ سیدہؓ کی دیکھ بھال کر سکیں اور اسی دوران سیدہ رقیہؓ خالق حقیقی سے جا ملیں۔ بدر سے واپسی پر جناب رسالت مآبؐ اپنی بیٹی فاطمہؓ کے ساتھ اپنی بیٹی سیدہ رقیہؓ کی مرقد پر تشریف لے گئے۔

دوسری جانب مدینہ کے لوگوں کو جب سرداران قریش اور خاص طور پر ابوجہل کے قتل کی خبر ملی تو انھیں بہت تقویت ملی اور یہ خبر ان کے لیے حیران کن بھی تھی۔ اس خبر سے بہرحال اہل مدینہ میں اطمینان کی لہر دوڑ آئی۔ جبکہ اہل مکہ اور دوسرے قبائل کو بھی علم ہو گیا کہ خطہ عرب میں ایک نئی طاقت ابھر کے سامنے آئی ہے اور جناب رسالت مآبؐ سربراہ مملکت کی حیثیت سے سامنے آئے۔

(ت) حبشہ کے عیسائی بادشاہ کی خوشی:

امام ابن کثیرؒ نے حافظ بیہقی عبدالرحمان سنائی کی روایت سے قلمبند فرمایا کہ حبشہ (Ethiopia) کے عیسائی بادشاہ نجاشیؓ نے جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کو بلوایا جو ہجرت کر کے وہیں مقیم تھے۔ جب وہ دربار میں آئے تو دیکھا کہ جناب نجاشیؓ جو زمین پر بیٹھے ہیں اور پرانے پھٹے ہوئے لباس کو زیب تن کیا ہوا ہے، یہ لوگ جناب نجاشیؓ کو اس حالت میں دیکھ کر خوفزدہ ہوئے۔ نجاشیؓ نے ان لوگوں سے کہا کہ ان کے پاس ایک اچھی خبر ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کر دیا اور چند مقتول سرداروں کے نام بھی بتائے۔ اس پر جعفرؓ نے سوال کیا کہ بادشاہ اس طرح سے مخدوش حالت میں زمین پر کیوں بیٹھے ہیں؟ نجاشیؓ نے جواب دیا کہ جناب مسیحؑ پر الہام ہوا تھا کہ جب اللہ کی طرف سے کوئی خوشخبری موصول ہو تو اس شخص کو اللہ کے سامنے اپنے عجز و انکساری کا اظہار کرنا چاہیے۔

انہوں نے کہا کہ وہ خوش ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر اپنا فضل و کرم فرمایا، اس لیے اس نے اپنا اظہار خوشنودی اللہ کے حضور اپنی کمترین حالت میں پیش ہو کر کیا۔

(ث) منافقوں کی حیرانگی اور ردِ عمل:

منافق لوگوں کے تخیل سے باہر تھا کہ مسلمان اس طرح کامیابی حاصل کر لیں گے کیونکہ بظاہر تو یہ تھا بھی ناممکن۔ ان میں سے ایک منافق نے جناب اسامہ بن زیدؓ سے کہا کہ رسول اللہؐ اور ان کے ساتھی اب باقی نہیں رہے۔ کیونکہ انہوں نے زیدؓ کو دیکھا کہ وہ رسول اللہ کی اونٹنی پر سوار تھے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ زیدؓ اپنی شدید مایوسی کے عالم اور پاگل پن میں فتح کا اعلان کر رہے تھے۔ اس پر اسامہؓ جلدی سے اپنے والد کی طرف گئے اور دریافت کیا کہ کیا ماجرہ ہے؟ زیدؓ نے جواب دیا "اللہ کی قسم! میں سچ بول رہا ہوں"۔ ایک دوسرے منافق نے ابو واحدؓ سے کہا کہ اس کے ساتھی یا تو بکھر گئے ہیں یا ختم اور وہ انہیں اب نہیں ملیں گے۔

بدر سے واپسی پر جناب رسالت مآبؐ اور آپ کے ساتھیوں کا روحہ کے مقام پر استقبال کیا گیا اور انہیں ان کے قیدیوں کے ساتھ مدینہ لایا گیا مسلمان بہت خوش تھے، انہوں نے فاتحین بدر کو مبارکباد دی۔

(ج) اہلِ مکہ کا غم و پریشانی:

بدر کے معاملے میں ابتدائی خبر حیثم بن عبداللہ خزاعی نے مکہ پہنچائی۔ جب لوگوں نے مزید دریافت کیا تو اس نے کہا کہ عتبہ، شیبہ، ابوجہل، امیہ، زمعہ، نبیح، منبہ، ابوالبختری اور بہت سے اور قتل ہو گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر صفوان بن امیہ نے کہا: "اللہ کی قسم! حیثم اس وقت پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں ہے اس سے پوچھو کہ میں کہاں ہوں"۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ وہ تو حطیم میں بیٹھا ہوا تھا، اس نے مزید کہا اللہ کی قسم! میں نے اس کے باپ امیہ اور بھائی علی کو مردہ حالت میں دیکھا ہے۔

موسیٰ بن عقبہؓ نے کہا کہ جب مکہ کی شکست کی تصدیق ہو گئی تو ان کی عورتوں نے اپنے بال نوچنے شروع کر دیے، غم اور مایوسی کے عالم میں۔ ابولہب بھی یہ خبر سن کر پریشان اور بیمار ہو گیا اور ایک ہفتہ سے زیادہ مزید زندہ نہیں رہ سکا۔

مکہ والوں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے ایک اور فیصلہ کن

جنگ لڑیں گے۔ ابوسفیان قریش کا سردار بن گیا، اور اس نے بدلہ لینے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے حنظلہ، سسر عتبہ اور اپنے دوسرے بیٹے عمرو کی گرفتاری کی وجہ سے بہت پریشان تھا، اس لیے اس نے قسم اٹھائی کہ وہ اپنی بیوی سے اس وقت تک قطع تعلق رہے گا، جب تک کہ وہ جناب رسول اللہؐ اور ان کے ساتھیوں سے اس ذلت آمیز شکست کا بدلہ نہیں لے لیتا۔ اس کی بیوی ہند جس کا بھائی، باپ اور چچا بھی اس جنگ میں کام آ چکا تھا، اس نے بھی اپنے شوہر کی طرح قسم کھائی اور ساتھ یہ بھی عہد کیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل (جناب حمزہؓ) کا کلیجہ چبائے گی۔

(د) ابوالعاص کی رہائی:

جناب رسول اللہؐ کی دختر سیدہ زینبؓ کا شوہر ابوالعاص بھی بدر کے قیدیوں میں تھا اور سیدہ زینبؓ ابھی تک مکہ میں ہی رہائش پذیر تھیں۔ اس وقت تک مسلمان خواتین ابھی اپنے غیر مسلمان شوہروں کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ایسے تعلقات یعنی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کا میاں بیوی کے تعلق سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے قوانین کا نفاذ دوران صلح حدیبیہ چھٹی ہجری میں ہوا تھا۔

اس لیے سیدہ زینبؓ نے اپنا ہار اور تین ہزار درہم اپنے شوہر کو چھڑوانے کے لیے بھجوائے۔ جناب رسول اللہ نے جب وہ ہار دیکھا تو آبدیدہ ہو گئے۔ وہاں موجود آپؐ کے ساتھیوں نے جب آپؐ کو آبدیدہ دیکھا تو خود بھی رنجیدہ ہو گئے۔ اس پر جناب عمر بن خطابؓ نے آپؐ سے جب وجہ دریافت کی تو آپؐ نے جواب دیا کہ یہ ہار سیدہ خدیجہؓ کا تھا جو انہوں نے اپنی بیٹی کو دیا تھا اور وہ اس نے اپنے شوہر کی رہائی کی غرض سے بھیجا ہے۔ اس پر جناب عمرؓ نے تجویز پیش کی کہ ابوالعاص کو بغیر فدیہ کے رہا کر دیا جائے لیکن جناب رسول اللہ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ ابوالعاص کو اس شرط پر رہا کیا جائے کہ وہ رہائی کے بدلے سیدہ زینبؓ کو طلاق دے کر مدینہ روانہ کر دے۔ لہٰذا اس شرط پر ابوالعاص کی رہائی ہو گئی اور اس نے سیدہ زینبؓ کو اپنے بھائی کے ہمراہ مدینہ روانہ کر دیا۔ لیکن کفار مکہ کو اس معاملے کا علم ہو گیا اور انہوں نے سیدہؓ کا پیچھا کیا جس کی وجہ سے سیدہؓ اونٹ سے گر گئیں اور آپ کو اس وجہ سے جو تکلیف پہنچی اس سے انہوں نے قبل از وقت بچے کو جنم دے دیا اور بعد ازاں آپؓ وفات پا گئیں۔ لیکن آپ کی وفات سے پہلے ہی ابوالعاص ان کے پاس پہنچ چکے تھے اور ایمان لے آئے تھے۔

(ض) شرکاءِ بدر کی فضیلت:

امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ جو حضرات بدر میں شرکت نہ کر سکے اور وہ جنہوں نے شرکت کی وہ اللہ کے نزدیک مرتبے میں برابر نہ تھے۔

امام بخاریؒ کی ایک اور حدیث علیؓ کی روایت سے جس کے مطابق جناب علیؓ نے اپنے اس واقعہ کے متعلق فرمایا کہ جب انھیں جناب رسالت مآبؐ نے ایک مشرک کے قبضے سے ایک خفیہ خط لانے کو کہا تھا، فتح مکہ سے پہلے جو اس عورت کو حاطبؓ نے دیا تھا۔ جب وہ خط اس عورت سے برآمد کر کے جناب رسالت مآبؐ کے سامنے لایا گیا تو جناب عمرؓ نے عرض کیا بلکہ رسالت مآبؐ سے اجازت طلب کی کہ حاطب کا سر قلم کیا جائے، اس کی غداری کے عوض۔ اس کے جواب میں جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کیا یہ (حاطب) بدر کے لڑنے والوں میں سے نہیں ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ہے بدر کے جنگجوؤں پر اور پھر فرمایا (حاطب سے) کرو! جو کچھ تم چاہتے ہو، میں نے تمھیں جنت کی ضمانت دی، یا یہ کہا کہ میں نے تمھیں معاف کیا۔ یہ سن کر جناب عمرؓ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔

بخاری کی ایک اور حدیث رفاعہؓ کی روایت کے مطابق (جو کہ بدر کے شرکاء میں سے تھے) کہ جبریلؑ جناب رسولؐ اللہ کے پاس آئے اور کہا: "آپؐ اپنے لوگوں میں بدر کے شرکاء کو کس طرح سے دیکھتے ہیں؟" جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا: "مسلمانوں میں سے بہترین" یا کچھ اسی طرح کے الفاظ کہے۔ اس پر جبریلؑ نے فرمایا "اور اسی طرح سے ان فرشتوں کی حیثیت ہے جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا تھا"۔

(۹۷) غزوہ سُلَیم کدر یا سَوِیق

اس معرکے کو تین ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

سُلَیم: اس لیے کہ جناب رسالت مآبؐ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بنو سلیم کے پانی کے ذخیرے کے پاس قیام پذیر تھے، اس معرکے کے دوران۔

کدر: اس لیے کہ پانی کا وہ ذخیرہ کدر کے مقام پر واقع تھا۔

سویق: اس لیے کہ ابوسفیان وہاں سے تیز بھاگنے کی غرض سے اپنے سویق (بھنے ہوئے جو

کا آٹا) وہاں پھینک گیا تھا۔

ابن اسحاقؒ نے عبداللہ بن کعبؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بدر کی شکست کے بعد ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ وہ غسل نہیں کرے گا، جب تک کہ وہ جناب رسولؐ اللہ پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ بنو نضیر کی بستی پہنچا جو مدینہ سے بارہ میل دور تھی۔ وہاں اس نے ایک بااثر یہودی حیی بن اخطب سے ملنے کی کوشش کی لیکن اس نے ابوسفیان کو مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے سلام بن مشکام سے ملاقات کی جس نے اسے مہمان بنا لیا۔ ابوسفیان نے اس سے مسلمانوں کے خلاف مدد مانگی اور مکہ واپس جانے کا ارادہ کر لیا اور واپسی پر اس نے کچھ گھروں کو آگ لگا دی اور ایک نخلستان کو بھی۔ اس کے علاوہ وہ دو مسلمانوں کو قتل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا، اس کے بعد اس نے اپنے جو کے آٹے کے بورے اور کچھ دوسرا سامان اونٹوں سے پھینک دیا تا کہ وہ تیز رفتاری سے بھاگنے میں کامیاب ہو جائے۔

اس واقعہ کی اطلاع ملنے پر جناب رسالت مآبؐ نے اس کا پیچھا کیا لیکن جب تک آپؐ کدر پہنچے تو آپؐ کو پتا چلا کہ ابوسفیان بھاگ چکا ہے۔ لہٰذا آپؐ نے واپسی کا فیصلہ کیا اور آپؐ کے ساتھیوں نے وہ پھینکے ہوئے جو اور دوسرا سامان اپنے قبضے میں لے لیا۔

اس موقع پر غطفان کے بنو سلیم اپنے لوگ جمع کر رہے تھے مسلمانوں کے خلاف۔ لیکن وہ بھی بھاگ لیے مسلمانوں کے پہنچنے سے پہلے اور وہ وہاں پر اپنے پانچ صد اونٹ چھوڑ گئے جنہیں بھی مسلمانوں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

(۹۸) جناب رسالت مآبؐ کا یہود مدینہ سے خطاب

محمد ابن اسحاقؒ بن یاسر نے قتادہؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بدر سے واپسی پر اللہ کے رسولؐ نے اہل یہود کو مدینہ کے ایک بازار میں ایک جگہ اکٹھا کیا اور ان سے خطاب فرمایا اور کہا: "اے یہود کے لوگو! اسلام قبول کر لو اس سے پہلے کہ کوئی مصیبت تمہارے لیے اللہ کی طرف سے آ جائے جیسا کہ قریش پر بدر کے مقام پر آئی ہے۔

اس پر اہل یہود نے جواب دیا "اے محمدؐ! تمھیں کسی زعم میں نہیں رہنا چاہیے کہ تم نے ان لوگوں کو شکست دی ہے اور قتل کیا ہے جو نا تجربہ کار ہیں اور ناواقف ہیں لڑنے کے ہنر سے۔ اللہ

کی قسم! اگر تمہارے ساتھ لڑو گے تو پھر تمہیں پتا چلے گا کہ ہم لوگوں کی کیا طاقت اور حیثیت ہے"۔

اللہ جل شانہٗ نے ان کے اس تکبرانہ جواب کا جواب سورۃ آل عمران کی آیت (۱۳) میں دیا اور فرمایا کہ "تمہارے لیے پہلے ہی ایک نشانی آ چکی ہے (اے یہود) دو افواج کی صورت میں (بدر کے مقام پر) ان میں ایک تو اللہ کی خاطر لڑ رہی تھی اور دوسری کفر کی خاطر۔ یہ کافر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے اور اللہ اسی کی مدد کرتا ہے جس کی وہ مدد کرنا چاہتا ہے۔ بے شک اس میں عبرت ہے ان کے لیے جو عقل رکھتے ہیں"۔

اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ یہودیوں کی تورات کے مدرسے جسے "مدراس" کہا جاتا تھا تشریف لے گئے اور ان لوگوں کو بھی دعوت اسلام دی۔ وہاں پر جناب رسالت مآبؐ سے سوال کیا گیا کہ آپ کا کیا مذہب ہے؟ جناب رسولؐ اللہ نے جواب دیا کہ دین ابراہیمی۔ انہوں نے کہا کہ ابراہیم تو یہودی تھے۔ اس پر جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ تورات لے آؤ اور پڑھو (کہ اس میں کیا لکھا ہے) اس کے لیے انہوں نے انکار کر دیا اور اپنے دعویٰ کو ثابت نہ کر سکے۔

ان کے اس انکار پر سورۃ آل عمران کی آیت (۲۳) کا نزول ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہود پر نکتہ چینی کی، اور عیسائیوں پر بھی، کیونکہ وہ اللہ کی کتابوں کے ماننے والے تھے، جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت فرمائی تھی کہ وہ آنے والے پیغمبر کی پیروی کریں لیکن اسے انہوں نے ٹھکرا دیا۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک تنبیہ تھی، ان کے لیے سچ کو جھٹلانے کی وجہ سے، وہ سچ جس کا انہیں علم تھا اپنی کتابوں کے ذریعے سے۔

اس کے علاوہ سورۃ آل عمران کی آیات (۶۷-۶۸) میں کہا گیا ہے کہ "ابراہیم نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی۔ بلکہ وہ ایک سچے مسلمان تھے حنیف، اور وہ مشرکوں میں سے بھی نہیں تھے۔ بے شک! انسانوں میں سے جو ابراہیم سے اپنا تعلق ظاہر کرتے ہیں وہ لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں پیغمبر کی حیثیت سے اور ان رسول (محمدؐ) کو اور وہ جنہوں نے انہیں تسلیم کیا ہے تو بے شک اللہ ان ایمان والوں کی حفاظت کرنے والا ہے"۔

(۹۹) قینوقاع کی عہد شکنی

مدینہ کے یہودیوں کے لیے بدر میں مسلمانوں کی فتح افسوس اور غم کا پیغام لے کر آئی کیونکہ

یہ ان کی امیدوں کے خلاف تھی۔ اس طرح وہ یہودیوں کے لیے حسد اور جلن کا باعث بن گئی اور اس کا اثر سب سے زیادہ اہل یہود کے قبیلہ قینوقاع پر ہوا۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے سنار اور لوہار اور گھریلو استعمال کی چیزیں بنانے والے تھے، اس لیے ان کے پاس سامان حرب کافی تعداد میں موجود تھا اور اس کے علاوہ ان کے ہاں سات صد دلیر سپاہ بھی موجود تھے۔ انہیں اپنی طاقت اور وسائل پر ناز تھا اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی خلاف ورزی کرنی شروع کر دی اور مسلمانوں کے ساتھ بدتمیزیاں اور شرارتیں کر کے انہیں اکسانے لگے کیونکہ انہیں قوی گمان تھا کہ اگر مسلمانوں نے ان کی شرارتوں کا جواب طاقت سے دینے کی کوشش کی تو وہ پھر اس کی آڑ میں ان پر حملہ بول کر انہیں زیر کر لیں گے۔

(۱۰۰) یہودیوں کی مسلمان خاتون کے ساتھ بیہودگی

اسی حسد اور جلن کے تحت شرارت کے سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی نکلی کہ چند یہود نے ایک مسلمان خاتون جو ایک یہودی کی دوکان میں داخل ہوئی، اس کا نقاب کھینچ کر اتار دیا۔ جب اس خاتون نے اپنے اس طرح بے آبرو ہونے پر احتجاج کیا تو وہاں موجود یہودیوں نے اس واقعہ سے لطف اندوزی کا اظہار کیا۔ جب ایک مسلمان راہ گیر نے یہ منظر دیکھا تو وہ آگ بگولہ ہو گیا اور ان کی اس شرارت کے جواب میں اس دوکاندار سنار کو قتل کر دیا جس نے خاتون کو بے آبرو کیا تھا۔ پس اس معاملے نے ایک بڑا انتشار پیدا کر دیا اور مسلمانوں اور یہودیوں کی آپس میں اچھی خاصی چپقلش ہو گئی۔

(۱۰۱) قلعہ بند یہود کا محاصرہ اور منافقوں کا کردار

جناب رسالت مآبؐ نے اس معاملے پر غور فرمایا اور اس شرارت کے انسداد کے لیے دوسری ہجری کے ماہ شوال کی پندرہ تاریخ کو مدینہ سے قلعہ بنو قینقاع کی طرف روانہ ہوئے۔ آپؐ نے اپنے بعد مدینہ کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے بشیر بن عبداللہ منذر کو منتخب فرمایا۔ جناب رسولؐ اللہ نے اپنے ساتھ چند جانثار حضرات کا گروہ لیا، آپؐ کے چچا جناب حمزہؓ علمبردار کی حیثیت سے شریک تھے۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قلعہ کے گرد گھیرا ڈال دیا اور

پندرہ روز کے محاصرے کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے ان کی زندگی، دولت، عورتوں اور بچوں کے متعلق فیصلہ دے دیا۔

قبیلہ خزرج کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول نے اپنا منافقانہ کردار پیش کیا، یہودیوں کے حق میں۔ جناب رسالت مآبؐ نے اس کا اسلوب و کردار پسند نہیں فرمایا جب کہ وہ یہود کی موافقت میں گزارش کر رہا تھا لیکن رسالت مآبؐ ہنوز اسے مسلمان ہی سمجھ رہے تھے حالانکہ آپ اس کی منافقت سے واقف بھی ہو چکے تھے۔ لیکن پھر بھی ابی کی معافی کی درخواست منظور کر لی گئی اور یہودی اپنی ملکیت کے بدلے صرف ان کے احلو کے معاف کر دیے گئے۔ اس پر وہ یہودی اپنے گھربار چھوڑ کر ملک شام چلے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے جو سب کچھ جاننے والا ہے منافقوں کی خفیہ مسلمان دشمنی کو ظاہر فرما دیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہ تو یہودیوں کے بھی خیر خواہ نہیں۔ اس بارے میں سورۃ الحشر (۵۹) کی آیت (۱۱) کا نزول ہوا۔ جس میں کہا گیا ہے کہ: "کیا تم نے (اے محمدؐ) منافقین کے متعلق غور نہیں کیا جو اپنے دوستوں کو کہتے ہیں جو اہل کتاب میں سے ہیں اور ایمان نہیں لائے، (اور کہتے ہیں) اللہ کی قسم! اگر تمہیں یہاں سے نکال دیا جائے گا تو ہم بھی تمہارے ساتھ یہاں سے نکل جائیں گے اور ہم کبھی بھی کسی کو تسلیم نہیں کریں گے جو تمہارے خلاف ہوگا اور اگر تم پر حملہ ہوا تو ہم تمہاری مدد کریں گے لیکن اللہ گواہ ہے کہ وہ بیشک جھوٹے ہیں"۔

ابن عباسؓ قتادہؓ اور ابن اسحاقؒ کا یہ خیال ہے کہ سورۃ الحشر (۵۹) کی آیت (۱۲) بھی اسی سلسلے میں نازل ہوئی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ "(منافقین نے جو یہود کے حلیف تھے انہوں نے ان کو دھوکہ دیا) شیطان کی طرح جب وہ انسانوں سے کہتا ہے کہ اللہ کو نہ مانو (اور جب انسان اس کی اطاعت کرتا ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے) یہ کہتے ہوئے کہ میں تو میرا ہوں تم سے اور اللہ سے ڈرتا ہوں جو رب ہے ہر شے کا جو موجود ہے (جیسا کہ وہ بدر سے بھاگ گیا تھا)"۔

اللہ تعالیٰ نے منافقین کو منع کیا سورہ المائدۃ (۵) کی آیت (۸۰) میں اور کہا "تم دیکھتے ہو (اے پیغمبر) ان (منافقوں) میں سے بہت سے لے رہے ہیں کافروں کو (یہود میں سے) اپنے دوست اور مددگار (اپنی وفاداری اور مدد کی یقین دہانی یہود کے لیے بجائے مسلمانوں کے) ان کے اس شیطانی کام نے ان کے دل میں منافقت پیدا کر دی اور اللہ کا غصہ جو وہ

پائیں گے قیامت کے روز عذاب کی صورت میں"۔

سورۃ المائدہ کی اگلی آیت (۸۱) اس کے بعد بیان کرتی ہے "اور اگر وہ سچائی سے مانتے اللہ کو، اس کے رسولؐ کو اور اللہ کی کتاب کو تو وہ یہ شیطانی عمل کافروں (یہود) کو مدد دینے کا نہ کرتے خفیہ طریقے سے، اور دشمنی کرتے ان سے جو اللہ کو مانتے ہیں، اس کے رسولؐ کو اور جو کچھ اس پر نازل ہوا ہے لیکن ان میں سے بہت سے اللہ کے نافرمان ہیں اور اس کے رسولؐ کے اور اللہ کی آیتوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں"۔

(۱۰۲) مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں اور مشرکین کی دشمنی

اللہ تعالیٰ نے اپنے تابعدار بندوں کو بتا دیا کہ یہود کبھی بھی ان سے پرخلوص نہیں ہو سکتے جیسا کہ وہ پچھلے پیغمبروں کے ساتھ اور ان کی امتوں کے ساتھ پرخلوص نہیں تھے۔ خاص طور پر وہ عیسائیوں کے ساتھ بغض رکھتے تھے، جناب عیسیٰؑ کے خلاف تھے، انہیں انہوں نے اللہ کا پیغمبر تسلیم ہی نہیں کیا اور انہیں قتل کرنے کی سازش کی۔ بلکہ انہوں نے تو اپنی طرف سے انہیں قتل کر ہی دیا تھا۔ وہ تو اللہ نے انہیں بچا لیا۔ اسی طرح سے وہ مسلمانوں کے خلاف ہو گئے اور جناب رسالت مآبؐ کو قتل کرنے کی کئی مرتبہ سازش کی۔

اس کے برعکس عیسائی مسلمانوں کے لیے نرم دل رکھتے تھے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر لعنت بھیجی۔ اس سلسلے میں سورۃ المائدہ (۵) کی آیت (۷۸) میں فرمایا گیا کہ "وہ جو اولادِ اسرائیل ہیں اور اللہ کا حکم نہیں مانتے، ان پر پیغمبر داؤدؑ اور مسیح ابن مریمؑ نے لعنت بھیجی کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کا حکم نہیں مانا اور وہ حدود اللہ کی پاسداری نہیں کر رہے تھے"۔

اس کے علاوہ سورۃ المائدہ کی آیت (۸۲-۸۲) اہل ایمان کو آگاہ کرتی ہیں کہ اہل یہود ان کے لیے شدید دشمنی رکھتے ہیں اور یہی حال مشرکین کا ہے جبکہ محبت میں ایمان والوں کے نزدیک عیسائی ہیں جو نصاریٰ کہلاتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں انکساری ہے تکبر کے بجائے اور ان میں صحیح علماء ہیں اور درویش جن کو اللہ کی کتاب (انجیل) پر ایمان ہے اور اس کا انہیں صحیح علم بھی ہے۔ اور وہ الہامی الفاظ کی پہچان بھی رکھتے ہیں، اس لیے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتی ہیں، جب وہ اللہ کا کلام سنتے ہیں، وہ سچے لوگ ہیں اور اپنے مالک سے امید رکھتے ہیں

جنت کے باغات کی، اپنی تابعداری کے عوض جس کا مظاہرہ وہ اللہ کے لیے کرتے ہیں۔
(تفصیل کے لیے ان آیات کا مطالعہ کیا جائے)

سعید بن جبیرؓ بن سدی اور کچھ دوسروں نے کہا ہے کہ یہ آیات عیسائیوں کے اس وفد کی بابت نازل ہوئی تھیں جو جناب نجاشیؓ کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ جب انہوں نے اللہ کے رسول کے متعلق سنا تو انہوں نے ایک وفد بھیجا تاکہ وہ دیکھ کر آئیں کہ جناب رسولؐ اللہ کے کیا خواص ہیں اور آپ کیا فرماتے ہیں اور کتاب اللہ کا کیا حکم ہے؟ لہٰذا جب انہوں نے جناب رسالت مآبؐ سے ملاقات کی اور آپؐ سے قرآن سنا تو وہ چیخ کر رونے لگے اور کانپنے لگے (کیونکہ انہوں نے پہچان لیا کہ وہ الفاظ کوئی معمولی الفاظ نہیں ہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ کے الفاظ ہیں) اور پھر وہ دوبارہ اسلام میں داخل ہوئے۔

ابن جریرؓ نے فرمایا کہ یہ آیات اہل کتاب کے لیے ہیں چاہے وہ کوئی بھی ہو اور انہوں نے اسی طرح کا اظہار کیا ہو قرآن اور اللہ کے رسولؐ کی بابت، جیسا کہ حبشہ کے وفد نے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کو مسلمانوں کا بدترین دشمن قرار دیا، ان کی مسلسل سازشوں کی وجہ سے، ان کی شرارتوں، بری عادتوں، بغاوت، دھوکہ اور سچائی کی مخالفت کی وجہ سے اور ان کی پیغمبروں سے دشمنی اور ان کو قتل کرنے کی وجہ سے۔ اور وہ ابھی تک اس تاک میں تھے کہ جناب رسولؐ اللہ کو بھی اسی طرح سے قتل کر دیں جیسا کہ انہوں نے پہلے پیغمبروں کو کیا، اسی لیے ان پر اللہ کی طرف سے لعنت بھیجی گئی۔

(۱۰۳) جناب رسالت مآبؐ پر قاتلانہ کوشش

محمد بن اسحاقؒ کے مطابق سورۃ المائدہ کی آیت (۱۱) کا نزول بنونضیر کے متعلق تھا، جب انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ جناب رسالت مآبؐ کے سر مبارک پر پتھر پھینکیں، جب کہ آپؐ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے، اس دوران جب آپؐ خون بہا کا حصہ یہودی قبیلے بنونضیر سے لینے تشریف لائے تھے۔ یہ خون بہا بنوکلب کے دو اشخاص کو عمرو بن امیہ کا غلطی سے قتل کی وجہ سے واجب ہوا تھا۔ یہودی قبیلہ بنونضیر چونکہ مسلمانوں کا اس معاملے میں حلیف تھا، لہٰذا انہوں نے خون بہا کی ادائیگی میں شریک ہونا تھا، اس کے متعلق پورے واقعہ کا ذکر آگے چل کر "غزوہ بنو نضیر" کے موضوع کے تحت آئے گا۔

جب رسولؐ اللہ یہود کے قلعے کی دیوار کے ساتھ بیٹھ کے انتظار فرما رہے تھے اور آپؐ کے ساتھی الگ ایک جگہ جمع تھے تو یہودیوں نے عمرو بن جحش بن کعب کو مقرر کیا کہ وہ جناب رسالت مآبؐ پر اوپر سے پتھر گرائے۔ جناب رسالت مآبؐ کو فوری الہام ہوا اور آپؐ نے اسی لمحہ وہ جگہ چھوڑ دی۔ اس طرح کے واقعات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آل عمران کی آیت (۵۴) میں فرمایا کہ "میں تم سے اچھی تدبیر کرنے والا ہوں"۔

بعد میں خاص طور پر بنونضیر کے بارے میں جب انہوں نے یہ سازش ترتیب دی تو اپنے رسولؐ کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ حشر (۵۹) کی آیت (۳) میں حکم دیا کہ وہ انہیں شہر بدر کر دیں۔

اسی طرح کی ایک اور سازش بدر کی لڑائی کے بعد مشرکین نے بھی کی تھی۔ جس میں دو اشخاص عمیر بن وہب اور صفوان بن امیہ نے آپس میں مشورہ کیا جس میں صفوان نے جناب رسولؐ اللہ کو قتل کرنے کی خواہش کا اظہار عمیر سے کیا۔ لیکن ساتھ ہی کہا کہ اسے اپنے قرضے کے متعلق خوف ہے اور ساتھ ہی اپنے گھر کے افراد کی فکر۔ صفوان نے کہا کہ وہ یہ ذمہ داری اپنے ذمہ لیتا ہے لہٰذا وہ اپنا کام کرے۔ اس پر عمیر مدینہ کی طرف روانہ ہوا جہاں مسجد نبویؐ کے باہر جناب عمر بن خطابؓ نے اسے دیکھ لیا اور انہیں اس پر کچھ شبہ ہوا۔ آپؓ نے اس کی خبر جناب رسولؐ اللہ کو پہنچائی۔ پھر عمیر بھی مسجد میں داخل ہو گیا تو جناب رسولؐ اللہ نے اس سے اس کی آمد کا مقصد پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہے جو بدر میں پکڑا گیا تھا۔ اس پر آپؐ نے اس کی تلوار پر لعنت بھیجی اور فرمایا کہ اس نے تمہارے لیے کچھ نہ کیا، اور پھر آپؐ نے اس کے ارادے کے متعلق اسے بتا دیا۔ کیونکہ اس کے ارادے کو صفوان کے علاوہ دوسرا اور کوئی نہیں جانتا تھا، وہ اس انکشاف پر حیران ہو گیا اور بیک جناب محمدؐ کی رسالت کا اقرار کر لیا اور پھر ایمان پا کر واپس مکہ چلا گیا اور دعوت اسلام میں مشغول ہو گیا اور اس کاوش میں کافی کامیاب رہا۔

(۱۰۴) یہودیوں کی جناب مسیحؑ کو قتل کرنے کی سازش

یہودیوں نے صرف جناب محمدؐ کو ہی قتل کرنے کی سازش نہیں کی بلکہ اس سے پہلے وہ جناب مسیحؑ کو بھی قتل کرنے کی سازش کر چکے تھے۔ اس سازش کے حوالے سے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۵۴–۵۵) کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں نے اس وقت کے کافر بادشاہ سے

جناب مسیحؑ کی شکایت کی اور کہا کہ وہ لوگوں کو بہکا کر مملکت میں تقسیم پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس بات پر بادشاہ غضبناک ہو گیا اور حکم دیا کہ مسیحؑ کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انکو بچا لیا اور انکو آسمان زمین تک ان کے جسم سمیت پہنچا دیا اور ان کی شبیہ کسی اور پر ڈال دی جو انکو پکڑنے آئے تھے اور اس طرح انہوں نے اپنے ہی ساتھی کو مسیحؑ سمجھ کر سولی چڑھا دیا۔

سورۃ آل عمران (۳) کی آیات (۵۴-۵۵) میں فرمایا گیا کہ "اور انہوں نے تدبیر کی (عیسیٰ کے قتل کی) اور اللہ نے بھی تدبیر کی۔ اور اللہ سب سے بہتر تدبیریں کرنے والا ہے اور یاد کرو جب اللہ نے فرمایا: "اے عیسیٰ! میں تمہیں لے جاؤں گا اور اٹھا لونگا اپنے پاس اور پاک کر دوں گا ان لوگوں سے جو کفر کرتے ہیں اور میں انکو بالا رکھوں گا جو تمہارا کہنا مانتے ہیں ان لوگوں کی نسبت جو کفر کرتے ہیں، قیامت تک کے لیے۔ پھر تم میرے پاس لوٹ آؤ گے اور میں فیصلہ کرونگا تمہارے درمیان ان معاملات میں، جن میں تم باہم جھگڑتے تھے"۔

(۱۰۵) جناب رسالت مآبؐ کی سیدہ حفصہؓ سے شادی

سیدہ حفصہؓ جناب عمرؓ کی صاحبزادی خنیس بن حذافہؓ کے عقد میں تھیں جو بدر میں شہادت پا گئے تھے۔ آپ دونوں چونکہ جوان عمر ہی تھے اس لیے جناب عمرؓ کو فکر لاحق ہوگئی کہ ان کی دختر جوانی میں ہی بیوہ ہو گئیں، اس لیے وہ شدید خواہش رکھتے تھے کہ ان کی کہیں شادی ہو جائے۔ اسی دوران سیدہ رقیہؓ دختر جناب رسولؐ اللہ جو سیدنا عثمانؓ کے عقد میں تھیں، علالت کے بعد وفات پا گئیں۔ اس لیے جناب عمرؓ نے عثمانؓ سے اپنی بیٹی کے بارے میں خواہش ظاہر کی۔ لیکن عثمانؓ نے خاموشی اختیار کی، عمرؓ کو عثمانؓ کا یہ طرز عمل پسند نہ آیا۔ جس کی شکایت انہوں نے جناب رسولؐ اللہ سے کی اور آپؐ سے اپنے غصے کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ عثمانؓ کے رویے کی وجہ سے اس سے کلام نہ کریں گے۔

جناب رسولؐ اللہ نے عمرؓ کو سمجھایا اور فرمایا "تمہارا عثمان سے خفا ہونا بجا ہے لیکن میں اسے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔ جناب رسولؐ اللہ نے مزید فرمایا جہاں تک تمہارے غصے اور غم کا مسئلہ ہے میں اس کو صرف اس طرح سے ہی حل کر سکتا ہوں کہ خود حفصہؓ سے نکاح کر لوں"۔ جناب رسالت مآبؐ کے اس فیصلے اور پیش کش نے جناب عمرؓ کو خوشی سے ہمکنار کر دیا اور انہوں

نے خوشی کے اظہار کے طور پر جناب رسولؐ اللہ کے دست مبارک اپنے ہاتھوں میں لے کر چومنے شروع کر دیے۔

(۱۰۶) دختران نبیؐ کی شادیاں

دوسری ہجری کے ماہ ذی الحجہ یعنی جون ۶۲۴ء میں جناب رسولؐ اللہ نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سیدہ فاطمہؓ کی شادی جناب علیؓ بن ابی طالب سے کر دی جو پہلے ہی سے آپ کے گھر میں آپ کے بیٹے کی طرح رہ رہے تھے۔ اسی دوران جناب رسولؐ اللہ نے اپنی دختر سیدہ ام کلثومؓ کا نکاح جناب عثمانؓ سے کر دیا۔ اس نکاح سے پہلے جناب عثمانؓ کے عقد میں جناب رسولؐ اللہ کی صاحبزادی سیدہ رقیہؓ تھیں جو علالت کے بعد رحلت فرما گئی تھیں، اسی لیے جناب عثمانؓ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے یعنی دو روشنیوں کا رکھنے والا۔

(۱۰۷) رسالت مآبؐ کے قریب ترین نائبین اور ان سے تعلقات

جناب رسولؐ اللہ کے نائب اول جناب ابوبکر صدیقؓ آپؐ کے نہایت عزیز ترین اور قریبی ساتھی تھے اور جنہیں آپؐ نے صدیق کا خطاب عطا کیا تھا، وہ آپؐ کے اور نزدیک آ گئے جب انہوں نے اپنی صاحبزادی سیدہ عائشہؓ کا نکاح آپؐ سے کیا۔ جس کی وجہ سے جناب رسولؐ اللہ کو دلی تسکین بہم پہنچی، جب کہ آپؐ اپنی عزیز ترین رفیقہ حیات اور آپ کی غمگسار سیدہ خدیجہؓ کے بچھڑنے کی وجہ سے نہایت رنجیدہ تھے۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ عمر ابن العاصؓ نے جناب رسالت مآبؐ سے پوچھا کہ آپؐ اس دنیا میں کس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں؟" تو آپؐ نے فرمایا: "عائشہ سے"۔ انہوں نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ میں نے مردوں کے متعلق سوال کیا تھا"۔ تو آپؐ نے فرمایا "عائشہؓ کے والد سے"۔

جناب رسالت مآبؐ کے تعلقات اور رشتہ داری جناب عمرؓ سے اور زیادہ ہو گئی اور زیادہ قربت بڑھ گئی جب آپؐ نے سیدہ حفصہؓ سے عقد فرمایا۔ بے شک جناب عمرؓ سے آپؐ پہلے ہی بہت محبت فرماتے اور آپؐ نے جناب عمرؓ کو فاروق کا لقب بھی عطا فرمایا تھا یعنی سچ اور غلط یعنی

اسلام اور کفر میں تفریق کرنے والا۔

عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جناب عمرؓ کا اسلام قبول کرنا اسلام کی فتح تھی کیونکہ سیدنا عمرؓ اسلام کے لیے طاقت لے کر آئے اور پہلی مرتبہ مسلمانوں نے کعبہ کے سامنے نماز ادا کی اور عمرؓ کی موجودگی میں کسی کافر کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ کچھ کہہ سکے۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے ابو ہریرہؓ کے حوالے سے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ: "بنی اسرائیل کی اقوام میں سے جو تم سے پہلے گزری ہیں ایسے حضرات تھے جو اپنے لوگوں کو ہدایت کی لیے متاثر کرتے تھے گو کہ وہ پیغمبر نہ ہوتے تھے، اگر اب ان جیسا کوئی شخص ہے تو عمرؓ ہے۔ عثمانؓ بن عفان بھی اللہ کے رسولؐ کے عزیز تھے اور آپ کے قریب تر تھے، آپؐ نے اپنی دو دختران عزیز ان کا یکے بعد دیگرے ان سے نکاح کیا۔ جناب عثمانؓ سخاوت میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور آپ کو غنی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

بخاریؒ نے انس بن مالکؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسولؐ اللہ احد کے پہاڑ پر جناب ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے ہمراہ تھے تو پہاڑ لرزنے لگا۔ جس پر جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "ٹھہر جاؤ اے احد! تمہارے اوپر ایک رسول، ایک صدیق اور دو شہید ہیں"۔ اسی طرح جناب علیؓ بن ابی طالب بھی آپ کو بہت عزیز تھے، انھیں آپؐ نے اپنے چچا سے لیا تھا اور اپنے بچوں کی طرح انھیں اپنے گھر رکھا تھا جب آپؐ نے علیؓ کو اپنایا تھا تو وہ صرف پانچ برس کے تھے لہٰذا جناب علیؓ کو جناب رسولؐ اللہ کی رفاقت میں رہنے اور آپؐ سے سیکھنے کا سب سے زیادہ موقع ملا۔ جناب رسولؐ اللہ ان سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے اور اسی لیے اپنی بیٹی کا عقد ان سے کر دیا۔ حالانکہ وہ بہت غریب تھے، دراصل انہوں نے جناب رسالت مآبؐ سے فقیری میں ہی رہنا سیکھا تھا۔ انہوں نے دنیاداری یعنی دنیا کے مال و اسباب کی ذیب نہیں لگائی۔ ایک مرتبہ جناب رسالت مآبؐ نے انھیں فرمایا تھا کہ "کیا تم خوش نہیں کہ تم مجھے مثل ہارونؑ ہو جیسا کہ وہ موسیٰ کو تھے لیکن میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں"۔

(۱۰۸) غزوہ نجد یا ذی اَمر

تیسری ہجری کے ماہ محرم میں جناب رسالت مآبؐ کو اطلاع ملی کہ بنو ثعلبہ اور بنو محارب مدینہ

کے اطراف حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اس پر جناب رسولؐ اللہ نے چار صد پچاس (۴۵۰) اصحاب کے ساتھ نجد کے علاقے غطفان کی طرف روانہ ہوئے۔ آپؐ نے مدینہ میں اپنے بعد جناب عثمانؓ بن عفان کو اپنی جگہ مقرر فرمایا۔ راستے میں آپ کو ایک مشتبہ شخص ملا جسے آپؐ نے حراست میں لے لیا لیکن وہ اسلام قبول کر کے قافلے کا گائیڈ بن گیا۔ جب دشمنوں کو آپ کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ جناب رسالت مآبؐ نے اپنے قافلے کو ایک پانی کے ذرائع جو ذی امر کے مقام پر تھا وہاں روکا اور وہاں پورے ماہ صفر قیام فرمایا تاکہ بدو قبائل کو مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ ہو جائے اور پھر کسی معاملے کے بغیر واپس تشریف لے آئے۔

(۱۰۹) غزوہ بُحران

تیسری ہجری کے ماہ جمادی الثانی میں جناب رسولؐ اللہ نے مدینہ میں جناب ام مکتومؓ کو قائم مقام کر کے تین صد صحابہ کے ساتھ حجاز کے علاقے فرغ کے گشت کے لیے نکلے۔ آپؐ وہاں دس روز گشت کرتے رہے جب کسی دشمن کا سراغ نہ ملا تو واپس تشریف لے آئے۔

(۱۱۰) سریہ زید بن حارثہؓ

قریش کا کافی زمانہ سے یہ دستور تھا کہ وہ ماہ جمادی الثانی کے دوران مکہ شام شاہراہ پر عموماً اپنے تجارتی قافلوں کے ساتھ سفر کرتے۔ چونکہ اس دوران موسم بہار ہوتا جو ریگستان کے سفر کے لیے بہت خوشگوار ہوتا، لیکن ان دنوں انھیں اس بات کا خوف بھی لاحق تھا کہ آیا ان کا سفر محفوظ رہے گا کہ نہیں۔ کیونکہ مسلمان اب لگاتار ان کی تلاش میں رہنے لگے تھے اور ان کی وجہ سے قریش کے جو معاہدات وہاں کے قبائل سے ہوئے تھے، محفوظ راستے کے معاملے میں وہ بھی مسلمانوں کی وجہ سے ختم ہو گئے تھے۔ بلکہ مسلمانوں نے خود نیا وہ تر قبائل سے دفاعی معاہدے کر لیے تھے قریش کے خلاف۔

اس لیے اب قریش نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنا راستہ شام مکہ شاہراہ جو ساحلی علاقے کے ساتھ ہو کر جاتا تھا تبدیل کر لیا اور اس سے زیادہ محفوظ راستہ لیکن مشکل اور طویل جو نجد اعراق شاہراہ تھی، اختیار کر لیا۔ یہ علاقہ پہاڑی اور صحرائی بھی تھا اس راستے کو گائیڈ کرنے کے لیے ایک

شخص فرات بن حیان بھی موجود تھا۔ اس لیے قریش نے اس نئے راستے سے ایک تجارتی قافلہ لے کر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن ان کی پلاننگ ایک شخص نعیم بن مسعود اشجعیؓ کی وجہ سے جو شراب کے نشے میں تھا خفیہ نہ رہ سکی۔ اس لیے جناب رسولؐ اللہ نے فوری طور پر ایک سو گھوڑوں کا رسالہ جناب زید بن حارثہؓ کی سالاری میں کاروان کے پیچھے روانہ کیا۔ چنانچہ زید بن حارثہؓ نے اس کاروان کو القردہ کے مقام پر آلیا۔ وہ قافلہ صفوان بن امیہ کی سربراہی میں تھا اور اس قافلے کے پاس ایک لاکھ درہم کا تجارتی سامان تھا۔ جب قافلے کے لوگوں نے مسلمان سپاہ کو دیکھا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے جبکہ قافلے کے راہبر فرات بن حیان کو مسلمان رسالے نے گرفتار کر لیا جس کے ساتھ دو اور شخص تھے اور ساتھ ہی قافلے کا سامان۔ مسلمانوں کی اس طرح سے قافلے کو مزاحمت کر کے قابو میں لے لینے سے اہل قریش بہت بڑی حیرانگی پریشانی اور خوف وہراس کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے اور اب ان کے لیے عراق و شام جانے کے لیے کوئی راستہ نہ بچا۔ اب ان کی سیاسی و معاشی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی اور یہ ان کی موت اور زندگی کا معاملہ بن گیا۔ اس لیے اہل قریش نے فیصلہ کیا کہ اب مسلمانوں کو مدینہ سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہو گیا ہے اور یہی امر اس کا باعث بنا کہ قریش نے ایک اور فیصلہ کن جنگ کا فیصلہ کیا اور اس کی تیاری شروع کر دی۔ اور پھر مقام احد پر مسلمانوں اور قریش میں ایک فیصلہ کن معرکہ ہوا۔

(III) جناب رسالت مآبؐ کے دشمنوں کا قتل

حالانکہ یہود مدینہ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک معاشی و سیاسی معاہدہ میں شرکت کی تھی لیکن انہوں نے اپنے بغض کی وجہ سے ابھی تک جناب رسالت مآبؐ کو مدینہ کا سربراہ تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ بدر کی فتح کے بعد وہ مسلمانوں کے معاملے میں اور زیادہ متعصب ہو گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جب کبھی بھی وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کرنے کے قابل ہوئے۔ اور تو اور انہوں نے اپنے شاعروں کو بھی اکسایا کہ وہ اپنی شاعری کو جناب رسولؐ اللہ کے خلاف استعمال کریں۔

فتح بدر سے پہلے مسلمان اس حالت میں نہ تھے کہ وہ اپنی بے عزتی یا اپنے خلاف کسی توہین یا سازش کا بدلہ لے سکیں بلکہ ان میں سے اگر کوئی قتل بھی کر دیا جاتا تو وہ اس کا بھی بدلہ نہ لے پاتے۔

اب وہ اللہ کے فضل و کرم سے کافی مضبوط ہو چکے تھے اور ان میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اپنی ذلت کا بدلہ لے سکیں۔ اس لیے انہوں نے یہود مدینہ کے تین شاعر منتخب کیے گئے جو جناب رسالت مآبؐ کی شان میں نازیبا شعر کہتے تھے، کہ ان سے ان کی بیہودگی اور گستاخی کا بدلہ لیا جائے۔

(الف) ابو افک:

یہ شخص قبیلہ بنو امرو بن عوف سے تعلق رکھتا تھا اور اپنی شاعری میں جناب رسولؐ اللہ کی شان میں گستاخی کرتا تھا اور اپنی قوم کو بھڑکاتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں اور بدر کے بعد بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ جبکہ اسے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ اب مسلمان کمزور نہیں رہے۔ لہٰذا ایک جانباز اور اللہ کے غلام سالم بن عمیر اوسیؓ نے ایک رات جبکہ وہ بدبخت اپنے گھر میں سو رہا تھا اس کا کام تمام کر دیا۔

(ب) اسماء بنت مروان:

یہ خاتون بنو خطیمہ کے قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی اور ایسی بد زبان تھی کہ اللہ، جبرئیل، محمدؐ، قرآن اور مسلمانوں کے خلاف ہجو اس کرتی تھی۔ اس کی اس حرکت کے صلہ میں ایک مجاہد جس کی بصارت بھی بہت ضعیف تھی جس کا نام عمیر بن عوف تھا اس کے گھر میں ایک رات داخل ہوا اور اسے قتل کر دیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ عمیر اس کا رشتہ دار تھا اور اس کے گھر کے بارے میں اچھی طرح واقف تھا۔

(ج) کعب بن اشرف:

یہودیوں کا ایک معزز کعب اس بات پر خوش نہ تھا کہ مسلمانوں نے اہل قریش کے چیدہ چیدہ سردار بدر کے میدان میں ختم کر دیے اور ساتھ ہی اسے یہ بھی شک تھا کہ حقیقت میں اہل قریش کو بدر میں واقعی شکست بھی ہوئی ہے یا نہیں۔ اس لیے وہ خود مکہ گیا تا کہ اس بات کی تصدیق کر سکے۔ وہاں پر اس نے قریش کو جناب رسالت مآبؐ کے خلاف بھڑکایا اور اپنے اشعار کو اس کا ذریعہ بنایا۔ جب وہ وہاں سے مدینہ واپس آیا تو اس نے مسلمانوں کی بے عزتی اور مسلمان عورتوں کو بدنام کرنا شروع کر دیا اور اس کا ذریعہ بھی اپنی شاعری کو بنایا۔

اس پر صورتحال بہت بگڑ گئی اور مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔ اس پر جناب رسولؐ اللہ نے اپنے ساتھیوں کو بلایا اور پوچھا کہ اشرف کو کون قتل کر سکے گا؟ اس پر محمد بن مسلمہؓ، عباد بن بشرؓ، حارث بن عوسؓ، عبس بن جبر اور سلکان بن سلمہؓ نے اپنی خدمات اس کام

کے لیے پیش کیں، اس طرح سے کعب کا کام بھی تمام ہوا۔

اس کے بعد یہود خوفزدہ ہو گئے اور اب مسلمانوں کے ساتھ انسانوں کی طرح برتاؤ کرنے لگے لیکن حقیقتاً وہ مسلمانوں کے اور بھی زیادہ خلاف ہو گئے تھے حالانکہ ان کی زبانیں گنگ تھیں۔

(۱۱۴) جنگِ اُحد

یہ جنگ مدینہ کے مسلمانوں اور قریش مکہ کے درمیان کوہِ اُحد کے دامن میں لڑی گئی جو مدینہ کے اطراف میں واقع ہے۔ یہ معرکہ تیسری ہجری کے ماہ شوال یعنی ۲۳ مارچ ۶۲۵ء کو وقوع پذیر ہوا۔ اس جنگ میں ایمان والوں کے لیے عبرت کے بہت سے نشانات دیکھنے کے لیے بہت کچھ ملا۔ دراصل یہ جنگ خلوص، وفاداری، تابعداری اور اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان اور یقین کا امتحان تھا۔ اس لیے اس جنگ سے سبق سیکھنے کے لیے اس کے استخراج کی ضرورت ہے جس کے لیے ہمیں اس کے ہر پہلو پر غور کرنا ہوگا۔ آج اس وقت بھی ہمیں یہ واقعہ عبرت کے نشان مہیا کرتا ہے۔

(الف) جنگ کے وجوہ:

(i) قریش کی بدر کے مقام پر شکست

قریش کی شکست نے انہیں انتہائی مایوس پاگل پن کی حد تک غضبناک اور اپنے مقتولوں کے انتقام کے لیے آگ بگولا کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان میں ایک خاص تڑپ پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی معمولی تعداد میں اور بے سروسامانی کی حالت میں یہ لوگ ایک بڑی قوت کو اس طرح کی ذلت سے ہمکنار کر دیں گے۔ ان کے معزز قتل ہو گئے، ان کے بہترین جنگجو زیر ہو گئے، ان کے دانشور اپنے پیچھے مشہور و معروف بیوائیں اور یتیم چھوڑ گئے اور انہوں نے اپنی اعلیٰ حیثیت جو پورے عرب میں تھی کھو دی۔ وہ جنگ بھی ہارے اور اپنی دولت بھی ضائع کر بیٹھے۔ انہیں اپنا مستقبل تاریک اور نا امید نظر آ رہا تھا اور یہ سب کچھ یاد کرنے کے بعد ان کے غصے نے بھڑکنا ہی تو تھا، اس لیے انہیں آخر کار اس فیصلے پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ مسلمانوں سے اپنی ذلت کا بدلہ لیں۔

(ii) قریش کا مستقبل اندھیرے میں

قریش شہر مکہ میں آزادی کے ساتھ رہ رہے تھے اور ان کا پورے عرب میں اثر و رسوخ

تھا۔ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے ان کی بہت اہمیت تھی اور اس وجہ سے ان کی اچھی خاصی آمدنی بھی تھی۔ زائرین کعبہ جب مکہ آتے تو اپنی ضروریات کی اشیاء خریدنے کے علاوہ انہیں اہل قریش سے احرام بھی خریدنا پڑتا جو طواف کعبہ کے لیے ضروری تھا اور احرام صرف کعبہ کے متولی ہی فروخت کر سکتے تھے۔ غریب زائرین جو احرام خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، انہیں کسی اور کپڑے میں طواف کرنے کی اجازت نہ تھی، اس لیے وہ اس بات پر مجبور تھے کہ اہل قریش سے احرام خریدیں یا پھر بغیر کوئی لباس زیب تن کیے طواف کریں۔

لیکن بدر کی شکست کے بعد ان کی یہ من مرضی کچھ زیادہ دیر چلنے والی نہ تھی، اس طرح سے ان کی سیاسی اور معاشی حالت داؤ پر لگ گئی تھی، ان کی آزادی اور ان کا رعب بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔ کیونکہ ان کے مقابلے میں آنے والی نئی قوت نے انہیں شرمناک شکست سے دوچار کر دیا تھا، یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مکہ کے چوہدریوں کی چوہدراہٹ خطرے میں پڑ گئی تھی۔

(iii) قریش خواتین کی اشتعال انگیزی

قریش خواتین ابھی تک اپنے پیاروں کی جدائی میں گریہ کناں تھیں اور ساتھ ہی انتقام کی آگ بھی ان میں بھڑک رہی تھی۔ ان کی اس طرح چیخ و پکار، رنج و الم اہل قریش کے لیے ناقابل برداشت تھا اور ان کے غم اور غصے کو بھڑکانے کے لیے اور بھی زیادہ کارگر ثابت ہوا۔ اس طرح سے اہل قریش اپنی شکست کا غم بھولنے کے بجائے اور زیادہ انتقام کی طرف مائل ہو رہے تھے، لہٰذا اقام کے تمام قریش انتقام کے لیے تیار ہو گئے۔

(ب) جنگ کی تیاری:

(i) امرائے قریش کا فیصلہ

قریش کے امراء و سردار اس معاملے پر غور و خوض کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے جو بدر کی شکست کے بعد رونما ہوا تھا، ان میں سے پانچ (۱) جبیر بن مطعم (۲) صفیان بن امیہ (۳) اکرمہ بن ابوجہل (۴) حارث بن ہشام (۵) اور حویطب بن عبدالعزیٰ نے مل کر اپنی دانش سے یہ فیصلہ کیا کہ جس قافلے کی وجہ سے بدر کا معرکہ ہوا اس قافلے کی آمدنی ہر شخص علیحدہ کرے اور اسے مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر خرچ کرے۔ اس تجویز کو تمام مشرکوں نے منظور کر لیا۔ اس واقعہ کے متعلق سورۃ انفال (۸) کی آیت (۳۶) کا نزول ہوا۔ محمد بن اسحاق نے فرمایا کہ

حسب ذکرہ بالا پانچ امراء کے بیٹے بھائی اور والد بدر میں کام آئے تھے۔ انہوں نے ابوسفیان اور دیگر ان لوگوں کو جن کا اسباب اس کارواں میں تھا جو مسلمانوں نے پکڑ لیا تھا کہا کہ " اے قریش کے لوگو! محمدؐ نے تمہیں مغرورہ کیا اور تمہارے معززین قتل کیے، لہٰذا تم اپنی دولت سے ہماری مدد کرو، اس لیے کہ ہم اس کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں، اس طرح سے ہم اپنے نقصان کا بدلہ لے سکیں گے"، اس پر وہ راضی ہو گئے۔

سورۃ انفال کی آیت (۳۶) میں اس واقعہ کے متعلق اس طرح فرمایا گیا کہ " بے شک! وہ جو کفر کرتے ہیں اپنی دولت خرچ کرتے ہیں (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے اور وہ اسی طرح سے خرچ کرتے رہیں گے لیکن آخر کار یہ ان لوگوں کے لیے اذیت کا باعث بنے گی اور پھر وہ بے یار و مددگار ہو جائیں گے اور وہ جو کفر کرتے ہیں وہ جہنم کے لیے اکٹھے کیے جائیں گے"۔

(ii) قریش نے مہم شروع کر دی

اس کے بعد انہوں نے رقم اکٹھی کی، جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور اپنے قبائل کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ایک شاعر ابوعزہ کو اجرت پر لیا اور اس کے ذمہ کنانہ اور تہامہ کے قبائل کو ابھارنے کا کام دیا جو آخر کار ان سے مل گئے۔ انہوں نے سیاہ فام غلاموں کے کچھ فراد بھی اجرت پر لیے تا کہ وہ ان کے لیے لڑائی لڑیں ان میں سے ایک قابل ذکر وحشی جو ایک ماہر تیر انداز اور نیزہ پھینکنے کا ماہر تھا، اسے ابوسفیان کی بیوی ہند نے اکسایا کہ وہ جناب حمزہؓ پر وار کرے اور اس کی کامیابی پر اس کی آزادی منحصر ہو گی۔

(iii) قریش خواتین کی جنگ میں شرکت

قریش کی بااثر خواتین نے جنگ میں شرکت پر اصرار کیا۔ جسے چند لوگوں نے پسند کیا اور چند نے ناپسند۔ پسند کرنے والوں نے کہا کہ وہ یا تو مرجانا پسند کرتے ہیں یا مار دینا اور ان کی سست روی کے موقع پر یہ خواتین ان کی ہمت بڑھائیں گی۔ دوسری طرف یہ دلیل دی گئی کہ ان خواتین کی بے حرمتی ہو گی، جنگ میں اگر شکست ہوئی تو۔ اس پر ابوسفیان کی بیوی ہند نے جذبات میں آکر کہا کہ وہ بدر جیسی غلطی نہ کریں جبکہ انہوں نے لڑکیوں کو واپس کر دیا تھا۔ بہرحال خواتین کی شرکت کو مان لیا گیا ان میں بڑے نام کی خواتین، ہند، ابوسفیان کی بیوی، ام

حکیم، ابوجہل کی بیوی فاطمہ، حارث بن ہشام کی بیوی، اور خالد بن ولید کی بہن برزہ، صفوان بن امیہ کی بیوی ام عبداللہ اور عمرو بن العاص کی بیوی وغیرہ۔

(iv) قریش فوج کی تفصیل

قریش تین ہزار سپاہ کو جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ اس وقت کی بہت بڑی فوج تھی۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

یہ فوج تین علمبرداروں کے ساتھ ابوسفیان کی سپہ سالاری میں تھی۔

(ا) مکہ کے تیغ زن ۲۸۰

(۲) طائف کے بنو ثقیف کے تیغ زن ۲۰

اس تین ہزار کی فوج کے پاس درج ذیل سامان حرب تھا:

(ا) اونٹ ۳۰۰۰ (سواری کے لیے اور کھانے کے لیے)

(۲) گھوڑے ۲۰۰ (خالد بن ولید کے تحت)

(۳) زرہ پوش سپاہی ۷۰۰

(۴) مناسب تعداد میں کمان، تیر، نیزے، ڈھالیں اور زرہ بکتر۔

(۵) خواتین کا ایک گروہ سپاہیوں کو اکسانے کے لیے (۳۰۰۰ کے علاوہ)

(ج) قریش فوج کا مدینہ میں ورود:

قریش فوج مدینہ کے شمالی علاقے میں تیسری ہجری کے ماہ شوال کی بارہ تاریخ یعنی ۲۲ مارچ ۶۲۵ء کو وارد ہوئی۔ انہوں نے مدینہ کے شمال میں پڑاؤ لگانے کا فیصلہ کیا، کیونکہ انہوں نے مدینہ کے جنوب کو اس کے لیے مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے ابوسفیان نے کوہ احد کے دامن میں جا کر عقیق کے مقام پر ڈیرہ ڈال دیا جو مدینہ شہر سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔ فوجی نقطہ نگاہ سے وہ جگہ ان کے لیے بہت موزوں تھی۔ پڑاؤ ڈالنے کے بعد انہوں نے اپنے گھوڑے اور اونٹ چرنے کے لیے مدینہ کے کھیتوں میں چھوڑ دیے۔

اس سے قبل جب قریش کی فوج ابواء کے مقام سے گزر رہی تھی جہاں پر جناب رسالت مآبؐ کی پیاری والدہ مدفون تھیں، وہاں پر ہند نے چند نوجوانوں کو اکسایا کہ وہ اس قبر کو کھود ڈالیں لیکن کچھ بڑے لوگوں نے اس بات کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم قبروں کو اکھاڑنے کی

روایت قائم کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔

(د) اللہ کے رسولؐ کو اطلاع:

جناب رسالت مآبؐ کے چچا عباسؓ جنہوں نے اسلام تو قبول کر لیا تھا بدر کے زمانے میں ہی لیکن ابھی تک مکہ میں ہی قیام پذیر تھے، انہوں نے ایک خط کے ذریعہ قریش کے تمام جنگی معاملات کے متعلق اطلاع پہنچا دی۔ انہوں نے یہ اطلاع بنو غفار کے قبیلہ کے ایک فرد کو اجرت دے کر بھجوائی تھی۔ اس روز تیرہ شوال کا دن تھا جبکہ جناب رسالت مآبؐ قبا کی مسجد میں تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے کعب بن مالکؓ کو خط پڑھنے کے لیے کہا اور پھر اس کے بعد انہیں اس خط کو خفیہ رکھنے کی ہدایت فرمائی اور مدینہ تشریف لے گئے وہاں سعد بن ربیعؓ سے ملاقات کی اور اس کے متعلق تبادلہ خیال فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک پارٹی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے بھجوائی۔ جنہوں نے اطلاع بہم پہنچائی کہ دشمن کے اونٹ اور گھوڑے مدینہ کے کھیتوں میں چر رہے ہیں۔ اس کے بعد انہیں سلمہ بن سلمہ نے اطلاع دی کہ انہوں نے ایک فوجی گروہ مدینہ کے نزدیک دیکھا ہے۔ اس کے بعد اہل مدینہ کو بھی حالات سے آگاہی ہو گئی جو اتنی بڑی فوج دیکھ کر گھبرا گئے، انہوں نے اتنی بڑی فوج عرب کی تاریخ میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ فوری طور پر مسلمانوں نے حفاظتی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں ایک گروہ فوری طور پر مسجد نبویؐ کے گرد حفاظت کے لیے متعین کر دیا گیا تاکہ وہ جناب رسالت مآبؐ کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لیں اور ایک دوسرے گروہ کو مدینہ شہر کی نگرانی کے لیے، خاص طور پر رات کے وقت چوکنا رہنے کے لیے متعین کر دیا۔

(ہ) جناب رسالت مآبؐ کا اپنے ساتھیوں سے مشورہ:

دوسری صبح یعنی شوال کی چودھویں کو جناب رسالت مآبؐ نے ایک میٹنگ بلائی جس میں تمام قبائل کے نمائندے شامل تھے حتیٰ کہ منافقوں کا بڑا عبداللہ بن اُبی بھی خزرج کے سردار کی حیثیت سے بلوایا گیا۔ تمام حقیقت بتانے کے بعد جناب رسول اللہؐ نے اپنا مقصد بیان فرمایا جو اس خواب پر مبنی تھا جو آپؐ نے رات دیکھا تھا کہ دشمنوں کو شہر کے باہر ہی رہنے دینا چاہیے اور انہیں اپنے جوش اور جذبے میں رہ کر اپنی توانائی کو ضائع کرنے دینا چاہیے۔ اور خود اس بات پر تیار رہنا چاہیے کہ جب دشمن مدینہ کو حملے کا نشانہ بنانے کی کوشش کرے تو خواتین کو اس بار اس

کے لیے تیار ہونا چاہیے کہ وہ دشمن کے شہر میں داخل کی صورت میں چھتوں سے ان پر پتھر برسائیں۔

اس مشورے پر اُبی نے فوراً لبیک کہا اور کہا اے اللہ کے رسولؐ! اہل مدینہ نے اپنے شہر کو اسی طرح سے ماضی میں بھی بچایا، جس طرح سے آپؐ نے فرمایا اور اس طرح سے کوئی بھی دشمن اہل مدینہ کو زیر کرنے پر قادر نہیں ہو سکا۔ چند مہاجروں اور انصار نے بھی اس تجویز کو سراہا لیکن چند لوگوں کا ایک گروہ کھڑا ہو گیا اور انکار کرتے ہوئے بلند آواز میں یہ دلائل دیے جو درج ذیل ہیں:

۱) انہیں اُبی کی نیت و خلوص پر شک ہے جس طرح سے اس نے جناب رسول اللہؐ کی بات کو فوری تسلیم کر لیا ہے۔

۲) ان میں سے چند نوجوانوں نے چونکہ بدر میں لڑنے کا (یعنی جہاد کا) موقع کھو دیا تھا لہٰذا انہیں بہت بے چینی تھی اور وہ باہر جا کر جنگ کرنا چاہتے تھے کیونکہ انہیں جہاد کے اجر سے خوب واقفیت تھی اور شہادت کے اجر سے بھی۔

۳) جن نوجوانوں نے بدر میں شرکت کی تھی وہ دوبارہ جناب رسول اللہؐ کے ساتھ جہاد میں شرکت کی سعادت چاہتے تھے۔

۴) ان کا یہ خیال بھی تھا کہ شہر میں بند ہو کر رہ جانے سے انہیں بزدل سمجھا جائے گا اور دشمن مزید دلیر ہو جائیں گے جب دیکھیں گے کہ مسلمان ڈر اور خوف سے شہر میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور اس طرح سے وہ مسلمانوں کے کھیت، فصلیں اور جانور لوٹ کر لے جائیں گے۔ اور وہ اس حالت میں ہوں گے کہ جب چاہیں گے کہ مسلمانوں کو پریشان اور خوفزدہ کر سکیں گے۔

گمان قوی ہے کہ ان کے ذہن میں (یعنی مسلمانوں کے) ابھی تک بدر کی فتح بھی ہو گی اور یہ بھی ان کے ذہن میں ہو گا کہ بہت کم مسلمانوں نے بہت زیادہ مشرکین کو شکست سے ہمکنار کیا تھا۔

(و) جناب رسالت مآبؐ کا فیصلہ:

جب جناب رسول اللہؐ نے یہ دیکھا کہ زیادہ تر لوگ مدینہ کے باہر جا کر لڑنا چاہتے ہیں اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح احکامات بھی نہیں ہیں تو آپؐ نے لوگوں کی خواہش کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ حالانکہ شہر کے اندر رہ کر اپنا دفاع کرنے کا طریقہ جناب رسولؐ

اللہ نے اپنی خواب سے اخذ کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا واضح حکم اس بارے میں نہ ہونے پر آپ نے اپنا فیصلہ لوگوں کے حق میں کر دیا۔ حالانکہ لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ پیغمبر کے خواب کا مرتبہ بھی بہت اعلیٰ ہوتا ہے اور اسکا کوئی مطلب ہوتا ہے اور پیغمبر کے خواب کو نظر انداز کرنا صحیح عمل نہیں تھا۔ یاد رہے کہ جب جناب ابراہیم نے اپنے لخت جگر اسمٰعیل کو جب بتایا کہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ انہیں ذبح کر رہے ہیں تو بیٹے نے عرض کیا کہ آپ اللہ کے حکم کو پورا کریں یعنی پیغمبر کے لیے اس کا خواب اس کے مالک کے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔

بہر حال جناب رسولؐ اللہ نے اس کے بعد جمعہ کی صلوٰۃ پڑھائی جس میں آپؐ نے اپنے خطاب میں اس بات پر زور دیا کہ وہ جہاد میں استقامت اور صبر کو کسی بھی حالت میں نہ چھوڑیں اور اب جنگ کے لیے اپنی تیاری مکمل کر لیں۔ اس کے بعد آپؐ نے نماز عصر پڑھائی اور اپنے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ آپؐ کے ساتھ آپ کے رفیق اول و دوئم جناب ابوبکرؓ اور جناب عمرؓ بھی تھے۔ آپ نے لباس جنگ زیب تن فرمایا اور دو زرہ بکتر پہنے اور تلوار ہاتھ میں تھامے باہر تشریف لے آئے۔ انہیں بیشک اس امر کا وجدان تھا کہ اب جنگ میں شدید مشقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اسی دوران لوگوں نے سوچا اور انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ انہوں نے شہر کے باہر جا کر لڑنے پر اصرار کیوں کیا جبکہ جناب رسولؐ اللہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ ان میں سے کچھ دوسروں کو کہہ رہے تھے کہ وہ اب بھی جناب رسولؐ اللہ کی خواہش کے مطابق حکم بجا لائیں کیونکہ ان کے پاس ابھی وقت ہے۔ اس لیے جب انہوں نے جناب رسولؐ اللہ کو دیکھا تو آپؐ کے سامنے اپنی تابعداری کا اظہار کیا اور کہا کہ ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ وہ آپ کی حکم عدولی کریں بلکہ ہم اب بھی آپؐ کی مرضی کے مطابق کرنے کو تیار ہیں۔

جناب رسالت مآبؐ نے جواب دیا کہ یہ پیغمبر کے لیے موزوں نہیں کہ وہ میدان جنگ سے پیچھے رہ جائے جبکہ اس نے زرہ بکتر پہن لیا ہو، اس وقت تک جب کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور دشمن کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کر دے۔

(ز) جناب رسولؐ اللہ کا اپنے سپاہ کا معائنہ کرنا اور آگے بڑھنا:

آپؐ کے پاس ایک ہزار رضا کار جمع ہو گئے جن میں سے صرف ایک صد زرہ بکتر والے اور پچاس کے پاس گھوڑے تھے۔ جناب رسالت مآبؐ نے اس فوج کو تین حصوں میں تقسیم فرمایا

یعنی ایک حصہ مہاجرین کا مصعب بن عمیر کی زیر قیادت، دوسرا حصہ انصار میں اوس کا جو اسید بن حضیر کے زیر قیادت اور تیسرا حصہ انصار کے خزرج کا جو حباب بن منذر کی زیر قیادت رکھا۔

اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ میدان جنگ کی طرف رواں دواں ہوئے یعنی بروز جمعہ بعد صلوٰۃ العصر ۱۴ شوال تین ہجری۔ آپؐ نے مدینہ میں اپنا جانشین جناب امّ مکتومؓ کو مقرر فرمایا۔ آپؐ نے راستے میں وداع کے مقام پر ایک چھوٹا سا یہودی دستہ دیکھا جو عبداللہ بن ابی کے حلیف تھے اور آپؐ کی فوج کے ساتھ ہونے کو آئے تھے لیکن آپؐ نے ان کی خدمات قبول نہ کیں۔

جناب رسولؐ اللہ مدینہ اور احد کے درمیان ایک جگہ ''شیخان'' پر رکے اور اپنی سپاہ کا معائنہ فرمایا اور دوران معائنہ چند معذور اور کم عمر لڑکوں کو جنگ سے روک دیا۔ ان کم عمر میں دو مشہور زمانہ مستقبل کے مجاہد اسامہ بن زیدؓ اور عبداللہ بن عمرؓ تھے اور دوسرے دو رافع بن خدیج اور سمرہ بن جندب جناب رسالت مآبؐ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ انہیں لڑنے کا فن آتا ہے اور وہ لڑنے کے قابل ہیں لہٰذا انہیں دستے میں شامل کر لیا گیا۔ فوج نے اس جگہ رات بھر قیام کیا اور وہاں پر مغرب اور عشاء کی صلوٰۃ پڑھیں۔ دوران شب پچاس جوانوں کو پہرے پر مقرر کیا گیا اور ایک ذکوان بن عبد قیس کو جناب رسالت مآبؐ کی حفاظت پر مقرر کیا۔

(ح) عبداللہ بن اُبَی کا کردار:

پندرھویں شوال کی صبح جناب رسولؐ اللہ آگے بڑھے اور راستے میں صبح کی صلوٰۃ ادا کی اشواط کے مقام پر جہاں سے دشمن کی فوج نظر آ رہی تھی۔ یہی وہ موقع تھا جو عبداللہ نے موزوں سمجھا اپنی منافقت کا اظہار کرنے کے لیے۔ لہٰذا اس نے کہا کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے آدمی قتل ہوں اور اس نے اس بات کی ناراضی کا بھی اظہار کیا کہ رسولؐ اللہ نے اس کے مشورے کا خیال نہیں رکھا۔ یہ بہانہ بنا کر اس نے اپنے تین صد آدمی فوج سے علیحدہ کر لیے۔ اس کی یہ باغیانہ حرکت اس نازک موقع پر صرف مسلمانوں کو کمزور کرنے اور اپنے غصے کو تسکین دینے کے لیے تھی۔ یہی نہیں بلکہ کچھ مسلمان بھی اس حرکت سے وقتی طور پر متاثر ہوئے، وہ قبیلہ اوس کے بنو حارثہ اور خزرج کے بنو سلمہ تھے جو ان سے جا ملنا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں منافقوں کے ساتھی بننے سے بچا لیا اور وہ اپنے ارادے سے باز آ گئے۔ ان لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ نے انہیں بچا لیا، اس بارے میں سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۲۲)

میں فرمایا گیا کہ ''جب تم میں سے دو گروہ اپنا دل چھوڑنے والے تھے لیکن اللہ ان کا ولی تھا یعنی ان کو بچانے والا تھا اور اللہ پر ہی ایمان والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے''۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ عبداللہ بن حرم کی نصیحت کے بعد سمجھ گئے تھے جنہوں نے عبداللہ بن ابی کے ساتھیوں کو سمجھایا تھا کہ وہ اس موقع پر لشکر اسلام سے علیحدہ نہ ہوں اور نفاق پیدا نہ کریں لیکن ابی اور اس کے ساتھیوں نے کچھ نہ سنا۔ اس پر عبداللہ بن حرم نے انہیں لعنت ملامت کی ان کے اس رویے پر۔ منافقت کے اس کردار کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۶۷) میں بیان فرمایا کہ: ''اور یہ کہ وہ (اللہ) ہوسکتا ہے کہ منافقوں کا امتحان لے رہا ہو، یہ ان سے کہا گیا کہ آؤ! اور لڑو اللہ کی راہ میں یا (کم از کم) اپنا دفاع ہی کرلو۔ انہوں نے کہا اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ لڑائی ہوگی تو ہم ضرور تمہاری اطاعت کرتے (یعنی جناب رسولؐ اللہ کی) لیکن وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے نزدیک تھے جبکہ جو کچھ وہ اپنے منہ سے کہہ رہے تھے وہ ان کے دلوں کی آواز نہ تھی اور اللہ کو تمام علم ہے اس بات کا جو انہوں نے چھپائی ہے''۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابی نے جناب رسالت مآبؐ کی حکم عدولی کی اور آپؐ کے فیصلے سے ہٹ گیا اور اس طرح سے اس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کے پیغمبرؐ کے حکم کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیغمبرؐ کی حکم عدولی کسی طور بھی قبول نہیں۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا واضح حکم سورۃ النساء (۴) کی آیت (۶۵) میں ہے کہ ''لیکن نہیں! تمہارے رب کی قسم ان کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا جب تک وہ تمہیں (اے محمدؐ) اپنے معاملات کا فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور اپنے دل میں آپ کے فیصلے کے متعلق کسی قسم کی تنگی نہ رکھیں اور آپؐ کے فیصلے کو پوری تابعداری اور خلوص کے ساتھ قبول نہ کرلیں''۔

(ط) منافقین اور ایمان والوں کی پہچان:

امام ابن کثیرؒ نے عوف البکالیؒ کے حوالے سے ان لوگوں (منافقین) کے بارے میں لکھا جنہوں نے دین کو فائدے کا ذریعہ بنایا کہ ''ان کی زبانیں شہد سے بھی زیادہ میٹھی ہیں لیکن ان کے دل صبر سے بھی زیادہ کڑوے ہیں اور وہ اپنی مکاری کا اظہار بھیڑیوں کی مانند کرتے ہیں''۔

قرآن حکیم میں منافقوں کے بارے میں چند آیات درج ذیل ہیں: ''سورۃ بقرہ (۲) کی

آیت (۲۰۴) میں فرمایا گیا ہے کہ ''اور انسانوں میں سے ایسے لوگ جن کی باتیں تمہیں اچھی لگیں (اے محمدؐ) اس زندگی میں اور وہ اللہ کو گواہ بنائے اس بات کے لیے جو اس کے دل میں ہے لیکن پھر بھی وہ بہت زیادہ جھگڑالو ہے اپنے مخالفوں سے (یعنی آپؐ اور مسلمانوں سے)''۔

اس آیت مبارکہ کا مطلب ہے کہ ایسے اشخاص اپنے آپ کو مسلمان تو کہلاتے ہیں لیکن وہ لوگ اللہ کے حکم کو جھٹلاتے ہیں یعنی انکار کرتے ہیں اور یہی ان کی منافقت اور کفر کی نشانی ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔

اسی طرح سورۃ النساء (۴) کی آیت (۱۰۸) میں فرمایا گیا ہے کہ ''بے شک وہ اپنے جرائم اپنے ساتھیوں سے چھپا لیں لیکن وہ انہیں اللہ سے نہیں چھپا سکتے''۔ اس سے پہلی آیت یعنی سورۃ بقرہ کی (۲۰۴) کے متعلق ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب ایسے لوگ یعنی منافق اپنے ایمان کا اعلان کرتے تھے تو وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے کہ جو کچھ ان کے دل میں ہے وہی کچھ وہ اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں۔

سورۃ بقرۃ (۲) کی آیت (۲۰۵) میں کہا گیا ہے کہ ''اور جب وہ تمہارے پاس سے چلا جاتا ہے (اے محمدؐ) تو وہ پھر زمین میں شرارتیں کرتا ہے اور فصلوں اور جانوروں کو پامال کرتا ہے اور اللہ پسند نہیں فرماتا شرارتوں کو''۔

امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے لکھا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں (۱) جب وہ بولتا ہے جھوٹ بولتا ہے (۲) جب بھی وہ وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا نہیں کرتا اور (۳) جب بھی اختلاف ہوتا ہے تو بہت جھگڑالو ہو جاتا ہے۔

مختصراً یہ کہ منافق ناقابل اعتبار اور زبان سے پھرنے والا، برے کام کرنے والا، اپنے عقیدے میں مکاری رکھنے والا، اپنے الفاظ کی ہیرا پھیری کرنے والا، غیر اخلاقی کام کرنے والا اور بہت زیادہ جھگڑنے والا ہوتا ہے اور یہی منافق کی نشانیاں ہیں۔

سورۃ بقرہ کی آیت (۲۰۶) میں کہا گیا ہے کہ ''جب یہ اس (منافق) سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو وہ تکبر سے جرم کی طرف زیادہ مائل ہو جاتا ہے پس اس کے لیے جہنم کافی ہے اور وہ جگہ بدترین ہے آرام کرنے کے لیے''۔

سورۃ النساء (۴) کی آیت (۱۴۲) میں فرمایا گیا ہے کہ ''بے شک! منافق اللہ تعالیٰ کو

دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ (اللہ) ہے جو انھیں دھوکہ دیتا ہے۔ اور جب وہ صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کھڑے ہوتے ہیں کاہلی اور سستی کے ساتھ لوگوں کے دکھاوے کے لیے، لیکن وہ اللہ کو یاد نہیں کرتے بجز معمولی طور پر"۔

سورۃ النساء کی آیت (۱۴۵) میں فرمایا گیا ہے کہ "بے شک منافق ہوں گے آگ کی سب سے نچلی سطح پر اور تمہیں ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ملے گا"۔

سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۶۸) میں کہا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے منافقوں سے وعدہ کیا ہے کہ خواہ عورتیں ہوں یا مرد اور کافروں سے بھی، جہنم کی آگ کا اور وہ وہیں رہیں گے، وہ انھیں بھسم کر دے گی۔ اللہ نے ان پر لعنت بھیجی اور ان کے لیے نہ ختم ہونے والا عذاب"۔

سورۃ الفتح (۴۸) کی آیت (۶) میں فرمایا گیا ہے کہ "وہ (اللہ) منافقین (مرد اور عورتوں) کو سزا دے گا اور کفار (مرد اور عورتوں) کو بھی، جو اللہ سبحانہٗ کے متعلق برے خیالات سوچتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے اور اللہ کا غضب ان پر ہے اور اس نے ان پر لعنت بھیجی اور ان کے لیے دوزخ تیار کی، اور بے شک وہ بدترین ٹھکانہ ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب منافقین کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اقوال پر قائم رہیں اور برے کاموں سے پرہیز کریں اور اللہ سے ڈرتے رہیں تو وہ غصے کا اور زیادہ اظہار کرتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور جس شخص میں خوف رب العالمین نہیں ہے، وہ اس کا نافرمان ہونے سے دریغ نہیں کرتا اور پھر اس کے لیے جہنم واجب ہو جاتی ہے۔

اور برخلاف منافقین کے وہ جو اللہ کے فرماں بردار غلام ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی تعریف فرماتے ہیں، انھیں پسند فرماتے ہیں اور انھیں اپنی خوشی اور مہربانی کے حوالے سے انعام و اکرام عطا فرماتے ہیں۔ وہ لوگ اپنی جانوں کو، اپنے آرام کو، اپنی خوشیوں کو، اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر قربان کر دیتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۲۰۷) میں فرمایا کہ "اور انسانوں میں سے وہ ہے جس نے اپنی جان کو بیچا اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک مہربانی سے لبریز ہے اپنے غلاموں کے لیے"۔

درحقیقت یہ آیت مبارک خاص طور پر جناب صہیب الرومیؓ کے لیے نازل ہوئی تھی، ان کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور سعادت مندی کے سلسلے میں۔ کیونکہ جب وہ مدینہ ہجرت کرنے لگے

تو قریش نے انھیں ان کی دولت میں سے کچھ بھی لے جانے سے منع کر دیا اور کہا تم صرف اکیلے ہی یہاں سے جا سکتے ہو یہ مال و دولت ہم تمہارے ساتھ نہیں لے جانے دیں گے۔ تو آپ نے وہ دولت اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر چھوڑ دی اور خود بھی مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ آیت مبارک ان کے لیے خاص نازل تو ہوئی لیکن ہر اس مومن کے لیے موزوں ہے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال قربان کرتا ہے اور یہی عمل مومنوں کی پہچان ہے اور یہی اللہ سے حقیقی محبت ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کی محبت کا جواب انتہائی محبت سے ہی دیتا ہے۔

سورۃ النساء (۴) کی آیت (۶۹) میں کہا گیا ہے کہ "جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے پھر وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل و کرم فرمایا ہوگا خاص طور پر یعنی پیغمبروں میں سے، صدیقین میں سے اور سچے ہوئے لوگ اللہ کی محبت رکھنے والے شہداء سچے راستے پر قائم رہنے والے سب ایک ساتھ ہوں گے اور کتنے اچھے اور عمدہ ہیں یہ ساتھی"۔

(ی) مسلمان فوج کو احد میں متعین کرنا:

جناب رسالت مآبؐ احد کے مقام پر پہنچ کر احد کے دامن میں مقیم ہو گئے قریش کے بالمقابل اور آپؐ کے ساتھ سات صد جانباز تھے۔ یہ پندرہ شوال کی صبح تھی کہ جناب رسولؐ اللہ نے زرہ بکتر زیب تن فرمایا اور اپنے جانثاروں سے خطاب کیا اور انھیں جنگی چالوں کے متعلق سمجھایا اور فرمایا کہ عام طور پر جنگ کا طریقہ کار وہی ہوگا جو بدر میں اپنایا گیا تھا۔ وہ یہ کہ سپاہی جہاں بھی رہیں گے اسی ترتیب سے یعنی گروہی شکل بنا کے یا مستطیل یا دائرے کی صورت میں دشمن کے سامنے ہوں گے اور اپنی قطاروں کو محفوظ رکھیں گے تاکہ ان کے اندر کوئی داخل نہ ہونے پائے۔ پھر آپؐ نے خاص طور پر جو ہدایت بخشی وہ یہ تھی کہ آپؐ نے اشارہ کر کے جنوب کی طرف جو پہاڑی درہ تھا اس کے متعلق تلقین فرمائی کہ دشمن وہاں سے حملہ آور ہو سکتا ہے اس کے لیے آپ نے پچاس تیر انداز منتخب فرما کے وہاں متعین کر دیے اور اس کی سالاری عبداللہ بن جبیر کے ذمہ لگائی۔ اللہ کے رسولؐ نے ان لوگوں کو خاص طور پر تاکید فرمائی کہ وہ وہاں پر بہت استقلال اور پابندی کے ساتھ رہیں اور کسی صورت بھی وہاں سے دشمن کو گزرنے کی اجازت نہ دیں۔ اور نہ ہی وہ کسی صورت اس جگہ کو چھوڑیں۔ اور ان کو بقیہ فوج کی فکر نہ ہونی چاہیے جب تک کہ انھیں جناب رسولؐ اللہ کی طرف سے کوئی حکم نہ مل جائے۔

امام بخاریؒ نے وہ اصل الفاظ لکھے ہیں جو جناب رسالت مآبؐ نے فرمائے۔ آپؐ نے فرمایا "کہ اگر تم دیکھو کہ ہمیں ٹکڑے ٹکڑے، اور پرندے ہمیں نوچ رہے ہیں تو پھر بھی تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا، جب تک کہ میں تم سے نہ کہہ دوں۔ اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور ہم ان کی لاشوں کے اوپر چل رہے ہیں، پھر بھی تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا جب تک کہ میں تم سے نہ کہہ دوں"۔

پھر جناب رسالت مآبؐ نے فوج کے دوسرے جوانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے خصوصی ہدایات دیں۔ ایک دستے کو دائیں طرف جناب منذرؓ بن عمرو کی قیادت میں اور دوسرے کو بائیں طرف جناب زبیرؓ بن عوام کی سرکردگی میں مقرر فرمایا۔ اور پھر سپاہ کو حکم دیا کہ وہ قطاروں میں کوئی جگہ خالی نہ رکھیں۔ سب تیاری کے بعد فرمایا کہ اب تمام لوگ لڑائی کے شروع ہونے کے حکم کا انتظار کریں۔

(ک) شمشیر اعزازی:

جب رسالت مآبؐ نے اپنی فوج کی صفوں کو ترتیب دے دی اور جنگ کے متعلق تمام ضروری ہدایات دے دیں تو اس کے بعد آپؐ نے اپنی شمشیر بے نیام فرمائی اور اسے لہرا کر فرمایا کہ وہ کون ہے جو اس تلوار کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کا حق ادا کرنے کے لیے، جس کی کہ یہ مستحق ہے۔ بہت سے صحابہ کرامؓ نے اپنے شوق کا اظہار کیا جن میں عمرؓ علیؓ، زبیر بن عوامؓ (آپؐ کے پھوپھی زاد) جیسے معتبر حضرات شامل تھے لیکن جناب رسالت مآبؐ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ ان کے بعد ایک اور جانثار جناب رسولؐ اللہ کا دیوانہ ابو دجانہؓ سامنے آیا اور پوچھا کہ حضورؐ اس کا کیا حق ہے؟ جس پر جناب رسولؐ اللہ نے جواب دیا کہ یہ تلوار اس وقت تک حرکت میں رہے، جب تک کہ ٹیڑھی نہ ہو جائے۔ جناب ابو دجانہؓ اس حق کے ادا کرنے کا وعدہ کر کے اس انعام یعنی اعزازی تلوار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ پہلا جنگی اعزاز تھا جو کسی مسلمان سپاہی کو حاصل ہوا اور وہ بھی جناب رسالت مآبؐ کی شمشیر اور وہ بھی آپؐ ہی کے دست مبارک سے۔ بے شک یہ بہت بڑا انعام اور اعلیٰ ترین اعزاز تھا جو کہ دیوانہ رسولؐ نے حاصل کیا۔

یہ اعزاز حاصل کرنے کے بعد جناب ابو دجانہؓ کا انداز ہی بدل گیا، تلوار ہاتھ میں لیتے ہی وہ اکڑ گئے اور انہوں نے ایک سرخ فیتہ لے کر اپنے ماتھے کے گرد باندھ لیا۔ بظاہر یہ معلوم ہو رہا

تھا کہ انہوں نے تلوار حاصل کرنے کے فخر کو اجاگر کیا اور اپنی جانثاری کے اظہار کے لیے سرخ پٹی ماتھے کے گرد باندھ لی۔ پھر وہ اعزازی تلوار تھامے ہوئے اپنی بے نیازی، شان و شوکت، وقار، غرور اور خوشی کا نمایاں اظہار کرتے ہوئے اکڑتے ہوئے قدم بڑھا کر اپنی قطار میں مل گئے۔ ان کے اس انداز کو دیکھ کر جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسی پر غرور چال کو پسند نہیں فرماتے، سوائے اس کے یعنی جس چال کا جناب ابو دجانہؓ نے مظاہرہ کیا۔ مطلب یہ کہ یہ چال اور یہ انداز صرف دشمن کے سامنے اور اس کے اظہار کے لیے ہی جائز ہے، ورنہ عام زندگی میں اس کی اجازت نہیں، اسی لیے یہی انداز فوج میں اپنایا گیا ہے اور صرف انہی کے لیے یہ جائز بھی ہے۔

(ل) قریش فوجیوں کی حالت:

قریش کے سپہ سالار اعظم ابوسفیان نے بھی اپنے سپاہ کو تیار کیا، دائیں ہاتھ کے رسالے کی سالاری خالد بن ولید کو دی اور بائیں ہاتھ کے رسالے کی سالاری عکرمہ بن ابوجہل کو دی۔ جبکہ پیدل فوج کا سالار صفوان بن امیہ اور تیر اندازوں کا سالار عبداللہ بن ابی ربیعہ کو بنایا۔ پھر چیف سالار نے اپنی فوج کو جوش دلایا اور مرتے دم تک لڑنے کے لیے حکم دیا۔

جنگ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ابوسفیان نے مسلمانوں میں نا امیدی اور نا اتفاقی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی اور مسلمان فوج میں سے قبل انصار کو کہا کہ اگر وہ چاہیں تو اب بھی میدان سے چلے جائیں اور مہاجرین کو میدان میں چھوڑ دیں کہ وہی اپنے رشتہ داروں سے لڑیں۔ قریش کو خواہش نہیں کہ وہ انصار کے ساتھ لڑائی کریں۔ انصار چونکہ سچے مسلمان تھے اس لیے انہوں نے ابوسفیان کو نا امید کر دیا۔

(م) قریش کی خواتین کا کردار:

قریش کے سردار کی بیوی ہند عورتوں کے ٹولے کی سردار تھی۔ عورتیں ڈھول یعنی دفوں کی تال پر گانوں کے ذریعے اپنے مردوں کو لڑنے کے لیے اکسا رہی تھیں اور ان کے جذبات ابھار رہی تھیں۔ ہند کے علاوہ ایک اور بڑی اہم عورت تھی اُمراہ علقمہ، خوبصورت، دراز قد اور پرکشش، جس نے بہت خاص اور اہم کردار ادا کیا، جس وقت قریش کو پہلے مرحلے میں مسلمانوں نے شکست دی اور جب قریش میدان جنگ سے بھاگ رہے تھے اور ان کا پرچم زمین پر پڑا ہوا تھا تو اس خاتون نے وہ پرچم اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی فوج کو پکارا اور انہیں شرم

دلانے میں کامیاب ہوگئی اور اس کے بعد جنگ کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔

(ن) دونوں افواج حرکت میں آگئیں:

جنگ شروع کرنے کے لیے قریش کے ایک بہت ہی بہادر شخص طلحہ بن ابی طلحہ نے اپنے مد مقابل کے لیے للکار لگائی۔ جسے جناب زبیر بن عوامؓ نے قبول کرتے ہوئے اس پر وار کیا اور وہ راہ عدم کو سدھار گیا۔ جناب رسولؐ اور آپ کے ساتھیوں نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور پھر اس کے بعد آپؐ نے زبیرؓ کی تعریف میں فرمایا کہ "ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور زبیرؓ میرا" ہے یعنی نبیؐ کا خاص الخاص شاگرد۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھا گیا ہے کہ زبیرؓ سیدہ صفیہؓ اور عوام کے بیٹے تھے۔ صفیہ جناب رسالت مآبؐ کی پھوپھی اور بہت بہادر خاتون تھیں اور عوامؓ سیدہ خدیجہؓ کے بھائی تھے اور زبیرؓ سیدہ اسماءؓ بنت ابوبکرؓ کے شوہر تھے، اس طرح سے ان کا رشتہ جناب رسالت مآبؐ سے بہت خاص محبت کا درجہ رکھتا تھا۔

اس کے بعد طلحہ کا بھائی عثمان آیا اور اپنے مد مقابل کے لیے پکار لگائی جسے جناب شیر خدا و شیر رسولؐ جناب حمزہؓ نے قبول فرمایا اور اسے راہ عدم پہنچایا۔ اس پر جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور قریش نے غصے میں آ کر بھرپور حملہ کر دیا اور ان کی عورتیں انہیں بھڑکانے کے لیے اکسانے لگیں۔

دوسری طرف اللہ کے غلام اور جناب رسولؐ اللہ کے جانثار بھی اپنی جانثاری کے لیے بڑھے ان میں سب سے آگے تھے سیف اللہ و اسد اللہ جناب حمزہؓ بن عبدالمطلب اور علیؓ بن ابی طالب اسد اللہ اور جناب صاحب سیف رسولؐ اللہ ابو دجانہؓ اپنی سرخ پٹی کی انفرادیت کے ساتھ۔ انہوں نے اپنی بہادری کے کارنامے دکھائے، جو کوئی بھی ان کے سامنے آیا اٹھ نہ پایا۔

دوسرا سرفروشوں کا گروہ جو جناب ابوبکرؓ، عمرؓ، مصعب بن عمیرؓ، طلحہ بن عبیداللہؓ، عبداللہ بن جحشؓ، سعد بن ربیعؓ، انس بن نضرؓ وغیرہ پر مشتمل تھا جو جناب رسولؐ اللہ کے ارد گرد تھا۔ جب ان مسلمان جانثاروں نے میدان جنگ میں اپنے حربی جوہر دکھائے تو دشمن تتر بتر ہو گئے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔

(س) شہادت حمزہؓ:

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ ناممکن معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی شخص جناب حمزہ کے سامنے آ کر ٹھہر سکے۔ دشمن یہ سمجھ گیا کہ مقابلہ کر کے انہیں زیر نہیں کیا جا سکتا، اور وہ ان سے بدر کا بدلہ

لینا ضروری سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک حبشی غلام جو نیزہ پھینکنے میں ماہر تھا خاص طور پر جناب حمزہؓ پر دور سے وار کرنے کے لیے رکھا تھا اور اسے اس کام کے بدلے پروانہ آزادی کا عندیہ دیا گیا تھا۔ لہٰذا اسنے دور سے اپنا نیزہ پھینکا جو ٹھیک نشانے پر لگا، بے شک یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی تھی اور اللہ تعالیٰ جناب حمزہؓ کو شہادت کے مرتبہ پر فائز کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپؓ نے اپنی بے مثال بہادری کے جوہر کا مظاہرہ کر کے جام شہادت نوش جان کیا۔ اور اپنی جان جان اللہ کی راہ پر قربان کر دی اور اپنے مالک کو راضی کر لیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہوا اور آپؓ ایک بے مثال ہیرو کی مانند عزت اور آبرو کے ساتھ اپنے مالک کی جانب رواں دواں ہوئے۔

وہ اپنے بھتیجے جناب رسول اللہؐ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور ان کے تابعدار تھے، اس کے علاوہ آپ اللہ کے نہایت تابعدار بندے تھے، جناب رسول اللہ کو ان سے بے مثال محبت تھی۔ بہرحال میدان جنگ میں مسلمانوں کے لیے یہ بڑا نقصان تھا جس پر انہوں نے جلد ہی قابو پا لیا۔

دوسری طرف دشمن خاص طور پر ابوسفیان اور اس کی بیوی ہند بہت خوش ہوئے۔ ہند نے اپنا وعدہ جو اس نے وحشی سے کیا تھا، فوری طور پر میدان جنگ میں ہی پورا کیا۔ اس نے اسی وقت اپنے زیورات اسے انعام میں دے دیے اور اس کی آزادی کا اعلان کیا۔

(ع) قریش کی شکست:

جناب حمزہ کی شہادت کے باوجود قریش اتنے زیادہ پریشان تھے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے کیونکہ میدان میں ہر مسلمان بہادری سے دشمن پر وار کر کے اس کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کفار اتنے زیادہ بوکھلا گئے کہ ان کا تمام نظم و نسق ختم ہو گیا حتیٰ کہ ان کا جھنڈا اٹھانے والا کوئی نہ رہا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان کے دس علمبردار یکے بعد دیگرے قتل ہوئے اور اب گیارھواں جھنڈا سنبھالنے والا ایک غلام تھا جس کا نام صواب تھا۔ کیونکہ علمبردار ہمیشہ معزز ترین لشکر میں سے ہوتا تھا، اس لیے یہ بات بھی ان کے لیے شرمناک تھی۔ لیکن جلد ہی صواب بھی مارا گیا اور اب ان کا جھنڈا بے یار و مددگار میدان میں پڑا ہوا تھا اور سپاہ قریش نے میدان سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ وہ اپنا پرچم اپنی عورتیں اور اپنے بت جو وہ اپنی مدد کے لیے ساتھ لائے تھے وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اس بے قراری اور اضطراب کے عالم میں قریش کی ایک خاتون جس نے بے شک اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور زمین پر پڑا ہوا پرچم اٹھایا اور بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو للکارا لیکن بھاگنے والوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

دوسری طرف مسلمانوں کا وہ دستہ جو پہاڑی درے پر تعینات تھا، وہ پوری امت مسلمہ کے لیے ایک معصیت کا سبب بن گیا۔ انہوں نے جناب رسول اللہ کی خاص ہدایت کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ دی اور اپنے سالار کے کہنے پر بھی نہ رکے۔ اس طرح سے انہوں نے اپنے فرض سے غفلت برتی، اللہ کے حکم کی نافرمانی کی، اپنے چیف کمانڈر اور رسول اللہ کی نافرمانی کی اور اپنے مقامی کمانڈر عبداللہ جبیرؓ کی بھی نافرمانی کی۔ انہوں نے میدان جنگ کے اصولوں کو توڑا اور ایک بہت بڑی معصیت کا باعث بنے، انہوں نے اپنی بے صبری کا مظاہرہ کیا، اپنی بدنظمی کا مظاہرہ کیا اور لالچ کا شکار ہو گئے اور میدان جنگ میں دشمن کا سامان لوٹنے کی غرض سے چلے گئے، ماسوا چند ایک کے۔ بے شک اس کے ذمہ دار وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے میدان جنگ میں دشمن کے فرار پر ان کا بچا کھچا سامان لوٹنا شروع کر دیا تھا۔

(ف) تیر اندازوں کی نافرمانی:

قریش کے ایک رسالے کے کمانڈر خالد بن ولید نے اس درے سے تین دفعہ داخل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن جو تیر انداز وہاں معمور تھے انہوں نے اسے روکے رکھا۔ لیکن جیسے ہی ان تیر اندازوں نے جناب رسول اللہؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی جگہ کو چھوڑا، خالد درہ پار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ پچھلے پیرے میں بتایا جا چکا ہے کہ ان پچاس میں سے چالیس تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور صرف دس باقی رہ گئے تھے۔ اس طرح سے جگہ چھوڑنے والے تیر اندازوں نے مسلمان فوج کی کمر توڑ دی اور مسلمانوں کی فتح کو شکست میں تبدیل کرا دیا۔ کیونکہ وہ دس حضرات خالد کے رسالے کو روکنے میں ناکام ہو گئے اور آخر کار خالد نے مسلمانوں کی پشت سے بھرپور حملہ کر دیا اس کے تیر اندازوں کا مقابلہ کرنا تو درکنار، ان کے تیروں کو روکنا نا ممکن ہو گیا۔

(ص) مسلمانوں کی فتح، شکست میں تبدیل ہو گئی:

خالد بن ولید جو بعد میں ایک مشہور مسلمان جرنیل کی حیثیت سے مشہور ہوا، اس وقت اس

نے بہت ہوشیاری کے ساتھ اپنا کام دکھایا اور جنگ کی پوری صورتحال کا جائزہ لیا اور جب دیکھا کہ مسلمانوں کی صف بندی ٹوٹ چکی ہے اور وہ مال غنیمت کو اکٹھا کرنے میں لگ گئے ہیں اور پہاڑی درہ خالی ہو چکا ہے تو اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے مسلمان فوج پر ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ ادھر امراہ علقمہ نے اپنا کام دکھایا اور بھاگتی ہوئی فوج کو واپس آنے اور لوٹنے پر اکساتی رہی۔ بھگوڑے دشمن نے جب میدان جنگ کا نقشہ پلٹا ہوا دیکھا تو انہوں نے دوبارہ میدان میں آنے کی جرأت کی۔

دشمن کی دوبارہ صف بندی اور اپنی بکھری ہوئی حالت کو دیکھ کر مسلمانوں کو کچھ ہوش آیا اور انہوں نے سنبھلنے کی پھر سے کوشش کی لیکن وقت گزر چکا تھا۔ اس وقت ان کی کوشش بے سود ثابت ہوئی اور پھر وہ اپنی صف بندی نہ کر سکے اور بھگدڑ کی حالت میں بے ڈھنگی لڑائی لڑتے رہے۔ لہٰذا نتیجے کے طور پر مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی اور دشمنوں نے مسلمان فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ اس طرح سے مسلمانوں نے مال غنیمت کے لالچ میں آ کر اپنے کمانڈروں کی حکم عدولی کی اور سب سے بڑھ کر اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی کر کے خود اپنی بدبختی کو دعوت دی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی بے صبری، لالچ، حکم عدولی، جنگی حکمت عملی کی ناسمجھی، آداب جنگ سے لاپروائی، اور اس کے متعلق قوائد وقوانین سے منہ موڑنے کا مظاہرہ کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ایک مثال قائم کر کے نشان عبرت چھوڑا۔

(ق) جناب رسالت مآبؐ کی رحلت کی افواہ:

اس موقع پر خاص طور پر جبکہ دشمن نے دھاوا بول دیا تو جانثاروں کی ایک چھوٹی سی جماعت نے جناب رسالت مآبؐ کو اپنے گھیرے میں لے لیا جن میں سے ایک جناب مصعب بن عمیرؓ ایک تیر کی زد میں آئے اور جان جاناں اپنے مالک کے حوالے کر دی۔ دشمن نے غلطی سے یا جان بوجھ کر یہ اعلان کر دیا کہ انہوں نے جناب رسول اللہؐ کو شہید کر دیا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی دشمنوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ان کا مقصد بر آیا اور اس کی وجہ سے ان میں لڑنے کی قوت، جوش اور جذبے میں بھی اضافہ ہو گیا۔

اس کے برعکس مسلمان یہ خبر سن کر پژمردہ ہو گئے، انہوں نے ہمت ہار دی اور ان کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور وہ لڑنے سے زیادہ حواس باختہ ہو گئے کہ اس عالم میں انہوں نے خود اپنے ہی

ساتھی حسیل بن جابر کو قتل کر دیا۔

قریش نے حالات کا پھر سے جائزہ لیا اور اس جگہ کو گھیرے میں لے لیا جہاں انھیں پتا چلا کہ جناب رسالت مآبؐ کا خیمہ تھا وہ جناب رسالت مآبؐ کے متعلق خبر کی تصدیق بھی کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت جناب رسالت مآبؐ کے گرد بارہ جانثار موجود تھے، ان بارہ میں چار نے جناب رسولؐ اللہ کو بالکل اپنے حصار میں رکھا ہوا تھا اور چاروں طرف سے آپؐ کو محفوظ کیا ہوا تھا۔ یہ چار حضرات تھے جناب عمرؓ، جناب علیؓ، جناب ابو دجانہؓ اور جناب انس بن نضرؓ۔ دیگر آٹھ افراد نے آپ کے گرد دوسرا حلقہ بنایا ہوا تھا اور دشمن سے مصروف جنگ تھے۔ ان آٹھ میں چار بہت مشہور صحابہ شامل تھے وہ تھے جناب ابوبکر صدیقؓ، طلحہ بن عبیداللہؓ، زبیر بن عوامؓ، اور حارث بن سمہ۔ یہ تمام جانثار بغیر زرہ بکتر کے تھے اور ایک صد سے زیادہ دشمنوں سے بیک وقت مقابلہ کر رہے تھے۔ بے شک انہوں نے اپنی بہادری کا بے مثال مظاہرہ کیا ہر ایک جانثار بیک وقت کم از کم دس تلواروں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی کہیں ملتی ہو۔

اس موقع پر جناب کعب بن مالک نے جناب رسولؐ اللہ کا چہرہ انور دیکھ لیا اور پکار کر بتایا کہ جناب رسالت مآبؐ حیات ہیں۔ اس خبر نے مسلمانوں کو دوبارہ زندگی بخشی اور ان کی روح پھر سے تازہ ہو گئی، ان کی ناامیدی اُمید میں بدل گئی ان کی ناتوانی کی جگہ توانائی نے لے لی اور پھر ان کا دشمن سے لڑنے کا انداز ہی بدل گیا۔

لیکن اس وقت جناب رسولؐ اللہ زخمی حالت میں تھے اور یہ زخم آپ کو ان پتھروں سے آئے تھے جو آپؐ پر عتبہ بن ابی وقاص، عبداللہ بن شہاب اور ابن قمیہ نے اپنی بدبختی کے جوش میں پھینکے تھے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو پسند نہ آیا مسلمانوں کا اس کی رحمتوں سے ناامید ہونا، جناب رسالت مآبؐ کے وصال کی خبر سن کر۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے اور یہی چاہتے ہیں کہ اس کے غلام صرف اسی کی خاطر لڑیں اور اسی کی خاطر اپنی جان، مال اور سب کچھ قربان کر دیں، نہ کہ کسی بھی اور کے لیے اور یہی سبق تو جناب رسولؐ اللہ نے انھیں پڑھایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ عمل کہ انہوں نے میدان میں حوصلہ چھوڑ دیا ہرگز پسند نہ آیا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو وارننگ دی اور اس موقع پر سورۂ آل عمران کی آیات (۱۴۴-۱۴۸) کا نزول ہوا۔ جس میں کہا گیا کہ ”محمدؐ ایک پیغمبر سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور بے شک اس سے پہلے پیغمبر وفات پاتے رہے ہیں، اگر وہ فوت

ہو جاتے ہیں یا مارے جاتے ہیں تو کیا تم (اپنے دین سے) پھر جاؤ گے (اگر ایسا ہوا) تو تم اللہ کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکو گے اور اللہ شکر گزاروں کو ہی انعام دے گا۔ اور کوئی شخص بھی فوت نہیں ہو سکتا سوائے اللہ کے حکم کے اور اس کے لیے اس نے وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اور جس کو بھی انعام چاہیے اس دنیا میں، ہم (اللہ) اس کو دیں گے اور جو کوئی بھی چاہے گا انعام آخرت میں، ہم اسے وہاں دیں گے اور ہم انعام دیں گے شکر گزاروں کو۔ اور بہت سے پیغمبروں نے لڑائی میں حصہ لیا اور ان کے ساتھ لڑے بہت سے دین پر مستحکم رہنے والے۔ لیکن کسی نے بھی دل نہیں چھوڑا اس مصیبت کے آنے پر جو اللہ کی راہ میں آئی۔ اور نہ ہی انہوں نے کمزوری کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی انہوں نے ہمت ہاری اور اپنی تذلیل کی اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اور انہوں نے اور کچھ نہیں کیا سوائے اس کے کہ: ”اے ہمارے رب! ہمارے گناہ معاف فرما دے اور ہماری خطائیں، اور ہمارے پاؤں جمادے مضبوطی کے ساتھ اور ہمیں فتح سے ہمکنار فرما کافر گروہ کے اوپر۔ پس اللہ نے انھیں انعام عطا فرمایا اس دنیا میں اور بہترین انعام عطا فرمایا دوسری دنیا میں اور اللہ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے“۔

(ر) ابودجانہؓ کی ناقابل یقین و ناقابل فراموش قربانی:

محبت اور وفاداری کی تاریخ میں قربانی کی ایسی نادر مثال شاید ہی کہیں ملے جیسی کہ صاحب شمشیر اعزازی ابودجانہؓ نے جناب رسالت مآبؐ کی وفاداری اور محبت میں احد کے روز پیش کی۔ بے شک اللہ کے رسولؐ سے وفاداری اور محبت اصل میں اللہ ہی کے لیے محبت اور وفاداری ہے۔ انہوں نے بہت کامیابی اور عزت کے ساتھ رسولؐ اللہ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ ان کی تیغ کے حق ادا کرنے کا پورا کیا۔ اور انہوں نے بہت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے لیے آخرت میں شایان شان مقام بھی حاصل کر لیا اور اس کی پوری پوری قیمت بھی ادا کر دی۔

ابودجانہؓ ان چار جانثاران اولین میں سے ایک تھے جنہوں نے رسالت مآبؐ کے گرد حلقہ بنایا ہوا تھا، وہ وہیں آپؐ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ دشمن کے وار بھی روک رہے تھے لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلتے، چاروں اصحاب کے جسم زخموں سے مزین ہو چکے تھے لیکن ابودجانہؓ کے زخموں نے انھیں زیادہ ہی مضمحل کر دیا اور ضعف نے آپ پر قابو پا لیا تھا اور آپ کے قدم آپ کا بوجھ سہارنے کے قابل نہ رہے۔ اس پر آپ نے اپنے جسم مبارک کو جناب رسالت مآبؐ کے جسم

مبارک کے ساتھ اس طرح سے چپکا لیا اور اپنے سر اور ہاتھوں سے گھیر لیا کہ ان کا جسم جناب رسولؐ اللہ کے جسم کے لیے مانند ڈھال بن گیا۔ اور جناب رسولؐ اللہ کی طرف آنے والے تمام تیر جناب ابو دجانہؓ کے جسم میں پیوست ہوتے چلے گئے جبکہ تین اصحاب اپنی تلواروں سے دشمن کو روکتے رہے لیکن انہوں نے بھی اپنی جگہ کو نہ چھوڑا۔

بے شک یہ منظر بھی ایک انوکھا اور غیر معمولی منظر تھا محبت کا جو ابو دجانہؓ نے پیش کیا اور اس طرح سے صاحب سیفِ رسولؐ ڈھال رسولؐ بن گئے اور اسی حالت میں جام شہادت نوش جان کیا۔ اللہ کی تمام تر تعریفوں کے بعد صلوٰۃ و سلام اللہ کے رسولؐ پر اور اللہ کی بے شمار رحمتیں ہوں ابو دجانہؓ پر اور تمام اصحاب رسولؐ پر۔

(ش) سیدہ اُمِ عمارہؓ کی مثالی ہمت و جرأت:

یہ باہمت اور معزز خاتون قبیلہ انصار سے تعلق رکھتی تھیں، آپ کا نام نسیبہ بن کعب تھا اور وہ میدانِ جنگ میں اپنے بھائیوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دے رہی تھیں۔ جنگ کی صبح سے ہی وہ اپنی خدمات عمومی طور پر انجام دے رہی تھیں لیکن جب دوپہر کے وقت انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی ہے تو انہوں نے اپنا مشکیزہ پھینک دیا اور اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔ انہوں نے دشمن سے لڑنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ کوشش کرنے لگیں کہ اس طرف جائیں جہاں جناب رسولؐ اللہ تشریف فرما تھے تا کہ آپؐ کے محفوظ ہونے کا انہیں یقین آ جائے۔

یہ پُرعزم اور باہمت خاتون بے جگری کے ساتھ دشمن مردوں کا مقابلہ کرتی رہیں حتیٰ کہ اپنے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے میدان میں گر گئیں لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی کہ آپ زندہ رہیں اور محفوظ رہیں، یہاں تک کہ انہوں نے غزوہ مسیلمہ کذاب میں شہادت کا درجہ پایا۔ بے شک ہمیں آپ کی بہادری پر رشک بھی آتا ہے اور ہمیں ان کی جانثاری پر ناز بھی ہے کہ اس افراتفری کے عالم میں انہوں نے دشمن کا بے دریغی سے مقابلہ کیا۔ وہ ہمارے سلام کی مستحق ہیں، انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی محبت اور رضا کی خاطر یہ کارنامہ انجام دے کر مسلمان خواتین کا نام سربلند کیا۔

(ت) جناب رسولؐ اللہ کی زندگی پر ایک اور حملہ:

قریش کو اس بات پر اطمینان تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کے سربراہ کو ہمیشہ کے لیے

خاموش کر دیا۔ لیکن جب انہیں اس کے برعکس خبر ملی تو انہوں نے ایک اور حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک قریشی ابی بن خلف نیزہ اپنے ہاتھ میں لیے جناب رسالت مآبؐ کے سامنے ظاہر ہو گیا اور چند نازیبا الفاظ جناب رسولؐ اللہ کی شان میں بکے۔ جناب رسالت مآبؐ نے اس پھرتی کے ساتھ حارث بن صمہؓ سے اسکا نیزہ کھینچا اور اسی سرعت کے ساتھ ابی کی طرف پھینکا جس نے گھوڑے کی پیٹھ پر ہی اسے خاموش کر دیا۔ گھوڑا اس بدبخت کی لاش کو لے کر اسی طرف چلا گیا جس طرف سے وہ آیا تھا اور اس طرح سے وہ جہنم رسید ہوا۔

(ث) ہندہ کا وحشیانہ پن:

ہندہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ کر شہداء کے اجسام کے ساتھ بدسلوکی کی اور جناب حمزہؓ کے جسم مبارک کے ساتھ بے حرمتی کر کے اس نے اپنی قسم کو پورا کیا۔ اس نے احد کے میدان میں ناچ اور گانے کے ساتھ اپنی فتح کا جشن منایا اور اپنے باپ بھائی اور بیٹے کی تعریف میں اشعار کہے، جو بدر میں مارے گئے تھے اور اس طرح اپنی تسکین کا سامان کیا۔ اس نے حبشی غلام وحشی کی بھی تعریف کی۔ ابوسفیان نے بھی جناب حمزہؓ کے لیے چند نازیبا الفاظ کہے اور اپنے نیزے سے آپ کے جسم کو چھو کر کچھ کہا۔ اللہ تعالیٰ جناب حمزہؓ پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور سلام ہو حمزہؓ پر اور ان کے دوسرے شہید ساتھیوں پر۔

(خ) جنگ میں مسلمان خواتین کا کردار:

سیدہ اُمِ عمارہؓ کے علاوہ اور بھی بہت سی خواتین تھیں جنہوں نے جنگ میں شرکت کی۔ لیکن ان خواتین کے فرائض میں یہ شامل نہ تھا کہ وہ سپاہیوں کو اکسائیں یا انہیں خوش کریں جس طرح سے کہ قریش کی خواتین کا مقصد تھا، بلکہ صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اللہ کی راہ میں میدان جنگ میں شریک ہوئی تھیں۔ ان کا کام پانی پلانا اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ ام المومنین سیدہ عائشہؓ بھی وہاں شریک تھیں اور ان کے ساتھ تھیں اُم سلیم، اُم سلیط اور اُم ایمنؓ۔ ان کے علاوہ دختران رسولؐ بھی وہاں موجود تھیں یعنی سیدہ اُم کلثوم زوجہ عثمان غنیؓ اور سیدہ فاطمہؓ زوجہ علیؓ۔ جب انہیں پتا چلا کہ ان کے والد محترم جناب رسولؐ اللہ پر حملہ ہوا ہے تو یہ فوراً آپؐ کے پاس تشریف لائیں اس وقت جناب رسالت مآبؐ نے سیدہ فاطمہؓ سے فرمایا کہ وہ انہیں چھوڑ دیں اور علیؓ کا خیال رکھیں کیونکہ انہیں بہت زیادہ زخم آئے ہیں۔

بہر حال اس روز کارکردگی میں سب سے آگے بڑھ جانے والی تھیں اُمِ عمارہؓ کیونکہ انہوں نے تیغ زنی کے جوہر دکھائے اور دشمنوں کو زیر کیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سب پر رحمتیں نازل ہوتی رہیں۔

(ق) ابوسفیان کا فخر:

جنگ کے ٹھہر جانے پر ابوسفیان میدان میں پڑے مسلمان شہدا کے اجسام کے قریب گیا اور چلایا یہ جاننے کے لیے کہ کیا اللہ کے رسولؐ حیات ہیں کہ نہیں۔ جس کا ہاں میں جواب دوسری طرف سے جناب عمرؓ نے دیا۔ اس پر ابوسفیان نے کہا "اے محمدؐ! جنگ بدر کے دوران تمہارے آدمیوں نے ہمارے ستر (۷۰) قتل کیے تھے اب ہم نے تمہارے ستر (۷۰) مار دیے ہیں اور اب حساب برابر ہو گیا۔ اگر تم اب بھی لڑنا چاہتے ہو تو اگلے برس تم سے بدر کے سلسلے میں پھر ملنے کے لیے تیار ہیں"۔ یہ کہنے کے بعد وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ میدان جنگ سے چلا گیا۔

(ض) شہدا کا کفن دفن:

جناب رسولؐ اللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رات گئے تک اپنے ساتھی شہدا کے کفن دفن میں مصروف رہے۔ شہدا کے اجسام کو اسی طرح سے دفنا دیا گیا جس طرح سے وہ ملے تھے، نہ تو انہیں غسل دیا گیا اور نہ ہی ان کا لباس تبدیل کر کے کفن اوڑھایا گیا۔ سب سے پہلے رسالت مآبؐ نے جناب سید الشہدا جناب حمزہؓ کے جسد مبارک کو منگوایا اور ان پر صلوٰۃ جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے ہر شہید کو لایا گیا لیکن جناب حمزہؓ کو وہاں سے ہٹایا نہیں گیا بلکہ تمام شہدا کے ساتھ آپ کو ہر صلوٰۃ میں شامل کیا گیا۔ اس طرح سے جناب حمزہؓ کی صلوٰۃ جنازہ جناب رسولؐ اللہ نے ستر (۷۰) مرتبہ ادا کی۔ اس کے بعد تمام شہدا کو احد کے دامن میں دفن کر دیا گیا اور ایک قبر میں ایک سے زیادہ شہدا کو دفن کیا گیا۔

شہدا کے دفن کے بعد آپؐ نے ان سب کی بہت تعریف فرمائی اور اس طرح سے فرمایا کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ جو کوئی بھی اللہ کی راہ میں زخمی ہوا یعنی شہید ہوا اللہ تعالیٰ اسے زندہ کریں گے قیامت کے روز اس حالت میں کہ اس کے زخموں سے خون رس رہا ہو گا اور اس کے خون میں سے مشک کی خوشبو آرہی ہو گی"۔ جناب رسالت مآبؐ کو آج تک کسی نے اتنا غمگین نہ دیکھا تھا جتنا کہ آپ احد کے روز تھے۔

(ظ) جناب رسالت مآبؐ کی اللہ کے سامنے عاجزی اور التجا:

امام احمدؒ نے لکھا کہ جب مشرکین مکہ جنگ احد کے میدان سے چلے گئے تو جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا "صلوٰۃ کے لیے قطاریں بنا لو، اس لیے کہ میں اللہ کا شکر ادا کر سکوں، تعریفیں بیان کر سکوں، اپنے مالک کے لیے جو سب سے بڑا اور تمام تر طاقت کا مالک ہے"۔ تو اہل احد آپؐ کے پیچھے کھڑے ہو گئے اس کے بعد صلوٰۃ میں قعود کی حالت میں جناب رسولؐ اللہ نے عرض کیا:

"اے اللہ! اسے کوئی روک نہیں سکتا جسے آپ کرنا چاہیں، اور اسے کوئی کر نہیں سکتا جسے آپ روک دیں یا نہ چاہیں۔ اسے کوئی ہدایت دے نہیں سکتا جسے آپ گمراہ کر دیں اور وہ گمراہ ہو نہیں سکتا جسے آپ ہدایت عطا فرمائیں۔ اسے کوئی رزق دے نہیں سکتا جسے آپ روک دیں اور اسے کوئی روک نہیں سکتا جسے آپ عطا کریں، کوئی اسے نزدیک لا نہیں سکتا جسے آپ دور کر دیں اور اسے کوئی دور کر نہیں سکتا جسے آپ نزدیک کر دیں۔

اے اللہ! ہم تمام لوگوں پر اپنا رحم فرمائیں، اپنا فضل اور اپنی برکتیں۔

اے اللہ! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھ پر اپنا فضل فرمائیں جو نہ تو کبھی تبدیل ہو اور نہ ہی ختم ہو۔

اے اللہ! صرف آپ ہی کی ذات بابرکت ہے جس سے ہم مشکل میں مدد چاہتے ہیں۔ صرف آپ ہی سے ہم اپنی حفاظت کی درخواست کرتے ہیں خوف کے دن۔

اے اللہ! صرف آپ ہی سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں برائی سے محفوظ رکھ۔ جس سے کہ ہم بُردی کی طرف جا سکتے ہیں۔

اے اللہ! ہمیں ایمان سے محبت عطا فرما اور ہمارے لیے اسے خوشگوار بنا دے اور ہمارے دلوں کو خوبصورت اور نافرمانوں کو اس سے سوا کر دے ہمیں ان لوگوں میں سے کر دے جن کو آپ نے ہدایت عطا فرمائی۔

اے اللہ! ہمیں مسلمان کی حیثیت سے زندہ رکھئے اور ہمیں مسلمان کی حالت میں موت عطا فرما اور ہمیں ملا دیجیے نیک اور سچے لوگوں کے ساتھ اور نہ کہ بھٹکے ہوئے بے عزت لوگوں کے ساتھ۔

اے اللہ! آپ کی دشمنی کافروں کے لیے ہو، جنہوں نے آپ کے پیغمبر کو جھٹلایا اور آپ کے صحیح راستے سے بھٹک گئے۔

اے اللہ! آپ کا عذاب، آپ کی پکڑ وہ آپ کی دشمنی کافروں کے لیے ہو اور وہ جن پر آپ نے کتاب بھیجی (اورانہوں نے اس کا انکار کیا) ان لوگوں کو مصیبت اور پریشانی میں ڈال جو آپ کی طرف سے جنگ میں ہوتی ہے۔

اے اللہ! (آپ) لکھنے والے (حکم چلانے والے) سچائی کے ساتھ (انسانوں کے لیے)"۔ (آمین ثم آمین)

(غ) جناب رسالت مآبؐ کی جناب حمزہؓ و دیگر شہدا سے اظہار محبت:

جناب رسالت مآب اپنے ساتھیوں سے بے پناہ محبت فرماتے تھے دراصل آپؐ ان کی شہادت پر غمزدہ نہ تھے بلکہ آپ ان لوگوں کی غفلت پر رنجیدہ تھے اور ان کی بے صبری پر اور ان کی حکم عدولی پر۔ جنہوں نے نے آپؐ کی ہدایات پر عمل درآمد نہ کیا اور میدان جنگ میں مال غنیمت کی خاطر بے صبری کا مظاہرہ کیا۔ آپؐ شہدا کے اجسام اور خاص طور پر جناب حمزہؓ کے جسم مبارک کی بے حرمتی پر بہت رنجیدہ تھے۔ اس لیے آپؐ نے ان تمام (۷۰) ستر شہدا کے لیے علیحدہ علیحدہ صلوٰۃ ادا فرمائی اور جناب حمزہؓ کی صلوٰۃ (۷۰) ستر مرتبہ۔ حالانکہ ان تمام ستر (۷۰) شہدا کی صلوٰۃ جنازہ صرف ایک مرتبہ ایک ساتھ بھی پڑھائی جا سکتی تھی۔ چونکہ شہدا احد تمام کے تمام کوہ احد کے دامن میں دفن کیے گئے تھے، اس نسبت سے جناب رسالت مآبؐ کوہ احد سے بہت محبت کا اظہار فرماتے۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ انس بن مالکؓ کی روایت کے مطابق کہ جب آپؐ نے ایک مرتبہ احد کو دیکھا تو فرمایا کہ "یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اے اللہ! ابراہیمؑ نے مکہ کو محترم ٹھہرایا اور میں نے دعا دیا مدینہ اور اس کے دو پہاڑوں کے درمیان محترم"۔

جناب رسول اللہؐ نے جناب حمزہؓ کے قاتل وحشی کی شکل دیکھنا پسند نہیں فرمائی تا کہ آپؐ کو وہ منظر جبکہ جناب حمزہؓ کے شہید جسد مبارک کی بے حرمتی کی گئی، یاد نہ آجائے۔ آپؐ کو زندگی بھر جناب حمزہؓ اور دیگر شہدائے احد یاد آتے رہے۔ آپؐ زندگی کے آخری ایام میں آخری مرتبہ کوہ احد تشریف لے گئے جہاں پر شہدائے احد مدفون تھے۔ غالباً آپؐ اپنے پیاروں کو ان کی شہادت کے آٹھ برس بعد الوداع کہنے کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔

امام بخاریؒ نے عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے شہدائے احد کی شہادت کے آٹھویں برس ان کے مرقد پر جاکے ان کے لیے صلوٰۃ جنازہ ادا کی۔ جیسا کہ یہ زندہ اور فوت شدہ مسلمانوں سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد آپؐ منبر پر تشریف آور ہوئے اور فرمایا کہ "میں تم سے پہلے جانے والا ہوں اور میں گواہ ہوں تمہارے لیے اور تمہاری وعدہ کی گئی جگہ کے لیے کہ تم مجھے ملو گے حوض کوثر پر قیامت کے روز اور میں اب دیکھ رہا ہوں اس جگہ کو اس جگہ سے جہاں پر میں ہوں۔ مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش کرو گے لیکن مجھے خوف ہے کہ تمہیں دنیا کی زندگی اپنی طرف راغب کرے گی اور تم ایک دوسرے سے اس بات کے لیے مقابلہ کرو گے۔ اور یہ آخری نظر تھی جو میں نے اللہ کے رسول پر ڈالی تھی"۔ اس نے کہا۔

(الف الف) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو تسلی:

جناب رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھی بہت ہی رنجیدہ تھے احد کے روز۔ اس حالت پر اللہ تعالیٰ جو رحیم و کریم ہے اس نے پسند فرمایا کہ اپنے بندوں کو تسلی دے اس غم کی حالت میں۔ اس لیے سورۃ آل عمران (۳) کی سورت (۱۳۷-۱۴۳) کا نزول ہوا جس میں فرمایا گیا کہ "اس طرح کے بہت سے حادثات پچھلی قوموں کے لوگوں نے زندگی میں دیکھے ہیں (لیکن یہ کوئی آخری معاملہ نہیں ہے بے شک آخر کار شکست کافروں کی ہوگی) پس زمین میں سفر کرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوا جنہوں نے (سچائی کو) جھٹلایا۔ یہ (قرآن) انسانوں کے لیے صاف بیان ہے ہدایت اور رہنمائی ان لوگوں کے لیے جو نیک ہیں (اور اللہ سے ڈرتے ہیں)، پس کمزور مت ہو (اپنے دشمن کے سامنے)، کیونکہ تم نے نقصان اٹھایا ہے اور غمگین نہ ہو اور تم ہی فاتح ہو گے اگر تم واقعی ایمان والے ہو۔ اگر تمہیں کوئی زخم اٹھانا پڑا ہے تو یقین کرو کہ ایسا ہی زخم دوسروں کو بھی لگا ہے اور اسی طرح سے ایسے ہی دن جو ہم (اللہ) دیتے ہیں لوگوں کو باری باری اور وہ (اللہ) ان کو آزماتا ہے جو ایمان والے ہیں تا کہ وہ (اللہ) تم میں سے منتخب کر سکے جنہیں شہادت ملی تھی۔ اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور یہ کہ اللہ امتحان لے ایمان والوں کا (اور ان کو انعام دے ان کے گناہ معاف کر کے) اور برباد کرے کافروں کو (ان کی زیادتی کی وجہ سے)۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں جاؤ گے اس سے پہلے کہ اللہ ان کو آزمائے

جو لڑتے ہیں (اس کی خاطر) اور ان کو بھی آزمائے جو صبر والے ہیں۔ بے شک! تم خواہش کرتے ہو موت کی (شہادت کی) اس سے پہلے کہ تم اس (موت) سے ملو۔ اب تم نے اسے دیکھ لیا ہے کھلی آنکھ سے ظاہری طور پر"۔

اسی طرح سے سورۃ عنکبوت (۲۹) کی آیات (۲-۳) میں ارشاد ہوتا ہے کہ "کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ انہیں ایسے ہی چھوڑ دیا جائے گا کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں، اور ان کا امتحان نہ لیا جائے گا؟ اور ہم (اللہ) نے بیشک امتحان لیا ہے ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اور اللہ اس کو یقیناً ظاہر کرے گا (سچائی) ان کی جو سچے ہیں اور یقینی طور پر (اسے) ظاہر کرے گا (جھوٹ ان کا) جو جھوٹے ہیں"۔

امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے لکھا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "کبھی بھی دشمن سے جنگ کی خواہش نہ کرو اور اللہ سے بھلائی چاہو اپنے لیے لیکن اگر وہ تم پر جنگ مسلط کر دیں تو پھر صبر سے کام لو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے"۔

(الف ب) شہدائے احد کے مراتب:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حالانکہ شہید مارے گئے اور ان کے جسموں کی بے حرمتی کی گئی لیکن یاد رکھو کہ ان کی ارواح زندہ ہیں اور انہیں رزق مل رہا ہے جنت میں۔ اور ان کے اجسام کو زمین کے نیچے محفوظ رکھا گیا ہے اور اللہ کی طرف سے زمین کو منع کیا گیا ہے کہ انہیں نقصان نہ پہنچائیں اور ان کی ارواح ان سے آملیں گی قیامت کے روز۔ اور وہ اپنے رب کے سامنے آئیں گے اپنے زخموں کے ساتھ جن میں سے خون بہہ رہا ہوگا لیکن اس میں سے مشک جیسی خوشبو آرہی ہوگی اور وہ اپنا انعام وصول کریں گے۔ (سبحان اللہ)

سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۶۹) میں فرمان ربی ہے کہ "ان کے متعلق یہ نہ سوچو کہ وہ مردہ ہیں جو مارے گئے ہیں اللہ کی راہ میں۔ نہیں! (بلکہ) وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس اور اپنا رزق پا رہے ہیں"۔

امام مسلمؒ نے مسروقؒ کے حوالے سے اس آیت کے متعلق لکھا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا: کہ "ان کی ارواح سبز رنگ کے پرندوں کے اندر رکھی گئی ہیں جو ان روشنیوں میں رہتے ہیں جو عرش کے نیچے لٹکی ہوئی ہیں اور وہ جنت میں پھرتے رہتے ہیں جہاں وہ چاہتے ہیں اور پھر اپنی

انہی روشنیوں والے گھروں میں لوٹ آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر نظر کرم فرماتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا انہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہیے کہ ہم جہاں چاہتے ہیں جنت میں چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے یہ سوال تین مرتبہ فرماتے ہیں جب وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے یہ سوال اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ اسکا جواب نہ دیں گے تو پھر انہوں نے عرض کیا اے مالک! ہم خواہش کرتے ہیں کہ ہماری ارواح ہمارے اجسام میں واپس چلی جائیں تا کہ ہم پھر تیرے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کو پتا ہوتا ہے کہ ان کی مزید کوئی خواہش نہیں ہے سو انہیں اسی حال میں چھوڑ دیا جاتا ہے"۔

امام احمدؒ نے لکھا ہے ابن عباسؓ کے حوالے سے کہ جناب نبیؐ نے فرمایا کہ "جب تمہارے بھائی احد میں مارے گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں میں رکھ دیا تھا جو جنت کے دریاؤں کی طرف جاتے اور وہاں جنت کے میوے کھاتے اور پھر وہ سنہری فانوسوں میں جو عرش کے سایہ میں لٹکی ہیں، چلے جاتے ہیں۔ جب انہوں نے جنت کے کھانے کا ذائقہ چکھا اور پینے کا اور وہاں کی بہار دیکھی تو انہوں نے کہا ہماری خواہش ہے کہ ہمارے بھائی، جان جائیں کہ اللہ نے ہمیں کیا عطا فرمایا ہے اور پھر وہ کبھی بھی جہاد سے منہ نہ موڑیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں انہیں تمہاری یہ خبر پہنچا دوں گا اور پھر اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۶۹-۱۷۱) کا نزول فرمایا"۔

ابوبکر ابن مرداؤہ نے لکھا کہ جابر بن عبداللہ نے کہا کہ ایک روز جناب رسالت مآبؐ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا "اے جابر! میں تمہیں غمگین کیوں دیکھتا ہوں؟" اس نے جواب دیا اے اللہ کے نبیؐ! میرا باپ شہید ہو گیا اور اپنے بعد قرض چھوڑ گیا اور بچے اور وہ (شہداء) اب واپس نہیں آئیں گے۔ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اللہ نے کسی سے بھی بات نہیں کی سوائے ایک پردے کے پیچھے سے؟ لیکن اللہ نے بات کی تمہارے والد سے بلاواسطہ اور اسے کہا مجھے بتاؤ اور میں تمہیں دونگا۔ اس نے کہا کہ مجھے واپس زندہ کر دیا جائے تا کہ میں دوبارہ آپ کے لیے مارا جاؤں۔ رب ذوالجلال والاکرام نے فرمایا میں یہ کہہ چکا ہوں کہ وہ واپس نہیں جائیں گے تو اس نے کہا اے میرے رب! تو پھر انہیں یہ خبر سنا دیں جنہیں میں پیچھے چھوڑ گیا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران کی آیت (۱۶۹) نازل فرمائی۔

اس آیت سے اگلی آیات (۱۷۰ اور ۱۷۱) میں فرمایا گیا ہے کہ "وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا ہے اپنی نعمتوں میں سے اور ان کے لیے بھی خوش ہو رہے ہیں جو ابھی تک ان سے نہیں آ ملے اور پیچھے رہ گئے ہیں کہ ان کے لیے نہ کوئی خوف اور نہ کوئی غم۔ وہ خوش رہیں گے اللہ کے فضل و کرم سے عزت کے ساتھ اور اللہ ایمان والوں کا انعام ضائع نہیں کرے گا"۔

(الف ج) ابوسفیان فتح کا جشن منائے بغیر کیوں چلا گیا؟

اپنے پہلے مرحلے میں جنگ احد میں اہل قریش کو شکست سے دوچار ہونا پڑا انہیں بعد میں ان کی وہ شکست فتح میں تبدیل ہوگئی اور پھر وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوگئے اور جناب رسولؐ اللہ کو بھی۔ تمام مسلمانوں نے شکست اور زخموں کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی، ان کے سات صد مجاہدوں میں سے (۶۳۰) باقی رہ گئے جبکہ قریش کے تین ہزار میں سے (۲۹۷۸) رہ گئے۔ لیکن پھر بھی ان لوگوں میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ میدان جنگ میں کچھ دیر رک جاتے۔ بلکہ وہ غروب آفتاب سے پہلے ہی بھاگ لیے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح سے جلدی میں میدان جنگ سے بھاگنا کیوں کہ قریش کی فتح تھی سوا یہ کہ اب یہ مسلمانوں کی فتح میں تبدیل ہونے کو تھی۔

اس لیے درج ذیل وجوہات معلوم ہوتے ہیں ابوسفیان کے میدان جنگ میں نہ ٹھہرنے کے اور ایک فیصلہ کن جنگ نہ کرنے کے:

۱) اسے جناب رسولؐ اللہ کے جانبازوں کی جانثاری کا اندازہ تھا، ان میں لڑنے کی جرأت کا بھی اور ان میں مرتے دم تک لڑنے کی صلاحیت اور خواہش کا بھی۔

۲) اسے اندازہ تھا کہ اس کے سپاہی اس جنگ میں فتح سے پہلے اسی میدان سے بھاگ چکے ہیں اور اب ان میں اتنی جرأت نہیں رہی کہ وہ ان سے ایک اور مقابلہ کر سکیں۔

۳) اسے اندازہ تھا کہ اس کے فوجی اپنی عورتوں کے اکسانے اور بھڑکانے کی وجہ سے لڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔

۴) اسے اندازہ تھا کہ اگلی صبح مسلمان پھر اپنی باری لیں گے ایک نئے جذبے ولولے اور امنگ کے ساتھ اور اس دفعہ وہ اپنی سابقہ غلطیوں کو نہیں دہرائیں گے۔

۵) اسے اپنی قطعی شکست مطلوب نہ تھی اور نہ ہی مزید اموات۔

۶) ہو سکتا ہے کہ اس نے سوچا ہو کہ مسلمانوں کے ستر قتل کرنے سے انہوں نے اپنا بدر کا انتقام لے لیا ہے اور وہ مطمئن ہو گئے ہوں اور اب انہیں اپنی جان بچا کے چلا جانا اچھا لگا ہو۔

درحقیقت جنگ احد قریش کی مکمل فتح تو نہ تھی بلکہ یہ مسلمانوں کے لیے ایک نشان عبرت اور ان کے ایمان کا امتحان تھا اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے نصیحت۔

(۱۱۳) جنگ الحمراء الاسد

یہ جنگ کا کوئی انفرادی واقعہ نہ تھا نہ اس کا تعلق احد کی لڑائی سے تھا بلکہ جب قریش کے سردار احد سے واپسی پر جنگ کا تجزیہ کر رہے تھے تو ابن حاتم کے مطابق، عکرمہ بن ابوجہل نے اپنے ایک ساتھی سے اس بارے میں اظہار خیال کیا کہ "نہ تو تم نے محمدؐ کو قتل کیا اور نہ ہی مال غنیمت حاصل کیا، تف ہے تم پر جو کچھ تم نے کیا، ہمیں واپس جانا چاہیے"۔

جب جناب رسولؐ اللہ کو اس رائے کا علم ہوا تو آپؐ فوراً اپنے ساتھیوں سمیت کوچ کر کے الحمراء الاسد کے مقام پر جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا، پہنچ گئے۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ کس نے یہ خبر جناب رسولؐ اللہ تک پہنچائی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی اپنی الہامی معلومات تھیں کیونکہ احد کے روز رات گئے تک جناب رسولؐ اللہ احد کے مقام پر ہی تھے اور اپنے ساتھیوں کے کفن دفن میں مشغول تھے، ستر مرحومہ جو آپؐ نے صرف صلوٰۃ جنازہ ہی پڑھائی تھی۔ آپؐ گئی رات کے وقت پندرہ شوال کی شب مدینہ پہنچے اور پھر وہاں پر علی الصبح ہی آپؐ نے شرکائے احد کو بلوایا اور قریش کے پیچھے ہو لیے۔ جناب رسولؐ اللہ کا یہ فیصلہ اور کارروائی اللہ کے حکم کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ جو سورۃ النساء (۴) کی آیت (۱۰۴) میں آپ تک پہنچا جس میں فرمایا گیا ہے کہ: "اور اپنی کمزوری مت دکھاؤ، دشمن کا پیچھا کرنے میں، اگر تم تکلیف میں مبتلا ہو (یعنی جنگ کی مشقت اور زخموں کی وجہ سے) تو یقیناً وہ (دشمن) بھی تمہاری ہی طرح تکلیف میں مبتلا ہیں۔ لیکن تمہیں تو اللہ کی طرف سے امید ہے (انعام کی) اور جس کی انہیں امید نہیں اور اللہ تو ہمیشہ سب کچھ جاننے والا اور دانائے کل ہے"۔

جناب رسولؐ اللہ نے شرکاء احد کے علاوہ کسی اور مسلمان کو اپنے ساتھ شرکت کی اجازت

نہیں دی سوائے ایک جابر بن عبداللہ بن عمرو کے اس کے بعد کہ آپ کو ان کے احد میں شرکت نہ کرنے کی صحیح عذر داری معلوم ہوگئی۔ دوسری طرف آپؐ نے علیؓ کو شریک ہونے کی اجازت نہیں دی کیونکہ آپؐ شدید زخمی حالت میں تھے۔ حالانکہ جناب رسولؐ اللہ اور دوسرے تمام شرکاء بھی اچھے خاصے زخمی تھے لیکن جناب رسولؐ اللہ کی آواز پر سب نے لبیک کہا۔ اس وقت ان سب کا جناب رسولؐ اللہ کی آواز پر فوری طور پر لبیک کہنا اللہ تعالیٰ کو بہت اچھا لگا جس کا اظہار مالک کائنات نے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۷۲) میں فرمایا اور کہا کہ ''وہ جنہوں نے جواب دیا (پکار کا) اللہ اور اس کے رسولؐ کو زخمی ہونے کے باوجود اور ان لوگوں کے لیے جو اچھے کام کرتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں بہت بڑا اجر ہے''۔

اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے اپنے جانثاروں کے ساتھ اہل قریش کا پیچھا کیا اور حمراء الاسد کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔ وہاں ایک شخص معبد بن ابی معبد جس کا تعلق بنی خزاعہ سے تھا جناب رسولؐ اللہ کے پاس آیا اور احد کے واقعہ پر اظہار افسوس کرنے لگا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ آپؐ کے لیے کچھ کرنے کا خواہشمند ہے۔ اس پر جناب رسالت مآبؐ نے تجویز پیش کی کہ اگر وہ ابوسفیان کی دل شکنی کرسکتا ہو اس کے بُرے ارادوں کے بارے میں؟۔

دوسری جانب اہل قریش اپنے چند سرداروں کے اکسانے پر روحا کے مقام پر رک گئے تھے جو مدینہ سے چھتیس میل کے فاصلہ پر تھا تاکہ وہ اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں فیصلہ کرلیں۔ ان میں سے ایک سردار صفوان بن امیہ نے مشورہ دیا کہ انہیں واپس اپنے گھر چلے جانا چاہیے، ایسی جیتی ہوئی حالت میں اور یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محمدؐ اپنے باقی مسلمانوں کو اکٹھا کر کے اپنا انتقام لیتے نہ آجائیں۔ اسی اثنا میں معبد وہاں پہنچ گیا اور کہا کہ رسولؐ اللہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے آرہے ہیں اور بہت ہی غصے کے عالم میں ہیں اور انہیں یہ نصیحت کی کہ ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ واپس اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ لیکن خلاف توقع ابوسفیان نے بھی بالکل ایسا ہی کیا اور اپنا ایک آدمی بھیج کر مسلمانوں تک ایسا ہی پیغام پہنچایا جسے سن کر اللہ کے رسولؐ نے بہت اطمینان کے ساتھ ان کی دھمکی کو ٹال دیا اور صرف یہ کہا کہ کوئی بات نہیں ہمارے لیے کافی ہے اللہ۔ یہ جواب جو جناب رسولؐ اللہ نے دیا اس کو اللہ تعالیٰ نے بہت سراہا اور سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۷۳) میں فرمایا کہ: ''وہ (ایمان والے) جن کو

لوگوں نے (منافقوں نے) کہا کہ بے شک کہ لوگ (کافر) تمہارے خلاف اکٹھے ہوگئے ہیں، اس لیے ان سے ڈرو۔ لیکن اس (دھمکی) سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین معاملات کا نمٹانے والا ہے''۔

جناب رسالت مآبؐ مسلسل تین روز تک دشمن کا انتظار کرتے رہے اور جب وہ نہ پلٹے تو مدینہ واپس تشریف لے آئے جبکہ قریش پہلے ہی مکہ واپس روانہ ہوچکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی واپسی کی تعریف فرمائی اور اس واپسی کو پروقار قرار دیا اور آپؐ کے تین روز کے قیام کو بھی پسند فرمایا۔ اس سلسلے میں سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۷۴) میں فرمان ہے کہ ''پس وہ واپس ہوئے عزت و وقار اور اللہ کے فضل کے ساتھ۔ انہیں کسی نقصان یا مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور انہیں اللہ کی خوشنودی حاصل ہوئی اور اللہ بڑے فضل و کرم کا مالک ہے''۔

اس آیت کریمہ کے علاوہ سورۃ الزمر (۳۹) کی آیت (۳۶) بھی اس مضمون کے متعلق فرماتی ہے کہ ''کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے! پھر بھی وہ کوشش کرتے ہیں تمہیں خوفزدہ کرنے کے لیے، ماسوائے اللہ کے! اور جسے اللہ گمراہ کرتا ہے اسے پھر کوئی ہدایت نہیں دے سکتا''۔

شرکاء احد جنہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرلیا جو انہوں نے دوران جنگ کی تھیں اور اس اعتراف کے بعد ان میں پھر ایمانی قوت واپس آگئی تھی اور پھر وہی لوٹنے کی قوت اور خواہش اللہ کے دشمنوں سے، جسے بعد میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے اور جذبے سے ثابت کردیا تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے تابعدار ہیں۔ اسی وجہ سے اپنے زخموں سے نڈھال ہونے کے باوجود انہوں نے جنگ کی اگلی صبح جناب رسولؐ اللہ کی ایک آواز پر بغیر کسی چوں و چرا اور بغیر کسی سوال کے لبیک کہا اور آپؐ کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان سے خوش ہی نہیں ہوئے بلکہ ان کے لیے آئندہ فتح کا مژدہ بھی سنا دیا۔ یہ خوشخبری انہیں سورۃ مجادلہ (۵۸) کی آیت (۲۱) میں سنائی گئی جس میں فرمایا گیا کہ ''اللہ نے لکھ دیا ہے: بے شک! یہ میں (اللہ) اور میرا رسولؐ ہوں گے جو فتح یاب ہوں گے، بے شک! اللہ ہر طرح سے طاقتور ہے اور تمام عزت زورآور''۔

سورۃ غافر (۴۰) کی آیت (۵۱) میں فرمایا گیا ہے کہ ''بے شک! ہم (اللہ) بنائیں گے فتح یاب، ہمارے پیغمبر اور ان کو جو یقین رکھتے ہیں اس دنیا کی زندگی میں اور اس دن پر جب کہ وہ

آ جائیں گے (یعنی اعمال لکھنے والے فرشتے)''۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام پیغمبروں کا مشن جناب محمدؐ سمیت ایک ہی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی کامیابی لکھ دی ہے۔ یعنی ان تمام اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ آخر کار کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار فرمایا اور آئندہ فرمائیں گے جنہوں نے اللہ کا اور اس کے رسولوں کا حکم پورا کیا اور کرنے کے لیے بھرپور کوشش کریں گے اور اپنے جان و مال کی قربانی سے بھی گریز نہ کریں گے۔

(۱۱۴) سریہ ابو سلمہ

جنگ احد کے اثرات جنگ بدر سے بالکل مختلف تھے، اس دفعہ مدینہ کے یہودی اور منافقین اور مدینہ کے اطراف کے بدو قبائل کا رویہ مسلمانوں کے خلاف جارحانہ ہو گیا تھا۔ اب وہ کھل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے لگے، اور اس بات کا علم جناب رسولؐ اللہ کو اچھی طرح سے تھا اور اسی بات کو پہلے سے ذہن نشین رکھتے ہوئے جناب رسالت مآبؐ نے ابو سفیان کا پیچھا کیا تھا اور حمراء الاسد میں تین روز قیام کیا۔ تا کہ دشمنوں کو احساس ہو جائے کہ مسلمان احد کے معرکے کے بعد مایوس اور کمزور نہیں ہو گئے۔ لہٰذا احد کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے دشمن کی کڑی نگرانی کا بندوبست کیا اور نتیجتاً آپؐ کو اطلاع ملی کہ بنو اسد بن خزیمہ کے ہاں طلحہ اور سلمہ بن خویلد، اس سازش کی تیاری میں لگے ہوئے تھے کہ جناب رسالت مآبؐ کے گھر پر حملہ کریں اور مدینہ کے اطراف کی چراگاہوں سے جانور لوٹ کر لے جائیں۔ اس لیے جناب رسالت مآبؐ نے ایک سو مجاہدین کو ابو سلمہ بن عبدالاسد کے زیر کمان ان لوگوں کی سازش کی تکمیل سے پہلے ہی ان سے نمٹنے کے لیے بھیجا، درج ذیل ہدایات کے ساتھ:

۱) وہ لوگ دن کے وقت سفر نہ کریں بلکہ چھپ جائیں اور رات بھر سفر کریں۔

۲) عام شاہراہ سے سفر نہ کریں، بلکہ غیر معروف راستہ اختیار کریں۔

۳) ان کا حملہ دشمن کے لیے حیران کن ہونا چاہیے یعنی اچانک۔

لہٰذا چوتھی ہجری کے ماہ محرم کے پہلے روز یعنی ماہ جون ۶۲۵ء ابو سلمہ نے ان پر اچانک حملہ کر دیا اور وہ مقابلہ نہ کر سکے اور بھاگ گئے۔ چونکہ ابو سلمہؓ احد میں کافی زخمی ہو چکے تھے جس کی

وجہ سے ان کے زخم تازہ ہو گئے اور ان کی وجہ شہادت بنے۔ دشمن کے اس طرح سے تتر بتر ہونے سے دیگر دشمنوں پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

(۱۱۵) سریہ عبداللہ بن اُنیس

چوتھی ہجری کے ماہ محرم کے پانچویں روز جناب رسولؐ اللہ کو اطلاع ملی کہ ایک شخص خالد بن سفیان الہذلی مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ کے مقام پر اپنے لوگوں کو اکٹھا کر رہا ہے تا کہ مدینہ پر حملہ کرے۔ جناب رسولؐ اللہ نے فوری طور پر عبداللہ بن انیسؓ کو اطلاعات اکٹھا کرنے کی غرض سے بھیجا انہوں نے اس کام کی غرض سے متعلقہ جگہ کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر خالد کو اس کی بیویوں سمیت پایا۔ وہاں جا کر اس نے اپنے آپ کو مسلمانوں کا دشمن ظاہر کیا اور اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کیا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ اس دوران اسے خالد کو قتل کرنے کا موقع مل گیا اور اس نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور واپس مدینہ پہنچ گیا۔ جناب رسولؐ اللہ اس کی کامیابی پر بہت خوش ہوئے اور اسے انعام کے طور پر ایک چھڑی عطا فرمائی اور فرمایا کہ ''یہ قیامت کے روز اس بات کی پہچان بنے گی کہ ہم ایک دوسرے کو پہچان جائیں''۔ اپنی وفات کے موقع پر عبداللہ کو اس چھڑی کے ساتھ ہی دفن کیا گیا، ان کی وصیت کے مطابق۔

(۱۱۶) سریہ الرجیع

خالد بن سفیان کے قبیلے نے خالد کا بدلہ لینے کے لیے ایک سازش تیار کی۔ اس مقصد کے لیے اس کے قبیلے کے ایک شخص بنو لیحان نے اس سازش کے تحت ہجرت کے چوتھے برس ماہ صفر میں یعنی جولائی ۶۲۵ء کو ایک وفد رسولؐ اللہ کی طرف روانہ کیا جس نے جناب رسولؐ اللہ سے درخواست کی کہ ان کے ساتھ کچھ ایسے لوگوں کو بھیجا جائے جو انہیں دین کی تعلیم دے سکیں۔ لہٰذا جناب رسولؐ اللہ نے اس مقصد کے لیے چھ صحابہ کو منتخب فرمایا وہ تھے (۱) مرثد بن ابی (۲) خالد بن لیثی (۳) عاصم بن ثابت (۴) خبیب بن عدی (۵) زید بن دثنہ اور (۶) عبداللہ بن طارق۔ جب یہ حضرات رجیع کے مقام تک پہنچے جو حجاز میں جدہ اور رابغ کے درمیان واقع ہے تو وہاں اچانک ایک سو تیر انداز نمودار ہوئے جو لیحان نے مقرر کیے ہوئے تھے۔ جناب رسولؐ

اللہ کے اصحاب نے ان کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے بلکہ دشمن سے لڑنا شروع کر دیا۔ نتیجے کے طور پر ان میں سے سات تو شہید ہو گئے جبکہ تین دشمن نے گرفتار کر لیے۔ ان تین میں سے عبداللہ بن طارق بھاگ نکلے تو دشمن نے اسے شہید کر دیا۔ باقی دو زید بن دثنہ اور خبیب بن عدی کو مکہ لے جا کر بیچ دیا گیا۔ وہاں حضرت خبیبؓ کو قتل کر دیا گیا، اپنے قتل ہونے سے پہلے جناب نے دو رکعت صلوٰۃ کے لیے اجازت مانگی اور صلوٰۃ کے بعد قریش سے کہا کہ اگر مجھے خوف نہ ہوتا کہ تم سوچو گے کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں تو میں زیادہ دیر تک صلوٰۃ ادا کرتا۔ پھر انہوں نے اپنے مالک سے عرض کی "اے میرے رب! ان کو ایک ایک کر کے مار دیجیے حتیٰ کہ ان میں سے کوئی بھی نہ رہے"۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ایمان کے بارے میں چند اشعار کہے، پھر وہ عقبہ بن حارثہ کے ہاتھ شہید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو ان پر اور ان کے قاتلوں پر اللہ کی لعنت"۔ زید بن دثنہ کو صفوان بن امیہ نے خرید کر اپنے باپ کے انتقام میں جسے بدر کے میدان میں زید نے قتل کیا گیا تھا، اس کا بدلہ لینے کی خاطر قتل کر دیا۔

یہ حادثہ جناب رسالت مآبؐ کے لیے بہت بڑا دھوکہ اور نقصان تھا اور دشمن کی یہ چال جناب رسولؐ اللہ اور دیگر مسلمانوں کے لیے لمحہ فکر تھی۔

(۱۱۷) حادثہ معونہ

یہ ایک اور واقعہ ہے دھوکہ اور دغابازی کا جس میں مسلمان قوم کو بہت زیادہ نقصان ہوا اور ان کے لیے باعث غم و نشان عبرت بنا۔ چوتھی ہجری کے ماہ صفر یعنی جولائی ۶۲۵ء میں نجد سے بنو کلب کا سردار ابو براء عامر بن مالک جناب رسولؐ اللہ کے پاس آیا اور منافقت میں ظاہر کیا کہ وہ مسلمانوں کا دوست ہے اور اس نے بھی بالکل ایسی ہی درخواست کی جیسی کہ مرد و لیحان نے کی تھی کہ انہیں اسلام کی تعلیم بہم پہنچانے کے لیے کچھ علماء کی ضرورت ہے۔ جناب رسولؐ اللہ کو رجیع کا واقعہ ابھی تک بھولا نہ تھا بلکہ ابھی تک تازہ ہی تھا، لہٰذا اس درخواست پر آپ ہچکچائے لیکن عامر کیونکہ کافی اچھا سمجھا جاتا تھا، اپنے قبیلہ میں، لہٰذا آپؐ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ اس کے علاوہ عامر نے ان استادوں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ چنانچہ جناب رسولؐ اللہ نے اس کے ساتھ چالیس اشخاص جو بہت اچھے طریقے سے قرآن سے واقفیت رکھتے تھے،

منذر بن عمرو کی سربراہی میں بھیج دیے۔ جب یہ حضرات معونہ کے کنوئیں تک پہنچے تو وہاں کچھ دیر کے لیے رکے کہ انہوں نے عامر بن طفیل کو جناب رسولؐ اللہ کا خط پہنچانا تھا۔ یہ خط حرام بن ملحان کے پاس تھا۔ جب انہوں نے وہ خط عامر کے سپرد کیا، اس بدبخت نے خط کی تو پرواہ نہیں کی بلکہ حرام کے قتل کا حکم دے دیا اور یہ قتل جناب رسولؐ اللہ کی دشمنی کی وجہ سے تھا۔ پس جناب حرامؓ کو نیزہ مار کے شہید کر دیا گیا، آپ نے شہادت کے وقت اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور فرمایا "میں کامیاب ہو گیا"۔ اس کے بعد عامر نے ابو براء عامر بن مالک کے قبیلہ کو بلوایا تا کہ وہ باقی ماندہ علماء کو قتل کر دیں۔ لیکن انہوں نے اس کام کے لیے انکار کر دیا۔ تب طفیل نے اپنے آدمی بلوائے اور ساتھ ہی اپنے حلیف تا کہ وہ ان علماء کو ختم کر دیں۔ جناب رسولؐ اللہ کے وہ محترم ساتھی اپنی پوری قوت کے ساتھ آخری دم تک دشمن سے لڑتے رہے۔ لیکن ان میں سے صرف ایک کعب بن زید بن نجار باقی بچ سکا جو دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جو شہادت پا چکے تھے، زخمی حالت میں لا۔ ان کے علاوہ دو ساتھی عمرو بن امیہ اور منذر بن عقبہ جو اس وقت دور اپنے جانوروں کی دیکھ بھال کر رہے تھے، جب انہوں نے اس جگہ پرندوں کی اڑان دیکھی تو جلدی سے واپس آئے، اور اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر فوراً دشمن کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا۔ اس جدوجہد میں منذرؓ شہید ہو گئے اور عمرو پکڑا گیا اور غلام بنا لیا گیا، لیکن عامر بن طفیل نے اسے آزاد کر دیا۔ اس لیے کہ اس نے اپنی ماں سے کیا ہوا ایک وعدہ پورا کرنا تھا کہ وہ ایک غلام آزاد کرے گا۔ عمرو کو مدینہ جاتے ہوئے دو اشخاص جو بنو عامر کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ملے اور اس نے انہیں دشمن سمجھ کر قتل کر دیا۔ لیکن چونکہ اس قبیلے سے جناب رسولؐ اللہ کا امن معاہدہ تھا لہٰذا آپؐ نے ان مقتولوں کا معاوضہ ادا کر دیا۔

اس طرح سے بہت سارے قرآن کے جاننے والے شہید ہو گئے جو مسلمانوں کے لیے بہت بڑا نقصان تھا۔ یہ تقریباً احد جیسا ہی نقصان تھا، اس پر جناب رسولؐ اللہ بہت رنجیدہ ہوئے اور اس صدمہ کی وجہ سے آپ نے مسلسل چالیس روز تک صبح کی صلوٰۃ میں قنوط فرمایا اور ان لوگوں کے لیے بددعا فرمائی۔ (قنوط آخری رکعت میں سجدے سے پہلے قیام کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کو کہتے ہیں)

(۱۱۸) مَعُونہ کے اثرات اور نتیجہ

ایک طرف تو واقعہ معونہ مسلمانوں کے لیے پھر سے غم کا پیام لایا اور دوسری طرف قبل یہود اور مشرکین کے لیے خوشی۔ قبل یہود تو مسلمانوں سے امن و آشتی اور دوستانہ تعلقات کے لیے پابند تھے لیکن حقیقت میں وہ مسلمانوں کی خوشی میں ناخوش اور غمی یا نقصان میں ہمیشہ خوش رہتے۔ ان کا مسلمانوں کے ساتھ یہ معاندانہ رویہ بنیادی طور پر تصوراتی تخالف کی وجہ سے تھا۔ جس کا تجزیہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، جو درج ذیل ہے:

۱) وہ تصور ہی نہ کرتے تھے اور نہ ہی پسند کرتے تھے کہ آنے والی نبوت ان کے علاوہ یعنی قبل یہود کے علاوہ کسی اور قوم میں منتقل ہو جائے گی۔ اس وجہ سے وہ جناب رسول اللہؐ کے دشمن بن گئے کیونکہ نہ تو وہ قبل یہود میں سے تھے، اور نہ ہی انہوں نے تورات کے قوانین کو اپنایا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مسیحؑ نے تو تورات کے قوانین کو ہی اپنایا تھا اور ان کے پیروکاروں نے بھی لیکن پھر بھی یہودیوں نے مسیحؑ کو قتل کرنے کی سازش کی۔

۲) انہوں نے پہلے تو یہ پسند کیا کہ مسلمانوں نے انہی کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنایا لیکن جب مسلمانوں کے لیے کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا تب انہیں اچھا نہیں لگا اور ان کی دشمنی مسلمانوں سے اور بڑھ گئی۔

۳) انہیں یہ بات ناگوار گزری کہ مسلمانوں نے ان کے لیڈر کعب بن اشرف کو قتل کر دیا۔ اس کے قتل کی وجہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس کا جناب رسالت مآبؐ کے خلاف نازیبا زبان کا استعمال کرنا تھا۔

۴) انہیں یہ پسند نہیں آیا کہ ان کے سماجی قوانین بدل دیے جائیں۔ حالانکہ نئے مسلم قوانین ان کی کتاب کے خلاف نہ تھے، بلکہ انہوں نے جو قوانین مروجہ رکھے تھے وہ انہی کی کتاب کے خلاف تھے۔ مثلاً:

i) ان کی کتاب کے مطابق سود حرام تھا، لیکن ان کی معیشت سودی نظام پر ہی قائم تھی اور انہوں نے اسے جائز قرار دیا ہوا تھا اور وہ ادھار کی رقم کی ضمانت کے عوض عورتوں اور بچوں کو گروی رکھ لیتے تھے۔

ii) انہوں نے زنا کو جائز کیا ہوا تھا معاشرے کے بااثر لوگوں کے لیے۔ جبکہ دوسروں

کے لیے ناجائز اور انہیں اس جرم کی باقاعدہ سزا بھی ملتی۔ مسلمانوں کے قوانین اور سزائیں ان کی کتاب کے مطابق تھے لیکن قبل یہود کے لیے فائدہ مند نہ تھے، اس لیے وہ ان کے خلاف تھے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شادی شدہ فرد کے لیے زنا کی سزا سنگسار ہے جس کے خلاف بہت واویلا مچایا جاتا ہے لیکن یہ سزا نہ تو قرآن میں ہے اور نہ ہی جناب رسول اللہؐ نے اپنی طرف سے مقرر کی ہے بلکہ یہ سزا تورات کی ہے جسے دین اسلام نے منسوخ نہیں کیا بلکہ قائم رکھا، اور اسی سزا کے متعلق آج بھی یہی لوگ نقطہ اعتراض اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سزا یہودی اور عیسائیوں کی دینی کتب میں مروجہ ہے۔

۵) وہ مسلمانوں کے سماجی اور معاشی نظام سے خوش نہیں تھے کیونکہ اس سے قبل یہود کا معاشی نظام متاثر ہو رہا تھا۔ اور اس کی وجہ سے معاشرے میں ان کا اثر و رسوخ بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ ان کا سماجی و معاشی نظام چونکہ قرض کے لینے اور دینے اور اس پر سود لینے اور دینے پر منحصر تھا، مزید یہ کہ اور انہیں اپنے بااثر لوگوں کو دیگر معاشرتی سزاؤں سے بچانا بھی مشکل ہو گیا تھا، اس لیے یہ باتیں ان کے لیے بہت ناگوار تھیں۔

ان مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی اور آج بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے درمیان نااتفاقی اور نا چاقی کا ماحول پیدا کریں۔ جیسا کہ انہوں نے مدینہ کے اوس اور خزرج قبائل کو تقسیم پر اکسایا اور اس سلسلے میں تو وہ ایک مرتبہ کامیاب بھی ہو گئے تھے، ان دونوں کی پرانی دشمنی ابھارنے کے لیے۔ لیکن اس موقع پر فوراً نزول الہام ہوا اور نبیؐ نے انہیں اس کے ذریعہ سمجھایا ورنہ تو بہت بڑا فتنہ جنم لے رہا تھا۔

اس بارے میں سورۃ آل عمران کی آیات (۱۰۰-۱۰۳) میں فرمان ربی ہوا کہ "کہو! اے تم جو ایمان والے ہو! اگر تم تسلیم کرتے اس گروہ کو جو کتاب والے ہیں (یعنی یہود) تو وہ بے شک تمہیں بے ایمان بنا دیتے اس کے بعد کہ تم ایمان لا چکے ہو، اور تم کیسے بے ایمان ہو سکتے ہو جب تمہارے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں آیات اللہ کی اور تمہارے درمیان اللہ کا رسولؐ موجود ہے؟ اور جو کوئی بھی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو پھر بے شک وہ سیدھے راستے کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے۔ اے تم جو ایمان لائے ہو! اللہ کی تابعداری (تقویٰ) اختیار کرو، جیسا کہ اس کا حق

ہے اور وفات مت پاؤ جب تک کہ تم کامل مسلمان نہ بن جاؤ۔ اور آپس میں مضبوطی سے پکڑ کر رکھو اللہ کی رسی (یعنی اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی حکمت) اور آپس میں تقسیم مت ہو جانا اور اللہ کی مہربانیاں یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اس نے تمہارے دلوں کو ملا دیا کہ تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے اور تم تو بس آگ میں گرنے ہی والے تھے کہ اس (اللہ) نے تمہیں بچا لیا۔ پس اللہ تعالیٰ اپنی آیات صاف صاف بیان فرماتا ہے تا کہ تم ہدایت پا جاؤ''۔

یہودیوں کے ساتھ ساتھ منافقین بھی اللہ کے رسولؐ کے خلاف جال بن رہے تھے۔ ان کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول بہت زیادہ مغموم تھا کہ وہ اس تاج سے محروم رہ گیا، جسے اس کے قبیلے نے اس کے لیے پسند کیا تھا اور اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب محمدؐ نبی بن کے سامنے آ گئے، اپنے قابل بھروسہ ساتھیوں کے ساتھ۔ اس نے بنو قریظہ کی سازش میں بھی شرکت کی تھی، جس کی وجہ سے انہیں مدینہ سے نکل جانا پڑا۔ اب بنو نضیر جو ایک یہودی قبیلہ تھا، اس نے اپنی مکار سازشوں کی تیاری شروع کر دی تھی جناب رسولؐ اللہ اور آپؐ کے پیروکاروں کے خلاف۔

غزوہ بنو نضیر (۱۱۹)

جب رسولؐ اللہ کو عمرو بن امیہ کے ہاتھوں دو آدمیوں کے قتل کا پتا چلا تو آپؐ نے فرمایا کہ ''کہ تم نے دو آدمی قتل کیے ہیں اب مجھے ان کے قصاص میں رقم دینی پڑے گی''۔ عمرو جو مدینہ کی دہشت گردی میں باقی ماندہ شخص تھے انہیں اس معاہدے کا علم نہ تھا جو محفوظ راستے کے سلسلے میں جناب رسولؐ اللہ اور مقتول اشخاص کے قبیلے والوں کے درمیان ہوا تھا یعنی بنو عامر کے ساتھ۔

چونکہ جناب رسولؐ اللہ اور بنو نضیر حلیف تھے بنو عامر کے، اس لیے یہ خون بہا کی رقم جناب رسولؐ اللہ اور بنو نضیر کو مل کے ادا کرنی تھی۔ اس لیے آپؐ بنو نضیر کے پاس گئے کہ ان سے خون بہا کا حصہ لیا جائے آپؐ کے ساتھ دس صحابہؓ بھی تھے جن میں ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور علی مرتضیٰؓ بھی شامل تھے۔

محمد بن اسحاق بن یاسر نے لکھا ہے کہ جب اللہ کے رسولؐ بنو نضیر سے ملے اور خون بہا کے حصے کے متعلق کہا تو انہوں نے بہت ہی بیہودہ جواب دیا اور کہا کہ ''ہاں اے محمدؐ! ہم تمہاری مدد کریں گے کیونکہ تم نے ہمیں مدد کے لیے کہا ہے''۔ اور جب وہ آپس میں ملے تو ایک دوسرے سے کہنے

لگے (خفیہ طریقے سے) کہ تم اس سے بہتر موقع نہ پا سکو گے، اس شخص کے لیے (یعنی ختم کرنے کے لیے)۔ پھر جب جناب رسولؐ اللہ ان کے ایک مکان کی دیوار کے ساتھ تشریف فرما تھے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ کون اس دیوار کے اوپر چڑھے گا اور اس شخص پر پتھر پھینکے گا، اس سے ہمیشہ کے لیے نجات پانے کے لیے۔ اس پر عامر بن جحش بن کعب نے اس کام کی حامی بھر لی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو فوراً ان کے ارادے کی آگاہی بخشی۔ جس پر آپؐ فوراً اٹھے اور مدینہ کی راہ لی اور اپنے ساتھیوں کو بھی اطلاع نہ دی۔ جب صحابہؓ نے آپؐ کو نہ پایا تو پریشان ہو کر آپؐ کو ڈھونڈنے لگے۔ انہیں پتا چلا کہ آپؐ مدینہ میں داخل ہوتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ اس پر صحابہؓ بھی مدینہ چلے گئے اور وہاں جا کر انہیں اس شیطانی منصوبے کا علم ہوا۔

اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے اپنے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ جنگ کی تیاری کریں تا کہ بنو نضیر کی طرف رخ کیا جائے۔ اس طرح سے مسلمان اپنے پیغمبرؐ کی سربراہی میں تیار ہوئے، یہ چوتھی ہجری کا ماہ ربیع الاول تھا۔ آپؐ نے ام مکتوم کو اپنا نائب چھوڑا اور اپنے مشن پر روانہ ہوئے۔ لیکن ریکارڈ میں یہ پتا نہیں چلا کہ اس غزوہ کے شرکاء کی تعداد کیا تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے آپؐ نے محمد بن مسلمہ کے ذریعے بنو نضیر کو پیغام بھیج دیا تھا کہ بنو نضیر اپنی شرارت اور ذلت آمیز منصوبے کی پاداش میں دس روز کے اندر اندر مدینہ چھوڑ دیں۔ کیونکہ انہوں نے جناب رسالت مآبؐ کو قتل کرنے کی سازش کر کے میثاق مدینہ سے غداری کی ہے۔

جب انہیں یہ اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے قلعوں میں اپنے آپ کو محصور کر لیا۔ ادھر جناب رسولؐ اللہ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ وہ کھجور کے درختوں کو کاٹ کر آگ لگا دیں جس پر یہود زور سے چیخے ''اے محمدؐ! آپ تو زمین پر فساد کرنے سے منع کرتے تھے اور جو ایسا کرتے تھے انہیں برا کہتے تھے، اب آپ نے خود ہی ایسا کیوں کیا؟'' اسی دوران عبداللہ بن ابی بن سلول، وادیاہ، مالک بن ابی قوقل، سوید، داعس اور بہت سے دیگر بنو خزرج اور بنو عوف سے تعلق رکھنے والوں نے بنو نضیر کو پیغام بھیجا کہ وہ مستحکم رہیں، وہ انہیں بے آسرا نہ چھوڑیں گے۔ انہوں نے یہ پیغام بھی دیا کہ اگر تم لڑو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ لڑیں گے اور اگر تمہیں مدینہ سے زبردستی نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔

لہٰذا بنو نضیر کے یہود ان کی مدد کا انتظار کرنے لگے لیکن منافقوں نے وعدہ وفا نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ

نے پھر یہود کے دلوں میں خوف پیدا فرمادیا اور انہوں نے جناب رسالت مآبؐ سے درخواست کی کہ انہیں محفوظ راستہ فراہم کیا جائے تاکہ وہ مدینہ چھوڑ سکیں۔ اس پر انہیں یہ بھی اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنا اتنا مال و اسباب اپنے ساتھ لے جانے کے مجاز ہیں، جتنا کہ ان کے ایک اونٹ پر آسکے، اسلحہ کے علاوہ۔ ان کی یہ درخواست منظور ہونے کے بعد انہوں نے مدینہ چھوڑنا شروع کر دیا۔ کچھ خیبر کی طرف روانہ ہوئے اور کچھ نے ملک شام کی راہ لی۔ ان میں دو فل یہود نے اپنی ساری جائیداد بچالی اسلام قبول کرنے کے بعد، وہ تھے یامین بن عمیر اور ابوسعد بن وہب۔

اس طرح سے یہود ایک اونٹ پر جتنا سامان آسکتا تھا لاد کر لے گئے اور باقی ماندہ سامان اور جائیداد کو آگ لگا گئے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحشر (۵۹) کی آیت (۲) میں فرمایا کہ "وہ (اللہ) جس نے کافروں کو باہر نکال بھگایا جو اہل کتاب میں سے تھے (یعنی بنو نضیر کے یہود) ان کے گھروں سے پہلے مرحلے میں۔ تم نے یہ خیال تک نہ کیا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے اور انہوں نے سوچا تھا کہ ان کے قلعے انہیں اللہ سے محفوظ رکھیں گے۔ لیکن اللہ کا عذاب ان تک پہنچا اس جگہ سے جہاں سے انہیں توقع ہی نہ تھی اور اس نے (اللہ نے) خوف طاری کیا ان کے دلوں پر اس طرح کہ انہوں نے اپنے ہی گھروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے اور ایمان والوں کے ہاتھوں سے تباہ کرلیا تو پھر عبرت پکڑو تم اپنی آنکھوں سے (اپنے حال کو دیکھ کر)"۔

اللہ جل شانہٗ نے کافروں کو یاد دلایا کہ ان کی اللہ کے رسولؐ کے ساتھ دشمنی کی اصل وجہ ان کی اپنی دولت اور جائیداد تھی جس کے لیے انہوں نے پوری زندگی جد وجہد کی، لیکن ان کی بدبختی کہ انہیں اپنی دولت خود اپنے ہی ہاتھوں تباہ کرنی پڑی۔ بے شک یہ ان کے کفر کا نتیجہ تھا اور اس شرارت کا جو انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف کی۔

اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا سورۃ الحشر (۵۹) کی آیت (۳) میں کہ: "اگر اللہ نے ان کی تقدیر میں یہ جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو وہ ان کو یقیناً اس دنیا میں شدید سزا دیتا اور آخرت میں تو ان کے لیے آگ کا عذاب ہے"۔

اس کے علاوہ رسول اللہؐ کا وہ فعل جسے یہودیوں نے خاص طور پر کہا تھا کہ یہ آپ نے کیوں کیا، اس کے لیے آپ دوسروں کو منع کرتے ہیں اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورہ

الحشر (۵۹) کی آیت (۵) میں فرمایا کہ "کیا ہوا جو تم نے (اے محمدؐ) الیناہ (Linah) کو کاٹ پھینکا (ایک عمدہ قسم کی کھجور کا درخت) یا انہیں کھڑا رہنے دیا، ان کے تنوں پر یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے تھا اس لیے کہ وہ باغیوں کو اور اللہ کے نافرمانوں کو ذلت سے ہمکنار کرے"۔

(۱۲۰) جنگ بدر دوئم

ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا کہ ابوسفیان نے جنگ احد کے بعد یہ دھمکی دی تھی کہ وہ پھر اگلے برس ان پر حملہ کرے گا۔ جس کے لیے مدینہ کے منافقین نے انہیں یاد دلایا، لیکن وہ اس حالت میں نہ تھا کہ حملہ کر سکے۔ اس غرض سے اس نے ایک شخص نعیم کو دس اونٹوں کے عوض مدینہ بھیجا تاکہ وہ وہاں جاکر خوف و ہراس کی فضا پیدا کر سکے، یہ ظاہر کر کے کہ ابوسفیان ایک بہت بڑی لڑائی کی تیاری کر رہا ہے، سو اس نے ایسا کیا۔

جناب رسول اللہؐ نے دیکھا کہ کچھ مسلمان خوفزدہ ہو گئے ہیں، اس پر آپؐ نے اظہار برہمی فرمایا اور قسم کھا کر کہا کہ وہ بدر جا کر اکیلے دشمن سے لڑنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہ برتیں گے۔ جناب رسول اللہؐ کی اس قسم کی وجہ سے مسلمانوں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ مفسرین نے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۷۵) کو نعیم کے شیطانی پروپیگنڈے کے حوالے کے سلسلے میں بتایا ہے۔ اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ "یہ صرف شیطان ہی تو ہے جو اپنے دوستوں سے تمہیں خوف دلاتا ہے، لہٰذا ان سے خوفزدہ مت ہو، بلکہ مجھ (اللہ) سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو"۔

لہٰذا جناب رسول اللہؐ پندرہ صد ساتھیوں کے ہمراہ مع دس زرہ بکتر گھوڑ سواروں کے بدر کی طرف روانہ ہوئے، یہ چوتھی ہجری کا ماہ شعبان تھا یعنی جنوری ۶۲۶ء۔ آپؐ نے جناب عبداللہ بن رواحہؓ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا اور علیؓ کو اپنا علمبردار۔ آپؐ نے بدر کے میدان میں ڈیرے ڈال دیے اور دشمن کا انتظار کرنے لگے۔

دوسری جانب ابوسفیان نے دو ہزار کی فوج کے ساتھ جس میں پچاس گھوڑ سوار تھے مدینہ کا رخ کیا۔ لیکن صرف دو دن کے سفر کے بعد وہ مجانہ کے پانی کے ذخائر کے پاس ٹھہر گیا اور وہاں سے مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ لگانے لگا۔ اس نے بلاشبہ یہ بھی اندازہ لگایا ہوگا کہ اسی میدان میں مسلمانوں کے (۳۱۳) نے قریش کے (۹۵۰) کو عبرتناک شکست دی تھی اور احد میں بھی

پہلے مرحلے میں ان کے سات صد نے قریش کے تین ہزار کو بھگا دیا تھا۔ اس وقت جبکہ ابو سفیان کی فوج (۲۰۵۰) پر مشتمل تھی، پھر وہ کس طرح سے (۱۵۰۰) کا مقابلہ کر سکتے تھے، اس سے پہلے کے تجربوں کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

ان لوگوں کی خوش قسمتی کہ ابو سفیان نے فیصلہ کیا کہ آگے نہ بڑھا جائے۔ لہٰذا اس نے اپنے لشکر سے خطاب کیا اور کہا کہ: "اے میرے ساتھیو! یہ دانشمندی نہ ہوگی کہ خشک سالی کے سال لڑائی کی جائے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ واپس چلا جائے، اور یہی تمہارے لیے بھی نصیحت ہے"۔ اس کے ساتھیوں نے بغیر کسی حیل و حجت کے اس کی نصیحت قبول کر لی اور واپس گھر کی راہ لی۔

ان کے برعکس جناب رسالت مآبؐ نے آٹھ روز تک ان کا انتظار کیا اور اس دوران میدان جنگ کو سالانہ میلے میں تبدیل کر دیا، اس طرح سے شرکاء کو کچھ آمدنی بھی ہوئی۔ جب آپؐ کو پتا چلا کہ دشمن واپس ہو گیا ہے تو آپؐ نے بھی عزت اور آبرو کے ساتھ واپس جانے کا قصد کیا۔ مسلمانوں کی یہ ہمت اور قریش کی بزدلی نے دوبارہ مسلمانوں کے وقار کو بلند کر دیا۔

(۱۴۱) غزوہ دومۃ الجندل

پانچویں ہجری کے ماہ ربیع الاول یعنی اگست ۶۲۶ء میں جناب رسالت مآبؐ کو پتا چلا کہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا ایک گروہ دومۃ الجندل کے مقام پر اکٹھا ہو رہا ہے، یہ مقام شام کی سرحد پر واقع تھا۔ اسی وقت جناب رسولؐ اللہ ایک ہزار ساتھیوں کے ہمراہ ان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گئے۔ چونکہ یہ بہت گرم موسم تھا اس لیے آپؐ صرف رات کے وقت ہی سفر کرتے اور دن کے وقت قیام پذیر رہتے۔ ڈاکوؤں کو کسی طور آپؐ کی آمد کا پتا چل گیا لہٰذا وہ کسی نامعلوم جگہ پر چھپ گئے اور اپنے مویشی وہیں چھوڑ گئے۔ آپؐ نے وہاں کچھ روز رک کر ان کی تلاش جاری رکھی لیکن وہ نہ مل سکے۔ لہٰذا آپؐ ان مویشیوں کے ہمراہ واپس آ گئے۔ واپسی پر آپؐ عیینہ بن حزن کے قبیلہ کے پاس رکے اور ان سے امن کا معاہدہ کیا۔

(۱۴۲) جناب رسول اللہ کا سیدہ زینب بنت خزیمہ سے نکاح

سیدہ زینبؓ کی شادی جناب عبیدہ بن حارثؓ سے ہوئی تھی جو بدر میں شہادت پا گئے تھے۔ جناب رسالت مآبؐ نے تیسری ہجری کے ماہ رمضان یعنی ۶۲۵ء میں سیدہ کو پیام بھیجا اور نکاح

کر لیا۔ لیکن آٹھ ماہ بعد ہی سیدہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہ آپ دوسری زوجہ تھیں جو آپ کی حیات میں ہی وفات پا گئیں۔ خاتون بہت رحمدل اور سخی تھیں غربا و مساکین کا دکھ درد بانٹنے کی وجہ سے آپ کو لوگ "اُم المساکین" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آپ کو یہ خطاب آپ کے اسلام قبول کرنے سے پہلے ہی مل چکا تھا۔

(۱۴۳) جناب رسول اللہ کا سیدہ اُم سلمہؓ سے نکاح

سیدہ کا نام ہند تھا اور آپ ابی امیہ بن مغیرہ کی صاحبزادی تھیں۔ جناب رسالت مآبؐ سے نکاح سے قبل آپ کا نکاح آپ کے چچا زاد عبداللہ بن عبدالاسد سے ہوا تھا جو عام طور پر ابو سلمہ کہلاتے تھے۔ اپنی شادی کے بعد آپ دونوں حبشہ ہجرت کر گئے تھے جب اہل مکہ نے ایمان والوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ ان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ جنگ احد کے دوران ابو سلمہ شدید زخمی ہو گئے تھے لیکن اسی حالت میں یعنی ابھی تک آپ کے زخم پوری طرح نہ بھرے تھے کہ آپ کو قطن الاسد کے مشن پر جانا پڑا۔ جس کی وجہ سے آپ کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے اور آپ اس کی وجہ سے شہادت پا گئے۔ جناب رسولؐ اللہ کو ان سے بہت محبت تھی اور ان کے زخموں کی تکلیف دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔

ان کی وفات کے بعد ان کی بیوہ کو آپؐ نے پیام بھیجا جس پر سیدہ نے کہا کہ وہ چار بچوں کی والدہ ہیں اور کافی عمر رسیدہ بھی۔ جناب رسولؐ اللہ نے ان کی عمر اور ان کے بچوں کو قبول فرمایا اور ان کا کافی خیال بھی رکھا۔

(۱۴۴) غزوہ بنو مُصطلق یا غزوہ مُریسیع

بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضرار نے اپنے قبیلے کو مدینہ کے خلاف اکٹھا کیا ہوا تھا اور یہ پانچویں ہجری کا ماہ شعبان یعنی دسمبر/جنوری ۶۲۶/۶۲۷ء تھا۔ جناب رسولؐ اللہ نے اس کے متعلق تصدیق کر لی، جب تصدیق ہو گئی تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مریسیع کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ جس کا مقابلہ کرنے کی مصطلق میں جرأت نہ ہوئی اور وہ اپنے قبیلہ سمیت وہاں سے بھاگ گیا۔ لیکن مریسیع کے لوگوں نے آپؐ سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا اور تھوڑی دیر کی

گھمسان کی لڑائی کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ دوران جنگ ایک مسلمان ہشام بن صبا غلطی سے اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھ قتل ہو گئے اور شہادت پائی۔ جبکہ دشمن کے دس قتل ہوئے اور ان میں سے چھ سو قیدی بنے۔ جبکہ دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئے۔ گو کہ یہ معرکہ کچھ بڑا نہ تھا لیکن اس دوران واپسی پر کچھ ایسے حادثاتی واقعات رونما ہوئے جس پر بہت ضروری احکامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔

(۱۲۵) اُبیّ کے جناب رسولؐ اللہ کے متعلق نازیبا الفاظ

محمد بن اسحاق نے لکھا کہ محمد بن یحییٰ بن حبان، عبداللہ بن ابی بکر اور عاصم بن عمر بن قتادہ نے بنو مصطلق کی کہانی بیان کی اور کہا کہ جب جناب رسولؐ اللہ غزوہ مُسیری کی جگہ پر مقیم تھے تو دو شخص جاہجاہ بن سعید غفاری (عمر بن خطابؓ کا ملازم) اور سنان بن وبر ایک پانی کے ذخیرے پر جھگڑ پڑے۔ جہاں سنان نے انصار کو اور جاہجاہ نے مہاجرین کو پکارا۔ اس وقت انصار کا ایک گروہ عبداللہ بن ابی بن سلول کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جب انہوں نے وہ پکار سنی تو اس پر عبداللہ بن ابی نے اپنی رائے زنی کی اور کہا کہ یہ لوگ ہمیں ہماری ہی زمین پر تنگ کر رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! ان بیوقوف قریشوں کی اور ہماری مثال ایسی ہے کہ تم اپنے کتے کو اتنا کھلاؤ کہ وہ اتنا طاقتور ہو جائے کہ تمہیں ہی کھا جائے۔ اللہ کی قسم! جب ہم واپس مدینہ جائیں گے تو طاقتور کمزور کو وہاں سے نکال دے گا۔ پھر اس نے اپنے لوگوں سے خطاب کیا جن کے ساتھ وہ بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے ان کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ تم نے انہیں اپنی زمین پر آباد کیا اور اپنی دولت ان سے بانٹی۔ اللہ کی قسم! اگر تم انہیں چھوڑ دو گے تو وہ کسی اور جگہ جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

زید بن ارقمؓ نے جناب رسولؐ اللہ کو اس واقعہ کے متعلق بتایا۔ عمر بن خطابؓ نے جو جناب رسولؐ اللہ کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے جناب رسالت مآبؐ سے اجازت چاہی کہ: "آپؐ اجازت دیں تو میں عبداللہ بن ابی کی گردن اڑا دوں"۔ اس پر جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا: "پھر کیا ہو، اگر لوگ یہ کہیں کہ محمدؐ اپنے ہی لوگوں کو مروا دیتا ہے؟ اے عمر! نہیں"۔

جب عبداللہ بن ابی کو پتا چلا کہ اس کی باتوں کا علم جناب رسولؐ اللہ کو ہو گیا ہے تو وہ آپؐ کے پاس گیا اور اپنے بیان سے مکر گیا اور قسم کھا کر کہا کہ: "ہو سکتا ہے کہ اس نوجوان لڑکے نے

(زید بن ارقمؓ) اپنی طرف سے ہی اندازہ لگایا ہو اور میری بات ٹھیک سے سنی نہ ہو"۔

جب رسولؐ اللہ نے اپنا سفر واپس مدینہ کے لیے اچانک شروع کیا تو اس وقت ایک شخص اُسید بن حضیر آپؐ کے پاس گیا اور آپ کی خدمت میں سلام عرض کی اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا اور کہا کہ: "اللہ کی قسم! آپ غیر مناسب وقت پر اپنا سفر شروع کر رہے ہیں"۔ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "کیا تم نے سنا نہیں اپنے دوست عبداللہ بن ابی کی بات؟ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ مدینہ واپسی پر طاقتور کمزور کو باہر نکال دے گا"۔

اُسید نے کہا: "بیشک آپؐ ہی طاقتور ہیں، اے اللہ کے پیغمبر! اور وہ ذلیل ہے۔ اس نے مزید کہا آپؐ اس کی باتوں کا بُرا نہ منائیں۔ اے اللہ کے پیغمبر! اللہ کی قسم! جب ہم لوگ آپؐ کو اپنے پاس لائے تو ہم اس وقت اس کے لیے موتی اکٹھے کر رہے تھے اور اسے اپنا بادشاہ بنا رہے تھے، چنانچہ اس کا خیال ہے کہ آپؐ کی وجہ سے وہ بادشاہت سے محروم رہ گیا"۔

جناب رسالت مآبؐ پوری رات اپنا سفر کرتے رہے اور اگلی صبح آپؐ نے رکنے کے لیے کہا۔ لوگ اتنا زیادہ تھکے ہوئے تھے کہ فوراً ہی سو گئے۔ اس وقت سورۃ منافقون کا نزول ہوا۔ جناب رسولؐ اللہ نے لوگوں کو سفر میں مشغول رکھا تا کہ وہ عبداللہ بن ابی کے بیان پر رنجیدہ یا مشتعل نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام سورۃ منافقون (۶۳) کی آیت (۷-۸) میں ہوا۔ اس میں فرمایا گیا کہ: "وہ ہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان پر خرچ نہ کرو، جو اللہ کے پیغمبر کے ساتھ ہیں جب تک کہ وہ انہیں نکال نہ دیں۔ اور اللہ ہی کے ہیں تمام خزانے زمین اور آسمانوں کے، لیکن منافق اس کو سمجھتے نہیں۔ وہ (منافق) کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ واپس جائیں گے تو عزت والے کمینوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔ لیکن عزت تو اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسولؐ کے لیے اور ایمان والوں کے لیے، لیکن منافقوں کو خبر نہیں"۔

عکرمہ اور ابن زید اور دوسروں نے کہا ہے کہ جب جناب رسولؐ اللہ اور ان کے ساتھی مدینہ پہنچے تو عبداللہ، عبداللہ بن ابی کا بیٹا شہر کے داخلے کی جگہ اپنی تلوار تھامے کھڑا تھا۔ لوگ اس کے نزدیک سے گزر رہے تھے اور جب اس کا باپ وہاں پہنچا تو اس نے اپنے باپ کو روک دیا اور شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ جب اس کے باپ نے اسے پوچھا کہ کیا ماجرہ ہے تو اس نے جواب دیا کہ: "اللہ کی قسم! تم اس وقت تک یہاں سے داخل نہ ہو سکو گے جب تک کہ

جناب رسولؐ اللہ اجازت نہ دے دیں۔ کیونکہ وہ عزت والے ہیں اور تم ذلیل''۔

جناب رسولؐ اللہ کے آنے پر ابی نے اپنے بیٹے کی شکایت کی تو بیٹے نے عرض کیا کہ ''اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسولؐ! یہ اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ اس کو اجازت نہ دے دیں''۔ پھر جناب رسولؐ اللہ نے اس کے باپ کو اجازت دی تو اس کے بیٹے نے اسے جانے دیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابی کے بیٹے نے اللہ کے رسولؐ سے کہا ''اے اللہ کے نبیؐ! مجھے بتایا گیا تھا کہ آپؐ نے میرے باپ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اللہ کی قسم! جس نے آپؐ کو سچائی کے ساتھ بھیجا ہے میں اپنے باپ کی نظروں میں نظریں ڈال کر نہیں دیکھتا اس کی عزت کی وجہ سے۔ لیکن اگر آپؐ چاہتے ہیں تو میں اس کا سر آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں کیونکہ میں نفرت کرتا ہوں کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو دیکھوں''۔ جناب رسالت مآبؐ جو دنیا میں سب سے زیادہ رحم دل شخص اور بہت ہی صبر کرنے والے تھے، انہوں نے جواب دیا کہ وہ رحم کرنا اور بردباری کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور وہ کوشش کریں گے کہ اس کے والد کا کردار بہتر ہو جائے۔

(۱۲۶) جناب رسالت مآبؐ کی سیّدہ جویریہؓ سے شادی

ابن اسحاقؒ نے سیدہ عائشہؓ کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ جب جناب رسالت مآبؐ نے بنو مصطلق کے قیدی تقسیم فرمائے تو ان میں سیدہ جویریہؓ بھی تھیں، جن کا اصلی نام بُرّہ بنت حارث بن ابی ضرار تھا، جو بنو مصطلق کا سردار تھا۔ قرعہ اندازی میں سیدہؓ کا نام ثابت بن قیس بن شمس کے لیے نکلا۔ وہ چونکہ سردار کی بیٹی تھیں اور بہت ہی پروقار اور بااثر شخصیت سے نوازی گئی تھیں اور ان کا انداز بھی شاہانہ تھا، انہوں نے پسند نہ فرمایا کہ وہ کسی کی کنیز بن کر رہیں۔ اس لیے انہوں نے ثابتؓ سے مکاتبت کر لی (یعنی اپنی آزادی کے لیے معاوضہ طے کر لیا) اس کے بعد آپ نے جناب رسولؐ اللہ سے مدد کی غرض سے ملاقات چاہی۔ چونکہ اس روز جناب رسالت مآبؐ سیدہ عائشہؓ کے ہاں قیام پذیر تھے اس لیے سیدہ نے فرمایا کہ جیسے ہی میں نے اس (جویریہؓ) پر نظر ڈالی جب وہ میرے دروازے پر آئیں تو میں نے ایک خاص ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ جناب رسولؐ اللہ بھی اسے ایسے ہی دیکھیں گے جیسا کہ میں نے دیکھا ہے (ان کا مطلب تھا کہ جناب رسولؐ اللہ بھی ان کی شخصیت سے ویسے ہی متاثر ہوں

گے جیسا کہ وہ ہوئی تھیں)

پس وہ اندر داخل ہوئیں اور اپنا تعارف کرانے کے بعد انہوں نے آپؐ سے مدد کے لیے کہا۔ جس کے جواب میں اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ''کیا تم اس سے زیادہ بہتر چیز قبول کرو گی؟ کہ میں تمہاری طرف سے معاوضہ ادا کر دوں اور تم سے شادی کر لوں''۔ اس پیشکش کو سیدہ نے فوری طور پر منظور کر لیا۔ بے شک یہ ان کے لیے نہایت باعث عزت و افتخار تھا کہ وہ جناب رسولؐ اللہ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ کیونکہ آپؐ اس وقت ایک طاقتور قوم کے سردار بھی تھے اور یہ بات اس وقت عرب کے سماج میں قابل فخر بھی جاتی تھی کہ کوئی خاتون کسی سردار کی زوجہ بنے۔

اس دوران سیدہ جویریہؓ کے والد بھی جناب رسولؐ اللہ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ مکاتبت کی رقم لے کر وہ ان کی بیٹی کو ان کے حوالے کر دیں۔ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ اس بات کا فیصلہ صرف ان کی بیٹی ہی کر سکتی ہیں۔ اس پر سیدہؓ نے جناب رسالت مآبؐ کے پاس رہنے کا فیصلہ ہی برقرار رکھا۔ بعد ازیں سیدہؓ کے والد بھی اسلام لے آئے۔ اور جب اہل مدینہ کو پتا چلا کہ جناب رسالت مآبؐ نے سیدہ جویریہؓ سے عقد فرمایا ہے تو انہوں نے اس رشتے داری کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب نہ سمجھا کہ ام المومنین سیدہ جویریہؓ کے رشتہ داروں اور قبیلہ کے لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھیں۔ لہٰذا انہوں نے ان تمام غلاموں کو آزاد کر دیا اور کہا کہ وہ کبھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ وہ رسول اللہؐ کے گھر والوں کے رشتہ داروں اور عزیزوں کو اپنا غلام بنائیں۔ اس طرح سے وہ چھ صد حضرات و خواتین بغیر کسی معاوضہ کے باعزت طور پر آزاد کر دیے گئے۔ مسلمانوں کے اس عمل فیاضی سے وہ سب کے سب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس بات پر سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ ''میں کسی ایسی خاتون کو نہیں جانتی جو اپنی قوم کے لیے اتنی برکات اور فضل کا باعث بنی ہو سوائے جویریہؓ کے''۔

(۱۲۷) اِفک (جھوٹی افواہ) سیدہ عائشہؓ کے خلاف

اس واقعہ کو بیان کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ مالک حقیقی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور (۲۴) کی آیت (۱۱-۲۱) میں فرمایا جو سیدہ عائشہؓ ام المومنین اور اپنے

زمانے کی بہترین خاتون کی سچائی کی تصدیق کرتی ہیں۔ جب بہتان لگانے والے جھوٹے منافقین میں سے جھوٹ پھیلانے میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے اُم المومنین پر الزام تراشی کی تو اللہ تعالیٰ نے سیدہ عائشہؓ کی طرف سے اور اپنے رسولؐ کی طرف سے بیقراری کا اظہار فرمایا اور ان کی پاکیزگی اور طہارت بیان فرماتے ہوئے ان کی اور اپنے رسولؐ کی عزت و آبرو کو نہ صرف بچایا بلکہ ان کی پاکدامنی کی تصدیق فرمائی۔

سورۂ نور (۲۴) کی آیت (۱۱) میں فرمایا گیا ہے کہ ”بے شک! وہ لوگ جنہوں نے بہتان لگایا (سیدہ عائشہؓ کے خلاف) وہ تم میں سے ایک گروہ ہے۔ تم اسے بری چیز نہ جانو اپنے لیے اور نہ ہی یہ تمہارے لیے اچھی بات ہے۔ بے شک ان میں سے ہر شخص کو اپنے گناہ کی سزا بھگتنی پڑے گی اور ان لوگوں میں سے جس کا حصہ (اس گناہ میں) جتنا زیادہ ہے اتنا ہی زیادہ اسے عذاب ملے گا''۔

یہ آیت مبارکہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے جھوٹی افواہ پھیلائی اور ان میں سے سب سے زیادہ آگے تھا اُبی سردار منافقین جس نے جھوٹ گھڑا اور اور دوسروں تک کانا پھوسی کر کے پھیلا دیا۔ یہاں تک کہ چند ایک مسلمانوں نے بھی یقین کرنا شروع کر دیا اور کچھ نے خیال کیا کہ یہ ہو سکتا ہے اور اس کے متعلق گفتگو کی۔ یہ پریشان کن صورتحال ایک ماہ تک برقرار رہی جب تک کہ الہام کے ذریعہ سے اس کی تردید نہیں ہوگئی اور صورتحال کی وضاحت نہیں ہوگئی۔

امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ زہری نے کہا کہ سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، علقمہ بن وقاص اور عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود نے اس سے سیدہ عائشہؓ کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ جب بہتان لگانے والوں نے کہا اور بہتان لگایا (سیدہ عائشہؓ پر) اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی پاکیزگی بیان فرمائی اور ان میں سے ہر ایک نے اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہا۔ لیکن ان میں سے کچھ کو زیادہ تفصیلات سے آگاہی تھی۔ اس نے ان سب سے واقعہ سنا جنہوں نے بذات خود یہ واقعہ سیدہ عائشہؓ سے سنا تھا۔ اور انہوں نے کہا کہ سیدہ عائشہؓ نے فرمایا کہ ”جب جناب رسالت مآبؐ کسی سفر پر تشریف لے جاتے تو وہ اپنی ازواج میں قرعہ فرما کر ایک نام نکالتے اور انہیں اپنے ساتھ سفر میں لے جاتے۔ سو انہوں نے قرعہ نکالا اس سفر پر جس پر آپؐ نے جانا تھا

تو اس میں میرا نام آیا، سو میں آپؐ کے ساتھ روانہ ہوئی۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حجاب کے متعلق احکامات آچکے تھے، اس لیے میں نے اپنے حودہ (ڈولی) میں سفر کیا اور اسی میں قیام رکھا، راستے میں رکتے وقت۔ ہم نے اس وقت تک سفر کیا جب تک کہ رسولؐ اللہ نے اپنی مہم کی تکمیل کی اور پھر واپس روانہ ہوئے۔ جب ہم مدینہ کے نزدیک ہی تھے تو ہم تھوڑی دیر کے لیے رکے اور پھر اعلان ہوا کہ سفر شروع ہونے والا ہے۔ جب میں نے یہ اعلان سنا تو میں جلدی سے وہاں سے حاجت رفع کے لیے نکلی اور پھر واپس اپنے حودہ کے پاس آگئی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میرا نیکلس جو سنگ سلیمانی کا بنا ہوا تھا کہیں گر گیا ہے۔

اس لیے میں واپس وہیں گئی، اسے ڈھونڈنے کے لیے اور اس وجہ سے مجھے دیر ہوگئی۔ اس دوران جو لوگ میرا حودہ اونٹ پر رکھتے تھے، وہ آگئے اور انہوں نے حودہ اونٹ پر رکھ دیا اور یہ خیال کیا کہ میں اس کے اندر موجود ہوں۔ ان دنوں میں بہت زیادہ دبلی پتلی ہوا کرتی تھی، اس لیے انہوں نے حودہ کو ہلکا محسوس نہ کیا جب اسے اٹھایا اور جب تک مجھے نیکلس ملا وہ لوگ روانہ ہو چکے تھے (یعنی قافلہ والے) اور جب میں واپس پہنچی تو میں نے وہاں کسی کو بھی نہ پایا اور میری آواز پر بھی کوئی نہ آیا۔ اس لیے میں وہاں بیٹھ گئی اس امید پر کہ لوگ واپس آئیں گے جب انہیں پتا چلے گا کہ میں وہاں موجود نہیں۔ جب میں وہاں بیٹھی تو سو گئی۔ صفوان بن معطل سلیمانی ذکوانی اس سے پہلی رات کے وقت آرام کے لیے ٹھہر گیا تھا، اس لیے وہ قافلے سے پیچھے تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی صبح کے وقت تو وہ وہاں سے روانہ ہوا اور اس جگہ پہنچا جہاں میں تھی۔ اس نے دیکھا کہ کوئی شخص سو رہا ہے، جب وہ نزدیک آیا اور مجھے دیکھا تو اس نے کہا! ”اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون'' اس کے ان الفاظ کو سننے کے بعد میری آنکھ کھل گئی، اور میں نے اپنا منہ حجاب سے ڈھانک لیا۔ اللہ کی قسم! اس نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور میں نے اس کو اس کے علاوہ کچھ کہتے ہوئے نہیں سنا، سوائے اس کے ”اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون''۔ پھر وہ اونٹ کی نکیل پکڑ کر چل پڑا حتیٰ کہ ہم دوپہر کے وقت کاروان سے آملے۔

وہاں ایسے لوگ بھی تھے جو برباد ہوگئے، اس واقعہ سے جو میرے ساتھ پیش آیا اور جس میں سب سے زیادہ حصہ عبداللہ بن اُبی بن سلول کا تھا۔ جب میں مدینہ واپس پہنچی تو ایک ماہ تک علیل رہی اور لوگ باتیں کر رہے تھے اس کے متعلق جو باتیں افواہیں پھیلانے والوں نے

کی تھیں۔ لیکن مجھے کچھ معلوم نہ تھا ان باتوں کے متعلق۔ مجھے جس بات نے پریشان کر رکھا تھا وہ
یہ تھی کہ جب میں بیمار تھی تو میں نے رسولؐ اللہ میں اپنے لیے وہ مہربانی نہ پائی جو اس سے قبل ان
میں تھی۔ میری بیماری کی حالت میں آپؐ آتے اور کہتے "یہ کیسی ہے؟" اور یہی بات مجھے
پریشانی میں مبتلا کیے ہوئے تھی، میں نے یہ محسوس نہ کیا تھا اس وقت تک کسی غلط بات کے متعلق،
جب تک کہ میں ٹھیک ہونے کے بعد باہر نہ گئی، اُم مسطح کے ساتھ المناصی کی طرف رفاہ حاجت
کے لیے جہاں رات کے وقت خواتین جاتی تھیں۔ اس وقت تک گھروں میں بیت الخلاء نہ ہوا
کرتے تھے اور اہل عرب میں یہی دستور تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے رات کے وقت صحرا میں
جاتے۔ جب ہم گھر واپس آئیں تو اُم مسطح نے ٹھوکر کھائی اور اس کے ساتھ ہی کہا "مسطح تباہ
ہو"۔ میں نے اسے کہا "یہ تم نے کیا برے الفاظ کہے، کیا تم ایسے شخص کو برا بھلا کہہ رہی ہو جو بدر
میں شریک تھا"۔ اس نے کہا "یہ بھی خوب ہے کیا تمہیں نہیں پتا کہ اس نے کیا کہا ہے؟" میں
نے کہا: "اس نے کیا کہا؟" تو پھر اس نے مجھے بتایا جو افواہ پھیلانے والے لوگ کہہ رہے تھے
جس نے مجھے اور بیمار کر دیا۔ میں واپس گھر آئی تو اللہ کے رسولؐ گھر میں داخل ہوئے اور سلام
کرنے کے بعد کہا "یہ کیسی ہے؟" میں نے ان سے کہا: "کیا آپ مجھے اپنے والدین کے گھر
جانے کی اجازت دیں گے؟" اس وقت میں ان سے اس خبر کی تصدیق ان کی زبانی سننا چاہتی
تھی۔ جناب رسولؐ اللہ نے مجھے اجازت دے دی، اس لیے میں اپنے والدین کے گھر چلی گئی
اور اپنی والدہ سے پوچھا "اے میری ماں یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟" میری والدہ نے کہا
"صبر کرو، اللہ کی قسم کوئی ایسی خوبصورت عورت نہیں ہے جو اپنے خاوند سے پیار کی جاتی ہو اور اس
کی دوسری بیویاں سے لیکن لوگ اس میں عیب نکالتے ہوں۔ میں نے کہا، سبحان اللہ! کیا لوگ
واقعی ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ پھر میں تمام رات روتی رہی اور میرے آنسو نہ تھمتے تھے اور میں
بالکل بھی نہ سو سکی اور صبح ہو گئی اسی حالت میں۔ کیوں کہ اس دوران الہام بھی رکا ہوا تھا، اللہ کے
رسولؐ نے علیؓ اور اسامہ سے مشورہ طلب کیا کہ کیا وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں۔ اسامہؓ نے
اللہ کے رسولؐ سے کہا "وہ آپ کی بیوی ہے اور ہم اور کچھ نہیں جانتے اس کے متعلق سوائے
اچھائی کے"۔ لیکن علیؓ نے کہا، اے اللہ کے نبیؐ! اللہ تعالیٰ نے کوئی پابندی نہیں لگائی آپ پر اور
یہاں بے شمار عورتیں ہیں اس کے علاوہ۔ اگر آپ اس کی لونڈی سے پوچھیں گے تو وہ آپ کو

حقیقت سے آگاہ کر دے گی۔ سو آپؐ نے بریرہ کو بلوایا اور کہا اے بریرہ! کیا تم نے کبھی کوئی
ایسی چیز دیکھی ہے جس سے تمہیں عائشہؓ کے متعلق کوئی شک ہوا ہو۔ انہوں نے کہا "اس کی قسم
جس نے آپؐ کو سچائی کے ساتھ بھیجا میں نے کبھی بھی کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس کے لیے میں
ان پر کوئی الزام لگاؤں اس کے علاوہ کہ وہ نوجوان خاتون ہیں جو کبھی کبھی گہری نیند سو جاتی ہیں
اور گھر کے لیے گوندھا ہوا آٹا کھلا چھوڑ دیتی ہیں جسے گھریلو بکریاں آکے کھا جاتی ہیں"۔

اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ کھڑے ہوئے اور لوگوں سے خطاب کیا اور کہا کہ کون ہے جو
ان کے لیے عبداللہ بن اُبی بن سلول کے ساتھ معاملہ کر سکتا ہے؟ آپؐ جب منبر پر ہی تھے تو اللہ
کے رسولؐ نے فرمایا "اے مسلمانو! کون میری مدد کرے گا اس شخص کے خلاف جس نے مجھے تکلیف
پہنچائی میری شریک حیات کے خلاف افواہیں پھیلا کر۔ اللہ کی قسم! میں کچھ نہیں جانتا اپنی شریک
حیات کے متعلق سوائے اچھائی کے، اور لوگ الزام لگا رہے ہیں ایسے شخص کو جس کے متعلق میں
سوائے اچھائی کے اور کچھ نہیں جانتا اور وہ میرے گھر کبھی داخل نہیں ہوا میرے علاوہ"۔

اس پر سعد بن معاذ انصاریؓ کھڑے ہوئے اور کہا "اے اللہ کے نبیؐ! اللہ کی قسم میں آپؐ
کے لیے اس سے نمٹ لوں گا۔ اگر وہ اوس قبیلہ سے ہے تو میں اس کا سر قلم کر دوں گا اور اگر وہ
ہمارے بھائی خزرج قبیلہ سے ہے تو پھر مجھے بتائیں کہ کیا کیا جائے تو ہم ویسے ہی کریں
گے"۔ اس پر سعد بن عبیدہ کھڑے ہوئے جو خزرج کے سردار تھے اور اچھے آدمی تھے لیکن وہ قبائلی
برتری کے قائل تھے، انہوں نے سعد بن معاذ سے کہا "اللہ کی قسم! تم اسے قتل نہیں کرو گے اور تم
ایسا کر بھی نہ سکو گے"۔ پھر سعد بن معاذ کے چچازاد اُسید بن حضیر کھڑے ہوئے اور سعد بن
عبیدہ سے کہا تم جھوٹ بول رہے ہو، اللہ کی قسم! ہم اسے قتل کریں گے اور تم منافق ہو جو
منافقوں کے لیے بحث کر رہے ہو۔ پھر دونوں گروہ اوس اور خزرج ایک دوسرے پر ناراض
ہونے لگے اور جھگڑا شروع ہونے کو ہی تھا کہ اللہ کے رسولؐ نے انہیں خاموش کرایا اور پھر
جناب رسولؐ اللہ سمیت سب خاموش ہو گئے۔

اس روز میں (عائشہؓ) اتنا روئی کہ میرے آنسو تھم نہ سکے اور میں سو نہ سکی۔ میرے ماں
باپ نے خیال کیا کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا، اس طرح روتے روتے۔ جب وہ میرے پاس
بیٹھے ہوئے تھے اور میں رو رہی تھی، تو انصار کی ایک خاتون نے مجھ سے ملنے کی اجازت چاہی۔

میری اجازت کے بعد وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئی اور میرے ساتھ ہی رونے لگی۔ ہم جب اس حالت میں تھے تو جناب رسولؐ اللہ گھر میں داخل ہوئے اور اس حال میں ایک ماہ گزر چکا تھا اور انہیں اس بارے میں کوئی الہام بھی موصول نہیں ہوا تھا۔ اس وقت جناب رسولؐ اللہ نے تشہد تلاوت فرمائی اور کہا: "اے عائشہؓ! مجھے تمہارے بارے میں یہ ...... یہ ...... بتایا گیا ہے۔ اگر تم معصوم ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری پاک دامنی کے بارے میں ضرور الہام فرمائیں گے اور اگر تم سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اور معافی مانگو کیونکہ جب کوئی غلام اعتراف جرم کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی معافی کو قبول فرماتا ہے"۔ جب وہ کہہ چکے میرے آنسو مکمل طور پر تھم گئے اور اس کے بعد ایک آنسو تک نہ بہا۔ پھر میں نے اپنے والد سے کہا کہ وہ میری طرف سے رسولؐ اللہ کو جواب دیں تو انہوں نے کہا میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں رسولؐ اللہ کو کیا کہوں۔ تو میں نے اپنے والد سے کہا جو کچھ بھی کہنا تھا وہ انہوں نے کہہ دیا۔ حالانکہ میں ایک نوعمر لڑکی تھی جسے زیادہ قرآن بھی یاد نہ تھا، میں نے کہا "اللہ کی قسم! مجھے علم ہے کہ آپ نے اس کہانی کے متعلق اتنا زیادہ سنا ہے کہ یہ آپ کے ذہن میں سما گئی ہے اور آپ نے اس کا یقین کر لیا ہے۔ سو اگر میں کہوں گی بھی کہ میں بے قصور ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں معصوم ہوں لیکن آپ کو یقین نہ آئیگا۔ لیکن اگر میں کسی چیز کو قبول کر لوں گی آپ کے سامنے اور اللہ جانتا ہے کہ میں معصوم ہوں تو آپ میرا یقین کر لیں گے۔ اللہ کی قسم! میری سمجھ میں کوئی ایسی مثال نہیں آرہی جو میں پیش کروں، اس کے علاوہ کہ جو پیغمبر یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ آپ نے سورۃ یوسف (۱۲) کی آیت (۱۸) کا حوالہ دیا) "میرے لیے تو بس صبر ہی مناسب ہے اور یہ اللہ ہی ہے جس کی مدد اس (جھوٹ) کا مداوا کر سکتی ہے جس کا آپؐ نے ذکر کیا ہے"۔

"پھر میں نے اپنا چہرہ پھیر لیا اور بستر پر پڑ گئی۔ اللہ کی قسم! اس موقع پر میں مطمئن تھی کہ میں معصوم ہوں اور اللہ تعالیٰ اس کی تصدیق فرمائیں گے کہ میں معصوم ہوں۔ لیکن اللہ کی قسم! میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں قرآن نازل فرمائے گا جو ہمیشہ تلاوت کیا جائے گا، میری بابت۔ کیونکہ میں اپنی بابت بہت معمولی گمتی تھی، اللہ کی نظر میں یعنی میری اہمیت نہ تھی کہ میرے لیے اللہ سبحانہٗ قرآن میں ذکر فرمائیں۔ لیکن مجھے یہ امید تھی کہ جناب رسولؐ اللہ کوئی ایسا خواب دیکھیں گے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ میری معصومیت اور بے گناہی بابت

کر دیں گے۔ اللہ کی قسم! ابھی اللہ کے رسولؐ اس جگہ سے ہلے بھی نہ ہوں گے جہاں کہ وہ بیٹھے ہوئے تھے اور ابھی گھر سے کوئی گیا بھی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ پر ورود الہام فرمایا اور آپؐ اس حالت میں آگئے جو حالت الہام آنے کے وقت ہوتی تھی اور پسینے کے قطرے موتیوں کی مانند آپؐ سے نکلنے شروع ہو جاتے خواہ وہ سردیوں کا دن ہی کیوں نہ ہوتا۔ آپؐ کی یہ حالت الہام کے الفاظ کی جلالت کی وجہ سے ہوتی۔ جب جناب رسولؐ اللہ اس حالت سے باہر آئے تو آپؐ کے چہرہ انور پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور جو پہلی بات آپؐ نے کی وہ یہ تھی، "خوش ہو جاؤ، اے عائشہؓ! اللہ تعالیٰ نے تمہاری معصومیت کا اعلان کر دیا"۔ میری والدہ نے مجھ سے کہا اٹھو اور ان کے پاس جاؤ (یعنی اظہار تشکر میں)۔ میں نے کہا اللہ کی قسم! میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی اور اس معاملہ میں کسی کی تعریف نہ کروں گی سوائے اللہ کے، جو بڑی بلند شان کا مالک ہے اور صرف اسی نے میری معصومیت کی تصدیق فرمائی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس وقت سورۃ نور (۲۴) کی آیت (۱۱) کا نزول فرمایا اور پھر اس آیات کا مسلسل ورود ہوتا چلا گیا میری پاکدامنی کے بارے میں"۔

ابوبکر صدیقؓ جو مسطح بن اثاثہ پر اللہ کے نام پر خرچ کرتے تھے، ان کی غربت کی وجہ سے اور ان سے ان کی رشتے داری بھی تھی، انہوں نے اس بارے میں کہا "اللہ کی قسم! میں کبھی بھی اس پر کوئی خرچ نہیں کرونگا، اس وجہ سے کہ جو کچھ بھی اس نے عائشہؓ کے خلاف کہا ہے"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت (۲۲) سورۃ نور کی نازل فرمائی جس میں فرمایا گیا کہ: "اور ان لوگوں کو تم میں سے جنہیں اللہ نے نوازا ہے اور ان پر اپنا فضل و کرم کیا ہے دولت کے ذریعے، انہیں زیب نہیں دیتا قسم کھانا کہ وہ اپنے رشتے داروں کی مدد نہیں کریں گے اور مساکین کی اور ان کی جنہوں نے اللہ کی خاطر اپنے گھر چھوڑے۔ انہیں چاہیے کہ وہ انہیں معاف کر دیں اور ان سے درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں معاف کر دے؟ اور اللہ تو بہت ہی معاف کرنے والا اور بہت ہی رحم کرنے والا ہے"۔

تو اس پر ابوبکرؓ نے کہا "اللہ کی قسم! میں یقینی طور پر پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادیں"۔ تو انہوں نے پھر سے مسطح پر خرچ کرنا شروع کر دیا جس طرح کہ وہ اس سے قبل خرچ کرتے تھے اور انہوں نے کہا کہ: اللہ کی قسم! میں اس پر خرچ کرنا کبھی بھی بند نہ کروں گا"۔

جناب رسولؐ اللہ نے زینبؓ بن جحش سے میری صورتحال کے بارے میں فرمایا اور کہا

"اے زینب! تم کیا جانتی ہو اور تم نے کیا دیکھا ہے (عائشہؓ کے بارے میں)"۔ انہوں نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ! اللہ تعالیٰ میری سماعت کو محفوظ رکھے اور میری بصارت کو بھی، اللہ کی قسم! میں کچھ نہیں جانتی سوائے اچھائی کے"۔ اور وہ ہی ایسی تھیں جو اپنا مقابلہ مجھ سے کرتی تھیں، رسولؐ اللہ کی بیویوں میں سے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا جھوٹ بولنے سے ان کی پرہیزگاری کی وجہ سے۔ لیکن ان کی بہن حمنہ بنت جحشؓ ان کی طرف سے لڑتی رہیں، سو وہ بھٹک گئیں دوسرے بھٹکنے والوں کے ساتھ۔ پھر اللہ کے رسولؐ نے اللہ کی طرف سے دی گئی سزا اسی (۸۰) کوڑوں کی ان لوگوں کو سنائی (۱) مسطح بن اثاثہ (۲) حسان بن ثابت اور (۳) حمنہ بنت جحش، کہ انہوں نے جھوٹی افواہ یعنی افک پھیلایا سیدہ عائشہؓ کے خلاف یعنی آپ پر تہمت لگائی اور یہ سزا اللہ تعالیٰ نے سورۃ نور (۲۴) کی آیت (۴) میں نافذ فرمائی تھی۔

(۱۲۸) اسلامی فقہ میں قوانین کا اجرا

۱) زنا کی سزا (سورۃ نور ۲۴، آیت ۲)
۲) پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کی سزا (سورۃ نور ۲۴، آیت ۴)
۳) قوانین لیان: زنا کی تہمت پر اپنی سچائی کے لیے قسم اٹھانا (سورۃ نور ۲۴، آیت ۶-۹)
۴) گھروں میں داخل ہونے کے آداب (سورۃ نور ۲۴، آیت ۲۷-۲۸)
۵) مردوں کے لیے نظروں کو جھکانے اور عصمتوں کی حفاظت کا حکم (سورۃ نور ۲۴، آیت ۳۰)
۶) خواتین کے لیے حجاب کے قوانین (سورۃ نور ۲۴، آیت ۳۱)
۷) عورتوں کے گلی بازاروں میں چلنے کے آداب (سورۃ نور ۲۴، آیت ۳۱)
۸) نکاح کرنے کا حکم (سورۃ نور ۲۴، آیت ۳۲)
۹) پاکدامنی اختیار کرنے کا حکم (سورۃ نور ۲۴، آیت ۳۳)
۱۰) غلاموں کو آزادی حاصل کرنے کے لیے اختیار (سورۃ نور ۲۴، آیت ۳۳)
۱۱) کنیز کو طوائف بنانے کی ممانعت (سورۃ نور ۲۴، آیت ۳۳)
۱۲) صلوٰۃ کا حکم، زکوٰۃ کا حکم اور رسولؐ اللہ کی اطاعت کا حکم (سورۃ نور ۲۴، آیت ۵۶)
۱۳) عمر رسیدہ خواتین کو حجاب سے مستثنیٰ قرار دینا (سورۃ نور ۲۴، آیت ۶۰)

۱۴) عزیز و رشتہ داروں کے گھروں میں کھانے کی اجازت (سورۃ نور ۲۴، آیت ۶۱)
۱۵) جناب رسولؐ اللہ کو مخاطب کرنے کے آداب (سورۃ نور ۲۴، آیت ۶۳)
۱۶) جناب رسولؐ اللہ کے حکم کے بغیر آپؐ کی مجلس چھوڑنا (سورۃ نور ۲۴، آیت ۶۲)
۱۷) اللہ اور اس کے رسولؐ کی تابعداری کی فرضیت (سورۃ نور ۲۴، آیت ۵۱-۵۲)
۱۸) اللہ کا وعدہ پرہیزگاروں کے لیے، انہیں اختیارات کا جانشین بنانے کے لیے (سورۃ نور ۲۴، آیت ۵۵)

نوٹ: اس مضمون کے نقطہ اول کے متعلق یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھا گیا ہے کہ سورۃ نور کی آیت (۲) کے مطابق یک صد کوڑوں کی سزا غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے لیے ہے۔ جبکہ شادی شدہ کے لیے سنگساری کی سزا، (بخاری اور مسلم کے مطابق) جناب رسول اللہ کے فرمان کے مطابق ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ سزا جناب موسیٰ کی شریعت کے مطابق جو یہودی اور عیسائی قوم کے لیے فرض تھی، اسی سزا کو اسلام میں بھی برقرار رکھا گیا۔

(۱۲۹) جنگ احزاب (حلیف قبائل) یا جنگ خندق

(الف) ریاست مدینہ کے خلاف کفار کا اتحاد:

جنگ احزاب کا واقعہ پانچ ہجری کی ماہ شوال اور ذیقعدہ یعنی فروری اور مارچ ۶۲۷ء میں وقوع پذیر ہوا۔ جبکہ تمام کے تمام مشرکین عرب مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہی کر دیا جائے۔ کیونکہ مسلمان ان کے تہذیب وتمدن، ان کے اعتقادات اور ان کے اجداد کے اصولوں کے خلاف اور ان کے خداؤں کے منکر تھے۔ ان مشرکوں کو اہل کتاب میں سے اہل یہود نے بھی معاونت کی پیشکش کر دی اور ان کے ساتھ مل گئے۔ وہ تو پہلے ہی سے اللہ کے رسولؐ کے خلاف تھے کیونکہ انہیں کوئی بھی راہبر خواہ وہ پیغمبر ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو اپنی قوم کے علاوہ گوارہ نہ تھا اور پھر ان کے ایک قبیلہ بنو نضیر کو جب مدینہ بدر کیا گیا تو اس کے بعد ان کے جذبات اور دشمنی اور زیادہ بھڑک اٹھی اور ان کی اکثریت خیبر کے یہودیوں کے ساتھ مل گئی۔ لہٰذا ان کے سرداروں کا ایک گروہ جس میں

سلام بن ابو حقیق، سلام بن مشکم، حیی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع شامل تھے، مکہ گئے اور سرداران قریش کو بھڑکایا، جناب رسولؐ اللہ کے خلاف۔ اور انھیں اپنی مدد کا یقین بھی دلایا اگر وہ مسلمانوں کے خلاف حملہ کرنے آئے۔ جس پر قریش نے اظہار اتفاق کیا۔ اس کے بعد یہودی سردار غطفان کے قبیلہ کے پاس گئے اور انھیں بھی ویسی ہی پیشکش کی اور ساتھ ہی خیبر کی فصلوں کی پیداوار سے آدھا حصہ بطور اجرت دینے کا وعدہ بھی کیا۔ قبل غطفان نے اپنے حلیف بنو اسد کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور انھیں اپنے حصہ میں سے آدھا حصہ دینے کا وعدہ کیا۔ اہل قریش نے اور بہت سے دیگر قبائل کو اسی مقصد کے لیے اپنے ساتھ ملا لیا اس طرح سے یہودیوں نے مشرکین کو اکٹھا کر کے ایک اتحاد قائم کر لیا اور پھر تمام عرب کے یہود اور مشرکین کا اتحاد مدینہ کے مسلمانوں کے خلاف سرگرم ہو گیا۔

(ب) اتحادیوں کی تیاری:

یہودیوں اور قریش نے جنگ کی تیاری کے لیے کافی رقم اکٹھی کر لی۔ اہل ثروت ہونے کی وجہ سے یہودیوں نے دل کھول کے اپنا حصہ ڈالا اور پھر دس ہزار کی کثیر فوج تیار ہو گئی جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

i) قریش کی فوج ابوسفیان کی سربراہی میں
   1) پیدل فوج ۴۰۰۰ چار ہزار
   2) زرہ بکتر گھوڑوں کا رسالہ ۳۰۰۰ تین ہزار
   3) اونٹوں کا رسالہ ۱۰۰۰ ایک ہزار
   4) راشن ۱۵۰۰ ڈیڑھ ہزار اونٹوں پر لدا ہوا۔
ii) فوجی دستے جن کا تعلق بنو فزارہ اور غطفان سے تھا اور وہ عیینہ بن حزن کی کمان میں تھے ان کی تعداد ۱۰۰۰ سپاہی اور ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھی۔
iii) اشجع قبیلہ کے ۴۰۰ سپاہی مسعود بن رخیلہ کی کمان میں۔
iv) بنو مرہ قبیلہ کے ۴۰۰ سپاہی حارث بن عوف کی کمان میں۔
v) بنو سلیم قبیلہ کے ۷۰۰ سپاہی سفیان بن عبد شمس کی کمان میں۔

تمام فوج کا کمانڈر انچیف ابوسفیان تھا۔ جب یہ فوج مدینہ کی طرف روانہ ہوئی تو راستے

میں بنو سعد اور بنو اسد نے بھی ان کے ساتھ شرکت کر لی، اس کے بعد ان کی تعداد دس ہزار سے بڑھ گئی، اہل عرب کی تاریخ میں سب سے زیادہ۔ یہ تمام کی تمام تیاری اور مدینہ پر حملہ بہت ہی خفیہ رکھا گیا تاکہ مسلمانان مدینہ کو ایک بہت ہی خوفناک حیرانگی کا سامنا کرنا پڑے۔

(ج) جناب رسالت مآبؐ کا ردعمل:

اس لشکر کی یلغار کی خبر جیسے تیسے مدینہ پہنچ گئی اور بہت سے مسلمان اس سے خوفزدہ بھی ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا خوف پسند نہ آیا۔ چنانچہ سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۱۱) کا نزول ہوا، جس میں فرمایا گیا کہ "ایمان والے آزمائے گئے اور شدت کے ساتھ ہلا دیے گئے (یعنی ایک بڑے لشکر کے ذریعہ)"۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے برے خیالات اور جذبات کا اظہار فرمایا اور ساتھ ہی کمزور مسلمانوں کے خیالات بھی افشا کیے۔ سو اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب کی آیت (۱۲) میں فرمایا کہ: "اور جب منافقین اور وہ جن کے دلوں میں مرض تھا (شک کا) کہا کہ اللہ اور اس کے پیغمبر نے دھوکے کے علاوہ ہم سے کچھ وعدہ نہ کیا"۔

جناب رسالت مآبؐ نے اس سلسلے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور بہت سے مشوروں اور تجویزوں میں سے آپؐ نے جناب سلمان فارسیؓ کی تجویز کو سراہا کہ شہر کے گرد ایک خندق کھود کر دشمن کے لیے راستہ بند کر دیا جائے۔ جناب سلمان فارسیؓ اس طرح کے دفاع سے واقف تھے جو قبل مشرق میں رائج تھا کیونکہ وہ اہل فارس میں سے تھے۔ مشرق کے ایک بہت پرانے شہر بیجنگ جو چین کا دارالخلافہ ہے وہاں ایک قدیم شہر جو خاندان شاہاں سے مخصوص تھا، ابھی تک موجود ہے اور اس کا نام "شہر ممنوعہ" ہے یعنی وہ علاوہ شاہوں کے سب کے لیے ممنوع تھا۔ یہ قدیم شہر دو ہزار برس پرانا ہے اور اس شہر کے گرد گہری اور خوب چوڑی نہر ہے جو اس کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جنوبی ایشیاء میں مغل شاہوں کے جتنے بھی قلعے ہیں، تقریباً سب کے سب دریاؤں کے کنارے اونچی جگہ پر واقع ہیں اور وہ دریا ان کے لیے حفاظتی حصار کا کام کرتے تھے۔ لیکن عرب اس طرح کے حفاظتی حصار سے قطعی ناواقف تھے۔

شہر مدینہ ایک طرف سے مکانوں کی قطاروں سے دشمن کو روکے ہوئے تھا اور اس کے دو اطراف گھنے باغات تھے جو کھجور کے پودوں سے پر تھے۔ صرف ایک طرف سے یہ شہر کھلا تھا یعنی مقام شیخان سے لے کر عقبہ کے مقام تک تھا۔ یہی سمت دشمن کے لیے کھلی تھی، یہ پر خطر

علاقہ تقریباً چھ کلومیٹر لمبا تھا۔ چنانچہ جناب رسالت مآبؐ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس علاقے میں خندق کھود دی جائے تاکہ سارا شہر دشمن کی دسترس سے محفوظ ہو جائے۔ اس لیے جناب رسالت مآبؐ نے اپنے دست مبارک سے خندق کھودنے کی جگہ پر نشان لگائے اور خندق کھودنے کے لیے تین ہزار نفوس متعین کیے۔ ہر دس اشخاص کے ذمہ (۲۰) میٹر لمبا علاقہ لگایا گیا جسے پندرہ فٹ چوڑا اور پندرہ فٹ گہرا کھودنا تھا۔ جناب رسالت مآبؐ بذات خود بھی مزدور کی حیثیت سے اس کام میں مشغول ہو گئے۔ خندق کھودنے والے جناب رسولؐ اللہ کے ساتھی کھانے پینے کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام میں مشغول ہو گئے حتیٰ کہ بعض اوقات ان کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہ ہوتا۔

بہر حال اس کام کی تکمیل کو (۲۰) بیس روز لگ گئے، اس کے بعد وہی تین ہزار مزدور اپنا کام پورا کرنے کے بعد فوجی سپاہ بن گئے اور دشمن کے انتظار میں بیٹھ گئے اور خندق کے ساتھ اپنی مورچہ بندی کر لی۔ جبکہ خواتین اور بچے جو لڑنے کے قابل نہ تھے وہ شہر کے محفوظ حصار میں تھے۔

(و) بنو قریظہ کی غداری:

ایک یہودی قبیلہ جو مدینہ کے جنوب مشرق کے ایک قلعہ میں آباد تھا وہ مسلمانوں کی امان میں تھا۔ اس لیے کہ ان کا اللہ کے رسولؐ کے ساتھ وفاداری کا معاہدہ تھا، ان کے پاس تقریباً آٹھ صد لڑاکا افراد تھے۔ لہٰذا بنو نضیر کا ایک سردار حیی ابن اخطب قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا اور اس کو راضی کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ان سے مل جائے اور اس کے بدلے انہیں اچھی خاصی پیشکش بھی کی جسے کعب نے قبول کر لیا۔

جب جناب رسولؐ اللہ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبیدہؓ کو کعب کے پاس بھیجا تاکہ اسے ان کا وعدہ یاد دلایا جائے جو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ کعب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر یہ جواب دیا کہ: "ہمیں نہیں معلوم کہ محمدؐ کون ہے اور وہ کیا معاہدہ ہے"۔ بنو قریظہ کی اس غداری نے مدینہ کے منافقین اور اتحادی افواج کو بہت تقویت پہنچائی اور منافقین نے جناب رسولؐ اللہ کو مختلف بہانے لگا کر چھوڑنا شروع کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل کو ناگواری کے ساتھ سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۱۳) میں بیان فرمایا کہ "جب ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا: "اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے ٹھہرنے کا کوئی ممکنہ جواز نہیں (یعنی دشمن کا حملہ متوقع نہیں) اس لیے واپس چلے جاؤ۔ اور ان

میں سے کچھ لوگوں نے اللہ کے رسولؐ سے اجازت چاہی عذرداری کر کے، کہ حقیقت میں ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ اور وہ ایسے نہ تھے ان کا تو بس موقع سے بھاگنا تھا"۔

اس کے علاوہ "سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۱۹) میں فرمایا گیا کہ "تمہارے لیے یہ بخیل ہیں (یعنی اللہ کی خاطر مدد کرنے کے لیے) اور جب انہیں خطرہ نظر آتا ہے تو تم انہیں دیکھو گے کہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں اور ان کی آنکھیں اس طرح سے چکرا کر گھومتی ہیں، جیسا کہ یہ موت کو دیکھ کر خوفزدہ ہو رہے ہیں اور جب خوف ان سے دور ہو جاتا ہے تو وہ اپنی زبانوں کی تیزی سے تمہیں کاٹ دیں گے اور وہ بخالت کا مظاہرہ کریں گے (کسی چیز کو خرچ کرنے کے لیے) اچھائی کے لیے۔ یہ لوگ ایمان نہیں رکھتے (اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے) اس لیے اللہ نے ان کے اعمال کو بیکار کر دیا ہے اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے"۔

(ہ) مدینہ کی ناکہ بندی:

حلیف افواج مدینہ پہنچ گئیں، اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ فتح سے ہمکنار ہوں گی، کیونکہ انہیں یقین تھا مسلمانوں کے ناخوشگوار خاتمے کے لیے۔ کیونکہ وہ تعداد میں اس قدر زیادہ تھے کہ اس سے پہلے کبھی بھی اتنی بڑی تعداد سے کسی پر حملہ نہ کیا گیا تھا، جبکہ مسلمان بہت قلیل تھے۔ وہ ڈھول بجاتے آ رہے تھے اپنے بتوں کی تعریفیں کرتے ہوئے، نظمیں پڑھتے اور ان کی عورتیں نعرے لگاتی ہوئی، فتح کے۔ دراصل اس حالت میں جب کہ وہ طاقت میں بہت زیادہ تھے اور ناچتے گاتے آ رہے تھے تو وہ یہ بھول گئے تھے کہ ابھی جنگ ہونا تو باقی ہے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ جیت چکے ہیں، اور اب اپنی فتح کا جشن منا رہے ہیں۔

ابو سفیان اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر احد کے میدان پہنچا لیکن حیران رہ گیا کہ وہاں تو کوئی نہ تھا، اس پر اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ مدینہ پر حملہ کر دیں۔ اس غرض سے جب وہ شہر مدینہ کے نزدیک پہنچے تو انہیں ایک اور چونکا دینے والی چیز نظر آئی اور انہوں نے ایک ایسی انہونی چیز دیکھی جس کا انہیں گمان تک نہ تھا اور وہ تھی خندق۔ اب ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ شہر کا محاصرہ کر لیں۔

دونوں فوجیں آمنے سامنے ایک دوسرے کو دیکھ سکتی تھیں، اس لیے قریش نے مسلمانوں کو طعنے دینا شروع کر دیے۔ کہ انہوں نے خندق کھود کر اپنی بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسلمانوں نے

بہرحال ان کے طعنوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب لڑائی کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ بچ گیا تھا اور وہ تھے تیر۔ چنانچہ دونوں طرف سے ایک دوسرے پر تیر چلنا شروع ہو گئے اور دونوں طرف کے لوگ زخمی ہوئے۔ اہل مدینہ تو خیموں وغیرہ میں اپنے گھروں کے نزدیک بیٹھے تھے لیکن اہل قریش نے کھلی جگہ پر پڑاؤ ڈالا ہوا تھا اور انہیں مشکل صورتحال درپیش تھی، تیز سرد ہواؤں کی وجہ سے۔

(و) دشمن کا خندق کو پار کرنا:

دشمن کی ناکہ بندی کے دوران حلیف افواج کوشش کرتی رہیں کہ کہیں سے خندق کی کم چوڑائی کا حصہ مل جائے تاکہ خندق پار کی جا سکے۔ اس کوشش میں چند لوگ کامیاب ہو گئے ان میں سے ایک عمرو بن عبدود نے مقابلے کے لیے للکارا۔ اس کی للکار کو جناب علیؓ نے قبول کیا اور مقابلے سے قبل عبدود سے کہا "اے عمرو! تم نے عہد کیا تھا کہ اگر اہل قریش میں سے کوئی تمہیں دو باتوں کے لیے کہے گا تو ان میں سے تم ایک قبول کرو گے"۔ اس کا جواب اس نے ہاں میں دیا۔ پھر علیؓ نے فرمایا: "تو پھر میں تمہیں اللہ کی راہ کے لیے دعوت دیتا ہوں اور اس کے رسولؐ کے لیے اور تم سے التجا کرتا ہوں کہ اسلام قبول کر لو۔

عمرو نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علیؓ نے پھر عمرو کو مقابلے کی دعوت دی، جس پر عمرو نے جواب دیا "اللہ کی قسم! میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا"۔ جناب علیؓ نے جواب دیا "لیکن میں تو چاہتا ہوں"۔ اس کے بعد مقابلہ شروع ہو گیا اور عمرو قتل ہو گیا اور اس کے ساتھی جلدی سے بھاگ لیے۔ اہل قریش نے عمرو کی لاش حاصل کرنے کی غرض سے دس ہزار درہم کی پیشکش کی جس پر جناب رسالت مآبؐ نے جواب دیا "ہم لاشوں کی قیمت وصول نہیں کرتے، اسے لے جاؤ"۔

(ز) رسالت مآبؐ کی کافروں پر لعنت اور اہل ایمان کے لیے خوشخبری:

امام ابن کثیرؒ نے موسیٰ بن عقبہؒ کا ایک بیان لکھا ہے کہ کفار کو مسلمانوں کا گھیراؤ کیے ہوئے بیس (۲۰) روز گزر گئے تھے کہ قریش نے بہت بڑی تعداد میں سپاہیوں کا ایک دستہ جناب رسالت مآبؐ کی قیام گاہ کی طرف روانہ کیا۔ اس صورت حال سے اچھی خاصی بے چینی پھیل گئی اور جناب رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھی اس اضطرابی معاملے کو حل کرنے میں رات گئے تک

مصروف رہے اور اپنے دفاع کا پورا پورا بندوبست کیے رکھا۔ اس دوران آپ حضرات نماز کے لیے اکٹھے نہ ہو سکے۔ جس پر جناب رسول اللہؐ نے کافروں پر لعنت بھیجی، یہ کہتے ہوئے کہ: "ان لوگوں نے ہمیں ہماری صلوٰۃ سے دور رکھا اللہ ان کے پیٹ، دل اور قبریں آگ سے بھر دے"۔

جس وقت اہل ایمان افسردگی اور ناامیدی کا اظہار کر رہے تھے، اس وقت اللہ کے رسولؐ نے اپنی کامیابی اور فتح کا اعلان یہ کہتے ہوئے کیا کہ: "اللہ کی قسم! یہ مشکل دور ہو جائے گی اور مجھے امید ہے کہ ہم طواف کریں گے، امن کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ ہمیں کعبہ کی چابی عطا فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ قیصر اور کسریٰ (روم اور فارس کے بادشاہ) کو ختم کرے گا اور تم ان کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے"۔

(ح) اللہ کا عذاب دشمنوں پر:

امام ابن کثیرؒ نے ابوسعید خدریؓ کی روایت امام احمدؒ کے حوالے سے بیان کی ہے کہ احزاب کے روز مسلمانوں نے جناب رسول اللہؐ سے درخواست کی اور کہا "اے اللہ کے رسولؐ! ہمیں دعا کے لیے چند ایسے الفاظ بتائیں کہ ہم سے جنگ کا خوف دور ہو جائے"۔ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا، ہاں اور پھر یہ پڑھنے کے لیے بتایا "اے اللہ! مہربانی فرما کر ہمیں ہماری بھول پر نہ پکڑیے اور کوتاہیوں پر بلکہ ہمیں معاف فرما دیجیے"۔ (یہ الفاظ سورۃ بقرۃ کی آخری آیت میں سے ہیں)

پس اللہ تعالیٰ جو نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے اس نے اپنے بندوں کی دعاؤں کو سن لیا اور دشمنوں پر ریت کا طوفان بھیج دیا۔ یہ واقعہ اللہ سبحانہٗ نے سورۃ احزاب کی آیات (۹—۱) میں بیان فرمایا، جس میں کہا گیا ہے کہ "اے ایمان والو! اللہ کی مدد کو یاد کرو، جب تمہارے خلاف ایک بہت بڑا لشکر آیا اور ہم نے ان کے خلاف زوردار ہوا اور طاقت بھیجی (فرشتوں کی) جسے تم نے دیکھا نہیں اور اللہ تو ہر چیز کو دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔ جب وہ تم پر آئے اوپر سے اور نیچے سے اور تمہاری آنکھیں پتھرا گئیں اور تمہارے دل تمہارے حلق تک آ گئے اور تم اللہ کے متعلق بھی شک کرنے لگے"۔

(ط) سیدہ صفیہؓ کی بہادری:

جناب رسالت مآبؐ نے دو صد جانباز سلام بن اسلم کی قیادت میں بھیجا کہ وہ بنو قریظہ سے مدینہ کی حفاظت کریں۔ بنو قریظہ کے ساتھ ہی ایک قلعہ تھا جہاں مسلمان خواتین کو حفاظت

کی غرض سے ٹھہرایا ہوا تھا تاکہ اگر حلیف افواج مدینہ پر حملہ آور ہونے میں کامیاب ہو جائیں تو مسلمان خواتین ان سے محفوظ رہیں۔ یہود کو چونکہ اس کی خبر ہو گئی لہٰذا انہوں نے وہاں حملہ آور ہونے کے لیے صحیح وقت پایا اور اپنے کچھ آدمی وہاں بھیجا کہ حالات سے آگاہ ہو کر خبر کریں۔ ان میں سے ایک قلعے کے اندر جانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں پر سیدہ صفیہؓ، جناب حمزہؓ کی ہمشیرہ اور جناب رسالت مآبؐ کی پھوپھی، نے اس بدبخت کو دیکھ لیا۔ انہوں نے بہت دلیری کے ساتھ خیمے کا ایک کھونٹا اٹھایا اور اس کے ساتھ اس یہودی کے سر پر اتنی شدید ضربیں رسید کیں کہ وہ رخصت از جہاں ہو گیا۔ پھر سیدہ نے اسکا سر تن سے جدا کر کے قلعے کی دیوار سے باہر پھینک دیا جہاں اس کے ساتھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھ کر اتنے زیادہ خوفزدہ ہوئے کہ وہاں سے بھاگ لیے اور پھر کل یہود نے وہاں حملہ کرنے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔

(ی) نعیم بن مسعود کا منصوبہ:

غطفان قبیلے کا ایک سردار نعیم بن مسعود ثقفی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اپنے ایمان کو ابھی تک ظاہر نہیں کیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے مسلمانوں کے لیے کوئی ایسا کام ہو جائے کہ ان کی مدد ہو جائے اس مشکل گھڑی میں۔ اس نے اس غرض سے جناب رسالت مآبؐ کی اجازت لے کر قریش اور یہود کے درمیان بات چیت کا سلسلہ شروع کیا، اس انداز سے کہ وہ دونوں ایک دوسرے پر شک کرنے لگے اور معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کا اعتبار کھو دیا اور ایک دوسرے پر یقین کرنا چھوڑ دیا۔ اس نازک موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی ایک زوردار آندھی، طوفان اور بارش کے ذریعے سے، جس نے ان کے خیمے اڑا دیے اور سامان بکھیر دیا۔ ان کا کھانا اور پانی اور برتن بھی بکھر گئے اور صورتحال ایسی ہو گئی کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور اس کا وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا اور ان کے ارادے اور منصوبے بھی ہوا ہو گئے۔ اب ان کو اپنے آپ کو بچانے کی فکر لاحق ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی اس طرح سے مدد سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۹) میں بیان کی گئی ہے جو اس سے قبل بیان کی جا چکی ہے۔

(ک) دشمن کا فرار:

بنو قریظہ کے لوگوں نے قریش کا ساتھ چھوڑنے کی پہل کی اور اپنے آپ کو قلعوں میں

محصور کر لیا، پھر قبیلہ غطفان کے لوگ بھاگے۔ اس کے بعد قریش کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہ اس افراتفری کی حالت کا مقابلہ نہ کر پائے۔ اس طرح سے وہ اپنے تیس (۳۰) روز اور اپنی دولت و طاقت ضائع کرنے کے بعد بھاگنے کا پروگرام بنانے لگے۔ اس صورتحال کو سورہ احزاب کی آیت (۲۵) میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ: "اور اللہ نے ان کافروں کو واپس دھکیل دیا ان کے غصے کے ساتھ اور انہیں کچھ حاصل نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ خود ہی مسلمانوں کے لیے کافی ہو گیا جنگ میں (آندھی اور فرشتوں کو بھیج کر کافروں کے خلاف) اور اللہ ہی بہت طاقتور اور بہت قوت والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے غلاموں سے کہا کہ اس نے کس طرح سے حلیف افواج کو نابود کر دیا آندھی اور فرشتوں کے ذریعے سے (اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو انسانوں کے لیے رحمت بنا کر نہ بھیجا ہوتا تو وہ ان کے لیے بھیجتا جو بری ہوائیں جو اس نے قوم عاد کے لیے بھیجی تھیں) بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اللہ ان کو سزا نہ دے گا جب تک کہ تم (اے محمدؐ) ان کے درمیان ہو۔ اور نہ ہی وہ انہیں سزا دے گا، جب وہ مانگتے ہیں (اللہ سے) معافی"۔ (آیت (۳۳) سورۃ انفال (۸)

(ل) اللہ کے رسولؐ کا ادائے شکر:

جناب رسولؐ اللہ نے اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی مہربانی اور فضل و کرم، درج ذیل الفاظ میں بیان فرمایا "کوئی اس کا اختیار نہیں رکھتا کہ اس کی پرستش کی جائے، سوائے اللہ واحد کے۔ وہ اپنے وعدوں میں سچا ہے، اس نے اپنے غلاموں کی مدد فرمائی اور طاقت عطا فرمائی اپنے سپاہیوں کو اور شکست دی حلیف افواج کو۔ وہ اکیلا ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں"۔

(۱۳۰) بنو قریظہ کی غداری:

بنو قریظہ کے یہود نے اپنا معاہدہ مسلمانوں کا حلیف رہنے کے سلسلہ میں توڑ دیا، اپنے دوسرے یہودی قبائل کے اکسانے پر۔ یہ وعدہ انہوں نے جنگ احزاب کے موقع پر اتحادی فوج کے ساتھ ملنے کے لیے توڑا۔ اس معاملہ میں مرکزی کردار حیی ابن اخطب نے ادا کیا، جس نے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسعد کو اس معاملے پر مجبور کیا۔ کعب ان کی تجویز پر راضی ہو گیا اس شرط پر کہ حیی ابن اخطب ان کے ساتھ ہی اپنے آپ کو قلعہ بند کرے گا اور ان کی قسمت میں

انہی کا ساتھ دے گا۔ یعنی جو حشر بنو قریظہ کا ہوگا وہی حشر ان کے ساتھ حتیٰ کو بھی قبول کرنا ہوگا۔

(الف) اس غداری کے متعلق اللہ کا حکم:

جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی ان کے دشمنوں کو مجبور کر کے اور انہیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس بھیج دیا مایوسی کے ساتھ تو جناب رسولؐ اللہ واپس تشریف لے گئے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ۔ جب آپؐ اپنے آپ سے جنگ کی مٹی جھاڑ ہی رہے تھے اور اس وقت آپؐ سیدہ ام سلمہؓ کے گھر تھے تو جبریلؑ تشریف لائے۔ انہوں نے اس وقت بروکیڈ کی پگڑی زیب تن فرمائی ہوئی تھی اور ایک خچر پر سوار تھے۔ انہوں نے جناب رسولؐ اللہ سے فرمایا "کیا آپؐ نے اپنے ہتھیار اتار دیے ہیں، اے اللہ کے رسولؐ؟" جس کا جواب جناب رسولؐ اللہ نے ہاں میں دیا تو جبریلؑ نے فرمایا لیکن فرشتوں نے تو ابھی تک اپنے ہتھیار نہیں رکھے میں تو ابھی ابھی لوگوں کا پیچھا کرتا ہوا آ رہا ہوں۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ اللہ بڑی برکت و شان والا آپ کو حکم دیتا ہے کہ اٹھیں اور بنو قریظہ کی طرف جائیں۔

(ب) غزوہ بنو قریظہ:

پھر جناب رسولؐ اللہ فوراً کھڑے ہو گئے اور اپنے لوگوں کو حکم دیا بنی قریظہ کی طرف قدم بڑھانے کا۔ یہ صلوٰۃ ظہر کے بعد کا وقت تھا اور جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی صلوٰۃ عصر نہیں پڑھے گا، بنو قریظہ پہنچے سے پہلے۔ یعنی جناب رسولؐ اللہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد وہاں پہنچا جائے حتیٰ کہ صلوٰۃ العصر کے لیے بھی نہ رکا جائے، اور عصر وہاں جا کر ادا کی جائے۔ کیونکہ وہاں فوراً جانے کا حکم بھی اللہ تعالیٰ ہی کا تھا۔ آپؐ نے ام مکتومؓ کو مدینہ میں اپنا جانشین چھوڑا اور اپنے رستے کا علمبردار جناب علیؑ کو بنایا۔ جب جناب رسولؐ اللہ قلعِ قریظہ کے پاس پہنچے تو یہودیوں نے آپؐ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، جیسا کہ جناب علیؓ نے فرمایا۔ اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ بذاتِ خود ان سے گفت و شنید کرنے کے لیے گئے لیکن انہوں نے پھر بدتمیزی کی۔ پھر آپؐ واپس تشریف لے آئے اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ ان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا جائے۔ یہ محاصرہ پچیس (۲۵) روز تک جاری رہا۔ اس دوران بھی جناب رسولؐ اللہ نے ان سے بات چیت کی کوشش کی لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ برخلاف اس کے جب ان کے سردار کعب بن اسد نے صورتحال کی سنگینی کا اندازہ لگایا تو اس نے اپنے قبیلے کے لوگوں سے خطاب

کیا اور انہیں تین تجاویز پیش کیں اور کہا کہ ان میں سے ایک پسند کر لیں تا کہ ان کا معاملہ نمٹ جائے۔

۱) انہیں اس شخص (محمدؐ) کی پیروی کر لینی چاہیے اور اسے سچا مان لینا چاہیے۔ اللہ کی قسم یہ صاف ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ ایک پیغمبر ہیں ان کی کتاب کے مطابق۔ اس طرح سے ان کی جان بخشی ہو جائے گی، ان کی جائیداد بچ جائے گی اور ان کی عورتیں اور بچے بھی۔ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ "ہم تورات کے قوانین ہرگز نہیں چھوڑیں گے اور نہ ہی بدلیں گے کسی دوسرے کے لیے"۔

۲) انہیں چاہیے کہ وہ اپنی خواتین کو اور بچوں کو قتل کر دیں اور اپنے مردوں کو تلواروں سمیت ان کے پاس بھیج دیں، اس وقت تک کے لیے کہ جب تک اللہ ان کے اور محمدؐ کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کر دے۔ اس تجویز کو بھی انہوں نے نامنظور کیا۔

۳) اسی رات جو سابتھ (ہفتہ) کی رات تھی، مسلمان یہ توقع نہ کریں گے، اس لیے اس رات ان پر حملہ کر دیا جائے۔ انہوں نے اسے بھی تسلیم نہ کیا کیونکہ انہیں سابتھ کے روز لڑنا منظور نہ تھا۔

وہ بہرحال اس بات پر مان گئے کہ جناب رسولؐ اللہ کو کہا جائے کہ ابولبابہؓ کے ذریعے صلح کر لی جائے۔

(ج) ابولبابہؓ کی غلطی:

جناب رسالت مآبؐ نے ان کی تجویز قبول فرمائی اور ابولبابہ کو ان کے پاس بھیجا۔ یہودیوں نے ابولبابہ سے رسولؐ اللہ کے ارادے کے بارے میں معلوم کیا، اس پر ابولبابہؓ نے اپنی انگلی اپنے حلق پر رکھی یعنی انہیں ان کے قتل کی خبر دی۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اس سے غلط کام سرزد ہو گیا ہے کہ اس نے جناب رسولؐ اللہ کے ارادے کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر دیا۔ اس پر فوراً ہی اس نے مسجد نبوی کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا اور اس بات کا ارادہ کیا کہ وہ اس حالت میں اس وقت تک رہے گا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں کر دیتے (وہ ستون اس وقت اس حالت میں تو نہیں ہے، کیونکہ اس وقت یہ ستون کھجور کا تھا اور آج پتھر کا لیکن مسجد نبوی کے حصے ریاض الجنہ میں جناب رسالت مآبؐ کے روضہ کے قریب وہ ستون آج بھی ستون ابولبابہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے)۔ جب جناب رسولؐ اللہ کو اس بات کا پتا چلا تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر وہ میرے پاس آ جاتا تو میں اس کی غلطی

کی معافی کے لیے دعا کرتا"۔ وہ پھر اس ستون کے ساتھ سات روز تک بندھا رہا اور اس کی بیوی صرف نماز کے وقت آ کر اسے کھولتی اور پھر باندھ دیتی۔ حتیٰ کہ جناب رسولؐ اللہ پر اس کے لیے معافی کی نوید سورۃ انفال کی آیت (۲۷) میں آئی۔ جس میں کہا گیا کہ "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ غداری مت کرو اور نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور نہ ہی ان باتوں میں جو اللہ نے تمہارے ذمہ لگائی تھیں"۔

(د) سعدؓ بن معاذ کی ثالثی:

یہودی آخر کار سعدؓ بن معاذ کی ثالثی پر تیار ہو گئے جو اوس قبیلہ کے سردار تھے اور قبل ازیں وہ اہل یہود کے حلیف تھے۔ سعدؓ نے یہ منصب اس شرط پر سنبھالا کہ دونوں فریق ان کے دیے گئے فیصلے کو ہر صورت قبول کریں گے۔

جب دونوں فریق اس بات پر راضی ہو گئے تو سعدؓ نے اپنا فیصلہ یہودوں کی کتاب تورات کے مطابق اس کی سورۃ (۲۰) آیات (۱۰-۱۵) کے مطابق سنا دیا۔ جس میں کہا گیا ہے کہ "جب تم کسی شہر کے نزدیک جاؤ، لڑائی کے لیے تو ان کو امن اور صلح کی پیشکش کرو اور اس کے لیے اپنی شرائط بتاؤ، اور پھر اگر اس کا جواب تمہیں امن اور صلح میں ہی ملے اور یہ تمہارے لیے کھول دیا جائے (شہر) تو پھر تمام لوگ جو وہاں ہوں وہ تمہارے لیے جبری کام کریں گے یعنی وہ غلام بنا لیے جائیں گے۔ لیکن اگر وہ تمہارے ساتھ امن اور صلح کے لیے راضی نہ ہوں بلکہ تمہارے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہوں تو پھر تم ان کا محاصرہ کرو اور پھر جب اللہ اسے تمہارے قبضے میں دے دے تو تم ان کے تمام مرد تلوار کے حوالے کر دو لیکن عورتیں، بچے، مویشی اور جو کچھ بھی شہر میں موجود ہو اور ان کا مال و اسباب تمہارے لیے ہے جو تمہارے اللہ نے تمہیں دے دیا ہے"۔

(ہ) سعدؓ کے فیصلے پر عمل درآمد:

جناب سعدؓ کے فیصلے پر عمل درآمد کرتے ہوئے اللہ کی کتاب تورات کے مطابق مردوں کو سزائے موت دے دی گئی۔ ان لوگوں کی بدبختی کہ انہوں نے جناب رسولؐ اللہ کو اپنا ثالث مقرر نہیں کیا اگر کیا ہوتا تو آپؐ ان کی سزا کے بارے میں بہت نرم رویہ رکھتے۔ لیکن انہوں نے اپنی بدبختی کو خود چنا، اپنے تکبر کی وجہ سے، غداری کی وجہ سے اپنے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہوتے ہوئے مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ آڑے وقت

میں مل گئے جبکہ وہ دشمن مسلمانوں پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جناب رسالت مآبؐ کو قتل کرنے کی سازش بھی تو کی تھی۔ جس کی خبر اللہ نے انہیں کر دی اور وہ وہاں سے ہٹ گئے انہوں نے جناب رسالت مآبؐ کو نازیبا الفاظ سے پکارا، گالیاں دیں اس وقت جب کہ آپؐ ان سے گفت و شنید کرنے آئے تھے سو وہ لوگ اللہ کی طرف سے اس سزا کے مستحق ہوئے۔

عام خیال یہ ہے کہ تقریباً سات صد سے چھ صد کو قتل کیا گیا لیکن یہ تعداد صحیح نہیں۔ امام ابن کثیرؒ کے مطابق جو قرآن، حدیث اور فقہ کے بہت بڑے امام ہیں اور تاریخ حیات رسولؐ اللہ کے ماہر اور اسلامی تاریخ اور قوانین کے بھی ماہر ہیں ان کے مطابق اور وہ ابن حزمؒ یعنی جابر کا حوالہ دیتے ہیں اور ان مقتولوں کی تعداد چار صد بتاتے ہیں۔ ان کے علاوہ پچھلی صدی کے محقق اور تاریخ دان سید امیر علی نے ان کی تعداد دو صد سے اڑھائی صد تک بتائی ہے، انہوں نے کہا کہ یہ گنتی کی غلطی محض اس وجہ سے ہے کہ لوگوں نے کل قیدیوں کی تعداد کو مدنظر رکھا۔ حالانکہ ان تمام قیدیوں میں سے صرف جوان مردوں کو ہی سزا دی گئی اور باقی عورتیں، بچے اور معذور افراد ان میں شامل نہ تھے۔

اس کے علاوہ منافقوں کا سردار حئی ابن اخطب بھی اسی سزا کا مستحق ہوا۔

(و) اس واقعہ کا قرآن میں ذکر:

بنو قریظہ کے واقعہ کی قرآن میں سورۃ احزاب (۳۳) کی آیات (۲۶-۲۷) میں تذکرہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ "اور وہ جو اہل کتاب میں سے تھے انہوں نے ساتھ دیا (حلیف افواج کا) تو اللہ تعالیٰ ان کو ان کے قلعوں سے نیچے لے آیا اور ان کے قلوب میں خوف ڈال دیا۔ سو ان میں سے ایک گروہ جنہیں تم نے قتل کیا اور ان میں سے ایک گروہ جنہیں تم نے قیدی بنایا اور اس (اللہ) نے تمہیں مستحق بنایا کہ تم وارث بن جاؤ ان کی زمینوں کے اور ان کے گھروں کے اور ان کی جائیداد کے اور ایسی جگہ جس کے لیے تم اس سے قبل قدم بھی نہ رکھ سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ ہر شے کے کرنے پر قادر ہے"۔

(ز) ریحانہ اللہ کے رسولؐ کی کنیز بن جاتی ہے:

بنو قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک عورت ریحانہ بنت عمرو بنت خنافہ جناب رسولؐ اللہ کے قرعہ میں آئیں۔ جناب رسولؐ اللہ نے اسے آزادی کے بدلے اسلام پیش فرمایا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے اسے دوبارہ اسلام کی پیشکش کی اور ساتھ ہی

شادی کی پیشکش بھی کر دی لیکن پھر اس نے انکار کر دیا اور اسلام قبول کرنے اور آپؐ سے شادی کرنے کے بجائے کنیز بنے کو ہی ترجیح دی۔ یہ اس کا اسلام اور اللہ کے رسولؐ سے دشمنی کا اظہار تھا۔ بہر حال وہ کنیز کی حالت میں ہی دس ہجری میں جب جناب رسولؐ اللہ حج سے واپس تشریف لائے تو انتقال کر گئی۔

(۱۳۱) جناب رسولؐ اللہ کا سیدہ زینبؓ بنت جحشؓ سے عقد

جناب آدم علیہ السلام اور سیدہ حوا علیہا السلام کے بعد یہ پہلی اور آخری شادی یا عقد ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت نے اپنے فرمان مبارک سے فرمایا۔ جناب رسولؐ اللہ نے جب اپنے غلام زید بن حارثہؓ کو آزاد فرمایا بلکہ اپنا بیٹا بنا لیا اور اب وہ ان کے گھر کے افراد میں سے ایک ہو گئے یعنی اہل بیت میں سے ہو گئے تو آپ نے ایک معاشرتی روایت قائم کرنے کے لیے کہ غلام آزادی کے بعد آزاد مملکت کی آزاد قوم کا ایک آزاد باشندہ بن جاتا ہے اور اس کے حقوق اور عزت و آبرو اور تعظیم سب کے برابر ہوتی ہے اور وہ زید سے سیدنا زید، سلمان سے سیدنا سلمان اور بلال حبشی سے سیدنا بلال بن جاتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے آپؐ نے زید بن حارثہؓ کو سیدنا زیدؓ بنانے کے لیے پہلے تو انہیں اپنا بیٹا قرار دے دیا کہ ان کی عزت اور مقام معاشرے میں ایسا ہو جائے کہ گویا جیسے نبی کے بیٹے کا یا سردار قوم کے بیٹے کا ہوتا ہے۔ لیکن آپؐ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس رشتے کو اور زیادہ حقیقت کا رنگ دینے کے لیے جناب رسولؐ اللہ نے اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحشؓ کے ساتھ شادی کرا دی۔ سیدہ زینبؓ نے جناب رسولؐ اللہ کی خاطر وہ نکاح قبول تو کر لیا لیکن مزاج پر کیا اختیار۔ آپ کا مزاج اور طبیعت زید کی طرف مائل نہ ہوئی۔ اور وہ ایک سال سے زیادہ کی رفاقت برداشت نہ کر سکے اور علیحدگی اختیار کر لی۔ زیادہ گمان یہی ہے کہ حقیقت میں دونوں کے مزاج کے علاوہ معاشرتی حیثیت بھی ان کی علیحدگی کی وجہ بنی۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سیدہ ان سے اکثر تند خوئی سے پیش آئیں اور انہیں پسند ہی نہ فرمایا۔ انہوں نے فقط رسولؐ اللہ کی خاطر ان سے نکاح کیا تھا کہ آپ جناب رسولؐ اللہ کے حکم کو ٹال نہیں سکتی تھیں۔

سیدہ کی اس وجہ سے زیدؓ نے ان کو طلاق دینے کے ارادے کے متعلق جناب رسولؐ اللہ

سے اظہار خیال کیا لیکن آپؐ نے انہیں صبر کی تلقین فرمائی۔ لیکن جب یہ معاملہ ناقابل برداشت ہو گیا تو دونوں میں اسلامی قانون کے مطابق علیحدگی ہو گئی۔ لیکن سیدہ زینبؓ پر ایک نشان لگ گیا کہ وہ ایک سابقہ غلام کی سابقہ بیوی ہیں اور اس طرح سے معاشرتی اعتبار سے ان کی حیثیت میں بھی کمی آ گئی اور اس وجہ سے انہیں ان کی سابقہ حیثیت کے مطابق شوہر کا ملنا بڑا مشکل ہو گیا ہو گا۔

ان تمام حالات کے پیش نظر یہ قیاس قوی ہے کہ جناب رسولؐ اللہ کو بھی اس بات کا شدید احساس ہو گا کہ ان کی وجہ سے اب انہیں کوئی اچھا شوہر نہیں مل رہا۔ اور اب اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی رہتا تھا اور سیدہ کی دلجوئی صرف اسی حالت میں ہو سکتی تھی کہ جناب رسولؐ اللہ بذات خود ان سے نکاح کر لیں۔ لیکن یہ معاملہ بڑا مشکل معلوم ہو رہا ہو گا کیونکہ زید کو آپؐ نے اپنا بیٹا قرار دیا ہوا تھا اور لوگوں کو اس بات کا موقع مل جاتا یہ کہنے کا کہ محمدؐ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے اپنا یہ ارادہ قابل اظہار نہ سمجھا ہو اور اس وجہ سے یہ معاملہ آپؐ کے لیے ناقابل برداشت بھی ہو گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی یہ حالت دیکھتے ہوئے اس معاملہ کو سلجھا دیا اور سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۳۷) کا نزول فرمایا جس میں کہا گیا ہے کہ "اور (یاد کرو) جب تم نے اس (زید) سے کہا جس کو اللہ نے عزت بخشی اور تم نے اس سے ہمدردی کی اور کہا اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو اور تقویٰ اختیار کرو۔ لیکن تم نے اس بات کو چھپایا (جو اللہ پہلے سے ہی جانتا تھا کہ وہ دے گا اسے تمہارے نکاح میں) اور وہ اللہ تعالیٰ ظاہر فرما دے گا اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو جبکہ اللہ کا زیادہ حق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ سو جب زید کا کام اس سے بس ہوا (یعنی اس نے طلاق دے دی)۔ ہم نے اسے دے دیا تمہیں نکاح میں (اے محمدؐ) اس لیے (آئندہ) کسی کو یہ مشکل نہ رہے ایمان والوں میں سے (نکاح) کے معاملہ میں اپنے لے پالک بیٹوں کی بیویوں سے جب کہ انہیں کوئی ضرورت نہ ہو ان کی (یعنی طلاق کے بعد) اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہر صورت میں پورا ہونا چاہیے"۔

اس طرح سے اس نکاح میں اللہ خود ولی بن گئے، سیدہ زینبؓ کے اور اللہ ہی نے ان کا نکاح جناب رسولؐ اللہ سے کر دیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا۔ بے شک یہ ایک انوکھی اور بہت ہی عزت والی شادی تھی۔

امام بخاریؒ نے لکھا، انس بن مالکؓ کے حوالے سے کہ سیدہ زینب بن جحش اس معاملہ پر نبیؐ کی دوسری ازواج سے فخر جتلایا کرتی تھیں یہ کہتے ہوئے کہ "تمہارے گھر والوں نے تمہاری شادی کا بندوبست کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے میری شادی کا بندوبست آسمانوں سے کیا"۔

اللہ تعالیٰ کے درج بالا فرمان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے مزید اس نکاح کی قانونی حیثیت کی بابت فرمایا، سورۃ احزاب کی آیت (۳۸) میں کہ "رسول اللہ پر کوئی مذ القدنہیں کہ جو کچھ اللہ نے ان کے لیے جائز قرار دیا یہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ رہا ہے ان سے جو پرانے زمانے میں گزر چکے ہیں (نبیؑ) اور اللہ کا حکم پہلے سے مقدر ہوتا ہے"۔

(۱۳۲) پیغمبر کسی مرد کے والد نہیں ہیں

اللہ جل شانہٗ تمام اچھائیوں کا سرچشمہ اور تمام علوم کا منبع ہے، اس نے مزید وضاحت فرمادی اور یہ اعلان کردیا کہ کسی بچے کو اپنا بیٹا بنالینا یا ظاہر کرنا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ شخص اس بچے کا باپ ہے یعنی وہ باپ جیسی محبت تو دے سکتا ہے لیکن حقیقت میں باپ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا کسی کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہونی چاہیے کہ محمدؐ نے اپنے بیٹے کی ساتھ بیوی سے نکاح کرلیا۔ اور یہ حکم اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۴۰) میں صادر فرمایا جس میں کہا گیا کہ: "محمدؐ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور مہر ہیں انبیاء اور رسل پر (یعنی کہ نبوت ان پر پایہ تکمیل تک پہنچ گئی اور اب کوئی نبی یا پیغمبر نہیں آئے گا قیامت تک) اور بے شک اللہ کی ذات ہمیشہ ہر شے سے باخبر ہے"۔

لہٰذا اس اعلان خداوندی نے اس دعوے کی نفی کردی کہ محمدؐ والد ہیں زید کے۔ اس لیے اس حکم کے بعد لوگوں نے زید کو زید بن محمد کہنا چھوڑ دیا اور پھر سے زید بن حارثہ کہنا شروع کردیا۔

(۱۳۳) محمدؐ مہر نبوت ہیں

سورہ احزاب (۳۳) کی آیت (۴۰) جس میں کہا گیا کہ محمدؐ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں اور یہ کہ نبوت اپنے کمال تک پہنچ چکی ہے اس کے مطابق انسان کی مزید الہامی تربیت کی ضرورت نہیں رہی۔ دوسرے الفاظ میں خالق نے اپنی اس مخلوق اعلیٰ کو تربیت کامل سے سرفراز فرمادیا۔

اور یہ تربیت کچھ کم عرصہ نہیں رہی بلکہ اس کا دور بہت طویل رہا۔ یعنی ابوالانسان آدم علیہ السلام سے لے کر جناب خاتم الرسل و خاتم النبیین تک۔ بس اس وقت کے بعد تک یعنی جب اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اللہؐ کی وفات سے نوے دن قبل آپؐ کو یہ اطلاع عرفات کے میدان میں سورۃ مائدہ (۵) کی آیت ۳) میں دی اور فرمایا کہ "آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کردیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کرلیا"۔

اب دین بھی کمال حاصل کرگیا اور الہام کی ضرورت نہ رہی اور جب الہام کی ضرورت نہ رہی تو پھر نبی کی بھی مزید ضرورت نہیں رہتی۔ بس اسی آخری نبی کا اکمل طریقہ قیامت تک چلتا رہے گا اور اس میں مزید کسی تبدیلی اور اضافے کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ اب تک انسانی تہذیب و تمدن اور انسانی سوچ نے اس قدر علم حاصل کرلیا کہ وہ اپنی تقدیر یا قسمت متعین کرنے کے قابل ہوگئے۔ اور اب وہ اپنی تعلیم و تربیت کرنے کے خود قابل ہوگئے اور اپنی آئندہ نسلوں تک علم منتقل کرنے کے قابل بھی ہوگئے۔ اور مزید یہ کہ ان کے پاس اللہ کی آخری کتاب قرآن بھی رہے گا جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا اور اس کے علاوہ آخری رسولؐ کی تعلیمات، آپؐ کے اسوۂ حسنہ اور قول و فعل یعنی سنت اور احادیث رسول اللہؐ بھی ہماری ہدایت کے لیے رہیں گی اور دنیا میں یہ آواز بھی گونجتی رہے گی کہ "محمدؐ اللہ کے رسول ہیں"۔ اس لیے ان سے رہنمائی حاصل کرنے کا موقع ہر ایک کو میسر رہے گا۔

عام طور پر جناب رسول اللہؐ کو آخری پیغمبر، قرآن کو آخری کتاب اور آپؐ کی تعلیمات کو آخری کے طور پر کہا جاتا ہے بلکہ ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ نبی کامل، کتاب الہامی کامل اور پیغام کامل۔ کیونکہ سب چیزیں وقتی لحاظ سے نہیں ہیں بلکہ قیامت تک کے لیے یعنی رہتی دنیا تک ہدایت کامل کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس طرح سے محمدؐ اللہ کے رسول اور قرآن اللہ کی کتاب قیامت تک رہے گی اور حضرت انسان ان سے فیض یاب ہوتا رہے گا۔

امام احمدؒ اور امام مسلمؒ نے لکھا ہے کہ ابوسعید خدری نے فرمایا کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ "میری مثال اور ان پیغمبروں کی مثال جو مجھ سے پہلے آئے ایسی ہے، جیسے انہوں نے ایک گھر بنایا اور اتنا بنایا کہ صرف اس میں ایک اینٹ لگنے کا کام باقی رہ گیا اور وہ اینٹ میں نے آکر لگائی اور گھر مکمل کردیا"۔

(۱۴۴) رسالت مآبؐ کے لیے صلوٰۃ اور سلام کہنے کا حکم

اللہ تعالیٰ اپنے نہایت تابعدار غلام سے جو اس کا رسول بھی ہے (یعنی عبد و رسول) انتہائی محبت کا اظہار فرمایا، کیونکہ انہوں نے اللہ کے ایک ایک حکم کی تعمیل کی اور اپنی انتہائی عقیدت اور جد وجہد کے ذریعہ پورا کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا کہ اس کے تمام بندے یعنی غلام اللہ کے حضور دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مہربانیاں، فضل وکرم، رحم، رحمتیں اور برکات اپنے غلام اور پیغمبر محمدؐ پر ہمہ وقت بھیجتے رہیں اور ان کے درجات اور مراتب بڑھاتے رہیں تا کہ اس بندے یا بندوں کو جناب محمدؐ کے ذریعہ سے ہدایت ربانی کا جو فیض ملا ہے اور جس کے لیے آپؐ نے بہت زیادہ محنت اور مشقت کی، اس کے لیے اظہار شکر اور محبت کا کچھ حق ادا ہو جائے اور ہماری محبت کے اظہار کا ذریعہ جناب رسولؐ اللہ سے یہی ہے کہ ہم آپؐ کے بلندیٔ درجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ اظہار محبت کا ذریعہ جو صلوٰۃ وسلام کی صورت میں ہے وہ جناب رسولؐ اللہ کی اطاعت کے بعد آتا ہے۔ کیونکہ اطاعت رسولؐ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی مظہر ہے اور یہی بندگی ہے یعنی کہ اللہ کی غلامی کا تقاضا ہے۔

یہاں ہم صرف صلوٰۃ وسلام کا ذکر کر رہے ہیں تو اس بارے میں سورہ احزاب (۳۳) کی آیت (۵۶) میں فرمایا گیا ہے کہ ”بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے صلوٰۃ (رحمت) بھیجتے ہیں ان نبیؐ پر (تو) اے ایمان والو! تم بھی صلوٰۃ بھیجو اور سلام بھی (یعنی رحمت اور سلامتی)“۔

یہ آیت منبر پر سب سے زیادہ پڑھی جانے والی آیت ہے تقریباً ہر صلوٰۃ کے بعد دعا میں اور خصوصاً جمعہ کے خطبہ میں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ کی تشریح کبھی بھی سنی نہیں گئی۔ خاص طور پر ان جگہوں پر جہاں عربی بھی نہیں جاتی۔ مصنف نے آج تک اپنی پوری زندگی میں اس آیت کی تفسیر یا بیان یا مطلب کبھی بھی نہیں سنا، پندرہ کروڑ کی آبادی والے ملک میں۔ بلکہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ اس آیت کو بعض دفعہ غلط سمجھا جاتا ہے اور بعض دفعہ اس کا غلط حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس آیت مبارکہ کی روح عام لوگوں تک عام کی جائے تا کہ اس کا فیض دلوں کی گہرائیوں تک پہنچ سکے۔

امام بخاریؒ نے ابو عالیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ اس (محمدؐ) کے لیے

اس (اللہ) کا تعریف کرنا ہے، اپنے فرشتوں کے سامنے اور فرشتوں کی صلوٰۃ ان کی دعائیں ہیں (رسولؐ اللہ کے لیے) یعنی کہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرنا کہ وہ اپنی مہربانیاں اور رحمتیں جناب محمدؐ پر جاری وساری رکھیں“۔

ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ”وہ (فرشتے) رحمتیں بھیجتے ہیں (رسولؐ اللہ پر)“۔

ابو عیسیٰ ترمذی نے فرمایا جو روایت ہے سفیان ثوری اور دوسروں کی انہوں نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ اس کا رحم ہے اور فرشتوں کی صلوٰۃ ہے اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنا (رسولؐ اللہ کے لیے)“۔

امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ ابن ابی لائل نے کہا کہ کعب بن احمد اسے ملا اور کہا ”کیا میں تمہیں ایک تحفہ نہ دوں؟ اور کہا کہ اللہ کے رسولؐ ہماری طرف باہر آئے اور ہم نے ان سے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! ہم جانتے ہیں کہ ہم آپ پر سلام کیسے بھیجیں، لیکن ہم صلوٰۃ کیسے بھیج سکتے ہیں (آپؐ پر)؟“ (کیونکہ رحمت بھیجنا یا معافی عطا کرنا تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے اس کے علاوہ تو کوئی نہیں کر سکتا)۔ انہوں نے فرمایا ”کہو: اے اللہ! اپنی صلوٰۃ بھیجیں محمدؐ پر اور آل محمدؐ پر (یعنی اُمت محمد پر) جیسا کہ آپ نے صلوٰۃ بھیجی ابراہیم اور آل (قوم) ابراہیم پر، بے شک آپ (اللہ) ہی سب سے زیادہ تعریف کے لائق ہیں اور بہت مہربان“۔

یہاں ایک اور ضروری بات سامنے آتی ہے کہ آل کا مطلب بھی واضح طور پر اور صحیح نہیں بتایا گیا اور اس میں اکثر غلط فہمی کا سامنا عام آدمی کو کرنا پڑتا ہے، اس لیے عربی کے لفظ آل کو بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اس آیت میں اس کا کیا مطلب ہے۔ عام طور پر ”آل“ کا مطلب گھرانا یا گھر والے کا بتایا گیا ہے اور اس کے بعد جناب علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کی اولاد کو ”آل“ سمجھا جا رہا ہے یعنی جناب رسولؐ اللہ کا تعلق صرف ایک خاص طبقے کی جانب موڑ دیا گیا ہے۔ لیکن ڈکشنری میں اس لفظ کا مطلب ہے خاندان، نسل اور رشتے دار۔ لیکن جہاں جہاں قرآن میں یہ لفظ آیا ہے اس کا مطلب ہے قوم۔ جیسا کہ پیغمبروں کا کوئی وارث نہیں ہوتا پیغمبر کی امت ہی اس کی وارث ہوتی ہے۔ پیغمبر کا مقصد حیات اپنے گھر والوں یا اولاد یا رشتہ داروں تک محدود نہیں ہوتا، پیغمبر قوم کے لیے ہوتا ہے اور اس کا مقصد قوم تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہوتا ہے، لہٰذا تمام اہل قوم پیغمبر کے رشتہ دار عزیز ہوتے ہیں اور اس کے خزانے کے وارث بھی۔

لہٰذا آل کا مطلب ہے پیغمبر کے پیروکار، اس کے امتی۔ ظاہر ہے گھر والے بھی اس میں شامل ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں بتلایا گیا ''آل فرعون''۔ آل فرعون تو اس کے پانچ ہزار لشکری تھے جو اس کے ساتھ غرق ہوئے۔ دوسرا یہ کہ فرعون کی تو کوئی اولاد ہی نہ تھی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے فرعون اور اس کی آل کو ڈبو دیا اور موسیٰ اور اس کی آل کو بچا لیا۔ تو موسیٰ کے ساتھ ان کی پوری قوم تھی جو بچائی گئی۔ اسی طرح سے آل عمران، آل لوط، آل عاد، آل ثمود وغیرہ ان سب میں امتوں کا یا قوموں کا ذکر ہے اور اولاد یا گھر والوں کا۔ لہٰذا یہ بات ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ ''آل محمدؐ'' کا مطلب ہے جناب محمدؐ کی امت یا قوم اور آپؐ کے گھر والے اور قربا۔ جیسے سیدہ مریمؑ کے والد عمران کی تو مزید کوئی اولاد ہی نہ تھی، سوائے مریمؑ اور مسیحؑ کے۔ لیکن قرآن میں جو آل عمران میں کہا گیا ہے وہ عمران کی قوم کے لیے تھا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کے بندے اپنی دعاؤں کے اختتام پر جناب رسولؐ اللہ پر صلوٰۃ بھیجنے کے بعد کریں۔ یعنی جب بھی اپنے لیے دعا کریں تو جناب رسولؐ اللہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے لیے دعا کریں۔ ویسے جو مسنون طریقہ ہمارے لیے اپنی صلوٰۃ یعنی نماز کے بارے میں بتایا گیا ہے اس میں پہلے تو اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت کی تعریف و تعظیم کی جاتی ہے پھر جناب رسولؐ اللہ کے لیے صلوٰۃ کہی جاتی ہے اور سلام بھی، پھر اپنے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ صلوٰۃ جنازہ میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے حمد و ثناء بیان کی جاتی ہے پھر جناب رسولؐ اللہ کے لیے صلوٰۃ و سلام اور پھر میت کے لیے دعا اور پھر تمام امت مسلمہ کے لیے دعا کی جاتی ہے۔

امام ترمذیؒ نے جناب عمرؓ کی ایک روایت لکھی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ''ایک دعا، زمین اور آسمان کے درمیان رہتی ہے اور اوپر نہیں پہنچتی جب تک کہ تم رسولؐ اللہ پر صلوٰۃ نہ بھیجو''۔

ایک اور بات بہت ضروری ہے جسے عام حضرات اہمیت نہیں دیتے وہ یہ ہے کہ جناب رسولؐ اللہ کے علاوہ مومنین پر بھی اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی اور فضل و کرم کے ساتھ صلوٰۃ بھیجتے ہیں اس سلسلے میں سورہ احزاب (۳۳) کی آیت ۴۳ میں فرمایا گیا ہے کہ ''وہ ہی ہے (یعنی اللہ) جو صلوٰۃ بھیجتا ہے تم پر (مومنین پر) اور اس کے فرشتے بھی (یعنی فرشتے بھی تمہاری بخشش اور تم پر رحمت کے لیے دعا کرتے ہیں) تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اندھیروں سے نکال کر (یعنی جہالت اور

کفر کے اندھیرے) نور کی طرف لے آئے (ایمان کے صحیح علم کی طرف) اور وہ مومنوں پر بہت ہی مہربان ہے رحم کرنے والا''۔

اسی وجہ سے صلوٰۃ کی تکمیل سے قبل ہم سلام اور صلوٰۃ کہتے ہیں اللہ کے نبیؐ کے لیے اور پھر خود اپنے لیے بھی (علینا) اور اللہ کے نہایت تابعدار بندوں کے لیے (عباد الصالحین) اور پھر دوبارہ ہم جناب رسولؐ اللہ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں اور پھر ہم آخر میں اللہ تعالیٰ سے معافی کے لیے عرض گزارش کرتے ہیں اپنے لیے اور والدین کے لیے اور اللہ کے تمام تابعدار بندوں کے لیے۔

(۱۳۵) عمرہ ادا کرنے کا حکم

غزوہ بنو قریظہ کے ایک سال بعد جب مملکت اسلامیہ معاشی اور انتظامی لحاظ سے کافی مستحکم ہوگئی تو جناب رسولؐ اللہ کو حکم ملا، ایک خواب کے ذریعے کہ اب وہ عمرہ ادا کرنے کے لیے نکلیں تاکہ طواف کعبہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجا لائیں اور پھر اللہ کی خاطر جانور ذبح کر کے قربانیاں دیں۔ اور اس طرح اپنے باپ جناب اسماعیلؑ اور ابراہیمؑ کی یاد تازہ کریں کیونکہ ایک عرصہ دراز کے بعد اس صحرائے عرب میں دین ابراہیمی کی ترویج کے لیے انتھک کوششیں ہو رہی تھیں۔ اس لیے جناب رسولؐ اللہ نے اپنے اس ارادے کا اظہار اپنے ساتھیوں سے کیا اور پڑوسی قبائل کو بھی اس کی اطلاع دی تاکہ وہ بھی اس سفر میں شریک ہو سکیں۔ جناب رسالت مآبؐ اس سفر کے لیے چھٹی ہجری کے ماہ ذیقعد یعنی مارچ ۶۲۸ء کو روانہ ہوئے۔ آپؐ اور آپؐ کے رفقاء نے احرام زیب تن فرما رکھے تھے اور ان کی تلواریں نیام میں تھیں۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ حاجیوں کی کل تعداد چودہ صد تھی اور ان کے ساتھ قربانی کے (۷۰) ستر جانور تھے۔ جنہیں انہوں نے ہار پہنا رکھے تھے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ قربانی کے جانور ہیں۔ جناب رسالت مآبؐ نے جناب ام مکتومؓ کو مدینہ میں اپنا نائب چھوڑا۔

(۱۳۶) صلح حدیبیہ

امام بخاریؒ نے صلح حدیبیہ کے بارے میں ایک بہت طویل حکایت لکھی ہے، مسور بن مخرمہ اور مروان کے حوالے سے جن دونوں کی علیحدہ علیحدہ حکایتیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔

اس حکایت کے مطابق صلح حدیبیہ کا واقعہ درج ذیل کیا جا رہا ہے۔

جناب رسول اللہ مقررہ وقت پر رخت سفر ہوئے اور جب کافی فاصلہ طے کر لیا تو آپؐ نے فرمایا کہ خالد بن ولید ایک دستہ لیے غمیم کے مقام پر ہے اس لیے وہ دشمن کو نظر انداز کرنے کی غرض سے دائیں طرف کو مڑ رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! خالد کو مسلمانوں کے قافلے کی خبر نہ ہوئی جب تک کہ قافلہ اس کے نزدیک نہ پہنچ گیا اور پھر وہ وہاں سے جلدی میں واپس ہو گیا قریش کو بتانے کے لیے۔ جناب رسولؐ اللہ نے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ آپ ثانیہ پہنچ گئے (ثانیہ ایک پہاڑی راستہ تھا) جہاں سے وہ قریش تک پہنچ سکتے تھے لیکن قصوہ وہاں بیٹھ گئی۔ لوگوں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ اٹھی اس پر لوگوں نے کہا کہ قصوہ ڈھیٹ ہو گئی ہے۔ جس پر جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ اس کی عادت نہیں کہ وہ ڈھیٹ ہو جائے بلکہ اسے اس نے روکا ہے جس نے ہاتھی کو روکا تھا (یعنی ابرہا کا ہاتھی لشکر والا جو کعبہ ڈھانے گیا تھا اور قصوہ جناب رسولؐ اللہ کی اونٹنی کا نام)۔ پھر جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "اللہ کی قسم! اگر مکہ والے مجھ سے کسی چیز کے لیے بھی کہیں جو کہ اللہ کے حکم کے خلاف نہ ہو تو میں ضرور انہیں دے دوں"۔ پھر جناب رسولؐ اللہ نے اپنی اونٹنی کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ گئی اور جناب رسولؐ اللہ نے اس کے راستے کی سمت تبدیل کرا دی، یہاں تک کہ آپ مقام حدیبیہ کے ایک چھوٹے سے کنوئیں پر پہنچے اور وہاں اتر گئے۔ لوگوں نے اس کا پانی جلد ہی استعمال کر لیا پھر جناب رسولؐ اللہ نے اپنا ایک تیر دیا کہ اسے کنوئیں میں گاڑ دیا جائے اور پھر اس سے پانی نکلنے لگا اور لوگوں نے اپنی پیاس بجھائی۔

اسی دوران ایک شخص بدیل بن ورقہ جو خزاعہ قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور تہامہ میں سے تھا اپنے آدمیوں کے ساتھ آیا۔ وہ جناب رسولؐ اللہ کا پہلے سے اعتبار والا تھا، اس نے بتایا کہ کعب بن لوئی اور عامر بن لوئی جو حدیبیہ کے ایک پانی کے چشمے پر رہتے ہیں، ان کے پاس دودھ دینے والے اونٹ بھی ہیں وہ ان کے خلاف جنگ شروع کر سکتے ہیں اور وہ انہیں کعبہ جانے سے بھی روکیں گے۔

جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں، بلکہ عمرہ ادا کرنے آئے ہیں، اس میں شک نہیں کہ قریش کو جنگ نے کافی کمزور کر دیا ہے اور اس نے جنگ سے بہت نقصانات اٹھائے ہیں تو اگر وہ چاہتے ہیں تو میں ان کے ساتھ اس کا معاہدہ کر لیتا ہوں جس کے ذریعے

وہ میرے اور لوگوں کے درمیان نہ آئیں گے یعنی قریش کے علاوہ۔ اور اگر میں ان پر فتح پا لوں تو قریش کی مرضی ہو گی کہ یا تو وہ اسلام قبول کر لیں جیسا کہ دوسرے لوگوں نے کیا ہے اور اگر وہ چاہیں تو وہ کم از کم دوران معاہدہ لڑنے سے محفوظ ہو جائیں گے کہ اچھی طرح سے لڑ سکیں (یعنی مدت معاہدہ تک ان کو بے فکری ہو جائے گی)۔ لیکن اگر انہیں میری یہ پیشکش منظور نہیں تو اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ان سے لڑوں گا اپنے مقصد کی خاطر اس وقت تک جب تک کہ میں مر نہیں جاتا لیکن مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ ضرور اپنے مقصد کو فتح یاب کرے گا" یعنی غلبۂ اسلام کو۔

بدیل نے کہا میں انہیں یہ سب کچھ بتا دوں گا جو آپ نے فرمایا ہے۔ پھر بدیل قریش کے پاس گیا اور انہیں یہ سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ ہم اس شخص کے پاس سے آئے ہیں (یعنی محمدؐ سے) جسے ہم نے سنا ہے اگر تم چاہو تو ہم تمہیں بتا دیں۔ قریش میں سے کچھ بے وقوفوں نے چیخ کر کہا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن ان میں سے جو ذرہ عقل والے تھے انہوں نے کہا ہمیں بتاؤ تم نے اس سے کیا سنا، اس پر بدیل نے پوری کہانی سنا دی۔ پھر عروہ بن مسعود اٹھا اور اس نے کہا اے لوگو! کیا تم بیٹے نہیں ہو اور میں تمہارا باپ؟ (عروہ کا مطلب تھا کہ وہ بزرگ ہے ان کا) انہوں نے کہا ہے۔ اس نے پھر کہا، کیا تمہیں میرا بھروسہ نہیں ہے؟ انہوں نے کہا ہے۔ پھر اس نے کہا، کیا تمہیں علم نہیں کہ میں نے عکاظ کے لوگوں کو تمہاری مدد کے لیے بلوایا تھا اور جب انہوں نے انکار کر دیا تھا تو میں اپنے رشتہ داروں اور بچوں کو لایا تھا اور انہوں نے تمہاری مدد کی تھی؟ پھر انہوں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا اچھا تو اس شخص (رسولؐ اللہ) نے تمہیں مناسب تجویز پیش کی ہے، تمہیں چاہیے کہ تم اسے قبول کر لو اور مجھے اس سے ملنے دو۔

پھر عروہ، جناب رسولؐ اللہ کے پاس گیا اور آپؐ نے اسے وہی تجویز پیش کی۔ پھر اس نے کہا اے محمدؐ! کیا تمہیں اپنے رشتہ داروں کو تباہ کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہو گی؟ کیا تم نے عربوں میں سے کسی کو سنا ہے کہ آپ سے پہلے کسی نے اپنے رشتہ داروں کو تباہ کیا ہو؟ برعکس اس کے اگر کوئی مصیبت آ جائے تو کوئی تمہاری مدد نہ کرے گا۔ اللہ کی قسم! مجھے تمہارے ساتھ کوئی باعزت لوگ نظر نہیں آ رہے، بلکہ مختلف قبائل کے لوگ جو تمہیں اکیلا چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ یہ باتیں سننے کے بعد جناب ابوبکرؓ نے اس پر لعنت بھیجی اور کہا "کیا تمہارا یہ مطلب ہے

کہ ہم بھاگ جائیں گے رسولؐ اللہ کو چھوڑ کر" عروہ نے کہا "یہ کون ہے؟" انہوں نے کہا ابوبکر۔ عروہ نے پھر ان سے کہا "اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے اگر تم نے ایک وقت مدد نہ کی ہوتی اور جس کا بدلہ میں نہ دے سکا تو میں تمہیں جواب دیتا"۔

عروہ جناب رسولؐ اللہ سے باتیں کرتا رہا اور دوران گفتگو آپؐ کی داڑھی مبارک کو چھو لیتا (از راہ عزت)

المغیرہ بن شیبہ جناب رسولؐ اللہ کے ساتھ ہی کھڑا تھا تلوار تھامے ہوئے اور سر پر خود پہنے ہوئے اور جب بھی عروہ آپؐ کی داڑھی کے پاس اپنا ہاتھ لاتا تو مغیرہ اس کے ہاتھ پر تلوار کا دستہ مارتا اور کہتا کہ "ہٹاؤ اپنا ہاتھ جناب رسولؐ اللہ کی داڑھی سے"۔ عروہ نے اپنا سر اٹھایا اور پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ مغیرہ بن شیبہ ہے۔ عروہ نے کہا او دھوکے باز! کیا میں نے تمہاری دغابازی کے نتائج کو نہیں بھگتا۔ قبول اسلام سے قبل مغیرہ کچھ لوگوں کے ساتھ تھا، اس نے ان کو قتل کر کے ان کی ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر مدینہ آ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ مغیرہ نے کہا میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن جہاں تک ملکیت کا تعلق ہے تو میں نے اس میں سے کچھ نہیں لیا۔

عروہ اس کے بعد اپنے لوگوں میں واپس چلا گیا اور کہا اے لوگو! اللہ کی قسم میں بہت سے بادشاہوں کے دربار میں گیا قیصر، خسران اور نجاشی کے درباروں میں، لیکن ان میں سے کسی کی بھی ان کے درباریوں میں اتنی عزت نہیں دیکھی جتنی کہ محمدؐ کے ساتھی ان کی کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر وہ تھوکتا ہے تو ان کی تھوک انکے ساتھیوں میں سے کسی کے ہاتھ پر گرتی ہے جو اسے اپنے منہ پر اور جسم کے دیگر حصوں پر مل لیتا ہے اور وہ انہیں حکم دیتا ہے تو وہ اس کا حکم فوراً بجا لاتے ہیں اور اگر وہ وضو کرتا ہے تو لوگ بچا پانی لینے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ اس سے بات کرتے ہیں تو اپنی آوازوں کو دھیما کر دیتے ہیں اور عزت کے مارے وہ اس کے چہرے کی طرف مسلسل نہیں دیکھتے۔ عروہ نے مزید کہا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے تمہیں ایک اچھی اور باعزت پیشکش کی ہے تو اس کو قبول کر لو۔

بنو کنانہ کے ایک شخص نے کہا مجھے اجازت دو کہ میں اس کے پاس جاؤں، اور اسے اجازت مل گئی۔ جب وہ جناب رسولؐ اللہ کے پاس پہنچا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس شخص کا تعلق اس قبیلے سے ہے جو قربانی کے جانوروں کی عزت کرتے ہیں، اس لیے قربانی کے جانور سامنے

لے آؤ۔ اور جب وہ گیا تو لوگ اس وقت تلبیہ ادا کر رہے تھے (تلبیہ حاجیوں کا ترانہ ہے اس میں وہ اللہ سے عرض کرتے ہیں کہ وہ اس کی حضوری میں اس کے گھر کے لیے حاضر ہو گئے ہیں) جب اس شخص نے یہ سب کچھ دیکھا تو اس نے کہا سبحان اللہ! ان لوگوں کو تو روکنا مناسب نہ ہو گا، یہ تو کعبہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔

جب وہ لوٹ کر اپنے لوگوں کے پاس آیا تو اس نے کہا "میں نے قربانی کے جانور دیکھے جن پر ایسے نشان تھے اور انہیں ہار پہنائے ہوئے تھے میرا خیال نہیں کہ انہیں کعبہ جانے سے روکا جائے"۔

ایک اور شخص مکرز بن حفص اٹھا اور اس نے رسولؐ اللہ کے پاس جانے کی اجازت چاہی، اسے بھی اجازت مل گئی۔ جب وہ مسلمانوں کے پاس پہنچا تو جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "یہ مکرز ہے اور یہ مکار شخص ہے"۔ پھر مکرز سے جناب رسولؐ اللہ نے گفتگو شروع کی۔ اسی دوران ایک شخص سہیل بن عمرو بھی آ گیا، جب وہ مسلمانوں تک پہنچا تو جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "اب معاملہ آسان ہو گیا ہے"۔

سہیل نے جناب رسولؐ اللہ سے کہا کہ وہ ان کے سامنے ہونے والا معاہدہ کریں۔ اب جناب رسولؐ اللہ نے ایک لکھنے والے کو بلوایا اور اسے کہا 'لکھو اللہ کے نام سے جو بڑا رحمان اور رحیم ہے'۔ سہیل نے کہا "جیسا کہ رحمان کہا گیا، اللہ کی قسم! مجھے اس کا مطلب نہیں آتا تو اس لیے آپ صرف یہ لکھیں کہ 'اللہ کے نام سے' جیسا کہ پہلے لکھا کرتے تھے"۔ اس پر مسلمانوں نے کہا "اللہ کی قسم ہم تو نہ لکھیں گے سوائے 'اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے'۔ اب جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "لکھو! آپ کے نام سے اے اللہ! پھر آپ نے لکھوا لیا کہ یہ ایک معاہدہ امن ہے جو محمدؐ اللہ کے رسول کر رہے ہیں"۔ سہیل نے کہا "اللہ کی قسم! اگر ہم جانتے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں تو پھر ہم آپ کو کعبہ جانے سے کیوں روکتے اور آپ سے کیوں جھگڑتے۔ اس لیے لکھیں 'محمد بن عبداللہ'۔ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "اللہ کی قسم! میں اللہ کا رسول ہوں اگر تم لوگ مجھے نہ مانو تو پھر بھی، لکھو 'محمد بن عبداللہ' پھر آپؐ نے سہیل سے کہا اس شرط پر کہ تم ہمیں اجازت دو گے اللہ کے گھر کا طواف کرنے کی تاکہ ہم اس کے گرد طواف کر لیں"۔ سہیل نے کہا "اللہ کی قسم! ہم تمہیں اس برس اجازت نہ دیں گے۔ اس لیے کہ ہم عربوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتے کہ وہ ہمیں

کہ ہم نے تمہارے سامنے ہتھیار ڈال دیے لیکن ہم تمہیں اجازت دیں گے اگلے سال کی''۔

پس جناب رسولؐ اللہ نے لکھنے دیا۔ پھر سہیل نے کہا ''ہماری یہ بھی شرط ہے کہ تم ہر اس شخص کو واپس کر دو گے جو تمہارے پاس آئیگا ہم میں سے، اگرچہ کہ وہ تمہارا مذہب ہی کیوں نہ قبول کر لے''۔ مسلمانوں نے کہا ''سبحان اللہ! ایسا شخص کیسے لٹا دیا جائے گا کافروں کو جبکہ اس نے اسلام بھی قبول کر لیا ہو''۔

جب یہ گفتگو جاری تھی تو اس دوران ایک شخص ابو جندل بن سہیل بن امرو یہاں آن پہنچا جو آیا تھا وادی مکہ سے، جس کے پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور وہ مسلمانوں کے سامنے آ کر گر گیا۔ سہیل نے کہا ''اے محمدؐ، یہ پہلی شرط ہے جس کے ذریعہ ہم آپؐ سے امن قائم کریں گے کہ آپ ابو جندل کو میرے حوالے کر دیں''۔

لوگوں نے کہا کہ ابھی تک تو معاہدہ لکھا بھی نہیں گیا۔ سہیل نے کہا ''میں تمہیں اسے لکھنے کی کبھی اجازت نہ دوں گا''۔ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا ''اچھا کرو''۔ ابو جندل نے کہا ''اے مسلمانو! کیا تم مجھے کافروں کے حوالے کر دو گے جبکہ میں تمہارے پاس مسلمان کی حیثیت سے آیا ہوں؟ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ میں نے کتنی تکلیف اٹھائی ہے''۔

جناب عمر بن خطابؓ نے کہا کہ میں رسولؐ اللہ کے پاس گیا اور کہا ''کیا آپ اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟'' جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا ''بے شک ہوں''۔ میں نے کہا ''کیا ہمارا مقصد سچا اور دشمن کا مقصد جھوٹا نہیں ہے؟''۔ آپؐ نے فرمایا ''بالکل''۔ میں نے کہا ''پھر ہم اپنے دین کے معاملے میں اتنے نرم کیوں ہیں؟''۔ آپؐ نے فرمایا ''میں اللہ کا نبی ہوں اور میں اس کی حکم عدولی نہیں کرتا اور وہ مجھے فتح سے ہمکنار کر دیگا''۔ میں نے کہا ''کیا آپؐ نے ہمیں نہیں کہا تھا کہ ہم کعبہ جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟'' آپؐ نے فرمایا ''ہاں! لیکن کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ ہم اس برس کعبہ جائیں گے؟'' میں نے کہا ''نہیں''۔ آپؐ نے فرمایا ''پس تو پھر تم وہاں جاؤ گے اور اس کے گرد طواف کرو گے''۔

جناب عمرؓ نے مزید کہا ''پھر میں ابو بکرؓ کے پاس گیا اور کہا اے ابو بکرؓ! کیا آپؐ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟'' انہوں نے فرمایا ''ہاں''۔ میں نے کہا ''پھر ہم اپنے دین کے معاملے میں کیوں جھک جائیں؟''۔ انہوں نے کہا ''بے شک وہ اللہ کے نبی ہیں اور وہ اپنے رب کی حکم عدولی

نہیں کرتے جو انہیں فتح یاب کرے گا بس اس کے وفادار رہو، اللہ کی قسم وہ بالکل صحیح ہیں''۔ میں نے کہا ''کیا انہوں نے ہمیں نہیں کہا تھا کہ ہم کعبہ جائیں گے اور اس کے گرد طواف ادا کریں گے؟'' انہوں نے کہا ''ہاں! لیکن کیا انہوں نے تمہیں اس برس کعبہ جانے کے لیے کہا تھا؟'' میں نے کہا ''نہیں''۔ انہوں نے کہا ''تو پھر تم کعبہ جاؤ گے اور اس کے گرد طواف کرو گے''۔

اس کے بعد جب معاہدہ قلمبند ہو چکا تو جناب رسولؐ اللہ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا ''اٹھو اور اپنی قربانیاں ذبح کر دو اور پھر اپنے سر منڈوا لو''۔ اللہ کی قسم ان میں سے کوئی بھی نہ اٹھا، جب کہ رسالت مآبؐ نے اپنا یہ حکم تین مرتبہ دہرایا۔ اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ اپنی رفیقہ حیات سیدہ ام سلمہؓ کے پاس تشریف لائے اور ان سے لوگوں کا رد یہ بیان کیا۔ اس پر سیدہؓ نے فرمایا ''اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا حکم تسلیم کر لیا جائے؟ تو آپؐ خود باہر تشریف لے جائیں اور کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہیں اس وقت تک جب تک کہ آپؐ اپنی قربانی ذبح نہ کر لیں اور اپنے بال منڈوانے کے لیے نائی کو نہ بلوا لیں''۔ اس پر آپؐ باہر تشریف لے گئے اور ویسے ہی کیا۔ انہیں دیکھ کر آپؐ کے ساتھی فوراً اٹھے اور اپنی اپنی قربانیاں ذبح کرنا شروع کر دیں اور اپنے سر منڈوانے شروع کر دیے اور پھر اتنی بھیڑ ہو گئی کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں لوگ آپس میں جھگڑ نہ پڑیں۔

معاہدہ کی درج ذیل چیدہ چیدہ شرائط تھیں:

الف) مسلمان اور قریش آئندہ دس برس کے لیے امن قائم رکھیں گے۔

ب) مسلمان بغیر عمرہ ادا کیے واپس لوٹ جائیں گے۔

ج) مسلمان اگلے برس عمرہ ادا کر سکیں گے لیکن تین روز سے زیادہ نہ رکیں گے۔

د) مسلمان مکہ میں بغیر اسلحہ کے داخل ہونگے لیکن اپنی تلواریں میان میں رکھ کر لا سکیں گے۔

ہ) مسلمان اپنے ساتھ کسی مسلمان کو واپس نہ لیجا سکیں گے اور اپنے کسی ساتھی کو مکہ رکنے سے روک نہ سکیں گے۔

و) مسلمان ہر اس مسلمان کو واپس کر دیں گے جو مکہ سے ان کے پاس مدینہ چلا جائے گا۔

ز) قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ وہ کسی بھی فریق سے مل سکیں گے یعنی قریش یا مسلمانوں کے ساتھ۔

(۱۴۷) بیعت الرضوان

یہ بیعت ایک خاص مقصد کے لیے، اللہ کے رسولؐ کی تابعداری کے سلسلہ میں، ایک درخت کے نیچے جناب رسولؐ اللہ نے اپنے ساتھیوں سے لی اور اس پر عہد لیا گیا کہ وہ جناب عثمانؓ بن عفان کی جان کا بدلہ لینے کے لیے جناب رسولؐ اللہ کا ساتھ اس طرح سے دیں گے کہ وہ اس میں اپنی جان تک کی پرواہ نہ کریں گے۔ کیونکہ اس وقت یہ افواہ گردش کر گئی تھی کہ قریش نے جناب عثمانؓ کو شہید کر دیا ہے۔

مقام حدیبیہ کے قیام کے دوران نبی کریمؐ کی یہی کوشش رہی کہ کسی صورت جنگ نہ ہو بلکہ کفار مکہ سے امن کا معاہدہ طے پا جائے تاکہ عمرے کی ادائیگی ممکن ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے آپؐ نے قریش کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ وہ فقط عمرے کی ادائیگی چاہتے ہیں اور لڑائی کے ہرگز خواہاں نہیں۔ اس لیے اس گفت و شنید کے دوران آپؐ نے خواہش ظاہر کی کہ عمر بن خطابؓ مکہ جا کر معززین قریش سے اس معاملے پر بات کریں۔ لیکن جناب عمرؓ نے عرض کیا کہ ان کے بجائے عثمانؓ بن عفان کو اس مقصد کے لیے بھیجنا زیادہ مناسب رہے گا اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ان کا کوئی عزیز رشتے دار وہاں نہیں رہا جبکہ عثمانؓ ایک نرم مزاج شخص ہیں اور ان کی بہت مضبوط رشتہ داری بھی وہاں پر موجود ہے۔

اس لیے جناب رسالت مآبؐ نے جناب عثمانؓ کو اس مقصد کے لیے مکہ روانہ کیا۔ لہٰذا وہ ابوسفیان کے پاس گئے اور دوسرے سرداروں سے بھی ملے اور انہیں یقین دلایا کہ یہ ان کا پر امن دورہ ہے اور وہ صرف عمرہ ادا کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ قریش نے آپ کی بات سننے کے بعد ان سے کہا کہ وہ بے شک عمرہ ادا کریں لیکن سب کی بابت عمرے کی ادائیگی کے بارے میں بات چیت طویل پکڑ گئی اور جناب عثمانؓ نے اکیلے عمرہ کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف مسلمان جناب عثمانؓ کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، اور ان کے متعلق فکر مند بھی تھے کہ وہ وہاں محفوظ بھی ہیں یا نہیں۔ اس طرح تمام اصحاب رسولؐ اللہ اور خود جناب رسولؐ اللہ کو جناب عثمانؓ کی زندگی کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی۔ اس لیے جناب رسولؐ اللہ نے اپنے ہاتھ پر اپنے تمام ساتھیوں سے یہ عہد لیا (جسے بیعت کہتے ہیں) کہ وہ لوگ اپنی جانیں تک قربان کرنے سے گریز نہیں کریں گے، جناب عثمانؓ کے قتل کا بدلہ لینے کی خاطر۔ اور وہ

اپنے راہبر جناب رسولؐ اللہ کے ہر حکم پر عمل کریں گے۔ لیکن جناب عثمانؓ حفاظت کے ساتھ واپس تشریف لے آئے اور معاہدہ امن بھی ہو گیا۔

(۱۴۸) نزول سورۃ فتح

جب قافلہ رسالت واپس جانب مدینہ رخت سفر تھا اور صلح حدیبیہ ہو چکی تھی، قربانی کے جانور قربان ہو چکے تھے اور اصحاب رسولؐ اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے لیکن ان میں افسردگی چھلک رہی تھی اور بیشتر اصحاب اس صلح کو بے عزتی کا باعث بھی جان رہے تھے، انہیں طواف کعبہ اور زیارت کعبہ نہ ہونے کا دکھ بھی تھا، انہیں صلح کی خاطر اپنے جھکاؤ پر ناگواری بھی تھی۔ بہر حال وہ غم و غصے کے ملے جلے رجحان کے ساتھ واپسی کا سفر کر رہے تھے اور انہیں اس صلح میں اپنی کمزوری کا پہلو نظر آ رہا تھا۔

ان کی اس بے بسی اور ناراضی کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیاروں کو خوشی کا پیام دیا اور اپنے نبیؐ پر سورۃ الفتح (۴۸) کا نزول فرمایا۔ جس میں مالک ارض و سماوات مالک کل نے حدیبیہ کے امن معاہدے کو مسلمانوں کی توقعات کے برعکس مسلمانوں کی فتح قرار دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے نبی اور اس کے ساتھیوں پر خاص مہربانی اور عنایت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس افسردگی اور غم کو خوشی میں تبدیل کر دیا یعنی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فتح لکھ دی یعنی فتح لازم کر دی۔ اور آخر کار یہ صلح جو بظاہر کفار مکہ کے حق میں تھی اور اس کا ہر نقطہ بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھا، وہی نقاط ان کفار کے خلاف ہو گئے۔ اور وہ صلح فتح مکہ کا باعث بن گئی اور اس فتح میں کوئی جنگ کی مشقت اور مصیبت بھی نہ تھی، اس میں کسی بھی فریق کا کوئی شخص تہ تیغ نہ ہوا، کوئی گھر نہ اجڑا، کسی کا کوئی نقصان نہ ہوا، کسی کو قید نہ کیا گیا، کوئی کسی کے مال پر قابض نہ ہوا، صرف اتنا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے دشمن پر اپنا رعب طاری فرما دیا اور وہ مسلمانوں کے سامنے گردن جھکائے کھڑے رہے اور مسلمان اس شہر میں اس طرح سے داخل ہوئے کہ گویا ان کے دشمن ان کا استقبال کر رہے ہیں اور مکہ مسلمان ہو گیا۔

سورۃ فتح کا صلح حدیبیہ کے بارے میں جائزہ:

۱) آیت (۱) میں کہا گیا ہے کہ "بے شک! ہم نے (اللہ) تمہیں دی (اے محمد) ایک واضح فتح"۔

ب) آیت (۴) میں کہا گیا ہے "وہ (اللہ) جس نے بھیجی سکینت، ایمان والوں کے دلوں میں، کہ وہ ایمان میں اور زیادہ بڑھ جائیں اپنے (موجودہ) ایمان کے ساتھ۔ اور اللہ ہی کی ہیں تمام افواج آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہی ہے ہر کچھ جاننے والا، تمام دانش کا مالک"۔

جناب اصحابہ کرام عمرہ نہ کرنے کی وجہ سے بہت افسردہ تھے اور جو کچھ لکھا جارہا تھا اس معاہدے میں، انھیں بالکل پسند نہ تھا۔ اور اسی وجہ سے جب رسالت مآبؐ نے انھیں قربانی کرنے کے لیے فرمایا اور سر منڈوانے کے لیے تو کسی نے اس حکم پر توجہ نہ دی۔ اور جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس وقت جب انہوں نے نبیؐ کو قربانی کرتے اور سر منڈواتے دیکھا تو اسی وقت انہوں نے نبیؐ کی تقلید شروع کر دی۔ اور یہی غلطی کا احساس اور پھر رسولؐ اللہ کے حکم کا بجا لانا ہی درحقیقت اللہ کی طرف سے سکینت تھی۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس وقت طاری فرمادی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان پر اس وقت اور زیادہ مہربان ہوئے جب انہوں نے اپنی غلطی کا احساس کر لیا کہ وہ حضرات اللہ اور اس کے رسولؐ کی حکمت کو نہیں سمجھ پائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسولؐ کا ہر فیصلہ اللہ کے حکم کے تابع ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ماننے کے لیے کسی فائدے یا نقصان کو مدنظر رکھنا نہیں چاہیے۔ بس جس طرح اللہ کے رسولؐ نے فیصلہ کیا اور حکم دیا، بغیر کسی شرط کے اور بغیر کسی عذر کے اور بغیر کسی حجت کے، اس پر عمل لازم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کو اللہ کے رسولؐ ہی سمجھے اور اس کے مطابق عمل پیرا ہوئے۔

ج) آیت (۱۱) میں فرمایا گیا کہ: "وہ بدو جو عمرے کی خاطر سفر کرنے سے پیچھے رہ گئے، وہ تمہیں کہیں گے کہ "ہمارے مال اور ہمارے گھر والے ہماری راہ میں حائل ہوئے، اس لیے ہماری بخشش کے لیے دعا کریں"۔ وہ اپنی زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔ پس ان سے کہیں: تو پھر کس کے پاس کیا کوئی طاقت ہے (کہ دخل دیں) تمہاری طرف سے اللہ کے حکم میں، اگر وہ چاہے تمہیں نقصان پہنچانا یا کوئی فائدہ پہنچانا۔ نہیں! لیکن اللہ ہی ہر شے کا جاننے والا ہے جو تم کرتے ہو"۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان بدوؤں کا گھڑا ہوا عذر جو پیچھے رہ گئے تھے، عمرے پر

جانے کے لیے جناب رسولؐ اللہ کے ساتھ، وہ بیان فرمایا ہے اور ان کے منافقانہ بیان کو افشا کر دیا تاکہ لوگ عبرت پکڑیں اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو پہچانیں۔

د) آیت (۱۸) میں فرمایا گیا ہے کہ "بے شک اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے خوش ہوئے جب انہوں نے آپؐ سے وعدہ کیا درخت کے نیچے۔ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان کے قلوب میں کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور انھیں جلد ہی فتح کی خوشخبری کا انعام عطا فرمایا"۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلد ہی فتح کی خوشخبری خیبر کی فتح کی صورت میں بھی تھی اور اس سفر عمرہ اور معاہدہ امن یعنی بیعت رضوان کے حوالے سے بھی فتح کی خوشخبری تھی فتح مکہ کی صورت میں۔ فتح خیبر میں مسلمانوں کو کافی مال غنیمت ہاتھ آیا اور ان کی عزت میں اضافہ ہوا۔ جبکہ فتح مکہ میں مسلمان تمام عرب پر چھا گئے اور اس کے فوراً بعد جنگ حنین میں بھی مال و دولت کے انبار لگ گئے جو جناب رسول اکرمؐ نے سب کا سب اہل مکہ کو دے دیا۔

ہ) آیت (۲۴) میں فرمایا گیا کہ "اور وہ (اللہ) جس نے ان کے ہاتھ روکے تم سے اور تمہارے ہاتھ روکے ان سے بطن مکہ (کے قریب) جبکہ اس نے تمہیں ان پر بھاری کر دیا اور اللہ ہمیشہ سب کچھ دیکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو"۔

اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہٗ تعالیٰ یاد دلاتے ہیں، اپنے تابعداروں کو اپنی مدد کہ جب اس نے کافروں کے ہاتھ روکے اور مسلمانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچنے دیا اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بھی ہاتھ روکے رکھے اور وہ کعبہ کے نزدیک کافروں سے نہ لڑ سکے اور لڑنے کے بجائے انہوں نے معاہدہ امن کر لیا۔ جس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے ایمان والوں کے لیے۔

و) آیت (۲۷) میں فرمایا گیا کہ "بے شک اللہ پورا کرے گا اس بات کو جو اللہ نے اپنے پیغمبر کو دکھایا، سچائی کے ساتھ (خواب میں) یقیناً تم مسجد الحرام میں داخل ہوگے، اگر اللہ نے چاہا تو۔ اور پھر کچھ سر منڈواتے ہوں گے اور کچھ بال کترواتے ہوں گے اور تمہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ وہی جانتا ہے جو کچھ تم نہیں جانتے اور اس نے دے دی اس کے علاوہ ایک اور فتح مستقبل قریب میں"۔

(۱۴۹) مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے غیر مسلموں سے شادی کی ممانعت

جب حدیبیہ کا امن معاہدہ ہو چکا اور اللہ کے رسولؐ اپنی قربانی ذبح کر کے اپنے بال منڈوا چکے تو آپؐ کے پاس چند مسلمان خواتین آ گئیں۔ اس کی وجہ سے معاملات میں معاہدہ حدیبیہ کی وجہ سے کچھ تنگی پیدا ہو گئی۔ کہ ان خواتین کو معاہدہ کی روح سے مسلمان اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو جو تمام امت مسلمہ اور خاص طور پر جناب رسولؐ اللہ کو درپیش ہوا، اللہ تعالیٰ نے فوری طور پر حل فرمایا اور اس بارے میں اپنا حکم سورۃ ممتحنہ (۶۰) کی آیت (۱۰) میں صادر فرما دیا۔

اس آیت مبارکہ کے مطابق فرمایا گیا کہ "اے ایمان والو! جب مسلمان خواتین تمہارے پاس ہجرت کر کے آئیں تو ان کی جانچ پڑتال کرو (یعنی ان کے ایمان کے متعلق کہ کہیں وہ جاسوسی یا دشمنی کے لیے تو نہیں آ گئیں) اور اللہ ہی ان کے ایمان کے متعلق خوب جانتا ہے اور جب تمہیں یقین ہو جائے کہ وہ سچی مسلمان ہیں تو پھر انہیں کافروں کے پاس واپس مت بھیجو۔ وہ کافروں کے لیے جائز نہیں ہیں (کہ ان کی بیویاں بنیں) اور نہ ہی غیر ایمان والے ان کے لیے جائز ہیں (ان کے شوہر بننے کے لیے)۔ لیکن ان (کافروں) کو دے دو، جو انہوں نے خرچ کیا ہے (مہر میں) اور اس میں کوئی گناہ نہیں تم پر اگر تم ان سے نکاح کر لو اگر تم نے انہیں مہر دے دیا ہے۔ اسی طرح سے غیر ایمان والی عورتوں کو مت رکھو اپنی بیویاں بنا کر اور ان سے طلب کر لو جو مہر تم نے انہیں ادا کیا ہے اور انہیں بھی (کافروں کو) مانگنے دو جو انہوں نے خرچ کیا ہے (مہر)۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اور وہی تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور عقل کل ہے"۔

لہٰذا یہ تو بالکل واضح ہو گیا کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اس معاہدہ امن میں سے وہ حصہ معاہدے کا جس کے تحت ایمان والی عورتوں کو جو کافروں سے نکل کر مسلمانوں کی پناہ میں آ گئیں، ان کا کافروں کے پاس واپس بھیجنا اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا اور اس شق کو اپنے حکم سے معاہدے سے خارج کر دیا۔ جب عمر بن خطابؓ نے یہ حکم سنا تو فوری طور پر اپنی دو غیر مسلم ازواج کو اپنے نکاح سے فارغ کر دیا۔ جنہوں نے بعد ازاں ایک نے تو معاویہ بن ابوسفیان

اور دوسری نے صفوان بن امیہ سے نکاح کر لیا۔

مندرجہ بالا آیت (۱۰) سورۃ ممتحنہ (۶۰) بہت ہی اہمیت کی حامل ہے اور آج بھی اس آیت مبارکہ کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ امت مسلمہ کے بہت سے افراد اس کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مزید یہ کہ اس آیت کو سورہ المائدہ (۵) کی آیت (۵) اور سورہ بقرہ کی آیت (۲۲۱) کے ساتھ ملا کر پڑھنا بہر چند مفید ہو گا۔ کیونکہ ان تینوں آیات مبارکہ کا آپس میں ایک گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے جیسا کہ قانونی معاملات کو سمجھنے اور نافذ کرنے کی غرض سے بہت سارے قانونی نکات ملا کر پڑھنے ازحد ضروری ہوتے ہیں، ورنہ قانونی پیچیدگیاں اور قانونی خلاف ورزی پیش آ جاتی ہے۔ جب ان نکات کو ایک دوسرے سے ملا کر اور آپس میں ان کا موازنہ کر کے پڑھا جاتا ہے تو قانونی نقاط کی وضاحت کے ساتھ ساتھ قانون بنانے کا اصل مقصد اور روح عیاں ہو جاتی ہے۔ اور ہماری عدالتیں بھی ایسے ہی قانونی نقاط کی وضاحت کر کے قانونی فرمان صادر کرتی ہیں۔ لہٰذا جب ہم تینوں آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر سمجھنے کی صدق دل سے کوشش کریں گے تو ہمیں ایمان والے مرد اور عورتوں کا نکاح ان غیر ایمان والی عورتوں اور مردوں کے ساتھ ہونے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی منشا و مرضی کے متعلق صحیح علم ہو جاتا ہے۔

سورۃ المائدہ (۵) کی آیت (۵): اس آیت مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ "جائز قرار دے دیا تمہیں آج کے اس روز طیبات (یعنی حلال اور جائز اللہ کی طرف سے) کھانا اہل کتاب کا (عیسائی اور یہود کا) جائز ہے تمہارے لیے اور تمہارا ان کے لیے اور (جائز ہیں تمہارے لیے نکاح کے بعد) پاکدامن خواتین جو ایمان داروں میں سے ہوں اور پاکدامن خواتین ان میں سے جن کے پاس اللہ کی کتاب آئی تم سے پہلے (یعنی عیسائی اور یہودی) جب کہ تم ان کے مہر ادا کر چکو اور تمہارا مقصد پاکدامنی کے ساتھ رہنا بھی ہو (یعنی قانونی میاں بیوی کی حیثیت سے) اور نہ کہ تم غیر شرعی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہو۔ اور جو کوئی بھی ایمان کو نظر انداز کر دے تو پھر اس کے کام بیکار ہو گئے اور آخرت میں وہ گھاٹا پانے والوں میں سے ہو گا"۔

سورۃ البقرہ (۲) آیت (۲۲۱) میں ارشاد ہے کہ "اور مت نکاح کرو المشرکات سے (یعنی وہ خواتین جو شرک کی مرتکب ہوتی ہوں)، اس وقت تک جب تک کہ وہ ایمان نہ لے

آئیں (اللہ کی واحدانیت پر) اور بے شک ایک غلام یا کنیز عورت جو ایمان والی ہو، وہ بہتر ہے ایک (آزاد) مشرک سے بے شک وہ تمہیں لبھاتی ہی کیوں نہ ہو اور مت دو (اپنی عورتوں کو) نکاح میں مشرکین کے اس وقت تک جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور بے شک! ایک ایمان والا غلام بہتر ہے ایک (آزاد) مشرک سے بے شک وہ تمہیں اچھا ہی کیوں نہ لگتا ہو۔ وہ (مشرکین) دعوت دیتے ہیں تمہیں جہنم کی، لیکن اللہ دعوت دیتا ہے (تمہیں) جنت کی اور تمہیں عطا فرمائے گا معافی (تمہارے گناہوں کی) اور وہ بتاتا ہے اپنی آیات یعنی نشانیاں (قرآنی آیات، نصیحت، ثبوت، گواہیاں، مثالیں، اپنی طرف سے بیان وغیرہ) صاف ان انسانوں کے لیے تاکہ وہ انہیں یاد رکھیں (اور نصیحت پکڑیں)''۔

ان آیات مبارکہ کے بعد درج ذیل دو احادیث جناب رسول اکرمؐ کی بھی اس غور میں شامل کر لینا بہتر ہوگا تاکہ مسئلہ اور بہتر طریقے سے سمجھ میں آ جائے۔

ا) امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے جناب ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ ''ایک خاتون نکاح کے لیے چنی جاتی ہے اس کے چار خواص کی وجہ سے یعنی اس کی دولت کی وجہ سے اس کے مرتبے کی وجہ سے، اس کی خوبصورتی کی وجہ سے، اس کی دین داری کی وجہ سے یعنی ایمان کی وجہ سے لہٰذا اس عورت سے شادی کرو جو دین دار ہو''۔

ب) امام مسلمؒ نے ابن عامرؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ ''اس دنیا کی زندگی ایک خوش کرنے والی چیز ہے اور سب سے زیادہ خوش کرنے والی شے اس زندگی کی دیندار بیوی ہے''۔

(۱۴۰) اہل کتاب خاتون سے شادی کرنے اور اہل کتاب کا کھانا کھانے کا قانونی پہلو

سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۲۲۱) اور سورۃ المائدہ (۵) کی آیت (۵) جو سابقہ عنوان (۱۳۹) بیان کی گئی ہے ان آیات مبارکہ سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں جو نہایت ہی قابل غور ہیں۔

ا) سورۃ (۵) کی آیت (۵) ایک مسلمان شخص کو اجازت دیتی ہے، کسی ایک خاتون سے

نکاح کرنے کی جو اہل کتاب میں سے تعلق رکھتی ہو، اور محصنہ یعنی پاکدامن ہو۔

۲) یہی آیت یعنی (۵:۵) مسلمانوں اور اہل کتاب کو ایک دوسرے کے کھانے کی اجازت دیتی ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیشتر اہل کتاب تو خنزیر کھاتے ہیں، کھانے میں شراب کا استعمال کرتے ہیں، غیر ذبیحہ استعمال کرتے ہیں تو کیا یہ سب جائز ہے؟
اس کا جواب ہوگا، نہیں! بلکہ صرف وہ جائز ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول نے جائز کیا ہے۔ یعنی اس آیت کا حکم اس شرط پر لاگو ہوگا کہ وہ کھانا حلال یعنی جائز ہو۔

۳) اب سورۃ (۶۰) ممتحنہ کی آیت (۱۰) اور سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۲۲۱) یہ اجازت نہیں دیتی کہ کوئی مسلمان (مرد اور عورت) کسی مشرک (عورت اور مرد) سے نکاح کرے۔

۴) لفظ ''مشرک'' مخالفت میں استعمال ہوتا ہے لفظ ''توحید'' کے تصور سے یعنی کوئی بھی ایسا شخص جو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک میں، اللہ کی صفات میں، اللہ کی ملکیت میں کسی اور شخص کو یا طاقت کو یا ذریعہ کو شامل کرے یا شریک کرے تو وہ مشرک ہے۔
گویا مشرک کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی شخص جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں، اس کے ناموں میں، اس کی صفات میں، اس کی حاکمیت میں، اس کی ملک میں، اس کے حکم میں، اس کے اختیار میں، اس کی عبادات میں، کسی کو بھی، کسی بھی طریقے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک ٹھہراتا ہو تو ایسا شخص مشرک ہوگا۔

۵) سورۃ (۶۰) کی آیت (۱۰) واضح طور پر حکم لگاتی ہے اور سورۃ (۲) کی آیت (۲۲۱) بھی واضح حکم لگاتی ہے کہ ''کوئی بھی مسلمان (مرد یا عورت) کسی مشرک (مرد یا عورت) سے نکاح نہیں کر سکتا۔

۶) جناب رسالت مآبؐ نے بھی فرمایا کہ ایسے شخص کو شادی کے لیے منتخب کرو جو اللہ کے احکامات کی تابعداری کرتا ہو۔

اب ان تصریحات یا نکات کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے جو یقیناً بہت اہم اور قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں جو سورۃ (۶۰) کی آیت (۱۰) اور سورۃ (۲) کی آیت (۲۲۱) میں وارد ہوتا ہے اس کے مطابق سورۃ (۵) کی آیت (۵) کی یہ اجازت کہ ''ایک مسلمان مرد اہل کتاب عورت سے شادی کر سکتا ہے'' کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

اب اس کے جواب کے لیے ضرورت ہے امانت و دیانت کی تقویٰ و پرہیزگاری کی اور اللہ تعالیٰ کی حقیقی تابعداری کی اور آخرت کی جوابدہی کی اور سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ سورۃ (۵) کا حکم اور اجازت اس وقت ہی جائز ہوگی جب دوسری دو آیات یعنی (۶۰) کی (۱۰) اور (۲) کی (۲۲۱) کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو۔

یعنی کہ ایک مسلمان کو کسی اہل کتاب خاتون سے شادی کی اجازت صرف اسی صورت ہوگی جب کہ وہ شرک نہ کرتی ہو۔ بالکل اسی طرح سے جیسا کہ اسی آیت یعنی (۵) کی (۵) میں جب مسلمانوں کو اہل کتاب کا کھانا جائز ہے لیکن وہ حرام اشیاء نہیں کھا سکتا، ویسے ہی شادی کے لیے مشرک خاتون بھی حرام ہوگی اور وہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا۔

یہ بات بہرحال ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ اہل کتاب میں سے ہنوز ایسے لوگ موجود ہیں جو اللہ کی ذات سے شرک نہیں کرتے لہٰذا مشرک نہیں ہیں اور ایسے لوگ جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ میں بھی تھے۔ مثلاً سیدہ خدیجہؓ کے چچازاد ورقہ بن نوفل اور شاہ حبشہ نجاشی اور اس کے ملک کے رہنے والے دیگر افراد۔ یہ لوگ سچے اہل کتاب تھے اور مومنین میں سے تھے اور اسی لیے انہوں نے جناب رسالت مآبؐ کی رسالت پر گواہی دی تھی۔ آج اس زمانہ میں بھی عیسائیوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو شرک نہیں کرتا اور ان کے لوگ گمنام طریقے سے رہ رہے ہیں لیکن ہیں ضرور اور ان کو صرف مثال کے طور پر ہی بیان کیا جا سکتا ہے جبکہ زیادہ تر مسیحی شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جہاں تک اہل یہود کا تعلق ہے ان کی اکثریت شرک نہیں کرتی بلکہ ایک گروہ ان میں ایسا ہے جو حضرت عزیرؑ کو (نعوذ باللہ) اللہ کا بیٹا کہتا ہے۔ لیکن یہ فرقہ بھی اب تقریباً معدوم ہے۔

لہٰذا اب سورۃ المائدہ (۵) کی آیت (۵) کے مطابق جب اس آیت کو دیگر دو آیات یعنی (۶۰) کی (۱۰) اور (۲) کی (۲۲۱) کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو یوں کہنا بجا ہوگا کہ: ایک مسلمان کسی اہل کتاب خاتون سے نکاح کر سکتا ہے جبکہ (الف) وہ محصنہ یعنی پاکدامن ہو اور (ب) وہ شرک بھی نہ کرتی ہو۔ اور اسی طرح سے آیت (۵) کی (۵) کے مطابق ایک مسلمان اہل کتاب کا کھانا کھا سکتا ہے اگر وہ حلال یعنی جائز ہو۔ کیونکہ عیسائی اہل کتاب خنزیر کھاتے ہیں جو ان کی شریعت میں بھی اور ہماری شریعت میں بھی حرام ہے اور غیر ذبیحہ کھاتے ہیں یہ بھی ہمارے ہاں اور ان کے ہاں حرام ہے۔ اہل یہود بہرحال نہ غیر ذبیحہ کھاتے ہیں اور نہ ہی خنزیر۔ اور اہل یہود

کے قوانین یعنی توریت کے قوانین ہی اہل مسیح کے لیے لاگو ہیں۔ اب آپ سمجھ لیں کہ امت مسلمہ کے بیشتر افراد درج ذیل گناہوں میں ملوث ہیں لیکن سب سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ اس ضمن میں علماء کے فتوے بھی ان کے حق میں موجود ہیں۔ جبکہ بیشتر مسلمان:

۱) مشرک اہل کتاب سے شادی کرتے ہیں: اس کے نتیجے میں وہ خود اور ان کی اولاد نہ معلوم کیا مذہب اختیار کر لیتے ہیں جو ایمان سے عاری ہوتا ہے۔

۲) غیر ذبیحہ جانوروں کا گوشت استعمال کرتے ہیں: یوں کہنا چاہیے کہ اہل کتاب کے ممنوعہ کھانے سے وہ پرہیز نہیں کرتے۔

بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے حکم سے لاپرواہی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اور یہی اللہ کی نافرمانی ہے اور اسی بنیاد پر جناب عبداللہ بن عمرؓ یہ فرماتے تھے کہ عیسائی خواتین سے نکاح نہیں کرنا چاہیے اور اس کی وجہ یہ فرماتے تھے کہ میں نہیں جانتا کہ اس سے زیادہ اور کیا شرک ہوگا کہ کوئی یہ کہے کہ عیسیٰؑ اس کا رب ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرکات سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

بلکہ اس حکم کو اس حد تک وسعت دینی چاہیے کہ کوئی بھی شخص چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ کہلائے اگر کھلا شرک کرتا ہے اس کا ایمان قائم نہیں رہتا جب تک کہ وہ تجدید ایمان نہیں کر لیتا اور توبہ نہیں کرتا اس کا مسلمان ہونا مشکوک ہوگا اور وہ مشرک کے زمرے میں آئے گا۔

مختصراً یہ کہ ہم پر اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی پابندی کرنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ایمان کو مستحکم فرمائے اور ہمیں اپنی نافرمانی سے اور اپنے رسولؐ کی نافرمانی سے محفوظ رکھے اور اللہ سبحانہٗ تعالیٰ جو بہت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ہماری عقل و دانش میں برکتیں عطا فرمائے اور ہمیں اپنی اطاعت نصیب فرمائے (آمین)

(۱۴۱) صلح حدیبیہ کے نتائج

المسور ابن مخرم اور مروان کی روایت کے مطابق جو صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں عنوان (۳۵) میں مذکور تھی، اسی کے سلسلے کو بڑھاتے ہوئے دیگر نتائج کے بارے میں جو صلح حدیبیہ کے بعد پیدا ہوئے درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

جب رسول اکرمؐ مدینہ واپس پہنچ چکے تو ابوبصیر ایک نومسلم جو قریش مکہ میں سے تھا وہ وہاں سے بھاگ کر مدینہ آ گیا اور جناب رسالت مآبؐ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اہل قریش میں سے اس کا پیچھا کرتے کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے لہٰذا ابوبصیر کو ان کے حوالے کرنا پڑا۔ حدیبیہ اس معاہدے کے تحت۔ جب اہل قریش اسے واپس مکہ لے جا رہے تھے تو ابوبصیر ان دو میں ایک کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ دوسرا مدینہ بھاگ گیا اور جناب رسول اللہؐ کے پاس پہنچ گیا اور آپؐ کو تمام ماجرا سنایا۔ اسی اثنا ابوبصیر بھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے جناب رسول اللہؐ سے عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ! اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے آپ کا وعدہ پورا کروا دیا اور آپؐ نے تو مجھے ان کے حوالے کر دیا تھا لیکن اللہ نے مجھے ان سے بچا لیا"۔ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا "تف ہو اس کی ماں پر! یہ کتنا زبردست جنگی چالیں چلنے والا ہوگا، اگر اس کو کچھ ساتھی مل جائیں تو"۔

جب ابوبصیر نے یہ بات سنی تو ابوبصیر سمجھ گیا کہ اسے پھر واپس کر دیا جائے گا، اس پر وہ پھر بھاگ گیا حتیٰ کہ ساحل سمندر تک پہنچ گیا۔ ابوجندل جسے میثاق حدیبیہ کے وقت مسلمان اپنے ساتھ نہ لا سکے تھے، وہ بھی مکہ سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا حتیٰ کہ ابوبصیر سے آ ملا۔

اس کے بعد مکہ کے مسلمان یا نومسلموں کے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے مکہ سے بھاگ کر ابوبصیر کے گروہ میں شامل ہو جائیں اور آزادی سے اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ اس طرح سے ابوبصیر کے زیر قیادت ایک چھوٹا سا لیکن مضبوط گروہ قریش کے خلاف بن گیا۔ وہ چونکہ ساحل سمندر اور شام، مکہ شاہراہ سے قریب تھے لہٰذا انہوں نے اہل قریش کے قافلوں کو لوٹنا اور ان کے نگہبانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔

اس طرح سے ایک تو قریش کے کارواں لٹتے رہے اور دوسرا یہ کہ ان کے مسافر محفوظ نہ رہے بلکہ یوں کہیے کہ ان کی بہت ہی اہم شاہراہ ان کے لیے پرخطر ہو گئی۔ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں جا کر درخواست کریں کہ آپؐ اس معاملہ میں ان کی مدد کریں۔ اس طرح سے انہوں نے خود ہی جناب رسالت مآبؐ سے درخواست کی کہ وہ ان مسلمانوں کو مدینہ کے لیے قبول کر لیں لہٰذا آپؐ نے اس مسلمان گروہ کو مدینہ بلوا لیا۔ اس وجہ سے اہل مکہ کا غرور اور تکبر نیچا پڑ گیا اور انہوں نے اس بات کو مجبور ہو کر خود ہی مان لیا جسے وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور مسلمان اسے اپنی بے عزتی سمجھ رہے تھے۔ اس

طرح سے اب اہل مکہ جناب رسالت مآبؐ کو مسلمانوں کا سربراہ ماننے کے لیے بذات خود مجبور ہو گئے اور سمجھ گئے بلکہ انہوں نے تسلیم کر لیا کہ مسلمان ان کے مقابلے میں ایک بڑی طاقت ہیں۔

(۱۴۴) عرب سے باہر دعوت اسلام

صلح حدیبیہ کے بعد جناب رسالت مآبؐ کو ایک طرف سے کچھ سکون میسر ہوا تو آپؐ کی توجہ علاقہ عرب کے باہر مرکوز ہوئی اور آپؐ نے پڑوسی ممالک کے سربراہان مملکت کو پیغام اسلام بھیجنا مناسب سمجھا۔ اتفاق سے دنیا کی دو عظیم طاقتیں عرب سے متصل تھیں یعنی اہل فارس اور اہل روم۔ خط لکھنے سے پہلے آپؐ نے ضروری سمجھا کہ آپؐ کے پاس ایک مہر ہونی چاہیے جو کہ خطوط پر لگائی جائے اور یہ رواج کے مطابق بھی تھا کہ سربراہ مملکت اپنے خط کے اختتام پر اپنی مہر ثبت کرتے تھے۔ لہٰذا چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی گئی تھی جس پر یہ الفاظ کندہ کیے گئے "محمد رسول اللہ" یہ تین الفاظ اس طرح سے کندہ کیے گئے کہ نیچے لفظ "محمد" درمیان میں لفظ "رسول" اور سب سے اوپر لفظ "اللہ" کندہ کروایا گیا۔

چند اہم خطوط جو ہمسایہ ریاستوں کے سربراہان کو بھیجے گئے، درج ذیل کیے جا رہے ہیں تاکہ دعوت کے بنیادی اصولوں کا علم ہو جائے۔ اور پتا چلے کہ جناب رسالت مآبؐ نے اللہ کے پیغام کو عرب کے باہر کس طرح سے اور کن الفاظ میں پیش کیا۔

بے شک یہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی تھی کہ اس کی مخلوق اعلیٰ کو پتا چل جائے کہ اس دنیا میں زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ کار کیا ہے کہ ان کو حیات جاوداں میں کامیابی و کامرانی حاصل ہو جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق اعلیٰ سے بہت زیادہ محبت فرماتے ہیں بلکہ ان کی ماؤں سے بھی ستر (۷۰) گنا زیادہ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ انسان کی رہنمائی فرمائی اور ان کی رہنمائی کے لیے ایک لاکھ سے زائد انبیاء اور رسل مبعوث فرمائے تاکہ وہ انسانوں کو زندگی کے حقیقی مقصد کی طرف مائل کر سکیں۔

اب چیدہ چیدہ خطوط کا ترجمہ درج ذیل کیا جا رہا ہے

الف) قیصر کے نام خط:

اس قیصر (Caeser) کا نام ہرکولس (Heracles) تھا اور یہ (۶۱۰ تا ۶۴۱ء) تک رہا۔ قیصر

روم کے بادشاہ کو کہتے تھے، یہ بازنطینیہ کا بادشاہ تھا یعنی شرقی سلطنت روما کا۔ جناب رسالت مآبؐ نے دحیہ کلبی کو خط لیجانے اور قیصر کے حوالے کرنے پر مامور فرمایا اور انہوں نے یہ خط بصرہ کے گورنر کو پہنچایا تھا کہ وہ اسے قیصر تک پہنچا دے۔

خط کے مضمون کا مکمل ترجمہ درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد، عبداللہ والرسولہٗ کی طرف سے

ہرکولیس، شاہ بازنطینیہ کے لیے

وہ خوش نصیب ہیں جو سچی ہدایت کو مانتے ہیں

میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اسلام قبول کر لو تا کہ تم امن کے ساتھ رہ سکو۔ اگر تم دائرہ اسلام میں آجاتے ہو تو اللہ تمہیں دہرا اجر عطا فرمائے گا۔ لیکن اگر تم اس سے منہ موڑ لیتے ہو تو پھر تمہارے عوام کے گناہ کا بوجھ بھی تمہارے کندھوں پر آجائے گا۔

شاہ نے یہ خط پڑھنے کے بعد خواہش ظاہر کی کہ اسے جناب رسالت مآبؐ کے کردار اور مشن کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہو جائیں۔ اس لیے اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے کوئی وہیں کا شخص مل جائے جہاں کے محمدؐ ہیں۔ اللہ کا کرنا کہ جناب محمدؐ کا سب سے بڑا دشمن ابوسفیان اپنی تجارت کے سلسلے میں وہاں موجود تھا، اس لیے اسے بادشاہ کے دربار میں لایا گیا۔ جب ابوسفیان سے عالی جناب محمدؐ کے بارے میں یعنی آپؐ کے کردار کے بارے میں اور ان کے دین کے بارے میں پوچھا گیا تو باوجود اس کے کہ ابوسفیان نے ان کے دین کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور ان کا سب سے بڑا دشمن بن گیا تھا لیکن بادشاہ کے دربار میں وہ ان کے متعلق سچائی کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔

بادشاہ جناب رسولؐ اللہ کے کردار کے متعلق سن کر حیران رہ گیا اور ساتھ ہی اس کے لیے قبائل عرب پر آپؐ کا دینی غلبہ بھی حیران کن تھا۔ لیکن بدبختی کا کیا کیجیے بادشاہ متاثر ہونے کے باوجود بھی ایمان کی روشنی سے فیضیاب نہ ہو سکا۔ بقول اس کے اس کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ بہر حال جناب رسولؐ اللہ کا نامہ عزت افزائی کے ساتھ واپس لوٹا۔

ب) کسریٰ یعنی خسرو یا Chosroes، شاہ فارس کے نام خط:

جناب رسولؐ اللہ نے اپنا خط عبداللہ بن حذیفہ کے ہاتھ کسریٰ کے لیے بھیجا۔ خط کا متن درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منجانب: محمد، عبداللہ و رسولہٗ

برائے: کسریٰ، شاہ فارس

سلامتی ہے اس کے لیے جو سچی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں، اللہ کو مانتے ہیں اور اس کے رسولؐ کو، اور گواہی دیتے ہیں کہ اللہ واحد کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اللہ کے غلام اور رسول ہیں۔

میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم اللہ کا دین قبول کر لو۔ میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور تمام لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس لیے کہ میں اللہ کی بندگی کا خوف (تقویٰ) ہر زندہ شخص میں ڈال دوں اور یہ کہ ان لوگوں کے خلاف دعویٰ قائم کیا جا سکے جو سچائی سے منحرف ہوں۔ اس لیے اسلام قبول کر لو اور اسے اپنا مذہب بنا لو، اس لیے کہ تم امن اور چین سے رہ سکو۔ ورنہ تم ذمہ دار ہو گے اپنے عوام کے گناہوں کے بھی۔

شاہ فارس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس انداز میں اور اس طرح کے الفاظ میں اسے کوئی خط لکھ سکتا ہے لہٰذا وہ آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے خط پھاڑ دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے وائسرائے والیٔ یمن کو حکم بھجوایا کہ وہ جناب رسولؐ اللہ کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کرے (بے شک اللہ تعالیٰ کی ذات سب سے بڑی اور بے نیاز ہے اور شاہ فارس گمراہی میں مبتلا تھا)۔

لہٰذا یمن کے گورنر کے کچھ لوگ مدینہ آئے جہاں جناب رسالت مآبؐ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا کہ دیکھو! تمہارے شاہ کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا ہے (اس شاہ کا نام خسرو پرویز تھا)۔ یہ خبر ان کے لیے بہت حیران کن تھی اور وہ جناب رسولؐ اللہ کی اس نصیحت کے ساتھ واپس ہو لیے کہ وہ اپنے بادشاہ سے کہہ دیں کہ اس کی تمام مملکت میں اسلام چھا جائے گا۔

ج) مقوقس (Muqawqas) الیگزینڈریا اور مصر کا گورنر:

جو بازنطینیہ کے رومن بادشاہ کے تحت تھا، اس کے نام خط، اس خط کے لے جانے والے

حاطب بن بلتعہ تھے خط کا متن درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منجانب: محمدؐ، عبداللہ و رسولہ

برائے: مقوقس، گورنر مصر

اس پر اللہ کی رحمتیں جو سچی ہدایت قبول کرے۔ اس کے بعد میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اسلام قبول کرلو۔ اگر تم حفاظت چاہتے ہو تو اسلام قبول کرو۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ تمہیں دوہرا ثواب عطا فرمائے گا لیکن اگر تم انکار کروگے تو اپنی قوم کے لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھاؤ گے۔

مقوقس نے اپنے درباریوں کے ساتھ حاطبؓ سے کچھ باتیں دین کے بارے میں سنیں۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ خط کے متن پر غور کیا اور کہا کہ "میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پیغمبرؐ کسی غلط بات پر ہمیں نہیں بلا رہے بلکہ وہ کوئی جادو ٹونہ کرنے والے ہیں اور نہ ہی کوئی جھوٹے ٹونکے کرنے والے۔ ان میں پیغمبری کے اصل پہلو نظر آرہے ہیں، اس لیے میں اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کروں گا"۔

اس نے حکم دیا کہ اس خط کو ایک قیمتی ہاتھی دانت کے بنے ہوئے بکس میں رکھ دیا جائے اور اس نے جناب رسالت مآبؐ کی خدمت میں ایک خط عربی زبان میں لکھوایا۔ جس کا متن درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقوقس کی طرف سے محمدؐ بن عبداللہ کے لیے

آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں! میں نے آپؐ کا خط پڑھا اور اس کے مضمون کو سمجھا اور آپؐ جس کے لیے بلا رہے ہیں میرے علم میں یہ بات پہلے سے ہی ہے کہ ابھی ایک پیغمبرؐ کا آنا باقی ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ملک شام میں پیدا ہوگا۔ میں آپؐ کو تحفے میں دو کنیزیں بھیج رہا ہوں جن کا تعلق مصر کے معزز گھرانوں میں سے ہے، اس کے علاوہ کچھ کپڑے اور سواری کے لیے ایک گھوڑا۔ آپؐ پر رحمتیں نازل ہوں۔

یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ بدقسمتی سے مقوقس دائرہ اسلام میں داخل نہ ہو سکا۔ جناب رسولؐ اکرمؐ نے اس کے بھیجے ہوئے تحائف قبول فرمائے۔ ان میں سے خوش بخت، ماریہؓ کو اپنے

لیے رکھا، جن کے بطن سے جناب رسولؐ اللہ کے صاحبزادے ابراہیم تولد ہوئے اور دوسری سائرین حسن بن ثابت انصاریؓ کو دے دی گئیں۔

د) نجاشیؓ (Negus) شاہ حبشہ یا ایتھوپیا یا Abyssinia

کے نام خط جسے عامر بن امیہ لے کر گئے۔ خط کا متن درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منجانب: محمدؐ، عبداللہ و رسولہ

برائے: نجاشی شاہ حبشہ

رحمتیں ہوں اس پر جس نے اطاعت کی صحیح ہدایت کی۔ اسلام علیکم! میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد کہتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ جو مالک ہے ہر شے کا پاک ہے ذات اس کی ہستی، ہے رحمتوں کا اور رحمتیں عطا کرنے والا ہے اور ایمان کا تحفظ دینے والا، اور حفاظت سے رکھنے والا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ مسیح مریم کے بیٹے، اللہ کی روح ہیں اور اس کا ایک لفظ ہے جو اللہ نے مریم میں ڈال دیا جو کنواری تھیں، اچھی، پاکدامن اور پھر انہوں نے عیسیٰ کو جنم دیا۔ اللہ نے انہیں اپنی روح سے پیدا کیا اور اپنی سانسوں سے (یعنی آواز سے) جیسے اس نے پیدا کیا آدم کو اپنے ہاتھ سے۔ میں تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں جو اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کی تابعداری کے لیے اور میری اطاعت کے لیے اور اس پر ایمان لانے کے لیے جو میرے پاس آیا ہے اور یہ کہ میں اللہ کا نبیؐ ہوں۔ اور میں دعوت دیتا ہوں تمہیں اور تمہاری قوم کو، اللہ کی طرف جو بڑی شان والا ہے اور تمام تر طاقتور ہے۔ میں ہر چند کہ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے پہنچا دیا ہے اپنا پیغام اور نصیحت، میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم غور سے سنو اور قبول کرو میری نصیحت کو، رحمتیں ہوں اس پر جو سچی ہدایت کی پیروی کرے۔

جناب نجاشیؓ نے جناب رسالت مآبؐ کے پیغام کو درج ذیل پیغام کے ذریعہ قبول کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منجانب: نجاشی، اشامر (Ashamer)

برائے: محمدؐ رسول اللہ

آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں، اے اللہ کے رسولؐ! اور رحم اور فضل و کرم اللہ کا۔ جس کے علاوہ

کوئی خدا نہیں۔ مجھے آپ کا خط ملا، جس میں آپؐ نے مسیح کے متعلق لکھا ہے۔ زمین اور آسمانوں کے مالک کی قسم، مسیح اس سے زیادہ کچھ نہیں جو کچھ آپؐ نے فرمایا ہے۔ ہم پوری طرح سے تسلیم کرتے ہیں کہ جو کچھ آپؐ نے کہا ہے۔ ہمارے پاس بھیجے گئے ہیں اور ہم نے آپؐ کے چچازاد (جعفرؓ) اور اس کے ساتھیوں کی خاطر کی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں سچے اور ان کی تصدیق کرتے ہوئے جو آپ سے پہلے آئے تھے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، آپؐ کے چچازاد کے سامنے اور اپنے آپ کو مطیع کرتا ہوں، اللہ کا جو مالک ہے تمام جہانوں کا۔

جناب نجاشیؓ نو ہجری کے ماہ رجب میں وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہو جائے اور ان پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے۔ جناب رسولؐ اللہ نے ان کے لیے صلوٰۃ الجنازہ کا اہتمام کیا جو ہر مسلمان کے لیے ادا کی جاتی ہے، اس کی بخشش و مغفرت کے لیے اور اس پر نزول رحمت کے لیے۔ جناب رسالت مآبؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں صرف ایک بار صلوٰۃ غائبانہ ادا کی اور وہ جناب نجاشیؓ کے لیے تھی۔ ایک مرتبہ ایک خاتون جو مسجد نبوی کی دیکھ بھال کرتی تھیں ان کی وفات کا آپؐ کو علم ان کی وفات کے چند روز بعد ہوا تو آپؐ نے ان کے مرقد پر جا کر ان کے لیے صلوٰۃ پڑھی اور ایک مرتبہ آپؐ اپنی زندگی کے آخری ایام میں احد کے مقام پر شہیدان احد کے مرقدوں پر گئے، ان کی وفات کے آٹھ برس بعد دوبارہ الوداعی صلوٰۃ جنازہ پڑھی۔

یہ بات بہت حیران کن ہے کہ جس طرح سے جناب نجاشیؓ نے جناب رسالت مآبؐ کے خط کا جواب دیا اور پھر آپؐ نے ان کے لیے صلوٰۃ جنازہ ادا کی اس کے باوجود زیادہ تر علماء جناب نجاشیؓ کے لیے اس عزت اور محبت کا اظہار نہیں کرتے جو وہ دوسرے بزرگوں کے لیے کرتے ہیں یا خود اپنے لیے چاہتے ہیں۔ اہل علم کو اس بات پر غور کرنا چاہیے اور اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ جناب رسالت مآب اور جناب نجاشیؓ کے مابین ایک خاص محبت اور ادب کا معاملہ تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کا نکاح سیدہ اُم حبیبہؓ سے (جو کہ حبشہ میں ہی مقیم تھیں) آپؐ کی خواہش کے مطابق جناب نجاشیؓ نے ہی منعقد کیا تھا اور جناب رسولؐ اللہ کی طرف سے چار صد دینار مہر اپنی جیب سے ادا کیا اور مہاجرین حبشہ کو کھانے کی دعوت بھی دی۔ علاوہ ازیں پھر بدر کی فتح پر شاہ حبشہ نے خوشی کا اظہار نہایت عاجزانہ انداز میں کیا۔

د) یمن کے گورنر کو خط:

یہ خط سلیط بن عامر کے ہاتھ بھیجا گیا جس کے مندرجات درج ذیل ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منجانب: محمدؐ رسول اللہ

برائے: ہوذہ بن علی، گورنر یمن

رحمتیں اس پر جس نے سچی ہدایت کو قبول کیا۔ تمہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ میرا دین ہر جگہ پھیل جائے گا اس لیے تم اسلام قبول کر لو، جو کچھ بھی تمہارے ماتحت ہے تمہارا ہی رہے گا۔

گورنر نے درج ذیل جواب دیا:

جس ایمان کی طرف آپ بلا رہے ہیں وہ بہت اچھی بات ہے۔ میں بہت مشہور مقرر ہوں اور شاعر بھی۔ اہل عرب میری بہت عزت کرتے ہیں اور میں ان میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہوں، اگر آپ مجھے اپنی حکومت میں شامل کر لیتے ہیں تو میں آپؐ کے تابع ہو جاؤں گا۔

جناب رسولؐ اللہ کو اس کا یہ جواب نہایت ناگوار گزرا۔ کیونکہ آپؐ کا فرمان تھا کہ ایسے تمام معاملات اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں یعنی عزت و ذلت اللہ ہی کے ہاتھ ہوتی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اس کے اختیار میں اپنی زمین دے دیتا ہے۔ اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ کو خبر ہوئی (الہام کے ذریعہ) کہ ہوذہ مر گیا ہے۔ اس پر جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا ''اب یمن میں ایک جھوٹا آنے والا ہے جو اپنے آپ کو نبی ظاہر کرے گا اور پھر وہ مارا جائے گا''۔

و) شام کے گورنر کے نام خط:

جو شجاع بن وہب کے ہاتھ بھیجا گیا۔ خط کے مندرجات درج ذیل ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منجانب: محمدؐ رسول اللہ

برائے: حارث بن ابی شمر، گورنر شام

اس پر رحمتیں جس نے تسلیم کیا سچی ہدایت کو، اس بات پر یقین کرو اور اسے سچا مانو۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ پر ایمان لاؤ جو واحد ہے لاشریک ہے، اس کے بعد تمہاری مملکت تمہاری ہی رہے گی۔

گورنر نے غصے کے عالم میں بڑی نخوت اور تکبر کے ساتھ جناب رسالت مآبؐ کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔

ز) والیٔ اومان کے نام:

اومان کے دو حکمران تھے یعنی یہ علاقہ دو حصوں میں تقسیم تھا، ان کو جناب رسولؐ اللہ نے عامر بن العاص کے ہاتھ خط بھیجا۔ خط کا مندرجہ ذیل متن ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منجانب: محمدؐ بن عبداللہ

برائے: جعفر اور عبدالجلندی

رحمتیں اس پر جس نے سچی ہدایت قبول کی۔ اس کے بعد میں تم دونوں کو دعوت دیتا ہوں اسلام کی طرف، پس اسلام قبول کرلو۔ اللہ نے مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، اپنے تمام بندوں کی طرف، اس لیے کہ میں اللہ کی تابعدار مخلوق کے دلوں میں اللہ کا خوف ڈال دوں۔ اس لیے کہ ان کے لیے کوئی بہانہ نہ رہے جو اللہ کا انکار کرتے ہیں، اگر تم دونوں اسلام قبول کر لیتے ہو تو تم اپنے ملک کے سربراہ رہو گے۔ لیکن اگر تم میری دعوت سے انکار کرتے ہو تو تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تمہاری تمام ملکیت فنا ہو جانے والی ہے میرے گھوڑوں والے تمہاری زمین روند ڈالیں گے اور میری نبوت کو طاقت حاصل ہو جائے گی تمہاری بادشاہت پر۔

ان حکمرانوں نے بہت طویل بحث ومباحثے کیے عامر کے ساتھ اور آخر کار اسلام قبول کر لیا۔

ح) بحرین کے گورنر کے نام خط:

اس کا نام منذر بن سوا تھا اسے یہ خط علی بن خدری نے پہنچایا۔

اپنے خط میں جناب رسولؐ اللہ نے گورنر کو دعوت اسلام دی جس کا اس نے مندرجہ ذیل جواب دیا:

”اے اللہ کے نبیؐ! مجھے آپ کا پیغام ملا، اس سے پہلے میں نے آپ کا خط پڑھا جو آپ نے بحرین کے لوگوں کے لیے لکھا اور انہیں دعوت اسلام دی۔ ان میں سے کچھ کو تو اسلام پسند آیا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا جبکہ دوسروں کو یہ نہیں بھایا۔ میرے ملک میں مجوسی (آتش پرست) رہتے ہیں جو اہل فارس کے مذہب پر ہیں اور ان کے علاوہ یہودی رہتے ہیں، اس لیے

آپ مجھے واضح کریں کہ ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کروں۔

جناب رسالت مآبؐ کا جواب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منجانب: محمدؐ رسول اللہ

برائے: منذر بن سوا

تم پر رحمتیں ہوں۔ میں تعریف کرتا ہوں اللہ کی، اس کے بغیر کسی شریک کے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہے۔ اس کے بعد میں تمہیں یاد دلاتا ہوں اللہ کی جو بڑی قوت والا، بڑی شان والا ہے۔ جو بھی یہ نصیحت قبول کرتا ہے تو یہ اس کی اپنی بھلائی کے لیے ہے اور جو کوئی بھی میرے ایلچی کی پیروی کرتا ہے اور ان کی ہدایت کے مطابق چلتا ہے، وہ دراصل میری ہی نصیحت کو مانتا ہے۔ میرے ایلچی نے تمہارے رویے کی بہت تعریف کی ہے۔ تم اپنے عہدے پر برقرار رہو گے۔ تو مسلموں کو پورا موقع فراہم کرو کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکیں۔ میں تمہاری سفارشات کو تسلیم کرتا ہوں جو تم نے بحرین کے لوگوں کے لیے دی ہیں۔ اور میں ان کی خلاف ورزی کو معاف کرتا ہوں، اس لیے تم بھی ان کو معاف کر دو۔ بحرین کے لوگوں کو جو ان میں سے جانا چاہیں اپنے یہودی اعتقاد میں، یا مجوسی اعتقاد میں، وہ جزیہ دینے کے پابند ہوں گے (جزیہ زکوۃ کے متوازی ٹیکس ہے، ایک دینار ایک شخص پر سالانہ اور وہ لوگ فوجی ذمہ داری سے بھی بری ہوں گے اور زکوۃ سے بھی جو کہ ڈھائی فیصد ہے)

(۱۴۴) نشہ آور اشیاء کے استعمال کی ممانعت

اس مضمون کے شروع کرنے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ قرآن میں نشہ آور اشیاء کے لیے لفظ (خمر) استعمال ہوا ہے۔ عرف عام میں اسے شراب کہتے ہیں۔ لیکن شراب عربی میں ہر پینے والی چیز کو کہتے ہیں جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ میں اور اس سے پہلے بھی جتنی تہذیبیں گزری ہیں جیسے بابلی، مصری، رومی، چینی، ہندوستانی وغیرہ، ان سب کے ہاں ایسے مشروب جو نشہ آور ہوں، وہ خمر کے زمرے میں آ گئے ہیں لیکن اس قانون کے حوالے سے جو قرآن نے اور اس سے پہلی الہامی کتابوں نے ہمیں دیا، اس اعتبار سے لفظ خمر (Khamr)

اُن تمام پینے والی یا کھانے والی یا سونگھنے والی یا انجکشن کے ذریعے لینے والی چیزوں کا احاطہ کرتا ہے جن کے استعمال سے ذہنی توازن ڈگمگانے لگے یا ذہنی سرور حاصل ہو کر وہ انسان کو بے خبری کی طرف لے جاتا ہو، ایسی تمام اشیاء کا استعمال شرعاً ممنوع ہے۔ بہر حال عام طور پر یہ لفظ جنابِ رسولؐ کے زمانے میں شراب کے زمرے میں آتا تھا۔ اس وضاحت کے بعد ہم اصلی مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:

جناب احمدؒ نے لکھا ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق کہ خمر یا نشہ آور اشیاء کا استعمال (یعنی اس وقت شراب کا استعمال) تین درجوں میں ممنوع قرار دیا گیا۔ مدینہ کے لوگ شراب کا استعمال کرتے تھے اور جوا کھیلتے تھے اور اسی طرح کرتے رہے جنابِ رسالت مآبؐ کے آنے کے بعد تک۔ لیکن انہوں نے اس کے متعلق پوچھا کہ اس کے استعمال کے بارے میں کیا حکم ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۲۱۹) نازل فرمائی۔ جس کے پہلے حصے میں فرمان کیا کہ "یہ تم سے پوچھتے ہیں (اے رسولؐ) خمر کے بارے میں اور جوئے کے بارے میں۔ کہو! کہ اس میں بڑی بُرائی ہے اور (تھوڑا سا) فائدہ انسانوں کے لیے۔ لیکن گناہ زیادہ ہے فائدے سے"۔

جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو بھی اہلِ مدینہ نے اس کا استعمال جاری رکھا، اس آیت کے الفاظ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ لیکن اس وقت جنابِ رسولؐ اللہ کے ایک ساتھیؓ نے جب وہ صلوٰۃ مغرب کی امامت کر رہے تھے تو قرأت میں قرآنی آیات کو آگے پیچھے کر دیا۔ اس پر اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے سورۃ النساء کی آیت (۴۳) نازل فرمائی اور اس کی پہلے حصے میں کہا کہ "اے ایمان والو! صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ جب کہ تم نشے کی حالت میں ہو، اس وقت تک جبکہ تم اس قابل نہ ہو جاؤ کہ تم سمجھ سکو جو کچھ کہ تم کہہ رہے ہو"۔

پھر اس حکم کے بعد لوگوں نے نماز کے وقت سے پہلے پینا چھوڑ دیا اور پھر اس کے بعد تیسرا اور آخری حکم اس بارے میں نازل ہوا۔ سورۃ المائدہ (۵) کی آیات (۹۰-۹۱) میں، وہ یہ کہ "اے ایمان والو! خمر، جوا اور بتوں کے لیے قربانیاں اور قرعہ اندازی کے لیے تیروں کا استعمال جو تم فیصلہ کرنے کے لیے کرتے ہو، یہ سب شیطانی دھوکہ ہے اس لیے اس سے بچو، اس لیے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہاری آپس میں دشمنی اور نفرت

بڑھے، نشے کے ذریعے سے، جوئے کے ذریعے سے اور تمہیں غافل کرے اللہ کی یاد سے اور صلوٰۃ ادا کرنے سے۔ تو کیا تم نہیں باز آؤ گے؟"

جب مسلمانوں نے یہ حکمِ ربی سنا تو فوری طور پر پکار اٹھے "ہم رک گئے، ہمارے رب"۔

امام احمدؒ نے ایک جگہ لکھا کہ عمر بن خطابؓ نے عرض کیا "اے اللہ! ہمیں خمر کے استعمال کے متعلق وضاحت سے بتا دیجیے"۔ اس پر سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۲۱۹) کا نزول ہوا۔ لیکن جنابِ عمرؓ تب بھی اس بات کے متمنی تھے کہ واضح حکم آ جائے۔ اس کے بعد سورۃ النساء (۴) کی آیت (۴۳) کا نزول ہوا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ جو نشے کی حالت میں ہیں صلوٰۃ کے قریب نہ آئیں۔ جنابِ عمرؓ نے پھر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ اس کے متعلق اور وضاحت فرمایئے تو اس پر پھر سورۃ مائدہ (۵) کی آیات (۹۰-۹۱) کا نزول ہوا۔ ان آیتِ مبارکہ کو سن کر جنابِ عمرؓ نے فرمایا "ہم رک گئے، ہم رک گئے"۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے لکھا ہے کہ خمر کے متعلق دس معاملات کے سلسلے میں لعنت بھیجی گئی ہے ایک خمر بذاتِ خود، جو اسے استعمال کرتا ہو، جو اسے پیش کرتا ہے، جو اسے بیچتا ہے، جو اسے خریدتا ہے، جو اسے کشید کرتا ہے اور جو اسے کشید کرواتا ہے، جو اسے لے کر آتا جاتا ہے، جو اسے رکھتا ہے اور جو اس کی ترغیب دیتا ہے۔

ایک خاص بات یہ کہ جنابِ رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر خمر منع ہے (یعنی حرام ہے)۔ امام مسلم

(۱۴۴) تیمم (Taymmum)

بخاری اور مسلم نے لکھا ہے کہ مومنین کی والدہ سیدہ عائشہؓ نے فرمایا کہ "ہم لوگ باہر ایک سفر پر گئے ہوئے تھے ایک مقام البیداء یا ذاتُ الجیش پہنچے۔ وہاں پر ان کا نیکلس ٹوٹ کر گر گیا۔ اللہ کے رسولؐ وہاں اسے ڈھونڈنے کے لیے رک گئے۔ اور ان کے ساتھی بھی اسی میں لگ گئے۔ وہاں نہ تو کوئی پانی کا ذخیرہ تھا اور نہ ہمارے پاس پانی تھا۔ اس پر کچھ لوگ جنابِ ابوبکرؓ کے پاس گئے اور کہنے لگے تمہیں کیا معلوم نہیں کہ عائشہؓ نے کیا کیا ہے؟ اس نے اللہ کے رسولؐ اور لوگوں کو وہاں رکوایا ہے جہاں نہ تو کوئی پانی کا ذریعہ ہے اور نہ ہی ہمارے پاس پانی ہے۔ جب ابوبکرؓ آئے تو اللہ کے پیغمبرؐ سو رہے تھے اور ان کا سر میری ٹانگ پر تھا انہوں نے مجھے کہا تم

نے اللہ کے نبیؐ کو روکا ہے اور دوسرے لوگوں کو اس جگہ جہاں پانی نہیں ہے اور نہ ہی ان کے پاس پانی ہے۔ پس انہوں نے اس بات پر مجھ سے رنجش کا اظہار کیا اور وہ کچھ کہا جو اللہ نے چاہا اور مجھے کمر پر اپنے ہاتھ سے مارا، اس سے مجھے تکلیف ہوئی لیکن میں رسولؐ اللہ کی وجہ سے نہ ہلی۔ پھر اللہ کے نبیؐ اٹھ گئے جب صبح ہوئی اور وہاں پانی نہ تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل و کرم فرمایا اور سورۃ النساء (۴) کی آیت (۴۳) کا نزول فرمایا تیمم کے بارے میں۔ جس میں حکم دیا گیا کہ "(جب) تمہیں پانی نہ ملے تو تیمم کر لیا کرو صاف مٹی کے ساتھ اور اسے اپنے ہاتھوں اور منہ پر مل لیا کرو۔ بیشک یہ ہے کہ اللہ ہمیشہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے"۔

(جب اس آیت کا نزول ہوا تو) اُسید بن حضیر نے کہا کہ اے ابوبکر کے گھر والو! یہ کوئی پہلی رحمت نہیں ہے آپ کی وجہ سے۔ پھر جس اونٹ پر میں سفر کر رہی تھی اپنی جگہ سے ہلا تو میرا نکلس اس کے نیچے سے مل گیا۔

تیمم وضو کا قائم البدل ہے اور غسل کا بھی یعنی جسم کے کچھ حصوں کو دھونا یا پورے جسم کا دھونا جہاں ضروری سمجھا گیا ہے اگر پانی نہیں مل رہا تو مٹی سے اپنے ہاتھوں اور چہرے کو ملنے سے دھونے کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح بیماری میں بھی کیا جا سکتا ہے اگر پانی ڈالنے سے جسم کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا ایسا کرنا ممکن نہ ہو۔ حالانکہ اس طرح سے چہرے اور ہاتھوں پر مٹی ملنے سے غلاظت تو صاف نہیں ہو سکتی لیکن یہ صرف اللہ کی طرف سے خاص مہربانی و رحم اور فضل و کرم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ خاص رعایت عطا فرمادی اور ہمارے لیے صلوٰۃ کی ادائیگی کو اور بھی آسان بنا دیا۔ دوسری بات یہ کہ اس عمل کے کرنے سے صفائی کی اہمیت اور تقاضہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور صلوٰۃ کی ادائیگی کی اہمیت بھی مدنظر رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وضو کا قائم البدل قائم فرما کر وضو کی رعایت تو دے دی لیکن صلوٰۃ کی معافی نہیں، صلوٰۃ کی ادائیگی تو ہر حال میں ہونا ہی ہے۔

(۱۴۵) متع اور خچروں کے گوشت کی ممانعت

متع ایک ایسی شادی یا نکاح تھا جس میں نکاح کی مدت مقرر کر لی جاتی۔ خاص حالات کے دوران اس قسم کی شادی اسلام کے ابتدائی دور میں جائز تھی، جب کہ اس کی ضرورت سمجھی گئی۔

لیکن بعد میں جناب رسول اللہؐ نے اس اجازت کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔

بخاری اور مسلم نے لکھا ہے کہ علی بن ابی طالب کی روایت کے مطابق کہ جناب رسول اللہؐ نے متع کرنا منع فرمادیا اور گھریلو خچروں کے گوشت کھانے سے بھی، خیبر کے وقت (یعنی جب جنگ خیبر ہوئی)۔

(۱۴۶) جناب رسالت مآبؐ پر جادو سے وار

صلح حدیبیہ کے بعد خیبر کے یہودیوں نے جناب رسالت مآب پر ایک منصوبہ کے تحت بہت زوردار جادو کا وار کیا۔ اس کے لیے وہ ایک مشہور جادوگر لابد بن عاصم کے پاس گئے جو مدینہ کے بنو زریق قبیلے کا تھا۔ اس زمانہ میں ایک یہودی لڑکا رسالت مآب کی خدمات پر معمور تھا جس کے ذریعہ سے جادوگر نے رسول اللہؐ کے کنگھے کو حاصل کیا جس میں آپؐ کے چند بال لگے ہوئے تھے۔ اور پھر اس جادوگر نے بالوں پر جادو کیا اور ان کو کھجور کے نر درخت کے پھولوں کے گچھے میں بند کر کے ایک کنویں کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے رکھ دیا۔

جناب رسالت مآب پر جادو نے اثر کرنا شروع کر دیا اور آپ اس کے زیر اثر تقریباً ایک برس تک رہے۔ اور اس کے آخری چالیس روز آپؐ کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تھے۔ جادو کے اثر سے جناب رسول اللہ بھول جاتے تھے کہ وہ کام کر لیا ہے یا نہیں جو کہ انہیں کرنا ہوتا۔ لیکن اس جادو کے اثر کا اندازہ کسی دوسرے شخص کو محسوس نہ ہو سکا۔

جب آپؐ کو اس سے زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو جناب رسالت مآب نے اپنی صحت کے لیے اپنے رب کو پکارا تو آپؐ کے رب نے انہیں تمام معاملات کی اطلاع دے دی۔ اس کے بعد آپؐ نے اس کنویں سے اپنا کنگھا اور بال سمیت منگوا لیا۔ اس کے ساتھ انہیں ایک ڈوری بھی ملی جس میں گیارہ گانٹھیں لگی ہوئی تھیں اور ایک موم کی بنی ہوئی شکل جس میں سوئیاں گاڑھی گئی تھیں۔ اس موقع پر جبرائیلؑ تشریف لائے اور آپؐ سے فرمایا کہ آپ سورۃ (۱۱۳) اور (۱۱۴) کی تلاوت فرمائیں۔ جب آپؐ نے تلاوت شروع کی تو ہر آیت کی تلاوت کے بعد ایک گانٹھ کھل جاتی اور اس کے ساتھ ہی ایک سوئی باہر نکل آتی۔ اس طرح سے دونوں سورۃ کی گیارہ آیات کے پڑھنے پر گیارہ گانٹھیں کھل گئیں اور گیارہ ہی سوئیاں باہر نکل آئیں۔ اور جناب

رسالت مآب اس جادوئی اثر سے فوراً باہر آ گئے، بے شک یہ اللہ کا حکم تھا۔ (روایت: بخاری، مسلم، نسائی اور احمد)

(۱۴۷) جناب رسول اللہ کی طرف سے اہلِ مکہ کی مدد

حدیبیہ امن معاہدے کے بعد جناب رسالت مآب کی کوشش رہی کہ آپ مکہ والوں سے اچھے تعلقات قائم رکھیں۔ اسی دوران مکہ اور اس کے اطراف میں شدید قحط پھیل گیا۔ اس دوران قبیلہ یمامہ جس سے وہ غلہ لیا کرتے تھے، انہوں نے اہل مکہ کو غلہ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

اس شدید تکلیف کے دوران جناب رسول اللہ ؐ نے اہل مکہ کو پانچ صد دینار یعنی سونے کے سکے بھجوائے تاکہ ان سے مکہ کے غرباء کی مدد ہو سکے۔ اور ساتھ ہی آپ ؐ نے یمامہ قبیلے کے لوگوں کو تاکید کی کہ وہ اہل مکہ کو حسب سابق اناج پہنچتے رہیں۔ اس بات پر ابوسفیان نے کہا کہ محمد ؐ چاہتا ہے کہ مکہ کے نوجوان ان کی طرف راغب ہو جائیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اللہ کے نبیؐ نے ان کی مدد جاری رکھی اور ابوسفیان کو بہت ساری کھجوریں بھجوائیں اور ساتھ ہی کہلا بھیجا کہ وہ اس کے بدلے جانوروں کی کھالیں ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ جسے اس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ قبول کر لیا۔ لیکن مکہ کے لوگ بہرحال جناب رسالت مآب کی سخاوت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

(۱۴۸) رسالت مآب کا ابوسفیان کی بیوہ بیٹی سے نکاح

سیدہ اُم حبیبہ جن کا نام رملہ بنت ابوسفیان تھا، وہ عبداللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں، جب کہ وہ عیسائی تھا۔ لیکن ان دونوں نے اسلام قبول کیا اور ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔ جہاں عبداللہ دوبارہ عیسائی ہو گیا لیکن جلد ہی فوت ہو گیا۔

جب جناب رسالت مآب کو یہ خبر ہوئی تو آپ نے فیصلہ کیا کہ اس موقع کو استعمال کیا جائے تاکہ دشمن (ابوسفیان) کو آپ ؐ کے نزدیک آنے کا موقع مل جائے اور اس میں مزید اور خیر بھی نکل سکتی ہے۔ آپ ؐ نے اس غرض سے شاہ حبشہ کو پیغام بھیجا کہ وہ آپ ؐ کا سیدہ ام حبیبہ سے نکاح کا بندوبست کریں، اگر وہ راضی ہو جائیں تو۔

اسی دوران سیدہ ام حبیبہ کو خواب میں کسی نے "یا اُم المومنین" کہہ کر پکارا۔ اس کی تعبیر سیدہ نے یہ سمجھی کہ وہ جناب رسول اللہ کی زوجہ بننے والی ہیں اور اس کے دوسرے ہی روز ان کو شاہ حبشہ کی طرف سے پیام ملا اسی سلسلے میں جسے آپ نے فوراً قبول کر لیا۔

لہٰذا شاہ حبشہ ؓ نے اس نکاح کا اہتمام کیا اور سیدہ کو جناب رسول اللہ کی طرف سے اپنی جیب خاص سے چار صد دینار (سونے کی سکے) پیش کیے جو کہ مہر کی ادائیگی تھی۔

اس کے علاوہ کچھ تحائف بھی دیے اور اپنے محل میں اس نکاح کی خوشی میں کھانے کی دعوت بھی کی۔ یہ واقعہ ساتویں ہجری کے ماہ صفر یعنی جون ۶۲۸ء کو پیش آیا۔ اس کے بعد شاہ نے آپ کو مدینہ بھجوانے کا بندوبست کیا اور سیدہ کو جناب رسول اللہ ؐ کے چچا زاد جعفرؓ کے ساتھ روانہ کر دیا۔

حالانکہ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد پیش آیا، پھر بھی قریش نے اس بارے میں کوئی مخالفت نہ کی۔ کیونکہ عرب کسی خاتون کو اس کے شوہر سے ملنے سے نہ روک سکتے تھے۔ اور دوسرا یہ کہ اس واقعہ نے ایک خاص نفسیاتی اثر اہل قریش کی سوچ پر بھی ڈالا اور اس طرح سے مکہ اور مدینے والوں کے کھچاؤ میں خاصی کمی واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ جناب رسول اللہ ؐ مکہ والوں کی مدد بھی کر چکے تھے۔

اس نکاح کے موقع پر شاہ حبشہ نے جو خطبہ دیا وہ قابل ذکر ہے اور ایک تاریخی خطاب کا درجہ رکھتا ہے۔ اس خطاب میں انہوں نے فرمایا کہ:

تمام حمد تعریفیں اور شکر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے جو اختیارِ کل رکھتا ہے سب کا مالک ہے اور پاک ذات ہے اس کی۔ امن کا منبع، طاقت کا سرچشمہ اور مجبور کر دینے والا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد ؐ اس کے غلام (بندے) ہیں اور نبی عیسیٰ بیٹے مریم کے بھی اللہ کے غلام ہیں"۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ "اللہ کے رسول نے اُسے پیغام بھیجا ہے کہ میں نکاح منعقد کروں اُم حبیبہ بنت ابوسفیان کا اُن کے ساتھ، میں نے یہ پیغام قبول کیا اللہ کے رسول کا اور اسی وقت ادا کر رہا ہوں چار صد دینار بطور مہر۔

اس کے بعد شاہ حبشہ کی یہ پیشکش خالد بن سعیدؓ نے سیدہ کی جانب سے قبول کی۔ خالد چچا زاد بھائی تھے سیدہ کے جنہوں نے دستور کے مطابق اختیار دیا تھا کہ وہ ان کی طرف سے نکاح

کی پیشکش قبول کریں۔

اس کے بعد جو لوگ نکاح کے لیے جمع ہوئے تھے وہ اُٹھے تو شاہ حبشہ نے انہیں روکا اور کہا کہ وہ لوگ کھانا تناول کر کے جائیں۔ کیونکہ یہ تمام انبیاء کی سنت رہی ہے کہ وہ اپنی شادیوں کے بعد کھانا کھلاتے تھے۔

(۱۴۹) خیبر میں اہل یہود کی سرگرمیاں

خیبر ایک ایسی کالونی تھی جسے یہودیوں نے آباد کیا تھا اور وہی وہاں رہتے تھے۔ یہ علاقہ تقریباً پچاس میل کے طول و عرض پر پھیلا تھا شام کی سرحد کے نزدیک مدینہ کے شمال میں اس میں تقریباً دس قلعہ بند آبادیاں تھیں۔ اہل خیبر کے پاس تقریباً بیس ہزار لڑنے والے افراد موجود تھے۔ اور ان کے پاس پانی کے بہترین ذرائع بھی موجود تھے جسے یہ اپنی زراعت کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ یہ علاقہ تجارتی اعتبار سے بھی بہت مشہور تھا، یہاں قیمتی پتھر و دیگر تجارتی اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ یہاں پر مدینہ سے نکالے ہوئے اور بعض خود سے نقل مکانی کر کے آجانے والے یہودی بھی رہتے تھے۔ یہ جگہ ان کے لیے پُر امن جنت سے کم نہ تھی اور یہاں رہ کر وہ آزادی کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بن سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مسلمانوں کے ان قافلوں کو جو ملک شام جاتے یا وہاں سے واپس آتے روکنا شروع کر دیا۔

اس لیے جناب رسالت مآب کو اس امر کی ضرورت پیش آئی کہ اس کا کچھ تدارک کیا جائے اور خیبر کے یہودیوں کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو جائے تا کہ مسلمانوں کی تجارت بغیر کسی رکاوٹ جاری رہے۔ آپؐ اسی طرز کا معاہدہ کرنا چاہتے تھے جیسا کہ اہل مکہ کے ساتھ حدیبیہ میں کیا تھا۔ جب اس بات کے لیے اہل یہود سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ مسلمانوں کے لیے اس کے علاوہ صرف ایک ہی راستہ تھا جو آتش فشانی پہاڑوں سے نکلے ہوئے پتھروں سے پُر تھا اور سفر کے لیے نہایت دشوار گزار تھا۔ اس لیے جناب رسالت مآب اس بات کے لیے مجبور ہو گئے کہ آپؐ صلح کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کریں تا کہ یہ مشکل آسان ہو جائے۔

(۱۵۰) جناب رسالت مآب کا یہودیوں کے خلاف ردِ عمل

یہود کی سرگرمیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جناب رسالت مآب نے طے کیا کہ اس علاقے میں یہود کی برتری ختم کر کے اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے ٹال دیا جائے اور آئے دن کی دردسری سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یعنی شمالی عرب کے خطے کو دشمنوں سے پاک کر دیا جائے تا کہ ملک شام تک رسائی اور رسد آسانی کے ساتھ ہو سکے۔

اس کے ساتھ ہی جب اہل یہود کو حدیبیہ امن معاہدے کے متعلق علم ہوا تو اس کے ساتھ ہی انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کا قریش سے مسلمانوں کے خلاف معاہدہ تو خود بخود ختم ہو گیا۔ اور یہ کہ مسلمان اب اپنے جنوبی علاقے کے بہت بڑے دشمن سے محفوظ ہو گئے۔ اس لیے انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ اب مسلمان ان کی طرف بھی آسکتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے لیے دفاعی انتظامات کا بندوبست شروع کر دیا۔

جناب رسالت مآب کو ان کے حالیہ الہامات کی وجہ سے جو آپؐ کو سورۃ الفتح (۴۸) کے ذریعے حاصل ہوئے تھے، یہ کامل یقین تھا کہ آپؐ کو جلد ہی کوئی فتح اور بہت سا مال غنیمت ملنے والا ہے جیسا کہ اس سورۃ مبارکہ میں آپ کو خوشخبری دی گئی تھی اور یہی خوشخبری فتح مکہ اور خیبر کی غنیمت سے بھی متعلق تھی جو خیبر کے بعد متوقع تھی۔ اس حکم میں جو سورۃ فتح میں ملا، اس میں یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ اس قریبی فتح کے سلسلے میں یعنی معرکۂ خیبر میں کسی ایسے شخص کو شامل نہ کیا جائے جنہوں نے عمرے کے لیے جانے سے گریز کیا۔ کیونکہ جن لوگوں نے عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مال خرچ کرنے سے گریز کیا، انہیں اللہ تعالیٰ یہ حق نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ مال غنیمت کے حقدار بنیں۔

لہٰذا ایک چھوٹی سی فوج تیار کی گئی یعنی وہی حضرات جنہوں نے عمرے کے سفر میں جناب رسول اللہ کا ساتھ دیا تھا۔ اور اس مشن کی کسی کو اس وقت تک خبر نہ دی گئی جب تک کہ وہ روانہ نہیں ہو گیا۔ لیکن پھر بھی مکہ اور خیبر والوں کو اس کا علم ہو گیا، اہل مکہ تو اس خبر سے خوش ہوئے کہ جلد ہی مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ اہل خیبر کے پاس بیس ہزار فوجی لڑنے کے ماہر اور بہت سا اسلحہ ہے جب کہ گنتی کے چودہ صد مسلمان دوسری طرف تھے یہود نے مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ لگانے کی تکلیف ہی گوارہ نہ کی، اس لیے انہوں نے ان

کے مقابلے کے لیے کوئی تیاری ہی کی تھی اور نہ کوئی منصوبہ بندی۔ جب انھیں یہ معلوم ہوگیا کہ مسلمان تو اب پہنچنے ہی والے ہیں تب انہوں نے اپنے حلیف غطفان قبیلہ سے ملاقات کی اور انھیں اس سال کی آدھی زرعی پیداوار کے عوض مدد کے لیے کہا تو انہوں نے اس معاوضے پر انھیں ایک ہزار افراد لڑنے کے لیے مہیا کر دیے۔ اب یہودیوں نے اپنے تیس ہزار سپاہی میدان کے لیے تیار کیے اور مزید چار ہزار کی انھیں امید تھی۔

راستے میں جب رسول اللہؐ بنو غطفان کے علاقے سے گزرے اور پھر بنو فرازہ کے علاقے سے جو کہ یہود کے حلیف تھے تو ان کے سردار، جناب رسول اللہؐ سے ملے اور آپ کو یقین دلایا کہ وہ اس جھگڑے سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھیں گے۔ کیونکہ انہوں نے سوچا ہوگا کہ جن لوگوں سے قریش جیسی طاقت نے معاہدہ امن کر لیا ہے ہم ان سے کیسے دشمنی مول لیں۔

اللہ کے رسولؐ خیبر کی طرف بڑھ رہے تھے اور جب خیبر کے علاقے میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو روکا اور پھر اللہ تعالیٰ کی حضوری میں پیش ہو کر دعا کی اور عرض کیا کہ: "اے اللہ کل جہانوں کے مالک اور جو کچھ ان میں ہے، اس کا مالک، شیاطین کے مالک اور جنھیں انہوں نے گمراہ کیا۔ ہم آپ کے حضور عرض کرتے ہیں کہ ہمیں اس گاؤں (خیبر) کی اچھی چیزیں عطا فرما اور اس کے رہنے والوں کی اچھی چیزیں اور جو بھلائی اس میں ہے۔ ہم آپ کی پناہ چاہتے ہیں اس گاؤں کی برائی سے اور اس کے رہنے والوں کی برائی سے اور جو برائی اس کے اندر ہے اس سے۔ پھر اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا "اب قدم بڑھاؤ اللہ کے نام کے ساتھ"۔

آپؐ نے یہودیوں کو شش و پنج میں ڈال دیا جب آپ ان کی حدود میں داخل ہوئے یہ صبح کا وقت تھا ساتویں ہجری کے ماہ محرم کی چھ تاریخ تھی یعنی جون ۶۲۵ء۔ یہودیوں نے مسلمانوں کو دیکھا تو فوراً اپنی جنگی کونسل طلب کی اور فوری طور پر مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے اپنے قلعوں میں بند رہیں گے۔ اور اس طرح سے انہوں نے اپنی قوم کو تقسیم کر دیا اور اپنے قلعوں میں خود ہی محصور ہو کے رہ گئے یعنی تمام یہودی حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس فوج کے ساتھ چند مسلمان خواتین بھی تھیں تاکہ زخمیوں کی دیکھ بھال اور پانی پلانے کا کام سرانجام دیتی رہیں۔ ان میں جیدہ جیدہ سیدہ اُمِ سلمہؓ اُم المومنین، سیدہ صفیہؓ جناب رسالت مآب کی پھوپھی اور اُم ایمن تھیں۔

(۱۵۴) خیبر مسلمانوں کے محاصرے میں

خیبر کا علاقہ تین حصوں میں منقسم تھا قلعہ نعیم بنزات سواہ بن معاذ اور زبیر پہلے حصے میں حسن شق، البراء اور ابی دوسرے میں قموص، وطیح اور سلالم تیسرے میں۔

ان کے گھر کے افراد یعنی عورتیں اور بچے اور قیمتی سامان قلعہ وطیح اور سلالم میں محفوظ کیے گئے تھے اور ان کا جنگی ساز و سامان اور سپاہی نعیم اور قموص کے قلعوں میں محفوظ تھا۔ یہ دونوں قلعے یعنی ان کی طاقت کا تمام تر ساز و سامان اور ان کے بہترین جنگجو مرحب کی قیادت میں دے گئے۔ یہودیوں کے پاس ایک غلیل نما جنگی ہتھیار تھا جس کے ذریعے وہ دشمن پر قلعے کے اندر سے پتھروں کی بارش کرتے۔ لہٰذا انہوں نے اس طاقت کو معہ تیر اندازوں کے فن کی مدد لیتے ہوئے مسلمانوں پر تابڑ توڑ حملہ کر دیا۔ لڑائی کا یہ انداز مسلمانوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا لہٰذا وہ اپنے بچاؤ کی صورت کرنے لگے لیکن یہودی بھی اپنی اس طاقت کا استعمال موثر طریقے سے نہ کر سکے۔ حالانکہ ان کے پاس جنگ کا یہ انداز مسلمانوں کے لیے انوکھا تھا اور دوسرا یہ کہ ان کے پاس تیس ہزار فوج تھی لیکن ان کی جرأت ہی نہ ہوئی کہ وہ باہر آ کر کھلی جگہ مسلمانوں کا مقابلہ کرتے۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے اپنی اتنی بڑی طاقت کو اپنے ہی ہاتھوں محصور کر کے اور اپنی طاقت کو تقسیم کر لیا اور اس طرح خود ہی اپنی بدبختی کو دعوت دی۔

جناب رسالت مآبؐ نے اس لیے فیصلہ کیا کہ ان کا اس وقت تک محاصرہ جاری رکھا جائے جب تک کہ وہ اپنی بوکھلاہٹ کی آخری حد تک نہ پہنچ جائے اور جب وہ اس حالت تک پہنچ جائیں تب ان پر ایک بھرپور حملہ کر دیا جائے۔ سب سے پہلے جناب رسول اللہؐ نے ان کے تیروں اور پتھروں سے بچنے کے لیے اپنے سپاہ کو حکم دیا کہ وہ قلعہ کی دیواروں کے قریب تر ہو جائیں، اتنے قریب کہ قلعے کے اوپر سے ان کا نشانہ لگانا ان کے تیر اندازوں کے لیے مشکل ہو جائے اور پتھر پھینکنے والوں کا نشانہ بھی نشانے پر نہ لگے اور خطا ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ جانثاروں نے دیوار پھلانگنے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ اسی لمحے آپؐ نے درختوں کے لمبے لمبے لٹھے اکٹھے کروائے اور ایسے ایک ایک لٹھے کو پچاس سے ساٹھ افراد اپنی پوری طاقت سے لاتے اور قلعے کے دروازے کو زوردار ٹھوکر لگاتے اور اسی طرح سے قلعے کی دیوار کے ساتھ بھی سلوک کرتے۔ قلعہ کے مکین چونکہ پانی باہر سے لاتے تھے، اس لیے مسلمانوں نے پانی کے

تمام ذخیروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس حالت میں جب قلعے کا دروازہ توڑ لیا گیا تو دونوں افواج کا دو بدو مقابلہ شروع ہو گیا اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی لیکن جلد ہی یہودیوں کا سربراہ سلام بن سکان اور ان کا بہترین جنگجو کمانڈر مرحب آمنے سامنے مقابلے میں قتل ہو گئے جس سے یہودیوں میں افراتفری مچ گئی اور انہوں نے اپنے قلعے کو ایک ایک کر کے چھوڑنا شروع کر دیا۔ اس طرح سے یہودی خود ہی مائل شکست ہو گئے اور ان کے دس میں سے آٹھ قلعے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے پاس صرف دو ہی قلعے یعنی وطیح اور سلام جن میں ان کے عورتیں بچے اور قیمتی سامان تھا بچ گئے ہیں تو انہوں نے مکمل طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ اس بات پر اپنی جان کی امان چاہی کہ وہ ہر سال مسلمانوں کو اپنی زرعی آمدنی کا آدھا حصہ مستقل طور پر دیں گے۔ لیکن ان کے ہتھیار ڈالنے سے پہلے جو کچھ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا وہ انہوں نے آپس میں تقسیم کر لیا اور جو مال ہتھیار ڈالنے کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ لگا وہ یہودیوں کو واپس دے دیا گیا تاکہ وہ اپنی گزر اوقات اور آئندہ فصل کی بوائی کے لیے خود کفیل ہو جائیں۔ اس پورے معرکے میں تقریباً ایک ماہ لگ گیا۔

خیبر کے نزدیک تین اور یہودی بستیاں تھیں جن کا نام فدک، وادی قرا اور وادی تیم تھا۔ وادی القراء کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ قوم عاد اور ثمود کا اصلی وطن تھا۔ جب مسلمان وہاں سے گزر رہے تھے تو انہوں نے ان پر تیر پھینکے جب مسلمانوں نے ان کو جواب دیا تو فوراً انہوں نے بھی خیبر والوں کی طرح ہتھیار ڈال دیے جبکہ دوسرے دو گروہوں نے ویسے ہی انہیں شرائط کے تحت اپنے آپ کو مسلمانوں کا مطیع کر دیا۔

اس معرکے کے دوران سولہ یا اٹھارہ مسلمان شہید ہوئے جبکہ تیرانوے (۹۳) یہودی کام آئے۔

(۱۵۳) شرارتی بدوؤں کا بندوبست

جب قریش مکہ اور خیبر کے یہودی اپنی اپنی اوقات میں آ گئے تو تیسرا تکلیف دہ گروہ ان صحرائی بدوؤں کا تھا جو صحرا کے ویرانے میں خانہ بدوش زندگی گزارتے تھے۔ ان کی گزر اوقات کا ذریعہ لوٹ مار کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، یہ لوگ چونکہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے مختلف جگہوں پر رہتے اور ان کے رہنے کی جگہوں کے راستے بہت دشوار گزار ہوتے لہٰذا انہیں

قابو کرنا یا ایک جگہ اکٹھا کرنا اور سماجی دھارے میں لانا ایک بہت مشکل کام تھا۔ ان کو معاشی، سماجی اور اخلاقی پہلوؤں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن ان حالات کے باوجود معاشرے میں انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اور امن اور چین قائم کرنے کے لیے اور قافلوں اور ان کے مسافروں کے سفر کو محفوظ بنانے کے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ ان کے قدر انسانیت کی روح پھونکی جائے۔ اور یہ کام ایک نبی کے علاوہ کسی اور کے لیے کرنا ناممکن تھا۔ اس لیے جناب رسالت مآبؐ نے اس کا بیڑا اٹھایا اور اس کام کے کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے لیے آپؐ نے چھوٹے چھوٹے فوجی دستے مختلف وقتوں میں مختلف مقامات پر ان بدوؤں کے ٹھکانے پر بھیجے تاکہ ان لوگوں کی سرکوبی کی جائے۔ آخر کار یہ بدو راہ راست پر آ گئے اور معاشرے میں امن قائم ہو گیا۔ یہ بات یاد رہے کہ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مکہ بھی فتح ہو گیا تھا اور پھر یہی بدو قبائل دور دراز سے جوق در جوق جناب رسالت مآبؐ کی خدمت میں آتے رہے اور ایمان کی دولت سے سرفراز ہوتے رہے۔ اور پھر ایسا زمانہ بھی آیا کہ یہی بدو حکمت و دانش کے مرحلے طے کر گئے اور ہدایت و رشد سے مالا مال ہو گئے۔

(۱۵۴) قضا عمرے کی ادائیگی

ساتویں ہجری کے ماہ ذیقعد یعنی مارچ ۶۲۹ء صلح حدیبیہ کو ایک برس ہو چلا تھا اور معاہدے کی شرط کے مطابق مسلمان ایک سال بعد عمرہ کے لیے جا سکتے تھے، اس لیے جناب رسالت مآبؐ اپنے دو ہزار ساتھیوں کے ساتھ قضا عمرے کی ادائیگی کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ ساتھ قربانی کے اونٹ تھے، آپؐ کے ساتھ مطلوبہ ہتھیار تو تھے مگر آپؐ نے مکہ سے آٹھ میل پہلے یجاج کے مقام پر دو صد اصحاب کو چھوڑا اور ان کے ساتھ اپنا تمام اسلحہ رکھ دیا تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ جناب رسول اللہ اپنے دیگر اصحاب کے ساتھ اپنی میان بند تلواروں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔ جبکہ مدینہ کے مشہور و مقبول شاعر جناب عبداللہ بن رواحہ، جناب رسالت مآبؐ کی اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے اپنی نظم پڑھ رہے تھے۔ جب وہ مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو درج ذیل اشعار آپ کے زیر لب تھے جن کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

"اے کافروں کے بیٹو!

راستہ چھوڑ کر رسولؐ آ رہے ہیں

ان کا آنا رحمتوں کا آنا ہے

اے اللہ! میں ان پر یقین بھی کرتا ہوں اور ان کا حکم بھی مانتا ہوں

اور انہی کی وجہ سے میں اللہ کے حقوق سے واقف ہوا"۔

اس کے بعد انہوں نے رزمیہ نظمیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اس پر جناب رسالت مآبؐ نے ان سے فرمایا کہ اس کے بجائے یہ کہو کہ "کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں، سوائے اللہ کے، جس نے اپنے غلام کو (محمدؐ کو) کامیابی عطا فرمائی اور اس کے سپاہیوں کو عزت بخشی، جنگ خندق میں، جہاں دشمن شرمسار، نا امیدی اور ناکامی سے واپس لوٹا"۔

کفار سرداروں کو مسلمانوں کا اس طرح سے مکہ میں داخل ہونا اور اس کی گلیوں اور بازاروں میں سر اٹھا کر پھرنا پسند نہ آیا لہٰذا، وہ غم اور غصہ کی حالت میں مکہ چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ وہ یہ منظر برداشت نہ کر سکے کہ جن کو انہوں نے ظلم کر کے مجبور کیا تھا کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے جائیں لیکن وہ پھر وہاں واپس آ گئے اور وہ بھی بڑے طمطراق سے۔ کفار سرداروں نے اپنے آپ کو کعبہ کے سامنے والی پہاڑی الخمیس میں چھپا لیا۔ لیکن وہاں سے وہ جناب رسالت مآبؐ اور ان کے ساتھیوں کو دیکھ سکتے تھے۔ جبکہ دوسرے مکہ کے عام لوگ راستوں پر اور چھتوں پر کھڑے جناب رسالت مآبؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو دیکھ رہے تھے، جبکہ وہ لوگ تکبیر پڑھ رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے کہ "اللہ بہت بڑا ہے اور وہ یکتا ہے اور سب سے زیادہ طاقتور ہے اور یہ کہ اس کے غلام، اس کے گھر کے سامنے حاضر ہو گئے ہیں"۔ ان کافروں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ سیاہ فام حبشی غلام جس کو گرم ریت پر لٹا کے کوڑے مارے جاتے تھے اور وہ اس وقت تکلیف کی شدت میں احد، احد پکارتے تھے، آج وہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر لوگوں کو پکار رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ نماز کے لیے آؤ اور فلاح کے لیے آؤ۔ اور ساتھ ہی اللہ کی بڑائی اور محمدؐ کی رسالت کا اقرار اور اعلان بھی کر رہے تھے۔ بلالؓ آج آزاد تھے کسی کے غلام نہیں اور وہ اپنے سردار جناب رسالت مآبؐ کے چہیتے تھے اور اللہ کے پیارے غلام (بندے)۔

اس وقت کافروں نے ایک افواہ پھیلا دی کہ رسولؐ اللہ اور آپؐ کے اصحاب یثرب کے بخار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کمزور ہو چکے ہیں۔ اور یہ بات جناب رسالت مآبؐ کو الہام کے

ذریعہ معلوم ہوئی۔ لہٰذا طواف شروع کرنے سے قبل جناب رسالت مآبؐ نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ پہلے تین چکر جو کعبہ کے گرد لگائے جائیں، اس دوران وہ اکڑتے ہوئے پہلوانوں کی طرح کندھے ہلاتے ہوئے چلیں تاکہ کافروں کی افواہ کی تردید ہو جائے اور ویسے بھی اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے کہ اس کے تابعدار بندے کافروں کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار کریں۔ بلکہ کافروں کے سامنے خوب جوانمردی کے ساتھ رہنا چاہیے تاکہ وہ انہیں کبھی بھی اور کسی طرح سے بھی کمزور نہ سمجھیں۔ لہٰذا جناب رسالت مآبؐ کی وہ ہدایت آپؐ کی سنت بن گئی اور اب ہر حاجی طواف میں یہ سنت ادا کرنے کا پابند ہے۔ کچھ لوگ طواف میں بھاگنے کی یا دوڑ لگانے کی کوشش کرتے ہیں یہ صحیح نہیں، صحیح طریقہ صرف پہلوانی چال چلنے میں ہے۔

جناب رسالت مآبؐ اور آپؐ کے ساتھی مکہ میں تین روز تک رہے پھر کفار نے آپؐ کو مکہ چھوڑنے کے لیے کہا حدیبیہ امن معاہدے کے مطابق اور آپؐ واپس تشریف لے گئے۔

(۱۵۵) جناب رسالت مآبؐ کا خواب پورا ہوا

عمرہ ادا کرنے سے ایک سال قبل جناب رسالت مآبؐ نے خواب دیکھا تھا کہ آپؐ کعبہ کے گرد طواف کر رہے ہیں، یہ آپؐ کے لیے اللہ کی طرف سے حکم تھا کہ آپؐ مکہ جائیں اور طواف کعبہ کریں۔ جس کے لیے مکہ والوں نے انہیں روک لیا اور اس کے نتیجے میں حدیبیہ امن معاہدہ عمل میں آیا۔ اس وقت تمام اصحابہ نے حیرانگی کا اظہار کیا تھا کہ کیونکر جناب رسالت مآبؐ کی خواب پوری نہیں ہوئی۔ جناب عمرؓ اس معاملے میں سب سے آگے تھے اور بہت بے چین تھے اور اسی عالم میں انہوں نے آپؐ سے سوال کیا کہ "اے اللہ کے نبیؐ! کیا آپؐ نے نہیں فرمایا تھا کہ ہم طواف کعبہ کے لیے جائیں گے؟" اس پر جناب رسالت مآبؐ نے جواب دیا تھا کہ ہاں، لیکن ساتھ ہی کہا کہ "کیا میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم اسی سال جاؤ گے؟" تو جناب عمرؓ نے جواب دیا "نہیں"۔ پھر جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "تو پھر تم جاؤ گے اور اس کے گرد طواف کرو گے"۔

سورۃ فتح (۴۸) کی آیت (۲۷) میں فرمایا گیا کہ: "بے شک اللہ پورا کرے گا سچا خواب جو اس نے اپنے پیغمبر کو دکھایا پوری سچائی کے ساتھ۔ یقیناً تم داخل ہو گے مسجد الحرام میں، اگر اللہ نے چاہا تو"۔

بے شک اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور اپنے نبیؐ کی خواب کو اور آپؐ کے فرمان کو سچ کر دکھایا۔

(۱۵۶) قریش مکہ پر عمرے کے اثرات

سات برس قبل اہل مکہ نے فیصلہ کیا اور پھر اس فیصلہ پر عمل درآمد کرنے کے لیے کوشش کی کہ جناب رسالت مآبؐ کو قتل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو اجازت اور حکم دیا کہ وہ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔ لہٰذا آپؐ کو اپنا گھر، شہر اور وطن چھوڑ کر وہاں سے جانا پڑا اور پھر آپؐ مدینہ میں ایک نئی دنیا بسانے کی جد و جہد میں لگ گئے۔ لیکن ان کافرین مکہ نے وہاں بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑا اور آپؐ اور آپؐ کے پیروکاروں پر تین مرتبہ حملہ آور ہوئے۔ لیکن آپؐ ایک طویل جد و جہد کے بعد دوبارہ اپنے آبائی شہر اور اللہ کے گھر کا طواف کرنے کے لیے تشریف لانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہی نہیں، بلکہ آپؐ کے دو ہزار رفقائے کار نے بھی طواف کیا۔ جہاں آپؐ کے دشمنوں نے دیکھا کہ وہاں تو غلام اور آقا ایک ہی قطار میں کھڑے ہو رہے ہیں ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں ایک ساتھ کھانا تناول کرتے ہیں اور ایک ساتھ ہی مالکِ کائنات کے سامنے جھکتے ہیں اور اُس سے دعائیں مانگتے ہیں۔ وہ شخص جنہیں یہ لوگ پسند نہیں کرتے تھے، وہ اسی شخص کی بے مثال قیادت کو حیرانگی سے دیکھ رہے تھے اور ان کے پیروکاروں کو دیکھ رہے تھے کہ وہ کس طرح سے اپنے رہبر پر اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار ہیں، ان سے کتنی محبت کرتے ہیں اور ان کی کس قدر عزت کرتے ہیں، یہ حیران کن منظر دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ کافرین مکہ جناب رسالت مآبؐ اور ان کے پیروکاروں سے بہت زیادہ مرعوب ہو گئے، ان کا رویہ اور کردار حیران کن تھا۔ مختصراً یہ کہ قریش مکہ جناب رسالت مآبؐ اور دیگر مسلمانوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

عمرے کے اس سفر کے دوران دو خاص واقعات رونما ہوئے۔ جو درج ذیل ہیں:

(الف) جناب رسالت مآبؐ کا سیدہ میمونہ سے نکاح:

جناب رسالت مآبؐ نے ہمیشہ کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح سے وہ اہل مکہ سے تعلقات خوشگوار کر لیں اور اس کاوش میں وہ کسی بھی موقع کو ضائع نہ کرتے، مثلاً یہ کہ آپؐ نے مکہ پر کبھی حملہ نہ کیا

جبکہ اہل قریش نے تین مرتبہ مدینہ پر چڑھائی کی۔ قحط کے زمانے میں آپؐ نے اہل مکہ کی خاص طور پر مدد کی۔ آپؐ نے اپنے دشمن اعلیٰ ابوسفیان کی بیوہ بیٹی سے نکاح کیا۔ آپؐ نے ان سے لڑائی کے بجائے امن معاہدہ کر لیا۔ حالانکہ اس معاہدے کو صحابہ نے اپنی توہین سمجھا۔ لیکن باوجود کڑی شرائط کے، جناب رسالت مآبؐ نے وہ معاہدہ کر لیا تا کہ مکہ والے قتل و غارت سے بچ جائیں اور ایمان بھی قبول کر لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب رسالت مآبؐ اپنے کنبے، قبیلے اور شہر والوں کو جہنم کی آگ سے کسی نہ کسی طرح سے بچانا چاہتے تھے۔ اب ایک نیا اور معاملہ پیش نظر آ گیا جو اہل مکہ سے تعلقات مزید استوار کرنے کا بہانہ بن سکتا تھا۔ ہوا یوں کہ آپؐ کے چچا عباسؓ نے اپنی سالی جو بیوہ تھیں اور بہت باوقار اور عزت والی خاتون تھیں، ان کے ساتھ آپؐ کو عقد کے لیے کہا۔ یہ خاتون سیدہ میمونہ تھیں جو آٹھ سو بھائیوں کی بہن تھیں اور ان کے آٹھوں بھائی مکہ کے اعلیٰ گھرانوں میں رشتہ ازدواج میں منسلک تھے۔ اس کے علاوہ وہ خالد بن ولید کی خالہ بھی تھیں جنہیں انہوں نے بچپن سے پالا تھا اور وہ آپ کی والدہ کی طرح عزت کرتے تھے۔ غرض کہ جناب عباسؓ نے یہ نکاح منعقد کرا دیا، چار صد درہم مہر ادا کیا گیا اور دستور کے مطابق جناب رسالت مآبؐ ولیمے کا اہتمام کرنا چاہتے تھے تا کہ اس دعوت میں مکہ کے اکابرین کو بلوایا جائے تا کہ تعلقات اور بھی زیادہ خوشگوار ہو جائیں۔ لیکن تین روز گزر چکے تھے اہل مکہ نے آپؐ کو مزید ٹھہرنے کی اجازت نہ دی، اس لیے دعوت ولیمہ وہاں نہ ہو سکی۔ لیکن پھر بھی عام خیال یہی کیا جاتا ہے کہ اہل مکہ کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات کافی حد تک کم ہو گئے تھے۔

(ب) خالد بن ولید کا اسلام قبول کرنا:

سیدہ میمونہ کے بھانجے خالد پر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور اسے توفیق دی کہ اس نے قریش کے کچھ لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے یہ کہا کہ مجھے یہ بات عیاں ہو گئی ہے کہ محمدؐ نہ تو شاعر تھے اور نہ ہی جادوگر اور ان کے الفاظ اللہ کے الفاظ تھے اس لیے ان کی تابعداری لازم ہے ہر ایک پر۔ اس گروہ میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، اس نے مایوسی اور گھبراہٹ کے عالم میں کہا کہ وہ ستارہ پرستوں کا مذہب کیوں اختیار کر رہا ہے۔ خالد نے جواب دیا کہ مسلمان ہونے میں کوئی خرابی نہیں۔ اس پر عکرمہ نے کہا کہ تمہارے باپ کو قتل کرنے کا ذمہ دار محمدؐ ہی ہے اور تمہارے چچا کو بھی انہوں نے ہی قتل کر لیا۔ خالد نے عکرمہ کے قول پر توجہ نہیں دی، بلکہ کہا کہ یہ سب کچھ

جہالت تھی اور مجھے اب صحیح علم ہو گیا ہے اور عقل آ گئی چنانچہ میں اسلام قبول کر رہا ہوں۔

خالد نے پھر اپنے ایمان کے بارے میں جناب رسولؐ اللہ کو اطلاع بھجوائی اور اس کے ساتھ ہی تحفے میں چند گھوڑے بھی بھجوائے۔ جب ابوسفیان کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے غصہ میں آ کر خالد سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ لیکن ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے آ کر بیچ بچاؤ کرا دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ بھی یہی خطرہ محسوس کر رہا تھا، جس کا اظہار ابوسفیان نے کیا ورنہ تو وہ بھی خالد کا مذہب اختیار کر لیتا۔

اس کے بعد عمرو بن العاص اور عثمان بن طلحہ کعبہ کا کلید بردار بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ پھر خالد مدینہ چلا گیا اور جناب رسالت مآبؐ کی صحبت اختیار کر لی۔ حالانکہ خالد کو مکہ والے مدینہ سے واپس بلوا سکتے تھے حدیبیہ معاہدے کی رو سے، لیکن ان میں ہمت نہ ہوئی ایسا کرنے کے لیے۔ شاید اہل مکہ نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ لگایا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں سابقہ تجربہ یاد آ گیا ہو، ابوبصیر کا جسے وہ واپس تو لے آئے تھے لیکن وہ ان کے لیے ایک اور مخالف طاقت بن کر ابھر آیا تھا۔

(۱۵۷) عیسائی شخصیتیں جنہوں نے جناب محمدؐ کو رسول کی حیثیت سے پہچانا

ایسے عیسائی حضرات جو عیسیٰؑ کے سچے ماننے والے تھے اور جنہیں اپنی الہامی کتابوں کے بارے میں صحیح علم بھی تھا، وہ جانتے تھے کہ عرب میں یثرب جیسے علاقے میں ایک نبی آنے والا ہے۔ انہوں نے جناب رسالت مآبؐ کو نبی کی حیثیت سے اس وقت تسلیم کر لیا تھا جب کہ آپؐ نے ابھی تک نبوت کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے عیسائیوں کی تعریف کی اور ان کے کردار اور سلوک کو سراہا۔ لیکن ایسے عیسائی بہت کم تعداد میں تھے۔ یہاں یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان چیدہ چیدہ مسیحی افراد کا ذکر کیا جائے، جنہوں نے محمدؐ بن عبداللہ کو دیکھنے اور آپؐ سے ملنے کے بعد از خود پیغمبر تسلیم کر لیا۔ بے شک وہ خوش بخت لوگ تھے۔

(الف) عیسائی راہب بحیرہ:

عراق کے شہر بصرہ میں جو اس وقت ملک شام کا حصہ تھا اس میں بحیرہ نامی ایک راہب رہتا

تھا جب جناب رسولؐ اللہ صرف بارہ برس کے تھے تو آپؐ وہاں اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ گئے۔ بحیرہ ایک سچا عیسائی تھا اور اسے توریت اور انجیل کا خاصا علم تھا اس نے جب اس بچے میں چند نشانیاں پائیں تو وہ سمجھ گیا کہ یہ بچہ آنے والا نبی معلوم ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے ان نبیؐ سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے قافلہ کے تمام لوگوں کو کھانے کی دعوت دی اور آپؐ سے بڑی محبت اور تعظیم کے ساتھ ملا اور آپؐ کے چچا کو ہدایت کی کہ وہ انہیں لے کر فوراً واپس چلے جائیں اور ان کی حفاظت کریں۔ چنانچہ بحیرہ وہ خوش نصیب پہلا شخص تھا جس نے نبیؐ کو صرف بارہ برس کی عمر میں نبی کی حیثیت سے پہچانا، ان کی نبوت کی تصدیق کی اور اپنی محبت اور عزت کا اظہار کیا۔

(ب) ورقہ بن نوفل:

ورقہ بن نوفل سیدہ خدیجۃ الکبریٰ کے چچازاد تھے اور انہوں نے مسیحیت اختیار کر لی تھی اور ایک اچھے عیسائی عالم بن گئے تھے، انہیں توریت اور انجیل کے علم پر بھی دسترس حاصل ہو گئی تھی۔

جب جناب رسالت مآبؐ کو پہلی مرتبہ وحی کی آمد کا تجربہ ہوا اور آپؐ نے جبرئیل کو دیکھا تو آپؐ کی طبیعت میں عجیب و غریب تغیر معلوم ہوا اور آپؐ تھوڑی دیر کے لیے خوفزدہ حالت میں مبتلا ہو گئے۔ آپؐ کی یہ کیفیت دیکھنے کے بعد سیدہ خدیجۃ الکبریٰ آپؐ کو اپنے چچازاد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور ان سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو دیکھ کر انہیں کیا ہوا ہے؟ جب ورقہ نے آپؐ سے گفتگو کی اور حقیقت معلوم کی تو اپنی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ محمدؐ تو نبی بننے والے ہیں اور ان کے پاس اللہ کا مقرب فرشتہ جبرئیل تشریف لایا تھا، جو اس سے پہلے تمام انبیاء کے پاس آ چکا ہے۔ ورقہ چونکہ ضعیف شخص تھا وہ اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکا جب محمدؐ نے نبوت کا اعلان کیا۔

(ج) نجاشی اشامر (شاہ حبشہ):

اشامر شاہ حبشہ اہل علم میں سے تھا۔ ایک سچا عیسائی بھی اور بہت نیک پرہیزگار۔ اللہ اور اس کے رسولوں سے محبت کرنے والا۔ جب اس نے جناب رسالت مآبؐ کی خوبیاں سنیں اور قرآن کی آیات سنیں خاص طور پر جب جناب جعفرؓ نے انہیں سورۂ مریم سنائی، جس میں عیسیٰؑ اور مریمؑ کا ذکر بیان کیا گیا ہے تو نجاشی کی آنکھیں عقیدت اور محبت اور اللہ کے خوف سے آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ اور انہوں نے پہلے تو قرآن کی سچائی کی تصدیق کی اور پھر جناب رسولؐ اللہ کی رسالت کی تصدیق کی۔ انہوں نے پہلے خط میں جو جناب رسول اکرمؐ کے خط کے جواب میں

لکھا تھا، اس میں اس بات کا اقرار کرلیا تھا کہ جناب رسول اللہؐ سچے نبی ہیں اور اس کے نقل و قول سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ وہ ایک سچا عیسائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ایسے لوگ دہرے ثواب کے حق دار ہوتے ہیں یعنی جن کو دو انبیاء پر ایمان لانا نصیب ہوا ہو۔ اسی لیے جب نجاشی کو بدر کی فتح کا علم ہوا تو اس نے یہ خوشخبری سنانے کے لیے مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین کو بلایا۔ جب وہ لوگ آئے تو دیکھا کہ نجاشیؓ پھٹے پرانے کپڑوں میں زمین پر بیٹھا ہے۔ جب جعفرؓ نے ماجرا دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ شکرانے کے طور پر اپنے مالک کے سامنے اپنے عجز و انکسار کا اظہار کر رہا ہوں، بدر کی خوشی کے موقع پر۔ پھر جناب رسالت مآبؐ نے انہیں پیغام بھجوایا کہ وہ سیدہ اُم حبیبہؓ سے ان کا نکاح کرا دیں۔ جو آپ نے منظور کرلیا اور اپنی جیب سے چار صد دینار مہر ادا کیا اور شادی کا کھانا کھلایا اور اُم المومنین کو مدینہ روانہ کرنے کا بندوبست کیا۔

اس کے بعد جب نجاشیؓ کی وفات کی خبر جناب رسول اللہؐ کو ملی تو آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ تمہارا بھائی نجاشیؓ فوت ہوگیا ہے آؤ اس کے لیے صلوٰۃ پڑھیں اور اس طرح ان کی غائبانہ صلوٰۃ جنازہ ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے بھی عیسائیوں کی تعریف کی ہے اور اس سلسلے میں سورۃ المائدہ (۵) کی آیت (۸۲) کا نزول ہوا، جس میں فرمایا گیا کہ "بے شک ! تم دشمنی میں سب سے زیادہ دیکھو گے انسانوں میں سے یہودیوں کو کہ وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں اور پھر مشرک، اور تم دیکھو گے نزدیک محبت میں ان ایمانداروں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ان میں بہت سے ہیں راہب اور پجاری اور وہ تکبر نہیں کرتے"۔

اس کے علاوہ اسی سورت کی آیت ۸۳۔۸۴ میں شاہ حبشہ نجاشی اور ان کے وفد کی تعریف کی گئی ہے، جس میں کہا گیا کہ "اور جب وہ (عیسائی) سنتے ہیں جو کچھ نازل کیا گیا ہے پیغمبر پر، پھر تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے اُبل رہی ہیں، اس وجہ سے کہ انہوں نے اس کلام میں سچائی پائی۔ اور پھر وہ کہتے ہیں ہمارے رب! ہم مانتے ہیں، پس ہم کو لکھ لیجئے ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے سچائی کی تصدیق کی اور ہم خواہش کرتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں داخل کرے گا جنت میں نیک لوگوں کے ساتھ"۔

اس کے علاوہ ایک اور بہت ضروری آیت یعنی سورۃ آل عمران کی آیت (۱۹۹) جس میں کہا گیا کہ "اور یہاں یقیناً ایسے لوگ ہیں اہل کتاب میں سے یعنی یہودی اور نصاریٰ جو اللہ کو مانتے ہیں اور جو کچھ آپ (محمدؐ) پر اتارا گیا ہے اور جو کچھ ان پر اتارا گیا ہے عاجزی اور انکساری کے ساتھ جھکتے ہوئے اللہ کے سامنے۔ وہ اللہ کی آیات کو تھوڑے داموں نہیں بیچتے اور ان کے لیے انعام ہے ان کے رب کے پاس۔ یقیناً اللہ تعالیٰ حساب لینے میں تاخیر نہیں فرماتا"۔

(د) حبشہ کا عیسائی وفد:

جب حبشہ کا عیسائی وفد جناب رسول اللہؐ سے مدینہ ملنے کے لیے آیا اور جناب رسالت مآبؐ سے قرآن حکیم کی تلاوت سنی تو وہ چونکہ سچے دین پر تھے اور علم والے تھے، چنانچہ قرآن کریم سننے کے دوران ان پر رقت طاری ہوگئی اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اپنے رب کے حضور عجز و انکساری کی وجہ سے اور وہ اپنے رب کا کلام سن کر لرزنے میں پڑ گئے۔

ان کے برعکس اہل یہود جو مدینہ کے علاقہ میں صرف اسی وجہ سے آئے تھے کہ یہی وہ علاقہ تھا جہاں آخری پیغمبر علیہ السلام تشریف لانے والے ہیں۔ لیکن ان کی کینہ پروری اور تعصب کی آگ نے انہیں پیغمبر علیہ السلام کی قربت نصیب نہ ہونے دی۔ اور انہوں نے نہ صرف جناب رسول اللہؐ کو پیغمبر کی حیثیت سے قبول نہ کیا بلکہ ان کے قتل کرنے کے درپے ہوگئے۔ اور اس سے پہلے اہل یہود نے جناب عیسٰیؑ کو بھی قبول نہ کیا تھا بلکہ انہیں قتل کرنے کی پوری پوری سازش کی۔ حالانکہ وہ نبی کی حیثیت کو جانتے اور پہچانتے تھے اور انہیں اس بات کا علم تھا کہ عیسٰیؑ اور محمدؐ ایک ہی دین یعنی دین ابراہیمی کے پیروکار ہیں اور وہی دین جناب موسٰیؑ کا تھا۔

(۱۵۸) عیسائیوں اور مسلمانوں کا غیر متوقع ٹکراؤ

چونکہ عیسائی زیادہ نرم مزاج اور قوت برداشت کے مالک تھے، اس لیے جناب رسول اللہؐ کے دل میں ان کے لیے زیادہ رغبت تھی اور ان سے زیادہ امیدیں بھی وابستہ تھیں کہ وہ اسلام کی طرف زیادہ راغب ہو جائیں گے۔ لیکن ایک خلاف توقع لیکن ظالمانہ واقعہ پیش آگیا، جس میں نہ تو اخلاقی اقدار اور نہ ہی بین الاقوامی قوانین کا لحاظ رکھا گیا۔ ہوا یوں کہ بنو غسان کے ایک

عیسائی شہزادے شورہ بیل بن عمر جو روم کے بادشاہ کا گورنر تھا اور بصرہ میں متعین تھا اس نے جناب حارث بن عمیرؓ کو قتل کرا دیا جو جناب رسولؐ اللہ کے ایلچی اور ان کے سفیر تھے۔ یہ متکبرانہ اور ظالمانہ کاروائی کسی طور بھی جناب رسولؐ اللہ اور دیگر مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ لہٰذا انہوں نے اس واقعہ پر اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ حالانکہ اہل روم کے سامنے مسلمان طاقت کی کوئی اہمیت نہ تھی اور جناب رسولؐ اللہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے، لیکن پھر بھی انہیں اپنی توہین پسند نہ تھی اور دشمن کو یہ جتلانا لازم ہو گیا تھا کہ ہم طاقت کے موازنے کی پروا نہیں کرتے، بلکہ اپنی عزت کی خاطر مرمٹتے ہیں۔ اس طرح سے رومیوں کے لشکر کثیر کے سامنے چند گنے چنے مسلمانوں کی جنگ تاریخ کے اوراق پر آج بھی سنہرے حروف کے ساتھ درج ہے۔

(۱۵۹) جنگ موتہ

چونکہ کسی بھی سفیر کا قتل ایک بہت گھناؤنا جرم ہوتا ہے اور اسے بین الاقوامی طور پر تسلیم بھی کیا جاتا ہے، یہ اسی طرح سے ہوتا ہے کہ سفیر کے قاتل ملک نے مقتول کے ملک کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہو۔ اس لیے جناب رسالت مآبؐ نے اپنے سفیر کے قتل کو نہایت سنجیدگی سے محسوس کیا اور تین ہزار سپاہ اپنے بہت ہی پیارے زید بن حارثہؓ کی کمانڈ میں دیے اور ساتھ ہی لشکریوں سے فرمادیا کہ جب زید تم میں نہ رہے تو پھر لشکر کی کمانڈ جعفرؓ بن ابوطالب کے حوالے کر دینا اور جب جعفرؓ بھی تم لوگوں کے درمیان نہ رہے تو پھر عبداللہ بن رواحہؓ ان کی جگہ لے لیں اور جب وہ بھی تمہارے درمیان نہ رہیں تو پھر جس کو چاہو اپنا امیر مقرر کر لینا۔

اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے نصیحت کے چند الفاظ انہیں کہے اور فرمایا کہ ”کفار کے ساتھ اللہ کے نام پر لڑو، نہ تو کسی عہد کو توڑو اور نہ ہی غداری کرو، اور کسی بھی حالت میں بچے، عورتیں، محتاج، بوڑھے، دینی ارکان یعنی راہب، پادری، بھکشو وغیرہ نہ مارے جائیں“۔

اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی کیونکہ آپؐ کی نصیحت سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اب ایک گھمسان کی جنگ ہوگی اور تینوں نامزد سپہ سالار شہادت پا جائیں گے۔ اس کے بعد جناب رسول اکرمؐ بقیہ مسلمانوں کے ساتھ لشکر کو الوداع کہنے مدینہ کے باہر تک تشریف لے گئے۔

اس وقت عبداللہ بن رواحہؓ کی آنکھیں نم ہو گئیں، جب ان سے پوچھا گیا کہ اس موقع پر آپ کیوں روئے تو انہوں نے قسم کھا کر کہا، کہ وہ دنیا کی کسی قسم کی کشش کی وجہ سے نہیں روئے بلکہ وہ اس وجہ سے روئے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو انہوں نے جناب رسولؐ اللہ سے سنے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے وہ الفاظ سورۃ مریم (۱۹) کی آیت ۷۱) کے تھے، جس کا مطلب ہے کہ ”تم میں سے ہر ایک کو اس پر سے گزرنا ہے (یعنی دوزخ کے اوپر سے) یہ تمہارے رب کی طرف سے طے ہے اور جو ہوتا ہی ہے“۔

یہ آیت مبارکہ بہت ہی چونکا دینے والی اور وحشت ناک ہے کہ اسے سنتے ہی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ ہر ذی شعور بندہ یہ سوچے گا کہ کیوں کہ میں اس آگ کی وحشت سے بچ سکتا ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا بہت شکر کہ اللہ نے اس سے اگلی آیت یعنی سورۃ مریم کی آیت (۷۲) میں اپنے بندوں کو اطمینان دلا دیا اس خوفناک آگ کی طرف سے اور فرمایا کہ ”پھر ہم (اللہ) بچا لیں گے ان کو جو اللہ سے ڈرتے رہے ہوں گے اور اللہ کے تابعدار رہے ہوں گے (یعنی اللہ کا ہر حکم مانتے رہے ہوں گے) اور ہم (اللہ) چھوڑ دیں گے ان لوگوں کو جو نافرمان ہوں گے اس (آگ) کے اندر ان کے گھٹنوں کے بل“۔

امام ابن کثیرؒ نے طبری کی ایک روایت کے مطابق لکھا ہے آیت مذکورہ (۷۱) کی نسبت سے کہ ”دوزخ پر ایک پل ہوگا اس قدر تیز جیسے تلوار کی دھار۔ اس کے اوپر سے پہلا گروپ گزرنے والوں کا ایسا ہوگا کہ وہ اس پر سے اس طرح سے گزرے گا جیسے بجلی اور دوسرا گروپ ایسے گزرے گا جیسے ہوا کا جھونکا اور تیسرا گروپ ایسے گزرے گا جیسا کہ تیز گھوڑا اور چوتھا ایسا ہو گا جیسا کہ تیز گائے اور پھر باقی اس طرح سے گزریں گے جبکہ فرشتے پکار رہے ہوں گے، اے اللہ ان کو بچا لے، ان کو بچا لے اور پھر جب وہ گزر جائیں گے اور ان کے بعد وہ ایمان والے نہ ہوں گے، اللہ کا حکم نہ ماننے والے، جن کی منزل ہی دوزخ ہوگی ان کی نافرمانی کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ بچا لیں گے ایمان والوں اور نیک لوگوں کو اس مصیبت سے ان کے اعمال کی وجہ سے جو انہوں نے اپنی دنیا کی زندگی میں کیے ہوں گے۔ پھر ایسے ایمان والے جنہوں نے گناہ کبیرہ کیے ہوں گے ان کو اجازت ملے گی کہ وہ ایک دوسرے کے لیے دعا کریں۔ فرشتے، پیغمبر اور دیگر ایمان والے بھی ان کے لیے دعا کریں گے اس طرح سے بہت بڑی تعداد گناہ گاروں کی

دوزخ سے نکال لی جائے گی۔ آگ نے ان کے زیادہ تر جسم کو اس طرح سے کھالیا ہوگا جیسے کسی
گھوڑے نے ان کے جسموں کو کھالیا ہو۔ سوائے ان کی ان جگہوں کے جو سجدے کے وقت پر
زمین پر لگتی ہوں گی۔ ان کو دوزخ سے صرف اس لیے نکالا جائے گا کہ ان کے دل میں ایمان کی
کچھ حرارت موجود ہوگی۔ ان میں سے پہلا نکلنے والا وہ ہوگا جس کے دل میں ایک دینار کے
برابر ایمان ہوگا، پھر جس کے دل میں اس سے کم ایمان ہوگا۔ اور اسی طرح سے ایمان کی کمی کے
ساتھ ساتھ لوگ باہر آتے رہیں گے جبکہ ایک ذرے کے برابر والے ایمان والے لوگ بھی
دوزخ سے باہر نکال دیے جائیں گے۔ پھر آخر میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو نکال لیں گے جس
نے اپنی پوری زندگی میں ایک بار بھی "لا الٰہ الا اللہ" کہا ہوگا۔ اس کے بعد دوزخ میں ان
لوگوں کے سوا کوئی نہ رہے گا جن کے لیے یہ لکھ دیا گیا کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں ہی رہیں گے۔ اللہ
تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اپنے غصے، ناراضی اور عذاب سے ہمیشہ بچائے رکھے (آمین)
حالانکہ درج بالا آیات کی تفصیل اس جنگ کے مضمون کے متعلق تو نہیں ہے لیکن یہ
مناسب سمجھا گیا کہ اس کو اس وجہ سے بیان کر دیا جائے کہ ہمیں ایمان کی اہمیت کا اندازہ
ہو جائے اور اس کے برعکس انجام کا اندازہ۔

(۱۲۰) مسلمان اور رومی افواج کا ٹکراؤ

مقام موتہ عرب اور شام کی سرحد پر واقع تھا اب یہ مقام عمان کے شہر کرک سے صرف بارہ
کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور مدینہ سے بارہ سو کلومیٹر۔ جنگ موتہ آٹھویں ہجری کے ماہ
جمادی الاول یعنی اگست ستمبر ۶۲۹ء کے دوران منعقد ہوئی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں جناب
رسول اللہ کے ایلچی حارث بن عمیرؓ کو رومی گورنر نے شہید کیا تھا۔ گورنر نے مسلمان فوج کی خبر
سننے کے بعد وہاں ایک لاکھ کی فوج اکٹھی کر رکھی تھی۔ یقینی طور پر یہ ایک بے جوڑ مقابلہ تھا۔
مسلمانوں کو بھی اس صورتحال کا بخوبی اندازہ تھا، جب وہ موتہ سے پہلے چند میل کے فاصلے پر
معان کے مقام پر رکے تو انہوں نے وہاں دو راتوں تک جنگ کی صورتحال سے نپٹنے کے لیے
غور و خوض کیا۔ ان میں سے کچھ شرکاء جنگ نے مشورہ دیا کہ اس معاملے میں جناب رسول اللہ
سے مشورہ کر لیا جائے اور ان سے مزید مدد مانگی جائے۔ لیکن تیسرے نامزد کمانڈر جناب عبداللہ

بن رواحؓ کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان کی واپسی ممکن نہیں اور ان کی زندگی کے آخری
دن یہیں پورے ہونے کو ہیں۔ اس لیے وہ آگے بڑھے اور اپنے ساتھیوں سے بہت بہادرانہ
اور جذباتی انداز میں خطاب فرمایا کہ "اے میرے بھائیو! اللہ کی قسم! وہ گھڑی جس کی نسبت تم
لوگ ہچکچا رہے ہو، وہی ہے جس کے لیے تم اپنے گھروں سے باہر نکلے ہو۔ ہم مسلمان تعداد پر
بھروسہ نہیں کرتے یا طاقت پر، کسی دشمن سے لڑنے کے لیے۔ بلکہ ہم لوگ اپنے ایمان کی خاطر
لڑتے ہیں جو ہمیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، پس ہمیں آگے بڑھنا چاہیے کیونکہ دو میں سے
ایک نعمت ہمارے انتظار میں ہے اور وہ ہے فتح یا شہادت"۔
ان کی تقریر نے ان لوگوں میں جو ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے ایک نئی روح پھونک دی،
پس پھر وہ آگے بڑھے موتہ کی طرف۔ جہاں دونوں میں ایک گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔
مسلمان اتنی بے جگری سے لڑے کہ رومن فوج کے سپہ سالار نے اپنی حکومت کو مزید فوری مدد
کے لیے درخواست کر دی۔ لڑائی کے اس گھمسان مرحلے میں سپہ سالار فوج جناب زید بن حارثہؓ
نے اپنی جان جان آفریں مالک کے حضور پیش کر دی۔ پھر اسی طرح سے دوسرے نامزد سپہ
سالاروں جناب جعفرؓ بن ابوطالب اور جناب عبداللہ بن رواحؓ نے باری باری اپنی قربانی کا
نذرانہ پیش کیا اور پھر فوج کی سربراہی کی ذمہ داری خالد بن ولید کے ہاتھ آئی۔ خالد نے بھی
اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور جنگ میں ان کے ہاتھ سے نو (۹) تلواریں ٹوٹیں۔ اس طرح
سے انہوں نے دشمن کو دن بھر لڑائی میں مشغول رکھا حتیٰ کہ لڑائی دوسرے روز کے لیے تھم گئی۔
خالد نے جنگ کی حالت زار کو سمجھتے ہوئے اور جنگ کے مقصد کو سمجھتے ہوئے کہ ان کا مقصد رومی
گورنر کے متکبرانہ رویہ کو چیلنج کرنا تھا وہ یہ کہ مسلمان کسی قسم کی بدتمیزی برداشت نہیں کریں گے اور
یہ کہ وہ لڑنا جانتے ہیں۔ ان مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے خالد نے فیصلہ کیا کہ چونکہ ان کا مقصد تو
پورا ہو چکا ہے اس لیے وہ بقیہ مسلمانوں کو باعزت طور پر واپس لے جائیں۔ اس مقصد کے لیے
انہوں نے بچے ہوئے سپاہیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور طے کیا کہ ان میں سے دو دائیں اور
بائیں طرف سے دشمن پر حملہ آور ہوں گے، جبکہ تیسری پلٹن پوری قوت کے ساتھ دندناتی
ہوئی دشمن پر ٹوٹ پڑے گی۔ چنانچہ صبح کے وقت اسی حکمت عملی کے ساتھ جنگ شروع کی گئی اور
دشمن کو یہ گمان ہوا کہ یہ تیسری پلٹن مسلمانوں کی تازہ دم فوج کا حصہ ہے اور اس طرح سے ان

کے حوصلے اور زیادہ پست ہو گئے انہوں نے پیش قدمی سے گریز کیا اور دفاعی پوزیشن میں آ گئے اور ان پر حیرانگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جبکہ خالد نے اپنی فوج کو احتیاط کے ساتھ ایک طرف کرنا شروع کر دیا اور اس طرح سے باقی ماندہ فوج بچ گئی، جسے خالد واپس مدینہ لانے میں کامیاب ہو گئے اور رومیوں نے جرأت نہ کی کہ وہ ان کا پیچھا کریں۔

اس لڑائی میں شہید ہونے والوں کی تعداد کی صحیح گنتی نہیں ملتی، بلکہ حیران کن اختلاف پایا جاتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ ابن ہشام نے کل تیرہ (۱۳) مسلمانوں کی شہادت لکھی، ابن کثیرؒ نے بارہ (۱۲) اور ڈاکٹر محمد علی سلابی نے دس (۱۰)، مارٹن لنگز نے آٹھ (۸) اور بہت سے اس بارے میں خاموش ہیں۔ لیکن رومانیہ کے ایک مورخ جو منسی ورژیل جارجیو، جو جناب رسول اللہ کے بارے میں بہت ہی محبت سے لکھنے والا عالم تھا اس نے یہ تعداد دو ہزار لکھی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ جب خالد نے کمان سنبھالی تو اس وقت تین ہزار میں سے ڈیڑھ ہزار سپاہی جام شہادت نوش جان کر چکے تھے اور پھر خالد نے جب بے جگری کے ساتھ لڑائی لڑی تو مزید پانچ صد شہید ہوئے جبکہ ایک ہزار کو بچا کر خالد واپس مدینہ لے آئے۔

مصنف بہرحال جارجیو کی بات کو منطقی طور پر صحیح تسلیم کرتا ہے کیونکہ خالد کی جنگ بندی اور واپسی کو جناب رسول اللہ کی طرف سے سراہا گیا، لیکن اگر تین ہزار میں سے صرف (۸) تا (۱۳) ہی شہید ہوئے تھے تو پھر اس طرح واپسی کا کوئی جواز نہ تھا۔ کیونکہ اگر دو روز میں ایک لاکھ کا مقابلہ کرتے ہوئے تین ہزار میں سے صرف تیرہ ہی شہید ہوئے تھے تو پھر لڑائی کئی روز تک جاری رہنی چاہیے تھی اور ان کی واپسی کا کسی طرح سے بھی جواز نہیں بنتا۔ دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کے بہت بڑے نقصان کی اطلاع جناب رسول اللہ نے پہلے ہی دے دی تھی اور اسی لیے آپؐ نے پہلے ہی سے ترتیب کے ساتھ تین کمانڈر مقرر کر دیے تھے اور تینوں کی شہادت کی پیش گوئی بھی کر دی تھی۔ یہ سارے حالات جب سامنے آتے ہیں تو صرف تیرہ مجاہدین معہ تین کمانڈروں کے شہید ہونا درست معلوم نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلطی کتابت کی وجہ سے یا نقل کرنے کی غلطی کی وجہ سے چلی آئی اور اس پر کسی نے غور نہیں کیا۔

بہرحال جب بقیہ مسلمان واپس گھر لوٹے تو اہل مدینہ نے انہیں میدان جنگ سے بھاگ آنے کا طعنہ دیا۔ جبکہ جناب رسول اللہ نے انہیں خوش آمدید کہا اور ان کے لیے فرمایا کہ وہ بھگوڑے نہیں ہیں، بلکہ یہ پھر واپس جائیں گے اور دشمن سے لڑیں گے انشاء اللہ۔ لیکن اس کے باوجود جناب رسول اللہ اپنے پیاروں کی شہادت پر غمزدہ ضرور تھے۔ حالانکہ اس جنگ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا لیکن پھر بھی مسلمانوں نے اپنی بے انتہا بہادری کا مظاہرہ کیا اور یہ جتا دیا کہ وہ تعداد کی پرواہ کیے بغیر لڑ سکتے ہیں اور بڑے سے بڑے دشمن کی صفوں کو چیر کر انہیں اچھی خاصی مشکل سے دوچار کر سکتے ہیں۔

مسلمان فوج کی اس بہادری کا اثر صحرائی بے لگام بدوؤں پر بھی ہوا اس لیے انہوں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بہادر قوم کے ساتھ مل جائیں۔ چنانچہ وہ بھی جناب رسول اللہ کے زیر قیادت آ گئے اور اس طرح سے بدوؤں کے قبیلے بنو سالم، بنو اشجع، بنو غطفان، بنو ذبیان، بنو فزارہ اور بہت سے دیگر قبائل نے جناب رسالت مآبؐ کی قیادت قبول کر لی۔

(۱۶۱) غزوہ ذات السلاسل

موتہ کے تقریباً ایک ماہ بعد جناب رسالت مآبؐ نے تین صد جانثاروں کو ایک نو مسلم عمرو بن العاص کی سرکردگی میں بنو قضاعہ کے ایک گروہ سے نپٹنے کے لیے بھیجا، جو رومیوں کے حلیف تھے اور ممکنہ مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو رہے تھے۔ عمرو بن العاص جبکہ راستے میں ہی تھے تو انہوں نے فیصلہ کر کے جناب رسول اللہ کو درخواست بھیجی کہ ان کے لیے مزید کمک روانہ فرمائیں۔ اس لیے جناب رسالت مآبؐ نے جناب عبیدہ بن جراحؓ کی سربراہی میں جن کے ساتھ جناب ابوبکرؓ، جناب عمرؓ بھی تھے مزید کمک روانہ کی۔ مذکورہ تینوں صحابی رتبے کے اعتبار سے مسلمانوں میں بہت اعلیٰ حیثیت کے مالک تھے۔

عمرو اپنے معرکے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن انہوں نے مذکورہ صحابہ کی حیثیت کا خاطر خواہ خیال نہ رکھا۔ جب یہ اصحاب وہاں پہنچے تو سوال پیدا ہوا کہ اب ان کی موجودگی میں لشکر کی کمانڈ کس کے پاس رہے گی، عمرو کے پاس یا نئے کمانڈر عبیدہؓ کے پاس۔ بہرحال یہ اختلاف چونکہ سبق آموز ہے اس لیے اس کا تذکرہ لازمی سمجھا گیا ہے۔ عمرو نے لشکر کی کمانڈ اپنے پاس رکھنے پر اصرار کیا، جبکہ بہت سے لشکری اس بات پر تیار نہ تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جناب رسول اللہ کے قریبی اور معتبر اصحاب کی موجودگی میں وہ کمانڈ کے اہل نہیں۔ لیکن عبیدہ بن جراحؓ نے بہت ہی

فراخ دلی کا مظاہرہ فرمایا اور معاملے کو بہت اچھی طرح سے اور پر امن طریقے سے سلجھا لیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے امرا میں تو جناب رسالت مآبؐ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کسی اختلاف کو جنم نہ دوں گا اور اگر تم میرا کہنا نہ مانو گے تو میں تمہارا حکم مان لوں گا۔

اس طرح سے تمام اصحاب نے امر کے زیر کمانڈ کام کیا۔ یہ چھوٹا سا واقعہ امت مسلمہ کے لیے ایک سبق آموز واقعہ ہے وہ یہ کہ انہیں اپنے کمانڈر کے حکم کو بہر حال قبول کرنا ہے اور ہر اس حکم کی تابعداری کرنی ہوگی جو صحیح ذریعہ سے ہم تک پہنچ رہا ہے۔ اس سے روگردانی کی صرف اور صرف ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس حکم سے اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو۔ قوم کو اسی طرح سے ایک رہنما چاہیے جو قوم کی وحدت کو اپنی ذاتی عزت قربان کر کے بھی قائم رکھنا چاہے۔ ہماری اپنی ذات کی قوم کی وحدت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں اور دوسری طرف امت پر بھی فرض بنتا ہے کہ وہ لیڈر کو منتخب کرے تو وہ اس کی علمی صلاحیتوں، اس کی تقویٰ و پرہیزگاری اور اس کی قائدانہ صلاحیتوں کو مدنظر رکھے۔

(۱۴۲) معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی

جناب رسولؐ اللہ اور قریش مکہ کے ساتھ حدیبیہ کا معاہدہ امن تقریباً اٹھارہ سالہ قریش دشمنی کے بعد ہوا۔ قریش نے جناب رسولؐ اللہ کو اٹھارہ برس تک تنگ کیا اور اس بات پر مجبور کرتے رہے کہ آپؐ اپنے مشن سے دستبردار ہو جائیں۔ جب یہ سب کچھ نہ ہو سکا تو پھر آپؐ کے قتل پر آمادہ ہو گئے لیکن جب کامیاب نہ ہو سکے تو آخر کار اس معاہدہ امن کی جانب راغب ہو گئے۔ اور پھر اس معاہدے کی وجہ سے جناب رسولؐ اللہ اور آپؐ کے ساتھی واپس اپنے وطن اور اللہ کے گھر جانے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ معاہدہ جو دس برس کے لیے ہوا تھا، محض دو برس تک قائم رہ سکا۔ اور مزید اس لیے قائم نہ رہ سکا کہ قریش اس معاہدے کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو گئے۔ اس معاہدے کی رو سے کوئی بھی گروہ ان معاہدہ کنندگان میں سے کسی ایک کا حلیف بن سکتا تھا اور حلیف بننے کے بعد اس گروہ یا قبیلہ کو بھی اس معاہدے کا پابند ہونا لازم تھا۔

اس طرح سے قبیلہ بنو بکر تو قریش کے اور قبیلہ بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے اور بعد میں یہ دونوں قبائل یعنی بنو خزاعہ اور بنو بکر آپس میں لڑ پڑے۔ اس وقت قریش نے اپنے حلیف

بنو بکر کی مدد کی۔ اس طرح سے یہ مدد مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ کے خلاف ہوئی جو قریش کی طرف سے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی تھی۔ لیکن انہیں مسلمانوں کی قوت اور حیثیت کا چونکہ احساس تھا اس لیے وہ معاہدہ حدیبیہ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ اس بات پر تیار ہو گئے کہ وہ اپنی خلاف ورزی کے عوض مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ کو معاوضہ یا تاوان ادا کریں۔

(۱۴۳) ابوسفیان کا مدینہ آنا

قریش کا سربراہ ابوسفیان بنیادی طور پر فائدہ پرست کاروباری شخص تھا اور ہر کام کے پیچھے وہ فائدہ اور نقصان کو مدنظر رکھتا تھا اور اس کے سیاسی عقائد بھی اسی بنیاد پر قائم تھے۔ چنانچہ گمان قوی یہ ہے کہ اس نے درج ذیل امور کو مدنظر رکھتے ہوئے اس معاہدہ کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہوگا:

الف) فتح خیبر کے بعد یہودیوں کی تجارت کا رخ زیادہ تر مسلمانوں کی طرف ہو گیا اور اب مسلمانوں کی گرفت مکہ شام شاہراہ پر اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔

ب) مسلمانوں نے چونکہ یہودیوں کی طاقت ختم کر کے خطہ عرب کے زیادہ تر حصے پر اپنی طاقت کا رعب بٹھا دیا تھا اور اب وہ بڑی طاقت بن گئے تھے۔

ج) رومیوں جیسی بہت بڑی طاقت کا سامنا میدان جنگ میں کرنا اور اس میں بہادری کے جوہر دکھانا، ایک بہت ہی بڑی اور حیران کن بات تھی جس نے تمام اہل عرب کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

یہ وجوہات قریش کے لیے کافی تھیں کہ وہ صلح حدیبیہ کو آئندہ برسوں کے لیے بھی قائم رکھیں کیونکہ اب قریش مسلمانوں کا میدان جنگ میں سامنا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ قریش کو اپنی خلاف ورزی کا شدید احساس تھا، اس لیے ابوسفیان فوری طور پر مدینہ روانہ ہوا تاکہ وہ اپنی صفائی میں جناب رسولؐ اللہ کو کچھ کہہ کر مطمئن کر سکے۔ لہٰذا وہ مدینہ اپنی بیٹی سیدہ ام حبیبہؓ کے گھر آیا۔ جب سیدہ نے اپنے والد کو دیکھا تو انہوں نے بستر کی چادر فوراً اتار لی۔ جب ان کے والد نے حیرانگی سے دریافت کیا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ تو انہوں نے فرمایا ”کیونکہ یہ چادر جناب رسولؐ اللہ کے استعمال میں آتی ہے تو انہوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اس چادر پر ایک مشرک بیٹھے“۔ ابوسفیان کو اپنی بیٹی کے یہ الفاظ اور رویہ پسند نہ آئے کہ وہ وہاں کچھ دیر رکا۔ لیکن پھر بھی

ابوسفیان نے اپنی بٹی سے کہا کہ وہ اس کی ملاقات رسولؐ اللہ سے کروا دے۔ اس پر اُم المومنین نے فرمایا کہ وہ انھیں مسجد میں جا کر مل سکتے ہیں۔

اس طرح ابوسفیان نے جناب رسالت مآبؐ سے مسجد میں جا کر ملاقات کی اور اپنی صفائی میں کہا کہ انہوں نے بنو بکر کی مدد نہیں کی۔ لیکن اگر آپؐ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہوا ہے تو وہ تاوان بھرنے کے لیے تیار ہیں۔ جناب رسالت مآبؐ نے اس بارے میں زیادہ گفتگو کرنا پسند نہ فرمایا اور کہا کہ اگر قریش نے ایسا نہیں کیا تو ان سے کسی تاوان کے لیے نہیں کہا جائے گا۔

اس کے بعد ابوسفیان وہاں سے واپس ہو لیا، بغیر کسی کامیابی کے سوائے اس کے کہ مسجد میں اس نے حاضرین سے کہا کہ قریش نے صلح حدیبیہ میں توسیع کر لی ہے۔

(۱۲۴) جناب رسالت مآبؐ کا مکہ پر لشکر کشی کا فیصلہ

جناب رسالت مآبؐ کی دانشمندی اور مالک کائنات کی مرضی کہ جناب رسولؐ اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ مکہ پر لشکر کشی کر دی جائے۔ کیونکہ سیاسی اعتبار سے اس سے مناسب موقع اور کوئی نہ تھا کہ جب قریش کا سربراہ خود مدینہ اس غرض سے آیا ہو کہ اس معاہدہ کی توسیع کرا لے چاہے اسے تاوان ہی کیوں نہ بھرنا پڑے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ قریش مسلمانوں کی طاقت سے اچھی طرح خائف تھے۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل درج ذیل ہے:

(الف) لشکر کشی کی وجہ:

i) قریش نے حدیبیہ امن معاہدے کی خلاف ورزی کی۔
ii) قریش نے اس وقت مسلمانوں کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔
iii) مسلمانوں نے فتح خیبر کے بعد اپنی قوت کا صحیح اندازہ لگایا۔
iv) مسلمان معاشی طور پر قریش سے بہت بہتر ہو گئے تھے۔
v) مسلمانوں کی تعداد میں خاصہ اضافہ بھی ہو گیا تھا۔
vi) جناب رسالت مآبؐ نے اپنے منصب نبوی کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ کعبہ آپؐ کی تحویل میں آ جائے تاکہ اللہ کے گھر کو بتوں سے پاک کر دیا جائے اور مکہ میں اللہ کے قوانین رائج کر دیے جائیں اور یہ کہ مسلمان اللہ کے بتائے

ہوئے طریقے کے مطابق حج اور عمرہ ادا کر سکیں اور یہ کہ مکہ مرکز اسلام بن جائے اور بت پرستی کا مکمل خاتمہ ہو جائے۔ یہی جناب رسالت مآبؐ کا مشن تھا اور جس کے لیے اور زیادہ انتظار ممکن نہ تھا۔

(ب) مشن کا خفیہ رکھنا:

اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کی پوری کوشش تھی کہ اس مشن کو مکمل طور پر خفیہ رکھا جائے اور اس کی درج ذیل وجوہات تھیں:

i) جنگ کی مصلحت، کہ دشمن کو اس کے خواب خرگوش میں ہی دھر لیا جائے اور انھیں حیرت میں ڈال دیا جائے۔
ii) دشمن کو مقابلے کی تیاری یا پیشگی حملے کا موقع نہ دیا جائے، بلکہ اسے ناگہانی دہشت میں ڈال دیا جائے۔
iii) یہ اس لیے بھی تھا کہ جناب رسولؐ اللہ کی منشا یہ تھی کہ آپؐ دونوں فریقین کو خون خرابے سے بچا لیں۔ اور اللہ کے گھر کی اور اس شہر مکہ کی حرمت برقرار رکھیں تاکہ نہ وہاں لڑائی ہو اور نہ ہی وہاں انسانوں کا خون بہے اور نہ ہی آپ اپنے رشتے داروں سے ان کے ظلم کا بدلہ لینا چاہتے تھے بلکہ وہ ان پر احسان کر کے انھیں محبت اور پیار سے اللہ کے سچے رشتے میں باندھنا چاہتے تھے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی ایمان کی حرارت پا کر دنیا اور آخرت کی عزت کے حقدار ہو جائیں اور آپؐ خود بھی اللہ کے ہاں سرخرو ہو جائیں۔
iv) مشن کو بالکل خفیہ رکھا گیا، اس لیے منزل کو خفیہ رکھنے کے لیے مختلف منزلوں کے متعلق خبر پھیلائی گئی۔
v) جناب رسولؐ اللہ نے مختلف شاہراہوں اور راستوں پر اپنے جاسوس بھیج دیے، تاکہ وہ مختلف حالات سے آگاہی حاصل کر کے اطلاع دیتے رہیں۔
vi) مدینہ کے تمام راستے بند کر دیے گئے اور ان پر پہرہ بٹھا دیا گیا، تاکہ پتا چل سکے کہ کوئی کس لیے مدینہ میں داخل ہوا ہے۔
vii) جناب رسالت مآبؐ نے یہ تمام تدابیر اختیار کرنے کے بعد اپنے مالک سے عرض کیا کہ اے اللہ ان کی سماعت اور بصارت لے لیجئے اس لیے کہ وہ ہمیں نہ دیکھ سکیں، اس وقت

تک کہ جب تک ہم اچانک ان کے سر پر نہ پہنچ جائیں۔

(ج) حاطب کی نافرمانی اور معافی:

حاطب بن ابی بلتعہ شروع کے مہاجر تھے اور بدر کے مجاہد تھے۔ ان کے بچے اور جائیداد ابھی تک مکہ میں ہی تھی۔ ان کا تعلق قریش سے نہیں تھا بلکہ یہ عثمان بن عفانؓ کے حلیف تھے۔ جب رسالت مآبؐ نے اپنی فوجی تیاری شروع کی اور دعا کی کہ "اے اللہ! ہماری یہ خبر ان سے چھپی رہے"۔ تو حاطب سمجھ گیا کہ یہ تیاری تو مکہ ہی کی طرف لگتی ہے اس پر وہ خوفزدہ ہو گئے اپنی جائیداد اور گھر والوں کی نسبت۔ اس لیے انہوں نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح قریش کو اس بات کی اطلاع ہو جائے۔ اس لیے انہوں نے ایک عورت کو معاوضہ دے کر مکہ بھیجا تا کہ وہ مکہ میں یہ خبر پہنچا دے۔

اللہ تعالیٰ جو ہر بات کی خبر رکھتا ہے اس نے اس بات کی اطلاع اپنے پیغمبر کو پہنچا دی۔ اس لیے آپؐ نے علیؓ، زبیرؓ اور مقدادؓ کو اس عورت کی طرف روانہ کیا تا کہ اس سے وہ خط برآمد کر کے لے آئیں اور اس عورت کو بھی۔ جب حاطب سے اس بات کی جواب طلبی کی گئی تو اس نے اپنا جرم تسلیم کر لیا اور کہا کہ اس نے یہ کام صرف اپنے گھر والوں کی وجہ کیا تھا کیونکہ مکہ میں ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ عمر بن خطابؓ اپنی خاص عادت کے مطابق غصہ میں آ گئے اور جناب رسالت مآبؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔

جناب رسالت مآبؐ نے اپنی شفقت اور محبت بھرے لہجے میں فرمایا، اس نے تو بدر میں حصہ لیا ہے اور میں تمہیں کیا بتاؤں اللہ سبحانہٗ بدر میں حصہ لینے والوں پر خاص نظر عنایت فرماتا ہے۔ پھر فرمایا اے صاحب بدر! جو چاہو سو کرو میں نے تمہیں معاف کیا۔

اس کے بعد رب اکریم نے سورہ ممتحنہ (۶۰) کی آیت (۱) کا نزول فرمایا جس میں کہا گیا کہ "اے ایمان والو! اپنے اور میرے دشمنوں کو دوست مت سمجھو، اور ان سے کرم فرمائی کا برتاؤ نہ کرو۔ جبکہ انہوں نے انکار کیا ہو اس کا جو سچ تمہارے پاس آیا ہے اور پیغمبر کو باہر نکال دیا ہو اور تمہیں بھی (اپنے وطن سے) کیونکہ تم اللہ پر یقین رکھتے تھے، جو تمہارا رب ہے اگر تم آئے ہو لڑائی کے واسطے میرے لیے اور میری خوشی حاصل کرنے کی خاطر (تو پھر ان کافروں کو اپنا دوست مت بناؤ) تم خفیہ طریقے سے ان سے اپنی دوستی کا اظہار کرتے ہو جبکہ میں سب کچھ جانتا

ہوں کہ تم کیا چھپاتے ہو اور کیا ظاہر کرتے ہو اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اس طرح سے تو تم سیدھے راستے سے بہت دور چلے جاتے ہو یعنی بھٹک جاتے ہو"۔

پس یہ ایک تنبیہ تھی حاطب کو اللہ کی طرف سے (اور اسی طرح کے تمام لوگوں کو) جو معاف کرنے والا مہربان ہے اور یہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک عام تنبیہ تھی کہ وہ کفار سے اپنی ہمدردیاں اور احسان نہ جتائیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف۔

(۱۲۵) مکہ پر لشکر کشی کا آغاز

(الف) قافلہ رسالت کی روانگی:

جناب رسالت مآب تسخیر مکہ کے مشن پر روانہ ہوئے، آٹھویں ہجری کے ماہ رمضان میں اور آپ نے ابو رہم کلثوم غفاری کو مدینہ کی انتظامی دیکھ بھال کے لیے مقرر فرمایا اور تمام وہ جو تندرست حالت میں تھے مہاجرین اور انصار میں سے آپؐ کے ساتھ تھے اور راستے میں ہر ایک مسلمان قبیلے کے لوگ آپؐ کے ساتھ ہو لیے۔ اس طرح سے لشکر کی کل تعداد دس ہزار ہو گئی۔ راستے میں جحفہ کے مقام پر جناب رسالت مآبؐ کے چچا عباسؓ جو اس سے قبل ہی اسلام لے آئے تھے اور اپنے گھر والوں کے ساتھ مدینہ جا رہے تھے وہ بھی آپؐ کے ساتھ مل گئے۔

(ب) جناب رسولؐ اللہ کا قبل از مکہ خیمہ زن ہونا:

شہر مکہ سے بائیس (۲۲) کلومیٹر قبل جناب رسالت مآبؐ نے اپنے لشکر کو پڑاؤ کا حکم دیا اس مقام کا نام مر الظہران تھا۔ وہاں آپؐ نے جناب عمرؓ کو کیمپ کا افسر کے طور پر متعین فرمایا اور کیمپ کی حفاظت کی ذمہ داری انکو سونپ دی۔ شام کے وقت جناب رسولؐ اللہ نے حکم صادر فرمایا کہ ہر لشکری ایک روشنی کے جلانے کا اہتمام کرے۔ اس طرح سے دشمن کو آپؐ کی طاقت کے بارے میں علم ہو جائے گا۔ چنانچہ جب رات کے اندھیرے میں اور صحرا کی ویرانی میں ان دس ہزار روشنیوں نے ایک ایسا خوفناک اور حیران کن منظر پیدا کر دیا، جو اہل مکہ کو نظر آ رہا تھا تو وہ مارے خوف کے لرزاں ہو گئے اور اس لشکر کی دہشت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ ان کے خیال و خواب میں بھی نہ تھا کہ جناب محمدؐ اس طاقت و شان و شوکت سے اس شہر میں دوبارہ قدم رنجہ

فرمائیں گے کہ ان کا دشمن ان کے سامنے نہ آنکھیں اٹھا سکے گا اور نہ ہی ٹھہر سکے گا۔

(ج) جنابِ رسالت مآبؐ کے چچا کا مکہ والوں کے لیے پریشان ہونا:

رسالت مآب کے چچا عباسؓ جو کافی جہاندیدہ تاجر اور ابوسفیان کے دوست تھے، انہوں نے جب یہ لشکر دیکھا تو فوراً اہلِ مکہ کی قسمت کے متعلق قیاس کر لیا کہ اگر مکہ والوں نے ذرہ برابر بھی جناب رسول اللہؐ کے سامنے چوں چرا کی تو ان کی تباہی ان کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ وہ اس صورتحال سے پریشان ہوئے اور چاہا کہ قریش کے کچھ سرکردہ سردار جناب رسالت مآبؐ کے پاس حاضر ہوں اور اپنی جان کی امان حاصل کر لیں۔ تاکہ مکہ خون خرابے سے بچ جائے۔ لہٰذا انہوں نے جناب رسول اللہؐ کا خچر لیا اور اس پر سوار ہو کر نکلے تاکہ ان کی ملاقات کسی سردار سے ہو جائے اور وہ ان کو صورتحال سے آگاہ کر سکیں۔ چنانچہ ان کی ملاقات ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقہ سے ہوئی، جو پہلے ہی سے مسلمانوں کی اس بے پناہ قوت کو دیکھ کر خوفزدہ ہو چکے تھے اور اپنی قسمت کے متعلق سوچ رہے تھے کہ اب کا کیا حشر ہوگا۔ بہرحال عباسؓ نے انہیں حالات سے آگاہ کیا اور ابوسفیان کو بتایا کہ اگر وہ اپنی گردن بچانا چاہتا ہے تو ان کے ساتھ چلے اور جناب رسالت مآبؐ کی اطاعت کر کے ان کا مطیع ہو جائے۔ ابوسفیان اس بات پر راضی ہو گیا اور جناب عباسؓ کے ساتھ چل دیا جبکہ دوسرے دونوں واپس چلے گئے۔ جب جناب رسالت مآبؐ کا خچر کیمپ کے دروازے کے نزدیک پہنچا تو کیمپ کے پہرے داروں نے جناب رسول اللہؐ کے خچر کو پہچان لیا اور جناب عباسؓ کو بھی پہچان لیا لیکن انہوں نے تردد کیا کہ خچر پر دوسرا کون شخص بیٹھا ہوا ہے لیکن کیمپ کمانڈر جناب عمرؓ نے ابوسفیان کو پہچان لیا، چنانچہ وہ اس کے قتل کے درپے ہو گئے کیونکہ وہ جناب رسول اللہؐ کا سب سے بڑا دشمن تھا لیکن جناب عباسؓ نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہا کہ اس کا فیصلہ جناب رسول اللہؐ پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد جناب عمرؓ نے جناب رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ ابوسفیان کو قتل کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس پر جناب رسالت مآبؐ نے اپنے چچا سے فرمایا کہ ابوسفیان کو صبح کے وقت لے کر آنا تاکہ ان کا معاملہ نمٹایا جائے۔

(د) ابوسفیان کا دائرۂ اسلام میں داخل ہونا:

اگلی صبح جب ابوسفیان کو جناب رسول اللہؐ کے سامنے لایا گیا تو آپؐ نے اس سے فرمایا

"تف ہے تجھ پر اے ابوسفیان! کیا تمہارے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ تم جان جاؤ کہ کسی کا حق نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے سوائے اللہ کے؟"۔ اس نے جواب دیا "اللہ کی قسم! اگر اللہ کے سوا کوئی اور خدا ہوتا تو وہ میری مدد ضرور کرتا"۔ پھر جناب رسول اللہؐ نے فرمایا "تف ہے تجھ پر اے ابوسفیان! کیا تمہارے لیے ابھی تک وقت نہیں آیا کہ تو جان جائے، کہ میں بیشک اللہ کا پیغمبر ہوں"۔ اس نے کہا اللہ کی قسم مجھے ابھی تک اس بات میں شک ہے"۔ پھر عباسؓ نے کہا ابوسفیان سے کہ "تف ہے تجھ پر! اسلام قبول کر لو، اس سے پہلے کہ تمہاری گردن زنی ہو جائے"۔ پھر اس کے بعد ابوسفیان نے گواہی دی اور اسلام میں داخل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس نے ایمان کی بابت اپنا سفر رفتہ رفتہ طے کیا ہوگا۔

جناب عباسؓ نے ابوسفیان کا دوست ہونے کے ناطے، جناب رسالت مآبؐ سے سفارش کی اور کہا اے اللہ کے نبیؐ! ابوسفیان ایسا شخص ہے جو اپنی بڑائی پسند کرتا ہے لہٰذا آپ اس کی ہمت افزائی کریں اور اس کی عزت افزائی کے لیے کچھ فرمائیں"۔ جناب رسالت مآبؐ نے اس دانشمندانہ تجویز کو سراہا اور پھر اعلان فرمایا کہ "جو کوئی بھی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا محفوظ رہے گا، اور جو کوئی بھی اپنے گھر کے دروازے بند رکھے گا وہ بھی محفوظ رہے گا اور جو کوئی بھی مسجد میں داخل ہو جائے گا، وہ بھی محفوظ رہے گا"۔

اس طرح سے جناب رسول اللہؐ نے ابوسفیان کی عزت افزائی فرما دی اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوا کہ جناب رسول اللہؐ نے ابوسفیان کی حیثیت، اس کی قوم میں ویسے ہی برقرار رکھی جیسا کہ پہلے تھی اور تیسرا یہ کہ جناب رسول اللہؐ نے ابوسفیان سے نہ کوئی بدلہ لیا اور نہ کوئی تاوان۔

(ہ) مکہ میں داخل ہونے سے پہلے جناب رسالت مآبؐ کی ہدایات:

مکہ میں داخل ہونے سے پہلے جناب رسول اللہؐ نے اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیں کہ وہ کسی سے بھی لڑائی نہیں کریں گے، یہاں تک کہ کوئی ان کے سامنے مقابلہ یا لڑائی کے لیے آئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جناب رسول اللہؐ نے پانچ ناموں کا اعلان فرمایا کہ وہ اس عام معافی میں شامل نہیں۔ کیونکہ ان کے جرائم پہلے ہی اتنے زیادہ تھے کہ انہیں معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جناب رسول اللہؐ نے خاص طور پر فرمایا کہ "اگر وہ لوگ غلافِ کعبہ کے ساتھ بھی لپٹے ہوئے کیوں نہ ہوں، ان کے لیے معافی نہیں ہے انہیں قتل کر دیا جائے"۔ ان اشخاص کے نام درج ذیل ہیں:

۱) عبداللہ بن سعد
۲) عکرمہ بن ابوجہل
۳) سارہ ایک آزاد کردہ کنیز
۴) قریبہ ایک مغنیہ (عبداللہ بن خطل کی کنیز)
۵) عبداللہ بن خطل
۶) حویرث بن نقیذ
۷) مقیس بن صبابہ

ان افراد میں سے پہلے چار تو قتل ہونے سے بچ گئے، ان کے معافی طلب کرنے کی وجہ سے انہیں معافی مل گئی، جبکہ باقی تین قتل کر دیے گئے۔

(و) ابوسفیان کے سامنے جناب رسالت مآبؐ کی مکہ میں فقید المثال آمد

جناب رسالت مآبؐ نے اپنا لشکر چار حصوں میں تقسیم فرمایا، جس کی قیادت (۱) زبیر بن عوامؓ (۲) ابوعبیدہ بن جراحؓ (۳) سعد بن عبیدہؓ (۴) خالد بن ولید کر رہے تھے۔ ہر ایک کمانڈر کو ہدایت تھی کہ وہ علیحدہ علیحدہ راستوں سے مکہ میں داخل ہوں۔ یعنی شمال، جنوب، مشرق و مغرب کی طرف سے، تاکہ پورے شہر میں جس طرف بھی مکہ کے رہنے والے موجود ہوں وہ دیکھ لیں کہ مسلمان کس طرح سے داخل ہو رہے ہیں۔ اور اہل مکہ کو اس طرح سے ہر طرف مسلمان ہی مسلمان نظر آئیں اور ان کے دلوں پر ان کی ہیبت اور زیادہ طاری ہو جائے۔ یعنی ان لوگوں کی دہشت جن کو اہل مکہ نے بے کس و بے بس کر کے ان کے گھر اور گھر کا ساز و سامان اور کاروبار اپنے قبضے میں لے کر بے یار و مددگار اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور آج وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنی آن بان کے ساتھ واپس اپنے شہر میں داخل ہو رہے ہیں اور انہیں روکنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔

جناب رسالت مآبؐ نے اپنے چچا عباسؓ سے کہا کہ وہ ابوسفیان کو مکہ آنے والی ایک بہت چھوٹی گھاٹی کے کنارے لے جا کر کھڑے ہو جائیں تاکہ قریش کا سردار، جناب رسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں کی جان کا دشمن وہاں کھڑا ہو کر نظارہ کر سکے کہ مسلمان کی کیا شان ہے اور وہ اپنے قائد کی قیادت میں کس پر شکوہ انداز میں داخل ہو رہے ہیں۔

جناب رسالت مآبؐ اور آپؐ کے لشکری بہت صبر و تحمل اور پر وقار طریقے سے مکہ میں داخل ہوئے اور خون کا ایک قطرہ بہے بغیر مکہ کے دروازے آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے کھول دیے گئے اور دشمن کے ہر فرد کو معاف کر دیا گیا۔ سوائے ان کے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ جب ابوسفیان نے اس طاقت کا مظاہرہ دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ جناب رسول اللہ کے ساتھی کس ادب اور احترام سے آپؐ کے آگے پیچھے اپنی جان نثاری کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں تو ابوسفیان نے اپنے دوست عباسؓ سے کہا "اے ابوالفضل! اللہ کی قسم اس فوج کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی طاقت کسی میں نہیں ہے"۔ اس نے مزید کہا "تمہارے بھتیجے کی بادشاہت اور سلطنت جلد ہی بے مثال ہو جائے گی"۔ جناب عباسؓ نے جواب دیا "یہ بادشاہت نہیں بلکہ یہ نبوت ہے"۔ ابوسفیان نے جواب دیا "یہ تو پھر اور بھی اچھا ہے"۔

اس کے بعد جناب عباسؓ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ جلدی کرے اور اپنی قوم کے پاس جائے اور انہیں نصیحت کرے کہ وہ اپنی جانیں بچائیں اور جناب رسول اللہ کی فوج کا ہرگز سامنا نہ کریں۔ پس ابوسفیان جلدی سے گیا اور اونچی آواز میں اپنی قوم کو پکارا! "اے قوم قریش! یہ محمدؐ ہیں تمہارے سروں کے اوپر ایک بہت بڑی طاقت کی صورت میں، جس کا سامنا تم میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے جو کوئی بھی میرے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ محفوظ رہے گا"۔

اس کی یہ بات سننے کے بعد اس کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے غضبناک انداز میں ابوسفیان کی مونچھوں کو پکڑ کر لوگوں سے کہا اس موٹے کو قتل کر دو، اس نے ہماری قوم کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ پھر لوگوں نے اپنے سردار پر ملامت کرنا شروع کر دی اور کہا کہ تیرے گھر میں کتنے شخص پناہ لے سکیں گے؟ پھر ابوسفیان نے کہا اور وہ جو کعبہ کی مسجد میں پناہ لے لیں گے اور وہ جو اپنے گھروں میں جا کر اپنے دروازے بند کر لیں گے۔ اس کے بعد لوگوں نے اسی طرح کیا اور اپنی جانوں کو محفوظ کر لیا۔

(ز) جناب رسالت مآبؐ کا نہایت عاجزی سے مکہ میں داخلہ:

رسالت مآبؐ آٹھویں ہجری کے ماہ رمضان المبارک کی تیرھویں تاریخ کو یعنی چار جنوری ۶۳۹ء کو مکہ میں داخل ہوئے اور وہاں آپؐ کا قیام انیس (۱۹) روز رہا اور آپ یہاں صلوٰۃ کسر کرتے رہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ اپنی اونٹنی قصوہ پر سوار تھے اور آپؐ کے پیارے زیدؓ کے بیٹے اسامہ جن سے آپ کو اور بھی زیادہ پیار تھا وہ بھی آپؐ کے ساتھ سوار تھے۔ آپؐ سورۃ فتح (۴۸) کی تلاوت فرما رہے تھے اور آپ کا سر مبارک اپنے رب کے حضور ادب و احترام، شکر اور عاجزی کے اظہار کے طور پر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اونٹنی کی گردن کے ساتھ لگ گیا تھا۔ اس حالت عجز و انکسار میں آپؐ مکہ میں داخل ہوئے۔ کیا تاریخ کوئی ایسی مثال کسی فاتح کی پیش کر سکتی ہے؟ یہ صرف اللہ کا غلام ہی کر سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی تکبر کے لائق ہے اور اس کے غلام کی عظمت صرف اپنے مالک کی بندگی میں ہی ہوتی ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کی عاجزی اور انکساری کو ہی پسند فرماتا ہے اور اپنی مخلوق کے تکبر اور غرور کو ناپسند فرماتا ہے۔

چنانچہ اس عجز و انکسار کی کیفیت میں جناب رسالت مآبؐ کعبۃ اللہ پہنچے اور وہاں اللہ کے گھر کا طواف کیا۔ اس وقت کعبہ کے اندر اور باہر تین صد اور ساٹھ (۳۶۰) اصنام موجود تھے۔ جناب رسولؐ اللہ کے لیے ضروری تھا کہ آپؐ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے اللہ کے گھر کو اصنام سے پاک کر دیں اور لوگوں کو بتا دیں کہ حکومت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور صرف وہی مالک واحد ہے، اس کائنات کا اور جو کچھ اس کے اندر اور اس کے علاوہ موجود ہے وہ سب اللہ ہی کے پیدا کردہ ہیں اور وہی ان سب کا مالک ہے اور وہ سب کے سب اللہ ہی کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور صرف اسی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

لہٰذا آپؐ نے ان اصنام کی سرزنش شروع کر دی۔ آپ اپنی چھڑی باری باری ایک ایک بت پر مارتے جاتے اور ساتھ ہی سورۃ اسراء (۱۷) کی آیت (۸۱) کی تلاوت فرما رہے تھے، جس میں کہا گیا ہے کہ "اور کہو (اے پیغمبر) حق آیا اور باطل چلا گیا۔ یقیناً باطل کو تو ختم ہونا ہی ہے"۔

لہٰذا آپؐ کی چھڑی کی ایک ضرب سے ایک ایک بت اپنے منہ کے بل گر پڑتا۔ جب کعبہ کے باہر والے بت زمین بوس ہو گئے تو آپؐ کعبہ کے اندر تشریف لے آئے۔ جہاں پر آپؐ کو بتوں کے علاوہ فرشتوں اور جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اشکال بنائی ہوئی نظر آئیں جو دیواروں پر لکیری گئی تھیں۔ آپؐ نے ان سب سے بھی کعبہ کو پاک کیا۔ جب آپؐ یہ کام کر رہے تھے تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے جا رہے تھے، جب کعبہ بتوں سے پاک ہو گیا تو آپؐ نے کعبۃ اللہ میں صلوٰۃ ادا کی۔

جب آپؐ نے اپنے جد امجد ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی تصاویر کی نقل دیکھی کہ ان کے ہاتھوں میں قرعہ اندازی والے تیر ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ ان سے نپٹے، انہوں نے (بت پرستوں نے) جان بوجھ کر یہ نقش بنائے۔ حالانکہ یہ لوگ جانتے تھے کہ جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے کبھی بھی قرعہ اندازی کے تیر استعمال نہیں کیے تھے"۔ اور پھر آپؐ نے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۶۷) کی تلاوت فرمائی۔ جس میں کہا گیا ہے کہ "ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی۔ بلکہ وہ ایک سچے مسلمان تھے (یعنی اللہ کے حکم کے سامنے اپنا سر جھکانے والے) حنیف، اور ان میں سے نہیں تھے جنہوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے"۔

(ح) کعبۃ اللہ کی نظامت:

جب رسالت مآبؐ کعبہ پہنچے تو آپؐ نے عثمان بن طلحہ سے کعبہ کی چابیاں طلب فرمائیں جو کعبہ کا ناظم یا متولی تھا۔ عثمان کا خاندان عرصہ دراز سے کعبہ کی نظامت سنبھالے ہوئے تھا۔ اس وقت جب آپؐ نے عثمان سے کلید کعبہ حاصل کر لی تو اہل قریش میں سے خاندان ہاشم کے بہت سے معززین اس بات کے خواہاں تھے کہ وہ کلید بردار کعبہ بن جائیں تا کہ ان کی عزت و وقعت میں اضافہ ہو جائے۔

لیکن جب رسالت مآبؐ کعبہ سے باہر تشریف لائے تو آپؐ نے عثمان سے فرمایا کہ اب وہ اس بات پر قادر ہیں کہ کلید کعبہ جسے چاہیں اس کے حوالے کر دیں۔ عثمان نے اس پر نہایت دل برداشتہ ہو کر کہا کہ "بے شک انہوں نے یعنی اہل قریش نے آپؐ کو بہت ستایا ہے اور بہت تکلیفیں پہنچائی ہیں اور اس لیے وہ آج بیمار ہو گئے ہیں"۔ لیکن رحمت دو عالم سرور عالم نے فرمایا "نہیں بلکہ قریش تو خوشحال اور طاقتور ہو گئے ہیں"۔ پھر آپؐ نے عثمان کو کلید کعبہ دیتے ہوئے فرمایا "اپنی چابی لو، اے عثمان! کیونکہ آج تو رحمت کا دن ہے اور تقویٰ کا، وفاداری اور تابعداری کا۔ اسے ہمیشہ کے لیے لے لو (اب یہ تم سے کوئی نہیں لے سکتا"۔ یعنی تمہارے خاندان سے اور تمہاری اولاد سے) سوائے کسی بدکار اور نا انصاف کے"۔

اس کے علاوہ آپؐ نے حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری جناب عباسؓ اور ان کی اولاد کے ذمہ حسب سابق رہنے دی۔

(ط) کعبۃ اللہ میں اذان بلالی:

دین ابراہیمی کے پیروکاروں کے صدیوں بعد اور جناب رسالت مآبؐ کی بیس سالہ

جد وجہد کے بعد اللہ کے اس پہلے گھر میں ایک آواز گونجی جس نے مکہ کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا اور انہیں دہلا دیا۔ جناب رسالت مآبؐ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ صلوٰۃ کے لیے لوگوں کو پکاریں۔ تو بلالؓ فوراً کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھ گئے اور تمام لوگوں کو آواز لگائی، کہ وہ آئیں اور اپنے مالک کے سامنے حاضر ہو جائیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں اور بس یہی ان کی فلاح کا راستہ ہے۔

بلالؓ کی اذان نے مکہ والوں کو حیرت میں ڈال دیا اور وہ مذبذب میں پڑ گئے اور کچھ اذان کے الفاظ سن کر خوفزدہ ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بلال ایک سیاہ فام حبشی نسل کا غلام اور غلام زادہ کس طرح سے اونچی آواز میں سب کو بلا رہا ہے جب کہ آٹھ برس پہلے وہ کسی کے ساتھ اونچی آواز میں بول بھی نہیں سکتا تھا، آج وہ اللہ کی بڑائی بیان کر رہا ہے اور محمدؐ کی رسالت کا اعلان کر رہا ہے اور وہ پکار رہا ہے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے اور صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ یہ وہی اعلان تھا جس کی وجہ سے قریش جناب رسولؐ اللہ کے دشمن بنے تھے اور ان کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ لیکن آج وہ دیکھ رہے تھے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذکر کو بلند کر دیا اور اللہ کے ساتھ اللہ کے رسولؐ کا نام پکارا جا رہا ہے۔ اس دن کے بعد سے یہ ذکر پھیلتا چلا گیا اور آج دنیا کے کونے کونے میں یہ نام اور پیغام ایک دن میں پانچ مرتبہ پکارا جا رہا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے نام کو بلند کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشرح (۹۴) کی آیت (۴) میں فرمایا کہ ''اور کیا ہم (اللہ) نے تمہارے ذکر کو بلند نہیں کیا؟''

اور جب اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام ایک ساتھ گونجتے ہیں تو واقعی لوگوں کے دل یا تو لرز جاتے ہیں یا ان کے ایمان تازہ ہو جاتے ہیں اور اسی لیے شیخ اقبالؒ نے بال جبریل میں فرمایا:

ناگاہ فضا بانگ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کہسار

(ی) رسالت مآبؐ کا قوم سے خطاب:

جب جناب رسولؐ اللہ کعبہ سے باہر تشریف لائے تو آپؐ کعبے کے دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو گئے اور ایک نظر وہاں کھڑے ہوئے مجمع پر دوڑائی اور پھر ان سے خطاب فرمایا اور کہا ''کوئی اللہ نہیں ہے سوائے ایک اللہ کے، جس کا کوئی شراکت دار نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا

کر دکھایا، جو اس نے اپنے غلام سے کیا تھا اور اس کی مدد فرمائی اور ان تمام کو شکست عطا فرمائی جنہوں نے اس کے خلاف سازشیں کیں۔ یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو کہ اب ہر طرح کے استحقاق اور مراعات کا دعوے دار خواہ وہ دعویٰ کسی خونی رشتے کی وجہ سے یا کسی امارت و جائیداد کی وجہ سے، وہ اب میرے پاؤں کے نیچے ہے سوائے اس بات کے کہ وہ شخص کعبہ کے متولی یا ناظم یا کلید بردار ہونے کا حق رکھتا ہو یا وہ حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری کا حق جتاتا ہو (یعنی ذات پات، رنگ نسل، برادری، قوم، زمینداری یا جاگیرداری یا کسی جاہ و منصب کی وجہ سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے)۔

یہ بات بھی اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو کہ ''اگر کوئی بھی قتل کر دیا گیا ہو، چاہے اس کا قتل غیر ارادی طور پر ہی کیوں نہ ہو، چاہے وہ قتل کسی کوڑے کے ذریعے یا کسی ڈنڈے کے ذریعے ہی ہو گیا ہو۔ اس پر قصاص بہت زیادہ ہو گا یعنی ایک صد اونٹ جن میں چالیس حاملہ ہوں گے''۔

اے قریش کے لوگو! یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم سے وہ فخر چھین لیا ہے، جو تم قبل از اسلام کرتے تھے وہ تمام القابات جو تمہارے اجداد استعمال کر کے فخر اور تکبر کرتے تھے وہ ختم کر دیے گئے ہیں، کیونکہ تمام لوگ آدم کی اولاد میں سے ہیں اور آدم کی تخلیق کیچڑ سے ہوئی تھی''۔

جناب رسولؐ اللہ نے اس خطاب کے بعد سورہ الحجرات (۴۹) کی آیت (۱۳) کی تلاوت فرمائی۔ جس میں کہا گیا ہے کہ ''اے انسانو! ہم نے پیدا کیا تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے اور تمہیں بنایا یعنی تقسیم کیا قبیلوں اور قوموں میں، تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان رکھ سکو۔ بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جس میں تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر ایک خبر رکھنے والا ہے''۔ (افسوس صد افسوس کہ مسلمانوں کی اکثریت حسب و نسب کو جتا کر خود کو اعلیٰ ترین قرار دیتی ہے)۔

جناب رسولؐ اللہ نے مزید فرمایا ''اے قریش کے لوگو! تم کیا خیال کرتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟'' انہوں نے جواب دیا ''اے ہمارے معزز بھائی اور ایک معزز بھائی کے بیٹے! ہم آپ سے کچھ خیال نہیں کرتے سوائے اچھائی کے''۔ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا ''میں تم سے انہی الفاظ میں بات کروں گا، جیسے یوسفؑ نے کی تھی اپنے بھائیوں سے''۔ اور فرمایا ''تم پر کوئی الزام نہیں یا تمہارے لیے کوئی ذلت نہیں آج کے دن، جاؤ

اپنی مرضی کے ساتھ جیسے چاہو رہو، تم اب آزاد ہو"۔ (یہ الفاظ یوسفؑ کے حوالے سے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے سورۃ یوسف (۲) کی آیت (۹۲) میں بیان فرمائے ہیں)۔

(ک) جناب رسالت مآبؐ کا دوسرا خطبہ اہل مکہ سے:

امام بخاریؒ نے امر بن سلمہ کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ "عرب (قریش کے علاوہ) قبائل نے اسلام قبول کرنے کو موخر کر دیا تھا اس وقت تک کے لیے کہ جب تک مکہ فتح نہ ہو جائے۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ اسے چھوڑ دو (پیغمبرؐ کو) اور اس کے لوگوں کو بھی (قریش کو) تنہا، اگر یہ ان پر فاتح ہو جاتا ہے تو پھر یہ ایک (سچا) پیغمبر ہے"۔ اس لیے جب مکہ رسولؐ اللہ کے قبضے میں آ گیا تو پھر ہر ایک قبیلے نے اسلام لانے میں جلدی کی اور میرے والد نے اسلام لانے کی جلدی کی اپنے قبیلے میں"۔

بس تو پھر مرد اور عورتیں، بوڑھے اور جوان سب جناب رسولؐ اللہ کے پاس پہنچے اور اسلام قبول کیا۔ پھر آپؐ صفا کی پہاڑی پر بیٹھ گئے اور ان سب لوگوں سے اسلام کے لیے بیعت لینا شروع کر دی اور اس پر بھی بیعت لی کہ وہ اپنی پوری استطاعت کے مطابق اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی پیروی کریں گے۔

فتح مکہ کے بعد لوگوں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا، کہ وہ خود اپنی قسمت کا فیصلہ کریں اور کسی کو بھی اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہوں نے اس وقت اپنی مرضی سے ہی اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد پھر قبائل جوق در جوق اسلام قبول کرنے کی خاطر آئے اور یہ سب کچھ عین اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق تھا، جو اللہ نے سورہ نصر (۱۱۰) کی آیت (۱) اور (۲) میں فرمایا تھا یعنی کہ "جب اللہ کی مدد آئے گی اور فتح اور پھر تم دیکھو گے کہ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوں گے"۔

امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ جابر بن عبداللہ کے پڑوسی نے کہا کہ "میں ایک سفر سے واپس آیا تو جابر آیا اور مجھے سلام کیا۔ اس کے بعد اس سے گفتگو کرنے لگا کہ لوگوں نے کیا کرنا شروع کر دیا ہے کہ ان میں تفرقہ پڑ گیا ہے۔ اس پر جابر رونے لگا اور کہا کہ میں نے رسولؐ اللہ سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا بے شک لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوں گے اور اسی طرح سے جوق در جوق اسے چھوڑ دیں گے"۔ (یعنی دین پر عمل نہ کرنا گویا دین کو چھوڑنا ہی تو ہے)

حالانکہ اس حدیث کا تعلق براہ راست اس مضمون کی مناسبت سے تو نہیں ہے لیکن یہ مناسب اس لیے سمجھا گیا کہ جناب رسولؐ اللہ کا یہ فرمان بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ لوگ آخر کیونکر دین کو چھوڑ دیں گے اور ایسا واقعی ہوا بھی۔ دین کا چھوڑنا یہ نہیں ہے کہ لوگ مسلمان سے عیسائی، یہودی یا کوئی اور مذہب اپنا لیں گے بلکہ مسلمان صرف نام کے مسلمان رہ جائیں گے اور عملی طور پر وہ مسلمان نہ رہیں گے اور بعض اوقات تو وہ نام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ مسلمانوں کا جوق در جوق مذہب اسلام کو چھوڑنے کی سب سے بڑی مثال ملک اسپین کی ہے جب مسلمانوں نے وہاں اپنے دین سے منہ موڑ لیا تو وہاں ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد عیسائیوں نے اپنی حکومت قائم کر لی اور وہاں مسلمانوں کا نام و نشان تک نہ رہا، کچھ قتل کر دیے گئے کچھ نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور کچھ وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ اسی طرح سے جب روس میں دہریوں کا انقلاب آیا تو یورپ کے تقریباً پانچ مسلم ممالک پر روس کا قبضہ ہو گیا اس کے علاوہ کچھ وسطی ایشیا کی ملکتیں جو مسلمانوں کی ریاستیں تھیں انہیں بھی اسلام چھوڑنا پڑا اور آج جب کہ روس کی دہریہ تحریک اپنی موت آپ مر چکی ہے تو وہ مسلمان ریاستیں دوبارہ اپنے نام کے ساتھ لفظ مسلمان کا استعمال تو کر رہے ہیں، لیکن ہنوز انہیں تجدید ایمان کی ضرورت ہے۔

آج مسلمان ممالک میں جھوٹ بولا جاتا ہے، کھانے پینے کی اشیاء میں حتیٰ کہ ادویات میں ملاوٹ ہو رہی ہے۔ لین دین میں اور ناپ تول میں بے ایمانی ہو رہی ہے، سرکاری کارندے حتیٰ کہ عدالتیں رشوت کے لین دین سے خالی نہیں رہیں۔ ایک دوسرے کا مال ہڑپ کیا جا رہا ہے، بے گناہ قتل کیے جا رہے ہیں، حرام کام ہو رہے ہیں، حرام کھلے عام کھایا جاتا ہے رشوت کا بازار گرم، نشے کی بھر مار اور اس کا کاروبار کرنے والے معززین کہلاتے ہیں۔ زنا، چوری، جوا عام ہے، بے حیائی پھیل رہی ہے۔ قرآن کی آیات اور رسولؐ اللہ کے فرمودات کی کھلی خلاف ورزی ہو رہی ہے اور سب سے زیادہ شرمناک بات یہ کہ ان سب جرائم کی پشت پناہی حکمرانوں کے ایماء پر ہوتی ہے۔ آپ خود فیصلہ کریں، کیا یہ لوگ مسلمان ہیں؟ نہیں بلکہ یہ جوق در جوق اسلام سے خارج ہو چکے ہیں۔ صرف انہوں نے اپنا نام نہیں بدلا۔ اب بھی وقت ہے کہ یہ لوگ دین میں واپس آ جائیں اور مسلمان ہو جائیں اور اس کا صرف ایک ہی آسان حل ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری اور تابعداری اختیار کر لیں۔

ہر کوئی مست مے ذوقِ تن آسانی ہے
حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(علامہ اقبال)

(ل) نہ ہجرت، نہ فتح سے قبل کے مسلمانوں سے برابری:

امام بخاریؒ نے مجاشع بن مسعود کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ وہ ابومعبد کو لے کر جناب رسول اللہؐ کے پاس گیا۔ فتح مکہ کے بعد، اور عرض کیا کہ "اے اللہ کے نبیؐ! میں آپؐ کے پاس حاضر ہوا ہوں اپنے بھائی کے ساتھ، اس لیے کہ آپؐ اس سے بیعت لیں ہجرت کے لیے"۔ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا "ہجرت کرنے والوں نے ہجرت کی مراعات حاصل کر لیں (فتح مکہ سے پہلے)"۔ پھر اس نے جناب رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ "آپؐ کس بات کی وفاداری کے لیے اس سے بیعت لیں گے؟"۔ آپؐ نے فرمایا "میں اس سے بیعت لوں گا اسلام سے وفاداری کے لیے، ایمان اور جہاد کے لیے"۔

لہٰذا یہ بات واضح ہو گئی کہ فتح مکہ کے بعد مکہ چھوڑنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ کیونکہ وہاں اسلام کا دور دورہ ہو چکا تھا۔ ہجرت صرف اسی وقت ہوتی ہے جب اسلام کسی جگہ رائج نہ ہو سکے اور ہجرت میں مہاجر کو اپنی جائیداد، گھر اور وطن، اپنے دین اور ایمان کی خاطر چھوڑنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہاں وہ دین اسلام کے مطابق آزادانہ عمل نہیں کر سکتا اور وہاں وہ اسلامی معاشرتی نظام کا فقدان پاتا ہے ایسے شخص کے لیے اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اعلیٰ درجے کا انعام و اکرام آخرت میں رکھا ہے۔

اس سلسلے میں سورۃ الحدید (۵۷) کی آیت (۱۰) میں فرمایا گیا ہے کہ "اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہے کہ تم اس کی (اللہ) راہ میں خرچ نہیں کرتے؟ اور اللہ ہی کی ہے تمام ملکیت آسمانوں اور زمین کی۔ تم میں سے وہ برابر نہیں ہیں جو خرچ کرتے تھے اور لڑتے تھے فتح سے پہلے (فتح مکہ سے پہلے)۔ ایسے لوگ اونچے درجوں پر ہیں ان لوگوں سے جنھوں نے خرچ کیا اور لڑے

اس کے بعد لیکن سب کے لیے اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے بہترین انعام کا۔ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے جو تم کرتے ہو"۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے زیادہ پسند فرمایا اور شاباش دی ان لوگوں کو جنھوں نے ہمت اور کوشش کی جناب رسول اللہؐ کی تابعداری کرنے کی شروع کے مشکل ترین دور میں۔ اس لیے انھیں سبقت لے جانے والوں میں سے سبقت لے جانے والوں کا مرتبہ عطا کیا گیا۔ یعنی جیسا کہ سورۃ واقعہ (۵۶) کی آیت (۱۰) میں ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ نے ان کے بعد والے لوگوں کو ان کے برابر درجہ عطا نہیں فرمایا۔ کیوں کہ اللہ قدردان ہے اس لیے اللہ نے ان لوگوں کی زیادہ قدردانی اور عزت افزائی فرمائی، جنھوں نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زیادہ تکلیفیں اٹھائیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نیتوں کو، محبت کو، جذبے کو، جد و جہد کو، قربانی کو، مشکلات اور تکلیفوں کو دیکھتا ہے اور اس کے مطابق اپنے بندے کی قدردانی فرماتا ہے۔

اس سلسلے میں سورۃ النساء کی آیت (۹۵) میں فرمایا گیا ہے کہ "وہ برابر نہیں ہیں، ان ایمان والوں کے جو (گھر میں) بیٹھ جاتے ہیں علاوہ ان کے جو محتاج ہوتے ہیں اور وہ جو انتھک محنت کرتے ہیں اور لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، اپنے مال سے اور اپنی جان سے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مراتب بڑھائے ہیں جنھوں نے بہت زیادہ جد و جہد کی اور لڑے اپنی دولت اور اپنی زندگیوں یعنی جان کی قربانی کے ساتھ، ان لوگوں کی نسبت جو اپنے گھروں پر بیٹھے رہے"۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے اچھا وعدہ فرمایا، لیکن ترجیح دی ان کو جو بہت مشکل اٹھاتے ہوئے لڑے ان کے مقابلے میں جو بیٹھے رہے (گھر میں) اور بڑے انعام کا وعدہ فرمایا"۔

بے شک اللہ ہر بات کو جانتا ہے اور وہ انصاف کرنے والا قدردان ہے۔ اس سلسلے میں امام مسلم نے جناب رسالت مآبؐ کی ایک حدیث قلمبند کی ہے کہ "ایک مستحکم ایمان والا زیادہ بہتر ہے اور اللہ کا محبوب ہے بہ نسبت ایک کمزور ایمان والے کے لیکن دونوں میں اچھائی ہے"۔

لہٰذا یہ ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے غلاموں کو انعام و اکرام عطا فرماتا ہے اپنے غلام کی نیت، اخلاص، محبت، لگن، اور قربانی کے مطابق جو وہ اللہ کی خاطر انجام دیتا ہے۔ اسی سلسلے میں امام نسائی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

"(ایسا بھی ہوتا ہے) ایک درہم کا خرچ کرنا سبقت لے جاتا ہے ایک لاکھ درہم پر خرچ کرنے والے کی نیت، اخلاص، محبت، ناہمواری کی وجہ سے"۔ اس کی مثال یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ ایک شخص کی کل ملکیت ایک درہم ہے اور وہ اس نے اللہ کی راہ میں بہت محبت اور ناہمواری سے خرچ کر دیا اور اس کے مقابلے میں ایک شخص جس کے پاس کروڑوں کا بنک بیلنس ہے اس نے ایک لاکھ اللہ کی راہ میں بہت محبت سے خرچ کیا، تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کے خرچ کو پسند فرمائے گا۔ دونوں کو انعام و اکرام سے نوازے گا لیکن سبقت میں ہوسکتا ہے کہ ایک درہم والا زیادہ انعام پا جائے، کیونکہ اس نے سب خرچ کر دیا جو اس کے پاس تھا۔

(م) جناب رسول اللہ کا خالد بن ولید کے عمل سے اظہار بیزاری:

جناب رسالت مآبؐ نے خالد بن ولید کو تین صد پچاس (۳۵۰) کی نفری کے ساتھ قبیلہ بنو جذیمہ کی طرف بھیجا، تا کہ وہ انہیں دعوت اسلام دیں۔ جب ان لوگوں نے خالد کو اس کے سپاہ کے ساتھ دیکھا تو انہوں نے خوفزدہ ہو کر ہتھیار اٹھا لیے۔ خالد نے انہیں ہتھیار ڈالنے کے لیے کہا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ قریش اور دیگر قبائل نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

لیکن قبیلہ کے لوگوں میں سے ایک شخص جحدر نے اپنے قبیلہ کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تو خالد ان کی گردنیں اڑا دے گا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح خالد نے ان سے ہتھیار ڈلوا لیے۔ اور ان کے ہاتھ بندھوا دیے۔ اور پھر اسلام کی دعوت دی۔ خالد نے جب ان لوگوں سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ پایا تو اس نے ان لوگوں کا قتال شروع کروا دیا۔ خالد کا یہ عمل اس کے ساتھیوں میں سے چند معتبر اور چیدہ چیدہ اصحاب رسول اللہ نے ناپسند فرمایا، ان حضرات میں عبدالرحمٰن بن عوف اور عبداللہ بن عمر جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔ جبکہ باقی ماندہ لوگوں نے خالد کا حکم مان لیا۔

واپسی پر جب رسول اللہ کو اس معاملے کا علم ہوا تو آپ ناراض ہوئے اور خالد کے اس فعل سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔ یہ سارا قصہ تفصیل کے ساتھ امام بخاری نے قلمبند کیا ہے، اس کے مطابق جب خالد اپنے ساتھیوں کے ساتھ جناب رسول اللہؐ کے پاس واپس پہنچا اور جناب رسول اللہ کو پورے قصے کا علم ہوا تو جناب رسول اللہؐ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند فرمائے اور دو مرتبہ عرض کیا "اے اللہ! میں اس سے بیزار ہوں جو خالد نے کیا ہے"۔

اس موقع پر خالد اور عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی۔ اور عبدالرحمٰن بن عوف نے خدشہ ظاہر کیا کہ خالد نے اپنے چچا کے قتل کا بدلہ اس طرح سے لیا ہے۔ کیونکہ قبیلہ جذیمہ کے لوگوں نے زمانہ جاہلیت میں خالد کے چچا کو قتل کیا تھا۔

امام مسلم نے بھی اس واقعہ کو قلمبند کیا ہے اور لکھا ہے کہ خالد نے عبدالرحمٰن بن عوف کے ساتھ بدتمیزی کی اور ان کے لیے برے الفاظ استعمال کیے۔ اس پر جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ "میرے اصحاب میں سے کسی ایک کو بھی برا بھلا نہ کہو، کیوں کہ اگر تم میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر بھی خیرات کر دے تو اس کے برابر نہیں ہوسکتا، اگر ان اصحاب میں سے کوئی 'مد' یعنی دو ہاتھ بھر بھی خیرات کر دے بلکہ اس سے آدھے کے برابر بھی نہیں"۔

اس کے بعد جناب رسول اللہؐ نے جناب علیؑ کو بنو جذیمہ کے پاس بھیجا تا کہ وہ انہیں ان کے مقتولوں کا قصاص دے کر آئیں۔ چنانچہ جناب علیؑ وہاں گئے اور ہر مقتول کے وارث کو اس کا قصاص ادا کیا۔

کچھ تاریخ دانوں نے خالد کے اس عمل کو صحیح قرار دینے کی کوشش کی ہے اور کہا کہ خالد کا عمل اجتہادی تھا۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے نہ صرف خالد کے عمل سے بیزاری کا اظہار فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضورؐ اپنی صفائی بھی پیش کی اور عرض کیا کہ وہ اس کام میں شامل نہیں ہیں۔

اس واقعہ سے ایک اور نقطہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جناب رسول اللہؐ کے اصحاب میں کون لوگ شامل ہیں۔ اس واقعہ سے اور دیگر کئی اور واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصحاب رسول اللہ کے مراتب ایک دوسرے سے کم زیادہ ہوتے ہیں اور اس کا معیار ان کے ذاتی اعمال، محبت، کوشش اور قربانی پر منحصر ہوتا ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر کتنی تکلیفیں اٹھائیں اور ان کا حکم مانا۔

اس بارے میں سورۃ الحدید (۵۷) کی آیت (۱۰) میں واضح بیان کیا گیا ہے کہ:

"تم میں سے وہ برابر نہیں ہیں۔ جنہوں نے خرچ کیا اور لڑے فتح سے پہلے۔ وہ درجے میں اونچے ہیں ان لوگوں سے جنہوں نے خرچ کیا اور لڑے اس کے بعد"۔

اس آیت کریمہ میں لفظ 'فتح' کو عام طور پر 'فتح مکہ' سے ہی موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں

علماء کا اختلاف ہے اور چند علماء کہتے ہیں کہ "فتح" سے مراد "صلح حدیبیہ" ہے۔ جس کے بعد سورۂ فتح (۴۸) کا نزول ہوا تھا۔ جس کی پہلی آیت میں ہی بیان کیا گیا ہے کہ:

"ہم (اللہ) نے تمہیں (اے محمدؐ) دی ایک واضح فتح"۔

حالانکہ فتح مکہ ایک فتح تو تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو ہی فتح قرار دے دیا۔

کیونکہ فتح کے آثار حدیبیہ کے بعد ہی پیدا ہوئے اور حدیبیہ ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ جناب رسول اللہؐ نے خالد سے فرمایا کہ "میرے اصحاب کو برا بھلا نہ کہو"۔

چنانچہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ حضرات جو جناب رسول اللہؐ کے ساتھیوں میں شمار ہوئے صلح حدیبیہ سے پہلے، انہیں ہی یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ سبقت لے جانے والوں میں سے سبقت لے گئے۔ اس لیے وہ لوگ جو اس کے بعد دائرہ اسلام میں آئے اور جناب رسول اللہؐ کے ساتھی بنے وہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے درجے میں پہلے والوں سے کم ہیں۔ بیشک یہ اعزاز پہلے والوں کو ان کی محبت اور جد و جہد کے سلسلے میں ملا تھا۔ اور یہ بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ خالد صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لایا۔

اس سلسلے میں جناب رسالت مآبؐ کی ایک حدیث بدر کے اصحاب کے متعلق بھی بہت اہم ہے۔ بخاری نے رفع کی روایت بیان کی ہے جو بدری تھے، کہ جناب جبرائیل، جناب رسول اللہؐ کے پاس تشریف لائے اور کہا "کہ آپؐ بدر کے جنگجوؤں کو کیسا پاتے ہیں؟" جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ: "بہترین مسلمان"۔ اس پر جناب جبرائیل نے فرمایا کہ "اور اسی طرح سے وہ فرشتے بھی ہیں جنہوں نے بدر میں حصہ لیا"۔

(ن) جناب رسولؐ اللہ کا بتوں کو تباہ کرنا:

اسلام کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ تو کسی کے سامنے سجدہ ریز ہوا اور نہ ہی کسی سے اپنی حاجت روائی کرنا اور نہ ہی کسی کو اللہ تعالیٰ کے کسی بھی معاملے میں شراکت دار سمجھنا ہے۔ لیکن بت پرستی اس نظریے کے برعکس ایک پرانا عقیدہ ہے جو اسی نظریے کی نفی کر کے اس کے بالمقابل آ کھڑا ہوا ہے۔ آج تک ہر پیغمبرؐ نے یہی بنیادی کام سب سے پہلے کیا اور انبیاء کی مخالفت ہمیشہ بت پرست گمراہوں نے ہی کی۔ انبیاء کی تاریخ کی روشنی میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام سے لے کر محمد علیہ السلام تک تمام پیغمبروں سے بت پرستوں کی دشمنی اور جنگ رہی۔

بت دراصل فرشتوں، انبیاء اور اولیاء کے تصور میں ان کی اشکال کی صورت میں بنائے گئے تھے اور لوگوں نے انبیاء اور اولیاء کی قبروں کو اپنی عبادت کی جگہ بنا لیا اور پھر وہاں عقیدت کے طور پر وہ جھکنے لگے اور اپنی حاجت روائی کرنے لگے لیکن ان کے ساتھ ہی وہ اللہ کو بھی مانتے تھے۔ وہ ایک سب سے بڑا اعلیٰ خدا کو بھی تسلیم کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ماسوا اللہ کی بھی پوجا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ لوگ اللہ کو بہت زیادہ محبوب ہیں، یعنی فرشتے، پیغمبر اور اولیاء اور اس کی بدترین شکل یہ تھی کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات بالکل ناپسند ہے بلکہ اس سے شدید نفرت ہے کہ کوئی کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرائے۔ ان بیہودہ عقائد کی رد میں چند آیات ربانی پیش کی جارہی ہیں تاکہ علم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات کتنی ناگوار گزرتی ہے۔

۱) سورۃ الصفات (۳۷) کی آیات (۱۴۹) سے (۱۵۴) تک میں بیان کیا گیا ہے کہ "اب ان سے پوچھو (اے محمدؐ) کیا تمہارے رب کے لیے صرف لڑکیاں ہیں اور ان کے لیے لڑکے۔ یا پھر ہم نے (اللہ نے) فرشتوں کو مادہ پیدا کیا اور کیا وہ اس کے گواہ تھے؟ بے شک یہ سراسر جھوٹ ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے جنم دیا (فرشتوں کو) اور بے شک یہ جھوٹے ہیں تو پھر کیا اس نے اپنے لیے بیٹیاں منتخب کیں بیٹوں کے بجائے! یہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ تم کیسے فیصلہ کرتے ہو؟"

۲) سورۃ النجم (۵۳) کی آیت (۲۷) میں کہا گیا ہے کہ "کیونکہ وہ جو ایمان نہیں لاتے قیامت پر وہ فرشتوں کے نام مونث رکھتے ہیں"۔

۳) سورہ زخرف (۴۳) کی آیت (۱۹) میں فرمایا گیا ہے کہ "اور وہ بناتے ہیں فرشتوں کو عورت جو اللہ کے غلام ہیں۔ کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے؟ ان کا یہ کہنا لکھا جاتا ہے اور قیامت کے دن ان سے اس کی باز پرس ہوگی"۔

۴) سورہ اسراء (۱۷) کی آیت (۵۶) میں فرمایا گیا ہے کہ "ان سے کہیں کہ جن کو تم اللہ کے سوا (معبود) قرار دیتے ہو اور ان کو پکارو تو سہی۔ سو (یقیناً) وہ نہ تو تم سے تکلیف دور کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس تکلیف کو بدلنے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں"۔

۵) سورۃ النساء (۴) کی آیت (۴۸) میں فرمایا گیا ہے کہ "بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اگر وہ چاہے گا تو

کسی بھی گناہ کو بخش دے گا اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوتا ہے''۔

۲) سورۃ النساء (۴) کی آیت (۱۱۶) میں فرمایا گیا کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشے گا، کہ اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک ٹھہرایا جائے۔ لیکن اس کے سوا اور کسی گناہ کو اگر وہ چاہے گا تو بخش دے گا اور جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے وہ بہت بڑی ذلت اور گمراہی میں پڑ گیا''۔

(س) عرب میں بت پرستی کی ابتداء:

عرب کے تمام علاقے میں مکہ سمیت بہت ساری جگہوں پر بت کدے بنے ہوئے تھے، ان میں سے طائف میں لات کا مندر، قدید (مدینہ اور بحر احمر کے درمیان) میں منات کا مندر اور نخلہ (مکہ اور طائف کے درمیان) میں عزّہ کا مندر بہت زیادہ مشہور تھے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے صلوٰۃ ادا کرنے سے پہلے کعبہ کے اندر اور باہر کے تمام اصنام کو تباہ کر دیا تھا اور پھر اس کے بعد شہر مکہ کے تمام علاقے میں بتوں کو تباہ کر کے حرم کعبہ اور اس کے اطراف کے تمام علاقے کو پاک کر دیا۔ جبکہ شہر مکہ کے باہر کے علاقوں میں مختلف جگہوں پر مختلف اصحاب کو بھیجا تا کہ تمام علاقے کو بتوں سے پاک کر دیا جائے۔ علاقہ عرب میں صدیوں سے دین ابراہیمی رائج تھا لیکن چار صدی قبل از نبوت محمدیؐ عرب میں بتوں کی آمد کے ساتھ بت پرستی کی ابتداء ہوئی۔ اس سلسلے میں علاقہ عرب میں سب سے پہلے ہبل کا بت لایا گیا اور اسے کعبہ کی چھت پر رکھ دیا گیا اس کے بعد دو اور بت بنام ایصاف اور نائلہ زم زم کے کنوئیں پر رکھ دیے گئے۔ یہ کنواں کعبہ کے دروازے کے سامنے واقع تھا اور لوگوں سے کہا گیا کہ وہ ان کی پرستش کریں۔ اس کے بعد ہر قبیلے نے اپنی عبادت کے لیے علیحدہ علیحدہ بت رکھ لیے اور اب انہوں نے بتوں کے سامنے قربانیاں کرنی بھی شروع کر دیں اور ان بتوں سے مدد مانگنی شروع کر دی۔

بت مختلف شکلوں میں بنائے جاتے تھے یا کندہ کیے جاتے تھے، ان کی شبیہ عورتوں، مردوں، جانوروں اور پرندوں جیسی ہوتیں۔ جیسے ود کی شکل مرد کی، سُواع اور نائلہ کی شکل عورت جیسی، یغوث کی شکل شیر جیسی، یعوق کی شکل گھوڑے جیسی اور نسر کی شکل گدھ جیسی تھی۔ قریش اور بنو کنانہ عزّہ کی پرستش کرتے جبکہ منات کی پرستش اوس اور خزرج کرتے۔

(ع) بت پرستی یا اسلام اختیار کرنے کا اختیار:

ملک عرب کے تمام مندر ڈھا دیے گئے لیکن جناب رسولؐ اللہ نے لوگوں کو اس بات کا اختیار دیا کہ اگر وہ چاہیں تو بتوں کو اپنے گھروں میں رکھ سکتے ہیں۔ گویا اسلام قبول کرنا ان کے لیے باعث حکم یا جبر نہ تھا، بلکہ انہیں اس بات کی اجازت اور اختیار دے دیا گیا، جو پہلے سے ان کے پاس تھا کہ جو اس نور کی موجودگی میں بھی اگر وہ لوگ اندھیرے میں رہنا پسند کرتے ہیں تو ان کی مرضی۔ پابندی صرف اس بات کی تھی کہ گھر سے باہر نہ تو بتوں کو رکھا جا سکتا تھا نہ ان کے لیے مندر بنائے جا سکتے تھے اور نہ ہی کھلے عام بتوں کی پوجا ہو سکتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ کافرون (۱۰۹) میں فرمایا کہ ''کہو (اے محمدؐ) اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو۔ اور نہ ہی تم اس کی عبادت کرو گے جس کی میں کرتا ہوں اور میں اس کی عبادت نہیں کروں گا جو تم پوجتے ہو اور نہ ہی تم اس کی عبادت کرو گے جس کی میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا''۔

یہ انتخاب دین کی آزادی اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کو دی ہے کہ چاہے تو اس کے حکم کے مطابق زندگی گزارے یا اپنی مرضی کے مطابق اور اسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کا امتحان رکھا ہے کہ وہ دیکھے کہ کون اس کی خوشنودی چاہتا ہے، اس کے حکم کو بجا آوری اور رضامندی کے ساتھ قبول کرتا ہے اور پھر اس پر عمل کرتا ہے۔ یا پھر برخلاف اس کے اللہ کے نافرمان شیطان مردود کی اتباع کرتا ہے اور اپنے نفس کو خوش رکھنے کے لیے اس کا کہنا مانتا ہے اور یہی بات آخرت میں اس کے حق میں یا اس کے خلاف فیصلہ کرے گی اور اس کے مطابق ہی وہ انعام و اکرام یا سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

(ف) جناب رسالت مآبؐ کا وعدہ انصار کے ساتھ مرنے جینے کا:

فتح مکہ کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے مکہ میں انیس (۱۹) روز تک قیام فرمایا تا کہ ایک تو مکہ اور اس کے گرد و نواح کو بت خانوں سے پاک کیا جائے اور دوسرا یہ کہ وہاں کے انتظامی امور کو بھی طے کر دیا جائے اور تیسرا یہ کہ وہاں کے مکینوں کو مسلمانوں کے شب و روز کی مصروفیات سے آگاہی ہو جائے اور یہ کہ دین کے ابتدائی امور سے واقفیت بھی ہو جائے۔ چنانچہ ان تمام امور کی وجہ سے جناب رسالت مآبؐ کے شب و روز خاصے انہماک اور مصروفیت سے گزرنے لگے۔

اہل انصار نے جناب رسالت مآبؐ کے اس انہماک کو بہت گہری نظر سے دیکھا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جناب رسالت مآبؐ کے دل میں اپنے آبائی وطن اور وہاں کے لوگوں کی محبت عود کر آئی ہے اور ان کی یہ کوشش اب انہیں وہاں سے واپس نہ جانے دے گی اور اس طرح سے اہل مدینہ آپؐ کی محبت، شفقت اور رفاقت سے محروم ہو جائیں گے اور ان کا سارے کا سارا وقار، عزت اور ان پر دن رات کی برکتوں اور رحمتوں کا نزول ختم ہو جائے گا۔ گویا کہ زندگی میں جو کچھ بھی نعمتوں اور رحمتوں کے خزانے انہوں نے پائے تھے، وہ سب کے سب یہیں رہ جائیں گے اور انہیں نامراد یہاں سے واپس جانا پڑے گا اور یہ سب کچھ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

چنانچہ اس تمام امر کی آگاہی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دے دی اور آپؐ کو الہام ہونا شروع ہو گیا اور ابو ہریرہ جو وہاں موجود تھے، انہوں نے آپؐ کی الہام موصول ہونے کی حالت کو پہچان لیا۔ جب یہ کیفیت ختم ہو گئی تو آپؐ نے وہاں موجود حضرات سے فرمایا کہ "اے اہل انصار! تم نے ایک دوسرے کہا، کہ یہ شخص (یعنی محمدؐ) اپنے آبائی شہر کی محبت میں ڈوب گیا ہے اور اپنے قبیلے اور خاندان کی محبت میں بھی۔" تو ان لوگوں نے عرض کیا "ہم نے ایسا کہا، اے اللہ کے نبیؐ۔" "تو پھر میرا کیا نام ہے (یعنی میں کون ہوں؟)" جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "بے شک میں اللہ کا غلام ہوں اور اس کا نبی۔ میں اللہ کی طرف اور تمہاری طرف ہجرت کر کے آیا۔ میں تم ہی لوگوں میں رہوں گا اور تم ہی میں مروں گا۔"

جناب رسالت مآبؐ کی یہ بات سن کر اہل انصار چیختے ہوئے اور روتے ہوئے آپؐ کی طرف بڑھے وہ ساتھ ہی یہ کہہ رہے تھے "اللہ کی قسم! ہم نے بے شک جو کچھ بھی کہا صرف اس لیے کہا، کیونکہ ہم اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے بارے میں بہت زیادہ حریص ہیں"۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا "تو پھر اللہ اور اس کا رسولؐ بھی تمہیں جانتا ہے کہ تم سچے ہو اور تمہیں معاف کرتا ہے۔"

بے شک جناب رسولؐ اللہ کا فرمان مبارک اہل مدینہ کے لیے نہایت خوش قسمتی اور بہت عزت اور رحمت و برکت کی بات تھی اور ہے اور ہمیشہ ان کے لیے یہ اعزاز برقرار رہے گا۔ بے شک اہل مدینہ کو قابل رشک مقام حاصل ہو گیا۔

(ص) مکہ کی سربراہی:

فتح سے پہلے عتاب بن اُسید جو بائیس سالہ نوجوان تھا، وہ مکہ کا سربراہ تھا، جب بلال نے

کعبہ کی چھت پر چڑھ کر لوگوں کو صلوٰۃ کے لیے پکارا تھا تو عتاب نے انہیں گالیاں دی تھیں۔ لیکن اللہ کے رسولؐ نے اس کی سرزنش نہیں کی، بلکہ چند روز بعد وہ خود ہی رسولؐ اللہ کے پاس حاضر ہوا اور مسلمان ہو گیا۔ جناب رحمت اللعالمین نے عتاب کو اس کے عہدے سے معزول نہیں کیا بلکہ وہی مکہ کا سرکاری طور پر سربراہ بنا دیا گیا۔

(۱۲۲) جنگ حنین

فتح کے بعد جب رسالت مآبؐ ابھی تک مکہ میں ہی قیام پذیر تھے تو آپؐ کو معلوم ہوا کہ ہوازن کا سردار وادی حنین میں بہت بڑی فوج جمع کر رہا ہے۔ اس نے بنو ثقیف، بنو جشم، بنو سعد، بنو بکر، بنو عوضا، بنو ہلال، بنو عمر اور بنو عوف کے جنگجوؤں کو جمع کیا، اس کا اتنی بڑی فوج جمع کرنے کا مقصد مسلمانوں سے اپنے بت خانوں کو محفوظ رکھنا تھا۔ خاص طور پر وہ طائف کے بہت بڑے مندر لات کو بچانا چاہتا تھا۔ کیونکہ انہیں پتا چل چکا تھا کہ رسولؐ اللہ نے مکہ اور اس کے گرد و نواح کے تمام بت خانے تباہ کر دیے ہیں اور وہ دیگر بت خانوں کے قیام کو بھی پسند نہیں کرتے۔ اسے وہ زمانہ بھی ضرور یاد آ رہا ہوگا، جب اس کی قوم نے جناب محمدؐ کو اپنے شہر طائف سے مجرمانہ اور غیر شریفانہ اور شرمناک طریقے سے نکال دیا تھا، آپؐ پر سنگ زنی کی اور آپؐ کی دعوت کو سننا تک گوارہ نہیں کیا۔ آج اسی محمدؐ کی حکومت تھی اور اس کی سربراہی اور حکم سے بت شکنی ہو رہی تھی۔

اہل ہوازن ایک بہت بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے یہ علاقہ مکہ کے جنوب سے لے کر یمن کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی اہل مکہ سے بھی پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ لفظ "ہوازن" جمع ہے لفظ "ہوزان" کا جس کا مطلب قبیلہ ہے۔

اس طرح سے ہوازن سے بیس ہزار کی فوج اکٹھی کی گئی جو ہوازن کے سردار مالک بن عوف کی سپہ سالاری میں جمع ہوئی۔ جنگ میں شمولیت کرنے والوں کے لیے یہ شرط لگائی گئی تھی کہ وہ اپنی عورتوں، بچوں، مویشیوں اور جمع شدہ دولت اور اشیاء جو بھی ان کے پاس ہوں وہ ساتھ لے کر آئیں۔

جب اہل مکہ کو اس لشکر کے متعلق علم ہوا تو ان کے دل میں بھی دبی ہوئی چنگاری ابھری اور انہیں اپنی پرانی دشمنی نبھانے کی آرزو ہوئی، کہ وہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ مل کر اہل ہوازن کو زیر

کرسکیں اور ان کی دیرینہ دشمنی پایہ تکمیل تک پہنچ جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اہل مکہ دیگر مسلمانوں کے بھی زیادہ قریب آسکیں گے۔ وہ جناب رسولؐ اللہ کا اس لیے بھی ساتھ دینا چاہتے تھے، کہ وہ آپؐ کے بہت زیادہ ممنون ہو چکے تھے کہ آپؐ نے نہ صرف ان کی جان بخشی فرمائی بلکہ یہ کہ ان کی عزت وآبرو کو بھی برقرار رکھا۔

اس طرح سے جناب رسالت مآبؐ اپنے دس ہزار ساتھیوں اور مزید دو ہزار مکہ کے لوگوں کے ساتھ ہوازن کی فوج کے مقابلے کے لیے نکل پڑے۔ آپؐ کا سامنا ان کے ساتھ وادی حنین میں ہوا، جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے یہ واقعہ سن ۶۳۱ عیسوی کے ماہ جون کی تیس ۳۰ کی شام کا ہے۔ آپؐ وہاں رات بھر قیام پذیر رہ کر صبح کا انتظار کرنے لگے تاکہ وادی حنین پہنچنے کے لیے وہ حنین سے گزرنے کے لیے صبح وقت آجائے۔ مسلمان فوج نے اس سلسلے میں کوئی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کیں۔ دشمن کی مخبری اور راستے کے خطرات خاص طور پر درے کے اطراف کسی خطرے کا جائزہ نہیں لیا۔ یہ بات نہ تو جناب رسولؐ اللہ نے اور نہ ہی آپؐ کے کسی ساتھی نے سوچی اگر سوچی بھی ہو تو کسی نے بیان نہیں کی اور نہ ہی کوئی الہام اس بارے میں موصول ہوا۔ نہ ہی کوئی خدشہ یا گمان اس بارے میں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اللہ کی مرضی تھی کہ ایسا ہی ہو، گویا یہ مسلمانوں کے لیے ایک آزمائش تھی تاکہ مسلمان خود بھی اپنی ایمانی کیفیت کا اندازہ لگا سکیں۔

برخلاف اس کے ہوازن کا سردار بہت چالاک جنگجو تھا اور جنگ لڑنے کے گُر اور تدبیروں سے خوب واقف تھا۔ اس لیے اس نے اس پہاڑی درے کے اطراف دونوں طرف خفیہ طریقے سے اپنے تیر انداز بٹھا دیے، جہاں سے گزر کر مسلمانوں نے وادی میں داخل ہونا تھا۔ چنانچہ دشمن کی یہ ترکیب اور چال بہت کارآمد ثابت ہوئی اور جب مسلمانوں نے اس درے کے اندر قدم رکھا تو ہوازن کے تیر اندازوں نے تیروں کی ایسی بوچھاڑ کی کہ مسلمان حواس باختہ ہو گئے اور جب وہاں سے واپس ہوئے تو لشکر میں ایک بھگدڑ مچ گئی اور لوگ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ لوگوں کی اس طرح سے فراتفری کے عالم میں واپسی نے دیگر افراد کو پریشانی کے عالم میں مبتلا کر دیا اور انہیں یہ علم ہی نہ ہوا کہ اصل معاملہ کیا ہوا ہے۔ اس فراتفری کے عالم میں دشمن کے سامنے جناب رسولؐ اللہ صرف چند اصحاب کے ساتھ باقی رہ گئے اور وہ اس وجہ

سے تھے کہ وہ اصحاب جناب رسولؐ اللہ کی زندگی کو اپنی ہی زندگی سمجھتے تھے اور آپؐ کے بغیر وہ اپنی ذات کو پہچانتے ہی نہ تھے، بلکہ یوں کہنا بہتر ہو گا کہ جناب رسالت مآبؐ کی زندگی اور بقا ہی ان کی اپنی زندگی اور بقا تھی۔ جناب رسالت مآبؐ اپنی خچر پر سوار تھے اور خچر کی لگام ایک طرف سے آپ کے چچا جناب عباسؓ نے پکڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف سے آپ کے چچازاد ابوسفیان بن حارث نے جبکہ جناب رسالت مآبؐ بھاگنے والے لوگوں کو پکار رہے تھے اور کہہ رہے تھے "اے اللہ کے غلامو! میرے پاس واپس آ جاؤ! میں اللہ کا پیغمبر ہوں"۔ آپ نے دوبارہ دہرایا "میں نبی ہوں اور جھوٹ نہیں بولتا! میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں"۔

یہ ایک بہت ہی سبق آموز اور چونکا دینے والا سچ ہے کہ بارہ ہزار کی فوج میں سے صرف ایک صد اسی (۱۸۰) جانثار جناب رسالت مآبؐ کے گرد جمع رہے اور ان کے متعلق بتانے کی یا کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ جناب رسولؐ اللہ سے کس قدر محبت کرتے تھے اور وہ رسولؐ اللہ کے کتنے چہیتے ہوں گے۔ اب چند پیاروں میں سے چند پیاروں کے نام ہی لے لیں تو یہ ہماری یادداشت کے لیے اچھا رہے گا، اللہ کی رحمتیں ہوں ان پر اور اللہ کے رسولؐ پر سلام اور رحمتیں اور برکتیں اللہ کی۔

وہ خوش نصیب "والسابقون السابقین" میں شامل تھے جناب ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، جناب علیؓ، جناب فضل بن عباسؓ، ایمنؓ (ام ایمن کے صاحبزادے)، اسامہ بن زیدؓ، جبکہ دو کا نام پہلے ہی آچکا ہے اس کے علاوہ بہت سارے اللہ کے رسولؐ کے چہیتے بلکہ وہ ایک صد اسی میں سارے کے سارے ہی فضیلت اور درجے اور رسولؐ اللہ کی محبت میں سب سے آگے تھے۔

پھر جناب رسالت مآبؐ نے اپنے چچا عباسؓ کو (جن کی آواز کافی بھاری تھی) کہا کہ لوگوں کو آواز دیں کہ واپس آ جائیں۔ پھر جناب عباسؓ نے لوگوں کو زور دار آواز لگائی اور انہیں ان کی بیعت جو انہوں نے حدیبیہ کے موقع پر جناب رسولؐ اللہ سے کی تھی یاد دلائی اور واپس آنے کے لیے اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے کہا۔ اس پر ان لوگوں کے ہوش ٹھکانے آئے اور انہیں اس بات کا احساس ہونے لگا کہ انہوں نے کیا کیا۔ بلکہ انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی اور اپنی ذمہ داری کو بھول گئے۔ ان کے اوسان اتنے زیادہ خطا ہو گئے تھے، کہ انہیں یہ احساس ہی نہ رہا کہ وہ رسولؐ اللہ کی قیادت سے بھاگ

کھڑے ہوئے ہیں اور انہوں نے اللہ کے رسولؐ کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔

پھر جیسے ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا وہ اسی لمحے واپس مڑے اور پھر گھبراہٹ اور شرمندگی کے عالم میں پکار اٹھے "ہم یہاں ہیں، ہم یہاں ہیں"۔ اور پھر واپس وہ جناب رسولؐ اللہ کے پاس پہنچ گئے اور ان میں وہی ایمان تازہ ہوگیا اور وہی ہمت واپس لوٹ آئی۔ اور پھر اس جذبہ ایمانی کے ساتھ انہوں نے دشمن کے ساتھ لڑنا شروع کردیا۔ اسی دوران جناب رسولؐ اللہ نے ایک مٹھی بھر خاک اٹھائی اور دشمنوں کی طرف پھینک دی اور ساتھ ہی اپنے مالک سے عرض کیا کہ "اے اللہ! اپنا وعدہ پورا کریں، جو آپ نے مجھ سے کیا ہے"۔ اس کے بعد فوراً ہی دشمن نے واپس بھاگنا شروع کردیا اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس پر مسلمان سپاہ نے ان کا پیچھا شروع کردیا اور وہ لوگ جو اپنے ساتھ اپنی عورتیں، بچے، مویشیوں کے ریوڑ اور مال و دولت لائے تھے وہ پیچھے چھوڑ گئے اور اللہ نے ان کی تدبیروں کو غارت فرمادیا اور وہ مسلمان فوج کا مقابلہ نہ کرسکے اور شکست ان کا مقدر بن گئی۔ انہوں نے مال غنیمت میں (۱) چھ ہزار (۶۰۰۰) قیدی (۲) چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) اونٹ (۳) چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) بکریاں اور بھیڑیں (۴) چار ہزار اوقیہ چاندی چھوڑی (ایک اوقیہ=۴اونس=۱۱۳گرام، اس طرح سے چار ہزار اوقیہ ایک ہزار۰۰۰ا پاؤنڈیا 453.59 کلوگرام چاندی ہوئی)۔

اللہ تعالیٰ حفاظت کرنے والا اور معاف کرنے والا، مسلمانوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ جب انہوں نے حنین سے فرقتری کے عالم میں منہ موڑا تو پھر کس طرح سے اللہ نے ان کی مدد فرمائی اور ان کی بے چینی اور خوفزدہ حالت میں ان پر سکینت نازل فرمائی اور پھر جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہیں معافی عطا فرمائی۔ اس سلسلے میں سورۃ توبہ (۹) کی آیات (۲۵-۲۷) میں رب العزت نے فرمایا کہ "صحیح بات تو یہ ہے کہ اللہ نے حنین والے دن میدان جنگ میں تمہیں فتح عطا فرمائی جب تمہیں فخر تھا اپنی زیادہ تعداد پر اور زمین تم پر وسعت کے باوجود تنگ اور مشکل ہوگئی تمہارے لیے اور پھر تم وہاں سے بھاگ اٹھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر سکینت نازل فرمائی اور اپنے پیغمبر پر بھی۔ اور پھر لشکر فوج بھیجی (فرشتوں کی) جو تم دیکھ نہیں سکے اور پھر کافروں کو سزا دی اور یہی صلہ ہے نافرمانوں کا۔ پھر اللہ قبول فرمائے گا معافی اور توبہ اس کی جسے وہ چاہے گا اور اللہ بہت ہی معاف کرنے والا اور بہت ہی رحم کرنے والا ہے"۔

اب یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ ایمان والوں کے لیے جو اللہ کے تابعدار بندے ہیں تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ان کی یا دشمن کی کسی کی بھی تعداد کو اللہ نہیں دیکھتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کفر و ایمان کے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور یہ کہ اللہ کی ذات پر مسلمانوں کو کتنا یقین ہے اور وہ اس کے حکم اور اس کی تابعداری پر کس طرح سے اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں یا انہیں کوئی اور لالچ یا اپنی طاقت یا تعداد پر بھروسہ یا تکبر ہوتا ہے۔ اصل بات اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کا ماننا ہی ہے۔

(۱۲۷) طائف کا گھیراؤ

حنین کی شکست کے بعد دشمن فوج جب مسلمان فوج کی زد سے باہر آئی تو پھر پناہ حاصل کرنے کی غرض سے تین مختلف جگہوں پر منقسم ہوگئی، کچھ اوطاس اور نخلہ چلے گئے اور باقی نے طائف کے قلعہ میں پناہ لے لی، جہاں ہوازن کا سردار بھی تھا۔ جناب رسالت مآبؐ نے اپنا پڑاؤ بمقام جیرانہ میں لگایا جو مکہ سے بارہ میل حنین اور طائف کی شاہراہ پر واقع ہے۔ جناب رسولؐ اللہ نے پہلے مرحلے میں اپنے کچھ لوگ پہلے دو مقامات یعنی اوطاس اور نخلہ بھیجے جہاں پھر انہوں نے دشمن کو شکست سے دوچار کیا۔ چونکہ دشمن کی زیادہ تعداد طائف کے قلعہ میں محصور تھی، لہٰذا جناب رسولؐ اللہ نے اس قلعے کا محاصرہ خود اپنی نگرانی میں کرنے کا فیصلہ کیا اور آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد درج ذیل طریقے اپنائے:

الف) ایک غلیل نما ہتھیار سے قلعے کے اندر پتھر پھینکے:

ب) دشمن کے تیروں کی روک تھام کے لیے لکڑی کے بڑے بڑے تختے ڈھال کے طور پر استعمال کیے۔

ج) قلعے کے اردگرد صلیب نما لکڑی کے ٹکڑے گاڑ دیے تاکہ قلعے کا راستہ روک دیا جائے۔

جب محاصرہ طول پکڑ گیا تو آپؐ نے حکم دیا کہ ان کے باغات جلا دیے جائیں۔ اس پر دشمن نے اللہ کے نام پر التجا کی کہ ان کے باغات نہ جلائے جائیں۔ اسی وقت جناب رسولؐ اللہ نے اعلان کردیا اور ان کے غلاموں کو دعوت اسلام دی اور ساتھ ہی آزادی کا پروانہ بھی۔ اس کے نتیجے میں تئیس غلاموں نے اس دعوت کو قبول کیا لیکن دشمن پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

جناب رسالت مآبؐ نے پھر اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کیا تو ان میں سے ایک نے

کیا" کہ وہ لومڑی کی طرح چھپے ہوئے ہیں اگر آپؐ ان کا محاصرہ جاری رکھیں گے تو وہ پکڑے جائیں گے، ورنہ وہ آپؐ کو نقصان پہنچانے کے قابل تو رہے نہیں"۔ آپؐ کو یہ بات پسند آئی اور آپؐ واپس اپنے پڑاؤ جعرانہ پہنچ گئے۔ یہ اس قلعے کا بیس روز کے محاصرے کے بعد ہوا۔ واپسی پر جناب رسالت مآبؐ نے اپنے لوگوں سے فرمایا "کہو! اب ہم واپس جا رہے ہیں توبہ کرتے ہوئے، اللہ کی عبادت کرتے ہوئے اور ہم اپنے رب کی تعریف کرتے ہیں"۔ پھر جناب رسولؐ اللہ کو کہا گیا کہ آپؐ طائف کے لوگوں کے لیے بددعا فرمائیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا "اے اللہ! ثقیف کو ہدایت عطا فرما (طائف کے لوگ) اور ان کو ایمان کے ساتھ ہمارے پاس بھجوا دے"۔

(۱۲۸) ہوازن کے جنگی قیدیوں کی واپسی

امام بخاری نے مروان اور المسور ابن مخرمہ کی ایک روایت نقل کی ہے، کہ جب ہوازن کے نمائندے جناب رسولؐ اللہ کے پاس آئے اور انہوں نے وہاں قبول اسلام کا اعلان کیا تو ساتھ ہی جناب رسولؐ اللہ سے درخواست بھی کر دی کہ ان کے قیدی اور ملکیت جو مال غنیمت میں آپؐ کے پاس آیا تھا وہ انہیں واپس دے دیں۔ اللہ کے رسولؐ نے کھڑے ہو کر ان سے فرمایا کہ "اس معاملے میں وہ بھی شامل ہیں جنہیں تم میرے ساتھ دیکھ رہے ہو۔ اور میرے نزدیک سب سے پیاری بات وہ ہے جو سچی ہو، اس لیے ان دو میں سے ایک منتخب کر لو یا تو قیدی یا مال، میں تو تمہارا انتظار کرتا رہا (یعنی ملکیت کو لوگوں میں تقسیم بھی نہ کیا تھا)"۔

جناب رسالت مآبؐ نے جنگی غنیمت کو دس راتوں تک تقسیم نہ کیا تھا، طائف سے جعرانہ آنے کے بعد آپؐ اس امید میں تھے کہ اہل طائف آپؐ کے پاس ایمان کی حالت میں واپس آ جائیں گے تو انہیں جنگی غنیمت واپس کر دی جائیگی۔ اور آپؐ نے طائف والوں کے لیے اپنے مالک سے یہ دعا بھی مانگی تھی اس لیے آپ کو امید تھی یہ لوگ ضرور ایمان کی حالت میں آپ کے پاس آئیں گے۔

بہر حال طائف کے لوگوں نے بلکہ ان کے وفد نے کہا کہ ہم اپنے قیدیوں کے لے جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس پر اللہ کے رسولؐ نے کھڑے ہو کر مسلمانوں سے خطاب فرمایا اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا فرمائی جس کا وہ لائق ہے اور پھر کہا "میں تمہیں مطلع کرتا ہوں!

تمہارے بھائی تمہارے پاس آئے ہیں پشیمانی کے ساتھ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے قیدی انہیں واپس کر دینے چاہئیں۔ اس لیے تم میں سے جو کوئی اس طرح کرنا چاہے بھلائی کے طور پر تو کرے اور جو کوئی بھی تم میں سے اپنا حصہ نہ چھوڑنا چاہے اس وقت تک، جب تک کہ ہم اسے اس مال غنیمت میں سے نہ دے دیں، جو سب سے پہلے اللہ عطا فرمائے گا۔ لوگوں نے کہا "ہم وہ کرتے ہیں (یعنی قیدیوں کو خوشی سے واپس کیے دیتے ہیں) اے اللہ کے نبیؐ"۔

اللہ کے نبیؐ نے فرمایا "ہمیں علم نہیں ہوا کہ تم میں سے کون اس پر راضی ہوا ہے اور کون نہیں۔ اس لیے واپس جاؤ اور تمہارے سردار تمہارے فیصلے سے ہمیں آگاہ فرمائیں"۔ اس پر وہ لوگ واپس چلے گئے اور ان کے سرداروں نے ان سے پوچھ گچھ کی تو سب نے ایسا ہی کہا۔ اور پھر وہ اللہ کے رسولؐ کے پاس واپس آ گئے اور آپؐ کو بتلایا کہ ان میں سے ہر ایک نے تسلیم کر لیا ہے (اپنے قیدیوں کی واپسی کے متعلق) خوشی کے ساتھ اور اس بات کی اجازت بھی دے دی ہے۔

(۱۲۹) نومسلموں نے بیوقوفی کا مظاہرہ کیا

حنین کے لشکر میں مکہ کے دو ہزار نومسلم بھی شامل تھے۔ راستے میں انہوں نے اپنی بے وقوفی کا مظاہرہ کیا، جس وقت کہ وہ ایک بہت مشہور درخت "ذات انواط" کے قریب سے گزر رہے تھے چونکہ انہوں نے ابھی تک صرف اسلام قبول ہی کیا تھا اور صحیح طور پر مسلمان نہ ہوئے تھے اور نہ ہی ایمان کی روح ان میں پوری طرح سے داخل ہوئی تھی اس لیے ان کے دل میں شیطانی وسوسوں نے زور پکڑا اور انہوں نے جناب رسالت مآبؐ سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا اور کہا کہ "اے اللہ کے نبیؐ! ہمارے لیے بھی کوئی ذات انواط مقرر کر دیں"۔ یعنی وہ پرانا اور بڑا درخت جو چند قبیلوں کے نزدیک بہت معتبر اور معزز درجہ رکھتا تھا اور وہ لوگ اس کا حج کرنے ہر سال آتے اور اس پر اپنے جانور قربان کرتے۔

جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "اللہ سب سے بڑا ہے! اس کی قسم، جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی روح ہے تم لوگوں نے ایسی بات کی جیسی کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے لوگوں نے ان سے کی تھی"۔ جناب رسولؐ اللہ نے پھر ان لوگوں کو سورۃ اعراف (۷) کی آیت (۱۳۸) کا ایک حصہ سنایا جس میں کہا گیا کہ "اے موسیٰ! ہمارے لیے ایک خدا مقرر کر دیں جس طرح سے کہ

دوسروں کے خدا ہیں"۔ انہوں نے کہا "بے شک تم تو جاہل لوگ ہو"۔

اسی طرح سے اہل مکہ کو اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ دین اسلام کے عقائد کو صحیح طرح سے سمجھ لیں۔ جناب رسول اللہؐ نے اپنی کمال محبت اور شفقت کے ساتھ ان سے برتاؤ فرمایا اور انہیں کوئی ملامت نہ کی۔ بلکہ قرآن کی سورۃ کا حوالہ جناب موسیٰؑ کی قوم کے کرتوت سنا کر ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اور بتایا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ ہی مالک کل ہے اور صرف اسی کی عبادت کرنا ہمارا مقصود ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور نہ ہی کوئی ہماری مدد کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ہمارا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور اللہ کے سوا کسی اور کو پکارنا یہ زمانہ جاہلیت کا فعل ہے، مسلمان ایسا نہیں کرتے بلکہ کوئی بھی ذی شعور انسان ایسا نہیں کرتا۔

(۱۷۰) جناب رسالت مآبؐ کی طرف سے اپنی رضاعی بہن کی عزت افزائی

حنین کے اسیروں میں ایک خاتون تھیں جس نے دعویٰ کیا کہ وہ جناب رسول اللہؐ کی ہمشیر ہیں۔ جبکہ مسلمان فوج کے سپاہ نے ان کی اس بات پر اعتبار نہیں کیا کیونکہ سب کو علم تھا کہ جناب رسول اللہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے لیکن انہوں نے خاتون سے یہ نہیں کہا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں بلکہ وہ تصدیق کے لیے انہیں جناب رسالت مآبؐ کے پاس لے آئے۔ انہوں نے بھی خاتون کو نہیں پہچانا۔ پوچھنے پر خاتون نے بتایا کہ اے اللہ کے نبی! میں بے شک آپ کی ہمشیر ہوں اور ہم نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے۔

پھر جناب رسالت مآبؐ نے ان سے اس بابت تصدیق چاہی اور کوئی نشانی بتانے کے لیے کہا تو خاتون نے کہا "آپؐ نے ایک مرتبہ میری کمر پہ کاٹا تھا جب میں نے آپ کو اٹھایا ہوا تھا"۔ تب جناب رسول اللہؐ کو وہ واقعہ یاد آ گیا اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی چادر زمین پر بچھا کر انہیں بیٹھنے کو کہا۔ آپؐ نے اپنی بہن سے بہت محبت، شفقت، عزت اور چاہت کا اصول مظاہرہ فرمایا اور بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ آپؐ اپنی بہن کے ساتھ کھیلتے اور ان کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ ان کا نام شیما تھا اور وہ حلیمہ سعدیہ کی صاحبزادی تھیں جن کے پاس آپؐ نے بچپن کے پانچ سال گزارے تھے اور ان کا دودھ نوش جان فرمایا تھا۔ عرب کے

پرانے دستور کے مطابق اور اسلام کے دستور کے مطابق بھی کوئی بچہ جب کسی خاتون کا دودھ پی لیتا جو اس کی والدہ کے علاوہ ہوتی تو وہ خاتون بھی اس بچے کی قانونی اور شرعی ماں کی حیثیت اختیار کر جاتی اور اس خاتون کے بچے اور دودھ پینے والا بچہ آپس میں بھائی بہن بن جاتے۔

پھر جناب رسالت مآبؐ نے اپنی ہمشیر کو پیشکش کی کہ یا تو وہ آپؐ کے ساتھ بہن کی حیثیت سے رہیں یا اگر وہ چاہیں تو اپنے قبیلے اور خاندان میں واپس چلی جائیں۔ انہوں نے واپس اپنے قبیلے میں جانا پسند فرمایا اور اس کے ساتھ ہی اسلام بھی قبول کر لیا۔ اللہ کے رسولؐ نے ان کے جانے کا بندوبست فرمایا اور انہیں تین غلام اور ایک کنیز اور بہت سے مویشی تحفے میں دیے۔

(۱۷۱) مال غنیمت کی تقسیم

جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو جناب رسالت مآبؐ نے اپنے ہم وطنوں کو اور اپنے قبیلے والوں کو پہلے یاد کرنا مناسب سمجھا کہ یہ تو وہ مال غنیمت کے بھوکے تھے، نہ ہی اور نہ ہی ان کا مقصد دولت کا حصول رہا اور نہ ہی یہ ان کے دین کا مقصد ہے اور نہ ہی آپؐ کا مقصد اہل مکہ سے مہاجرین کی جائیدادوں کا حصول تھا جو انہوں نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں اور نہ ہی ان سے کسی قسم کا تاوان وصول کرنا مطلوب تھا۔ اس لیے آپؐ نے اپنی سخاوت کا مظاہرہ تقسیم غنیمت میں اس قدر فرمایا کہ انہوں نے سب کچھ اہل مکہ کو ہی دے دیا اور اپنے ساتھیوں کے لیے ان میں سے بھی خاص طور پر اہل مدینہ یعنی انصار کے لیے کچھ نہ رکھا۔

جناب رسول اللہؐ نے غنیمت کا بیشتر حصہ مکہ والوں میں سے بھی قریش کے سرداروں کو دے دیا۔ جو جناب رسول اللہؐ کے خون کے پیاسے تھے اور پھر قریش کے سرداروں کے علاوہ قبیلہ غطفان اور قبیلہ تمیم کے سرداروں کو دیا جو ان کے حلیف اول تھے ان سرداروں میں سے ہر ایک کو ایک صد شتر اور چالیس اوقیہ یعنی دس پاؤنڈ یا 4.53 کلوگرام چاندی دی گئی۔ جب آپؐ کے سابقہ دشمن اول ابوسفیان بن حرب کو بھی یہی غنیمت دی گئی تو اس نے کہا میرے بیٹے یزید کا حصہ؟ تو آپؐ نے اسے بھی اتنا ہی حصہ دے دیا۔ لیکن اس نے پھر کہا کہ میرے بیٹے معاویہ کے لیے؟ تو آپؐ نے پھر اسے اتنا ہی حصہ دے دیا۔ اس کے علاوہ جو دوسرے مشہور سردار تھے جنہیں غنیمت میں حصہ ملا، وہ تھے صفوان بن امیہ اسے تین صد اونٹ دیے گئے، حکیم بن حزام

اسے دو صد اونٹ ملے، سہیل بن عمر، قیس بن عدی، حارثہ بن حارثہ بن کلدہ اور بہت سے دوسرے جنہیں ہر ایک کو ایک صد اونٹ ملے۔ عام طور پر ایک پیدل سوار شریک جنگ کو چار اونٹ اور چالیس بھیڑیں، جبکہ ایک گھوڑ سوار جنگجو کیا وہ اونٹ اور ایک صد بیس بھیڑیں ملیں۔

اس طرح سے تمام کا مال غنیمت تقسیم کر دیا گیا اور پھر اہل مدینہ رہ گئے جنہیں اس کا کچھ نہ ملا۔ خاص طور پر انصار جو رسول اللہ کے سچے جانثار تھے اور مددگار تھے اور ان کو بھی جو ان کے پاس ہجرت کر کے آئے تھے۔

امام بخاریؒ نے عبداللہ بن زید بن عاصم کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں اہل مدینہ کا اس بارے میں اظہار ہو رہا ہے کہ انہیں یہ معاملہ کیسا لگا اور یہ کہ جناب رسول اللہ نے ان کے احساسات کا کیا جواب دیا۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مال غنیمت عطا فرمایا حنین والے روز تو آپؐ نے تقریباً تمام کا تمام ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جن کے قلب حال ہی میں اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ لیکن انصار کو کچھ نہ دیا، اس پر وہ کچھ ناخوش اور مایوس نظر آرہے تھے کہ انہیں دوسروں کی طرح کچھ نہ ملا۔ پھر جناب رسالت مآبؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا ان کے سامنے اور فرمایا: "اے اہل انصار! کیا میں نے تم لوگوں کو گمراہ نہ پایا تھا اور اللہ نے تمہیں ہدایت بخشی سیدھے راستے کی طرف میرے ذریعے سے! تم لوگ آپس میں گروہوں میں منقسم تھے اور اللہ نے تمہیں اکٹھا کیا میرے ذریعے سے، تم لوگ غریب تھے اور اللہ نے تمہیں امیر کر دیا میرے ذریعے سے"۔

جناب رسالت مآبؐ جو بھی فرما رہے تھے تو وہ لوگ اس کا جواب ہاں میں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے "ہاں! اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم پر بہت مہربانیاں کیں"۔

جناب رسول اللہ نے پھر فرمایا "تمہیں کس چیز نے روکا ہے کہ تم جواب دو اللہ کے رسولؐ کو؟" لیکن جو کچھ بھی آپؐ نے فرمایا انہوں نے جواب دیا "ہاں! اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہم پر بہت زیادہ مہربانیاں ہیں"۔

پھر جناب رسول اللہ نے فرمایا "اگر تم چاہتے تو تم یہ کہہ سکتے تھے کہ تم ہمارے پاس آئے اس اس طرح سے کیا تم لوگ یہ دیکھنا پسند نہیں کرتے کہ لوگ یہاں سے جا رہے ہیں، بھیڑوں اور اونٹوں کے ساتھ، جبکہ تم جاؤ گے نبیؐ کے ساتھ اپنے گھروں کو؟ لیکن جہاں تک ہجرت کا تعلق

ہے، میں انصار میں سے ہی ایک ہوں اور اگر لوگ اپنا راستہ ایک وادی یا درے سے بنائیں تو میں بھی اسی وادی یا پہاڑ کے درے کا انتخاب کروں گا جس کا انتخاب انصار کریں گے۔ انصار میرے شعار ہیں (یعنی جسم سے چھونے والے کپڑے) اور دوسرے لوگ میرے دثار ہیں (یعنی کہ اوپر والے کپڑے)۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم دیکھو گے کہ لوگوں کو تم سے زیادہ مدد دی گئی لیکن تمہیں صبر کرنا چاہیے اس وقت تک جب تم مجھے ملو گے حوض پر (حوض کوثر پر)"۔

پس جناب رسالت مآبؐ نے وہ ساری غنیمت اہل مکہ اور دوسرے قبائل کو دے دی لیکن انصار کے لیے آپؐ نے اپنی ذات مبارک، اپنی محبت اور شفقت رکھی۔ بے شک وہ لوگ آپؐ کے لیے دوسرے ہر ایک سے زیادہ عزیز تھے اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ اور اس کے پیاروں پر رحمتیں اور برکتیں نازل فرماتا رہے۔

(۱۷۲) ہوازن سربراہ دائرہ اسلام میں

جناب رسول اکرمؐ کو یہ اطلاع ملی کہ ہوازن کا سردار مالک بن عوف، ثقیف کے لوگوں کے ساتھ طائف میں چھپا ہوا ہے چنانچہ آپؐ نے اسے پیغام بھجوایا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیتا ہے اور آپؐ کے سامنے پیش ہو جاتا ہے تو اسے اس کے تبدیلی بھی واپس مل جائیں گے اور اس کے ساتھ اسے ایک صد اونٹ بھی انعام میں دیے جائیں گے۔

اس پیغام کے ملنے کے بعد مالک فوری طور پر جناب رسالت مآبؐ کے پاس حاضر ہوا جو ابھی تک جعرانہ میں ہی قیام پذیر تھے۔ آپؐ نے وعدہ کے مطابق اس کے گھر کے افراد اس کے حوالے کر دیے اور ایک صد اونٹ بھی دیے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسلام بھی قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس نے جناب رسول اللہ کی مناقبت میں کچھ اشعار کہے۔ جناب رسول اللہ نے اس کی مزید عزت افزائی فرماتے ہوئے اسے اپنے قبائل کے علاوہ کچھ اور قبائل کا بھی سردار بنا دیا۔

(۱۷۳) حنین، احد اور بدر کی مشابہتیں

۱) حنین اور بدر میں دشمن کی اموات اور احد میں مسلمانوں کی شہادت کی تعداد ہر ایک کی (۷۰) تھی۔

۲) اُحد میں پہلے مسلمانوں کو فتح اور بعد میں شکست ہوئی جبکہ حنین میں اس کے برعکس ہوا۔

۳) حنین میں مسلمانوں کی شکست ان کے اپنے احساس برتری کی وجہ سے ہوئی اور انہوں نے دشمن کی حربی ترکیبوں کا صحیح طور تو کیا بلکہ اندازہ ہی نہ لگایا اور اپنی تعداد پر بھروسہ کیا۔ جبکہ اُحد میں ان کی شکست کی وجہ ان کے کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی تھی اور مال غنیمت کے لالچ کا عنصر شامل تھا۔

۴) حنین اور بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلم افواج کی مدد فرشتوں کی ذریعے کی جو دشمن سے لڑے۔

۵) اللہ نے حنین اور بدر میں اس وجہ سے مدد کی اور فتح عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو انسانوں کی بھلائی کے لیے قائم رکھ کے پھیلانا چاہتا تھا۔

۶) حنین اور بدر میں جناب رسولؐ اللہ نے اپنی نبوت کی روحانی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے بھی اللہ کی مدد حاصل کی وہ یہ کہ آپؐ نے دونوں جگہ مٹھی بھر مٹی دشمن کی جانب پھینکی، اللہ کا نام لے کر جس کی وجہ سے دشمن میں بے چینی، بے قراری اور افراتفری پھیل گئی۔

(۱۷۴) رسولؐ اللہ کی واپسی

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کا مشن کامیاب فرمایا اور اپنا کیا ہوا وعدہ پورا فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے سورۃ فتح (۴۸) کی آیات (۱)، (۳) اور (۲۷) میں کیا تھا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی تھی کہ ''بے شک ہم نے تمہیں (اے محمدؐ) ایک واضح فتح دی''۔ (۱/۴۸)

''اور اللہ تمہاری مدد عزت کے ساتھ کرے گا''۔ (۳/۴۸)

''بے شک اللہ تمہارے خواب کو پورا کرے گا جو اس نے اپنے پیغمبر کو سچائی کے ساتھ دکھلایا۔ یقیناً تم داخل ہوگے مسجد الحرام میں انشاء اللہ''۔ (۲۷/۴۸)

اللہ تعالیٰ نے اسی آیت (۲۷/۴۸) میں مزید فرمایا کہ ''وہ جانتا تھا جو تم نہ جانتے تھے اور اس نے اس کے علاوہ ایک اور فتح دے دی''۔

یعنی بنیادی طور پر تو فتح کی خوشخبری صلح حدیبیہ کی تھی جو وجہ بنی تھی فتح مکہ کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس فتح یعنی فتح مکہ سے فوراً پہلے اور فوراً بعد یعنی فتح خیبر اور فتح حنین کا تحفہ بھی دے دیا اور ان دونوں فتوحات میں مال غنیمت کے انبار لگ گئے تھے۔

اس موقع پر بھی جناب رسولؐ اللہ کا مقصد بیت الحرام اور اس کے گرد حرمت والے علاقے کو بتوں سے پاک اور کافروں سے آزاد کرانے کا تھا، اس مقصد میں کامیابی کے فوراً بعد ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ آپؐ کو حنین اور طائف کے معرکے کے لیے جانا پڑا۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنی فوج کا پڑاؤ مکہ اور طائف کی شاہراہ پر جعرانہ کے مقام پر ڈالا۔ اور پھر وہاں مال غنیمت کی تقسیم کے بعد اور قبیلہ ہوازن کو ان کے قیدی واپس کرنے کے بعد عمرہ ادا کرنے مکہ تشریف لے گئے۔ اس وقت آپؐ جعرانہ کے مقام سے ہی احرام باندھ کر عمرے کی غرض سے روانہ ہوئے اور پھر بعد ادائیگی عمرہ آپؐ نے اپنے ایک معزز ساتھی جناب معاذ بن جبل کو مکہ میں دین کی تعلیم دینے کے لیے چھوڑ دیا۔ اور اس کے بعد آپؐ اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ واپس تشریف لے گئے۔ آپؐ کے مدینہ واپس پہنچنے کا روز آٹھویں ہجری کے ماہ ذیقعد کی چوبیس (۲۴) تاریخ بمطابق ۱۵ مارچ ۶۳۰ء تھا۔

(۱۷۵) مکہ میں کافروں کا داخلہ ممنوع کر دیا گیا

فتح مکہ کے دوسرے برس نو (۹) ہجری میں اللہ جل شانہ نے حکم صادر فرمایا کہ اب کوئی بھی غیر مسلم حدود مکہ میں، جو سارے کا سارا باعث حرمت قرار دے دیا گیا تھا اس میں داخل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ لوگ غیر اخلاقی طریقے سے طواف کرتے تھے اور بنیادی طور پر اللہ واحد لاشریک کے شریک ٹھہراتے تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ طواف میں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کے بجائے تالیاں بجاتے اور سیٹیاں بجاتے کعبہ کے گرد چکر لگاتے، اس طرح سے اللہ کے احکامات کی بے حرمتی ہوتی اور کوئی بھی ذی شعور انسان اس بیہودگی میں طواف کرنا گوارہ نہیں کرتا۔

اس لیے آئندہ سے انکا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اور یہ حکم سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۲۸) کے ذریعے سے نافذ العمل ہوا، اس حکم نامے میں کہا گیا کہ ''اے ایمان والو! بے شک مشرکین نجس ہیں۔ اس لیے انہیں مسجد الحرام کے نزدیک مت آنے دو، اس سال کے بعد۔ اور اگر تمہیں خوف ہے غربت کا تو اللہ تمہیں غنی کر دے گا، انشاء اللہ اپنی نعمتوں سے، یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور سب سے زیادہ دانا و بینا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ "اگر تمہیں خوف ہے غربت کا" اس وجہ سے ہے کہ اہل مکہ کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ کعبہ کا حج کرنے والوں کی وجہ سے ہی آتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بات سے مت خوفزدہ ہو۔ اگر اس ذریعہ سے نہیں تو اللہ اور بہت سے ذرائع پیدا فرمادے گا جس سے تمہاری آمدنی مزید بڑھ جائے گی۔

بہر حال جیسے ہی یہ حکم پہنچا جناب رسولؐ اللہ نے علیؓ ابن ابی طالب کو ابو بکر صدیقؓ کو پیغام پہنچانے کے لیے مکہ روانہ کیا تا کہ وہ وہاں اعلان عام کر دیں اور عوام الناس کو آگاہ کر دیں کہ اس وقت کے بعد سے (یعنی فوری طور پر یہ حکم نافذ العمل ہو گیا ہے کہ) کوئی بھی بت پرست و مشرک یا کافر یعنی کہ غیر مسلم آئندہ سے نہ طواف کے لیے اور نہ ہی حج کے لیے آسکے گا۔ بلکہ اس کا داخلہ تمام حدود حرم میں ممنوع ہوگا۔ مطلع رہے کہ جناب صدیقؓ پہلے ہی قافلہ حج لے کر روانہ ہو چکے تھے۔

یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ تمام شہر مکہ جو کعبہ کے گرد ہے یا اس وقت تھا وہ تمام کا تمام کعبہ کی وجہ سے حرمت والی جگہ قرار دے دیا گیا تھا۔ یوں کہنا بھی مناسب ہوگا کہ وہ تمام حدود کعبہ ہے، اسی لیے اس وقت بھی مکہ شہر کے تمام داخلی راستوں پر یہ لکھا ہوا ملے گا کہ کوئی شخص بھی اس حد کو پار نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے پاس ایمان کی کنجی نہ ہو یعنی "کوئی غیر مسلم اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا" اور ایمان ہے مختصر ترین الفاظ میں کہ وہ شخص اللہ کی حاکمیت بغیر کسی شرکت کے مانتا ہو۔ اور آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، اور ان کے درمیان جتنے بھی پیغمبر آئے ہیں ان کو تسلیم کرتا ہو اور پھر جناب محمدؐ کو اللہ کا آخری پیغمبر مانتا ہو اور قیامت پر یقین رکھتا ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم پر وہاں آنے کی پابندی صرف دو وجوہات کی بنا پر لگائی۔ ایک تو یہ کہ وہ اللہ کے شریک ٹھہراتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ محمدؐ کو اللہ کا آخری رسولؐ نہیں مانتے اور نہ ہی اللہ کے رسولؐ کے احکامات کو مانتے ہیں۔ مزید یہ کہ انہوں نے یعنی مشرکین نے اللہ کے رسولؐ کو صرف اس لیے قتل کرنا چاہا تھا کہ آپؐ نے ان کے بتوں کی نفی کی تھی، جبکہ انہوں نے بتوں سے اللہ کے گھر کو ناپاک کر رکھا تھا، اور اللہ کے رسولؐ کو وہاں آنے سے روک بھی رکھا تھا۔

اس سلسلے میں سورۃ انفال (۸) کی آیت (۳۴) اور (۳۵) میں فرمایا گیا ہے کہ "اور اللہ ان کو سزا کیوں نہ دے جب کہ وہ روکتے ہیں (اللہ کے غلاموں کو) مسجد الحرام سے جبکہ وہ اس

کے متولی و ناظم بھی نہیں ہیں اور اس کے متولی وہ ہو ہی نہیں سکتے سوائے ان کے کہ جو پرہیز گار ہوں اور تقویٰ رکھتے ہوں۔ لیکن زیادہ تر لوگ تو جانتے ہی نہیں ان کی تسبیح اور صلوٰۃ اللہ کے گھر پہ کچھ نہ تھی بلکہ تالیاں اور سیٹیاں بجانا۔ اس لیے اب چکھو مزہ سزا کا اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے"۔

اس کے علاوہ سورۃ توبہ (۹) کی آیات (۱۷) اور (۱۸) اور سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۲۱۷) کے کچھ حصے میں یہ فرمان ہے کہ "وہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں جبکہ وہ خود کفر میں مبتلا ہوں۔ ایسے لوگوں کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے اور جہنم ان کا مستقل ٹھکانہ ہوگا۔ اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور صلوٰۃ کے تسلسل کو قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے اور یہی لوگ صحیح ہدایت پانے والے ہیں (۹/ ۱۷-۱۸)"۔ "لیکن اللہ کے نزدیک وہ نافرمان وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو اللہ کے راستے پر جانے سے روکتے ہیں اس کا کفر کرتے ہیں۔ لوگوں کو مسجد حرام جانے سے روکتے ہیں اور وہاں سے وہاں کے لوگوں کو نکالتے ہیں"۔

یہ بات ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ عرب کے مشرک اصل میں تو دین ابراہیمی کے پیروکار تھے یعنی ابراہیمؑ کا دین جو اس وقت تک تینوں بڑے مذاہب یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودیت کی بنیاد ہے۔ لیکن بعد میں انہوں نے اللہ کے شریک ٹھہرانے شروع کر دیے اور بت پرستی کی ابتدا کی اور اس طرح سے وہ دین ابراہیمی سے منحرف ہو گئے۔ حالانکہ ابراہیمؑ تو ایسے شخص تھے جنہوں نے سب سے پہلے بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی اور صرف اللہ واحد اور احد کی پرستش کے لیے کہا۔ اسی طرح سے جناب محمدؐ اہل عرب کے لیے کوئی نئی بات لے کر نہیں آئے تھے، آپؐ نے تو صرف دین عیسوی اور دین موسوی اور دین ابراہیمی کی ہی تو تجدید کی تھی۔ اس دین الہامی کی تکمیل جو آدم علیہ السلام سے لے کر جناب ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ تک پہنچا تھا، وہ جناب رسالت مآب محمدؐ پر اللہ کی طرف سے تکمیل پا گیا۔

(۱۷۲) الفاظ 'حلال' و 'حرام' کی تشریح

ہماری روزمرہ کی زندگی میں اور ہمارے معاشرے میں خاص طور پر الفاظ حلال و حرام بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور ان الفاظ کا استعمال اسلامی قوانین اور قرآن و حدیث کی مذہبی

اصطلاحوں میں عام ہے۔ لیکن ان کا مروجہ مطلب جائز و ناجائز کی طرف ہی جاتا ہے لیکن ان الفاظ کی حقیقی روح کو نہیں سمجھا جاتا۔ لفظ حلال عام طور پر اچھائی کی نسبت اور حرام برائی کی نسبت استعمال کیا جاتا ہے۔ ان الفاظ کو صحیح طور پر سمجھنا ہمارے لیے بہت اہمیت کا باعث ہوگا کیونکہ بعض دفعہ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ پیچیدگیاں پیدا ہونے کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً کعبہ جو اللہ کا گھر ہے پاک ہے اسے بھی حرام کہا گیا ہے یعنی بیت الحرام۔ اسی طرح محرم کا مہینہ جو چار محترم مہینوں میں سے ہے اسے بھی حرام کہا گیا یعنی محرم الحرام۔ اور حرام مردار کو بھی کہتے ہیں اور خنزیر کے لیے بھی یہی الفاظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے قرآن اور حدیث میں بھی یہ الفاظ مختلف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں ہم چند احادیث اور آیات قرآنی میں ان الفاظ کے استعمال کو دیکھتے ہیں اور پھر ان کے معانی پر غور کریں گے:

۱) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ (بقرہ کی ۱۷۳) اس نے حرام کیا تم پر مردار کو اور خون کو اور خنزیر کے گوشت کو اور ایسے جانور کو جو غیر اللہ کے نام پر ذبح ہو۔

۲) يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا (بقرہ کی ۱۶۸) اے لوگو! کھاؤ اس میں سے جو زمین میں ہے حلال اور پاک۔

۳) لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ (فتح کی آیت ۲۷) تم لوگ مسجد حرام میں ضرور جاؤ گے انشاء اللہ۔

۴) يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ (المائدہ کی آیت ۴) آپ سے یہ لوگ سوال کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیے گئے ہیں (جانور)

۵) حُرِّمَتِ النَّارُ عَلَى عَيْنٍ سَهِرَتْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (حدیث طبرانی و مستدرک) حرام ہے آگ اس آنکھ پر جو بیدار رہی اللہ کی راہ میں۔

۶) يَحْرُمُ بِالرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ (بخاری و مسلم) حرام ہیں وہ رشتے جو دودھ پینے سے اور جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔

۷) كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ خَمْرٍ حَرَامٌ (مسلم) تمام نشہ والی چیزیں خمر ہیں اور خمر حرام ہے۔

یعنی جب ان آیات قرآنی اور احادیث رسول میں لفظ حرام و حلال دیکھا جائے تو کچھ یوں پڑھنا یا بولنے میں آتا ہے:

۱) حرام ہے (یعنی منع ہے غیر قانونی ہے) خنزیر کا گوشت، مردار، اور اللہ کے سوا کے نام کا۔

۲) حلال اور پاک میں سے کھاؤ۔

۳) تم جاؤ گے مسجد حرام میں یعنی کعبہ مسجد حرام ہوا۔

۴) یعنی حلال کیا ہے اور جائز کیا ہے۔

۵) حرام ہے آگ (منع ہے) اس آنکھ پر جو اللہ کی راہ میں بیدار رہے۔

۶) حرام ہیں وہ رشتے جو دودھ پینے (ایک خاتون کا) اور جو نسب سے حرام ہوتے ہیں (نکاح کے لیے)۔

۷) حرام ہے خمر (منع ہے)

اس میں لفظ حرام بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کعبہ جو اللہ کا گھر ہے اسے بھی "حرام" کہا گیا ہے اور مردار اور خنزیر کو بھی حرام کہا گیا ہے۔ یعنی وہی لفظ "حرام" پاک اور گندی دونوں چیزوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ کا استعمال ہے جس کا صحیح مطلب عام طور پر سمجھا نہیں جاتا۔ اچھی اور بری دونوں تعبیروں کے لیے ایک ہی لفظ کا استعمال سمجھنے کے لیے اس لفظ کے بنیادی مطلب کی تعبیر یا منطق کو سمجھنے کے بعد ہی سمجھ میں آسکتا ہے۔

لہٰذا اس لفظ کی تعبیر کو سمجھنے کے لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ لفظ "حرام" کی جڑ یا بنیاد ہے لفظ "حرمت" جس کا مطلب ہے عزت و احترام جبکہ لفظ "حلال" کا مطلب ہے جائز۔ اس لیے خنزیر، مردار یا خون وغیرہ کس طرح سے باعث عزت ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ تو حرام ہو ہی نہیں سکتا جبکہ اس کو حرام کہا گیا ہے۔ اس لیے لفظ حرام اور حلال اسلامی قوانین میں اپنے لفظی معنی کے اعتبار سے استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اس لفظ کا مطلب کبھی تو مفعول کی حرمت کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی فاعل کی حرمت سے تعلق کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی فاعل اور مفعول دونوں کی حرمت کی وجہ سے۔ مثال کے طور پر انسان ذاتی طور پر حرام ہوتا ہے یعنی اس کی اپنی حرمت ہوتی ہے یعنی عزت اور احترام ہوتا ہے۔ اسی طرح سے کچھ مقامات حرام ہوتے ہیں جیسے مسجدیں، جو اس وجہ سے حرام ہوتی ہیں کہ وہ محترم ہوتی ہیں یعنی ان کی اپنی حرمت ہوتی ہے۔ اسی طرح سے وہ

جانور جو کھائے جاتے ہیں اور اسلام میں ان کے کھانے کی اجازت ہوتی ہے انہیں حلال کہتے ہیں لیکن دراصل وہ حرام ہوتے ہیں یعنی ان کی حرمت ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس خنزیر جسے حرام کیا جاتا ہے وہ حرام نہیں ہوتا یعنی اس کو حرمت نہیں دی گئی وہ پاک نہیں ہے بلکہ وہ اس کو کھانے والے کی حرمت کو خراب کرتا ہے۔ اسی طرح سے کسی کو قتل کرنا بے قصور، حرام ہے کیونکہ اس میں قاتل خود اپنی اور مقتول کی حرمت کی بے حرمتی کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح سے کعبہ حرمت والا گھر ہے، اس کی عزت لازم ہوگی۔ اسی طرح سے جنت حرام ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں کیونکہ جنت کی حرمت ہے اور اس کی حرمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں گناہگار لوگ نہ جائیں صرف نیک لوگ ہی جائیں۔ اسی طرح سے اللہ تعالٰی کے ساتھ شریک کرنے سے اللہ کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ اس کے حکم کے انکار سے یا اس کا کہنا نہ ماننے سے اللہ کی بے حرمتی ہوتی ہے اسی لیے اللہ شرک کو معاف نہیں کریگا۔ اور اس بات کا ہمیں خیال کرنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ گناہ کیا ہے۔ جب ہمیں اللہ اور اس کا رسولؐ یہ حکم دے رہا ہے کہ صلوٰۃ پانچ وقت روزانہ ادا کریں یعنی اللہ کے حضور حاضری دیں، اب جو ایسا نہیں کرتا وہ کیا کرتا ہے؟ وہ اللہ کی بے حرمتی تو کر رہا ہے اور ساتھ اس کے رسولؐ کی بے حرمتی بھی کر رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ خود اپنی بے حرمتی بھی کر رہا ہے کیونکہ اللہ تعالٰی نے اسے بھی اپنی مخلوق میں محترم بنایا ہے۔ جب محترم کسی جرم میں یا نافرمانی میں ملوث ہوگا تو وہ اپنی ذاتی بے حرمتی کر رہا ہوگا، کیونکہ اس گناہ سے جب اس کے جسم یا روح یا دونوں کو سزا ملے گی تو اس بے حرمتی کی وجہ وہ خود ہی تو ہوگا۔

مختصراً اس موضوع کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام برے کام حرام نہیں تمام ممنوعہ کام حرام نہیں یعنی ان کا کرنا جرم ہے۔ اس وجہ سے کہ ان کاموں کے کرنے والا خود اپنی حرمت کو نقصان پہنچا کر اپنی تذلیل کرتا ہے، اپنی بے عزتی کرتا ہے اور اپنی بے حرمتی کرتا ہے۔ اس کے برعکس تمام اچھے کام حلال ہیں یعنی جائز ہیں کیونکہ ان کے کرنے سے انسان اپنی حرمت برقرار رکھتا ہے، اپنی عزت اور اپنا وقار قائم رکھتا ہے۔ اور اسی طرح سے وہ تمام چیزیں جن کی حرمت اللہ نے قائم فرمائی، ان کی حرمت کا قائم رکھنا ہمارے لیے فرض اور بے حرمتی کرنا جرم ہے یعنی حرام۔ اسی طرح جو چیزیں استعمال کرنے سے ہماری حرمت قائم نہیں رہتی، وہ حرام ہیں اور ان کا استعمال بھی حرام ہے یعنی جرم ہے۔

(۱۷۷) زکوٰۃ اور جزیہ کا نفاذ

مکہ اور حنین کے معرکے سے واپسی کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے زکوٰۃ اور جزیہ کے نفاذ کا اعلان فرمایا، یہ نفاذ اللہ تعالٰی کے حکم سے ہوا جو سورۃ توبہ (۹) کی آیات (۱۰۳) اور (۱۰۴) میں موصول ہوا۔ یہ دونوں محصولات کے وصول کرنے کا حق حکومت کو دیا گیا تاکہ حکومت وصول کر کے ریاست کے ضرورت مندوں پر خرچ کرے۔ ان محصولات میں زکوٰۃ کا محصول صدقے کی مد میں آتا ہے جو ہر سال ایک فرد کی دولت کا اڑھائی فیصد ہے۔ اللہ تعالٰی کا فرمان ہے کہ یہ محصول اس لیے لگایا جا رہا ہے تاکہ تمہاری دولت کو اور تمہارے دلوں کو پاک کیا جائے، ہوس اور لالچ سے اور اس لطف سے جو دولت جمع کرنے میں آتا ہے اور اس کے بدلے میں ان لوگوں کو معافی دی جائے گی ان کے گناہوں کی اور غلطیوں کی جو وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر کرتے ہیں۔ ان آیات میں جناب رسولؐ اللہ سے فرمایا گیا ہے کہ:

"وصول کرو صدقہ (زکوٰۃ) ان کی دولت میں سے تاکہ ان کو پاک کیا جائے اور صاف کیا جائے اس کے ساتھ، اور اللہ سے ان کے لیے دعا کریں۔ بے شک تمہاری دعائیں ان کے لیے باعث اطمینان ہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ قبول فرماتا ہے اپنے غلاموں سے معافی اور توبہ، اور قبول کرتا ہے صدقہ اور اللہ واحد ہے اکیلا، جو معاف کرتا ہے اور قبول کرتا ہے توبہ کو، جو بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے"۔ (سورہ توبہ ۱۰۳-۱۰۴)

چنانچہ اس حکم کی اطاعت میں جناب رسولؐ اللہ نے اپنے نمائندے بھیجے عرب کے قبائل کے پاس تاکہ اس حکم کا نفاذ کیا جائے۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے کارکنوں کو ان کی خدمات کے عوض معاوضہ دینے کے لیے کہا گیا اور ان کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ زکوٰۃ اکٹھی کرتے وقت کسی سے بھی اپنی ذات کے لیے کسی قسم کا تحفہ وصول نہ کریں۔

جناب رسولؐ اللہ کے وصال کے بعد عرب کے بدوؤں کو خیال ہوا کہ زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار صرف رسولؐ اللہ کو ہی تھا اور آپؐ کے بعد اب حکومت زکوٰۃ وصول نہیں کر سکتی۔ اس لیے انہوں نے جناب ابوبکرؓ کے زمانے میں زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن جناب ابوبکرؓ نے ان کی رائے کی نفی فرمائی اور اس امر کے لیے اپنی تلوار نیام سے باہر نکالی اور فرمایا کہ اللہ اور اس

کے رسولؐ کے احکامات کی پابندی ضرور ہوگی اور اس امر میں کسی قسم کی کوئی رعایت یا مصلحت کو مدنظر نہیں رکھا جائے گا۔ چنانچہ زکوٰۃ وصول کرنے کا عمل جاری رکھا گیا۔

اس بات کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ صرف اسلامی فلاحی مملکت ہی زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ جب کوئی مملکت زکوٰۃ وصول کرے گی تو پھر اس ریاست میں کسی کا بھوکا سونا یا اور کسی وجہ سے محتاج ہونے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی اور اگر کوئی ریاست یہ ذمہ داری پوری کرنے کی اہل نہیں تو وہ پھر زکوٰۃ وصول کرنے کے اہل بھی نہیں رہتی۔ کیونکہ زکوٰۃ وصول کرنے کا مطلب ہی ہے کہ ریاست تمام افراد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لے رہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی یعنی زکوٰۃ کے ساتھ مسلم ریاست کے مسلمانوں کی ایک اور ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی مملکت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی قبول کریں۔ کیونکہ غیر مسلمان لوگ جو مسلم ریاست میں رہتے ہیں وہ نہ تو زکوٰۃ دینے کے پابند ہیں اور نہ ہی ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے ذمہ ہوگی۔ بلکہ اس کے بجائے وہ ایک معمولی محصول ادا کریں گے جسے جزیہ کہا جاتا ہے، جزیہ کی رقم زکوٰۃ کے نصاب سے بہت کم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ زکوٰۃ اور ریاست کی حفاظت سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ جزیہ بچوں، عورتوں، غرباء، مساکین، راہب، پادری، معذور اور بوڑھوں پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ ان جوانوں پر لاگو ہوتا ہے جو کمار ہے ہوتے ہیں۔ اس کا نصاب ایک دینار فی کس سالانہ ہے۔

اس محصول کے وصول کرنے کے بعد پھر ریاست کی ذمہ داری ایسی ہونی چاہیے جیسا کہ جناب عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں فرمایا تھا کہ "اگر ایک کتا بھی رات کو بھوکا رہا نیل کے کنارے تو اس کی بھوک کا ذمہ دار عمر ہوگا"۔

یہ اس مہذب دنیا کے لوگوں کو اور خاص طور پر جمہوری اور اسلامی ریاستوں کے سربراہوں کو جناب عمرؓ کا یہ قول نہ بھولنا چاہیے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ دیکھا جا رہا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے کے باوجود لاکھوں انسان گداگری کی لعنت میں گرفتار ہیں اور کئی بھوکے سوتے ہیں اور لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں علاج معالجے سے بھی محتاج ہیں اور لاکھوں کے سروں پر چھتیں نہیں ہیں۔ اور دنیا کی امیر ترین مملکتوں میں بھی بغیر چھت کے بھوکے پیٹ لوگ نظر آتے ہیں۔ یہ اس مہذب دنیا کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ نہیں؟

(۱۷۸) معرکہ تبوک (العسرہ)

(الف) معرکے کی وجہ:

جناب رسول اکرمؐ کے علم میں یہ بات آئی کہ بازنطینی روم اپنی افواج کو عرب اور شام کے سرحد پر جمع کر رہا ہے۔ جناب رسالت مآبؐ اس وجہ سے خاص طور پر چوکنا ہو گئے کہ بازنطینی اپنے تکبر اور غرور کا اس سے پہلے بھی مظاہرہ کر چکے تھے اور انہوں نے قتل از یں آپؐ کے ایک ایلچی کو قتل بھی کر دیا تھا۔ بازنطینیوں کو مسلمانوں کی ہمت اور بہادری کا اندازہ تو تھا ہی، کہ ان کی صرف تین ہزار کی نفری نے ایک لاکھ رومیوں کے قدم اکھیڑ دیے تھے۔

جناب رسول مآبؐ نے یہ مناسب سمجھا کہ رومیوں کو ان کی سرحد پر ہی روک دیا جائے اور انہیں حدودِ عرب میں داخل نہ ہونے دیا جائے تا کہ ان کے حوصلے بلند نہ ہو جائیں۔

(ب) سامانِ حرب کی قلت:

اہل مدینہ کے لیے اس وقت اپنا گھر بار چھوڑنا نہایت نامناسب تھا کیونکہ ایک تو سفر بہت طویل تھا اس لیے اس کے لیے کافی وقت درکار تھا، دوسرا یہ کہ ذرائع سفر، سواری اور کھانے پینے کا سامان بہت کم تھا، گرمی کی شدت تھی۔ ادھر ان کی فصلیں تیار تھیں، کھجور پکی ہوئی تھی اور اس پکی ہوئی فصل کا لوگوں کو سال بھر سے انتظار رہتا اور مناسب وقت پر اگر فصل کی دیکھ بھال نہ ہو تو فصل کے ضائع ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ منافقین نے اس مشن کے خلاف اچھا خاصہ پرچار کر کے اہل مدینہ کو اس معرکے سے دل برداشتہ کیا ہوا تھا جبکہ اس کے لیے مناسب تعداد میں مجاہدین اور سامانِ حرب کی ضرورت تھی۔

تبوک کا راستہ کافی دشوار تھا اور تقریباً آٹھ صد میل دور تھا۔ آج بھی یہ علاقہ مدینہ سے سات صد اسی میل کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت مسلمانوں پر مفلسی کا دور دورہ بھی تھا، ان تمام حالات کے سبب وہ کافی پریشان تھے اسی لیے اس معرکے کو پریشانی کا معرکہ بھی کہا جاتا ہے یعنی غزوہ العسرہ۔

(ج) اہل ایمان کی جانفشانی:

جناب رسول اللہؐ کے جانثاروں نے اپنی انتھک محبت اور وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے

اس معرکے کی تیاری میں حصہ لیا اور ہر کسی نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق بڑھ چڑھ کر خرچ کیا۔ لیکن پھر بھی ان سبقت لے جانے والوں میں سے اور بھی زیادہ سبقت لے جانے والے جناب رسول اللہؐ سے اور اللہ سے محبت کرنے والوں میں سے اور بھی زیادہ محبت کرنے والے ابھی تھے، جنہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی مثالیں قائم کیں۔ ان میں سے جناب عثمان بن عفانؓ تھے، جب رسول اللہؐ نے اس معرکے کے لیے مال دینے کی اپیل فرمائی تو جناب عثمانؓ اٹھے اور کہا "اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک صد اونٹ اللہ کی راہ میں دونگا اور ساتھ ہی ان کی سواری کا سازوسامان بھی ان کے ساتھ ہوگا''۔ جناب رسول اللہؐ نے پھر اپنی اپیل کے الفاظ دہرائے اس پر جناب عثمانؓ پھر اٹھے اور پھر اعادہ کیا اور کہا "اے اللہ کے رسولؐ! میں اللہ کی راہ میں دوصد اونٹ دونگا معہ ان کی سواری کے سازوسامان کے۔ جناب رسول اللہؐ نے تیسری بار پھر وہی پکار لگائی جس پر جناب عثمانؓ پھر کھڑے ہوئے اور اعادہ کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں اللہ کی راہ میں تین صد اونٹ مع ان کی سواری کے سازوسامان کے دونگا۔ اس کے بعد جناب رسول اللہؐ نے فرمایا "جو کچھ بھی اس وقت کے بعد عثمانؓ کرے گا وہ اس کے خلاف نہیں جائے گا''۔ آپؐ نے یہ الفاظ دوسری مرتبہ پھر دہرائے۔ (ترمذی و احمد)

اس کے بعد جناب عثمانؓ نے جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں ایک ہزار دینار (سونے کے سکے) پیش کیے۔ جس پر جناب رسول اللہ نے وہی بشارت جناب عثمانؓ کے لیے پھر دہرائی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں برکتیں اور سلام ہو جناب رسول اللہؐ اور عثمانؓ اور آپؐ کے اصحاب پر۔ جناب رسول اللہؐ کے ایک اور بہت زیادہ وفادار اور محبت کرنے والے جناب عمرؓ جو ہمیشہ اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے اور زیادہ قریب ہو جائیں ابوبکرؓ کی نسبت۔ اور کسی نہ کسی طرح سے ان سے زیادہ قربانی دے سکیں اور مال دے سکیں۔

جب عمر فاروقؓ نے اس معرکہ کے لیے اپنی طرف سے مال و زر پیش کیا تو آپؐ سے جناب رسول اللہؐ نے سوال کیا کہ انہوں نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اتنا ہی مال انہوں نے گھر والوں کے لیے چھوڑا ہے۔ پھر ان کے بعد جناب رسول اللہؐ کے سب سے زیادہ چہیتے ابوبکرؓ تشریف لائے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ پیش کر سکتے تھے وہ کیا۔ ان سے بھی جناب رسول اللہؐ نے وہی سوال کیا کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ

کر آئے ہیں۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ان کے گھر والوں کے لیے اللہ اور اس کا رسولؐ کافی ہے۔ اس سلسلے میں شیخ اقبال علیہ رحمتہ نے جناب ابوبکرؓ صدیق کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا اور فرمایا:

پروانے کو شمع بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

اس کے بعد جناب عمرؓ نے اپنے آپ سے خود ہی کہہ دیا کہ وہ کبھی بھی ابوبکرؓ سے سبقت نہ لے جا سکیں گے۔

ان کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف تھے جنہوں نے چار ہزار درہم پیش کیے جو ان کی کل دولت کا نصف تھا۔ ان کے بعد زیادہ دینے والوں میں تھے جناب عباسؓ بن عبدالمطلب، طلحہ بن عبیدہؓ، محمد بن مسلمہؓ، عاصم بن عدیؓ اور دیگر بہت سے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ ضرور پیش کیا۔ حتیٰ کہ غریب مسلمانوں نے بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان میں ایک قابل ذکر مثال ابوعقیل کی ہے جنہوں نے چار مٹھیاں بھر کے کھجوروں کی پیش کیں، جس پر منافقین نے تمسخر اڑایا اور کہا کہ اللہ کو ایسی خیرات کی ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے جناب عبدالرحمٰن عوف کی بابت بھی کہا تھا کہ انہوں نے صرف دکھاوے کے لیے اتنی رقم دی ہے۔

ان لوگوں کی یعنی منافقین کی یہ باتیں طنز اور تمسخر اپن اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں آیا اور اللہ تعالیٰ کو ناگوار گزرا کہ اس کے بندوں کے اخلاص کی توہین کی جائے۔ اللہ جل شانہ نے اس بارے میں سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۷۹) میں فرمایا کہ: "وہ لوگ جو ان ایمان والوں کو بدنام کر رہے ہیں، جنہوں نے خیرات دی جو کچھ ان کے پاس تھا اور انہوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ اللہ تعالیٰ ان کا تمسخر اپن انہی کی طرف پھینک دے گا اور انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا''۔

(د) اللہ تعالیٰ کی طرف سے خرچ کرنے والوں کی عزت افزائی:

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو شاباش دی اور اس طرح سے اپنی خوشی کا اظہار اپنے ان تابعدار بندوں تک پہنچایا جنہوں نے اللہ کے رسولؐ کے ساتھ اپنا قدم بڑھایا، اس مشکل زمانہ میں اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کو اور اپنے مال کو جناب رسول اللہؐ کے سامنے پیش کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی قدردانی کا اعتراف سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۱۱) میں اس طرح سے فرمایا ہے کہ ”بے شک، اللہ نے خرید لیں ان ایمان والوں کی زندگیاں اور ان کے اموال اور اس کے عوض میں ان کے لیے جنت ہوگی۔ وہ اللہ کی خاطر لڑے اور انہوں نے قتل کیے اور قتل ہوئے۔ یہ ایک وعدہ ہے سچا جو لازم ہے اس (اللہ) پر (جو بیان کیا گیا ہے) توریت میں، اور انجیل میں اور قرآن میں۔ اور پھر اللہ سے زیادہ اپنے وعدے میں کون سچا ہے؟ تو پھر اس سودے سے جو تم نے کیا ہے مزے کرو اور یہی سب سے اعلیٰ کامیابی ہے؟“

اللہ تعالیٰ نے مزید ان ایمان والوں کی خوبیاں بیان فرمائی ہیں جن سے اللہ نے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خریدے۔ اللہ تعالیٰ نے وہ خوبصورت اور مثالی خوبیاں سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۱۲) میں بیان فرمائی ہیں اور کہا ہے کہ ”(ایمان والے جن کی زندگیاں اللہ نے خریدی وہ ہیں) وہ جو توبہ کرتے ہیں اور رجوع کرتے ہیں (اللہ سے) جو عبادت کرتے ہیں (اللہ کی)، جو تعریف کرتے ہیں (اللہ کی) جو روزے رکھتے ہیں (اللہ تعالیٰ کے) لیے جو جھکتے ہیں (اللہ کے سامنے) جو سجدہ ریز ہوتے ہیں (اللہ کی حضوری میں) جو بھلائیاں پھیلاتے ہیں اور روکتے ہیں برائیوں سے اور جو ان حدود کے اندر رہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قائم کی ہیں۔ اور (آپ) ایسے ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیں“۔

(ہ) منافقین کی کارستانیاں:

جب رسالت مآبؐ نے معرکہ تبوک کا اعلان فرمایا تو مدینہ کے ہر ایک شخص نے اس کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن کچھ لوگ آرام سے بیٹھے رہے بلکہ دوسرے لوگوں کو جو تیاری کر رہے تھے ان کی حوصلہ شکنی کرتے نظر آ رہے تھے، یہ لوگ منافقین میں سے تھے اور اپنے گھروں کے آرام کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ جب جناب رسولؐ اللہ نے جنگی تیاری کے لیے سامان حرب جمع کرنے کے لیے کہا تو اس سلسلے میں انہوں نے کچھ خرچ نہ کیا بلکہ اپنے گندے خیالات کا اظہار مذاحیہ اور طنزیہ انداز میں کرنے لگے اور ان لوگوں پر تنقید کرنے لگے جنہوں نے اس معاملے میں اپنی حیثیت کے مطابق کم یا زیادہ جو کچھ بھی ہو سکا دیا تھا۔ ان لوگوں کا غیر اخلاقی اور کمینہ پن اللہ تعالیٰ کو اتنا ناگوار گزرا کہ اللہ نے اس کی خبر عام کر دی تاکہ لوگوں کو اور خود ان کو اپنے کرتوں کا علم واضح ہو جائے۔ لہٰذا اس بارے میں سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۷۹) کا نزول

فرمایا جس کا بیان اس سے قبل پیرا (ج) کے آخر میں آ چکا ہے۔

اس کے علاوہ ان لوگوں کو ان کے خوش ہونے پر کہ وہ لوگ اپنے گھر پر ہی آرام سے رہے اللہ نے انہیں ملامت کی اور اس بارے میں سورۃ توبہ (۹) کی آیات (۸۱) و (۸۲) کا نزول ہوا جس میں کہا گیا کہ ”وہ لوگ جو (معرکہ تبوک سے) دور رہے وہ خوش ہوئے اپنے پیچھے رہنے پر اللہ کے رسولؐ سے، اللہ کی راہ میں۔ اور انہوں نے کہا اس گرمی میں نہ جاؤ (ان سے) کہیں: جہنم کی آگ اس گرمی سے بہت ہی زیادہ شدید ہے اگر وہ صرف اس بات کو ہی سمجھ سکیں۔ پس انہیں ہنسنے دیں تھوڑی سی دیر کے لیے (اس کے بعد) وہ چلائیں گے بہت زیادہ اس نتیجے میں جو انہوں نے کمایا ہے (اپنے گناہوں کے صلے میں)“۔

جناب رسول اکرمؐ ایک منافق جد بن قیس سے ملے اور پوچھا کہ کیا وہ اس معرکے کے لیے تیار ہے۔ اس نے جواب دیا اے اللہ کے نبیؐ! کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں رک جاؤں اور اس آزمائش سے بچ جاؤں۔ اللہ کی قسم میرے لوگ جانتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ اور کوئی شخص نہیں جو مجھ سے زیادہ عورتوں پر فریفتہ ہو اور مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے بنو اصفر (رومیوں) کی عورتوں کو دیکھ لیا تو میں اپنے اوپر قابو نہ پا سکوں گا“۔ جناب رسولؐ اللہ نے اس سے اپنا منہ پھیر لیا یہ کہتے ہوئے ”تمہیں اجازت ہے“۔

اللہ تعالیٰ کو اس بے شرم کی بات بہت ناگوار گزری جس کا اظہار ناپسندیگی اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۴۹) میں فرمایا اور یوں کہا کہ ”اور ان میں سے وہ ہے جو کہتا ہے مجھے رخصت دو (معرکہ تبوک سے) اور مجھے آزمائش میں مت ڈالیے۔ یقیناً وہ لوگ آزمائش میں ڈال دیے گئے ہیں اور بے شک جہنم نافرمانوں کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے“۔

چند منافق جناب رسولؐ اللہ کے پاس گئے جھوٹے بہانوں کے ساتھ معرکہ تبوک سے رخصت پانے کے لیے جن کو جناب رسولؐ اللہ نے رخصت دے دی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات بھی ناگوار گزری اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۴۳) میں فرمایا کہ ”اللہ تمہیں معاف فرمائے (اے محمدؐ)! آپ نے انہیں کیوں رخصت دی جبکہ جنہوں نے سچ بولا ان کا سچ صاف نظر آ رہا تھا اور تمہیں جھوٹوں کی خبر تھی؟ اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا کہ انہیں جھوٹے اور سچے کے متعلق علم تھا، اس لیے پیغمبرؐ کو ان لوگوں کے خلوص کو جانچنا چاہیے تھا اس سے پہلے کہ وہ انہیں رخصت دیتے۔

اسی سلسلے میں سورۃ توبہ (۹) کی آیات (۴۴) اور (۴۵) میں کہا گیا کہ "وہ جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور روزِ آخرت پر وہ تمہیں رخصت کے لیے نہیں کہیں گے لڑنے کے لیے اپنی جانوں اور اموال سے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے پرہیزگاروں کے متعلق۔ یہ صرف وہی ہیں جو اللہ پر یقین نہیں رکھتے اور قیامت کے دن پر اور جن کے قلوب شک میں مبتلا ہیں جو تم سے رخصت مانگتے ہیں (جہاد سے) اس لیے وہ اپنے شبہات میں اپنے خیالات اور اپنی رائے کو بدلتے ہیں"۔

پس اللہ تعالیٰ نے اس بات کو صاف صاف ظاہر کر دیا کہ وہ لوگ جو صحیح ایمان والے ہیں وہ کبھی رخصت کے لیے نہیں کہیں گے جہاد پر جانے سے سوائے اس کے کہ ان کے لیے کوئی واقعی مجبوری ہو۔ کیونکہ چند ایک صحابہ نے جناب رسولؐ اللہ سے درخواست کی تھی کہ ان کے پاس سواری کے لیے کوئی جانور میسر نہیں، اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی ایسا بندوبست ہو جائے تا کہ وہ سفر کے قابل ہو جائیں۔ لیکن چونکہ ان کے لیے ایسا کوئی بندوبست نہ ہو سکا چنانچہ انہیں مجبوراً گھر واپس لوٹنا پڑا لیکن واپس لوٹتے وقت افسردگی کی وجہ سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا سے محروم رہ گئے تھے، سواری کے نہ ہونے کی وجہ سے۔

(و) منافقین کے لیے نہ جہاد نہ صلوٰۃ الجنازہ:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جناب رسولؐ اللہ کو حکم موصول ہوا کہ اگر وہ (اللہ) انہیں تبوک سے واپس لاتا ہے تو پھر انہیں کسی بھی منافق کو اپنے ساتھ کسی جنگ میں شریک نہیں کرنا ہوگا"۔ یہ حکم سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۸۳) میں وارد ہوا جس میں کہا گیا کہ "اگر اللہ تمہیں واپس لاتا ہے ان کے (منافقین) کے کسی گروہ میں اور وہ آپؐ سے اجازت چاہیں، آپؐ کے ساتھ لڑائی میں جانے کے لیے تو کہو تم کبھی بھی نہ جا سکو گے میرے ساتھ، نہ میرے ساتھ تم کسی دشمن سے لڑ سکو گے، تم خوش تھے بیٹھ کر (اپنے گھر میں) اس سے قبل پہلی مرتبہ تو (اب) بیٹھے رہو ان کے ساتھ جو پیچھے رہ جانے والے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے پھر حکم دیا اپنے پیغمبر کو کہ منافقین کی صلوٰۃ جنازہ نہ پڑھائیں۔ اس سلسلے میں سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۸۴) میں فرمایا گیا کہ "اور کبھی بھی (اے محمدؐ) نہ پڑھنا (صلوٰۃ جنازہ) ان میں سے کسی کے لیے (منافقین میں سے) جو مر جائیں اور نہ ہی ان کی قبر پر جانا۔

یقیناً انہوں نے اللہ سے انکار کیا اور اس کے رسولؐ سے اور مر گئے جبکہ وہ نافرمان تھے اللہ کے اور اس کے رسولؐ کے"۔

اس حکم سے پہلے ایک اور حکم اسی سلسلے میں سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۸۰) میں آ چکا ہے جس کے مطابق یہ کہا گیا ہے کہ "چاہے تم (اے محمدؐ) ان (منافقین) کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو (اور اگر) آپؐ ان کے لیے ستر (۷۰) مرتبہ بھی مغفرت کی دعا کریں گے تو بھی اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لائے اور اس کے رسولؐ پر اور اللہ ہدایت نہیں دیتا جو اللہ کے نافرمان ہیں"۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی فوت ہوا اور اس کے بیٹے نے جناب رسالت مآبؐ سے گزارش کی کہ وہ اپنی قمیص دے دیں تا کہ وہ اس کے باپ کی میت کو پہنائی جائے اور آپؐ سے اس کی صلوٰۃ جنازہ پڑھنے کے لیے بھی کہا۔ چنانچہ جناب رسالت مآبؐ نے اس کی درخواست پوری کی۔ یہ بات بظاہر متعلقہ دو آیات یعنی سورۃ توبہ کی آیت (۸۰) اور (۸۴) کی خلاف ورزی معلوم ہوتی تھی، اس لیے جناب عمر بن خطابؓ نے جناب رسالت مآبؐ کی قبا تھام لی اور عرض کیا "اے اللہ کے نبیؐ! کیا آپ اس کی صلوٰۃ الجنازہ ادا کر رہے ہیں جبکہ آپ کے مالک نے آپؐ کو منع کیا ہے، اس سے؟

اس پر اللہ کے نبیؐ نے فرمایا مجھے یہ اختیار دیا گیا تھا کیونکہ اللہ نے فرمایا اور آپ نے سورۃ توبہ کی آیت (۸۰) کا حوالہ دیا، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ "چاہے آپؐ ان کی مغفرت کے لیے کہیں یا نہ کہیں اور اگر آپ ستر (۷۰) مرتبہ بھی کہیں گے تو بھی اللہ انہیں معاف نہیں فرمائے گا"۔

اس لیے جناب رسولؐ اللہ نے اس کے لیے صلوٰۃ الجنازہ پڑھ دی۔ اور پھر اس کے بعد آیت (۸۴) سورۃ توبہ کا نزول ہوا، جس میں جناب رسولؐ اللہ کے پاس حکم آیا کہ اب آپ کبھی بھی صلوٰۃ الجنازہ نہ پڑھیں کسی منافق کے لیے اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہوں"۔

(ز) جناب رسول اللہ کا شرانگیزی کی منصوبہ گاہ کو جلانے کا حکم:

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی شرانگیزیوں سے آگاہی عطا فرما دی تھی اور ان کے لیے ملامت کا اعلان بھی کر دیا تھا لیکن پھر بھی جناب رسولؐ اللہ نے ان کو قتل کرنے سے گریز فرمایا۔ اور اسکا یہ جواز پیش کیا کہ لوگوں کو موقع مل جائے گا، کہنے کا کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیتا

ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک شدید کارروائی ان کے خلاف اس وقت کی گئی جب آپؐ کے علم میں یہ بات آئی کہ منافقین ایک گھر میں جمع ہوتے جو ایک یہودی سویلم کا تھا اور جناب رسالت مآبؐ کے خلاف لوگوں کو اکساتے، اور ساتھ ہی معرکہ تبوک سے بیزار کرنے کی کوشش کرتے۔ جناب رسولؐ اللہ نے اس بات کی تصدیق کرائی کہ وہ لوگ واقعی ایسا ہی کر رہے ہیں، اور جب یہ علم ہو گیا کہ وہ لوگ مسلمانوں کی یکجہتی کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں سرگرم عمل ہیں تو آپؐ نے اپنے چند اصحاب کو بھیجا اور حکم دیا کہ وہ سویلم کے گھر کو آگ لگا دیں۔ آپؐ کے اس عمل سے یہودیوں اور منافقین کو ایک تو ان کی سرگرمیوں سے روکنا اور دوسری طرف باور کرانا تھا کہ ان کی شرارتیں جناب رسولؐ اللہ سے پوشیدہ نہیں اور وہ ان کا خاطر خواہ تدارک کر سکتے ہیں اور انہیں اس سے زیادہ بھی سزا دے سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مزید ان کی نیتوں کو ظاہر کر دیا کہ وہ کیوں کر معرکہ تبوک سے پیچھے رہے، اس سلسلے میں سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۴۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ ”اگر اس (جنگ) میں کسی فائدے کی امید ہوتی اور اس کا سفر بھی آسان ہوتا تو یہ لوگ آپؐ کے پیچھے آ جاتے لیکن (تبوک کا) فاصلہ ان کے لیے بہت زیادہ تھا اور وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں گے کہ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ ضرور جاتے۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو برباد کر لیا اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں“۔

(ح) ایمان کی کمزوری کی وجہ سے پیچھے رہ جانے والے:

ایسے ایمان والے جو کہ منافق تو نہ تھے لیکن پھر بھی معرکہ تبوک سے رہ گئے، اس کی وجہ ان کے ایمان کا کمزور ہونا تھا۔ چونکہ کھجور کا پھل تیار تھا اور وہ اپنے گھروں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور اپنی پکی ہوئی فصلوں کو اتنے زیادہ عرصے کے لیے اور اتنا لمبا سفر اختیار نہ کرنا چاہتے تھے، شدید گرمی کے موسم میں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں وارننگ دی، اس غلطی کی کہ انہیں ان کی ایسی غلطیاں، دنیا اور آخرت کے عذاب میں مبتلا کر سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں سورۃ توبہ (۹) کی آیات (۳۸) اور (۳۹) میں فرمایا گیا ہے کہ ”اے ایمان والو! تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں جانے کے لیے تو تم زمین کے ساتھ چپک جاتے ہو؟ کیا تم اس دنیا کی زندگی سے خوش ہو، آخرت کی نسبت؟ لیکن

اس دنیا کا لطف تو بہت ہی کم ہے آخرت کے مقابلے میں۔ اگر تم نہ نکلے اللہ کی راہ میں تو وہ تمہیں سزا دے گا دردناک عذاب سے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ اور تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کبھی بھی اور اللہ ہر کام کرنے کے قابل ہے“۔

اس کے علاوہ سورۃ توبہ کی آیات (۹۰) اور (۹۳) میں ان لوگوں کے متعلق بتایا گیا ہے جن لوگوں نے جناب رسولؐ اللہ سے اجازت مانگی رک جانے کی جبکہ ان کے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ ان لوگوں کو بھی وارننگ دی گئی ان کی نادانی کی کہ وہ اپنا آخرت کا اجر کھو دیں گے اور اس کے بدلے انہیں عذاب ملے گا اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی کرنے پر۔

آیات بالا (۹۰ اور ۹۳) میں کہا گیا ہے کہ ”وہ جنہوں نے بہانے بنائے ان بدوؤں میں سے جو تمہارے پاس آئے تمہاری اجازت لینے کہ انہیں (تبوک سے) رہنے دیا جائے اور وہ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے جھوٹ بولا اور وہ جو اپنے گھروں میں بیٹھے رہے (بغیر اجازت)، ایک دردناک عذاب ان نافرمانوں کو لے ڈوبے گا۔ یہ شکایت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو ذرائع بھی رکھتے ہیں اور پھر بھی رخصت چاہتے ہیں۔ وہ لوگ اس بات پہ مطمئن ہیں کہ رہیں (اپنی عورتوں کے ساتھ) جو پیچھے رہ جاتے ہیں (گھروں میں) اور اللہ نے ان کے دلوں کو مہر بند کر دیا ہے اس لیے کہ وہ جانتے نہیں (کہ انہیں کیا نقصان ہو رہا ہے)“۔

(ط) وہ جو جائز عذر کی بنا پر پیچھے رہ گئے:

کچھ ایسے بھی وفادار ایمان والے تھے جن کو معرکہ تبوک سے روک دیا گیا تھا وہ کسی جائز وجہ سے رک گئے تھے جیسے علیؑ کو جناب رسولؐ اللہ نے روک دیا تھا تا کہ وہ خانوادہ رسولؐ اللہ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے سعدؓ کی روایت سے کہ ”اللہ کے رسولؐ جب تبوک کے لیے نکلے اور علیؑ کو اپنی جگہ چھوڑا تو علیؑ نے عرض کیا ”کیا آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑنا چاہتے ہیں؟“۔ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا ”کیا تم خوش نہ ہو گے کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کے لیے؟ لیکن میرے بعد کوئی پیغمبر نہ ہوگا“۔

کچھ لوگ بیماری یا لاچاری کی وجہ سے لڑنے کے قابل نہ تھے اور کچھ ایسے تھے جن کے پاس سواری کا کوئی بندوبست نہ تھا، اور نہ ہی وہ سامان حرب خرید سکتے تھے۔ لیکن وہ سچے ایمان

والے تھے اور واقعی رسولؐ اللہ کے ساتھ جانا چاہتے تھے اس لیے نہ جانے کی وجہ سے غمزدہ تھے، بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نیتوں سے واقف تھا۔ اس لیے ان کا راز بھی اللہ نے افشاں کر دیا اور فرمایا سورۃ توبہ کی آیت (۹۱-۹۲) میں کہ "ان پر کوئی الزام نہیں جو کمزور یا بیمار ہیں اور جو سامان حرب کے لیے خرچ نہ کر سکتے تھے جبکہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ مخلص ہیں۔ ان نیکوکاروں پر کسی قسم کا کوئی الزام نہیں اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بہت ہی مہربان ہے۔ اور نہ ہی ان لوگوں پر کوئی الزام، جو آپ کے پاس سواری حاصل کرنے کے لیے آئے۔ جب آپؐ نے کہا میں تمہارے لیے کسی سواری کا بندوبست نہیں کر سکتا تو پھر وہ واپس ہو لیے اپنی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ رنجیدگی کے عالم میں کہ ان کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہ تھا"۔

(ی) وہ جو اپنی کاہلی کی بنا پر پیچھے رہ گئے:

(i) ابولبابہ اور دوسرے

امام ابن کثیر نے اپنی کتاب سیرت النبیؐ میں لکھا ہے کہ ابولبابہ کے ساتھ مل کر کل سات افراد تھے جو معرکہ تبوک سے رہ گئے تھے، اپنی کاہلی کی وجہ سے۔ لیکن یہ لوگ منافق نہیں تھے بلکہ سچے ایمان والے تھے، انہیں اپنی غلطی کا احساس خود ہی ہو گیا۔ جس کی معافی انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے مانگی۔ لیکن جناب رسولؐ اللہ کی واپسی سے پہلے ہی انہوں نے اپنی خود احتسابی طور پر اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں کے ساتھ باندھ لیا اور یہ اعلان کر دیا کہ انہیں جناب رسولؐ اللہ کے علاوہ اور کوئی نہ کھولے۔

چنانچہ جب رسولؐ اللہ کی تبوک سے واپسی ہوئی اور آپؐ کو ان کے متعلق بتایا گیا تو آپؐ نے انہیں کھولنے سے انکار کر دیا، اور فرمایا کہ جب تک اللہ کی طرف سے ان کے لیے معافی نہ آئے گی وہ انہیں نہیں کھولیں گے کیونکہ انہوں نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ جب ان لوگوں کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ وہ اب اپنے آپ کو اس وقت تک نہ کھولیں گے جب تک کہ اللہ کی طرف سے ان کی معافی قبول نہ ہو جائے گی۔

یہ ذکر کرنا یہاں مناسب ہوگا کہ جس ستون کے ساتھ ابولبابہ نے اپنے آپ کو باندھا تھا وہ ابھی تک ان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وہ مسجد کے حصے ریاض الجنہ میں واقع ہے جو جناب رسالت مآبؐ کے گھر اور منبر کے درمیان واقع ہے۔ اب اس میں صرف یہ فرق آ گیا ہے کہ اس

وقت یہ ستون کھجور کے تنے کا تھا جبکہ اس وقت سنگ مرمر کا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے جو نہایت مہربان اور بہت رحم کرنے والے ہیں، ان لوگوں کی توبہ قبول فرمائی اور انہیں معاف کر دیا۔ اور اسکا حکم سورۃ توبہ کی آیت (۱۰۲) میں صادر فرمایا اور کہا کہ "(کچھ ایسے ہیں) جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا انہوں نے اپنے عمل کو جو اچھا تھا ملا لیا اس عمل کے ساتھ جو برا تھا۔ شاید اللہ تبدیل کر دے گا ان کو معافی میں، یقیناً اللہ معاف کرنے والا اور بہت مہربان ہے"۔

اللہ کے رسولؐ نے پھر ان لوگوں کو معاف کر دیا اور کھول دیا۔ اس کے بعد ابولبابہ اور دوسرے اپنی دولت لے کر اللہ کے رسولؐ کے پاس آئے کہ اسے خیرات کر دیں۔ لیکن جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان سے خیرات کے لیے نہیں کہا، اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ کی آیت (۱۰۳) نازل فرمائی اور رسولؐ اللہ سے فرمایا، کہ ان سے خیرات قبول کر لیں اور ان کے لیے دعا کریں۔

آیت میں اس طرح سے فرمایا کہ "ان کی دولت میں سے صدقہ وصول کریں تا کہ وہ پاک ہو جائیں اور ان کے لیے دعا کریں۔ بے شک تمہاری دعائیں ان کے لیے بہت اطمینان کا باعث ہوتی ہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

(ii) کعب بن مالک، مرہ بن ربیعؓ اور ہلال بن امیہ

یہ لوگ بھی معرکہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے ہیں اپنی سستی کی وجہ سے اور اپنی کھجوروں کی پکی ہوئی فصلوں کی وجہ سے۔ لیکن نہ تو منافق تھے اور نہ ہی نافرمان، اللہ اور اس کے رسولؐ کے، وہ ان کا حکم ماننا تو چاہتے تھے، لیکن سستی اور لالچ کی وجہ سے وہ رک گئے۔

کعب بن مالک نے بیان کیا کہ جب جناب رسولؐ اللہ تبوک سے واپس آئے تو آپؐ کے پاس تقریباً اسی (۸۰) لوگ آئے اپنے جھوٹے بہانوں کے ساتھ کہ وہ معرکہ میں شرکت نہ کر سکے۔ لیکن کعب اور اس کے ساتھ دو اور نے بیان کیا کہ وہ اپنی کاہلی کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔ اس پر جناب رسولؐ اللہ نے ان سے فرمایا کہ وہ ان سے دور ہو جائیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں کوئی فیصلہ صادر فرمائے۔ اللہ کے نبیؐ نے تمام مسلمانوں سے بھی کہہ دیا کہ وہ ان لوگوں سے زندگی کے ہر معاملے میں دور رہیں، یہاں تک کہ اللہ کا کوئی حکم ان کے

بارے میں آ جائے۔

اس لیے جب کعب مسجد میں یا بازار میں ہوتے تو کوئی بھی مسلمان ان سے بات نہ کرتا۔ جبکہ دوسرے دونوں نے اپنے آپ کو گھر میں بند کر لیا تھا، اور اپنی قسمت پر روتے رہتے۔ اللہ کے نبی کعب کے سلام کا جواب بھی نہ دیتے۔

اسی دوران کعب کو غسان کے بادشاہ کا خط وصول ہوا جو قیصر روم کا نائب تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ "مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارے دوست (رسول اللہ) نے تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا ہے اور اللہ نہیں چاہتا کہ تم ایسی جگہ رہو جہاں تمہیں کمتر ہو کر رہنا پڑے اور تمہارے حقوق بھی وہاں سلب ہو جائیں اس لیے ہمارے پاس آ جاؤ۔ ہم تمہیں اچھائی سے رکھیں گے"۔

اس خط کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ اس کی دوسری آزمائش ہے، اس پر اس نے اس خط کو جلا دیا۔

بہرحال اس واقعہ کی چالیسویں شب ان تینوں اصحاب نے جناب رسول اللہ کا پیغام سنا کہ اب وہ اپنی ازواج سے بھی علیحدگی اختیار کر لیں۔ کعب نے اس سلسلے میں بیان کیا کہ انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی آئندہ دس راتوں تک۔ اور اس کی اگلی صبح صلوٰۃ الفجر کے بعد یعنی پچاسویں صبح اس نے ایک آواز سنی یہ کہتے ہوئے "اے کعب بن مالک! خوش ہو جاؤ"۔ اس کے بعد پھر وہ سجدے میں چلا گیا اپنے رب کے حضور یہ سوچ کر کہ انہیں اللہ کی طرف سے معافی مل چکی ہے، پھر وہ جناب رسول اللہ کے پاس گئے اور لوگ انہیں جوق در جوق مبارک دینے لگے اللہ کی طرف سے معافی ملنے پر۔ پھر وہ جناب رسول اللہ سے ملے اور انہوں نے آپ لوگوں کو سلام کیا اور فرمایا "خوش ہو جاؤ اچھے دن کے ساتھ جو تم نے اس سے پہلے نہ دیکھا ہوگا جب سے کہ تمہاری ماں نے تمہیں جنم دیا ہوگا"۔

کعب نے مزید کہا کہ جب وہ جناب رسول اللہ کے سامنے بیٹھا اس نے کہا "اے اللہ کے نبی! چونکہ مجھے معاف کر دیا گیا ہے، اس لیے میں اپنی تمام دولت اللہ اور اس کے نبی کے واسطے خیرات کر دوں گا"۔ اللہ کے نبی نے فرمایا "کچھ دولت کا حصہ اپنے پاس بھی رکھو، یہ تمہارے لیے بہتر رہے گا"۔ میں نے جواب دیا "تو پھر میں خیبر سے ملا ہوا حصہ اپنے پاس رہنے دیتا ہوں"۔

تین اصحاب کے اس واقعہ میں جنہوں نے سچ بولا اور توبہ کی اللہ سے جو بڑا مہربان اور بخشنے

والا ہے اور اس کے رسول سے بھی معافی مانگی، اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ کی آیت (۱۰۶) میں فرمایا کہ "اور کچھ دوسرے انتظار کرائے گئے اللہ کے فیصلے تک، کہ یا تو وہ انہیں سزا دے یا انہیں معاف کر دے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور سب سے زیادہ دانشمند ہے"۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو جناب رسول اللہ اور دیگر ایمان والے ان تینوں صحابہ سے دور ہو گئے، جنہوں نے توبہ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں انتظار کرایا اپنے فیصلے کے لیے کہ وہ دیکھیں کہ اللہ ان کے لیے کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی معافی کا اعلان سورۃ توبہ کی آیات (۱۱۷) تا (۱۱۹) میں کیا۔

اور ان آیات میں فرمایا کہ "اللہ نے معاف فرما دیا، رسول کو مہاجرین اور انصار کو جنہوں نے اس کی تابعداری کی عسرت کے زمانے میں۔ اس کے بعد ان میں سے چند لوگوں کے دل ہٹ جانے کے قریب تھے لیکن اس (اللہ) نے ان کی توبہ قبول کی۔ یقیناً وہ ان پر بہت ہی زیادہ مہربان ہے، بہت ہی زیادہ رحم والا"۔

"اور وہ تین جو پیچھے رہ گئے، یہاں تک کہ زمین ان کے لیے تنگ ہو گئی اتنی کھلی ہونے کے باوجود اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے اور اس کے سوا کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ پھر اس نے ان کو معاف کر دیا تا کہ آئندہ بھی وہ معافی کے لیے اللہ ہی سے رجوع کرتے رہیں۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا بہت ہی زیادہ مہربان ہے"۔

"اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اللہ کا اور ان کے ساتھ رہو جو سچے ہیں"۔

(ک) تبوک کے لیے روانگی:

جب لوگ اس معرکہ کے لیے تیار ہو گئے جتنا کہ وہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق تیار کر سکتے تھے لیکن پھر بھی ان کے پاس دو چیزوں کی بے حد کمی تھی، ایک تو سواریوں کا بندوبست کم تھا اور دوسرا یہ کہ کھانے پینے کا بھی خاطر خواہ انتظام نہ تھا، بہرحال عرب کے ہر حصے سے جانثاران رسول اللہ مدینہ پہنچ گئے اور اپنے آپ کو اس معرکہ کے لیے پیش کر دیا۔ اس طرح سے مجاہدین کی کل تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ آج تک خطہ عرب میں کبھی بھی اتنی بڑی تعداد میں لوگ جمع نہ ہوئے تھے۔ جناب رسالت مآب نے مدینہ کے انتظامی فرائض کی انجام دہی کے

لیے محمد بن مسلمہ انصاری کو مقرر فرمایا۔

جناب رسول اللہ اس لشکر کو لے کر نو ہجری کے ماہ رجب یعنی ۲ نومبر ۶۳۱ء کو جانب تبوک روانہ ہوئے۔ اس معرکہ کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ توبہ کی آیت (۴۱) میں صادر ہوا تھا جس میں فرمایا گیا تھا کہ ''آگے بڑھو، چاہے تم ہلکے ہو یا بھاری (یعنی اچھی یا بری جیسی بھی حالت ہے اس میں) اور شدید جدوجہد کرو اپنی دولت کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ، اللہ کی راہ میں، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، لیکن اگر تم اس (اہمیت) کو جانتے ہو تو''۔

اللہ تعالیٰ کے تابعدار بندے اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں جان و مال پیش کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اور اس کے برعکس جاہل و نادان لوگ اپنی جان اور دولت کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں، انھیں اپنی ذات کے لیے تن آسانی، آرام اور دولت زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ بے شک ایمان والوں نے اپنی محبت، تابعداری اور وفاداری کا شدید اظہار کیا اور اللہ کی راہ میں مثالی طور پر مال جمع کیا۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ سفر بہت زیادہ تھا اس لیے جو مال رکھا گیا تھا وہ کافی نہ تھا۔ کیونکہ ایک اونٹ پر باری باری اٹھارہ لوگ سوار ہوتے، اور ایک کھجور پر دو شخص گزارہ کرتے۔ جب یہ لوگ کسی صحرا سے گزر رہے ہوتے جہاں پانی بالکل میسر نہ ہوتا تو انھیں اپنا ایک اونٹ ذبح کرنا پڑتا تا کہ اس کے معدے سے پانی نکال کر استعمال کریں۔

دوران سفر قافلہ رسالت الحجر نامی ایک جگہ سے گزرا جو القراء کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، یہ وہ جگہ تھی جہاں پر قوم ثمود کو اپنے نبی جناب صالحؑ کے جھٹلانے پر عذاب دیا گیا تھا۔

امام بخاریؒ نے ابن عمرؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب جناب رسول اللہ الحجر کے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ ان لوگوں کی بستی سے نہ گزرو، جنھوں نے اپنے ساتھ ناانصافی کی، اگر گزرو تو اس حالت میں کہ (اللہ کے خوف سے) روتے ہوئے گزر جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ویسا ہی عذاب کہیں تم پر بھی نہ آجائے''۔

پھر آپؐ نے اپنا سر ڈھانپ لیا اور جلدی سے وادی سے گزر گئے۔ بظاہر وہ وادی قافلہ والوں کے لیے بہت قیمتی تھی، کیونکہ وہاں پانی کے ذرائع موجود تھے لیکن آپؐ نے وہاں کے پانی کو بھی لینے سے منع فرما دیا تھا۔ پانی کی چونکہ شدید قلت پیدا ہو چکی تھی چنانچہ لوگوں نے جناب رسالت مآبؐ سے اس بارے میں عرض کیا۔ آپؐ کے پاس اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ رہ

گیا تھا کہ وہ اپنے رب کو پکاریں، چنانچہ آپؐ نے اپنے رب سے پانی کی درخواست کی۔ مالک نے اپنے چہیتے غلام کی آواز سنی اور ایک بادل کا ٹکڑا بھیجا جو اتنا برسا کہ ہر شخص نے اپنی پیاس بجھائی اور کافی مقدار میں پانی جمع بھی کر لیا۔ جو آئندہ کے سفر کے لیے کافی تھا۔ غرض کہ آپ پندرہ روز کے مشکل ترین سفر کے بعد تبوک پہنچ گئے۔

(ل) مسلمان فوج کی تبوک آمد:

تبوک پہنچنے پر جناب رسول اللہ نے وہاں کے ایک پانی کے ذخیرے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ لیکن ساتھ ہی تمام لوگ حیرت زدہ ہو گئے کہ رومی فوج کا ایک سپاہی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ جب فوج کے شرکاء اپنی اپنی جگہ مقیم ہو گئے تو جناب رسول اللہ نے ایک بہت پر اثر خطاب فرمایا، کہ کس طرح سے اس دنیا کی بھلائی اور ساتھ ہی آخرت کی بھلائی کو حاصل کیا جا سکے۔ آپؐ نے لوگوں کو متنبہ کیا اور انھیں یاد دلایا کہ انھیں اس دنیا میں آنے کے مقصد اور آخرت کے متعلق معلوم ہونا چاہیے۔ اور اس سلسلے میں ان کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کو ماننا بہت ضروری ہے۔ اور اس کے لیے آپؐ نے خوشخبری سنائی، اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم عطا فرما کے بے حد اعزاز بخشا اور اپنے مخلوق اعلیٰ کو مناسب طور پر پیغمبروں کے ذریعے سے الہامی ہدایت ہر اس وقت پہنچائیں جبکہ انسان کی عقل زندگی کی گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے میں ناکام ہوتی رہی۔

اسی طرح سے جناب رسالت مآبؐ کے خطاب سے آپ کے ساتھی جو اس سفر کی مشکلات سے دوچار تھے، یقیناً روحانی طور پر مستفید ہوئے ہوں گے اور انھیں ان تکلیفات اٹھانے کی قدر و منزلت جو اللہ کے ہاں ہو گی اس کے متعلق خبر پا کر اپنی خوش بختی پر رشک تو آیا ہوگا کہ چند دنوں کی مشکل کے بعد ان کی ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں گزرے گی۔ اور جناب رسول اللہ کے خطاب سے وہ لوگ ذہنی آسودگی حاصل کرنے کے بعد مطمئن ہو گئے ہوں گے اور اب وہ دشمن کے ساتھ نمٹنے کے لیے بھی پرجوش ہو گئے ہوں گے۔

دوسری طرف بازنطینی رومن یا ان کا کوئی حلیف دور دور تک نظر ہی نہ آ رہا تھا گویا کہ وہ مسلمانوں سے خوفزدہ ہو گئے تھے یا پھر انہوں نے مسلمان فوج کی پرواہ ہی نہ کی ہوگی، لیکن مسلمان بہرحال پرجوش اور تازہ دم تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رومیوں کو جنگ موتہ کا معرکہ بھی یاد آ گیا ہو جہاں مسلمانوں کے تین ہزار نے ان کی ایک لاکھ فوج کے دانت کھٹے کر دیے تھے اور اب تو

تین کے بجائے تیس ہزار کی فوج تھی اور وہ بھی جناب رسالت مآبؐ کی ذاتی سپہ سالاری میں۔

بہرحال یہ صورتحال ان قبائل کے لیے بہت ہی زیادہ متاثر کن تھی جو بازنطینی حکمرانوں کے زیر اثر عرب اور شام کی سرحد پر آباد تھے۔ یہ معاملہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی جانفشانی جو انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر کی تھی اس کا ایک صلہ تھا کہ انہیں جنگ کی مشکلات جھیلے بغیر اس علاقہ میں سبقت حاصل ہو گئی اور بازنطینیوں کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف قدم بڑھا سکیں۔ مزید یہ کہ ان کے حلیف قبائل بھی مسلمانوں کے تابع ہو گئے جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

(م) جنگ کے بغیر کامیابیاں:

مسلمان فوج نے بازنطینی اور عرب حدود کے درمیانی علاقے میں پڑاؤ ڈالا ہوا تھا جہاں کے مکین بازنطینی حکمرانوں کے زیر سایہ تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان اپنے مرکز سے اس قدر دور بازنطینی سرحد تک آ گئے ہیں اور اطمینان سے بیٹھے ان کی فوج کا انتظار کر رہے ہیں تو وہ ان سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اب بازنطینی حکمرانوں کو چھوڑ کر جناب محمدؐ کی سرپرستی قبول کر لیں۔ کیونکہ انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ مسلمان اتنی دور سے بھی ان کی مدد کے لیے آ سکتے ہیں جبکہ بازنطینیوں کو اتنے نزدیک ہو کر بھی ان لوگوں کی کوئی فکر نہیں۔ لہٰذا وہاں کے عیسائی حکمران بادشاہوں نے جن کا نام ایلیا اور یوحنہ تھا، جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کی راہبری قبول کرتے ہوئے آپ کو جزیہ دینا قبول کیا۔ ان دونوں کی دیکھا دیکھی جربہ اور اذروح نے بھی ایسا ہی کیا۔ جناب رسول اللہؐ نے ان حکمرانوں کو اپنی سرپرستی کے سلسلے میں ایک ایک خط ان کو دیا تاکہ ان کے پاس سند رہے کہ وہ مسلمانوں کے تابع ہیں۔ خط کے مندرجات درج ذیل ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ ایک ضمانت ہے حفاظت کی اللہ کی طرف سے اور محمدؐ جو اللہ کا رسول ہے اس کی طرف سے یوحنہ بن روبہ اور ایلیا کے لوگوں کے لیے کہ ان کے جہاز، کارواں، خشکی اور سمندر میں، اللہ اور اس کے رسول محمدؐ کی حفاظت میں ہوں گے۔ وہ (یوحنہ) اور جو کوئی بھی اس کے ساتھ ہوں گے شام کے لوگوں میں سے اور جو کوئی بھی سمندر والے ہوں گے۔

جو کوئی بھی اس معاہدے کو توڑے گا اس کی دولت اسے نہیں بچا سکے گی اور وہ اس کی ہو جائے گی جو اسے لے جائے گا۔ اب یہ جائز نہ ہوگا کہ کسی شخص کو کسی پانی کے چشمے یا ذخیرے سے روکا جائے جو ان کے علاقے میں ہوگا اور انہیں کسی بھی سفر سے نہ روکا جائے گا، جو وہ کرنا چاہیں گے سمندر یا خشکی کے راستے۔

وہاں کے صرف ایک سربراہ قبائل دومۃ الجندل کا چیف اکیدر دومۃ جناب رسالت مآبؐ کے پاس حاضر نہ ہوا۔ جس کے لیے جناب رسالت مآبؐ نے خالد بن ولیدؓ کو چار صد پچاس سواروں کے ساتھ روانہ کیا اور فرمایا کہ ''تم اسے پاؤ گے ایک سفید ہرن کا شکار کرتے ہوئے''۔ لہٰذا جب خالد نے اکیدر کو دیکھا اسی حالت میں تو اسے گرفتار کر لیا اور اس کی قیمتی سلک کی قباء اتروا کے جناب رسالت مآبؐ کے پاس پہنچوا دی۔ جب وہ قبا جناب رسالت مآبؐ کے پاس پہنچی تو صحابہ نے بڑی حیرانگی سے اسے دیکھا اور اسے ہاتھ لگا کر اور بھی حیرت کا اظہار کرنے لگے۔ اس پر جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ ''تم اس کو دیکھ کر اتنے زیادہ مرعوب کیوں ہو گئے ہو۔ اللہ کی قسم! آخرت میں سعد بن معاذؓ کا رومال اس قبا سے زیادہ قیمتی، ملائم اور دیدہ زیب ہوگا''۔ (ابن اسحاق)

جب اکیدر کو جناب رسول اللہؐ کے پاس لایا گیا تو اس نے بھی دوسروں کی طرح کی شرائط پر جناب محمدؐ کی سرپرستی قبول کر لی۔ چونکہ آپ نے اس کی زندگی اور سلطنت کو امان بخشی تھی تو اس نے اظہار تشکر کے طور پر آپؐ کی خدمت میں دو ہزار اونٹ، آٹھ صد مویشی، چار صد زرہ بکتر اور چار صد نیزے پیش کیے۔ جناب رسالت مآبؐ نے پھر اسے اس علاقے کا جزیہ کلکٹر مقرر فرمایا، اس علاقے میں دومۃ، تبوک، ایلیا، تیماء کی ریاستیں آتی تھیں۔

(ن) مسلمانوں کی مدینہ واپسی:

جناب رسالت مآبؐ تبوک میں بیس (۲۰) راتیں گزارنے کے بعد مدینہ واپس روانہ ہوئے۔ ان کے رب نے انہیں جو کچھ عطا فرمانا تھا عطا فرما دیا۔ اور انہیں کوئی جنگ نہ کرنی پڑی۔ لیکن واپسی کے دوران دو اہم واقعات پیش آئے جن کا ذکر کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔

(i) منافقین کا جناب رسول اللہؐ کے خلاف منصوبہ

اس موضوع سے پہلے بھی منافقین کا رویہ اور کردار تیں بیان کی جا چکی ہیں۔ ان میں سے

زیادہ تر تو اس مہم میں شریک ہی نہ تھے لیکن پھر بھی چند ایک نے شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اور وہ جناب رسالت مآبؐ کی زندگی کے خلاف منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کرتوتوں کے متعلق اچھی طرح سے آگاہی کرا دی تھی، لیکن پھر بھی انہوں نے جہنم کو ہی پسند کیا اور ایمان کی نعمتوں اور برکتوں کو ٹھکرا دیا۔ یہ بدبخت جناب رسول کریمؐ کو برا بھلا کہتے اور آپؐ کے صحابہ کو بھی، جب بھی یہ اکٹھے ہوتے تو تدبیریں کرتے کہ کس طرح سے جناب رسولؐ اللہ کی زندگی کے درپے ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو ہر چیز کا جاننے والا اور ہر چیز کا مالک ہے اس نے پھر ان منافقین کے ذلیل اور مکروہ ارادوں سے اپنے رسولؐ اور دوسروں کو بتا دیا اور اس لیے سورہ توبہ کی آیت (۷۴) کا نزول ہوا۔ جس میں فرمایا گیا کہ: "وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی خراب بات نہیں کی، لیکن حقیقت میں انہوں نے کفریہ الفاظ ادا کیے اور انہوں نے کفر کیا بعد اس کے کہ ایمان لائے۔ اور انہوں نے کوشش کی (جناب رسولؐ اللہ کے قتل کی) جسے وہ نہ کر سکے اور یہ ان کی طرف سے اس بات کا بدلہ تھا کہ ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے اللہ کے فضل سے غنی کر دیا تھا۔ سو اگر (اسکے بعد بھی) وہ توبہ کر لیں تو ان کے لیے (دونوں جہانوں میں) بہتر ہوگا اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور ان کا دنیا میں کوئی بھی یار و مددگار نہ ہوگا''۔

البیہقی نے لکھا کہ حذیفہ بن یمین نے کہا "کہ میں جناب رسولؐ اللہ کی اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے تھا جب کہ عمار رہبری کر رہا تھا جب ہم پہاڑی درے پر پہنچے تو بارہ (۱۲) سوار جناب رسول اللہ کی طرف گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے۔ جب میں نے جناب رسول اللہ کو خبردار کیا تو آپؐ ان پر چلائے اور وہ بھاگ لیے۔ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ کیا تم لوگ جانتے ہو کہ وہ کون لوگ تھے؟ ہم نے کہا نہیں یا رسول اللہؐ! انہوں نے نقاب پہن رکھے تھے، لیکن ہم ان کے گھوڑوں کو پہچانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا وہ لوگ منافق ہیں قیامت تک کے لیے۔ کیا تمہیں پتا ہے کہ ان کی نیت کیا تھی؟ ہم نے کہا نہیں، آپؐ نے فرمایا "وہ اللہ کے رسولؐ کو گھیر کر اگھاہ (یعنی پہاڑ کے درہ) سے گرانا چاہتے تھے۔ ہم نے کہا اے اللہ کے نبیؐ! کیا آپؐ ان کے قبیلے والوں کو کہیں گے کہ ان ہر ایک کا سر آپؐ کے سامنے پیش کیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں! مجھے

اس بات سے نفرت ہے کہ عرب کہیں کہ محمدؐ نے کچھ لوگوں کو جنگ میں استعمال کیا اور جب اللہ نے اسے کامیابی دی، ان کی مدد سے تو اس نے انہیں مروا دیا۔ آپؐ نے پھر فرمایا: اے اللہ! ان پر دبیلا پھینکے (یعنی آگ کا گولہ)۔

(ii) مسجد ضرار کا انہدام

مدینہ واپسی پر جناب رسول اکرمؐ ایک مقام ذوی طوان پر ٹھہرے۔ وہاں پر آپؐ نے مالک بن دخشام اور معان بن عدی کو بلوایا اور انہیں حکم دیا کہ مسجد ضرار کو جلا دیا جائے۔ اس واقعہ کی وجہ بیان کرنے کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ قبل از اسلام وہاں ایک شخص ابو عامر نامی رہتا تھا، جس کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا اور اس نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ جب رسولؐ اللہ مدینہ تشریف لائے تو اس کے بعد بھی عامر عیسائی ہی رہا۔ جب مسلمان طاقتور ہو گئے تو ابو عامر نے قریش مکہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا پھر جنگ احد کے بعد وہ عیسائی بادشاہ بازنطینی حکمران ہرکولیس کے پاس گیا اور اس سے جناب رسولؐ اللہ کے خلاف مدد کی درخواست کی، جس کے لیے بادشاہ نے وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے مدینہ اپنے لوگوں کو لکھا کہ وہ جلد ہی رسولؐ اللہ اور ان کے اصحاب پر قابو پا لے گا۔ اس لیے انہیں اس بات کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور اس کے لیے ابتدائی طور پر ایک جگہ کا بندوبست کر لینا چاہیے تاکہ وہاں یہ لوگ اپنی کارروائیوں کے لیے ایک دوسرے سے مل جل سکیں اور آپس میں صلاح و مشورہ کر سکیں۔ لہٰذا ان لوگوں نے مسجد قبا کے پیچھے ایک اور مسجد تیار کر لی اور پھر انہوں نے جناب رسولؐ اللہ سے درخواست کی کہ وہ اس مسجد میں آ کر نماز پڑھائیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح سے اس مسجد کی حیثیت جائز قرار دے دی جائے گی اور کوئی اعتراض نہ کر سکے گا۔ ان کا بہانہ تھا کہ یہ مسجد بوڑھے اور کمزور لوگوں کے لیے بنائی ہے تاکہ ان کا راستہ نزدیک ہو جائے۔ چونکہ اس وقت جناب رسالت مآبؐ تبوک کی تیاریوں میں مصروف تھے چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ میری واپسی تک میرا انتظار کرو۔ اسی دوران جناب رسالت مآبؐ کو سورۂ توبہ کی آیات (۱۰۷) اور (۱۰۸) میں اس مسجد کی بابت احکامات وصول ہو چکے تھے۔

یعنی: "اور ان کے لیے جنہوں نے ایک مسجد بنائی نقصان اور کفر کے لیے اور ایمان والوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے اور ایک ٹھکانہ بنایا ان کے لیے جو بغاوت پر آمادہ تھے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اس سے پہلے سے۔ یہ لوگ بلاشبہ قسمیں کھائیں گے کہ ان کی نیت اچھائی کے

علاوہ کچھ نہیں۔ اللہ گواہ ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ کبھی بھی آپؐ ان کے ساتھ کھڑے نہ ہوں۔ بے شک وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے تقویٰ پر رکھی گئی (مسجد قبا) وہ زیادہ حقدار ہے کہ آپؐ اس میں کھڑے ہوں (نماز کے لیے) اس میں وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو صاف اور پاک کرنے میں کوشاں رہتے ہیں، اور اللہ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم سورۃ توبہ کی آیت (۱۱۰) میں فرمایا کہ: "وہ عمارت جو انہوں نے بنائی وہ ہمیشہ منافقت اور شکوک پیدا کرنے کی آماجگاہ بنے گی ان کے دلوں میں یہاں تک کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں (یعنی وہ مر نہ جائیں) اور اللہ ہر چیز کی خبر رکھنے والا اور دانا و بینا ہے"۔

(iii) مدینہ واپسی

مسجد ضرار کو ٹھکانے لگانے کے بعد آپؐ اپنا لشکر لے کر مدینہ واپس پہنچے۔ جناب رسالت مآبؐ نے اُحد کو دیکھ کر خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا "ہم اُحد کو پیار کرتے ہیں اور یہ ہمیں"۔ جب مدینہ کے لوگوں کو آپؐ کی آمد کا پتا چلا، جو پچاس روز کے بعد واپس آئے تھے تو مدینہ کی تمام عورتوں، جوانوں، نوجوانوں اور بچوں نے مدینہ سے باہر آکر اپنی پیاری پیاری آوازوں میں جناب رسالت مآبؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کا استقبال کیا۔ جناب رسالت مآبؐ نے اپنا سفر تبوک اپنی مسجد پر ختم فرمایا اور دو رکعت ہمیشہ کی طرح صلوٰۃ شکرانہ ادا کی اور پھر حسب معمول لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

(۱۷۹) وفود کا سال

نویں ہجری ماہ اپریل، ۶۳۰ – ۶۳۱ء تک تقریباً تمام کا تمام ملک عرب جناب محمدؐ کی قیادت میں اسلام قبول کر چکا تھا۔ یہ تبدیلی اس وقت آئی جب قریش مکہ نے جناب رسالت مآبؐ کی قیادت کو قبول کر لیا تھا۔ اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے رومی بازنطینی سلطنت کے دروازے پر دستک دی جہاں پر صرف چند ایک قبائل نے اسلام قبول کرنے کے بجائے اسلامی سلطنت کے زیر اثر رہنا قبول کیا اور ساتھ ہی جزیہ دینا بھی۔ لیکن ایسے قبائل نے سنجیدگی کے ساتھ اسلام کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور اسے مزید جاننے کی غرض سے اپنے وفد مدینہ بھیجنے شروع کیے۔ ان وفود کی

کل تعداد کا تو تاریخ میں اندراج نہیں ملتا لیکن اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ کم از کم ساٹھ وفود جناب رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان وفود کے متعلق بہت کم لیکن بہت ضروری معلومات ملتی ہیں مثلاً وفد بنو تمیم، بنو قیس، بنو حنیف، اور نجران، یمن اور روس وغیرہ کے وفود۔

ان وفود کے لوگوں کی مسلمان حکمرانوں نے رضاکارانہ طور پر خاطر خواہ خاطر و مدارت کی، جبکہ ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا۔ مسجد میں ٹھہرانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ پانچ وقت مسلمانوں کا مسجد میں آنا، آپس میں ملنا جلنا، گفتگو اور عبادات کا طریقہ کار دیکھیں اور انہیں مسلمانوں کے طرز عمل کا اندازہ ہو سکے۔ مزید یہ کہ وہاں کس قسم کی گفتگو ہوتی ہے اور جناب رسالت مآبؐ سے لوگ کیا کیا سوالات کرتے ہیں اور آپؐ اپنے لوگوں کو کس طرح سے پند و نصیحت فرماتے ہیں اور کس طرح سے اللہ کے کلام اور اپنی دانش مندانہ گفتگو سے اپنے ساتھیوں کے قلوب کو منور فرماتے ہیں۔

اس طرح سے ان وفود کے بہت سے احباب آپؐ کے مواعظ سے متاثر ہوئے اور آپؐ کے ذاتی کردار اور برتاؤ سے مستفیض ہوئے۔ لیکن پھر بھی چند ایک، جیسے نجران کے عیسائی اپنے ہی مذہب پر قائم رہے۔ لیکن انہوں نے بھی جناب رسالت مآبؐ کی قیادت اور جزیہ دینا قبول کیا۔

ان وفود کے علاوہ جناب رسالت مآبؐ نے اپنے وفود بھی دور دراز علاقوں میں بھجوائے تاکہ وہ اللہ اور اس کے پیغمبر کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیں۔

(۱۸۰) مدینہ میں نظام حکومت کا قیام

کسی بھی مملکت کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا انتظام چلانے کے لیے ایک ادارہ ہو جسے حکومت یا گورنمنٹ کہا جاتا ہے جس کا بنیادی کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس مملکت میں قوانین کا اجرا کرے اور پھر ان قوانین کا اس مملکت کی حدود میں مملکت کے لوگوں پر اطلاق کرے اور ان کی خلاف ورزی پر ان کی سرزنش کرے۔ اس کے علاوہ بہت اہم کام یہ کہ مملکت کی معاشی حالت کو بہتر بنانا اور اس کے لیے لوگوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسے ذرائع پیدا کریں اور آپس میں مل کر ان ذرائع کو ایک جگہ حکومت کی نگرانی میں جمع کریں تاکہ مملکت کے کاروبار کو ٹھیک طریقے سے چلایا جا سکے، دوسرے لفظوں میں حکومت کے خزانے کا قیام۔ تیسری بات یہ کہ لوگوں کا ایک گروہ مملکت کے اندرونی نظام کو چلانے کے لیے اور اس کی حفاظت کے لیے

مقرر کیا جائے۔ جبکہ مملکت کو بیرونی خطرات سے بچانے کا فرض ہر بالغ اور تندرست فرد پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ تمام معاملات طے کرنے ہوں گے تو مملکت کے لیے ایک سربراہ کا ہونا بھی ضروری امر ہوگا۔ جس کی قیادت میں تمام امور امانت اور دیانت کے اصولوں کے ساتھ بخوبی طے پائیں۔ قوانین کی پابندی اور انصاف مہیا کرنے کے لیے مناسب انتظام کیا جائے، یعنی قاضیوں کا خاطر خواہ بندوبست کیا جائے۔

یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے اپنے لوگوں کی راہبری اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق کی اور معاشرے کو انہی قوانین کے مطابق چلایا اور اللہ کے حکم کے مطابق ہی اس معاشرے میں بھائی چارہ، انصاف، برابری، ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کی دیکھ بھال اور مدد رائج کی۔ معاشرے میں اخلاقی رواداری، شرم اور حیا اور ایک دوسرے کے لیے عزت کی فضا قائم کی۔ مملکت کو محفوظ رکھنے کے لیے جہاد فرض کیا گیا اور اپنی مال و دولت کو اپنے بھائیوں کے لیے خرچ کرنا سکھایا گیا۔ اور اپنی آمدنی میں سے اڑھائی فیصد ہر سال مملکت کے خزانے میں عوام کی فلاح کے لیے جمع کرنا فرض کیا گیا۔ مملکت کے لوگوں کو طمع، لالچ اور حرص سے پاک رکھنے کے لیے سود اور جوئے کو منع کیا گیا، نشے کو حرام کیا گیا، زنا کو منع کیا گیا، تاکہ مملکت برائیوں سے پاک رہے اور لوگ امن و سکون کے ساتھ رہ سکیں۔

سماجی بہبودی اور باہمی تعلقات اور ایک دوسرے کی دیکھ بھال کے لیے پانچ وقت مسجد میں جانا ضروری کر دیا گیا، تاکہ لوگ ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہ سکیں اور بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ سال میں ایک ماہ روزے رکھنے فرض کیے گئے تاکہ لوگوں میں بھوک اور پیاس کا احساس اس طرح سے ہو جائے کہ وہ غریبوں اور مساکین کو اپنے کھانے کا کچھ حصہ دے کر ان کی بھوک اور پیاس مٹائیں اور اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

مختصر ترین الفاظ میں مملکت کے پورے نظام اور مقصد کو بیان کر دیا گیا ہے کہ اس مقصد کے لیے مملکت کا انتظامی معاملہ اور امور اچھی طرح سے چلیں۔ لوگوں کے سماجی تعلقات اور بھائی چارے کی فضا قائم رہے، امن قائم رہے لوگ خوشحالی کے ساتھ زندگی گزاریں اور مملکت بیرونی خطرات سے محفوظ رہے۔ ان سب مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جناب رسولؐ اللہ نے درج ذیل تدابیر اختیار کیں:

الف) ہر قبائلی علاقے میں انہی لوگوں میں سے ان لوگوں پر با اختیار ناظم مقرر کیے۔ یہ لوگ ان میں پہلے سے ہی با اختیار اور ہر دل عزیز تھے اور انتظامی امور چلانے کے لیے بہتر سمجھے گئے تھے۔ ان لوگوں میں سے ہی لوگ اس لیے منتخب کیے گئے کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ حکومت کا اختیار کسی بیرونی شخص کو نہیں بلکہ ان کے اپنے ہی کو دیا گیا ہے تاکہ وہ اس کی حکمرانی خوشی سے قبول کر لیں۔

ب) آپؐ نے کچھ اہلِ علم کو ان علاقوں میں استاد مقرر کیا تاکہ وہ علاقے کے لوگوں کو دینی اور سماجی علوم کی تعلیم دے سکیں۔ تاکہ ان لوگوں کو سماجی اور اخلاقی اقدار اور قوانین کا پتا چل جائے اور وہ اپنے معاشرے کو پرامن رکھ سکیں۔

ج) آپؐ نے ان علاقوں میں قاضی مقرر کیے تاکہ وہ عوام کے سماجی جھگڑوں اور معاملات کو طے کر سکیں اور حکومت کے قوانین اور سماجی قوانین کی پابندی کرا سکیں۔

د) آپؐ نے زکوٰۃ اور جزیہ کلکٹر مقرر فرمائے اور حکومت کے خزانے کی بنیاد رکھی۔

جناب رسالت مآبؐ نے حکومت کے تمام کارندوں کی ماہوار تنخواہ مقرر کی اور اس کے علاوہ ان کی مراعات کے متعلق بھی انہیں آگاہ کر دیا۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے آپؐ نے مکہ کے گورنر عتاب بن اُسید کی تنخواہ ایک درہم روزانہ مقرر کی۔ لیکن عمومی طور پر آپؐ نے سرکاری ملازمین کو یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنے معاملاتِ زندگی بہت سادگی کے ساتھ سرکاری خزانے سے پورے کر لیں۔ یعنی ان کے پاس اپنا گھر نہیں تو وہ رہنے کی جگہ لے لیں، سواری کا جانور لے لیں اگر شادی شدہ نہیں اور ان کے پاس مہر ادا کرنے کی رقم نہیں ہے تو وہ مہر کی رقم لے لیں۔

یہ مراعات اس وجہ سے انہیں دی گئی تھیں کہ ان کے پاس رشوت لینے کا یا تحائف وصول کرنے کا کوئی جواز باقی نہ رہے۔ اور ان کی اور ان کے گھر والوں کی گزر بسر سادگی کے ساتھ اور عزت کے ساتھ ہوتی رہے اور وہ کسی طور پر کسی کے محتاج نہ رہیں۔ اور اپنی خدمات دیانتداری اور پوری لگن کے ساتھ ادا کر سکیں اور وہ حکومت کے خزانے اور حکومت کی املاک کے سچے امین بن سکیں اور انصاف قائم کر سکیں اور رشوت کی طرف ان کا دھیان تک نہ جائے۔

(۱۸۱) جناب رسالت مآبؐ کی اپنی ازواج سے علیحدگی

امام بخاریؒ نے ام المومنین سیدہ عائشہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جناب رسولؐ اللہ ان

کے پاس تشریف لائے جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا کہ وہ اپنی ازواج کو موقع دیں اس دنیا یا آخرت کا۔ سیدہؓ نے فرمایا کہ "اللہ کے رسولؐ نے مجھ سے اس بات کا سلسلہ شروع کیا اور فرمایا کہ "میں تمہیں ایک بات کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں اور تمہیں اس کے فیصلے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے اور اس بارے میں اپنے والدین سے مشورہ کر لینا چاہیے"۔

پھر آپؐ نے سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۲۸) اور (۲۹) کی تلاوت فرمائی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہہ دو! اگر تم اس دنیا کی زندگی کی تمنا رکھتی ہو اور اس کی چمک دمک کی تو آؤ! میں تمہارے لیے اس کا بندوبست کر دوں اور تمہیں اچھی طرح سے آزاد کر دوں۔ لیکن اگر تم چاہتی ہو اللہ اور اس کے رسولؐ کو اور آخرت کے گھر کو تو پھر بے شک اللہ نے تیار کیا ہے بہت اچھا انعام تم میں سے ان کے لیے جو بھلائی اختیار کریں گی"۔

اس کے بعد سیدہ صدیقہؓ نے آپؐ کو جواب دیا کہ "مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اس سلسلے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟ میں تو چنتی ہوں اللہ اور اس کے رسولؐ کو اور آخرت کے گھر کو"۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ "جناب رسالت مآبؐ کی تمام ازواج نے اسی طرح سے کہا جیسے میں نے کہا"۔

اس سوال کی نوبت اس وقت آئی جب کہ نبیؐ کی ازواج نے کچھ بہتر زندگی گزارنے کے ذرائع کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ فتح خیبر، فتح مکہ اور حنین کے بعد مسلمان مملکت اور مسلمانوں کی عام طور پر معاشی ابتری ختم ہو گئی تھی اور مناسب خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ لیکن جناب رسولؐ اللہ اور آپ کے گھر والے اسی غربت میں ہی زندگی بسر کر رہے تھے آپؐ کی ہر زوجہ ایک جھونپڑی نما گھر میں قیام پذیر تھی، جس کی پتھروں کی چھوٹی چھوٹی دیواریں جو گارے اور چونے سے کھڑی کی گئی تھیں بہت نیچی سی چھت جو کھجور کی شاخوں سے بنی ہوئی تھی۔ ان گھروں میں روشنی کے لیے کوئی لیمپ نہ تھا نہ کوئی گدہ اور نہ کوئی بچھونا۔ بلکہ جھونپڑی کا کچھ حصہ کھجور کی چٹائی سے ڈھکا ہوا۔ جناب رسالت مآبؐ کے صرف ایک گھر میں ایک چمڑے کا تکیہ تھا اور وہ بھی کھجور کے درخت کے پتوں سے بھرا تھا۔

اس بات کی کوئی سند نہیں ملتی کہ کبھی بھی جناب رسالت مآبؐ نے اپنی پوری زندگی میں نرم روٹی کا کوئی لقمہ اپنے دہن مبارک میں ڈالا ہو۔

بخاریؒ اور مسلمؒ نے لکھا ہے کہ سیدہ عائشہؓ نے فرمایا کہ وہ خود اس بات کی گواہ ہیں کہ تین

متواتر ہلال گزر جاتے یعنی تین ماہ گزر جاتے کہ آپؐ کے کسی بھی گھر میں چولہا نہ جلتا۔ عروہ بن زبیرؓ نے سیدہؓ سے سوال کیا کہ پھر آپ کس چیز پر گزارا کرتیں؟ تو انہوں نے فرمایا دو سیاہ اشیاء پر یعنی کھجور اور پانی۔ عام مسلمانوں کی حالت بھی تقریباً ایسی ہی تھی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل و کرم فرمایا فتوحات کے بعد تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل و کرم سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دے دی لیکن اس میں سے ضائع کرنے کو منع کیا۔

اس سلسلے میں سورۃ الاعراف (۷) کی آیات (۳۱) اور (۳۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اے اولادِ آدم! جب صلوٰۃ کے لیے آؤ یا طواف کعبہ کے لیے تو اچھا لباس زیب تن کرو، کھاؤ اور پیو، لیکن فضول ضائع نہ کرو، بے شک وہ (اللہ) فضول خرچوں کو پسند نہیں فرماتا۔ کہو (اے محمدؐ) کس نے منع کی ہیں یہ پہننے کی اچھی چیزیں جو اللہ نے دی ہیں جو اس نے بنائی ہیں اپنے بندوں کے لیے خالص اور اچھی چیزیں (حلال اشیاء) کھانے کے لیے۔ کہو! وہ دنیا کی اس زندگی میں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان والے ہیں (اور) خاص طور پر ان کے لیے (ایمان والوں کے لیے) قیامت کے دن۔ پس ہم (اللہ) بیان کرتے ہیں ہمارے احکامات تفصیل کے ساتھ ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں"۔

حالانکہ عام مسلمانوں کی مالی حالت بہتر ہو چکی تھی لیکن جناب رسول اکرمؐ اسی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے جیسے کہ عسرت کی حالت میں کرتے تھے۔ آپؐ پسند نہیں فرماتے تھے کہ وہ خود اور ان کے گھر والے زندگی کے عیش و آرام کے دلدادہ ہو جائیں۔ کیونکہ آپؐ نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی قربت ہی پسند کی ہے اور آخرت کے ہمیشہ کے آرام اور خوشی کو۔ اس لیے آپؐ کو یہ بات پسند نہ آئی کہ آپؐ کی ازواج دنیا کی آسائش کی طلب یا خواہش رکھیں، اس لیے آپؐ نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد جب ایک ماہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بابت اپنا حکم صادر فرمایا، جو سورۃ احزاب کی آیات (۲۸) اور (۲۹) میں بیان کیا گیا ہے۔

(۱۸۲) اللہ تعالیٰ نے ازواج رسولؐ کے درجات و مراتب بلند فرما دیے

جب اللہ تعالیٰ نے ازواج رسولؐ کو یہ اختیار دیا کہ وہ دنیا کے آسائشات یا آخرت کی زندگی

میں سے کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کر لیں تو امہات المومنین نے اس بات کو پسند فرمایا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہی منتخب کریں اور آخرت کو پسند کریں۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کے لیے خاص قوانین کا نفاذ فرمایا اور امت مسلمہ میں تمام ازواج کے مراتب بلند فرمادیے۔ یہ مراتب اس وقت کے لیے بھی تھے اور رہتی دنیا تک رہیں گے اور مقام آخر کے مراتب کی تو خیر بات ہی کیا وہ تو کسی کے خواب و خیال میں بھی سا نہیں سکتے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب (۳۳) کی آیات (۳۰) تا (۳۴) میں ان قوانین اور احکامات کی وضاحت فرمائی ہے۔ جو درج ذیل ہے:

۱) ”اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی بھی ناشائستگی کا مظاہرہ کرے گی یا اپنے کردار کے اعتبار سے ناپسندیدہ ہو گی تو اس کی سزا دوگنی ہو گی اور یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے“۔ (آیت ۳۳/۳۰)

امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ”کردار کی ناپسندیدگی“ کے لیے اس آیت میں ”فاحشۃ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے معنی اور استعمال کے اعتبار سے ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہاں پر فاحشۃ کا مطلب ”نشوز“ ہے یعنی ”ناپسندیدہ رویہ“ جبکہ عام طور پر اس کا مطلب بدکردار ہوتا ہے۔

۲) ”اور تم میں سے جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی تابعدار ہے اور نیک کام کرتی ہے اور اچھے اعمال رکھتی ہے، ہم (اللہ) اسے انعام عطا فرمائیں گے دوگنا۔ اور ہم نے تیار رکھا ہے اس کے لیے اعلیٰ قسم کا رزق“۔ (۳۳/۳۱)

۳) ”اے نبی کی بیویو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم تقویٰ اختیار کیے رکھنا چاہتی ہو تو اپنی گفتگو میں لجاجت نہ پیدا کرو، ایسا نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بیماری ہو اور اس کے دل میں فاسد خیال نہ پیدا ہو جائے۔ اس لیے پر وقار لہجے میں گفتگو کرو“۔ (۳۳/۳۲)

۴) ”اور اپنے گھروں میں چین و اطمینان سے رہو اور اپنے آپ کو اس طرح سے مت دکھاؤ جس طرح سے زمانہ جاہلیت میں عورتیں کرتی تھیں اور صلوٰۃ کا قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے ہر غلاظت کو دور رکھے۔ اے پیغمبر کے گھر والو (اللہ) تمہیں پاک رکھنا چاہتا ہے ظاہر و باطن سے“۔ (۳۳/۳۳)

۵) ”اور یاد رکھو جو تمہارے گھر میں تلاوت کی جاتی ہیں، اللہ کی طرف سے نازل شدہ آیات اور دانشمندانہ حکایات۔ بے شک اللہ بڑا مہربان اور ہر چیز سے باخبر ہے“۔ (۳۳/۳۴)

۶) اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے ازواج پیغمبرؐ کو مومنین کی ماؤں کا درجہ عطا فرمادیا۔ اور اس لیے انہیں کسی اور سے نکاح کرنے کا حق نہ رہا، پیغمبرؐ سے نکاح کے بعد۔ بے شک یہ قانون اللہ نے اس لیے نافذ فرمایا تھا کہ لوگ اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیں، تسلیم کر لیں اور اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیں کہ جناب نبی علیہ والسلام کی ازواج کا کیا مرتبہ، عزت اور درجہ ہے اور ہمیں ان کی اسی طرح سے عزت کرنی چاہیے اور ویسا ہی احترام ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے جیسے اپنی ماؤں کا، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سورہ احزاب (۳۳) کی آیت (۶) میں نازل ہوا جو درج ذیل ہے ”نبی ان ایمان والوں کے اپنے نفس سے بھی زیادہ قریب ہیں اور ان کی بیبیاں ایمان والوں کی مائیں ہیں“۔ (۳۳/۶)

(۱۸۳) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی مزید عزت افزائی فرمائی

اللہ جو بہت قدردان اور نہایت مہربان ہے، اس نے اپنے نبیؐ کی ازواج کی عزت افزائی فرمانے کے بعد اپنے نبیؐ کی مزید قدردانی فرمائی اور اپنی مہربانیوں اور عنایتوں کے سلسلے کو بڑھاتے ہوئے آپؐ کی مزید عزت افزائی فرمائی۔ وہ اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان والے بندوں کے ایمان کو اپنے رسولؐ کی محبت و احترام سے مشروط کرتے ہوئے فرائض کے درجے تک پہنچا دیا اور ہر ایک مومن پر لازم کر دیا کہ وہ جناب رسالت مآبؐ کی جان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز جانے۔ اس کا مطلب یوں سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی پہچان، ایمان اور مکمل اطاعت اور تابعداری کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسولؐ کی محبت، احترام اور تابعداری بھی لازم ہے ورنہ ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔

یہی نظریہ یعنی جناب رسولؐ اللہ سے اپنی جان سے زیادہ محبت کرنا صوفی طریقہ کار میں اللہ کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ بتلایا گیا ہے اور صوفی اس طریقے کو ”فنائی الرسول“ کے نام سے جانتے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو رسولؐ اللہ کی محبت میں ختم کر دینا اور یہ طریقہ کار صوفی طریقہ ”فنائی

اللہ" کے مقابل معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کی محبت میں اپنی ذات کو ختم کر دینا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی محبت یا رسولؐ کی محبت کو اپنی ذات کا محور و مرکز بنا کر غور و فکر کرنا اور اپنی زندگی بسر کرنا۔

اس کا طریقہ کار یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی محبت ہی میں فنا ہونے کے لیے اللہ کا ذکر ہمہ وقت ہمیں اس منزل پر لے جاتا ہے جہاں مومن کے دل میں سوائے اللہ کے کوئی نہیں ہوتا اور دوسری طرف اللہ سے یہ التجا کرتے رہنا ہمہ وقت کہ اللہ اپنے نبیؐ پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اور سلامتی فرماتا رہے تو یہ طریقہ کار ہمارے دل میں نبیؐ کی محبت کے علاوہ کچھ نہیں رہنے دیتا۔ اور یہ دونوں مشقیں پوری زندگی جاری و ساری رکھنی پڑتی ہیں۔

لیکن تیسرا امر واقع یہ ہے کہ ہم اللہ کی محبت اس وقت تک پا نہیں سکتے جب تک کہ ہم رسول اللہ کی محبت میں گم نہ ہو جائیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیا اور وہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم اس کی اطاعت یعنی نبیؐ کے احکامات کی پابندی نہیں کریں گے نبیؐ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے کے علاوہ۔

اس سلسلے میں سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۶) میں فرمایا گیا ہے کہ "نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں"۔

یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں پر یعنی ایمان والوں پر نبیؐ کا حق، ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ ہے، اس لیے آپؐ کی اطاعت اور تعظیم ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہے، نبیؐ کا نہیں۔ اس لیے اس حکم کی اہمیت کا اندازہ لگانا بھی ہمارا فرض بنتا ہے۔

اس آیت کے حوالے سے امام بخاریؒ نے عبداللہ بن ہاشم کی روایت نقل کی ہے جنھوں نے فرمایا کہ "ہم لوگ نبیؐ کے ساتھ تھے اور آپؐ جناب عمرؓ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ اس وقت جناب عمرؓ نے عرض کیا یا اللہ کے نبیؐ! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں سوائے اپنی جان کے"۔

جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "نہیں! اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں تمہیں تمہاری جان سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں"۔

اس پر جناب عمرؓ نے آپؐ سے عرض کیا "اللہ کی قسم! آپؐ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں"۔

جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "اب، اے عمرؓ! تمہارا ایمان مکمل ہو گیا"۔

سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۶) کے ساتھ خاص تعلق رکھتی ہوئی اسی سورۃ کی آیت (۵۶) جس میں ہر ایمان والے پر جناب رسولؐ اللہ کے بارے میں آیت (۶) کی طرح سے ایک اور حکم دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایمان والے کو اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کرنا چاہیے یعنی دعا مانگنی چاہیے کہ وہ اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے رسولؐ اللہ پر اور ان کے ساتھ ہی ان لوگوں پر جو ان پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں یعنی امت رسولؐ اللہ۔

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "بے شک اللہ بھیجتا ہے اپنی صلوٰۃ (یعنی رحمتیں، برکتیں، عزت اور رحم) اور اس کے فرشتے بھی ان نبی پر (محمدؐ پر)۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر صلوٰۃ بھیجا کرو اور سلام"۔

اس آیت مبارکہ میں اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ کا سلام اور رحمتیں بھیجنا اور فرشتوں کا سلام اور برکتیں بھیجنا اور مومنین کا سلام اور رحمتیں بھیجنا یہ مختلف امور ہیں، اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک و بابرکت تو رحمتوں، برکتوں، عزت و رحم کا منبع ہے لیکن نہ تو فرشتے اور نہ ہی انسان۔ کیونکہ یہ دونوں مخلوقات تو بذات خود رحمتوں اور برکتوں کی محتاج ہیں اور اس امر کے لیے ہمیشہ اللہ ہی کی طرف ان کی نظر رہتی ہے کہ اللہ ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے تو پھر اس حالت میں وہ دونوں کیوں کر اپنے سے زیادہ فضیلت رکھنے والے اللہ کے بندے اور رسول پر رحمتیں اور برکتیں بھیج سکتے ہیں؟ اور جب وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسا کرنے کے لیے کیوں کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے نبیؐ کو فرشتوں اور انسانوں کے سامنے زیادہ معزز دیکھنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے پیارے بندے کو فرشتے اور دیگر انسان عزت اور قدر سے دیکھیں اور ان کا ذکر کریں۔ لیکن چونکہ ان کی استطاعت نہیں ہے کہ وہ ان پر صلوٰۃ یا سلام بھیج سکیں اس لیے وہ اللہ کے حکم کی تکمیل کرنے کے لیے اللہ سے ہی درخواست کرتے ہیں کہ اے اللہ ان نبیؐ پر اپنی طرف سے صلوٰۃ یعنی رحمتیں، برکتیں اور عزت وغیرہ اور سلام یعنی سلامتی بھیج۔ یہ دعا فرشتے بھی کرتے ہیں اور انسانوں پر بھی اسی طرح جناب رسولؐ اللہ کے لیے دعا کرنا واجب ہے۔ اس عمل کو فارسی اور اردو زبان میں "درود شریف" کہا جاتا ہے۔ جس کا صحیح مطلب عام طور پر لوگوں کو نہ تو سمجھایا گیا ہے اور نہ ہی وہ زیادہ تر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان دو آیات مبارکہ کے علاوہ ایک اور آیت بھی قابل ذکر

ہے اور وہ ہے سورۃ النساء (۴) کی آیت (۶۵) جس میں کہا گیا ہے کہ "لیکن نہیں! تمہارے رب کی قسم! ان کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تمہیں اپنا منصف نہ بنا لیں اپنے ہر جھگڑے میں اور معاملے میں اور وہ تمہارے فیصلے پر ذرہ برابر بھی اختلاف نہ کریں اور آپؐ کے فیصلے کو پورے ادب اور احترام کے ساتھ قبول کر لیں"۔

بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے آپ کو دنیا کی محبت اور دنیا کی دلچسپیوں میں گم کر رکھا ہے لیکن ساتھ ہی ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کے دعویدار بھی ہیں۔ حالانکہ اطاعت کے اعتبار سے ہم ان کی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ ہم تو صرف مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہم لفظ مسلمان کا تو مطلب ہی نہیں سمجھتے اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کے معنی کو جانتے ہیں۔ کیونکہ صرف مسلمان کہہ دینے سے ہی ایک بندہ اپنے مالک کی غلامی کا اقرار کر لیتا ہے اور مسلمان کا مطلب ہی ہے کہ "جو اپنے رب کے حکم کے سامنے اپنی گردن رکھ دے" اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کا مطلب بھی ایسا ہی ہے کہ "وہ جو اپنی تمام زندگی اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی اطاعت میں گزار دے"۔

اس مضمون پر شیخ اقبال کا ایک شعر یہاں پر کوٹ کرنا ضروری سمجھا جا رہا ہے فرماتے ہیں:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم

کہ دانم مشکلات لا الہ را

یعنی ایک اہل عقل کے لیے اپنے آپ کو مسلمان کہلوانا بہت بڑی بات ہے اور اہل دانش تو جب یہ سوچتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں، تو لرز جاتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب وہ مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں تو اسی وقت وہ اپنے گلے میں اللہ کی غلامی کی جوت پہن لیتے ہیں اور پھر وہ ہر لمحہ کی نفی کرتے ہیں اور سارے زمانے کی دشمنی مول لے لیتے ہیں کیونکہ اللہ کی جوت پہن کر ان کی اپنی ذات کی بھی نفی ہو جاتی ہے اور ان کی میں مر جاتی ہے وہ صرف اللہ کے حکم کے بندے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ صرف ایک لفظ اگر وہ سمجھ لیں تو ان کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کوئی آسان بات نہیں جو ہم اپنے منہ سے نکالتے ہیں۔ صرف ایک لفظ کہنے سے بہت بڑی ذمہ داری ہمارے اوپر آ جاتی ہے۔ کیا ہم اپنے ساتھ مذاق نہیں کرتے؟ مسلمان ہونے کا دعویٰ تو

کرتے ہیں لیکن ہیں نہیں۔

ان سب باتوں کے برعکس ابلیس اپنے شیطانی کاموں میں لگا ہوا ہے۔ وہ انسان کو گمراہ کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا ہے کبھی اس کی تعریف کر کے اس کو متکبر بنا دیتا ہے، کبھی اسکو علم سے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی اس کے دل میں ماسوا اللہ کی محبت ڈال دیتا ہے اور کبھی اللہ کے پیاروں سے پیار کا سہارا لے کر ان سے شرک کرا دیتا ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بت پرستی کا رواج پیغمبروں اور اللہ کے نیک بندوں کی محبت میں ہی شروع ہوا۔ کیونکہ لوگوں نے پیغمبروں اور اولیاء کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا اور اس طرح گمراہی میں پڑ گئے اور پھر نے اللہ کے بجائے ان سے مدد مانگنی شروع کر دی۔ جنگ بدر میں جب مسلمان اور کافر میدان جنگ میں آمنے سامنے آئے تو جناب رسولؐ اللہ اپنے مالک کو "یا حی یا قیوم" کے اسماء سے پکار کر مدد طلب کر رہے تھے جبکہ آپ کے اصحاب "یا احد یا احد" اور "یا غوث یا غوث" یعنی اے اکیلے، مدد کرنے والے پکار کر مدد طلب کر رہے تھے۔ جبکہ بعد کے مسلمانوں نے اولیاء اللہ کو غوث نہیں بلکہ غوث اعظم کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ یہ بات غور طلب ہے یا کہ نہیں اس کا فیصلہ آپ خود کریں۔

اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے محبت کے ضمن میں ہمارے پاس ایک بہت اچھی مثال جناب عمر فاروقؓ کی ہے، کہ جب جناب رسولؐ اللہ نے ان سے پوچھا کہ انکو آپؐ سے کتنی محبت ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہر ایک سے زیادہ سوائے اپنی ذات کے۔ لیکن جب رسولؐ اللہ نے ان کا جواب سن کر یہ فرمایا کہ ان کا ایمان مکمل نہیں ہوا تو فوراً ہی اسی لمحے جناب عمرؓ نے عرض کیا کہ اب اپنی جان سے بھی زیادہ آپؐ سے محبت ہے۔ تو اس جواب پر جناب رسولؐ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے عمر! اچانک تمہیں مجھ سے اس قدر محبت کیسے ہو گئی؟ جبکہ ایک لمحہ قبل تو ایسی بات نہ تھی۔ بلکہ آپؐ نے جناب عمرؓ کے ایمان کے مکمل ہونے کی تصدیق فرما دی۔

دراصل معاملہ یوں تھا کہ نہ تو جناب عمرؓ کو اچانک جناب رسولؐ اللہ سے محبت ہو گئی تھی اور نہ ہی انہوں نے اپنا بیان یکایک تبدیل کیا اور نہ ہی جناب رسولؐ اللہ کے کہنے پر کہ "ان کا ایمان ابھی نامکمل ہے" کی وجہ سے محبت ہو گئی، بلکہ جناب عمرؓ کے کیے بعد دیگر دونوں بیان درست تھے اور دیانتدارانہ طریقے سے دیے گئے تھے۔ یعنی کہ آپ کا پہلا بیان ان کی جبلی خصوصیات کے مطابق تھا اور سچ تھا، جبکہ ان کا دوسرا بیان حقیقی بنیاد پر یعنی حقائق پر مبنی تھا اور وہ بھی درست تھا۔

یعنی حقیقت حال یہ تھی کہ ہر جاندار فطری طور پر اپنی جان کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتا ہے اور یہی فطری جواب تھا جناب عمرؓ کا۔ لیکن جناب رسول اللہؐ کے یاد دلانے پر انہیں فوری طور پر احساس ہو گیا کہ انہیں بھی ہر جاندار کی طرح فطری طور پر اپنی جان تو عزیز ہے تمام دوسروں کی نسبت لیکن جناب رسول اللہؐ کی نسبت ایسی بات حقیقت میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ان کے حکم پر ان کی ذات کے لیے ہمہ تن اور ہمہ وقت اپنی جان کا نذرانہ دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ بلکہ اپنی جان کے علاوہ وہ اپنی دولت، اپنی طاقت، اپنا آرام، اپنا گھر گویا کہ ہر چیز کو جناب رسول اللہؐ پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے اور یہ سب کچھ وہ آپؐ کی خوشنودی اور محبت حاصل کرنے کے لیے ہی کرتے تھے۔

چنانچہ اس مثال کے ذکر کا مقصد یہ بتانا مقصود تھا کہ اللہ اور اللہ کے رسول سے محبت کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کیا جائے اور ان کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے اور اطاعت اور فرمانبرداری ہی محبت کا پیمانہ ہوتا ہے۔

ایک بات اور سمجھ لینا ضروری ہے، کہ اللہ کے رسولؐ سے محبت کا دراصل مطلب و مقصد اللہ ہی سے محبت ہے، کیونکہ رسولؐ اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتے، نہ ان کا اپنا کوئی لالچ ہوتا ہے۔ وہ تو صرف اللہ ہی کی خاطر، اللہ کا حکم ہم تک پہنچاتے ہیں اور ان سے محبت کا حکم بھی اللہ نے ہی ہمیں دیا ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ کا حکم ماننا اور ان سے محبت کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ کا حکم ماننا اور اللہ ہی سے محبت کرنا۔

(۱۸۴) تصوف کا مختصر تجزیہ

تصوف کے بنیادی مضمون رہے ہیں "اللہ سے محبت" اور "اللہ کے رسولؐ سے محبت"۔ یہ دونوں مضامین مسلمان صوفیوں کے بنیادی نقطے رہے ہیں۔ جبکہ درویشی دوسرے مذاہب کے لوگوں نے بھی اختیار کی مثلاً گوتم بدھ، گرو نانک وغیرہ اس کے علاوہ بہت سے ہندو، یہودیت اور عیسائیت کے پیروکاروں نے بھی۔ لیکن ہم یہاں پر صرف مسلمانوں کے نظریہ تصوف پر ہی گفتگو کریں گے۔ حالانکہ تصوف کے نظریے متوازی چلتے ہیں، لیکن ان کا مقصد اور محور علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ عام طور پر صوفی اپنے مرکز ہی کی طرف مائل پرواز ہوتا ہے اور اس کا مرکز اللہ کی ذات ہوتی ہے

لیکن اسے پانے کے لیے ہر مکتبہ فکر و مذہب کے صوفی علیحدہ علیحدہ راستے اختیار کرتے ہیں۔

ہم بنیادی طور پر یہاں تصوف کے نظریے کو قرآن اور سنت کے پیرائے میں دیکھیں گے، کہ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے اور جناب رسول اللہؐ نے کہاں تک اپنی زندگی میں تصوف کو اپنایا۔ اگر کچھ ایسا ہے تو پھر تصوف کو قرآن اور سنت کے حوالے سے کیوں نہ پیش کیا جائے اور اسے ویسے ہی اپنایا جائے۔

چونکہ پچھلے مضمون میں جن قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے یعنی سورۃ احزاب کی (۶) اور (۵۶) اور سورۃ النساء کی (۶۵) یہ آیات کسی نہ کسی طرح سے تصوف کی بنیاد رہیں یا نظریہ تصوف کے ایک پہلو کی بنیاد ان آیات کے مضمون پر رکھی گئی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ تصوف کے بارے میں بھی کچھ گفتگو کر لی جائے۔ کیونکہ تصوف میں بہت سے ابہام اور غلط فہمیاں اور غلط نظریات، حکایتیں اور عقائد پیدا ہو گئے ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے اقوال کے منافی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس امر کا جائزہ لیں کہ مروجہ تصوف میں کہاں تک دین یعنی قرآن اور سنت سے مطابقت ہے اور کہاں تک اختلاف۔

صوفیانہ طرز عمل کی تاریخ اور فلسفہ بہت قدیم ہے اور اس طرز عمل کا عام طور پر یہ مقصد رہا ہے اور ہوتا ہے کہ مالک کائنات کی محبت اور قربت اختیار کی جائے اور دنیا کے تمام معاملات، کاروبار اور تعلقات کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ اور اسی نظریہ پر مسلمانوں کے ہاں بھی صوفی طریقے کی بنیاد پڑی۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک مسلمان کی بنیادی طور پر یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی محبت اور قربت کو حاصل کرے، لیکن تقویٰ اور پرہیزگاری کے ذریعے۔ اس لحاظ سے تو مسلمانوں میں سے سب سے پہلے اور سب سے بڑے صوفی تو خود جناب رسول اکرمؐ ہوئے۔ کیونکہ ان سے زیادہ تو کسی نے بھی اللہ کا حکم نہیں مانا اور نہ ہی ان سے زیادہ کسی نے اللہ سے محبت کی اور آپؐ کی زندگی سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو قربت انہیں اللہ تعالیٰ کی عطا ہوئی وہ اور کسی کو نہ ہو سکی اور اسی طرح سے جناب رسول اللہؐ کے طرز عمل کو آپؐ کے اصحابہ نے اپنایا اور پھر امت کے متقی فرزانے یعنی جس نے بھی ویسا عمل اپنایا وہ صوفی ہوا۔

لیکن حقیقت میں یوں ہوا کہ جناب رسالت مآبؐ کے وصال کے بعد مسلمانوں میں یہ صوفیانہ نظریہ تین مختلف رخ اختیار کر گیا۔ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس نے شدت کے

ساتھ جناب رسول اللہ کا طریقہ کار اپنایا اور اپنی زندگی کے عمومی کاروبار میں بھی مشغول رہے اور ساتھ ہی قرآن اور سنت رسول اللہ پر بھی کاربند رہے اور اس دائرے میں رہتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو اپنی زندگی کا محور بنائے رکھا۔ ظاہر ہے کہ انہیں زندگی کے عیش و عشرت سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی ہوگی۔

دوسرا گروہ ایسا تھا جس کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور قربت حاصل کریں۔ لہٰذا انہوں نے بھی اس مقصد کے لیے دنیاداری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان کا دنیاداری سے مکمل طور پر علیحدہ ہونا بلاشبہ قرآن اور سنت رسول اللہ کے مطابق نہ تھا۔ اب رہا تیسرا گروہ، اس گروہ نے بلاشبہ غلط راستہ اختیار کیا، اللہ اور اس کے رسول کی محبت حاصل کرنے کے لیے۔ حالانکہ ان کی نیت میں فتور نہ تھا، وہ اپنی طرف سے سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے خواہاں تھے لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ گروہ یونانی اور ایرانی فلسفہ اور عقائد سے متاثر ہوا، دانستہ یا غیر دانستہ طور پر۔ کیونکہ مسلمانوں میں ایک گروہ مفکرین کا ایسا بھی آیا جس نے ایرانی اور یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر اسی فکر کو اسلام کے نام سے اختیار کر لیا۔ اس لیے یہ ضروری امر ہے کہ ہم دیکھیں کہ وہ کون کون سے ایسے نظریات ہیں جو مسلمان مفکروں کے ذریعہ سے دین کے نام سے اسلامی تہذیب میں داخل ہوئے اور جن کا قرآن اور سنت رسول اللہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ یہ ان سے اختلاف کے دائرے میں آ جاتے ہیں۔

(الف) عقیدہ ثنویت یعنی نظریہ دوئی:

کچھ مفکرین نے اسلام کے بہت ہی اہم عقیدے نظریہ واحدانیت (Divinity) کے برعکس نظریہ دوئی (Duality) کو پیش کیا اور اسے عام کیا۔ اس سلسلے میں ایک مسلمان مفکر ابن العربی (۵۶۰ھ یا ۱۱۶۵ء پیدائش) جنہیں شیخ اکبر بھی کہا جاتا ہے انہوں نے ایک نظریہ پیش کیا کہ اللہ نے ہر شے کو اپنی ہی ذات سے پیدا کیا، کیونکہ ایک وقت تھا کہ کوئی شے نہ تھی سوائے اللہ کی ذات کے۔ اس نظریے نے مسلمانوں کے بنیادی نظریہ میں ایک ہیجان اور بے قراری پیدا کر دی۔ اور بہت سارے سوالات سامنے آ گئے، مثلاً یہ کہ جب ہر شے اللہ کا ہی حصہ ہے تو پھر فرعون اور نمرود کے متعلق کیا کہیں گے جنہوں نے خود خدائی کا دعویٰ کیا اور جن کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا اور جب انہوں نے ان پیغمبروں کی بات نہ سنی تو اللہ نے انہیں

سزا دی۔ اور پھر جس کا جی چاہا اس نے خود کو اللہ کا حصہ اور پھر خود کو خدا ہی قرار دے دیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال ایک بہت بڑے اور مشہور صوفی بزرگ کی ہے جن کا نام ابوالمغیث حسین منصور الحلاج (۸۵۸-۹۲۲ء) تھا۔ یہ ایرانی صوفی تھے اور بغداد میں قیام پذیر تھے انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ "میں وہ ہوں جسے میں محبت کرتا ہوں، اور وہ جسے میں محبت کرتا ہوں وہ میں ہی ہوں، ہم دو روحیں ہیں ایک ہی جسم میں۔ اگر تم مجھے دیکھو تو تم اسے دیکھتے ہو اور اگر تم اسے دیکھتے ہو تو تم مجھے دیکھتے ہو"۔ (یعنی وہ اور اللہ ایک ہی ہیں)۔

منصور الحلاج کے اس دعویٰ کے بعد حکومت وقت نے اسے سزائے موت دے دی۔ اب ملاحظہ فرمائیں کہ منصور کا دعویٰ حقیقت میں درج ذیل قرآنی آیات کے خلاف ہے:

i) "کوئی شے اس (اللہ) کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے اور دیکھنے والا ہے"۔ (آیت ۱۱، سورہ الشوریٰ ۴۲)

ii) "کہو! وہ اللہ ہے، واحد اور اکیلا، اللہ یکتا و بے نیاز"۔ (آیت ۱، ۲، سورہ اخلاص ۱۱۲)

یہ قرآن کے دونوں حوالے ان تمام بیانات اور عقائد کی نفی کرتے ہیں جو وحدانیت کے عقیدے کے خلاف ہوں جبکہ صرف عقیدہ وحدانیت ہی مسلمانوں کے ایمان کی بنیاد ہے۔ لیکن بہت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ عقیدہ واحدانیت کے خلاف صرف عقیدہ دوئی ہی نہیں بلکہ عقیدہ تثلیث بھی صوفی عقائد میں ملتا ہے۔ اس عقیدے کی مثال ایک صوفی شاعر بلھے شاہ (۱۶۸۰-۱۷۵۸ء) کی شاعری میں ملتی ہے بلکہ یہ عقیدہ ثنویت اور تثلیث دونوں کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

۱) کارن بیت میت بن آیا	میم دا گھونگھٹ کھول لیا
احد تے احمد نام دھرایا	سر پھر جھلے لالا کی دا
۲) ذات احدی اور جمیع الشان ہے	جیسا تھا ویسا ہی وہ قرآن ہے
ازلی و ابدی ہے وہ نور قدیم	وہی احمد ہے بلا میم اے جیم
۳) پیارا پہن پوشاکاں آیا	آدم اپنا نام دھرایا
احد تے بن احمد آیا	نبیاں دا سردار
۴) احد احمد وچ فرق نہ باہیا	رتی اک بھیت مروڑی دا

۵) علی حیدر پہلے احدی   فیر احمد بن کے آیا

اسی طرح مولانا جامی نے بھی کہا ہے:

ز احمد تا احد یک میم فرق است

جہانے اندر آں یک میم غرق است

شیخ بابا ذہین شاہ تاجی رحمۃ اللہ علیہ ، بلھے شاہ ، شاہ حسین ، اقبال اور دیگر بہت سے صوفی شاعروں نے اسی قسم کے خیالات اور جذبات کا اظہار کیا ہے جو مستی کی حالت یا عالم سکر کے طور پر ان اشعار کے متعلق بحث نہیں کرنی۔ نہ ان کے مخفی معنی کو دیکھنا ہے نہ شاعروں یا ان صوفی حضرات کے متعلق کچھ کہنا ہے ہمیں صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ کیا ان اشعار کا مضمون قرآن اور سنت کے تحت آتا ہے یا اس کے منافی ہے؟ بہت ساری سی بات یہ ہے کہ اگر قرآن اور سنت یعنی قول رسولؐ کے خلاف ہے تو اہل صوفیہ کا یہ نقطہ نظر ہو یا کوئی بھی نقطہ نظر جو قرآن اور سنت کے منافی ہے تو وہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے لیے قرآن کی آیات جو مختصراً پیش کی گئی ہیں ، یہ تمام اشعار اور ایسے ہی خیالات وعقائد ان قرآنی آیات سے سو فیصد متصادم ہیں۔

اس لیے ہمیں تمام ایسے فلسفیانہ، شاعرانہ، مذہبی، سائنسی، افسانوی یا ماورائی کہانی یا نصیحت یا عقیدہ یا اصول یا قاعدہ یا قیاس سے نہ صرف گریز کرنا چاہیے بلکہ اسے اٹھا کر دوسری طرف رکھ دینا چاہیے یعنی اسے رد کر دینا چاہیے جو آپ دیکھ رہے ہوں کہ وہ قرآن کی کسی عبارت اور معنی سے متصادم ہے یا جو جناب رسول اکرمؐ کے قول اور فعل کے خلاف ہے۔ اس کے لیے کسی بحث و مباحثے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے ، کیونکہ قول اللہ تعالیٰ اور قول رسولؐ کی اطاعت، تابعداری اور فرمانبرداری ہمارے ایمان کی اولین شرط ہے اور اس کے بغیر ہمارا ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا۔ اگر کسی صوفی یا شاعر نے جذب کی حالت میں ہی کچھ خلاف قرآن وسنت کچھ لکھ دیا ہے تو پھر بھی وہ قابل تقلید نہیں۔

(ب) خلوت:

صوفی اپنی روزمرہ کی زندگی سے خلوت نشینی اختیار کر لیتے ہیں اور اس خلوت کو بعض تو مستقل طور پر اختیار کیے رہتے ہیں اور بعض اس کی مشقیں کرتے رہتے ہیں۔ پہلے تین روز کی پھر اس روز کی پھر چالیس روز کی اور پھر اس سے زیادہ مدت کی اور پھر مستقل طور پر دنیا داری

سے کنارہ کشی اختیار کر کے اللہ کی طرف رجوع کر لیتے ہیں۔

اس قسم کا عمل معاشرے میں ہزاروں برس قدیم ہے یہ کام مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ موجودہ خلوت نشینی کا فلسفہ وہیں سے ہمارے ہاں منتقل ہوا ہے یعنی یہودی اور عیسائی راہبوں سے بدھ مت کے جوگیوں سے یا ویدانتا ہندو ویدوں سے۔

جہاں تک یہود راہبوں کا تعلق ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کم از کم چالیس روز کی خلوت تو انہی سے رواج میں آئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جناب موسیٰ نے کوہ طور پر خلوت میں چالیس روز گزارے تھے۔ اسی طرح عیسائی راہبوں نے بھی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور مستقل طور پر خلوت اختیار کیے رکھی۔ ہندو پنڈت بھی چالیس روز کی خلوت یعنی "چلہ" اختیار کرتے ہیں خود گوتم بدھ نے پانچ سال تک جنگل کی خلوت میں گزارے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ خلوت نشینی اختیار کرنا کیا جناب رسول اللہؐ کا فعل بھی رہا ہے اگر رہا ہے تو کس لیے اور کس طرح سے اور کتنی مدت تک؟ اگر ایسا ہے تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے تاکہ اس کے مطابق عمل کیا جا سکے۔

جناب رسول اللہؐ نے اعلان نبوت سے قبل اعتکاف کیا یعنی خلوت اختیار کی اور اکثر غار حرا میں جا کر معرفت حاصل کرنے کی غرض سے قیام پذیر ہوتے رہے۔ لیکن جب آپؐ نے اعلان نبوت فرمایا اور دین کے احکامات جاری و ساری ہونے لگے تو نبوت کے تقریباً پندرہ برس بعد یعنی جب دوسری ہجری میں روزے فرض ہوئے تو اس کے بعد آپؐ نے ماہ رمضان کے آخری عشرے کو ہمیشہ اعتکاف کی حالت میں گزارا لیکن صرف اپنی حیات مبارکہ کے آخری رمضان المبارک کے مہینے میں آخری دو عشرے اعتکاف میں گزارے۔ اس اعتکاف کے دوران جناب جبرئیل آپؐ کے ساتھ بیٹھ کر دورہ قرآن فرماتے جبکہ آخری سال دو مرتبہ دورہ قرآن ہوا۔ اس اعتکاف کے دوران آپؐ تمام دنیاوی امور ترک فرما کر مسجد نبوی میں قیام پذیر ہو جاتے اور وہ وقت صرف اپنے رب کی حضوری میں گزارتے۔

چنانچہ جناب رسول اللہؐ کی اس سنت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہؐ نے بھی خلوت نشینی اختیار کی، چنانچہ خلوت نشینی میں سنت رسول اللہؐ کا اختیار کرنا یقیناً باعث فضیلت ہوگا۔

(ج) بیعت:

صوفی شیخ اپنے مرید سے بیعت لیتے ہیں یعنی عہد لیتے ہیں کہ وہ ان کے حکم کے تابع ہو جائے گا اپنی زندگی گزارنے کے معاملے میں اور شیخ کے صوفیانہ طریقہ کار کی پیروی کرے گا۔ صوفیا اس مقصد کے لیے سورۃ فتح (۴۸) کی آیت (۱۰) کا سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح سے مرید اپنے تمام اختیارات اپنے مرشد کے حوالے کر دیتا ہے اور مرشد کے حکم کا تابع ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ کار قرآن اور سنت سے متصادم معلوم ہوتا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

i) صوفی بزرگ اس معاملہ کے لیے صرف ایک ہی قرآنی آیت، جو اوپر بیان کی گئی ہے کا سہارا لیتے ہیں جو صحیح نہیں۔ کیونکہ آیت بالا صلح حدیبیہ کے بعد ایک خاص موقع کے لیے نازل کی گئی تھی اور وہ یوں کہ جب جناب عثمان بن عفانؓ کو جناب رسول اللہؐ نے مکہ بھیجا تاکہ وہ قریش مکہ سے عمرہ کی بابت گفت و شنید کریں تو اس دوران انہیں وہاں کافی زیادہ وقت لگ گیا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو تشویش لاحق ہو گئی اور ساتھ ہی ایک افواہ بھی گردش میں آ گئی، کہ اہل مکہ نے انہیں شہید کر دیا ہے۔ اس موقع پر جناب رسول اللہؐ نے اپنے رفقاء سے یہ عہد لیا، یعنی بیعت لی کہ وہ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی خاطر جناب رسول اللہؐ کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ اس بیعت کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور اس امر کی تعریف کی اور فرمایا کہ:

"بے شک جنھوں نے بیعت کی تم سے (اے محمدؐ) انہوں نے عہد کیا اللہ سے"۔

اب یہ بالکل ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابہ کی فرمانبرداری کا عہد جو انہوں نے عثمانؓ کی جان کا بدلہ لینے کے لیے جناب رسول اللہؐ سے کیا، اسے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور تعریف کی۔ اس عہد کا اُس عہد سے کوئی تعلق نہیں بنتا جو شیخ اپنے مرید سے لیتے ہیں۔ اس لیے اس آیت کا حوالہ شیخ کی بیعت کو قانونی ثابت کرنے کے لیے درست نہیں اور دوسرا یہ کہ رسول اللہؐ کے علاوہ امت کے کسی بھی شخص کو یہ اختیار نہیں دیا گیا، کہ وہ ایمان کے معاملے میں بیعت لے اور نہ ہی اس معاملے میں خلفائے راشدین نے بیعت لی۔ ان کی بیعت اور ان کے بعد کے حکمرانوں کی بیعت صرف ان کی حکومت کو تسلیم کرنے کی بیعت تھی، کہ عوام الناس یا بیعت کرنے والے ان کی حکمرانی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے تابع کر رہے ہیں۔ اس میں ایمان کی بیعت کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔

ii) دوسرا خاص عنصر جو اس معاملے میں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو ایمان کا دعویدار ہے یعنی کہ مسلمان ہے وہ تو پہلے ہی سے بیعت کیے ہوئے ہے اور وہ بیعت اس کی اپنے رب سے ہوتی ہے۔ جب کہ وہ اپنی زبان اور دل سے اپنے رب کے سامنے اور اپنے رب کے ساتھ اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اُسے اپنا رب اور جناب محمدؐ کو اس کا آخری رسول مانتا ہے اور وہ ان کی تابعداری اور اطاعت کا اقرار کرتا ہے۔ جب اس نے یہ اقرار اپنے رب سے کر لیا تو پھر کسی انسان کو کیسے اختیار پہنچتا ہے کہ وہ اپنے رب کی وفاداری کے لیے شیخ سے اقرار کرے اور شیخ کو اس بات کا کس نے اختیار دیا ہے؟

یہ بہت عجیب بات ہے کہ شیخ ایک بندے سے اس کے مالک کے بارے میں بیعت لے۔ دوسری بات یہ کہ اگر شیخ سیدھے راستے پر (خدانخواستہ) نہ رہا تو پھر اس کے مرید تو گئے نا جہنم میں؟ جبکہ شیخ جنت کی گارنٹی تو دے ہی نہیں سکتا۔ اس کی مثال مرزا غلام احمد قادیانی کی ہے وہ بھی نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے شیخ ہی تو تھا۔ اس کے ہزاروں مریدوں نے اس سے بیعت ہی تو کی تھی اور پھر جب اس نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تو وہ مرید جنھوں نے اسے نبی مانا وہ بھی اس کے ساتھ مرتد ہو گئے نا۔ اس طرح سے شیخ صاحب اپنے ساتھ کتنے مریدوں کو جہنم رسید کر گئے۔

اس لیے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ سوائے جناب رسول اللہؐ کے کسی اور کا تابع نہ ہو۔ ہاں علم سیکھنے کے لیے یعنی قرآن و حدیث کا علم اور مسائل جاننے کے لیے استادوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے، بلکہ استاد ہی اس معاملے میں راہبری کرتے ہیں اور وہ اپنے شاگردوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے قریب لانے میں مدد دیتے ہیں، لیکن انہیں بیعت لینے کا حق نہیں ہوتا۔ کیونکہ شاگرد صرف ایک استاد کا پابند نہیں ہوتا وہ علم حاصل کرنے کے لیے جتنے بھی چاہے اساتذہ کرام سے استفادہ کر سکتا ہے اور ان کے علم سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

ایک مسلمان کا لیڈر، مرشد، پیر، راہبر صرف ایک ہی ہے اور قیامت تک وہی رہے گا، اور وہ ہیں جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ایک خاص بات اس معاملہ میں یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہی ایمان اختیار کرے جو اللہ کے رسولؐ نے اختیار کیا اور پھر اس کی بیعت اللہ تعالیٰ سے کرے۔ کس بات پر ایمان لائیں یہ بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۲۸۵) میں بتا دیا ہے اور یہی ایک مسلمان کی بیعت ہے۔ اس آیت مبارکہ میں فرمایا گیا کہ:

"ایمان لائے ہیں رسولؐ (محمدؐ) اس پر جو نازل کی گئی ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے اور مومنین بھی۔ ہر ایک ایمان رکھتے ہیں (یعنی مسلمان) اللہ کی ذات پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ (اور وہ کہتے ہیں) اور ہم سب پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ان سب نے کہا (یہی بیعت ہے) کہ ہم نے (اللہ کا ارشاد) سنا اور اس کی اطاعت کی۔ (اور عرض کیا) ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب ہم سب کو آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے"۔

یہ ہے ایک مسلمان کی بیعت اور جب ایک بندے نے یعنی ایک غلام نے اپنے رب یعنی اپنے مالک سے بیعت کر لی تو اس مالک کے کسی دوسرے غلام (شیخ) کو کس نے اختیار دے دیا کہ وہ اپنے مالک کے لیے اس کے کسی غلام سے بیعت لے۔ صرف طلوع اسلام کے وقت جناب رسولؐ اللہ کے دور میں صرف اللہ کے رسولؐ کو ہی یہ حق حاصل تھا، کہ وہ اپنی رسالت اور اللہ کی ربوبیت کی غرض سے بیعت لیں اور اس کے علاوہ دوسری بیعت جناب رسولؐ اللہ کی اطاعت اور اللہ کی اطاعت کے لیے ہوتی تھی۔

iii) صوفی مکتبہ فکر کے ہاں ہمیں ابونصر فارابی (۸۷۲–۹۵۰ء) کی فکر کا عکس اصل بھی ملتا ہے۔ فارابی کا یہ کہنا کہ انسان اپنے علم اور عقل کے فیض سے عقل کے انتہائی درجے تک پہنچ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ الہام کے حاصل کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ذاتی علم سے مستفید ہونے کی استطاعت حاصل کر لیتا ہے۔ جب کہ انبیاء کی اتنی زیادہ بعثت یعنی ایک لاکھ سے زائد اس بات کا کامل ثبوت ہے کہ جہاں عقل انسانی کے سامنے پردہ حائل ہو جاتا ہے، وہاں اسے الہامی علم کی راہبری پیغمبروں کے ذریعہ سے ملتی ہے اور الہام کو حاصل کرنا انسانی کمال نہیں ہوتا، کیونکہ یہ استطاعت صرف اللہ کی طرف سے اس کے

انتخاب یا نزد پیغمبروں کو ہی ملتی ہے اس بات کو اللہ تعالیٰ نے سورہ جن (۷۲) کی آیات (۲۶-۲۷) میں فرمایا ہے کہ:

"غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا، سوائے کسی برگزیدہ رسول کے، جس کو وہ منتخب کر لیتا ہے اور اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے محافظ فرشتے مقرر کر دیتا ہے"۔

وہ علم جس کے بارے میں فارابی نے کہا وہ الہام تو ہو ہی نہیں سکتا، کسی بھی صورت۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا مطلب علم ادراک سے ہو اور ترجمہ کرتے کرتے اس کی ترمیم ہو گئی ہو۔ کیونکہ بنیادی طور پر تو علم کے تین ہی درجے ہیں جو اس کتاب کے مضمون اول میں بیان ہو چکے ہیں (۱) جبلت: جو ہر جاندار میں فطری طور پر داخل کیا گیا علم ہے پھر (۲) ادراک: یعنی اپنی ذہنی کیفیات کو حواس خمسہ کے ذریعہ علم سیکھ کر اس علم کی بلند سطح پر قیاس کرنا یا قیاس کا ہو جانا اور پھر آخری درجہ (۳) علم الہام کا ہے جو پیغمبروں سے ہی سیکھا جاتا ہے اور وہ اس علم کو براہ راست اللہ سے حاصل کرتے ہیں۔

بہر حال بیعت کرانے کی کوئی سند قرآن و سنت میں نہیں ملتی۔ اس کا مقصد صرف کسی شخص کو اپنی سرپرستی میں لینا مقصود نظر آتا ہے۔ علم سیکھنے کی غرض سے بیعت کی ضرورت نہیں، عالم اپنا علم پھیلانے میں بہت خوش ہوتے ہیں اور نہ تو وہ کوئی شرط لگاتے ہیں اور نہ کوئی صلہ چاہتے ہیں۔ تاریخ کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ ایسے شیوخ جنہوں نے لوگوں کو اپنا مطیع کیا، انہوں نے ان سے نذرانے وصول کیے اور ہنوز کر رہے ہیں اور انہی نذرانوں سے وہ آج بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بنے ہوئے ہیں، اس دعوے کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہر شخص اس سے واقف ہے۔ اس سلسلے میں جناب علامہ اقبال نے "باغی مرید" کے نام سے اپنی کتاب "بال جبریل" میں چند اشعار کہے ہیں جو ملاحظہ کے لیے پیش خدمت ہیں۔ اس سے زیادہ کہنا ممکن نہیں!

"ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو یا دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن"

(و) صوفیوں کے روایتی حلقے:

صوفیوں کے مختلف گروہ یا حلقے ہیں جن کے اپنے اپنے روایتی طریقے وضع کیے ہوئے ہیں جن کے ذریعے وہ مشقیں کرتے ہیں تاکہ وہ اللہ کی قربت حاصل کرسکیں۔ اس کے لیے وہ کسی اولیاء اللہ، بزرگ، شیخ، مرشد یا پیر کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں اور ان کی دی گئی ہدایات کے مطابق چند مشقیں، وظائف، تسبیحات، ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ اللہ کی قربت پاسکیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرشد کو وسیلہ بنائے بغیر اللہ کی قربت حاصل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور دوسرا یہ کہ اس کے متعلق اللہ اور رسولؐ کا کیا حکم ہے۔ اس سلسلے میں قرآن اور قول رسولؐ اللہ کے فرمان درج ذیل ہیں:

i) سورۃ الانعام (۶) آیت (۱۵۳) میں فرمایا گیا ہے کہ: "اور بے شک یہ میرا راستہ ہے سیدھا۔ سو اس کو اختیار کرو اور دوسروں کے راستے اختیار نہ کرو کہ وہ راستے تمہیں میرے راستے سے دور لے جائیں گے"۔

ii) سورۃ آل عمران (۳) آیت (۳۱-۳۲) میں فرمایا گیا ہے کہ: "کہو (اے محمدؐ) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کردے گا۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔ کہو (اے محمدؐ) کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی۔ اگر پھر بھی لوگ ایسا نہ کریں تو اللہ تعالیٰ کافروں سے (یعنی انکار کرنے والوں سے) محبت نہیں کرتا"۔

اب ان آیات کریمہ میں صاف صاف حکم آگیا کہ اللہ کی محبت پانے کے لیے دو صرف باتیں ضروری ہیں ایک تو اللہ کے احکامات کی اطاعت اور دوسرے اس کے رسولؐ کی۔ جب دونوں کے احکامات کی تکمیل ہوچکی تو پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا دین مکمل ہوگیا۔ اب اس کے لیے استادوں کی ضرورت تو ہے اور علم والوں کی جو قرآن حکیم اور جناب رسالت مآبؐ کے اقوال کو

اچھی طرح سے گوش گزار کرسکیں، سمجھا سکیں۔ لیکن کسی شیخ، مرشد یا پیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ کی محبت انہیں کی معرفت ملے گی۔ یہ بات نہ تو اللہ نے فرمائی نہ اس کے رسولؐ نے۔

اب ان لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اپنے مرید کا رشتہ اللہ سے جوڑتے ہیں اپنے پیروں کے سلسلے سے، وہ پہلے علیؓ تک پہنچتے ہیں پھر ان کے ذریعے سے وہ رسولؐ اللہ تک اور پھر اللہ تک۔

حالانکہ جناب رسولؐ اللہ کا فرمان مبارک جو ہر مسجد کے منبر پہ اکثر دہرایا جاتا ہے کہ "بہترین کلام ہے اللہ تعالیٰ کا کلام اور بہترین آگاہی ہے جناب محمدؐ کے ذریعے سے اور سب سے زیادہ برائی یہ ہے کہ کسی بدعت کا اجرا کیا جائے اور ہر بدعت ہدایت سے دور کرتی ہے اور یہ دوری جہنم تک لے جاتی ہے"۔

(ہ) مدد کے لیے پکار:

صوفی نقطۂ نظر کے حامی ماسوائے اللہ کو بھی مدد کے لیے پکارتے ہیں، ان کے ہاں ایک یہ نظریہ بھی ملتا ہے کہ دنیا کا نظم و نسق کو چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ اور صوفیائے اکرام کو باقاعدہ طور پہ مقرر کیا ہوا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان کی دعائیں ان کی معرفت اور وسیلے سے اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی قابل قبول نہیں کیونکہ اس کو تسلیم کرلینے سے احکامات خداوندی کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے عقائد کو بالکل ناپسند فرماتے ہیں۔ یہ مضمون بہت طوالت اختیار کرسکتا ہے لیکن چونکہ ہم یہاں اسے اختصار سے بیان کررہے ہیں لہٰذا ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے اس بارے میں کیا فرامین ہیں:

i) سورۃ (۷۲) الجن کی آیت (۲۱) اور (۲۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"کہو (اے محمدؐ)! میں کوئی اختیار نہیں رکھتا تمہیں کوئی ضرر پہنچانے کا یا کسی بھلائی کا۔ کہو! یقیناً کوئی نہیں بچا سکتا، مجھ کو بھی، اللہ سے اور نہ میں پناہ پاسکتا ہوں اس کے علاوہ"۔

اللہ تعالیٰ نے اس وقت نبیؐ سے فرمایا جب کہ آپؐ حیات تھے کہ "اگر لوگ نبیؐ کو پکاریں بھی تو وہ پھر بھی تمہاری مدد نہیں کرسکتے اور نہ ہی تمہیں بچا سکتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کے شریک نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ بلاشرکت غیرے سب کا رب ہے یعنی مالک ہے۔ نبیؐ کا بھی وہ مالک ہے اور نبیؐ اپنے مالک کا غلام اور رسولؐ ہے اور نبیؐ کی تابعداری اور فرمانبرداری اللہ کے ہاں مقبول ہے اور ان کے اعلیٰ مراتب کی باعث ہے، اسی لیے نبیؐ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ

پیارے ہیں۔ اسی لیے ان پر اللہ تعالیٰ ہر وقت رحمتیں اور برکتیں نازل فرماتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ان کا کچھ حصہ نہیں، اللہ کے سامنے وہ بھی بے بس ہیں"۔

ii) سورہ فاطر (۳۵) کی آیات (۳) اور (۱۴) میں اللہ تعالیٰ کی طاقت و قوت، ملکیت، حاکمیت کا بیان ہے جو ہر اس چیز پر قادر ہے جو کہ موجود ہے۔ ان آیات مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ:

"وہ (اللہ) رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں اور اس نے مقرر کر رکھا ہے سورج کو اور چاند کو کہ ہر ایک اپنے محور کے گرد اور اس کے علاوہ اپنے راستے پر مقررہ وقت میں پہنچتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا مالک، اس کی بادشاہی ہے اور وہ جنہیں تم پکارتے ہو یا بلاتے ہو اللہ کے سوا وہ تو کھجور کی گٹھلی کی جھلی کے برابر بھی طاقت نہیں رکھتے۔ اگر تم ان کو پکارو بھی تو وہ تو تمہاری پکار سن ہی نہیں سکتے اور فرض کرو اگر وہ سن بھی لیں تو وہ تمہاری درخواست پوری نہیں کر سکتے۔ اور قیامت کے روز وہ تمہاری ان عبادتوں کو تسلیم نہیں کریں گے اور تمہیں کوئی اس (اللہ) کی طرح مطلع نہیں کر سکتا، جو ہر شے کا جاننے والا ہے"۔

بہت سے صوفی اور اس نقطہ نظر سے تعلق رکھنے والے لوگ یہ بحث کرتے ہیں کہ اولیاء اللہ اور پیغمبر زندہ ہیں اپنی اپنی قبور میں اور وہ فوت نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کی آواز سنتے ہیں اور جب وہ لوگ ان کو پکارتے ہیں تو وہ ان کی پکار سنتے ہیں اور پھر اللہ سے سفارش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں سورہ آل عمران (۳) کی آیت (۱۶۹) اور سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۱۵۴) میں فرمایا گیا:

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ہیں ان کو مردہ خیال مت کرو، بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اور اپنے رب کے حضور رزق پا رہے ہیں"۔ (۳/۱۶۹)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کے لیے یہ مت کہو وہ مر گئے ہیں۔ نہیں! بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کا شعور نہیں رکھتے"۔ (۲/۱۵۴)

اللہ تعالیٰ جو ہمارا ولی ہے، اس نے صاف صاف فرما دیا کہ ایسے لوگ جو اس کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں وہ زندہ ہیں، اپنا رزق پا رہے ہیں، لیکن تمہیں ان کی زندگیوں کے بارے میں شعور نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاطر (۳۵) کی آیت (۱۴) میں فرمایا کہ "اگر وہ تمہاری پکار سن بھی لیں (جیسا کہ تم کہتے ہو) تو بھی وہ تمہیں کچھ عطا نہیں کر سکتے"۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے سورہ فاطر (۳۵) کی آیت (۲۲) میں فرمایا ہے کہ "زندہ اور مردہ برابر نہیں ہیں، یعنی ایک جیسے نہیں۔ بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے سنوا دیتا ہے اور تم ان کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں"۔

(و) تسبیح و ذکر:

صوفیاء کا ہر مکتبہ فکر اپنے پیروکاروں کو ایک خاص انداز میں خاص قسم کی تسبیح یا ورد یا ذکر کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ ایسے اذکار میں یا تو اللہ تعالیٰ کے اسماء کا ورد ہوتا ہے یا جناب رسولؐ اللہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحمتوں اور برکتوں کی دعا کی جاتی ہے، جسے فارسی یا اردو میں درود کہا جاتا ہے اور قرآن میں اس کے لیے صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

صرف یہ ایک ایسا نقطہ ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذکر کا یہ عمل ذاکر پر لازم کرتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے معاملات میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی پیروی کرے۔ چونکہ صوفیاء اکرام کا یہ عمل قرآن اور سنت کے مطابق ہے اس لیے اس بارے میں ہمیں قرآنی نقطہ نظر جاننا ضروری ہے۔

(i) ذکر کے بارے میں نظریہ قرآن

قرآن حکیم میں ایسی بہت سی آیت مبارکہ ہیں جو ذکر کی ترجمانی کرتی ہیں اور قاری کے دل میں ذکر کی اہمیت اجاگر کرتی ہیں ان میں سے چند ایک درج ذیل کی جا رہی ہیں:

۱) قرآن کی سب سے پہلی آیت یعنی پہلا جملہ:

"الحمدللہ رب العالمین" یعنی کہ "تمام تعریفیں اور شکر صرف اللہ ہی کے لیے ہے، جو ہر شے کا مالک ہے"۔

۲) سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۲۵۵) جو بہت ہی زیادہ مشہور و معروف ہے اور اس آیت شریفہ کو آیت الکرسی کہا جاتا ہے، اس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اللہ! اکیلا اور دوسرا کوئی بھی نہیں پرستش کے لائق، جو ہمیشہ سے ہے زندہ، وہ جو رزق پہنچاتا ہے ہر مخلوق کو۔ نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اسی کی ملکیت میں ہے جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین پر۔ وہ کون ہے جو اس سے سفارش کر سکے سوائے اس کی اجازت کے؟ وہ جانتا ہے کہ اس کی مخلوق کے ساتھ کیا ہوتا ہے، اس دنیا میں اور آخرت میں۔ اور وہ کبھی بھی

احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس کے علم میں سے کسی چیز کا سوائے اس کے جو وہ چاہے۔ اس کا تخت یعنی کرسی آسمانوں اور زمین پر محیط ہے اور وہ تھکتا نہیں اپنی مخلوق کی نگہبانی سے اور وہ بہت ہی بلند اور بڑے مرتبے کا مالک ہے"۔

۳) سورۃ الحدید (۵۷) کی آیت (۱) میں فرمایا گیا کہ:

"جو کوئی بھی ہے آسمانوں اور زمین پر وہ اللہ کی تعریف کرتا اور اس کی پاکی بیان کرتا ہے جو زبردست اور حکمت والا ہے"۔

۴) سورۃ الاسراء (۱۷) آیت (۴۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ بھی ان کے اندر ہے سب اللہ کی پاکی بیان کر رہے ہیں اور کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کی پاکی نہ بیان کرتی ہو۔ لیکن تم ان کے بیان کو سمجھ نہیں سکتے۔ بے شک وہ بڑا حلیم اور غفور ہے"۔

۵) سورۃ تغابن (۶۴) آیت (۱) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے۔ یہ سب اس کی سلطنت ہے اور وہی تعریف کے لائق ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے"۔

۶) سورۃ حج (۲۲) کی آیت (۱۸) بہت ہی زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور آیت سجدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو کوئی بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور دواب (تمام جگر رکھنے والے جانور) اور بہت سے انسانوں میں سے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے آگے۔ لیکن بہت سے ایسے ہیں (انسانوں میں سے جو سجدہ نہیں کرتے) جو سزا کے لائق ہیں۔ اور جس کو بھی اللہ ذلیل کرتا ہے اسے کوئی بھی عزت نہیں دے سکتا۔ بے شک اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے"۔

تو پس ظاہر ہے کہ جب اللہ مالک و آقا ہے، ہر شے کا اور ہر شے اس کی شان بلند کرتی ہے اس کا ذکر کر کے اور سجدہ ریز ہوتی ہے اس کی حضوری میں تو پھر اس کی مخلوق اعلیٰ کیوں نہ باقاعدگی سے اس کا ذکر کرتی رہے اور اس کی حضوری میں سجدہ ریز ہوتی رہے۔ حالانکہ انسان کا ذکر دوسری مخلوق کی نسبت بہت اعلیٰ ہونا چاہیے اور وہ اعلیٰ ہوتا ہے جبکہ انسان اپنی شیریں زبانی

سے ذکر کرتا ہے اعلیٰ ترین الفاظ میں اپنا عجز و انکساری پیش کرتا ہے اپنے کردار اور اعمال کے ذریعے سے اپنی عقیدت پیش کرتا ہے اپنے آنسوؤں کے ذریعے سے اس کی مخلوق کی خدمت کرتا ہے اس کی محبت میں اور پھر اس کی حضوری میں پیش ہو کر اپنے جسم کو عاجزی کی انتہائی حالت میں لے آتا ہے جسے سجدہ کہا جاتا ہے۔ گویا کہ انسان اپنے رب کے حضور اپنی روح کو اور اپنے جسم کو اور اپنے جسم کے ان اعضا کو بھی جو اپنی حالت کے ادراک کا اظہار کرتے ہیں، ان تمام ارکان کے ساتھ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔

(ii) ذکر کے نفسیاتی پہلو

ذکر کا بنیادی مقصد تو اللہ کی محبت کا حصول ہے، لیکن ذکر کی مشق کے بار بار دہرانے سے اللہ تعالیٰ کے بابرکت اسماء الحسنیٰ انسانی ذہن پر بہت سے نفسیاتی تاثرات چھوڑ جاتے ہیں جن کا اثر انسانی سوچ، کردار اور اعمال پر پڑتا ہے۔ ان اثرات کے نتائج انفرادی طور پر انسان کے ذکر کرنے کی توجہ اور انہماک پر مبنی ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ سکون اور اطمینان کی کیفیت حاصل کر لے۔ درج ذیل آیات اس حالت کے بارے میں قابل غور ہیں:

۱) سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۱۵۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"پس میرا ذکر کرو تو میں تمہارا ذکر کروں گا، یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرے شکرگزار بنے رہو اور کبھی بھی میری ناشکری نہ کرنا"۔

۲) سورۃ اعراف (۷) کی آیت (۲۰۵) میں فرمایا گیا کہ:

"اور ذکر کرو اپنے رب کا اپنی زبان سے اور اپنے دل میں، عاجزی اور خوف کے ساتھ اور دھیمی آواز میں، صبح اور شام کے اوقات میں اور اہل غفلت میں شامل نہ ہونا (یعنی ذکر چھوڑ کر)"۔

۳) سورۃ رعد (۱۳) آیت (۲۸) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہ لوگ جو ایمان لائے ان کے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، اللہ کے ذکر سے۔ بے شک اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے"۔

ذکر اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے علاوہ اللہ کی محبت کے حصول کا بھی سبب بنتا ہے اور یہ امراض نفسانی قلب کی صفائی اور طہارت کے لیے ایک بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اور نفسیاتی زبان میں یہ عمل تحت الشعور کو برائی اور مختلف خیالات سے پاک و صاف کر کے ان اذکار کے انوار سے بھر

دیتا ہے۔ کیونکہ ذہن کے دو حصے ہوتے ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی جسے شعور اور تحت الشعور کہتے ہیں ان میں سے شعور سوچتا ہے اور کام کرتا ہے جبکہ تحت الشعور یادوں کو، خیالوں کو، تجربات کو، واقعات کو اور مشاہدات کو جمع کر لیتا ہے جس سے شعور بوقت ضرورت استفادہ حاصل کرتا ہے۔ تحت الشعور جتنا امیر ہوگا یعنی پاک ہوگا، شعور کو اتنی ہی نیادہ تازگی و توانائی حاصل ہوگی۔

حقیقت میں ہمارا تحت الشعور ہمیشہ خیالات سے لبریز رہتا ہے اچھے اور برے سے پسندیدہ اور غیر پسندیدہ، نیک اور بد وغیرہ۔ جب ہمیں اللہ تعالیٰ کی محبت درکار ہوتی ہے یعنی ہم اس کے لیے کوشش کرتے ہیں تو ہمیں اس امر کی ضرورت پڑتی ہے کہ ہم تحت الشعور کی سطح کو بالکل صاف کرلیں یعنی اس پر جو کچھ بھی لکھا ہوا ہے اسے ختم کر دیں۔ لیکن ایسا ممکن صرف انبیاء کے لیے ہی ہوتا ہے یا پھر اولیاء اللہ ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن اولیاء کو اپنے تحت الشعور کو صاف کرنے کے لیے روحانی مشقیں، وظائف، دنیاداری سے دوری اور پھر ذکر اللہ کے ذرائع استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ جب ان کے شعور اور تحت الشعور بالکل صاف ہو جاتے ہیں تو پھر وہ ان کو ذکر کے انوار سے بھر دیتے ہیں اور یہ ذکر کا عمل انکی تمام زندگی جاری و ساری رکھنا پڑتا ہے تاکہ اللہ کے خیال کے سوا اور کوئی خیال ان کے ذہن میں نہ آسکے اور آئے بھی تو اسے وہاں سمانے کی اجازت ہی نہ ملے۔ اور ایک صوفی کے لیے یہی سب سے بڑا ماحاصل ہوتا ہے اس دنیا میں۔ جبکہ باقی کے انعامات اسے آخرت میں ملتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔

اس سلسلے میں امام ابو حامد الغزالیؒ (۱۱۱۱-۱۰۵۸ء) ایک مسلمان مشہور مفکر جو آخر میں صوفی بن گئے تھے انہوں نے فرمایا کہ انسان کو سب سے پہلے اپنا قلب صاف کرنا چاہیے یعنی کہ شعور، ان تمام خیالات سے جو ماسوا اللہ ہوں تاکہ وہ زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد حاصل کر سکے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ تقویٰ اختیار کرے یعنی پرہیزگاری، اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے۔ ان کے مطابق یہ ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم اپنی دنیاوی مصروفیات اور دنیا کی لذات نہ چھوڑ دیں۔ یقیناً یہ بہت مشکل ہے لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہی رہنا چاہیے۔

چنانچہ صوفی، درویش یا اللہ کا ولی بنتا ہی اس وقت ہے، جب اس کا قلب غیر اللہ سے بالکل خالی ہو جائے اور تنہا اللہ ہی کا ذکر اس پر کندہ ہو جائے تو پھر اسی وقت سے اس کی سوچ، اس کی گفتگو، اس کا دیکھنا سننا سب کچھ اللہ ہی سے متعلق ہوگا اور اس کو اللہ کے سوا کچھ نظر ہی نہ آئے گا۔

(۱۸۵) پہلے حج کی ادائیگی اسلامی قانون کے تحت

آٹھ ہجری میں فتح مکہ کے بعد پہلا حج مسلمانوں نے اسی سال کے آخری ماہ میں مکہ والوں کے قانون کے مطابق ادا کیا۔ لیکن دوسرے برس یعنی نویں ہجری کے اختتام پر جناب رسول اللہؐ نے جناب ابوبکرؓ کی سرکردگی میں ایک حج وفد روانہ کیا اور وہ حج پہلا حج تھا جو مسلمانوں کے طور طریقوں کے مطابق ادا کیا گیا۔ لیکن ان کے ساتھ ہی کافروں نے بھی اپنے طریقے سے حج ادا کیا۔

اس کے بعد دسویں ہجری میں کافروں پر پابندی عائد کر دی گئی اور حج صرف مسلمانوں ہی کے لیے رہ گیا۔ اس لیے دسویں صدی ہجری والے حج کا قصد جناب رسول اللہؐ نے کیا اور یہی حج جناب رسالت مآبؐ کا پہلا اور آخری حج تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حج کے فرض ہونے کے بعد۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نویں صدی میں جب جناب ابوبکرؓ حج کا قافلہ لے کر مدینہ سے چل دیے تو اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم موصول کیا جس میں غیر مسلم کو مسجد الحرام اور اس کے اطراف حدود میں آنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس لیے جناب رسول اللہؐ نے اسی وقت مناسب سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا اعلان کروا دیا جائے تاکہ حج کے موقع پر آئے ہوئے ہر طرف کے لوگ اس اعلان کو سن لیں اور باخبر ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سورۃ توبہ (۹) کی پہلی چھ آیات پر مبنی تھا جس کا اعلان حج کے آخری روز کیا گیا۔ ان آیات شریفہ میں فرمایا گیا کہ:

”اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے دستبرداری ہے ان مشرکین کے عہد سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا سو تم اس زمین پر چار ماہ چل پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ بھی جان لو کہ بے شک اللہ کافروں کو رسوا کریں گے۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اسکا رسولؐ دستبردار ہوتے ہیں ان مشرکین سے۔ پھر اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے اعراض کیا تو سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور ان کافروں کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔ سوائے ان مشرکین کے جن سے تم نے عہد لیا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ ہی تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی، وہ مستثنیٰ ہیں۔ ان کے معاہدے کو ان کی مدت تک پورا کرو، واقعی اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ سو جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو (جو

شہر حرام کی حدود میں پائے جائیں تو ان کو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی پر) مارو، پکڑو اور با ندھو اور ان کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور صلوٰۃ کا قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دے دیں تا کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دیں۔ یہ حکم اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری طرح سے خبر نہیں رکھتے"۔

(۱۸۲) جناب رسالت مآبؐ کی مباہلے کے لیے پکار، نجران کے مسیحیوں کے لیے

(الف) لفظ "مباہلہ" کا مطلب:

عربوں کے رواج کے مطابق جسے جناب رسول اللہؐ نے بھی جاری رکھا، جب دو گروہ یا اشخاص کسی سچائی پر متفق نہیں ہوتے یا اللہ تعالیٰ کے فرمان پر متفق نہ ہوتے اور ان دونوں میں سے جھوٹا یا غلط اپنی ضد پر قائم رہتا تو سچا شخص دوسرے کو مباہلے کی دعوت دیتا اور کہتا کہ چلو آؤ ہم اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہو اس پر اپنی لعنت بھیج دیں۔

یہ رواج ابھی تک اسلامی قوانین کے مطابق ہے لیکن اس کا موقع نہیں دیا جاتا۔ یہ اس وقت لاگو ہوتا ہے جب کسی شخص پر حد کا الزام لگ جائے اور وہ یہ سمجھے اور کہے کہ وہ بے قصور ہے تو وہ بے قصور مباہلے کی دعوت دے سکتا ہے، پھر مباہلے کے بعد سزا کا اختیار اللہ کے سوا کسی دوسرے کو نہیں رہتا۔

(ب) مباہلے کا واقعہ:

نویں ہجری یعنی سن ۶۳۱ء کے دوران جناب رسالت مآبؐ نے نجران کے مسیحیوں کو دعوت دی کہ "بے شک میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم لوگ غلاموں کی پرستش چھوڑ کر اللہ کی عبادت شروع کر دو اور میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم لوگ غلاموں سے اپنی تابعداری کا اظہار ترک کر دو بلکہ اللہ تعالیٰ کی مکمل تابعداری اختیار کر دو۔ پھر اگر تم انکار کرتے ہو تو پھر جزیہ ادا کرو اور پھر تم اگر اس سے بھی انکار کرتے ہو تو پھر میں تمہارے ساتھ جنگ کا اعلان کرتا ہوں"۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کا یہ پیغام یقیناً آپؐ کا اپنا پیغام تھا، اللہ کے قانون کے مطابق۔ لیکن آپؐ کا یہ پیغام تو ریت اور انجیل کے احکامات کے بھی مطابق تھا۔

اس پیغام کے ملنے کے بعد نجران کے بڑوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے معززین کا ایک وفد بھیجیں جناب رسول اللہؐ کے پاس تا کہ وہ آپؐ سے اس معاملے پر گفتگو کر سکیں اور ساتھ ہی اس بات پر کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ اس موقع پر ایک حکم کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۃ آل عمران کی آیات (۱) سے لے کر (۶۱) تک نزول ہوا، جس میں عیسائیوں کے دعوے کو غلط کہا گیا، یہ آیات مبارکہ "آیات مباہلہ" کہلاتی ہیں۔

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ وہ وفد ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا، اس میں تین سردار تھے (۱) عاقب ان کا سربراہ (۲) سعید ان کا مشیر اور (۳) ابو حارثہ ان کا مذہبی لیڈر۔ ابو حارثہ جانتا تھا کہ جناب رسول اللہؐ سچے نبی ہیں، کیونکہ وہ پرانی کتابوں کا علم رکھتا تھا جن میں آپؐ کے تشریف لانے کی خبر درج تھی۔

ان لوگوں نے جناب رسول اللہؐ سے بحث و مباحثہ کیا، لیکن آخر کار جناب مسیحؑ کے معاملے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ چند ایک نے کہا کہ وہ خدا ہیں، چند انہیں اللہ کا بیٹا کہہ رہے تھے اور کچھ نے کہا کہ وہ تین میں سے ایک تھے، یعنی کہ ایک پاک روح۔ بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہیں ان باتوں سے جو کافر ان کے بارے میں کہتے ہیں یا کہتے تھے۔

(ج) مسیحؑ کی پیدائش:

اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران (۳) کی آیت (۵۹) میں آدمؑ اور مسیحؑ کی پیدائش کی یکسانیت کو بیان فرمایا ہے کہ:

"بے شک عیسیٰ کی (پیدائش کی) یکسانیت اللہ کے نزدیک آدمؑ (کی پیدائش) جیسی ہے۔ اس نے پیدا کیا اسے مٹی سے اور پھر فرمایا! ہو جا اور وہ ہو گیا (یعنی جیتا جاگتا انسان بن گیا)"۔

اگر اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو بغیر باپ کے اور بغیر ماں کے پیدا فرمایا تو پھر مسیحؑ کو بغیر باپ کے پیدا کرنے میں کیا شک ہے؟ وہ کیوں مسیحؑ کو بغیر باپ کے پیدا نہیں کر سکتا؟ اگر مسیحؑ کی بغیر باپ کی پیدائش اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے تو پھر یہ دعویٰ تو آدمؑ کے لیے زیادہ مناسب لگتا ہے جو کبھی نہیں کیا گیا۔ آدمؑ نے بھی مسیحؑ کی طرح سے کبھی دعویٰ کیا تھا کہ وہ

اللہ تعالیٰ کے نہایت تابعدار غلام ہیں۔

اب ذرا لاحظہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کس کس طرح سے پیدا کیا:

i) آدمؑ کو پیدا کیا مٹی کے گارے سے (آل عمران:۵۹)

ii) حوّاؑ کو پیدا کیا آدم (مرد) سے بغیر عورت کے (النساء:۱)

iii) مسیحؑ کو پیدا کیا ایک عورت سے کسی مرد کے بغیر۔ (آل عمران:۴۵۔۴۷)

iv) اور انسانوں کو پیدا کرنے کے عام قانون کے مطابق تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت کے جوڑے سے پیدا ہوئے اور ہوتے ہیں اور یہی قانون تمام جانوروں یا جانداروں کے لیے رکھا گیا ہے۔

یہ سب کچھ یعنی پیدائش کے طریقے خاص و عام اللہ تعالیٰ کی کاریگری، طاقت، اور کمال کا اظہار ہے اور یہ کہ وہ خالق ہے، مالک ہے، اپنی مخلوق کی ربوبیت کرتا ہے یعنی پرورش، اپنی مخلوق کو زندہ رکھتا ہے جب تک چاہتا ہے اسے موت دیتا ہے اور موت کے بعد پھر زندہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے اس لیے صرف وہی عبادت کے لائق ہے اور اس کے سوا اور کوئی اللہ نہیں اور نہ کوئی الٰہ۔

(و) جناب مسیحؑ کی پیدائش پر خوشخبری:

سورہ آل عمران (۳) کی آیات (۴۵-۴۷) جناب عیسیٰؑ کی پیدائش کی خوشخبری بیان کررہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ سیدہ مریمؑ کو دی تھی۔ ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ:

"جب کہا فرشتوں نے کہ، اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو اس (اللہ) کی طرف سے ہوگا۔ اس کا نام مسیح عیسیٰؑ ابن مریم ہوگا جو ہوں گے عزت والے، دنیا و آخرت میں اور ہوں گے مقربین میں سے اور لوگوں سے کلام کریں گے، جبکہ جھولے میں ہوں گے اور بڑی عمر میں اور ہوں گے صالح لوگوں میں سے۔ انہوں (مریمؑ) نے کہا اے میرے رب مجھے کس طرح بچہ ہوگا، جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ فرمایا (اللہ نے) بس ویسے ہی ہوگا جیسے اللہ پیدا کردیتے ہیں جو چاہیں اور جب چاہتے ہیں کسی ہونے کا فرماتے ہیں "ہو جا" تو بس وہ چیز ہو جاتی ہے"۔

پیدائش کے بعد بچپن میں ہی اپنی ماں کی گود میں جب کوئی بچہ بات نہیں کرسکتا تو اللہ تعالیٰ

نے انہیں یعنی مسیحؑ کو گویائی عطا فرمائی اور انہوں نے فرمایا کہ "میں اللہ کا بندہ ہوں"۔ انہوں نے کبھی بھی نہ تو خدائی کا دعویٰ کیا اور نہ ہی ان کا بیٹا ہونے کا۔ اس سلسلے میں سورۃ مریم (۱۹) کی آیت (۳۰) میں جناب عیسیٰؑ کی پہلی گفتگو کا تذکرہ کیا گیا ہے اور فرمایا کہ: "کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا"۔

اس کے بعد اسی سورہ مریم (۱۹) کی آیت (۳۶) میں پھر فرمایا کہ: "اور بے شک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا بھی سو اسی کی عبادت کرو اور یہی سیدھا راستہ ہے"۔

(ہ) سیدہ مریمؑ کی پارسائی:

اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریمؑ کو اعلیٰ مرتبہ کے لیے منتخب فرمایا اور ان کی عظمت اور پارسائی قائم رکھتے ہوئے بغیر کسی مرد کی شرکت کے بیٹا عطا فرمایا اور اس بیٹے کو نبوت کے لیے منتخب فرمایا۔

قرآن حکیم کی سورۃ آل عمران (۳) کی آیات (۴۲) و (۴۳) میں بیان کیا گیا کہ:

"اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ نے تمہیں منتخب فرمایا اور پاک بنایا اور تمام جہان کی خواتین کے مقابلے میں منتخب فرمایا۔ اے مریم اطاعت کرتی رہو اپنے رب کی اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ"۔

فرشتے نے سیدہ مریمؑ سے کلام کیا اللہ کے حکم سے اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں منتخب فرمایا ہے، ان کی تابعداری کی وجہ سے اور اللہ کے سامنے عاجزی کی وجہ سے اور ان کی پاک دامنی کی وجہ سے اور معصومیت کی وجہ سے اور اللہ پر ایمان کی وجہ سے اور ان کے اس فضیلت کی وجہ سے جو اللہ نے انہیں عطا فرمایا۔

امام ترمذیؒ نے علیؓ بن ابی طالب کے حوالے سے کہا کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ "اپنے وقت کی بہترین خاتون مریمؑ تھیں عمران کی بیٹی اور اپنے وقت کی بہترین خاتون تھیں سیدہ خدیجہؓ زوجہ رسولؐ اللہ"۔ اس کے علاوہ ایک اور قول رسولؐ بھی ہے جسے تمام محدثین نے داؤد کے علاوہ قلمبند کیا ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "بہت سے مرد تکمیل انسانیت کی منزل پر پہنچے لیکن کوئی خاتون اس منزل پر نہ پہنچی سوائے سیدہ آسیہؓ کے جو فرعون کی زوجہ تھیں، سیدہ مریمؑ بنت عمران والدہ مسیحؑ اور سیدہ عائشہؓ زوجہ رسولؐ اللہ"۔ یہ قول رسولؐ اللہ سیدہ خدیجہؓ کی وفات کے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل آپؐ نے سیدہ خدیجہؓ کو بھی اپنے دور کی

بہترین خاتون فرمایا ہے۔

لہٰذا سیدہ مریمؑ خوش نصیب تھیں ایک خوش نصیب بچے کی والدہ بن کر بغیر شوہر کے۔

(و) مباہلہ:

اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے عیسائی وفد کے تمام دعووں کی نفی فرما دی جو انہوں نے جناب عیسیٰؑ اور سیدہ مریمؑ کے بارے میں کیے تھے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب فل کتاب اپنے نقطۂ نظر پر جم گئے تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران کی آیات (۶۰) اور (۶۱) کا نزول فرمایا جس میں فرمایا گیا کہ:

"یہ امر حق تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں۔ پھر جو بھی آپؐ سے حجت کرے (عیسیٰؑ کے بارے میں) اس کے بعد کہ آپؐ کے پاس تمام علم آ گیا (اللہ کی طرف سے) تو آپؐ فرما دیں کہ آؤ ہم (دونوں فریق) بلا لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے آپ اور تمہارے نفوس کو۔ پھر ہم سب مل کر دعا کریں اور اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو جھوٹے ہوں"۔

پھر جناب رسالت مآبؐ نے وفد کے اراکین کو دعوت مباہلہ دی۔ جس پر انہوں نے کہا کہ "اے ابو القاسمؐ! ہمیں سوچنے کا موقع دیں اس کے بعد ہم آپؐ کو اس کا جواب دیں گے"۔

اس کے بعد وہ وہاں سے چلے گئے اور آپس میں صلاح مشورہ کیا تو ان میں سے ایک نے خطاب کیا اور کہا کہ "اللہ کی قسم! اے عیسائی ساتھیو! تم جانتے ہو کہ محمدؐ پیغمبر ہیں اور وہ عیسیٰؑ کے متعلق صحیح بات کہہ چکے ہیں اور مباہلہ ان کے لیے خاتمے کا باعث ہوگا اگر انہوں نے قبول کر لیا تو"۔ اس نے مشورہ دیا کہ اگر انہوں نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے تو پھر انہیں محمدؐ سے معاہدہ کر لینا چاہیے اور واپس چلے جانا چاہیے۔

مشورے کے بعد وہ جناب رسولؐ اللہ کے پاس واپس آئے اور کہا "اے ابو القاسمؐ! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم مباہلہ نہیں کریں گے اور یہ کہ آپؐ اپنے مذہب پر رہیں اور ہم اپنے پر۔ آپ ہمارے ساتھ ایک شخص بھیج دیں اپنے ساتھیوں میں سے جسے آپ چاہیں تاکہ وہ ہمارے درمیان لین دین کے معاملات کے متعلق فیصلے کر سکے۔ ہمارے لیے آپ اس معاملے میں قابل قبول ہیں۔ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: "بے شک! میں تمہارے ساتھ ایک بھروسے والے

شخص کو بھیجوں گا جو سچا اور اعتماد والا ہوگا"۔

وہاں موجود تمام اصحاب کرامؓ خاص طور پر جناب عمر بن خطابؓ بہت بے چین تھے اور خواہشمند تھے کہ وہ جناب رسولؐ اللہ کے پسندیدہ اور اعتماد والے اور سچے ساتھی کے طور پر منتخب ہو جائیں۔ لیکن سب کو تعجب ہوا جب جناب رسولؐ اللہ نے جناب عبیدہ بن جراحؓ کو فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ اور جب وہ کھڑے ہو گئے تو جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "یہ ہے بھروسے والا شخص میری امت کا"۔ یقیناً یہ بہت بڑا اعزاز تھا جناب عبیدہ بن جراحؓ کے لیے کہ وہ امت کے قابل اعتماد شخص کا درجہ حاصل کر گئے جناب رسولؐ اللہ سے۔

(۱۸۷) جناب رسالت مآبؐ کا الوداع کعبہ اور آخری حج

اس سے قبل کہ جناب رسالت مآبؐ کے حج بیت اللہ کے متعلق کچھ بیان کیا جائے اور اس خطاب کے بارے میں جو آپؐ نے اپنی قوم کو آخری مرتبہ نصیحت کے طور پر فرمایا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کعبہ کے بارے میں تعارف کروایا جائے کہ یہ پتھروں کا بنا ہوا عام سا کمرہ کیونکر اللہ کے ہاں مقبول ٹھہرا اور کیونکر اللہ تعالیٰ نے اس چھوٹے سے کمرے کو اپنا گھر قرار دیا۔ اور تمام امت مسلمہ کو یہاں حاضری دینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہاں پہنچ کر میری (اللہ کی) تکریم عطا کیجیے اور جاہ وجلال کو پیش نظر رکھ کے اس گھر کا طواف کرو اور میری (اللہ کی) پاکیزگی اور تعریف بیان کرو اور یوں سمجھو کہ تم اللہ کی حضوری میں ہو اور اسے راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تم کیونکر ایک سیاہ رنگ کے پتھر کو چومتے ہو اور صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگاتے ہو۔

(الف) تعارف وتقدیس کعبہ:

اس کرۂ ارض پر جو سب سے پہلی جگہ تعمیر کی گئی وہ یہی جگہ ہے جسے کعبہ کہتے ہیں، اسے جناب آدمؑ نے فرشتوں کی مدد سے تعمیر کیا تاکہ وہاں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کی جائے۔ لیکن بعد میں جب طوفان نوحؑ سے یہ گھر بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تو پھر عرصہ دراز کے بعد جناب ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تو انہوں نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر اس گھر کی تعمیر نو اس جگہ کی جہاں پر یہ پہلے تھا۔ جبکہ اس کی بنیادوں کی نشانی کو فرشتوں نے جناب ابراہیمؑ پر ظاہر

کیا۔ اس کے بعد پھر جب اس عمارت کی حالت خستہ ہوگئی تو جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ میں اسے گرا کر اس کی تعمیر نو کی گئی۔ اس وقت جناب رسالت مآبؐ جوان تھے، لیکن اعلان نبوت ابھی نہ ہوا تھا۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے موقع عطا فرمایا کہ وہ حجر اسود کو اپنے ہاتھ سے اس جگہ پر لگائیں۔

کعبہ کی عمارت ایک مستطیل، چھوٹی سی اور نہایت ہی سادہ کمرے نما عمارت ہے۔ اس کا رقبہ ۴۱×۴۲×۳۳×۴۳ فٹ ہے۔ اس کے کونے تقریباً شرقاً غرباً، شمالاً اور جنوباً ہیں۔ اس کا ایک کونہ رکن یمانی، جنوب کو ظاہر کرتا ہے، رکن اسود مشرق کو جہاں حجر اسود ہے، رکن عراقی ظاہر کرتا ہے شمال کو اور رکن شامی ظاہر کرتا ہے مغرب کو۔

کعبہ کو بیت الحرام یعنی حرمت والا، احترام والا گھر کہتے ہیں، اسے بیت العتیق یعنی قدیم گھر بھی کہتے ہیں اور اسے بیت اللہ یعنی اللہ کا گھر بھی کہتے ہیں۔

اس گھر کو بیت المعمور کا متبادل بھی کہتے ہیں، جو ساتویں آسمان پر فرشتوں اور جو کوئی بھی وہاں رہتا ہے ان کے عبادت کرنے کی جگہ ہے۔ بیت المعمور کی تفصیل آئندہ مضمون میں کی جائے گی۔ کعبہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کے اقوال درج ذیل ہیں:

i) سورہ آل عمران (۳) کی آیت (۹۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بے شک پہلا گھر جو انسانوں کے لیے مقرر کیا گیا مکہ کے اندر جو مبارک ہے اور ہدایت کا منبع ہے تمام جہاں کی اقوام کے لیے اور جنوں کے لیے" یعنی یہ پہلا گھر مقرر کیا گیا جن و انس کی عبادت کے لیے اس دنیا میں۔

ii) سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۱۲۷) میں یہ فرمان ہے کہ:

"اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور ساتھ کہتے جا رہے تھے، کہ اے ہمارے رب! ہم سے (یہ ہماری خدمت) قبول فرما! بے شک آپ سب کچھ سننے والے اور جاننے والے ہیں"۔

iii) سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۱۲۵) کا ایک حصہ فرماتا ہے کہ:

"اور (یاد کرو) جب ہم نے (اللہ نے) بنایا اس گھر (کعبہ) کو انسانوں کے لیے رجوع کرنے کی جگہ اور امن کی جگہ"۔

کعبہ کو اللہ نے اپنا گھر بتانے کے بعد جبکہ وہ محترم اور متبرک بن گیا تو اسے اپنے پیغمبر محمدؐ

اور آپؐ کی امت کے لیے صلوٰۃ کے رخ کو متعین کرنے کی جگہ بھی بنا دیا، جسے قبلہ کہا جاتا ہے۔ یعنی دنیا کے جس حصے میں بھی صلوٰۃ ادا کریں تو اپنا رخ کعبے کی طرف کرلیں اور یہ قانون اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی آیت (۱۴۴) میں نازل فرمایا جس میں کہا گیا کہ:

"بے شک ہم نے تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا دیکھا، یقیناً ہم تمہیں پھیر دیں گے قبلہ کی طرف جو تمہیں خوش کردے گا، اس لیے اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف پھیر لو"۔

اس حکم سے پیشتر مسلمان اپنی صلوٰۃ میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے، جو کعبہ کے بعد دنیا میں دوسرا پہلا گھر ہے، اللہ کا۔

عام طور پر غیر مسلموں کو جو بت پرست ہیں، یہ کہتے سنا گیا ہے کہ مسلمان ہمارے اوپر تو بت پوجنے کا الزام لگاتے ہیں جبکہ یہ خود بھی تو پتھروں کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کا مطلب کعبہ سے ہے جو پتھروں سے چنا ہوا ہے۔ یہ ان کی کم فہمی کی وجہ ہے حالانکہ مسلمان اللہ کے سوا کسی بھی چیز کی پرستش نہیں کرتے۔ اگر خدانخواستہ کریں گے تو مسلمان ہی نہ رہیں گے۔ وہ تو صرف اپنی یکجہتی قائم کرنے کے لیے اپنی جماعتوں میں اور اپنی قوم میں، اپنی مسجدوں میں، اپنی صلوٰۃ میں تنظیم پیدا کرنے کے لیے نظم و ضبط پیدا کرنے کے لیے دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، کعبہ کی طرف اپنا رخ کرتے ہیں اور یہ بھی اللہ ہی کے حکم کے تحت کرتے ہیں، اپنی طرف سے نہیں، پرستش وہ صرف اللہ ہی کی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف (۷) کی آیت (۲۹) میں فرمایا ہے کہ:

"کہدو! کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کرنے کا اور یہ کہ تم اپنا رخ سیدھا رکھو اسی کی طرف عبادت کی ہر ایک جگہ پر اپنی صلوٰۃ میں اور صرف اسی کو ہی پکارا کرو اور اپنی عبادت صرف اسی کے لیے ہی خالص رکھا کرو"۔

(ب) بیت المعمور:

اللہ تعالیٰ جو سب تعریفوں کے لائق ہے بہت رحم والا اور صاحب جلال مالک، تمام جہانوں کا خالق شہنشاہوں کا شہنشاہ۔ اس نے سورۃ الطور (۵۲) کی آیت (۴) میں ان تمام باتوں کی سچائی کے لیے جو کچھ بھی اس نے فرمایا، قسم کھائی ہے "بیت المعمور" کی۔ بیت المعمور ساتویں آسمان پر کعبہ کی طرح کا اور کعبہ کے ہی متصل ایک گھر ہے، جو بنایا گیا فرشتوں کی

عبادت کے لیے اور جو کوئی بھی وہاں رہتا ہے، اس کی عبادت کے لیے۔ یہ گھر بھی کعبہ کی طرح کبھی خالی نہیں رہتا اور ہمہ وقت فرشتے اس کا طواف کرتے رہتے ہیں۔

امام ابن کثیرؒ نے ان الفاظ کی تشریح قول رسولؐ کے حوالے سے کچھ یوں کی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ جب اسراء اور معراج پر تشریف لے گئے اور یہ واقعہ بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے اس کے مطابق جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "پھر میں بیت المعمور کی طرف لے جایا گیا۔ اس گھر کے طواف کے لیے ہر روز ستر ہزار فرشتے آتے ہیں جن کو دوبارہ پھر یہ موقع میسر نہ آئے گا"۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی تعریف اور ذکر اس گھر کا طواف کرتے وقت کرتے ہیں بالکل اسی طرح سے جس طرح زمین پر انسان کعبے کا طواف کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ بیت المعمور ان لوگوں کے واسطے قبلہ ہے جو ساتویں آسمان پر قیام پذیر ہیں خواہ فرشتے یا انسان اور جو کوئی بھی ہیں۔ دوران معراج جناب رسالت مآبؐ کی ملاقات آپؐ کے دادا جناب ابراہیم سے اس وقت ہوئی جبکہ جناب خلیلؑ اپنی کمر بیت المعمور کی دیوار سے لگائے کھڑے تھے۔ اور یہ ابراہیم خلیل ہی تھے جنہوں نے زمین پر کعبہ کو دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ انہیں انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ مقام یعنی بیت المعمور کی قربت عطا فرمائی۔

سورۃ النجم (۵۳) کی آیت (۱۸) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بے شک اس (محمدؐ) نے دیکھی بہت بڑی نشانی اپنے رب کی (دوران معراج)"۔

ایک روایت کا بیان کرنا یہاں مناسب رہے گا، کہا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کا اظہار فرشتوں سے فرمایا اور کہا "میں زمین کے لیے اپنا نائب مقرر کرنے کے لیے آدم کی تخلیق کرنے والا ہوں"۔ تو اس پر فرشتوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا اور عرض کیا "کیا آپ وہاں بھیجیں گے ان کو جو وہاں فساد برپا کریں گے اور خون بہائیں گے، جبکہ ہم آپ کی شان میں آپ کی تعریفیں بیان کرتے ہیں اور آپ کا شکر ادا کرتے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔ (سورۃ البقرہ آیت ۳۰)

اس بات کا امکان ہے کہ فرشتوں نے سوچا ہو گا کہ یہ نئی مخلوق زمین پر جا کر ویسے ہی ہنگامہ و فساد برپا کرے گی جیسا کہ جنات وہاں کرتے رہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کو آدم کے خواص سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کو رد تو نہیں کیا لیکن یہ

فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے واقف نہیں ہیں کہ وہ آدم کو کیوں خلق کرنا چاہتا ہے اور پھر اسے زمین پر بھیجنا چاہتا ہے۔

یقین کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جواب اتنا متکبرانہ، رعب دار اور جلالی تھا جو کہ فرشتوں نے محسوس کیا اور انہیں گمان ہوا کہ کہیں انہوں نے اپنے رب کو ناراض تو نہیں کر دیا اور اس احساس پر ہی وہ خوفزدہ ہو گئے کہ کہیں اللہ کا عذاب ان کا احاطہ نہ کر لے۔ انہوں نے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی جواب دیا۔ اس لیے انہوں نے فوری طور پر عرش کی پناہ لے لی اور پھر اس کا طواف شروع کر دیا اور اپنے رب کی تسبیح کرنے لگے۔ ان کا مطلب یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنی بات پر از خود شرمندہ ہیں اور اللہ کی معافی کے خواستگار ہیں۔ فرشتوں کو اس طرح سے عبادت کرتے ہوئے دیکھ کر ان کی عاجزی اور معافی طلب کرنے کے طریقہ اور عبادت کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا۔ اور انہیں حکم دیا کہ وہ عبادت کے لیے گھر بنائیں جو عرش کے نیچے ہو اور وہی گھر بیت المعمور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اب عرش کے بجائے اس گھر کا طواف کریں۔ کہا کہ بیت المعمور کا طواف عرش کے طواف کا نعم البدل بنا دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آسانی پیدا کر دی کیونکہ عرش کا طواف یقیناً بہت ہی مشکل ہو گا کیونکہ عرش تو آسمانوں اور زمین پر محیط ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ عرش کا طواف قیامت تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورہ الزمر (۳۹) کی آیت (۷۵) میں فرمایا ہے کہ:

"تم دیکھو گے فرشتوں کو عرش کے گرد ہر طرف سے تعریفیں کرتے ہوئے اپنے رب کی"۔

اس کے علاوہ سورۃ الحقہ (۶۹) کی آیت (۱۷) میں فرمایا گیا کہ:

"اور فرشتے اللہ کے عرش کے گرد ہوں گے اور آٹھ فرشتے قیامت والے دن اپنے اوپر تمہارے رب کا عرش اٹھائے ہوئے ہوں گے"۔

(ج) طواف کعبہ:

چونکہ کعبہ کی موافقت و مناسبت بیت المعمور کے ساتھ ہے اور بیت المعمور کی موافقت عرش کے ساتھ، اس لیے کعبہ عرش کے ساتھ بھی موافقت رکھتا ہے اور اس کا متبادل ہے۔ اس لیے طواف کعبہ کوئی معمولی بات نہیں، یہ ایسا ہی ہے کہ جیسا آپ نے بیت المعمور کا طواف کیا اور گویا کہ عرش

کا طواف کیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو اپنا گھر قرار دے کر کعبہ کو عرش کا قائم مقام بنا دیا۔

اس لیے جب حاجی کعبہ کا طواف کرتے ہیں تو انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے لیے یہ بہت ہی قدر و منزلت کا مقام ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعزاز حاصل ہوا اور یہ عزت بخشی گئی کہ وہ عرش اور بیت المعمور کے قائم مقام کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے جب اللہ تعالیٰ کا ذکر و فکر کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں تو وہ انبیاء کے ساتھ ساتھ فرشتوں کی سنت بھی ادا کرتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ طواف کرتے وقت وہ اللہ کے گھر کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ اور اس طرح سے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح سے جس طرح کہ فرشتوں نے کوشش کی تھی عرش کے طواف کی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حضوری میں حاضر ہیں اس کے گھر کے در پہ ہیں، فقیروں کی طرح اس سے بخشش کی خیرات لینے کے لیے۔ اس سے رحم اور فضل اور اس کا کرم اور اس سے مغفرت مانگنے کے لیے آئے ہیں۔ اس لیے انہیں بہت احتیاط سے رہنا چاہیے اور بے انتہا ادب کے ساتھ عاجزی اور انکساری کے ساتھ اپنے مالک کے حضور گڑگڑاتے ہوئے، اپنی غلطیوں کی گناہوں کو اور اپنی کوتاہیوں کو اور اپنی نافرمانیوں کو معاف کرانے کے لیے۔ اپنے اللہ کے حضور یہ جانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے سامنے جلوہ فروز ہے اور جب وہ ان سے راضی ہو جائے گا تو انہیں معافی بھی مل جائے گی اور اس سے انعام و اکرام بھی پائیں گے۔ وہ ایسا سخی ہے کہ اپنے در سے کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا۔ پس اُسے خوش کرنے کی کوشش کریں اور اُسے راضی کرنے کی کوشش کریں، جیسا کہ ایک غلام اپنے آقا کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے طواف کا حکم اپنے بندوں کو سورۃ الحج (۲۲) کی آیت (۲۹) میں دیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

"پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں"۔

طواف کعبہ پرانے وقتوں سے کیا جا رہا ہے، یعنی کہ جناب ابراہیم خلیلؑ کے زمانے سے اور جناب اسمٰعیلؑ کے زمانے سے۔ لیکن اس کے بعد اس عبادت کی اصل روح ختم ہو گئی اور اس میں خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ اس وقت ہوا جب عربوں میں بت پرستی کا دور دورہ شروع ہوا اور

طواف میں بے شرمی کی حد تک بدعات پیدا ہو گئیں جس کی مذمت اللہ تعالیٰ نے سورہ اعراف (۷) کی آیات (۲۸) تا (۳۰) میں کی ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے سورۃ اعراف کی آیت (۲۸) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا کہ "میں کہتا ہوں کہ عرب ماسوائے قریش کے طواف برہنہ حالت میں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ ایسا لباس پہن کر طواف نہیں کریں گے جس سے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی ہو۔ اور جہاں تک قریش کا تعلق ہے انہیں اَحمس کہا جاتا تھا اور وہ اپنے روزمرہ کے کپڑوں میں طواف کرتے تھے اور جو کوئی بھی کسی اَحمس سے احرام خریدتا وہ ہی طواف کر سکتا تھا اور ایک مرتبہ طواف کے بعد وہ لباس کوئی دوسرا یا دوسری مرتبہ استعمال نہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح سے جو کوئی اہل قریش سے احرام نہ خرید سکتا وہ پھر بغیر لباس کے یعنی بغیر احرام کے طواف کرتا اور عورتیں بھی ایسا ہی کرتیں لیکن رات کے وقت"۔

قریش چونکہ کعبہ کے متولی تھے اس لیے حاجیوں کے لیے انہوں نے یہ شرط عائد کر رکھی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ ان کی کمائی کا ایک ذریعہ تھا۔ عرب کے بدوؤں میں ہر کوئی اس قابل نہ ہوتا کہ وہ احرام خرید سکتا اور چونکہ طواف کرنا ان کے لیے اہم تھا اس لیے انہوں نے بغیر کپڑوں کے ہی طواف کرنا گوارا کیا۔ یوں کہیے کہ ایک برائی نے ایک دوسری بڑی برائی کو جنم دیا اور اس برائی کو اس وقت کے معاشرے نے گوارہ کر لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس برائی کی مذمت سورہ اعراف کی آیت (۲۸) میں فرمائی جس میں کہا گیا کہ:

"اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا اور اللہ نے بھی ہمیں یہی بتلایا۔ کہیں (اے نبیؐ) کہ اللہ تعالیٰ فحش بات کی تعلیم نہیں دیتا۔ کیا اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جو تم جانتے نہیں"۔

پھر اس کے بعد سورہ اعراف کی آیت (۲۹) میں فرمایا گیا کہ:

"آپ کہہ دیں کہ میرے رب نے حکم دیا انصاف کرنے کا اور یہ کہ تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو اور اللہ کی عبادت ایسے کیا کرو کہ وہ خاص اللہ کے لیے ہی ہو اور تم دوبارہ ویسے ہی پیدا ہو گے جیسے کہ پہلے پیدا ہوئے تھے"۔

آخر کار جناب رسول اللہؐ اور آپ کی امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے طواف کرنے کے لیے ایک لباس مقرر فرما دیا۔ جو دو سفید چادروں پر مبنی ہے، جو صاف ستھری ہوں ایک جسم کے اوپر

والے حصے کے لیے اور دوسری نچلے کے لیے، یہ لباس ہے مردوں کے لیے اور خواتین کے لیے ان کا عام روزمرہ کا لباس ہے، جس میں ان کا چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کھلے ہوں۔

اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ طواف کرتے وقت کی حالت بالکل ایسی ہی ہوتی ہے جیسا کہ نماز کی حالت۔ امام ترمذیؒ نے لکھا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ: "کعبہ کے گرد طواف ایسا ہی ہے جیسا کہ صلوٰۃ، اس میں فرق صرف اتنا ہی ہے کہ تم اس کے درمیان بول سکتے ہو، اس لیے جو کوئی بھی طواف کی حالت میں گفتگو کرے تو اچھی گفتگو کرے"۔

(و) حجرِ اسود:

یہ کہا جاتا ہے کہ کالے پتھر کا یہ ٹکڑا جنت سے لا کر کعبہ کے سامنے والی پہاڑی ابوقبیس پر لا پھینکا گیا اور وہاں سے جناب ابراہیمؑ نے اسے اٹھا کے کعبہ کی دیوار کے ایک کونے میں لگا دیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ یہ سیاہ پتھر اللہ کے سیدھے ہاتھ کی نمائندگی کرتا ہے جو لوگوں سے ہاتھ ملاتا ہے۔

امام ترمذیؒ نے ابن عباسؓ کی ایک روایت لکھی ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "سیاہ پتھر جب جنت سے لایا گیا تھا تو وہ سفید کی طرح سفید تھا لیکن لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے سیاہ ہو گیا"۔

بخاریؒ اور ترمذیؒ نے عامر ابن ربیعؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "میں نے عمر بن خطابؓ کو حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا اور انہیں کہتے ہوئے سنا کہ "میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ تم ایک معمولی پتھر ہو اور تمہاری کوئی طاقت نہیں کہ تم کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکو۔ اگر میں نے جناب رسولؐ اللہ کو نہ دیکھا ہوتا کہ آپؐ نے تمہیں بوسہ دیا تھا تو میں تمہیں کبھی بوسہ نہ دیتا"۔

یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس پتھر کو بوسہ دینے سے ہم ایک روحانی تعلق کے ساتھ ساتھ جسمانی تعلق بھی پیدا کرتے ہیں ان شخصیات سے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب اور ہمارے لیے قابلِ قدر ہیں۔ ان شخصیات میں بلاشبہ ہمارے محبوب اور اللہ کے محبوب جناب رسالت مآبؐ اور ان کے دادا جناب اسمٰعیلؑ اور جناب ابراہیمؑ کے ہاتھ اور لب مبارک اس پتھر کے ساتھ لگے ہوں گے اور اسی جگہ کو چھونے کی سعادت ہمیں مل رہی ہے یعنی ان ہستیوں کے اور ہمارے لب اسی ایک جگہ کو چھو کر ایک دوسرے سے جسمانی تعلق پیدا کر رہے ہیں بے شک یہ تعلق اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ اس بات کا احساس اور ادراک پیدا نہ کر لیں اور اس جذبہ محبت و عقیدت کو مدِنظر نہ رکھیں۔

(ہ) رُکن یمانی:

چونکہ کعبہ کا جنوبی کونے کا رخ جنوب کی طرف ہے اور اس طرف ملک یمن ہے اس لیے اسے رکن یمانی کہتے ہیں جیسا کہ اس کا شمالی کونا رکن عراقی اور مغربی کونے کو رکن شامی کہا جاتا ہے۔

لیکن رکن یمانی کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لفظ یمانی نکلا ہے لفظ یمن سے جس کا مطلب ہے داہنے ہاتھ والا اور اسے اچھائی سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی خوش بختی سے۔ جیسے سورہ واقعہ (۵۶) کی آیت (۲۷) میں کہا گیا ہے "و اصحٰب الیمین" یعنی داہنے ہاتھ والے لوگ اور پھر ان کی خوش بختی کا بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کونے کو ہاتھ لگا کر اس ہاتھ کا بوسہ لیا جاتا ہے جبکہ حجر اسود کا بوسہ لیا جاتا ہے اور یہی دستور شروع سے چلا آ رہا ہے اور جناب رسولؐ اللہ نے بھی اسی کو جاری رکھا۔ اس کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ کعبے کا یہ کونہ اس کی تعمیر نو کے وقت جب ابراہیمؑ نے شروع کی تھی تو فرشتوں نے آپؑ کو یہی کونہ کھود کر اس کی بنیادیں ظاہر کرائی تھیں اور یہاں سے ہی کعبہ کی تعمیر شروع کی گئی تھی۔

(و) مقامِ ابراہیمؑ:

کعبہ کے سامنے ایک پتھر کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے جو جناب ابراہیمؑ کے اس وقت زیر استعمال رہا جب وہ کعبہ کی تعمیر نو کر رہے تھے یعنی اس پر کھڑے ہو کر کعبہ کی دیوار کی چنائی کرتے اور اس دوران جناب اسمٰعیلؑ ان کی مدد کرتے۔ یہ پتھر کا ٹکڑا نبوت کی جلالی کیفیت کی وجہ سے جناب ابراہیمؑ کے پاؤں کی جگہ سے نیچے دب گیا اور جناب ابراہیمؑ کے پاؤں کے نشانات پتھر پر آ گئے۔ یہ عمل کیمیائی یا معجزے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان نشانات کو اپنی نشانی قرار دیا اور حکم دیا کہ اس نشان کے پاس جا کر کعبہ کا ہر زائر دو رکعت صلوٰۃ ادا کرے۔ یہ حکم سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۱۲۵) میں موصول ہوا جس میں فرمایا گیا کہ:

"اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جس وقت ہم نے کعبہ کو لوگوں کا عبادت خانہ اور مقام امن بنایا (تو حکم دیا کہ) مقام ابراہیمؑ کو صلوٰۃ کی جگہ بنایا کرو۔ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے اس گھر کو خوب پاک رکھا کرو، زائرین کے واسطے اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے واسطے"۔

اسی طرح سے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۹۷) میں فرمایا گیا کہ:

"اس (کعبہ) میں کھلی نشانیاں ہیں اور ان میں ایک مقام ابراہیمؑ ہے، جو شخص اس میں

داخل ہو جائے وہ امن حاصل کر لیتا ہے، اور لوگوں کے لیے اس گھر کا حج کرنا مقرر کر دیا ہے، جو وہاں جانے کی استطاعت رکھتے ہیں"۔

امام بخاریؒ نے جناب ابن عمرؓ کی ایک روایت قلمبند کی ہے، کہ جناب رسول اللہؐ مکہ پہنچے، کعبے کا طواف کیا، سات مرتبہ اور پھر مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت صلوٰۃ ادا کی اور پھر آپؐ صفا کی طرف روانہ ہوئے۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "بے شک! اللہ کے رسولؐ تمہارے لیے مثال ہیں"۔

(ز) صفا و مروہ کی سعی:

صفا و مروہ کی سعی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۱۵۸) میں ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"بلاشبہ! صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی یادگار نشانیوں میں سے ہیں، اس لیے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ جو شخص عمرہ ادا کرے یا حج کرے، وہ ان کے درمیان طواف کرے اور جو کوئی بھی اپنی مرضی سے کوئی اچھائی کرے تو پھر اللہ اس خیر کی بہت قدر دانی فرماتے ہیں اور وہ اس خیر کرنے والے کی نیت کو خوب پہچانتے ہیں"۔

امام احمدؒ نے لکھا ہے کہ عروہ نے کہا کہ اس نے ام المومنین سیدہ عائشہؓ سے اس بارے میں دریافت کیا کہ اس جملے میں کہ: "اس بارے میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرے" کا کیا مطلب ہے جو کہ آیت بالا میں کہا گیا ہے۔ ام المومنین نے پھر فرمایا کہ ان الفاظ کا تعلق انصار کے ایک رواج سے ہے جو ان کے ہاں مقبول تھا جہالت کے دور میں۔ اس میں انصار مدینہ احرام باندھ کر اپنے بت منات کے حج کو جاتے تھے اور اس کی پوجا بھی کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ جو منات کا حج کیا کرتے تھے ان لوگوں کو مسلمان بننے کے بعد یہ تردد ہوا کہ وہ صفا اور مروہ کا طواف کر کے کہیں منات کے حج ہی کی طرح تو نہیں کر رہے۔ اس لیے انہوں نے اس بارے میں جناب رسول اللہؐ سے ایمان لانے کے بعد رجوع فرمایا۔ اس پر آیت مذکورہ بالا کا نزول عمل میں آیا اور پھر یہ عمل یعنی طواف صفا و مروہ کے دوران اللہ تعالیٰ کا ذکر و فکر کرنا سنت رسول اللہ بن گیا۔

(ح) طواف صفا و مروہ کا اجرا:

امام ابن کثیرؒ نے ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ طواف

صفا و مروہ کی ابتدا ہوئی۔ جناب ابراہیم خلیل کی زوجہ سیدہ ہاجرہؓ جو والدہ ماجدہ تھیں جناب اسمٰعیل کی۔ جب وہ پریشانی کے عالم میں اپنے بچے اسمٰعیل کی زندگی بچانے کی غرض سے پانی کی تلاش میں صفا سے مروہ تک آتیں اور جاتیں کہ شاید کہیں پانی کے آثار نظر آ جائیں۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب جناب ابراہیم اس صحرا میں جو پھر مکہ شہر میں تبدیل ہو گیا اپنی صاحبہ ہاجرہؓ اور اپنے شیر خوار بچے اسماعیل کو اللہ کے حکم سے وہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جب سیدہ نے یہ سمجھ لیا کہ اب تو ان کا بچہ اس بیابان میں بغیر پانی زندہ نہ رہ سکے گا تو انہوں نے اس پریشانی کے عالم میں اپنے رب کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ ان کی حالت اس وقت جب وہ اپنے رب کے آگے پکار کر رہی تھیں تو نہایت ناگفتہ بہ تھی، کہ عاجزی و انکساری، خوف و امید اور آہ و بکا کی کثرت میں حالت میں اپنے رب کے حضور اپنی بے بسی کا اظہار کر رہی تھیں۔ اس حالت میں صحرا کی تنہائی اور موت کا خوف بھی حائل ہوگا اور بچے کی زندگی کا خوف علیحدہ ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مالک کی مرضی بھی ملحوظ خاطر ہوگی۔ تبھی مالک نے اپنی غلام کی آواز سنی، ان کی عاجزی اور بے کسی اور آہ و بکا کی حالت میں اپنے مالک کا پکارنا مالک کو اچھا لگا اور پھر رب کریم نے ان کی مصیبت، پریشانی اور مجبوری اور تکلیف دور فرمائی اور انہیں پانی کا چشمہ عطا فرمایا جو بچے اسماعیل کے قدموں کے نیچے سے اللہ تعالیٰ نے جاری و ساری کیا۔ جب اس چشمے کا پانی بہہ کر آگے جانے لگا تو سیدہ نے سمجھا کہ پانی کہیں دور نہ چلا جائے چنانچہ آپ نے فرمایا "زم زم" یعنی ٹھہر جا ٹھہر جا۔ تو پانی رک گیا اور وہیں ٹھہر گیا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کو سیدہ ہاجرہؓ کی یہ ادا پسند آئی اور اس میں پسند آنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس محترم خاتون نے اس مصیبت اور خوف کے عالم میں نہ صرف اس اضطرابی کیفیت کا سامنا کیا بلکہ اس حالت میں اپنے مالک کی تسبیح، ذکر اور ثناء اپنی زبان پر جاری رکھا اور مالک سے مدد کی درخواست بھی جاری رکھی تو اللہ تعالیٰ کو ان کا اس حالت زار میں اس کی تسبیح کرنا اچھا لگا اور اسے اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک اپنے بندوں کو جاری و ساری رکھنے کا حکم صادر فرما دیا۔

چنانچہ زائرین کعبہ جب صفا و مروہ جائیں تو وہ دل میں عبودیت کا وہ جذبہ پیدا کریں جو سیدہ ہاجرہؓ کے قلب میں تھا اور اسی عاجزی و انکساری اور یقین کے ساتھ اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔

(ط) حج و عمرے کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے سورۃ آلِ عمران (۳) کی آیت (۹۷) میں حکم صادر فرمایا کہ:

"اور حج اس گھر (کعبہ) کا اللہ کے لیے ذمہ ہے ان لوگوں پر جو استطاعت رکھتے ہوں اس سفر کے تحمل کی۔ اور پھر جو کوئی انکار کرے گا تو پھر اللہ کو ایسے لوگوں کی (یعنی انس و جن کی) کوئی ضرورت نہیں"۔

اس کے علاوہ سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۱۹۶) میں حکم دیا گیا ہے کہ: "اور ادا کرو حج و عمرہ اللہ کے لیے"۔ اور اس کے بعد حج کے تمام ارکان بیان کیے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حج فرض کیا گیا ہے ہر ایمان والے شخص پر کم از کم ایک مرتبہ اس کی زندگی میں۔ اگر وہ شخص حج کا خرچہ اور اپنے اہل کا خرچہ جنہیں وہ چھوڑ کر جا رہا ہو برداشت کر سکتا ہو۔ اس پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے گھر والے دوسرے افراد کو بھی حج کرائے اگر وہ خرچ کر سکتا ہے۔

حج جناب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے دور میں فرض کیا گیا تھا، تا کہ لوگ جا کر اللہ کے گھر حاضری دیں اور اس کی تسبیح و ثناء بیان کریں۔ بنیادی رکن تو حج کے یہ تھے کہ کعبہ کے طواف کے بعد عرفات میں ٹھہریں اور قربانی کے بعد حج پورا کریں۔ لیکن بعد میں جب لوگ دینِ ابراہیم کو چھوڑتے چلے گئے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو پھر انہوں نے بتوں کی طرف رجوع کر لیا اور کفر اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے حج کرنا تو نہ چھوڑا لیکن حج کے طریقہ کار کو مسخ کر دیا۔ اللہ کے شریک بنائے اور ان شریکوں کے لیے قربانیاں کرنے لگے اور اللہ کے گھر کو بت کدہ بنا کے اس کا طواف شروع کر دیا۔

جناب رسالت مآبؐ نے اعلانِ نبوت سے پہلے اور بعد کفار کے ساتھ بھی حج کیا۔ جبکہ آپؐ مکہ میں ہی تشریف فرما تھے۔ لیکن مدینہ تشریف لے جانے کے بعد آپؐ صرف ایک ہی مرتبہ عمرہ کر سکے اور وہ بھی صلح حدیبیہ کے بعد۔ مسلمانوں کو نویں ہجری میں موقع ملا کہ وہ اپنے طریقے سے حج کریں لیکن کافروں نے بھی ان کے ساتھ اپنے جاہلانہ طریقے سے حج کیا۔ اسی لیے اس سال جناب رسولؐ اللہ حج ادا نہ کر سکے کیونکہ انہوں نے گوارہ نہ کیا کہ وہ کفار و مشرکین کے ساتھ حج ادا کریں۔ چنانچہ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے حکم صادر فرمایا کہ آئندہ انہیں حج کے

لیے اجازت نہ ملے گی اگر انہیں حج کرنا ہے تو وہ ایمان کے دائرے میں داخل ہو کر اللہ کے حکم کے مطابق حج کریں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے لیے کم از کم ایک مرتبہ پوری زندگی میں حج کرنا فرض کر دیا گیا۔

اس بارے میں جناب رسولؐ اللہ کا بھی قول ہے کہ "حج ایک ہی بار ہے سو جو بھی زیادہ مرتبہ کرنا چاہے یہ ضروری نہیں"۔ (ابوداؤد و احمد)

یہ عرض کرنا بہت ضروری ہے کہ ابن حبان نے اپنی صحیح اور البیہقی دونوں نے ایک حدیث قدسی نقل کی ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ بے شک ایک غلام جسے میں نے تندرست جسم عطا کیا ہو اور اس کو میں نے استطاعت بھی دی ہو اور اسے پانچ برس گزر جائیں اور وہ میرے پاس نہ آئے (حج کے لیے) تو پھر وہ محروم رہا"۔

اس کے علاوہ درج ذیل اقوال رسولؐ اللہ برائے حج پیشِ خدمت ہیں:

i) حج مبرور (مقبول) کے لیے کوئی صلہ نہیں سوائے جنت کے۔ (بخاری و مسلم)

ii) بوڑھوں، کمزوروں اور عورتوں کا جہاد ان کا حج مبرور ہے۔ (نسائی)

iii) عمرے سے عمرے تک باعثِ بخشش ہے جو ان کے درمیان ہوا اور کوئی اجر نہیں حج مبرور کا جنت کے علاوہ۔ (بخاری)

iv) جو کوئی روکا نہیں گیا کسی خاص وجہ سے یا بیماری کی وجہ سے یا کسی جبر کی وجہ سے اور وہ حج نہیں کر سکا تو اگر وہ چاہے تو اسے مرنے دو یہودی یا عیسائی ہو کر۔ (احمد و بیہقی)

(ی) حجِ رسالت مآبؐ:

جب نویں ہجری میں حج کا حکم اللہ کی طرف سے صادر ہوا سورۃ آلِ عمران کی آیت (۹۷) کے تحت، تو جناب رسولؐ اللہ نے فوراً ہی آئندہ حج جو کہ دسویں ہجری میں ہوا تھا اس کا ارادہ کر لیا۔ یہ آپؐ کا پہلا اور آخری حج تھا اس کے فرض ہونے کے بعد۔ اسی لیے اس اکلوتے حج کو "حجۃ الوداع" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ جناب رسالت مآبؐ کا آخری دورہ تھا اپنی قوم سے خطاب کرنے کے لیے میدانِ عرفات اور منیٰ میں اور آخری دورہ تھا اللہ کے گھر کا، اور اپنے شہر مکہ کا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو وہ دن دیکھنا نصیب فرمایا کہ آپؐ (۲۳) برس کی جدوجہد اور انتھک کوشش کے بعد اپنے گرد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیروکار جمع کرنے میں

کامیاب ہوئے جنہیں آپؐ نے اپنے آخری دانشمندانہ خطاب سے بہرہ مند فرمایا اور یہ خطاب
آپؐ نے وادی عرفات میں دس ہجری کے آخری ماہ ذی الحج کی نو (۹) تاریخ کو ہوا۔

آپؐ کا یہ آخری خطاب آپؐ کی تمام زندگی کے علم اور تدریس کا بہترین نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ آپؐ نے اپنی قوم تک جو علم پہنچایا اس میں الہامی علم جو آپؐ کو قرآن کی صورت میں ملا اور اس کے علاوہ آپؐ کو دانش کے ذریعے ملا اور وہ الہامی علم جو قرآن کے علاوہ آپؐ کو حاصل ہوا اور وہ علم جو آپؐ کے ذاتی کردار پر محیط تھا۔

وہ دن ایسا یادگار اور تاریخی اہمیت کا دن تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان بھی فرما دیا کہ اللہ کے رسول محمدؐ نے اپنا مشن مکمل کرلیا اور دین بھی مکمل ہوگیا۔ یہ حکم سورۃ المائدہ (۵) کی آیت (۳) میں نازل ہوا جس میں فرمایا گیا کہ:

"آج کے روز تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا۔ اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کردیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کرلیا"۔

پس دس ہجری میں جب جناب رسولؐ اللہ نے اپنے حج کے ارادے کو ظاہر فرمایا تو مدینہ کے لوگ اور تمام عرب کے لوگ جو اس سفر پر جانے کی استطاعت رکھتے تھے انہوں نے حج پر جانے کی تیاری شروع کردی اور مدینہ کے باہر ایسے لوگوں کے لیے ایک کیمپ لگا دیا گیا تاکہ وہ جناب رسالت مآبؐ کی قیادت میں حج کے لیے روانہ ہوسکیں۔

جناب رسالت مآبؐ نے ماہ ذیقعدہ کے آخری ہفتے میں حج پر روانہ ہونے سے پہلے غسل فرمایا اور اس کے بعد سیدہ عائشہؓ نے آپؐ کو خوشبو لگائی اور پھر آپؐ نے احرام زیب تن فرمایا۔

ابن کثیرؒ نے امام شافعی، بخاری اور مسلم کے حوالے سے سیدہ عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جناب رسولؐ اللہ احرام پہننے سے قبل اور پھر اتارنے کے بعد غسل فرماتے اور خوشبو کا استعمال فرماتے"۔

راستے میں آپؐ ذوالحلیفہ کے مقام پر ٹھہرے تاکہ آپؐ کے ہمسفر احرام باندھ سکیں۔ آپؐ کے ساتھ قربانی کے جانور بھی تھے۔ جب آپؐ مکہ کی جانب روانہ ہوئے تو آپؐ نے تلبیہ کہنی شروع کردی۔ جس کا مطلب تھا کہ "میں حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں، آپ کا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔ یقیناً تمام تعریفیں، عزت اور حکومت آپ ہی کی ہے آپ کا کوئی شریک نہیں"۔

یہ الفاظ جناب ابراہیمؑ کی اس پکار کے جواب میں آپؐ نے کہے جو انہوں نے اہل انسان کی ارواح کو دی تھی کہ وہ آئیں اللہ کے گھر کی طرف اور حج کریں اللہ کے گھر کا اور یہ انہوں نے اپنے رب کی ہدایت کے مطابق کیا تھا۔ جو سورۃ الحج (۲۲) کی آیت (۲۷) میں بیان کی گئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور پکارو انسانوں کو حج کے لیے، وہ تمہاری طرف آئیں گے، پیدل اور ہر ایک دبلی اونٹنیوں پر بھی، وہ آئیں گے دور دراز راستوں سے اور پہاڑوں سے"۔

جناب ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ لوگوں کو بلائیں کہ وہ آکر حج کریں۔ جب انہوں نے حیرانگی کا اظہار کیا کہ لوگ ان کی آواز کیسے سنیں گے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اُن کی آواز کو لوگوں تک پہنچا دیں گے اور وہ اس آواز کا جواب دیں گے اس لیے ہر ایک حاجی احرام باندھنے کے بعد جناب ابراہیمؑ کی پکار کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "اے اللہ! میں حاضر ہوں، اے اللہ! میں حاضر ہوں"۔

اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ کا قافلہ مکہ پہنچا تو آپؐ نے سب کے ساتھ طواف کعبہ کیا، پھر صفا مروہ کی سعی کی اور احرام کھول دیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ ہم اپنی صلوٰۃ سے باہر آتے ہیں۔

پھر جناب رسالت مآبؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ وہ لوگ جو اپنے ساتھ قربانی لائے ہیں اپنے احرام کھول دیں اور وہ اپنے احرام دوبارہ حج شروع ہوتے وقت پہنیں گے، جبکہ دوسرے تمام لوگ احرام میں ہی رہیں گے حج کرنے تک۔

اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ نے حج شروع فرمایا اور منیٰ کے لیے روانہ ہوگئے اور یہ ذی الحج کی آٹھ تاریخ تھی۔ وہاں پر آپؐ نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی صلوٰۃ اور پھر فجر کی صلوٰۃ ادا کیں۔ اور پھر سورج طلوع ہونے کے بعد نو ذی الحج کو آپؐ وادی عرفات روانہ ہوئے اور نمرہ کے مقام پر خیمہ زن ہوگئے۔ اب اس مقام پر اسی نام سے یعنی مسجد نمرہ ہے۔ وہاں پر ظہر اور عصر کی صلوٰۃ اکٹھی پڑھیں اور پھر اس کے بعد جناب رسولؐ اللہ اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے۔ اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور عرفات کی پہاڑی کے قریب اپنی اونٹنی پر ہی بیٹھے ہوئے اپنی قوم سے خطاب فرمایا، جو حج کے لیے آپؐ ہی کے ساتھ آئے تھے۔ عرفات کے بعد دوسرے روز یعنی دس ذی الحج کو جب منیٰ تشریف لے گئے تو قربانی کے بعد پھر آپؐ نے قوم سے خطاب فرمایا یہ

دونوں خطاب ایک ہی خطاب کے نام سے مشہور ہیں اور ریکارڈ میں ایک ساتھ درج کیے گئے ہیں اور یہی خطبہ "حجۃ الوداع" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ تمام کا تمام خطاب جناب رسالت مآبؐ کا ایک جگہ پر نہیں ملتا۔ اس لیے علماء اور مورخین نے خطاب کے ان حصوں کو جو مختلف ذرائع سے حاصل ہوئے اور ان پر تحقیق ہوئی کہ وہ خطابات جناب رسالت مآبؐ کے ہی ہیں تو انہیں جمع کیا۔ ان خطابات کے حصوں کا ذریعہ ابن اسحاقؒ، ابن ہشامؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، داؤدؒ اور ترمذیؒ ہیں۔

جناب رسالت مآبؐ کا خطاب حج کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کی بڑائیاں اور تقدیس بیان کرنے کے بعد درج ذیل الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے:

"اے لوگو! سنو غور سے جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ تمہیں کبھی ملوں گا اس جگہ پر دوبارہ اس سال کے بعد۔ یہ تمہارے لیے جائز نہیں، کہ کسی کا خون بہاؤ یا کسی کی ملکیت پر قبضہ کرو (غیر قانونی طریقے پر) یہ تمہارے لیے ایسا ہی حرام ہے جیسا کہ تم خون بہاؤ اس دن جیسا کہ آج کا روز ہے اور اس ماہ میں جیسا کہ آج کا حرمت والا مہینہ ہے اور ایسے حرمت والے شہر میں جیسا کہ یہ شہر مکہ ہے"۔

"خبردار! زمانہ جہالت کے تمام رسم و رواج اب میرے پاؤں کے نیچے ہیں، زمانہ جہالت کا خون اب معاف ہو چکا ہے سب سے پہلے خون کا بدلہ جو میں ختم کر رہا ہوں وہ ابن ربیعہ بن حارث کا خون ہے (یہ جناب رسولؐ اللہ کا چچازاد تھا، جس کی پرورش بنو سعد میں ہوئی تھی اور جسے ھذیل نے قتل کیا تھا) سود حرام کیا جا رہا ہے اور اس معافی کی شروعات میں عباس بن عبدالمطلب کے سود کی عام معافی سے کرتا ہوں (عباس آپؐ کے چچا تھے)، جو انہوں نے لوگوں سے وصول کرنا تھا یوں سمجھیے کہ وہ سارے کا سارا ادا ہو گیا"۔

"اے لوگو! اللہ سے ڈرو، عورتوں کے معاملے میں، بے شک تم نے انہیں اللہ کی ضمانت پر حاصل کیا تھا اور اللہ کے حکم سے ان کی ذات تم پر جائز قرار دی گئی۔ یہ تم پر لازم ہے کہ ان کے ازدواجی حقوق کی عزت کرو اور ان کے ساتھ ناشائستہ زبان اختیار نہ کرو، ایسی زبان کہ اگر وہ تمہارے ساتھ اختیار کریں تو تم انہیں برا بھلا کہو۔ اگر تمہاری بیویاں تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور تمہاری وفادار رہیں تو انہیں اچھی طرح سے کھلاؤ اور پہناؤ"۔

"بے شک میں تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت، جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہو گے تو تم کبھی بھی غلط راستے پر نہیں جا سکو گے"۔

"اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور تمہارے بعد کوئی اور امت نہیں آئے گی اس لیے میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت صلوٰۃ ادا کرو، رمضان کے مہینے میں روزے رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو خوشی کے ساتھ۔ میں ہدایت کرتا ہوں تمہیں کہ اللہ کے گھر کا حج کرو اور ان کا حکم مانو جو تمہارے سربراہ بنائے گئے ہیں اور پھر تم کو انعام دیا جائے گا تمہارے رب کی جنت میں داخلہ"۔

"اور اگر تم سے سوال کیا جائے گا میرے متعلق تو پھر تم کیا کہو گے؟"

انہوں نے جواب دیا کہ "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے ہمیں پیغام حق پہنچا دیا اور اپنی ذمہ داریاں پوری کر دیں"۔

پھر جناب رسولؐ اللہ نے اپنی انگلیاں آسمان کی طرف بلند فرمائیں اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اے اللہ! آپ گواہ رہیں"۔ یہ جملہ آپؐ نے تین مرتبہ دہرایا۔

جناب رسولؐ اللہ کا خطاب ساتھ ہی ساتھ اونچی آواز میں ربیعہ بن امیہ بن خلف دہراتے جاتے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک آپ کا پیغام پہنچ سکے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ (۵) کی آیت (۳) کے ذریعہ یہ اعلان فرمایا کہ:

"آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا تمہارے لیے، اور اپنی عنایات تمہارے اوپر مکمل کر دیں اور تمہارے لیے چن لیا اسلام کو تمہارا دین"۔

اس اعلان کو سنتے ہی جناب عمرؓ کی چیخ نکلی، جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں چیخے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "عروج کے بعد ہمیشہ زوال آتا ہے"۔

اس کے بعد جناب بلالؓ نے نماز کے وقت کا اعلان کیا اور بعد میں اقامت کہی۔ پھر جناب رسالت مآبؐ نے ظہر اور عصر علیحدہ علیحدہ ایک ہی وقت میں صلوٰۃ ادا کیں۔ اس کے بعد آپؐ اپنی اونٹنی پر سوار ہو گئے اور پھر بعد از غروب آفتاب مزدلفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں پر آپ نے مغرب اور عشاء کی صلوٰۃ ایک ہی اذان کے ساتھ پڑھیں اور پھر وہیں لیٹ گئے اور صبح کے وقت بعد صلوٰۃ الفجر یعنی دس ذی الحج کی صبح کو منیٰ روانہ ہو گئے۔ وہاں آپؐ نے سات عدد کنکریاں بڑے

جمرہ پر پھینکیں اور ہر کنکری پر "اللہ اکبر" پکارتے اور اس کے بعد آپؐ نے تلبیہ کہنا بند کر دی۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جمرا کی جمع ہے جمرہ کی۔ یہ ان تین جگہوں کی نشان دہی ہے جہاں شیطان نے کوشش کی تھی بہکانے کی جناب ابراہیمؑ کو اور جناب اسمٰعیلؑ کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے اور قربان ہونے کے فیصلے سے جو انہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر کیا تھا۔ ان تین میں پہلا جمرہ وہ ہے جہاں ابلیس نے جناب ابراہیمؑ کو بہکایا تھا اور دوسرا جمرہ وہ ہے جہاں ابلیس نے سیدہ ہاجرہؑ کو بہکایا تھا کہ وہ جناب ابراہیمؑ کو اس کام سے منع کریں اور تیسرا جمرہ وہ ہے جہاں ابلیس نے بہکایا تھا اسمٰعیلؑ کو کہ وہ اپنے آپ کو اس قربانی سے بچالیں۔ تینوں ابلیس کے بہکانے پر فوراً جناب جبرئیلؑ نے جناب ابراہیمؑ کو ان تینوں جگہوں پر کہا کہ وہ ابلیس کو سات سات مرتبہ کنکریاں ماریں جس پر وہ وہاں سے دفع ہو گیا۔ چنانچہ یہ کنکریاں مارنا ان تینوں جگہوں پر ایک تو سنت ابراہیمی کی یاد دلاتا ہے اور دوسرا امت کے لوگوں کو یہ یاد کراتا ہے کہ ابلیس تمہارے پیچھے تمہیں بہکانے کے لیے ہر وقت سرگرم رہتا ہے لہٰذا تمہیں یہ چاہیے کہ ہر وقت ابلیس کے شر سے اپنے آپ کو بچائے رکھو، ورنہ یہ تمہیں جہنم میں دھکیل کر رہے گا۔

یہاں آپ کی معلومات کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پہلے اور دوسرے جمرہ کا درمیانی فاصلہ (۱۵۰) ایک سو پچاس میٹر ہے اور پھر دوسرے سے تیسرے کے درمیان فاصلہ (۲۲۵) دو سو پچیس میٹر ہے اس طرح ان کا کل فاصلہ (۳۷۵) میٹر ہے۔

پھر جناب رسالت مآبؐ جانور قربان کرنے کی جگہ پہنچے جہاں آپؐ نے (۶۳) تریسٹھ اونٹ اپنے دست مبارک سے نحر کیے۔ اور بقیہ (۳۷) سینتیس اونٹ جناب علیؑ کے حوالے کر دیے کہ وہ آپؐ کی طرف سے نحر کر دیں۔ اس طرح سے آپؐ نے ایک سو اونٹ قربان کیے۔ اس قربانی کی تعداد میں یہ خاص بات ملتی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کی زندگی کی مطابقت سے آپؐ نے (۶۳) اونٹ بذاتِ خود نحر فرمائے جبکہ آپؐ کی عمر مبارک بھی (۶۳) برس ہی تھی۔ اور آپؐ قربانی والے دن کے ٹھیک نوے (۹۰) روز کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اور قربانی کی کل تعداد یعنی ایک سو اونٹ اس قربانی کی تعداد سے ملتے ہیں جو آپؐ کے دادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ جو کہ رسالت مآبؐ کے والد ماجد تھے ان کی جان بچانے کے عوض قربان کیے تھے۔

دس ذی الحج کے روز جناب رسالت مآبؐ نے اپنی قوم سے دوبارہ خطاب فرمایا اور جناب علیؑ اس خطاب کو زور دار آواز میں دہراتے رہے تاکہ دور دور تک لوگ سن لیں۔ جناب رسالت مآبؐ نے اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور تقدیس بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ:

"یہ وقت اس وقت سے مطابقت اختیار کر رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا فرمائے تھے۔ ایک سال بارہ ماہ پر مشتمل ہوتا ہے، جن میں سے چار ماہ محترم ہوتے ہیں، جن میں تین تسلسل کے ساتھ آتے ہیں اور وہ ہیں ذیقعد، ذوالحج اور محرم جبکہ چوتھا ہے ماہ رجب۔ تو پھر یہ کون سا مہینہ ہے؟" آپ نے سوال کیا۔

لوگوں نے جواب دیا "اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں"۔ آپؐ چند لمحے خاموش رہے اس پر لوگوں نے گمان کیا کہ شاید آپؐ اس ماہ کا نام تبدیل کر رہے ہیں۔

"کیا یہ ذوالحج نہیں ہے؟" آپؐ نے حیرانگی سے پوچھا۔

ہاں، یہ ہے!" لوگوں نے جواب دیا۔

پھر آپؐ نے پوچھا: "یہ شہر کیا کہلاتا ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا: "اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں"۔

آپ چند لمحوں کے لیے خاموش رہے تو لوگوں نے خیال کیا کہ آپ اس شہر کا کوئی دوسرا نام دے رہے ہیں۔

"کیا یہ البلد نہیں ہے (یعنی شہر مکہ)؟" آپ نے فرمایا۔

"ہاں یہ ہے"۔ لوگوں نے کہا۔

پھر آپؐ نے فرمایا: "آج کیا دن ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا "اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں"۔

پھر آپؐ چند لمحوں کے لیے خاموش رہے اور حیرانگی سے پوچھا "کیا یہ یوم النحر (قربانی کا روز) نہیں؟"

"ہاں یہ ہے"۔ لوگوں نے جواب دیا۔

اس کے بعد جناب رسول اللہؐ نے خطاب فرمایا اپنی قوم سے اور کہا کہ:

"اے لوگو! ایک دوسرے کا خون بہانا اور کھانا یا لینا ایک دوسرے کا خورد و نوش کا مال (بغیر

اجازت کے) اور تمہاری عزت، یہ سب کے سب نا جائز ہیں یعنی حرام ہیں۔ یہ بھی غیر قانونی ہے کہ ان کی عزت کو پامال کیا جائے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے محترم ہیں جیسا کہ یہ محترم دن اس محرم ماہ کا اس محترم شہر میں''۔

''تم لوگ اپنے مالک کے پاس جاؤ گے واپس (موت کے بعد) وہاں پر تم لوگوں کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اس لیے ان لوگوں کی طرح تبدیل نہ ہو جانا جو پھر جاتے ہیں اپنے دین سے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں''۔

''کیا میں نے تمہیں پیغام مکمل پہنچایا (اپنے رب کا)؟''

''ہاں! آپ نے پہنچا دیا''۔ لوگوں نے کہا۔

''اے اللہ! آپ گواہ رہیں! جو لوگ اس وقت حاضر ہیں وہ اس (پیغام) کو ان تک پہنچا دیں جو غیر حاضر ہیں۔ ہو سکتا ہے بہت سارے لوگ جن کو پیغام پہنچایا جائے گا وہ زیادہ توجہ کریں اس پر ان کی نسبت جو یہاں موجود ہیں''۔ آپؐ نے فرمایا۔

اس کے بعد تین روز یعنی گیارہ تا تیرہ ذوالحج تک جناب رسالت مآبؐ نے منیٰ میں ہی قیام فرمایا اور اللہ کی یاد میں مصروف رہے اور زائرین کی تدریس فرماتے رہے۔ آپؐ ان تین روز میں متواتر ہر روز صبح کے وقت تینوں جمروں پر سات سات کنکریاں پھینکتے رہے اور تیرہ تاریخ کو آپؐ مکہ تشریف لے گئے اور وہاں آپؐ نے طواف وداع یعنی الوداعی طواف کیا۔ اور یہ آپؐ کی زندگی کا آخری طواف تھا۔ اس کے بعد آپؐ نے چودہ (۱۴) تاریخ کو بیت اللہ کو، شہر مکہ کو بھی الوداع فرمایا اور مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

(ک) جناب رسالت مآبؐ کے حج کا ما حاصل:

i) سورۃ مائدہ (۵) کی آیت (۳) میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اعلان فرمایا کہ اس نے دین اسلام کو مکمل فرما دیا اور جناب رسول اللہؐ کا مشن پایہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ اس اعلان کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و دانش میں سے جس قدر بھی علم حضرت انسان کو عطا فرمانا تھا اور جو پروگرام اللہ تعالیٰ نے سلسلہ پیغمبری کا اس واسطے بنایا تھا، کہ انسان کی تربیت اس کی سماجی اور سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی ترقی اور اخلاقی تعمیر اور تربیت (انبیاء کے ذریعہ سے) وقتاً فوقتاً کی جائے اُس کی تکمیل ہو گئی تھی۔

جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص علم الہام فرمایا اور انبیاء کو اس کے پھیلانے کا ذریعہ بنایا اور اس مقصد کے لیے اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو منتخب فرمایا، جس کی انتہا اور تکمیل جناب حیات محمدؐ پر ہوئی یعنی دس ہجری کے بارہویں ماہ کی نو تاریخ کو وہ پروگرام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اور پھر انسانیت کے لیے الہام کے دروازے بند کر دیے گئے اور ساتھ ہی نبوت کے دروازے بھی بند ہو گئے اور انسانیت اپنے عروج پر پہنچ گئی اور اب یہی رسالت محمدؐ اور الہام منجانب اللہ جو قرآن اور سنت رسولؐ کی صورت میں ہے وہ قیامت تک انسان کی راہبری کرتے رہیں گے۔

درحقیقت اگر آپ غور فرمائیں تو یہ دن جس دن تکمیل الہام و نبوت و دین اسلام کا اعلان ہوا وہی اعلان حقیقت میں آمد قیامت کا اعلان بھی تھا۔ کیونکہ قیامت تک کا پروگرام اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا، کہ اب انسان کی مزید تربیت کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے اپنی تعلیم کا پروگرام مکمل کر لیا ہے اور اب اس کے امتحان کا وقت اپنے آخری مراحل سے گزر رہا ہے اور اب صرف اس کا نتیجہ نکلنے والا ہے اور وہ دن اب قریب ہی ہے۔

ii) جناب رسالت مآبؐ نے اپنی دانشمندی اور حکمت کے جو الفاظ اپنی قوم کو بتانے تھے وہ آپؐ نے بتا دیے اور آپؐ نے یہ بھی ہدایت فرمادی کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کی جائے جو قرآن حکیم میں محفوظ کر دیے گئے ہیں اور اس کے بعد ان حکیمانہ اقوال اور افعال میں محفوظ ہیں، جن پر جناب رسالت مآبؐ نے اپنی زندگی میں عمل کر کے اپنی قوم کو بتا دیا۔

iii) سب سے اہم نصیحت جو آپؐ نے فرمائی وہ تھی انسانیت کی عزت اور اس سے انصاف اور مسلمانوں کا بھائی چارہ، جس میں کوئی ایک دوسرے سے نہ حقیر تھا نہ برتر اور اس کی وجہ بلحاظ صرف تقویٰ فضیلت رکھتا ہے اور کوئی بھی اپنے تقوے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، بلکہ معاشرے کے لوگ خود دیکھ لیں گے کہ کون متقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں جناب رسول اللہؐ کے حکم کی اچھی خاصی نفی ہو رہی ہے، قوم کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے آپ کو نسل کی بنیاد پر لوگوں پر ترجیح ہی نہیں دے رہی بلکہ ان پر حکومت کر رہی ہے، ان سے خراج وصول کرتی ہے اور بہت سے لوگ تقویٰ کا دعویٰ کر کے لوگوں کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں، ان سے نذرانے وصول کرتے ہیں اور ان کو اپنے سے کم تر درجے پر رکھتے ہیں۔

١٧) جناب رسالت مآبؐ نے نصیحت فرمائی کہ جو لوگ وہاں موجود تھے اور آپؐ کے احکامات سن رہے تھے، وہ دنیا کے کونے کونے تک اس پیغام کو پہنچا دیں اور اس کے لیے ممکنہ ذرائع استعمال کریں۔ اپنی استطاعت کے مطابق ہر مسلمان جو اللہ کا غلام ہے اس کا فرض ہے کہ اپنے صحیح علم کی بنیاد پر وہ قرآن اور سنت کا علم جہاں تک ہوسکے دوسروں تک پہنچا دے۔ یہ عمل ان پر فرض کر دیا گیا ہے۔

٧) حج کے جتنے بھی ارکان ہیں اس کے دو بنیادی مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ انبیاء کی اور جنہوں نے اللہ کی خاطر تکلیفیں اٹھائیں ان لوگوں کی سنت کی یاد تازہ ہو اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہمہ وقت اپنے مالک کی حمد و ثناء بیان کریں، اس کو راضی کرنے کی کوشش کریں اور اس سے اپنی کوتاہیوں کی، غلطیوں کی اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کریں، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا یہ ایک منفرد اجتماعی موقع ہوتا ہے، کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک ساتھ اللہ کو خوش اور راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اجتماعی طور پر اس سے بخشش طلب کرتے ہیں۔

(١٨٨) انتظامی معاملات کی تکمیل اور لشکر اُسامہ برائے موتہ

جب جناب رسالت مآبؐ واپس مدینہ پہنچے تو آپؐ نے مملکت کے معاملات کو آخری اور حتمی شکل دینا شروع کر دی، یعنی انتظامی، سفارتی اور معاشی امور کے علاوہ تعلیمی معاملات کی منصوبہ بندی اور اس کے انتظامات کو تکمیل کی منزل تک پہنچانے کی کوشش شروع کر دی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آپؐ کو سیاسی حدود کی حفاظت کی ذمہ داری کا بھی احساس تھا۔ اس لیے آپؐ نے خطہ عرب کے قبائل کو انتظامی دھارے میں لانے اور زکوۃ جمع کرنے کی کوشش کی۔ آپؐ نے مملکت کے تمام علاقوں اور قبائل کو ایک تسبیح میں پرونے کا بندوبست بھی کیا۔ اس کے لیے آپؐ نے ان تمام علاقوں میں استاد دینی امور کے لیے، قاضی فیصلے کرنے کے لیے اور زکوۃ اور جزیہ اکٹھا کرنے کے لیے عامل مقرر کر دیے۔

قبائلی سرداروں اور ان کے نمائندوں نے اسلام قبول کرنے کے واسطے مدینہ آنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ لوگوں نے دور دراز علاقوں سے جناب رسول اللہؐ کی تھوڑے ہی وقت کے لیے سہی، صحبت اختیار کرنے اور کچھ پند و نصیحت سننے کے لیے مدینہ آنا شروع کیا۔ جناب

رسول اللہؐ نے کبھی بھی کسی قبیلے کے سردار کو اس کی حیثیت سے تبدیل نہیں کیا، کیونکہ اس سے فساد ہونا اتفاقی کا خطرہ تھا، جبکہ فطری طور پر عرب کسی غیر کی سربراہی پسند بھی نہیں کرتے۔

جناب رسالت مآبؐ کو بازنطینی کے گورنر کے متکبرانہ رویے کا بھی اچھی طرح سے احساس تھا، جس کی فوج سے لڑتے ہوئے جناب زید بن حارثہؓ جعفر ابن ابی طالب اور جناب عبداللہ بن رواحہؓ نے شہادت پائی تھی۔ جناب رسالت مآبؐ کو اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ حجاز سے نکالے ہوئے یا بھاگے ہوئے قبائل ضرور اس کوشش میں ہوں گے کہ دوبارہ بازنطینیوں کو مسلمانوں کے خلاف اکسائیں اور بازنطینی بھی اس بات کو یقیناً گوارہ نہ کرتے ہوں گے کہ ان کی سپر پاور کے سامنے ایرانیوں کی ایک بڑی طاقت کے علاوہ ایک اور طاقت ابھر آئے، کیونکہ اس طرح سے ان کی اس علاقے میں برتری کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔

لہٰذا ان امکانات کو پیش نظر رکھ کر جناب رسول اللہؐ نے فیصلہ کیا اور حکم دیا ایک لشکر تیار کرنے کا، جس کا سپہ سالار جناب اسامہ بن زیدؓ کو مقرر فرمایا۔ جناب اسامہؓ کی عمر اس وقت تقریباً سترہ برس تھی، لیکن انہیں جناب رسالت مآبؐ کی خاص شفقت و محبت و رفاقت اور قربت حاصل تھی۔ کیونکہ وہ جناب زید بن حارثہؓ کے فرزند تھے اور ام ایمنؓ ان کی والدہ تھیں۔ جناب رسول اکرمؐ اس وجہ سے انہیں اپنا پوتا ہی سمجھتے اور ان کے ساتھ ویسی ہی شفقت فرماتے تھے۔ آپؐ کو اسامہ پر بے حد اعتماد تھا اسی لیے انہوں نے سوچا کہ وہ اسامہ کو شام کی سرحد پر بھیجیں تاکہ دوبارہ بازنطینیوں کی مملکت میں جا کر فلسطین و روم اور بلقاء کی سرحدوں کو دہلا دے۔

انصار کے معزز ین اور قریش کے معززین جن میں جناب عمرؓ اور ابوبکر صدیقؓ جیسے زعماء شامل تھے وہ بھی اسامہؓ کی زیر قیادت کر دیے گئے لیکن زیادہ تر لوگوں نے اسامہ کی قیادت کو پسند نہ کیا۔ شاید وہ ایک تو نوجوان تھے اور دوسرا یہ کہ وہ ایک سابقہ غلام اور کنیز کے بیٹے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے جناب رسالت مآبؐ نے لوگوں سے خطاب فرمایا اور کہا کہ:

"اس بات میں کوئی تعجب نہیں کہ اب تم اس کی قیادت کی مخالفت کر رہے ہو، تم تو پہلے بھی اس کے والد کی قیادت پر اعتراض کر چکے ہو۔ ہاں! اللہ کی قسم! اس کا والد جو مجھے بہت ہی عزیز تھا وہ قیادت کے لیے بہت زیادہ مناسب تھا اور اس کا بیٹا بھی مجھے بہت ہی زیادہ عزیز ہے اس کے والد کے بعد"۔

جناب رسالت مآبؐ کی یہ بات سننے کے بعد لوگ اسامہ کو قدر کی نظر سے دیکھنے لگے اور انہوں نے جنگ موتہ کے لیے ان کی قیادت قبول کر لی۔ لہٰذا مدینہ شہر کے باہر فوج اکٹھی کرنی شروع کر دی گئی، اس جنگ کا نام حوف تھا۔ اسامہ کو جناب رسولؐ اللہ نے ہدایت فرمائی کہ وہ اپنی فوجوں کو فلسطین میں اس مقام پر لے کر جائے جہاں پر اس کے والد نے شہادت پائی تھی اور انہیں یہ بھی کہا گیا کہ وہ دشمن پر اس کی بے خبری کے عالم میں حملہ کریں اور وہ وقت علی الصبح کا ہو، مزید یہ کہ وہ ان کو شکست دے کر فوراً گھر واپس روانہ ہو جائیں۔

اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ جناب رسولؐ اللہ نے جس طرح سے اس سے قبل جناب زید بن حارثؓ، جناب جعفر بن ابی طالبؓ اور جناب عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادتوں کی پیش گوئی فرمائی تھی، اسی طرح سے ہی آپؐ نے جناب اسامہ کی فتح کی پیش گوئی بھی فرما دی، اس معرکے کو در حقیقت جنگ موتہ دوئم کا نام دینا چاہیے۔

دوران تیاری جناب اسامہ کو پتا چلا کہ جناب رسالت مآبؐ شدید علیل ہو گئے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا جناب رسالت مآبؐ کی صحت یابی تک لشکر کی روانگی کو موقوف کر دیا جائے۔ کیونکہ انہیں اور ان کے لشکریوں کو یہ بات پسند نہ تھی کہ جناب رسالت مآبؐ کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ چلے جائیں۔ چنانچہ فوج کو وہیں ٹھہرنے کی ہدایت کر کے جناب اسامہ جناب رسالت مآبؐ کے پاس چلے آئے۔

لیکن جناب رسالت مآبؐ کا مشن چونکہ مکمل ہو چکا تھا لہٰذا وہ آپؐ کا وقت سفر آخر تھا، چنانچہ آپؐ اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ آپؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے قریب ترین جانثار جناب ابوبکر صدیقؓ نے اسلامی مملکت کی قیادت سنبھال لی۔ اور سب سے پہلے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے آپ نے جناب رسالت مآبؐ کے حکم سے تیار کردہ لشکر کو فوری روانگی کا حکم دیا۔ حالانکہ وہ سیاسی طور پر بہت نازک وقت تھا اور اردگرد کے بدوؤں نے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ لوگوں نے بھی خلیفہ ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ وہ اس وقت فوج کو نہ بھیجیں اور مدینہ کی حفاظت کے لیے روک دیں یا اسامہ کی جگہ کسی تجربہ کار سپہ سالار کو بھیجیں۔

جناب ابوبکرؓ نے دونوں تجویزوں کو مسترد کر دیا اور کہا کہ ”فوج جائے گی، اگر چہ مجھے اکیلے ہی کسی حملے یا بغاوت کے خلاف کیوں نہ لڑنا پڑے اور جہاں تک اسامہ کا تعلق ہے میں جرأت

نہیں کر سکتا کہ اس شخص کو اس کے مرتبے سے علیحدہ کر دوں جس کے لیے اسے جناب رسالت مآبؐ نے منتخب کیا ہے“۔

انہوں نے مزید فرمایا کہ ”مدینہ رہے یا نہ رہے خلیفہ زندہ رہے یا مر جائے، لیکن جناب رسالت مآبؐ کے الفاظ کی تعمیل ہو کر رہے گی“۔

جب خلیفۃ المسلمین نے دیکھا کہ لوگوں کے دلوں میں ابھی تک متکبرانہ خیالات پیدا ہو رہے ہیں اور وہ ہنوز جناب اسامہ کی سپہ سالاری کو قبول نہیں کر رہے ہیں تو جناب خلیفۃ المسلمین پیدل اسامہ کے ساتھ چل دیے انہیں الوداع کہنے کے لیے، جبکہ اسامہ اپنی سواری پر سوار تھے۔ جناب ابوبکرؓ اسامہؓ سے عسکری معاملات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے جا رہے تھے اور ساتھ ہی مناسب وقت پر اسامہ کو مناسب نصیحتوں سے بھی مطلع فرماتے۔ لیکن اسامہؓ نے یہ بات پسند نہ کی کہ وہ گھوڑے پر سوار جا رہے ہوں جبکہ خلیفۂ وقت اور نائب رسولؐ اللہ ان کے ساتھ پیدل جا رہے ہوں۔ اس پر انہوں نے جناب خلیفہ سے عرض کیا کہ ”یا تو آپ سواری پر تشریف لے آئیں یا پھر مجھے نیچے اترنے کی اجازت دیں کہ میں آپ کے ساتھ ساتھ چل سکوں“۔

جناب ابوبکر صدیقؓ نے ان کی اس تجویز کو قبول نہ کیا اور اسی طرح چلتے رہے۔ دراصل آپ لوگوں کو بتانا اور جتانا چاہتے تھے کہ وہ خلیفہ وقت ہوتے ہوئے بھی اسامہ کے زیر قیادت کام کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کو وہ درجہ اللہ کے رسولؐ نے عطا کیا ہے اور ساتھ ہی جناب ابوبکرؓ کی سادگی، انکساری، عجز، محبت اور تابعداری یہ سب کچھ جناب محمد رسولؐ اللہ کے لیے تھی، اور سب کے آقا اور مالک کائنات کے لیے۔

جناب ابوبکر صدیقؓ نے الوداع کہنے سے پہلے جناب اسامہؓ سے درخواست کی کہ وہ عمرؓ کو اجازت دے دیں کہ وہ میری مدد کے واسطے میرے پاس رہ جائے تاکہ بوقت ضرورت ان سے مشاورت کر سکوں۔ جسے اسامہؓ نے فوری طور پر قبول کر لیا۔ یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ جناب ابوبکرؓ اسامہ کو ایک خلیفہ کی حیثیت سے نصیحت فرما رہے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان کی قیادت کو اہمیت بھی دے رہے تھے اور ان کی قیادت کو تسلیم بھی کر رہے تھے، کیونکہ انہیں اور جناب عمرؓ کو جناب رسولؐ اللہ نے اسامہ کی قیادت میں دیا تھا۔

بہر حال جناب اسامہ اس جنگ میں کامیابی حاصل کر کے واپس لوٹے اور انہیں اس مشن

میں چالیس روز لگے۔ اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے اسامہ کو فتح عطا فرمائی، جس میں ایک بھی مسلمان دشمن کی تلوار کی زد میں نہیں آیا۔ اسامہ مال غنیمت کے ساتھ واپس آئے اور خاص بات اس فتح کی یہ تھی، کہا جاتا ہے کہ اسامہ دشمن کے اس گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے جس نے جنگ موتہ اول میں ان کے والد جناب زید بن حارثہؓ کو شہید کیا تھا۔ (اللہ اکبر)

(۱۸۹) جھوٹی نبوت کے دعوے دار

کچھ بے وقوف لوگوں نے سوچا کہ وہ بھی اسی طرح سے نبوت کا دعویٰ کر کے ویسے ہی باعزت ہو سکتے ہیں جیسا کہ جناب محمد رسولؐ اللہ۔ اس لیے انہوں نے اپنے اپنے قبائل میں نبوت کے دعوے کر دیے، لیکن ان کا خیال خواب ثابت ہوا۔ درج ذیل لوگوں نے یہ گناہ کبیرہ جناب رسالت مآبؐ کی زندگی میں ہی کیا۔

(الف) طلیحہ:

قبیلہ بنو اسد کا سردار جو طلیحہ کا بااثر شخص تھا وہ ابلیس کے شکنجے میں جکڑا گیا، جبکہ وہ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ سفر میں تھا اس سفر کے دوران کارواں کو پانی کی شدید کمی پیش آئی اس پر طلیحہ نے اپنے قبیلہ والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کہہ دیا کہ انہیں تھوڑی ہی مسافت پر پانی مل جائے گا اور ایسا ہی ہوا کہ اللہ کی قدرت سے تھوڑی دور کے بعد انہیں پانی کا ذخیرہ مل گیا۔ چنانچہ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ابلیس نے اس بدبخت پر حملہ کیا اور اس کو یہ کہنے پر ورغلایا کہ اس کی پیش گوئی دراصل اس کی نبوت کی وجہ سے تھی۔ جناب رسالت مآبؐ کی زندگی میں وہ مسلمانوں کے ہاتھ نہ آسکا، لیکن جناب ابوبکرؓ کے دور خلافت میں اس نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی کوشش کی۔ جس پر جناب ابوبکرؓ نے خالد بن ولیدؓ کو اس کے پاس بھیجا تاکہ اسے کچھ سبق سکھلایا جا سکے۔ لیکن طلیحہ کا کوئی نیک کام اس کے کام آگیا اور وہ ایمان لے آیا اور پھر تمام زندگی ایمان پر قائم رہا۔

(ب) مسلمہ کذاب:

مسلمہ ایک مرتبہ مدینہ گیا تھا اور جناب رسالت مآبؐ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا تھا وہ وسطی عرب کے علاقہ یمامہ کے قبیلہ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جب وہ واپس گھر پہنچا تو اس نے

وحی کے حصول کا دعویٰ کر دیا اور کہا کہ وہ معجزانہ طور پر کام کر سکتا ہے اور پھر اس نے قبیلہ کے لیے نبی ہونے کا دعویٰ کر دیا اور کہا کہ جناب محمدؐ صرف اپنے ہی قبیلہ کے نبی تھے۔ اس نے اپنا ایک ایلچی بھی اپنے پیغام کے ساتھ جناب رسالت مآبؐ کے پاس بھیجا، اس پیغام کے ساتھ کہ وہ اس کے اور اپنے علاقے کی تقسیم کر لیں۔ جناب رسالت مآبؐ نے اس ایلچی سے فرمایا اگر کسی ایلچی کا قتل جائز ہوتا تو وہ ضرور قتل ہو جاتا۔ آپؐ نے بہر حال اسے درج ذیل جواب دیا۔

منجانب: محمدؐ رسول اللہ، بنام مسلمہ کذاب

"بے شک زمین اللہ کی ملکیت ہے اور وہ اس کی وراثت اسے دیتا ہے جس سے وہ خوش ہوتا ہے اپنے نیک بندوں میں سے اور اس کے لیے اللہ کی رحمتیں جو ہدایت قبول کرے"۔

جناب رسالت مآبؐ کا یہ جواب سورۃ اعراف (۷) کی آیت (۱۲۸) کے مطابق تھا۔ یہ جھوٹا شخص جناب ابوبکرؓ کے دور خلافت میں ۱۲ ہجری میں وحشی کے ہاتھوں مارا گیا۔

(ج) اسود انسی:

یہ شخص عناہ، یمن کا رہنے والا تھا اور جادو کے زور سے لوگوں کو اپنے اثر کر دیکھ رکھتا اور اس نے یمن کے گورنر کو قتل کر کے اس کی بیوہ سے نکاح کر لیا تھا۔ اس گورنر کا نام بدھان تھا اور اسے جناب رسولؐ اللہ نے مقرر فرمایا تھا۔ اس کے بعد اسود کو شیطانی وسوسے نے گھیرا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور جلد ہی بدھان کی بیوہ نے اسے قتل کر دیا۔

(۱۹۰) جناب رسالت مآبؐ نے دنیا سے رخصت ہونا ہی تھا

اللہ تعالیٰ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہی رہنے والا ہے، پیدا کرنے والا زندگی دینے والا اور پھر موت کے بعد زندگی دینے والا، اس نے دنیا میں جسے بھی بھیجا اسے موت کے وعدے کے ساتھ بھیجا۔ اور ہر انسان کے لیے اللہ نے موت کے بعد پھر دوبارہ زندگی رکھی۔ اسی قاعدے کے مطابق جناب محمد رسولؐ اللہ کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے بار بار یاد دلایا کہ تمہارے پیغمبر، راہبر اور قائد نے آخر کار اس دنیا سے رخصت ہونا ہے اور جب ان کی ذمہ داریاں پوری ہو جائیں گی تو پھر مزید ان کے رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ اس لیے ہمیں بھی اس بات کا احساس رہنا چاہیے کہ ہم اپنی زندگی کا وقت ضائع کیے بغیر اللہ تعالیٰ کی ہدایات جو جناب نبی کریمؐ کے ذریعہ سے

ہمارے پاس پہنچی ہیں، ان سے استفادہ حاصل کرلیں تاکہ اپنی موت سے پہلے پہلے اللہ اور اس کے احکامات کی پیروی کرکے اپنی عاقبت کا سامان پیدا کرلیں۔

درج ذیل آیات اس غرض سے تحریر کی جارہی ہیں، تاکہ ہمیں پتا چل جائے کہ جناب رسالت مآبؐ ہم ہی میں سے انسان تھے، اولادِ آدمؑ و نوحؑ و ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ تھے اور انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء کی طرح انسانیت کی ہدایت کے لیے مامور فرمایا تھا۔ اور اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد انہیں بھی دنیا سے رخصت ہونا تھا بالکل اپنے اجداد کی طرح۔

i) سورۃ رحمان (۵۵) کی آیت (۲۶) اور (۲۷) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے اسے فنا ہونا ہے اور تمہارے رب کا چہرہ مبارک جو عزت اور جاہ و جلال کا مالک ہے وہی ہمیشہ رہے گا''۔

ii) سورۃ القصص (۲۸) کی آیت (۸۸) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں، سوائے اس کے چہرے کے (سوائے اللہ کے) اسی کا حکم چلے گا اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے''۔

iii) سورۃ الانبیاء (۲۱) کی آیت (۳۴)(۳۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور ہم نے آپؐ سے پہلے بھی کسی بشر کے لیے ہمیشہ رہنا نہیں رکھا، پھر اگر آپ کا انتقال ہو جائے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں اور پھر تم سب ہمارے پاس چلے آؤ گے''۔

iv) سورۃ الضحیٰ (۹۳) آیت (۴ اور ۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور بے شک آخرت تمہارے لیے بہتر ہے (اے محمدؐ) اس دنیا سے اور یقیناً تمہارا رب تمہیں دے گا (آخرت میں بہت نعمتیں) کہ تم خوش ہو جاؤ''۔

v) سورۃ الزمر (۳۹) آیت (۳۰) میں فرمایا کہ:

''بے شک آپؐ کو (اے محمدؐ) بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے''۔

vi) سورۃ آل عمران (۳) کی (۱۴۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور محمدؐ صرف رسول ہی تو ہیں، آپؐ سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ قتل کر دیے جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور وہ جو

الٹا پھر بھی جائے گا تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نقصان نہ کر سکے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جلد ہی اجر دیں گے جو اللہ کے شکر گزار ہیں''۔

لیکن پھر بھی جن احباب کو صحبت رسول اللہ میسر تھی، ان کے لیے آپؐ کی جدائی بہت مشکل تھی، پھر بھی انہیں اس غم سے دوچار ہونا ہی تھا۔

(۱۹۱) اللہ تعالیٰ نے باور کرا دیا کہ رسول اللہؐ اب رخصت ہوا چاہتے ہیں

اللہ تعالیٰ کے چند ارشادات اور جناب رسول اللہؐ کے چند اقوال و اعمال کی وجہ سے یہ ظاہر ہونے لگا، یا ان میں یہ بتا دیا گیا تھا، کہ رسول اللہؐ کا وقت آخر اب بالکل قریب آچکا ہے اور جناب رسول اللہؐ اپنے مالک کے اس بلاوے پر لبیک بھی کہہ چکے تھے۔ آپؐ کے قریب ترین ساتھی اور نائب جناب ابوبکرؓ اور فاروقؓ اس بات کو محسوس کرکے اپنی چیخ اور آنسوؤں سے اس بات کا اظہار بھی کر چکے تھے کہ اب وہ اپنے محبوب کی رفاقت سے محروم ہونے والے ہیں۔ ایسے ہی چند واقعات اور کلمات کو درج ذیل کیا جارہا ہے۔

ا) دس ہجری کا ماہ رمضان آپؐ کی زندگی کا آخری ماہ رمضان تھا اور اس میں آپؐ کا خاص عمل رہا۔

i) اس ماہ آپؐ نے دس روز کے بجائے بیس روز کا اعتکاف فرمایا۔

ii) اس ماہ میں جبرئیل نے آپؐ کے ساتھ ایک کے بجائے دو مرتبہ دورہ قرآن فرمایا۔

ب) آپؐ کا دوران حج اپنی قوم سے فرمانا کہ ''میں نہیں جانتا کہ میں پھر کبھی تمہیں مل سکوں گا اس جگہ اس سال کے بعد''۔

ج) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا تھا، کہ وہ اپنے رب کی تعریفیں بیان کریں اور اس سے معافی طلب کریں یہ بات اس وقت کہی گئی جب فتح مکہ کے بعد لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں سورۃ النصر (۱۱۰) میں بیان کیا گیا ہے۔ جناب ابن عباسؓ اور جناب عمرؓ دونوں اس بات پر متفق ہیں، کہ اسی آیت کے ذریعے سے جناب رسول اللہؐ کے وصال کی خبر سنا دی گئی تھی۔

د) سورۃ المائدہ (۵) کی آیت (۳) کا نزول یوم عرفات کو ہوا جس روز آپؐ اپنی قوم سے

خطاب فرما رہے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اس روز میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنا فضل تمام کر دیا اور تمہارے دین اسلام کو منتخب کر لیا"۔

اس آیت کو سننے کے بعد ہی جناب عمرؓ کی چیخ نکل گئی تھی، جبکہ پوچھنے پر انہوں نے یہ کہا تھا کہ اب تکمیل کے بعد اسلام زوال کی طرف ہی جائے گا۔ لیکن حقیقت انہوں نے جان لی تھی کہ تکمیل دین کے بعد اب نبیؐ کا مزید رہنا ممکن نہ رہے گا۔ لیکن وہ ایسا زبان سے کہہ نہ سکے کیوں کہ وہ سمجھ گئے تھے کہ اب جناب رسالت مآبؐ مزید اُن کے ساتھ نہ رہیں گے۔ چونکہ یہ کہنا ان کے لیے ممکن نہ تھا اس لیے انہوں نے اپنے احساسات کا اظہار اپنی چیخ کے ذریعے کیا۔

ہ) اس حج میں قربانی والے دن یعنی دس ذوالحجہ کو آپؐ نے اپنے دست مبارک سے (۶۳) تریسٹھ اونٹ نحر فرمائے اور اس وقت آپ کی زندگی کے تریسٹھ (۶۳) سال مکمل ہوئے ہی تھے اور اس کے نوے (۹۰) روز بعد آپؐ اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں۔

و) گیارہ ہجری کے ماہ صفر کے اوائل میں یعنی اپنے وصال سے صرف ایک ماہ قبل آپ احد پر تشریف لے گئے اور الوداعی صلوٰۃ جنازہ شہدائے احد کے لیے ادا فرمائی۔ اور پھر ان لوگوں سے جو آپؐ کے ساتھ تھے فرمایا، کہ میں تم سے سبقت لے جانے والوں میں ہوں اور تم پر گواہ بنا دیا گیا ہوں۔ اللہ کی قسم! تم مجھے ملو گے حوض کوثر پر بہت جلد، مجھے دنیا کے خزانوں کی چابیاں پیش کی گئیں، اللہ کی قسم! مجھے خوف نہیں کہ تم میرے بعد ایمان سے پھر جاؤ گے، لیکن مجھے خوف ہے کہ دنیا کی رنگینیاں تمہیں اس بات پر ابھاریں گی کہ تم ایک دوسرے کی گردن مارو"۔ (بخاری)

ز) آپؐ نے جنت البقیع (قبرستان مدینہ) کا بھی الوداعی دورہ فرمایا اور وہاں مدفون ایمان والوں کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔

(۱۹۲) جناب رسول اللہؐ کی زندگی کے آخری ایام اور علالت

گیارہ ہجری ماہ صفر کی ۲۹ تاریخ بروز پیر جناب رسول اللہؐ علیل ہو گئے اور دوران علالت آپؐ نے گیارہ روز تک صلوٰۃ کی قیادت فرمائی۔ جب آپ کی علالت بڑھ گئی تو آپؐ نے بے

بیماری کے عالم میں فرمایا کہ اب مجھے کہاں ٹھہرنا ہے آپ کی ازواج سمجھ گئیں کہ آپؐ سیدہ عائشہؓ کے ہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں، اس پر ان کے آپس کے مشورہ کے بعد جناب رسالت مآبؐ کو جناب علیؓ اور جناب فضل بن عباسؓ نے سہارا دے کر سیدہ عائشہؓ کے گھر پہنچا دیا۔ اس طرح سے ام المومنین سیدہ عائشہؓ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہیں جناب رسالت مآبؐ کے آخری لمحات کی صحبت اور خدمت نصیب ہوئی۔ سیدہ عائشہؓ بار بار معوذتین یعنی سورۃ فلق اور الناس کی تلاوت کرتیں اور مختلف دعائیں مانگتیں تا کہ جناب رسالت مآبؐ کو راحت میسر ہو۔

بروز بدھ یعنی آپؐ کی زندگی کے آخری پانچویں روز آپؐ کی طبیعت زیادہ بیقرار ہو گئی اور آپ کی درد بڑھ گئی اور اکثر آپؐ پر غنودگی کا غلبہ رہنے لگا۔ ایک مرتبہ اس دوران جب آپؐ نے کچھ بہتر محسوس کیا تو آپؐ مسجد تشریف لے گئے اور کچھ دانش و حکمت کے الفاظ بیان فرمائے۔ جس میں آپؐ نے نصیحت فرمائی کہ ان کی قبر کو عبادت کی جگہ نہ بنایا جائے، جیسا کہ قوم یہود و نصاریٰ نے کیا۔ آپؐ نے اس دوران یہ بھی اعلان فرمایا کہ اگر وہ کسی کے مقروض ہیں تو انہیں بتایا جائے۔ آپؐ نے احباب کو یہ بھی نصیحت کہ وہ آپس میں بھلائی کا سلوک کریں۔ آپؐ نے اپنے وصال کا اس طرح اعلان بھی کر دیا کہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے غلام کو موقع دیا ہے کہ وہ انتخاب کرے اس دنیا کے رزق کا جو اللہ نے عطا فرمایا اس کا انتخاب کرے جو اللہ نے اس کے لیے آخرت میں تیار رکھا ہے، لیکن اس نے آخرت کو پسند کیا۔

وصال سے چار روز قبل آپؐ مزید تکلیف میں مبتلا ہو گئے، لیکن ابھی تک آپؐ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہہ سکتے تھے۔ آخری حکم جو آپؐ نے دیا تھا وہ یہ تھا کہ غیر مسلموں کو حجاز سے باہر نکال دیا جائے، لیکن سفیروں کو عزت دی جائے۔ آپؐ نے اس روز جمعرات والے دن مغرب تک صلوٰۃ کی قیادت فرمائی۔

(۱۹۳) جناب رسالت مآبؐ کی ابو بکرؓ کو صلوٰۃ کی قیادت کرنے کی ہدایت

آپؐ کے وصال سے چار روز قبل کی شام یعنی بعد از مغرب آپؐ صلوٰۃ کی قیادت کرنے کی طاقت نہ رکھ سکے جیسا کہ امام بخاریؒ نے ام المومنین سیدہ عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں

نے فرمایا کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "کیا لوگوں نے صلوٰۃ ادا کر لی ہے (عشاء کی صلوٰۃ)؟"
نہیں! ابھی نہیں کی۔ وہ آپؐ کے انتظار میں ہیں"۔ سیدہؓ نے فرمایا۔
"تسلے میں کچھ پانی ڈالو"۔ آپؐ نے فرمایا۔

سیدہؓ نے ایسا ہی کیا۔ تو آپؐ نے چہرہ مبارک دھویا یعنی وضو کیا اور پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن چکرا گئے۔ آپؐ نے پھر فرمایا: "کیا لوگوں نے صلوٰۃ ادا کر لی؟" اور پھر آپؐ نے دو مرتبہ منہ پر چھینٹا دیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اٹھنے کی سکت نہ پائی۔ اس کے بعد آپؐ نے ابوبکرؓ کو صلوٰۃ کی قیادت کے لیے حکم دیا۔ پھر جناب ابوبکرؓ نے آپؐ کی حیات مبارکہ کے دوران صلوٰۃ کی قیادت فرمائی۔

یہاں ایک بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ کچھ علماء نے تحریر کیا ہے جناب رسالت مآبؐ نے اپنی مسجد میں جو آخری صلوٰۃ ادا کی تھی وہ جناب ابوبکرؓ کی قیادت میں کی تھی۔ یہ بات بالکل ناموزوں اور غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جناب ابوبکرؓ پہلے سے ہی قیادت کے لیے تیار تھے، کہ جناب رسالت مآبؐ تشریف لے آئے۔ جناب ابوبکرؓ کو جب آپؐ کا پتا چلا تو آپ فوراً پیچھے آنے لگے لیکن جناب رسالت مآبؐ نے انہیں روک دیا اور آپؐ ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ گئے اور صلوٰۃ کی قیادت فرمائی اور جناب ابوبکرؓ نے آپؐ کی معاونت کرتے ہوئے صلوٰۃ کی تکبیروں کو دہرایا۔

اس دعوے کی جو یہاں عرض کیا گیا ہے صرف ایک دلیل اور منطق ہے اور وہ یہ کہ نبیؐ کسی کی قیادت اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ اور اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص امت کی قیادت بھی نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ کہ اس بات میں کسی عالم یا مورخ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کی صلوٰۃ جنازہ کسی شخص کی قیادت یا امامت میں نہیں ہوئی۔ بلکہ تھوڑے تھوڑے لوگوں کی جماعت نے بار بار انفرادی طور پر صلوٰۃ ادا کی۔

یعنی سیدہ عائشہؓ کے حجرہ میں جہاں آپؐ نے وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے اور وہیں آپؐ کا جسد مبارک تدفین سے پہلے رکھا رہا، وہاں لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں آتے رہے اور صلوٰۃ جنازہ ادا کرنے کے بعد باہر جاتے رہے تاکہ دوسرے آسکیں اور یہ سلسلہ تین روز تک جاری رہا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نبیؐ کی امامت ان کے فوت ہونے کے بعد بھی نہیں ہوسکتی تو آپؐ کی حیات طیبہ میں کیسے ہوسکتی تھی؟

آپؐ کا جناب ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ کر صلوٰۃ کی قیادت کرنا اور جناب ابوبکرؓ کا آپؐ کی معاونت کرنا اس بات کو ضرور ظاہر کرتا ہے، کہ جناب رسالت مآبؐ کے اصحاب میں آپؐ کے رفیق اور نائب اول ابوبکر صدیقؓ ہی تھے۔ اور اس لیے آپؐ کے فوت ہونے کے بعد وہی آپؐ کے نائب ہونے چاہئیں تھے تاکہ امت کی قیادت کر سکیں۔ لیکن آپؐ نے اس بات کا اعلان نہیں فرمایا اور قوم پر چھوڑ دیا تاکہ وہ خود اپنا لیڈر منتخب کریں اور جناب عمرؓ نے بھی قوم کے سامنے یہی منطق پیش کی تھی، جب انہوں نے ابوبکرؓ کو خلافت کے لیے تجویز کر کے ان کی بیعت کی تھی۔

(۱۹۴) جناب رسالت مآبؐ کا سفر آخرت

اپنے وصال سے ایک روز قبل بروز اتوار جناب رسالت مآبؐ نے اپنے غلام کو آزاد فرمادیا اور جو کچھ آپؐ کی ملکیت میں تھا خیرات کر دیا۔ اس وقت آپ کی ملکیت کل سات دینار تھے۔ آپؐ نے اپنے ہتھیار بھی اپنے احباب کو دے دیے۔ اس وجہ سے آپؐ کی زندگی کی آخری رات، مادر امت سیدہ عائشہؓ کو اپنے گھر کا چراغ روشن کرنے کے لیے کچھ تیل مستعار لینا پڑا، جبکہ آپؐ کا زرہ بکتر گروی رکھ کر چند کلو جو اپنی خوراک کے لیے لینے پڑے۔

آپؐ کی زندگی کے آخری روز انس بن مالکؓ نے فرمایا، کہ جب مسلمان اکٹھے ہوئے صلوٰۃ الفجر کے لیے بروز پیر ۱۲ ربیع الاول گیارہ ہجری تو انہیں حیران کن خوشی ہوئی جناب رسول اللہؐ کو دیکھ کر جب آپؐ نے اپنی کھڑکی سے پردہ اٹھایا جو مسجد کی جانب کھلتی تھی۔ آپؐ نے اصحاب کی جانب نظر دوڑائی جب وہ اپنی قطاریں سیدھی کر رہے تھے صلوٰۃ کے لیے تو آپؐ انہیں دیکھ کر خوشی سے مسکرا دیے۔ آپؐ کو اس طرح دیکھ کر جناب ابوبکرؓ امامت کی جگہ سے پیچھے ہو گئے اور اصحاب بھی بہت خوش ہوئے وہ منظر دیکھ کر۔ لیکن جناب رسالت مآبؐ نے انہیں اشارہ کیا کہ وہ اپنی صلوٰۃ جاری رکھیں اور پھر آپؐ نے پردہ نیچے گرا دیا۔

اور یہ قوم کے لیے اس برکت والے پرنور چہرہ مبارک کا آخری نظارہ و دیدار تھا، کیونکہ آپؐ پھر دوسری صلوٰۃ سے پہلے پہلے اس دنیا سے کوچ فرما گئے۔

امام بخاریؒ نے ام المومنین سیدہ عائشہؓ کی ایک اور روایت نقل کی ہے کہ:

"اللہ کے رسولؐ اپنی علالت کے دوران جس میں آپؐ نے وصال فرمایا، کہا کرتے تھے:

"اے عائشہؓ! میں ابھی تک وہ درد محسوس کرتا ہوں جو اس کھانے کی وجہ سے مجھے ہوئی تھی، جو میں نے خیبر میں کھایا تھا اور اس وقت میں ایسے محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے میری شہ رگ کٹ رہی ہو، اس درد سے"۔ (اس سے قبل یہ بتایا جا چکا ہے کہ ایک یہودی عورت نے جناب رسالت مآب ؐ کو دعوت پر بلا کر زہریلا کھانا کھلایا تھا لیکن وحی آنے پر جناب رسول اللہ ؐ نے منہ میں رکھا ہوا لقمہ باہر اگل دیا تھا لہٰذا زہر کا بہت معمولی اثر ہوا)۔

اس آخری روز جناب رسول اکرم ؐ نے اپنی بیٹی سیدہ فاطمہؓ کو بلوایا اور بہت ہلکی آواز میں انہیں کچھ فرمایا جس پر وہ رو دیں، اس کے بعد آپ ؐ نے پھر کچھ فرمایا تو آپ مسکرا دیں۔ بعد میں اس کے متعلق جب ام المومنین سیدہ عائشہؓ نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ "پہلی دفعہ آپ ؐ نے فرمایا کہ وہ اس بیماری سے صحت یاب ہونے والے نہیں تو میں رو دی۔ پھر آپ ؐ نے فرمایا کہ میں گھر والوں میں سے پہلی ہوں گی، جو ان سے ملوں گی تو میں خوش ہو گئی"۔ (سیدہ فاطمہ رسالت مآب ؐ کی رحلت کے چھ ماہ بعد فوت ہو گئی تھیں)۔

جب سیدہ فاطمہؓ نے آپ ؐ کو شدید درد میں مبتلا دیکھا تو کہا "میرے والد کتنے شدید درد میں ہیں"۔ اس پر جناب رسالت مآب ؐ نے فرمایا "وہ آج کے بعد درد میں نہیں رہیں گے"۔ (بخاری)

اس کے بعد جناب رسالت مآب ؐ نے اپنی ازواج اور نواسوں کو بلوایا اور انہیں نصیحت کی کہ وہ اللہ کی یاد میں رہیں۔ پھر آپ ؐ کی درد میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی اور آپ ؐ نے پھر سیدہ عائشہؓ سے فرمایا "میں ابھی تک اس کھانے کا اثر محسوس کر رہا ہوں جو میں نے خیبر میں چکھا تھا، میں محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے موت میرے قریب آ رہی ہے"۔ آپ ؐ نے دوبارہ پھر فرمایا۔ (بخاری)

پھر سیدہ عائشہؓ کے بھائی عبدالرحمٰنؓ تشریف لائے ایک مسواک لے کر آپ ؐ کے لیے۔ سیدہ عائشہؓ نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا اس مسواک کو وہ چبا کر نرم کر دیں، تا کہ آپ ؐ کے لیے آسانی پیدا ہو جائے، جس پر آپ ؐ نے سر مبارک ہلایا تو سیدہؓ نے مسواک چبا کر نرم کر دی، جسے اللہ کے رسول ؐ نے استعمال فرمایا اور اپنے ہاتھ کو پانی میں ڈالا اور اپنے منہ پر ملا اور پھر فرمایا "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور موت بہت اذیت ناک ہوتی ہے"۔

پھر آپ ؐ نے اپنی انگلیاں اوپر اٹھائیں اور اپنے لب مبارک ہلائے اور سیدہ عائشہؓ نے آپ ؐ کو کہتے سنا "ان کے ساتھ جن پر آپ نے عطا فرمائیں اپنی رحمتیں، پیغمبروں میں سے اور

صدیقین میں سے، شہداء اور صالحین میں سے۔ اے اللہ! مجھے معاف فرما دے اور مجھ پر رحم فرما اور مجھے ملا دے رفیق الاعلیٰ سے"۔

پھر آپ ؐ رخصت فرما گئے جبکہ آپ ؐ سیدہ عائشہؓ کی گود میں سر رکھے ہوئے تھے، اس روز پیر کا دن، بارہ ربیع الاول گیارہ ہجری یعنی آٹھ جون ۶۳۲ء تھا اور آپ ؐ کی عمر مبارک سن ہجری کے مطابق ۶۳ تریسٹھ برس چار ماہ اور گیارہ روز جبکہ سن عیسوی کے مطابق باسٹھ برس ایک ماہ اور سولہ روز بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں اور سلام ہو آپ ؐ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے (آمین)۔

(۱۹۵) اللہ کے رسول ؐ کے لیے خوشخبریاں

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول ؐ کے لیے چند خوشخبریاں سنائی ہیں جو آپ ؐ کے لیے آخرت کے لیے رکھی ہیں ان میں چند بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

الف) سورۃ الضحیٰ (۹۳) آیت (۳-۵) میں فرمایا کہ:

"تمہارے رب نے (اے محمد ؐ) نہ تو تمہیں نظر انداز کیا اور نہ ہی تم سے نفرت کی اور بے شک آخرت تمہارے لیے اس دنیا سے بہتر ہے اور بے شک تمہارا رب تمہیں عطا فرمائے گا اتنا کہ تم بہت خوش ہو جاؤ گے"۔

ب) سورۃ الکوثر (۱۰۸) آیت (۱) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بے شک ہم نے تمہارے لیے رکھا (اے محمد ؐ) الکوثر"۔

(یہ ایک ایسا چشمہ یا دریا ہے جس سے رسالت مآب ؐ قیامت کے روز ایمان والوں کو اس کا شربت عطا کریں گے جب کہ وہ پیاس سے ہلک رہے ہوں گے)

ج) سورۃ الفتح (۴۸) آیت (۲) میں فرمایا گیا کہ:

"اللہ تمہارے گناہ معاف فرما دے گا، پچھلے اور آئندہ کے بھی اور تمہارے اوپر اپنی مہربانیاں کمال تک پہنچا دے گا اور تمہیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرمائے گا"۔

(۱۹۶) جناب رسالت مآب ؐ کی وفات پر اصحابہ کا ردعمل

اب یہاں کوئی بھی وحی وصول کرنے والا نہ رہا۔ سلسلہ نزول الہام جس کی ابتدا جناب آدم

علیہ السلام سے ہوئی تھی وہ اب انتہا کو پہنچ گئی اور یہ واسطہ وحی ہمیشہ کے لیے لپیٹ دیا گیا۔ جناب جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے پیغامات اس کے پیغمبروں تک پہنچانے کا کام نہایت دیانتداری سے پایہ تکمیل کو پہنچا دیا اور سلسلہ نبوت پایہ تکمیل تک پہنچ کر ہمیشہ کے لیے مہر بند ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اپنے عروج و انتہا تک پہنچ گئیں، اب عقل انسانی کو کامل کر دیا گیا، اب مزید اس کی تربیت اور تعمیر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یعنی اب قیامت تک مزید ہدایت کی ضرورت باقی نہیں رہی اس وقت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام قرآن کی صورت میں اور ہدایات کا عملی نمونہ جناب محمد رسول اللہ کی حیات مبارکہ اور آپؐ کے اقوال و افعال کی صورت میں ہمارے لیے تا قیامت ہدایات کا باعث بنا رہے گا۔ اور اس کے لیے ضرورت اس بات کی رہے گی کہ قوم محمدؐ میں سے لوگوں کا ایک طبقہ اس کام کی تیاری اور کوشش میں مصروف رہے، کہ وہ حسب استطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا رہے تاکہ عوام الناس میں امن اور بھائی چارے کی فضا قائم رہے لیکن بدقسمتی سے انسانی تمدن میں ہمہ وقت اسی بات کی کمی رہی۔ ہمیں اس بات کی کوشش میں لگا رہنا چاہیے کہ ہم انسانی معاشرے میں رائج نفرت کی فضا کو محبت میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اور تمام دنیا کی تہذیبوں، قوموں، نسلوں اور گروہوں میں اللہ کے نام پر، جو ہم سب کا خالق و مالک ہے یکجہتی اور محبت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ ہم حضرت انسان کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہیں کہ وہ ایک خالق کی مخلوق ہیں ایک آقا کے غلام ہیں اور ایک ہی ماں اور باپ کی اولاد ہیں، ان کے درمیان نفرت اور جھگڑے کا کوئی جواز نہیں۔ انہیں ایک ہی اصول پر زندگی گزارنی ہے اور ان اصولوں کی نشاندہی ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے پیغمبروں کے ذریعہ کرا دی ہے۔ لہٰذا ان کے پاس تفرقہ و فساد کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ دنیا کے اس آخری دور میں جناب رسالت مآبؐ حضرت انسان کے لیے منبع روشنی، اور اپنی ذات میں ایک درسگاہ تھے، بہت ہی زیادہ پیار و محبت کرنے والے اور انسانوں کی راہبری کرنے والے۔

ایسے شخص کے وصال کی خبر سن کر آپؐ کے رفقائے کار عجیب سکتے کے عالم میں آ گئے اور ان کا ذہن چکرا گیا۔ چونکہ وہ اس بات کے لیے تیار ہی نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے اس بارے میں سوچا تھا، کہ جناب رسالت مآبؐ انہیں چھوڑ کر رخصت ہو جائیں گے لہٰذا انہوں نے اس بات

کو سننا اور ماننا گوارا ہی نہ کیا کہ جناب رسالت مآبؐ اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ ایسے لوگوں میں سب سے آگے جناب عمرؓ تھے جو ہمہ وقت آپؐ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ جناب عمرؓ نے نہ صرف اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اپنی شمشیر نیام سے باہر نکال لی اور کہا کہ "کوئی شخص یہ نہ کہے کہ محمد رسول اللہ فوت ہو گئے ہیں، بلکہ وہ تو اپنے رب کے پاس ان سے ملنے کے لیے ایسے ہی گئے ہیں جیسا کہ موسیٰ اپنے رب کے پاس گئے تھے اور واپس آ گئے تھے"۔

ایسی صورتحال میں جناب رسول اللہ کے قریب ترین، مدبر ترین، سنجیدہ، ہوشمند، معتدل اور با خلق ساتھی جناب ابوبکرؓ آگے بڑھے اور سب سے پہلے جناب رسول اکرمؐ سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرنے کی غرض سے آپؐ کی مبارک پیشانی کو تین مرتبہ بوسہ دیا اور پھر اپنی دختر سیدہ عائشہؓ کے حجرے سے خاموشی کے ساتھ باہر تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے جناب فاروقؓ کی صورت حال کا پریشان کن اور جذباتی منظر دیکھا اور فرمایا "اے عمر! بیٹھ جاؤ"۔ اور پھر آپ نے وہاں موجود تمام حضرات کو فرمایا اور فرمانے سے پہلے انہوں نے رب السماوات والارض کی حمد و ثناء کی اور اس کے بعد کہا کہ "جو کوئی بھی محمدؐ کی پرستش کرتا تھا تو وہ سن لے کہ وہ وفات پا چکے ہیں اور جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی پرستش کرتا ہے تو وہ جان لے کہ اللہ زندہ ہے اور وہ کبھی بھی وفات نہیں پائے گا"۔

اس کے بعد انہوں نے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۴۴) کی تلاوت فرمائی جس میں کہا گیا ہے کہ:

"اور محمدؐ تو صرف رسول ہی ہیں اور ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، سو اگر وہ فوت ہو جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص الٹا پھر بھی جائے تو اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کر سکے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جلد ہی صلہ دے گا شکر کرنے والوں کو"۔

پھر لوگوں کو احساس ہوا حقیقت حال کا اور وہ اپنے ہوش میں آنے شروع ہو گئے۔ اس موقع کے بعد جناب عمرؓ نے اس موقع کے لیے فرمایا تھا، کہ انہیں یہ آیت ایسی لگی تھی کہ گویا وہ اسی وقت نازل ہوئی ہو اور یہ آیت سن کر ان کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور گویا جب انہیں ہوش آیا تو اب ان کے درمیان ان کے پیارے راہبر جناب محمدؐ موجود نہیں رہے اور انہیں ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے چکے تھے۔

"بے شک! جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے اسے فنا ہونا ہے اور تمہارے رب کی ذات بابرکت بڑی شان و شوکت والی اور عزت والی ہی ہمیشہ باقی رہے گی"۔ (سورہ رحمان ۵۵، آیت ۲۶-۲۷)

(۱۹۷) جناب رسالت مآبؐ کی صلوٰۃ جنازہ و دفن

جناب رحمت اللعالمین کے جسدِ مبارک کو آپؐ کے لباس سمیت غسل دیا گیا۔ اور اس خدمت میں شامل تھے جناب عباسؓ، جناب علیؓ، جناب فضل بن عباسؓ اور قثم بن عباسؓ، جناب اسامہ بن زیدؓ اور اوس بن خولی اور شقران (آپؐ کے آزاد کردہ غلام)

اس کے بعد ہزاروں کی تعداد میں لوگ آئے اور تھوڑے تھوڑے گروہ ہو کر آپؐ کی رہائش گاہ میں آتے رہے اور صلوٰۃ جنازہ ادا کر کے باہر جاتے رہے۔ اتنے لوگ اندر آتے جتنے کہ وہاں سما سکتے تھے۔ جب مردوں کا سلسلہ پورا ہوا تو خواتین نے آنا شروع کیا اور اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکا کہ کتنی مرتبہ صلوٰۃ جنازہ ادا کی گئی اور یہ کہ کسی صلوٰۃ میں بھی کسی نے اس صلوٰۃ کی امامت نہیں کی کیونکہ نبیؐ کی قیادت کوئی نہیں کر سکتا، ان کی وفات کے بعد بھی۔ اور تین روز تک مسلسل یہ سلسلہ صلوٰۃ الجنازہ چلتا رہا۔

آپؐ کی تدفین پر کچھ اختلاف ہوا لیکن جناب ابوبکرؓ نے فرمایا کہ انہوں نے جناب رسالت مآبؐ سے سنا ہے کہ انبیاء کو اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں پر وہ فوت ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ کا جسدِ مبارک اس جگہ سے ہٹایا نہیں گیا اور صلوٰۃ جنازہ بھی وہیں پڑھائی گئی اور آپؐ کی لحد کا بندوبست بھی وہیں کیا گیا جہاں پر آپ لیٹے ہوئے تھے۔

جناب رسالت مآبؐ کو بروز بدھ کی آدھی رات کے وقت دفن کیا گیا جبکہ آپؐ کی وفات بروز پیر کی دوپہر کو ہوئی تھی۔

(۱۹۸) جناب رسول اللہؐ کا جسد مبارک و لحد مبارک

امام احمد ابن ماجہ، نسائی اور ابوداؤد نے مختلف روایات سے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے نصیحت فرمائی کہ آپؐ کے لیے صلوٰۃ کا اہتمام کیا جائے خاص طور پر جمعہ کے روز۔ کیونکہ اس

روز فرشتے بھی آپؐ کے لیے صلوٰۃ کہتے ہیں انسانوں کے ساتھ مل کر اور وہ صلوٰۃ و سلام جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

کسی نے آپؐ سے سوال کیا، کہ کیا یہ ایسا ہی آپؐ کی وفات کے بعد بھی ہوگا؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے زمین کو منع فرمایا ہے کہ پیغمبروں کے اجسام کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے اللہ کے نبی محفوظ رہتے ہیں اور اپنا رزق پاتے ہیں"۔

اس جواب میں وہ سوال بھی شامل ہو گیا کہ صلوٰۃ و سلام آپؐ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا آپؐ کی وفات کے بعد بھی۔ جناب رسالت مآبؐ نے منع فرمایا تھا کہ اس بات سے احتراز کریں کہ آپؐ کی لحد کو عبادت کی جگہ بنایا جائے۔ آپؐ نے ان اقوام پر لعنت فرمائی جنہوں نے اپنے پیغمبروں اور اولیاء کی قبور کو عبادت کی جگہ بنایا۔ بے شک یہ بڑا گناہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم جناب رسول اللہؐ پر صلوٰۃ بھیجنے کا اور سلام بھیجنے کا سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۵۶) میں نازل ہوا۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اللہ بھیجتا ہے اپنی صلوٰۃ (یعنی رحمتیں، برکتیں، عزت، فضل و کرم) اپنے پیغمبر محمدؐ پر اور اس کے فرشتے بھی (اللہ سے دعا کرتے ہیں آپؐ کی مغفرت کے لیے اور آپؐ پر برکتوں اور رحمتوں کے لیے) لہٰذا اے ایمان والو! تم بھی اپنی طرف سے صلوٰۃ بھیجو (یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے آپؐ پر) اور سلام بھیجو آپؐ پر جیسا کہ سلام بھیجتے ہیں"۔

(۱۹۹) جس سے اللہ کے رسولؐ نے محبت فرمائی ان کی صفات

جناب رسول اللہؐ کو دل مدینہ سے خاص رغبت تھی یعنی مدینہ کے لوگوں سے، مدینہ میں اپنی مسجد سے، مدینہ شہر سے، مدینہ کے پہاڑ احد سے، جہاں آپؐ کے پیارے شہداء احد اور خاص طور پر آپؐ کے چچا سید الشہداء و سیف اللہ و اسد اللہ جناب حمزہ بن عبدالمطلبؓ مدفون تھے، ان سے آپؐ کو بے حد محبت تھی۔ ان کے علاوہ بھی چند اور شخصیات جو آپؐ کو محبوب تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ کو سب سے زیادہ محبوب ذات تو باری تعالیٰ ہی کی تھی۔ اب آپؐ کی محبوب شخصیات اور چیزوں کے متعلق مختصر ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

(الف) مدینہ اور اس کے مکینوں سے محبت:

i) جناب رسول اللہؐ نے اہل مدینہ سے اچھی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں جس کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو اہل بھی ثابت کیا اور اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھے وعدے بھی فرمائے اور یہی وجہ ہے کہ آپؐ ان کو پسند فرماتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اہل مدینہ نے آپؐ سے اس وقت جب اہل قریش آپؐ کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے، یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آپؐ کی حفاظت اس طرح کریں گے جس طرح سے وہ اپنے بچوں اور عورتوں کی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا وعدہ وفا بھی کیا اور اس امر کے لیے اگر صرف ایک مثال ہی پیش کرنے کو کہا جائے تو جناب ابو دجانہؓ کی بے مثال محبت قربانی اور جانثاری کی مثال تاریخ میں نہ ملتی ہے اور نہ ملے گی کہ انہوں نے اپنے جسم کو ڈھال بنا کر جناب رسالت مآبؐ کی طرف آنے والے تیروں کو اپنے جسم پر روک لیا (سبحان اللہ)

اس سلسلے میں قرآن حکیم کی سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۰۰) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور جو مہاجرین اور انصار میں سے ایمان میں سبقت لے جانے والے ہیں اور وہ بھی جنھوں نے ان کی پیروی کی ایمان میں تو، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے۔ اللہ نے ان کے لیے وعدہ کر رکھا ہے باغوں کا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی (جنت میں) اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ان کے لیے بڑی کامیابی ہے"۔

ii) امام ابو جعفر بن جریر طبریؒ نے جابر بن عبداللہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "ابراہیمؑ نے اللہ کے گھر (کعبہ) کو محترم بنایا اور اس کی جگہ اور میں نے بنایا محترم اور اس کی جگہ مدینہ میں جو کچھ بھی ہے دو پہاڑوں کے درمیان۔ اس لیے یہاں شکار کرنا اور درختوں کو کاٹنا ممنوع ہے (جیسا کہ مکہ کی حدود میں ہے) نسائی اور مسلم نے بھی یہی لکھا ہے۔

iii) امام بخاریؒ نے انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا جناب رسول اللہؐ نے کہ: "ایمان کی نشانی ہے کہ انصار سے محبت کی جائے اور منافق کی نشانی ہے کہ وہ انصار سے نفرت کرے"۔

iv) امام بخاریؒ نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اگر میں مدینہ میں ایک ہرن چرتا

ہوا دیکھوں تو میں اس کا پیچھا نہیں کروں گا کیونکہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ "مدینہ ایک حرم ہے دو پہاڑوں کے درمیان"۔

v) جناب رسالت مآبؐ کی ایک بہت مشہور حدیث ہے کہ جب آپؐ نے احد پہاڑ کو دیکھا، جبکہ آپؐ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ "کہ ہم اسے پسند کرتے ہیں اور یہ ہمیں چاہتا ہے"۔

(ب) مسجد نبویؐ:

i) امام مسلمؒ نے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "میری مسجد میں ایک صلوٰۃ بہتر ہے ایک ہزار صلوٰۃ سے کسی بھی دوسری مسجد میں سوائے مسجد الحرام کے"۔

ii) امام احمدؒ، ترمذیؒ، اور طبرانیؒ نے جناب رسالت مآبؐ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ "جو کوئی بھی میری مسجد میں لگاتار چالیس صلوٰۃ ادا کرے تو وہ آپؐ کی طرف سے لکھوا لے کہ وہ منافقت سے بچا رہے گا"۔

iii) بخاریؒ نے ابوہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کا ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض (کوثر) پر ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جناب رسالت مآبؐ کے منبر کی جگہ اتنی مبارک اور متبرک ہے کہ وہ مرتبے کے اعتبار سے جنت کے حوض کوثر جیسی ہے اور رسالت مآبؐ کے گھر اور منبر کے درمیان والی جگہ ایسی ہی ہے جیسا کہ جنت کا حصہ

iv) امام ابن تیمیہؒ نے جناب رسول اللہؐ کے فرمان کے تحت فرمایا کہ کوئی بھی سفر کسی عبادت یا ثواب کے لیے نہیں کرنا چاہیے سوائے تین جگہوں کے یعنی (۱) مسجد الحرام (۲) مسجد نبوی اور (۳) مسجد اقصیٰ۔

(ج) ام المومنین سیدہ عائشہ و خدیجۃ الکبریٰ اور سیدہ فاطمہ:

i) بخاریؒ نے ابو سلمہؒ کی روایت نقل کی ہے کہ ام المومنین سیدہ عائشہؓ نے فرمایا کہ:

ایک دفعہ اللہ کے رسولؐ نے (مجھے) کہا اے عائشہ! یہ جبرائیل ہیں اور تمہیں سلام کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا "سلامتی اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں ان پر۔ جو آپؐ دیکھ رہے ہیں میں نہیں دیکھتی"۔

۲) امام ابن کثیرؒ نے ابن مردویہ کے حوالے سے لکھا کہ امام احمدؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذی اور امام نسائی نے نقل کیا ہے کہ جناب رسالت مآب نے فرمایا کہ: "مریمؑ بنت عمران اور خدیجہؓ بنت خویلد اپنے وقت کی بہترین خواتین ہیں"۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ: "بہت سارے مرد گزرے ہیں کمال کے ساتھ، جبکہ عورتوں میں صرف تین ہیں (۱) صدیقہ مریمؑ (۲) آسیہؑ زوجہ فرعون اور خدیجہؓ بنت خویلدؓ۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے وقتوں کے پیغمبر کی دیکھ بھال کی ہے۔ سیدہ آسیہؑ نے جناب موسیٰ کی سیدہ مریمؑ نے عیسیٰ کی جبکہ سیدہ خدیجہؓ نے جناب رسالت مآب کے حوالے اپنی ذات کر دی اور اپنی تمام دولت آپؐ کے لیے وقف کر دی"۔ اس کے علاوہ سیدہ خدیجہؓ نے آپؐ کی نبوت کو اس وقت ہی تسلیم کر لیا تھا، جبکہ آپؐ نے اس کا اعلان بھی نہیں کیا تھا۔

۳) امام بخاریؒ نے مسور ابن مخرمہ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "فاطمہ میرا حصہ ہے جس نے اُسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا"۔

(و) جناب رسول اللہ کے قریب ترین نائبین:

۱) ترمذیؒ نے جناب رسول اللہؐ کا قول نقل کیا ہے کہ آپؐ نے ابوبکرؓ سے فرمایا کہ:

"تم میرے ساتھی ہو حوض کوثر کے اور میرے ساتھی غار کے (غار ثور کے)"

۲) طبرانیؒ نے جناب عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا،

"ابوبکرؓ سے زیادہ مجھ پر کسی کا احسان نہیں، انہوں نے اپنی ذات سے میری مدد کی اور اپنی دولت سے اور انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کیا"۔

۳) ترمذیؒ نے جناب رسول اللہؐ کا قول نقل کیا ہے کہ:

"جس کسی نے بھی دیکھنا ہو ایسے شخص کو، جسے دوزخ کی آگ سے رخصت مل چکی ہو تو پھر اسے چاہیے کہ وہ ابوبکرؓ کو دیکھ لے"۔

۴) ترمذیؒ نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ:

"ابوبکرؓ اور عمرؓ میرے لیے بالکل ایسے ہی ہیں جیسے میری سماعت اور میری بصارت کا درجہ میرے سر کے لیے ہے"۔

۵) ابن عساکرؒ اور الحاکمؒ نے جناب رسول اللہؐ کا قول نقل کیا ہے کہ:

"ہر نبی کے دو وزیر ہوتے ہیں جنت کے رہنے والوں میں سے اور دو زمین کے رہنے والوں میں سے۔ میرے دو وزیر جنت کے رہنے والوں میں سے ہیں۔ جبرائیلؑ و میکائیلؑ اور زمین کے رہنے والوں میں سے ہیں، ابوبکرؓ اور عمرؓ۔

۶) ترمذیؒ نے جناب رسول اللہؐ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ:

"بے شک اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر سچائی رکھ دی ہے"۔

(۲۰۰) جناب رسالت مآب کے قریب ترین ساتھی نے قیادت سنبھال لی

امام ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب سیرت النبیؐ میں امام احمدؒ کے حوالے سے عبداللہ بن مسعود کی روایت لکھی ہے اور ایسی ہی ایک روایت جناب عمر بن خطابؓ کی جو امام نسائی نے لکھی ہے، کہ جناب رسول اللہؐ کے وصال کے بعد انصار کے ایک گروہ نے یہ دعویٰ کیا کہ ایک خلیفہ انصار میں سے اور ایک مہاجرین میں سے ہونا چاہیے۔ یہ بات سننے کے بعد جناب عمرؓ نے فرمایا کہ:

"اے انصار کے لوگو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جناب رسول اللہؐ نے ابوبکرؓ کو منتخب کیا تھا، کہ وہ اُن کی جگہ صلوٰۃ کی قیادت کریں؟ تو اب مجھے بتاؤ کہ اب کون ہے جو جناب ابوبکرؓ کو اپنی قیادت اور سربراہی میں لانا چاہتا ہے"؟۔

یہ بات سننے کے بعد انصار نے کہا: "ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہم ابوبکرؓ کو پیچھے چھوڑیں"۔

محمد بن اسحاقؒ نے مزید کہا کہ جناب عمرؓ نے فرمایا کہ:

"اے مسلمانو! بغیر کسی شک کے رسول اللہؐ کا نائب بننے کے لیے سب سے زیادہ موزوں شخص وہ ہے جو غار کے ساتھیوں میں سے ایک ہے۔ اور ابوبکرؓ سب سے زیادہ پرہیزگار اور بزرگ شخص ہیں مسلمانوں میں سے"۔

پھر انہوں (عمرؓ) نے جناب ابوبکرؓ کا ہاتھ تھام لیا اور خلافت کے لیے بیعت کی۔ اس طرح سے جناب ابوبکر صدیقؓ جناب رسول اللہ کے سب سے زیادہ چہیتے تمام مسلمانوں میں۔ جناب رسول اللہؐ کے بعد مسلمان قوم اور ملک کے پہلے خلیفہ منتخب ہو گئے۔

(۲۰۱) اقوالِ قرآن برائے جناب رسول اللہؐ

اللہ کی کتاب میں بہت سی آیات مبارکہ ایسی ہیں جن میں جناب رسالت مآب کی شان بیان کی گئی ہے۔ چند ایک آیات حوالے کی غرض سے درج ذیل کی جا رہی ہیں تا کہ قارئین کو یہ احساس ہو جائے کہ اللہ کی کتنی رحمتیں اور برکتیں ہیں، جناب رسول اللہ پر اور اللہ تعالیٰ کو وہ کتنے پیارے ہیں اور امت کے لیے آپؐ کتنے باعث برکت اور رحمت ہیں۔ آپؐ کی تعلیمات اقوال اور افعال ہماری راہبری کے لیے کتنی اہمیت کے باعث ہیں۔

(الف) مہرِ نبوت:

سورۃ الاحزاب (۳۳) کی آیت (۴۰) میں بتایا گیا ہے کہ جناب محمد رسول اللہؐ آخری نبی ہیں اور آپ مانند ہیں اس مہر کے جو کسی سند پر یا دستاویز پر اس کے مکمل ہونے کے بعد لگائی جاتی ہے۔ اس طرح آپؐ سلسلہ نبوت اور نزول الہام کی دستاویز پر مہر کی طرح ثبت کیے گئے ہیں۔ اب انسانیت کے لیے مزید کسی نبی اور الہام کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ انسان کی تعلیم و تربیت اب مکمل ہو چکی ہے، اب وہ زندگی کے مقصد سے پورے طور پر آگاہی حاصل کر چکے ہیں، علم و حکمت کی منزلیں طے کر چکے ہیں اور زندگی اور موت کے رموز سے بہرہ مند ہو چکے ہیں۔ اب ان کے ذہن کو جلا بخشنے کے لیے علم کی تمام منزلیں موجود ہیں یعنی وہ اپنی دانش کی آگاہی اور تکمیل کے لیے علم جبلت، علم ادراک اور علم الہام کی انتہا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اب مزید الہام کی انہیں ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے اب یعنی وصال محمدؐ کے بعد یا ان کی زندگی میں بھی اگر کوئی نبوت کا دعوے دار ہے یا تھا یا کہتا ہے کہ وہ الہام یا وحی کا حصول کنندہ ہے تو وہ بلاشبہ جھوٹا ہے اور قابل سرزنش ہے۔

(ب) جناب رسول اللہ کا اخلاق اور پارسائی:

اللہ تعالیٰ نے سورۃ القلم (۶۸) آیت (۴) میں فرمایا کہ:

"بے شک (اے محمدؐ) آپؐ اخلاق حسنہ کے بہترین درجہ پر فائز ہیں۔"

جناب رسالت مآب بہت زیادہ منکسر المزاج اور اللہ تعالیٰ کے نہایت تابعدار غلام تھے۔ آپؐ نے اپنے مالک کے حکم کے ہر پہلو کو تسلیم کرنے کا حق ادا کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے مزاج اور اخلاق کو انسانیت کے لیے بہترین اور مثالی قرار دیا۔

(ج) سب کے لیے رحمت:

سورہ انبیاء (۲۱) آیت (۱۰۷) میں فرمان ربی ہے کہ:

"ہم (اللہ) نے تمھیں بھیجا (اے محمدؐ) عالمین کے لیے رحمت بنا کے"۔

اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اللہ کو اپنی رحمت قرار دیا۔ اس رحمت سے جو کوئی بھی مستفید ہونا چاہتا ہے اس پر رحمت طاری ہو جاتی ہے یعنی اس پر رحمت کے فیوض و برکات جاری و ساری ہو جاتے ہیں۔ پوری انسانیت کے لیے جب کہ پوری نسل ابلیس اس کو راہ حق سے ہٹانے کے لیے ہمہ تن و ہمہ وقت مصروف تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا، تا کہ ان کے فیض رحمت کو حاصل کر کے لوگ اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کر لیں۔ اور جب اللہ کی قربت مل جائے تو نہ ابلیس درمیان میں حائل ہو سکتا ہے اور نہ ہی جہنم اس کے سامنے آ سکے گی۔ کیونکہ اسے راہ حق حاصل ہو جائے گا اللہ کی محبت اور اس کے رسول کی پیروی سے چنانچہ وہ سرخرو ہو جائے گا دنیا اور آخرت میں۔ اسی لیے آپؐ کو دونوں جہاں کے لیے رحمت کہا گیا ہے۔

(د) جناب رسول اللہ کی اپنی قوم کے لیے بخشش کی دعا:

۱) اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنی قوم کی غفلت اور لاپروائی کے باوجود ان کے لیے بخشش کی دعا مانگتے رہیں اور ان کے ساتھ مشفقانہ رویہ رکھیں اس سلسلے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۵۹) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اللہ کی رحمت کی وجہ سے ہی آپؐ ان کے ساتھ نرم خو رہے اور اگر آپ ان سے تلخ مزاج ہوتے تو وہ آپؐ سے دور ہو جاتے۔ اس لیے ان کے رویے سے درگزر فرمائیں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی بخشش چاہیں۔ اور ان سے روزمرہ کے معاملات میں مشورہ لے لیا کریں، پھر اللہ پر انحصار کر کے اپنا فیصلہ کر لیا کریں۔ یقیناً اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو اس پر توکل کرتے ہیں"۔

۲) سورۃ توبہ کی آیت (۸۰) میں فرمایا گیا ہے کہ معافی کی دعا جو آپؐ نے کی تھی منافقین کے لیے، وہ اللہ تعالیٰ نے منظور نہیں کی۔ لیکن ایمان والوں کے لیے آپؐ کی دعائیں منظور کی گئیں۔ اس آیت میں جو الفاظ آئے ہیں انکا مطلب یہ ہے کہ:

"چاہیے آپؐ (اے محمدؐ) ان کے لیے (منافقین کے لیے) معافی کی درخواست کریں یا نہ

کریں اور اگر آپ ان کے لیے ستر (۷۰) مرتبہ بھی معافی طلب کریں تو بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں فرمائے گا۔ کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے انکار کیا اور اللہ ان کو ہدایت نہیں دیتا جو نافرمان ہیں''۔

۳) اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۱۳) میں مشرکین کے بارے میں فرمان جاری فرمایا کہ ''یہ بات نبیؐ اور دیگر ایمان والوں کے لیے صحیح نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوں مشرکوں کے لیے، خواہ وہ ان کے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے بعد کہ معلوم ہو جائے کہ وہ جہنم کے مکین ہیں (یعنی کفر اور شرک میں ہی فوت ہو گئے ہوں)''۔

۴) سورۃ نور (۲۴) آیت (۶۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جب رسولؐ کے پاس کسی کام سے آئے ہوں تو وہ اس وقت تک وہاں سے نہیں جاتے جب تک کہ آپؐ سے اجازت نہیں لے لیتے۔ اور بے شک جو آپؐ سے اجازت لیتے ہیں تو آپؐ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیا کریں اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کیا کریں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

۵) اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اپنے رسولؐ کو سورۃ ممتحنہ (۶۰) آیت (۱۲) میں کہ:

''اے نبیؐ! جب مسلمان خواتین آپ کے پاس آئیں بیعت کرنے، اس پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، اور چوری نہ کریں گی اور بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ بہتان باندھیں گی (یعنی کسی کی اولاد کو اپنے شوہر کی اولاد نہ بتائیں گی) اور آپؐ کی ہدایات کی خلاف ورزی نہ کریں گی۔ تو آپؐ ان سے بیعت لے لیا کریں اور ان کے لیے مغفرت طلب کیا کریں، بے شک اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے''۔

۶) اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو سورۃ منافقون (۶۳) آیت (۵-۶) میں یاد کر رہے ہیں کہ:

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمہارے لیے رسول اللہؐ استغفار چاہیں اللہ سے تو وہ (فاسق) اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور آپؐ ان کو دیکھیں گے کہ وہ تکبر سے بے رخی کرتے ہیں۔ تو اس حالت میں ان کے لیے برابر ہے کہ ان کے لیے آپ استغفار کریں یا نہ کریں اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہ بخشے گا۔ بے شک اللہ ایسے نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

(ہ) رسولؐ روشن چراغ ہیں:

اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، سب سے زیادہ دانشمند فرماتا ہے کہ اس نے اپنے نبیؐ کو دانش کا خزانہ اور غیب کا علم و ادراک والہام کے ذریعہ سے عطا فرمایا۔ اس لیے آپؐ کی مثال ایک مینارِ ضیاء کی روشنی کی سی ہے، جو اندھیرے سمندر میں جہازوں کو ان کے ٹھکانوں کا پتا دیتی ہے۔ اسی طرح سے نبیؐ کا علم جہالت کے اندھیروں میں علم کا نور پھیلاتا ہے اور مخلوق اس سے فیض یاب ہوتی ہے۔ اور نبوت کا نور اس جہالت کے گھرے ہوئے لوگوں کو جہالت، غرور، تکبر، دشمنی، ظلم، کفر اور شرک سے بچاتا ہے۔ لہٰذا وہ جہنم کی آگ سے بچ جاتے ہیں۔ جناب رسول اللہؐ امت کو بلاتے ہیں محبت، امن، بھائی چارہ، اطمینان اور خوشی کی طرف۔ وہ لوگوں کو ان کی برائیوں سے آگاہ کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی طرف بلا کر اللہ کی حکمت سے روشناس کراتے ہیں اور پھر ان تک اللہ کی خوشخبریاں پہنچاتے ہیں۔

اس سلسلے میں درج ذیل آیاتِ قرآنی ملاحظہ فرمائیں۔

۱) سورۃ الاحزاب (۳۳) سورۃ (۴۵-۴۷) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اے نبیؐ! بے شک ہم نے تمہیں بھیجا گواہ بنا کر اور خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا۔۔۔۔ اور بنایا کہ جو صرف اللہ کی طرف بلانے والا مانند روشن چراغ کے اور (آپ) ایمان والوں کو خوشخبری سنائیں، کہ ان پر اللہ کا بہت فضل ہونے والا ہے''۔

۲) سورۃ سبا (۳۴) آیت (۲۸) اور (۴۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور ہم نے تو آپؐ کو بھیجا ہے پیغمبر بنا کر تمام انسانوں کے لیے، انہیں خوشخبری اور ڈر سنانے والا۔ لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں'' (۲۸/۳۴)

''کہو (اے رسول) کہ میں تو صرف ایک ہی بات سمجھاتا ہوں، وہ یہ کہ تم صرف اللہ کے واسطے کھڑے ہو جاؤ، دو دو اور ایک ایک اور پھر غور کرو (رسول اللہ کی اللہ کے لیے تابعداری پر تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ) تمہارے اس ساتھی (محمدؐ) پر کوئی پاگل پن نہیں ہے۔ وہ تو صرف تنبیہ یعنی وارننگ دینے والا ہے کہ ایک بڑا عذاب آنے والا ہے (نافرمانوں کے لیے)''۔ (۴۶/۳۴)

(و) اللہ تعالیٰ کی اپنے نبیؐ پر نظر کرم:

۱) دوسری صدی ہجری کے ماہ رجب کے کچھ حصے تک، مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے، صلوٰۃ میں۔ لیکن جناب رسول اللہ کی خواہش تھی کہ مسلمانوں کا رخ نماز میں کعبہ کی طرف ہو جائے اور اس کے لیے آپؐ صرف اپنا چہرہ مبارک اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھ لیتے اور منہ سے اپنی خواہش کا اظہار اپنے مالک سے نہ کرتے۔ دراصل آپ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ وہ بھی یہودی اور عیسائیوں کی مشابہت اختیار کریں قبلہ کے معاملے میں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۱۴۴) میں فرمایا کہ: ''بے شک ہم نے تمہارا چہرہ آسمان کی طرف کرتے ہوئے دیکھا تو یقیناً ہم تمہیں بدل دیں گے کعبے کی طرف جو تمہیں خوش کر دے گا، پس اب اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف کر لو۔

۲) اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ جناب رسالت مآب کے احکامات کو فوری طور پر تسلیم کریں۔ بصورت دیگر وہ بڑے عذاب کے مستحق ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں سورت نور (۲۴) آیت (۶۳) ملاحظہ ہو، جس میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

''تم رسول اللہ کے بلانے کو معمولی نہ سمجھو جیسا کہ تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو چپکے سے (مجلس نبوی) سے کھسک جاتے ہیں۔ اور جو کوئی بھی اس طرح کی مخالفت کرتے ہیں اللہ کے حکم کی تو ان کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر دنیا میں کوئی فتنہ آ جائے اور آخرت میں (بھی) وہ دردناک عذاب میں گھر جائیں''۔

۳) اسی طرح سے سورۃ محمد (۴۷) آیت (۳۳) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اطاعت کرو اس کے رسولؐ کی۔ اور (اس سے منکر ہو کر یا غافل ہو کر) اپنے اعمال غارت نہ کرو''۔

(ز) رسول اللہ پر اللہ کی برکتیں و رحمتیں:

اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب (۳۳) آیت (۵۶) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اپنی برکتیں رحمتیں فضل و کرم عزت و رحم فرماتا ہے اپنے نبیؐ پر۔ اور اس کے فرشتے (بھی) اللہ سے بھی دعا کرتے ہیں یعنی اللہ سے جناب رسول اللہ کے لیے اس (اللہ) کی رحمت اور فضل و کرم کی درخواست کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر ایمان والے پر بھی لازم کر دیا ہے کہ وہ

بھی ایسی ہی دعا اپنے نبیؐ کے لیے اللہ سے کرتے رہیں۔ اور اس کے علاوہ ان نبیؐ پر سلام بھی بھیجتے رہا کریں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ پر اتنا فضل و کرم فرمایا تو پھر آپؐ سے پوچھا سورۃ الشرح (۹۴) آیت (۴) میں کہ:

''کیا ہم نے بلند نہیں کیا آپؐ کا ذکر؟''

(ح) اللہ نے اپنے رسول کو سب سے اونچے درجے پر فائز کر دیا:

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اتنی عزت افزائی فرمائی کہ انہیں انسانوں میں سب سے اعلیٰ مقام معراج عطا فرمایا۔ اور اس کے لیے سب سے پہلے وقت اور جگہ کی قید سے آزاد کرتے ہوئے مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ پہنچایا۔ اور پھر وہاں سے آسمانوں کی طرف بلوالیا۔ جہاں پر اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں جو آپؐ سے پہلے کسی انسان نے نہیں دیکھی تھیں۔ اس کی تفصیل تو پہلے بیان ہو چکی ہے، یہاں صرف اس واقعہ کی نسبت سے یعنی آپؐ کے معراج یعنی بلندی یا فضیلت کے متعلق آیات نقل کی جا رہی ہیں۔

۱) سورۃ اسراء (۱۷) آیت (۱) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''پاک ہے ذات اس کی جس نے بلوالیا اپنے بندے کو، رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جہاں رکھی ہیں ہم نے برکتیں۔ تا کہ ہم انہیں اپنی قدرت کے عجائبات دکھا دیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت سننے والے اور بہت دیکھنے والے ہیں''۔

۲) سورۃ اسراء (۱۷) آیت (۷۹) میں فرمایا گیا ہے کہ: ''امید ہے کہ آپؐ کا رب آپؐ کو مقام محمود تک پہنچا دے گا''

۳) سورہ النجم (۵۳) آیت (۱۸) میں فرمایا گیا کہ: انہوں (محمدؐ) نے اپنے رب کی قدرت کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے''

۴) سورۃ الکوثر (۱۰۸) آیت (۱) میں فرمایا گیا ہے کہ: بے شک ہم (اللہ) نے (اے محمد) تمہیں عطا فرمایا الکوثر آخرت میں (حوض کوثر)۔

(ط) جناب رسول اللہ کے لیے ادب:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کے لیے عزت افزائی کا خاص اہتمام فرمایا اور ایمان والوں کو تاکید فرمائی کہ ہمہ وقت وہ نبیؐ کی عزت اور احترام کا خاطر خواہ خیال رکھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے

اعمال کسی بے ادبی کی وجہ سے اکارت چلے جائیں۔ یعنی ہمیشہ آپ ؐ کی محبت، آپ ؐ کی عزت، احترام ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ اس کے لیے یہاں صرف سورۃ حجرات (۴۹) کی پہلی پانچ آیات نقل کی جاتی ہیں، جس سے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کا پتا چل جائے گا۔

۱) اے ایمان والو! اپنے تئیں کوئی فیصلہ نہ کر لیا کرو، اللہ اور اس کے رسول ؐ سے پہلے۔ اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے''۔

۲) ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں جناب رسول اللہ ؐ کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ ہی آپ ؐ سے اونچی آواز میں بات کیا کرو، جس طرح سے تم آپس میں گفتگو کرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کر تمہارے اعمال غارت ہو جائیں اور تمہیں پتا ہی نہ چلے''۔

۳) ''بے شک وہ لوگ جو اپنی آوازیں جناب رسول اللہ ؐ کی موجودگی میں دھیمی رکھتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے سلسلے میں آزما رکھا ہے۔ ان لوگوں کے لیے ہے معافی اور بڑا انعام''۔

۴) بے شک وہ لوگ جو آپ ؐ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے''۔

۵) اور اگر وہ لوگ کچھ صبر کا مظاہرہ کرتے کہ جب تک آپ ؐ ان کے پاس باہر آ نہیں جاتے تو یہ ان کے لیے اچھا ہوتا اور اللہ بہت معاف فرمانے والا بہت رحم کرنے والا ہے''۔

(ی) اپنے معاملات میں رسول اللہ ؐ کو منصف بناؤ:

اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء (۴) کی آیت (۶۵) میں فرمایا کہ اللہ کے رسول ؐ کے فیصلے پر قائم رہا کرو اور اسے من وعن اپنے دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا کرو۔ اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ: ''نہیں نہیں، تمہارے رب کی قسم، وہ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ آپ ؐ کو اپنا منصف نہ بنا لیں اپنے ہر جھگڑے میں اور تمہارے ہر فیصلے کو قبول نہ کر لیں اور اپنے دل و جان سے تسلیم نہ کر لیں''۔

(ک) جناب رسول اللہ ؐ کی مکمل پیروی کا حکم:

اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام ہیں جن میں حکم دیا گیا ہے کہ امت کا ہر فرد آپ ؐ کے فرمان کی تعمیل کرے۔ کیونکہ رسول ؐ صرف وہی حکم اپنی امت کو دیتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے جناب رسول اللہ کی اتباع، اللہ تعالیٰ کی ہی اتباع ہوتی ہے اور اسی طرح جناب

رسول اللہ ؐ کے حکم کی خلاف ورزی بھی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات قرآنی پیش کی جا رہی ہیں۔

i) سورۃ آل عمران (۳) آیت (۳۱) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''کہو (اے محمد ؐ)! کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے واقعی ہی محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔ بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے''۔

ii) سورۃ آل عمران (۳) آیت (۳۲) میں فرمایا گیا ہے کہ۔

''کہو (اے محمد)! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول ؐ کی۔ اور پھر جو کوئی پھر جائے تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا''۔

iii) سورۃ النساء (۴) آیت (۸۰) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''جس شخص نے رسول ؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور پھر جو کوئی اس سے پھر جائے تو ہم نے آپ ؐ کو ان کا نگران بنا کر نہیں بھیجا''۔

iv) سورۃ انعام (۶) آیت (۳۳) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''بے شک ہم جانتے ہیں اس رنج کو جو آپ ؐ کو ان کے الفاظ سے پہنچتا ہے۔ (اے محمد ؐ) یہ لوگ آپ ؐ کو ہی نہیں جھٹلا رہے، بلکہ یہ ظالم تو اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلا رہے ہیں۔

v) سورۃ اعراف (۷) آیت (۱۵۷) میں فرمایا ہے کہ:

''جو لوگ اتباع کرتے ہیں اُس رسول ؐ کی جو نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں اور جن کے متعلق وہ لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے پاس تورات میں (Deut.xviii,15) اور انجیل میں (John.xiv,16) وہ حکم دیتا ہے ان کو اچھے کاموں کا اور منع کرتا ہے برے کاموں سے اور وہ اجازت دیتا ہے انہیں حلال کی اور منع کرتا ہے انہیں حرام سے۔ وہ انہیں نجات دلاتا ہے اس بوجھ سے اور اس طوق سے جو انہیں جکڑے ہوئے تھے۔ پس جو لوگ اس پر (محمد ؐ) ایمان لاتے ہیں اس کی عزت و احترام کرتے ہیں اس کی مدد کرتے ہیں اور اتباع کرتے ہیں نور کی (قرآن کی) جو ان کے پاس بھیجا گیا ہے یہ وہ ہیں جو کامیابیوں سے ہمکنار ہوں گے''۔

vi) سورۃ نور (۲۴) آیت (۵۶) میں حکم ہے کہ:

"قائم کرو صلوٰۃ اور ادا کرو زکوٰۃ، اور اطاعت کرو رسولؐ کی تا کہ تم پر رحم کیا جائے"۔

vii) سورۃ احزاب (۳۳) آیت (۲۱) میں فرمایا ہے کہ:

"بے شک رسولؐ اللہ میں موجود ہے ایک عمدہ مثال اور نمونہ اتباع کرنے کے لیے اس شخص کے لیے جو امید رکھتا ہو اللہ کے پاس حاضر ہونے کی اور امید رکھتا ہو قیامت والے دن کی اور اللہ کی یاد میں زیادہ مصروف رہتا ہو"۔

viii) سورۃ احزاب (۳۳) آیت (۳۶) میں حکم ہوا ہے کہ:

"یہ کسی ایمان والے مرد یا عورت کے لیے جائز نہیں، کہ جب اللہ اور اس کے رسولؐ کسی معاملے کے متعلق کوئی فیصلہ کر دیں تو وہ اس کے متعلق کوئی رائے زنی کریں اور پھر جو کوئی بھی نافرمانی کرے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تو بے شک وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا"۔

ix) سورۃ احزاب (۳۳) آیت (۶۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"جس روز ان کے چہرے دوزخ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے، وہ کہیں گے: کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی"۔

x) سورۃ محمد (۴۷) آیت (۳۳) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور اپنے اعمال کو غارت نہ کرو (نافرمانی کر کے)"۔

(۲۰۲) تکمیل دین اور ضرورت اجتہاد

دین اسلام کی تکمیل کا مطلب ہے تکمیل نبوت یعنی کہ سلسلہ نبوت جو انسانوں کے باپ جناب آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور آخر کار جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیل کی منزل کو پہنچ گیا تو پھر اس کے بعد انسان کی رہبری کے لیے مزید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ضرورت نہ رہی اور الہام کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے۔ اس لیے نبوت کی راہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور اب قیامت تک کے لیے جناب محمد رسولؐ اللہ کی نبوت ہی جاری وساری رہے گی۔

اس بیان کی بنیاد جو اوپر دیا گیا ہے وہ جناب رسولؐ اللہ کے اس خطاب سے اخذ کیا گیا

ہے، جو آپؐ نے اپنے پہلے اور آخری حج کے خطبات میں دیے تھے اور آپؐ نے عرفات کے میدان میں سورۃ المائدہ (۵) کی آیت (۳) کا ایک حصہ پڑھ کر اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع دی تھی، کہ دین اسلام اب پوری طرح سے تکمیل پا چکا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کے الفاظ ہیں کہ:

"آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا"۔

ابن جریرؒ نے لکھا ہے کہ ہارون بن انترہ نے کہا، کہ ان کے والد نے کہا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی بروز حج عرفات میں تو جناب عمرؓ اسے سننے کے بعد چیخ پڑے۔ جس پر جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "تم کس بات پر چیخے ہو؟"۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اس بات پر چیخا کہ ہمارا دین ہمارے لیے مکمل ہو گیا ہے اب یہ مکمل ہے اور ہر چیز کو عروج کے بعد زوال آتا ہے۔ جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "تم نے سچی بات کی"۔

امام احمدؒ نے لکھا کہ طارق بن شہابؓ نے کہا، کہ ایک یہودی شخص نے کہا عمر بن خطابؓ کو: اے امیر المومنین! آپ کی کتاب میں ایک آیت ہے جسے آپ سب پڑھتے ہیں اور اگر وہ ہمارے لیے نازل ہوتی تو ہم اس دن کو منایا کرتے خوشی کے لیے۔ اس نے درج بالا آیت کے متعلق کہا تھا۔

اس کے بعد سے اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات جو قرآن میں محفوظ ہیں اور جناب رسالت مآبؐ کے افعال اور اقوال جو ہمیں زندگی گزارنے کے قوانین بطور طریقے مہیا کرتے ہیں تا کہ ہماری زندگیاں فطری قواعد اور اللہ تعالیٰ کی منشا ومرضی کے مطابق گزاری جا سکیں۔

چنانچہ اسلام کے دین کی خدمت کرنے والے عالم اور مفکر جو جناب رسولؐ اللہ کے احکامات اور منشا کی پیروی کے خواہشمند ہوتے ہیں وہ قرآن اور سنت کی روشنی میں اپنے عصر حاضر کی ضرورتوں اور معاشرے کی تبدیلیوں کے مطابق قوانین مرتب کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح سے کہ قوانین کا استخراج جو کسی ایک مفکر نے کیا ہو اور وہ قرآن اور سنت کی روح سے متنازعہ نہ ہو وہ اجتہاد کہلاتا ہے اور جب یہی استخراج علماء اور مفکرین کے ایک گروہ نے کیا ہو تو وہ اجماع کہلاتا ہے۔ جناب رسولؐ اللہ کے تمام قریبی اصحاب اور خصوصاً آپؐ کے تابعین نے اور ان کے بعد کے جید مفکرین اور عالموں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ کوئی بھی اجماع یا اجتہاد جو قرآن اور

سنت کے بنیادی عقائد، اصولوں اور روح سے اتفاق نہ کر سکے وہ قابل قبول نہ ہوگا۔

اس لیے درج بالا اصول کی اتباع کے لیے امت مسلمہ کا ہر فرد جو پیشوا، سربراہ اور لیڈر جناب محمد رسول اللہؐ کو تسلیم کرتا ہے اس کا براہ راست تعلق قرآن اور سنت یعنی رسول اللہؐ کے قول اور فعل سے ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ ان اصولوں کو سمجھنے کی غرض سے کسی بھی علم و فہم رکھنے والے شخص سے رجوع کر سکتا ہے، جب اسے اس کی ضرورت پڑے۔ لیکن ہوا یوں کہ مختلف اذہان، مختلف استخراجات پیش کرتے رہے اپنے اپنے علم اور عقیدے کی بنیاد پر، حالانکہ بنیادی منبع ان کی سوچ کا قرآن اور سنت ہی تھا۔ اس طرح سے جب ایک مسئلے پر مختلف نظریات سامنے آئے اور سب کے لیے دلیل قرآن اور سنت سے ہی دی گئی تو پھر لوگوں نے ان نظریات میں سے ایک کو اپنے مزاج اور علم اور نظریے کی دلیل کے مطابق منتخب کر لیا یعنی جسے انہوں نے سمجھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمودات کے زیادہ قریب ہے۔ چنانچہ یہی اصول اور سلسلہ تیسری صدی ہجری تک چلتا رہا اور مسلمان اسی طرح سے دین پر کاربند رہے اور انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ فلاں فلاں فقہ یا اصول یا فلاں فلاں عقیدہ یا شخصیت کے پابند ہیں اور صرف اسی کی اتباع کریں گے۔ اس وقت تک اسلام کے ماننے والے فقط مسلمان تھے اور بہت سادگی سے قرآن اور سنت کی پیروی کرتے تھے۔ وہ قرآن و سنت کو جناب رسول اللہؐ کی زندگی کے مطابق اپنی عقل کی بنیاد پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کے لیے جناب رسول اللہؐ کے قریبی اصحاب کے قول اور عمل سے بھی استفادہ حاصل کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی جب ضرورت پڑتی تو کسی بھی عالم یا مفکر سے براہ راست یا ان کے اقوال سے مدد حاصل کرتے قرآن اور سنت کو سمجھنے کے لیے۔

ہندوستان کے ایک مفکر اور عالم شاہ ولی اللہ جو بارہویں صدی میں گزرے، انہوں نے اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ چوتھی صدی ہجری کے دوران لوگ مذہب کی پیروی کے لیے جناب رسول اللہؐ کی اتباع کرتے تھے اور کسی ابہام کی صورت میں علماء کی رائے لیتے۔ اگر علماء کی رائے ایک سے زیادہ ہوتی اور ان میں اختلاف رائے ہوتا تو، وہ پھر کسی ایک رائے کو جو ان کی عقل کے مطابق بہتر ہوتی اختیار کر لیتے۔

لیکن چوتھی صدی کے بعد علماء کی سوچ میں زوال آ گیا اور ان میں قرآن اور سنت کی تشریح کرنا اور اس میں سے استخراج کرنا مشکل معلوم ہونے لگا تو انہوں نے اپنی سوچ کے دائروں

کو مقفل کر دیا اور اپنے سے پہلے علماء کی سوچ اور نظریے کا سہارا لیتے ہوئے ان میں سے کسی ایک عالم، مفکر یا امام کے نظریے پر لبیک کہتے ہوئے، اسی کو قبول کر لینے کا رواج ڈال دیا۔ اس رواج نے بنیاد ڈال دی مختلف نظریات کی پیروی کرنے کی اور علماء وقت نے کسی بھی خاص امام کے نظریے کو بنیاد بناتے ہوئے دوسرے تمام نظریات کو رد کر دیا اور صرف ایک ہی فکر کی پیروی اور وکالت کرنے لگے اور اپنے آپ کو ان کی فکر سے منسوب کرنے لگے اور اس طرح سے انہوں نے اس فکر کو ایک خاص نام دیتے ہوئے ان علماء یا اماموں کو دین کے معاملات میں اپنا سربراہ مان لیا۔ حالانکہ ان علماء یا اماموں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کسی فرقے کے بانی ہیں اور یہ کہ ان کی فکر یا نظریہ حتمی ہے اور دیگر غلط ہیں اور یہ کہ صرف ان ہی کی فکر کی اتباع کی جائے۔

اس طرح سے پانچ بڑے فرقے مسلمانوں میں پیدا ہو گئے اور پھر ان میں مزید شاخیں نکل آئیں اور پھر انہوں نے ایک دوسرے کی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ مختلف حکمرانوں نے اپنی اپنی مملکتوں میں اپنے مرضی کے فقہی قوانین نافذ کر دیے اور یہ تصور کر لیا کہ عوام الناس کا وہی فرقہ ہے جو مملکت کا ہے چہ جائے کہ کوئی خود سے اس کا انکار نہ کر دے۔ عقائد کے عوام میں اور خاص طور پر جنوبی ایشیا میں تقریباً ساٹھ کروڑ افراد ایسے ہیں جس میں سے ننانوے فیصد کو تو یہ پتا ہی نہیں کہ ان فرقوں کی ابتدا کیونکر ہوئی اور یہ کہ جو ان سے کہا گیا وہی ان کا فرقہ ہو گیا اور وہ اپنے اپنے علماء کے مسلک کے تابع ہو گئے۔ اصل میں وہ لوگ زیادہ تر مذہبی رسم و رواج کے پرستار ہو گئے اور قرآن کو سمجھنا تو کجا انہوں نے چھوڑ ہی دیا ہے اور قرآن کی تلاوت صرف ثواب حاصل کرنے کی غرض سے رہ گئی یا کوئی فوت ہو جائے تو اس کے ایصال ثواب کے لیے قرآن پڑھا جاتا ہے یا پھر نکاح کے بعد دختران عزیزاں کو قرآن کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے اس کو سمجھنے کی نہ تلقین کی جاتی ہے اور نہ ہی خود سے کوشش کی جاتی ہے۔ جو کچھ ان کے فقہ کے علماء کہتے ہیں اسی کو زیادہ تر بغیر سمجھے اپنا لیا جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے دین اسلام کو مذاہب بنا کر اسے تقسیم کر لیا ہے اور پھر مذاہب سے اسے داستانوں اور کہانیوں اور خوابوں اور تصوراتی و ماورائی علوم میں تبدیل کر دیا ہے، جسے عام طور پر Myth کہا جاتا ہے مذہب کو اس رنگ میں لانے کے لیے اول اول تو یونانی فلسفے اور Myth نے راہ ہموار کیا۔ اور اس کے بعد ایرانی قدیم مذہب کا رنگ لگا، پھر رہبانیت نے اپنا رنگ دکھایا اور پھر آخر میں رہی سہی کسر ہندو اور بدھ

مت کے افکار، رسم و رواج اور Myth نے پوری کر دی اور مسلمانوں کو اعمال اور عقائد کے اعتبار سے گمراہ کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اصل سے نا واقف بے بہرہ ہو گئے۔ اسی بے راہ روی نے دوسری طرف ایک اور گروہ پیدا کر دیا جو مذہبی انتہا پسندی کی طرف چل دیا اور اس طرح سے مذہبی رواداری اور دین اسلام میں کوٹ کوٹ کر بھری محبت اور امن اور جناب رسالت مآبؐ کے اقوال اور افعال سے دوری ہو گئی۔

فقہوں کی تقلید کا رواج اس قدر شدت اختیار کر گیا، کہ اگر کسی مفکر نے سوچ سمجھ کے بعد حالات اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن اور سنت کی ایسی تشریح کی جو مروجہ فقہی خیالات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی، اسے نہ صرف قبول کرنے سے انکار کیا، بلکہ اس کی مخالفت کی۔ بلکہ ان خیالات اور مفکرین کے خلاف شدت اختیار کر لی اور اب تو یہ شدت دشمنی کی حد تک بڑھ چکی ہے۔ گذشتہ دور کے ایسے عالم اور مفکر جنہوں نے اجتہاد کرنے کی کوشش کی عام عالموں اور اساتذہ نے ناپسندیدگی کی وجہ سے علمی دروس میں ان کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ ایسے مفکرین و علماء میں چند کا ذکر کرنا مناسب ہوگا مثلاً امام ابوالحسن الاشعری، امام غزالی، شیخ السلام عزالدین، شیخ السلام امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، شیخ مودودی وغیرہ۔

انسانی تمدن کی ترقی پندرھویں صدی عیسوی میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد اور پھر اس کے بعد (۱۷) صدی میں مختلف سائنسی ایجادات اور صنعتی انقلاب اور پھر جاگیر داری نظام اور کلیسا کی برتری کے خاتمہ (ایشیا کے علاوہ) کی وجہ سے عمل میں آئی۔ لیکن گزشتہ نصف صدی سے نظام اطلاعات و ترسیلات، سائنسی علوم اور ایجادات کے پھیلاؤ اور کمپیوٹر کی ایجاد سے انسانی تہذیب اور تمدن میں اس قدر ترقی کا دور دورہ ہوا کہ جس کا تصور انسانی ذہن میں آج سے ایک صدی قبل تک نہیں ملتا۔ اگر کمپیوٹر کی ایجاد کو اکیسویں صدی کا جادو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان حالات کے پیش نظر یعنی انسانی شعور اور عقل و دانش کے اس پھیلاؤ میں انسانی تہذیب و تمدن کہیں سے کہاں پہنچ گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی بہت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ امت مسلمہ اور اس کے تقلیدی علماء ابھی تک ان جدید علوم سے بے بہرہ نہیں، بلکہ اس سے مسلسل اپنی بصارت اور سماعت کے دروازے بند کر کے بیٹھے ہوئے ہیں اور آج بھی ان علوم سے بہرہ مند ہونے کی کوشش نہیں کر رہے اور نہ ہی یہ بات ان کے پروگرام میں شامل ہے۔ آج بھی صدیاں بیت

گئیں لیکن اجتہاد کے دروازے کھولنے کا کوئی پروگرام ان کے پاس نہیں ہے۔ بیشتر مسلم ممالک میں وہی کلیسائی جاگیردارانہ اور آمرانہ نظام رائج ہے۔

یہ بہت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ ان کے مدارس کا نصاب یعنی خاص طور پر جنوبی ایشیا کے مدارس کا آج سے تقریباً چار صد سال پہلے یعنی سولہویں صدی عیسوی میں اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں اسی کے ایماء پر ملا نظام الدین نے تشکیل دیا تھا جو اس وقت کے بعد کبھی بھی زمانے کی ترقی اور ذہنی نشو و نما اور ارتقا کے مطابق نظر ثانی کی زد میں نہیں آنے دیا گیا۔ وہ جوں کا توں اسی حال میں ہے اور آج بھی اس نظام تعلیم کا متولی اسے تھامے بیٹھا ہے اور اس میں زیر زبر نہیں لگانا چاہتا۔

مفکر مشرق شیخ اقبالؒ اسلامی فقہ و قانون کا ماہر اپنے فکر میں روتا رہا کہ مسلمان اجتہاد کے دروازے کھول لیں اور اسلامی فکر کی زمانہ حاضر کے مطابق قرآن اور سنت کی روشنی میں تشریح کریں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن اور سنت کا مطلب بدل دیں دراصل اجتہاد کا مطلب یہ ہے، کہ ہمیں یہ غور کرنا ہوگا کہ آج اس اکیسویں صدی عیسوی میں اگر قرآن نازل ہوتا اور جناب رسالت مآبؐ آج اس دور میں پیدا ہوتے تو قرآن کی انہیں آیات اور جناب رسول اللہؐ کی اسی ہدایت کا مطلب آج کیا ہوتا۔ ابھی تک اسلامی فکر اسی اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے، لیکن پھر بھی اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں علم کی روشنی کی ایک کرن جھلک رہی ہے۔ چند ایک مفکر اور چند ایک ادارے اس کرن کی روشنی سے جہالت کے اندھیرے منور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان اداروں جن سے کچھ امیدیں وابستہ ہیں اگر نام لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا، ان میں سے مثال کے طور پر اسلامی یونیورسٹی مدینہ، اسلامی یونیورسٹی ملائشیا، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اور اسلامی ریسرچ فاؤنڈیشن انڈیا جیسی تنظیمیں اس پر کام کر رہی ہیں لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آٹے میں نمک۔ ہمیں پورے کے پورے نظام تعلیم کو ایک کر دینا چاہیے اور قرآن اور حکمت کو نصاب میں بالکل اسی طرح شامل کرنا چاہیے جیسا کہ ہم فزکس اور کیمسٹری پڑھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم قرآن و سنت کے فہم و ادراک اور استخراج کے علاوہ وہ علوم بھی اس کے ساتھ حاصل کریں جو اللہ تعالیٰ نے جناب آدم علیہ السلام کو سکھائے تھے اور پھر ان کی جنت میں داخل کر دیئے۔ اس کتاب کے شروع میں موضوع نمبر (۲۵) میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ جناب آدمؑ کو

اللہ تعالیٰ نے کیا علم سکھایا تھا کہ وہ فرشتوں سے زیادہ عالم و فاضل ہو گئے اور پھر فرشتوں کو آدمؑ کے ادب میں ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ آج اسی علم کی اشد ضرورت ہے۔ ذرا غور فرمائیں؟

(۴۳) کسی ایک مکتبہ فکر یا فقہ سے منسلک ہونا

کسی ایک مکتبہ فکر یا کسی خاص امامت سے اپنے آپ کو منسلک کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اپنی ذات کو یا اپنے مکتبہ فکر کے علماء کو اور لوگوں کو فکر اجتہاد سے آزاد کر دینا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ کاہلی اور بزدلانہ رویہ ہے ان علماء کا کہ وہ اپنے انداز فکر معاشرے کی ارتقائی منزلوں کے مطابق نہ ڈھال سکے اور اسی پرانے رویے پر اٹکے رہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ پرانے قوانین پر ہی ڈٹے رہنا چاہتے ہیں اور اس فکر کی تبدیلی پر قائم رہنے کو وہ بہتر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کسی بھی امام جن کے نام سے مختلف گروہ فرقے یا فقہے رائج ہوئے ہیں، مثلاً ابو حنیفہ، احمد بن حنبل، مالک اور شافعی وغیرہ ان میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کہا تھا کہ وہ کسی فرقے کے بانی ہیں اور اس کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور یہ کہ ان کا قول تقلید کے لیے حرف آخر ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ انہوں نے تو بس خاص امور پر قرآن اور سنت کی روشنی میں اپنا نقطہ پیش کیا اور نہ ہی جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد امام آئیں گے اور تم ان کے نقطہ نظر کی تقلید کرنا۔ جناب رسالت مآبؐ نے اپنے وصال سے ٹھیک نو روز قبل میدان عرفات میں اپنی امت کو یہ تاکید کی تھی کہ آپؐ امت کے پاس ہدایت کے لیے دو چیزیں چھوڑ کر جا رہے ہیں ان میں سے ایک تو قرآن ہے اور دوسری آپؐ کی سنت، سوائے اس کی پیروی کی تاکید اور حکم آپؐ نے دیا تھا۔

ہر فقہ کے علماء کہتے ہیں، کہ وہ تو جناب رسولؐ اللہ کی ہی تقلید کرتے ہیں۔ چونکہ وہ جناب رسولؐ اللہ کی سنت کی جانچ بذات خود نہیں کر سکتے اور نہ ہی قرآن کی آیات کو سمجھ سکتے ہیں اس لیے وہ اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ کسی امام کی تقلید کریں۔ کیونکہ وہ اس معاملے کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں اور انہوں نے قرآن اور سنت سے استخراج کر کے قوانین بھی مرتب کر لیے ہیں۔

یہ بات اس حالت میں تو بالکل صحیح ہوگی جبکہ کوئی مسلمان کسی ایک عالم کی دانش کو اسلامی قوانین کو سمجھنے کے لیے استعمال کرے اور اگر وہ مناسب ہے تو تقلید بھی کر لے لیکن یہ نہ کہے کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور کی بات سنے گا ہی نہیں۔ اور اگر سن لے گا تو تقلید نہیں کرے گا۔ کوئی بھی

مسلمان سوائے اللہ اور اس کے رسولؐ کے کسی اور کی اتباع کو اپنے اوپر لازم نہیں کر سکتا۔ ایک مسلمان بہر حال اللہ کے رسول کا ہی پیروکار ہے اور اسی کے حکم کا پابند ہے نہ کسی امام کا اور نہ ہی کسی پیر و مرشد کا۔ کیونکہ اس طرح کرنے سے ایک تو وہ مقلد ہونے کے بعد کسی اور اچھی رائے سے مستفید نہیں ہو سکتا اور دوسرا یہ کہ اگر وہ کسی غلط بات کا مقلد ہو گیا ہے تو صحیح بات کی جانب رجوع نہیں کر سکتا اور تیسرا یہ کہ امت اس وجہ سے مختلف گروہوں، جھتوں اور فرقوں میں بٹ گئی ہے۔ اور اس طرح سے ایک دوسرے کی دشمن بھی ہو گئی ہے اور انہوں نے تقلید کی بنا پر دین کے بجائے اپنے اپنے مذاہب پر تقسیم کر لی ہے۔

اس طرح سے تقریباً ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے کہ اجتہاد کے ادارے معطل ہو کر رہ گئے ہیں اور آج اکیسویں صدی میں بھی یہی صورتحال ہے جبکہ انسانی تہذیب و تمدن عروج کی تمام منزلیں طے کر چکا ہے۔ اس صورتحال کی وجہ سے مسلمان معاشرے تنزلی کے دامن میں آگرے ہیں ان میں سیاسی، سماجی، معاشی، سائنسی فقدان، غربت، افلاس اور بیماری، اخلاقی کمزوریاں، بدکرداریاں، غرض کہ ہر قسم کی بدحالی و پریشانی ان میں ڈیرے ڈال چکی ہے۔ بلکہ یہ بڑی ذلت آمیز حقیقت ہے کہ پچاس سے زیادہ اسلامی مملکتوں میں سے ایک بھی اول درجے کی مملکت نہ بن سکی۔ تقلید کے بارے میں شیخ الاسلام عز الدین نے کہا ہے کہ "یہ بہت تعجب کی بات ہے کہ چند علماء اپنے رویے میں اتنے زیادہ سخت ہوتے ہیں کہ وہ اپنے فقہ کے مقابلے میں اچھی رائے کو بھی رد کر دیتے ہیں"۔

اسی طرح سے مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے اماموں کو معصومیت کے درجے پر رکھتا ہے حالانکہ پیغمبر کے علاوہ یہ درجہ کوئی بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ پیغمبر سے بھی انسان کی حیثیت سے غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن اللہ تعالیٰ نے فوری طور پر اپنے پیغمبروں کی اصلاح فرما دی۔ تقلید کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ کا فرمانا کہ ابن حزم کا کہنا کہ "تقلید حرام ہے" صحیح ہے اس شخص کے لیے جو ایک خاص فقہ کا مقلد ہو اور اس کا عقیدہ یہ ہو کہ اس کے امام کا قول بالکل صحیح ہے اور وہ اس سے انحراف نہیں کرے گا اگر چہ وہ غلط ہی کیوں نہ ثابت ہو جائے یا یہ کہ اس سے زیادہ بہتر منطق کے ساتھ وہی مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ ابن حزم نے اپنے دعوے کی حمایت میں جناب رسولؐ اللہ کا ایک قول پیش کیا ہے، جسے امام احمدؒ نے عدی بن حاتم کی روایت سے نقل

کیا ہے جو کہ "عدی بن حاتم جاہلیت کے زمانہ میں عیسائی ہو گیا تھا اور شام چلا گیا تھا، جب اس کے علاقے میں اسلام کا پیغام پہنچا، جبکہ اس کے رشتہ دار اور بہن گرفتار ہو کر جناب رسولؐ اللہ کے سامنے لائے گئے تھے تو اس وقت جناب رسولؐ اللہ کو بتایا گیا کہ وہ خاتون ایک مشہور سخی حاتم کی بیٹی ہے تو آپؐ نے خاتون کو نہ صرف رہا کیا بلکہ انہیں تحائف بھی دیے اور ان کے والد کی سخاوت کی وجہ سے ان کی عزت افزائی فرمائی۔ رہائی کے بعد خاتون نے اپنے بھائی عدی کو اس شفقت کے متعلق آگاہ کیا، جس کا برتاؤ جناب رسولؐ اللہ نے ان کے ساتھ کیا تھا اور ساتھ ہی اسلام بھی پیش کیا، اس پر عدی جناب رسولؐ اللہ کے پاس مدینہ گیا جب آپؐ نے اسے دیکھا تو عدی نے اپنے گلے میں کراس پہنی ہوئی تھی (یعنی صلیب)۔ جسے دیکھ کر جناب رسولؐ اللہ نے سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۳۱) کی تلاوت فرمائی۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا رکھا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی۔ حالانکہ انہیں صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ فقط ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔ جس کے علاوہ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں اور وہ ان کے شرک سے پاک ہے"۔

اس پر عدی نے جواب دیا کہ "وہ ان کی پوجا نہیں کرتے"۔

جناب رسولؐ اللہ نے فرمایا "ہاں! کرتے ہیں۔ انہوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا اور وہ ان کی پیروی کرتے ہیں اور اس طرح سے وہ ان کی اتباع کر کے ان کی پرستش کرتے ہیں"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس بارے میں فرمایا کہ "یہ ہر حال میں ضروری ہے کہ ظاہری طور پر اور خفیہ بھی ہر مسلمان انسان اور جن کے لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم مانیں اور اس کے رسولؐ کا اپنی زندگی کے ہر شعبے کے ہر معاملے میں اور انہوں نے جس چیز کو حلال کیا اسے حلال ہی رہنے دیں اور جس چیز کو حرام کیا حرام رہنے دیں۔ اس معاملے میں غیر اللہ اور غیر رسولؐ، کسی کی بھی تقلید جائز نہیں ہے۔ لیکن اسلامی قوانین کی باریکیاں سمجھنے کے لیے کسی بھی با اعتبار شخص یا عالم کو رجوع کرنا اور اس کی اتباع کرنا صحیح ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے پاس وافر علم ہے اور یہ کہ ان کی عقل استخراج کرنے کے معاملے میں زیادہ بہتر ہے اور اسلامی قوانین یعنی قرآن اور سنت کو سمجھنے کے لیے زیادہ سازگار ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ایک فرد عام طور پر اپنے والدین

کے خیالات کا زیادہ مطیع ہو جاتا ہے اور اسی کو اپناتا ہے اور اس طرح سے وہ اپنے والدین اور اپنے گردوپیش کا مذہب ہی اختیار کرتا ہے۔ لیکن ایک باشعور انسان کی حیثیت سے جب کسی کو استخراج کا ملکہ حاصل ہو جائے اور وہ اچھائی اور برائی میں تفریق کرنے کی صلاحیت پیدا کر لے اور اسے زندگی کا مقصد اور اقدار کا علم ہو جائے تو پھر اسے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی کامل تابعداری کرنی چاہیے۔ خاص طور پر ان افراد کو جو یہ دعویٰ بھی کریں، کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتے ہیں اور یہ کہ ان کے احکامات کی پیروی بھی کرتے ہیں۔

اس موضوع کو سمیٹنے کے لیے اور مزید واضح کرنے کے لیے درج ذیل مثال پیش کی جاتی ہے:

یہ دیکھا گیا ہے کہ آج اکیسویں صدی عیسوی میں علمائے اسلام جن کا سائنس اور مابعد الطبیعاتی علوم سے کوئی سروکار نہیں ہے اور نہ ہی ان کی معاشی اور معاشرتی علوم سے واقفیت ہے وہ وقت اور جگہ کے تعین اور نظام کائنات اور اس کائنات کے ایک چھوٹے سے نظام شمسی کے بارے میں علم نہیں رکھتے یعنی سورج کے گرد زمین کی گردش اور زمین کے گرد چاند کی گردش اور ان ہر ایک کا اپنے اپنے محور پر بھی گردش کرنا ابھی تک ان کی عقل کی زد میں نہیں آیا۔ حالانکہ حضرت انسان نے اپنی محنت اور کوشش سے عرصہ دراز سے یہ حساب لگا رکھا ہے کہ زمین کی گردش اپنے محور پر اور اس کی گردش سورج کے گرد اسی طرح چاند کی گردش اس کے محور پر اور پھر زمین کے گرد کس طرح سے ہوتی ہے اور جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ یٰس (۳۶) کی آیات (۳۷-۴۰) میں فرمایا ہے کہ:

اور ایک نشانی ان لوگوں کے لیے رات ہے کہ ہم اس پر سے دن کو اتار لیتے ہیں۔ سو یکایک لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور آفتاب جو اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔ یہ اندازہ مقرر کیا گیا ہے اس کا جو زبردست علم والا ہے۔ اور چاند کے لیے مقرر ہیں منزلیں یہاں تک کہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی، نہ آفتاب کی مجال کہ چاند کو پکڑ لے، اور نہ ہی رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ اور دونوں ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔

"اب جبکہ سورج زمین اور چاند کی گردشوں کے اوقات کا پورا حساب کر لیا گیا ہے اور اس کے کیلنڈری عرصہ دراز سے اہل علم کے پاس موجود ہیں لیکن ہر سال خاص موقعوں پر پوری دنیا کے مسلمان اس مصیبت کے عالم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ چاند نظر آیا کہ نہیں اور نظر آیا تو کب؟

یہ لوگ ابھی اسی جھمیلے میں پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ تمام دنیا کے بحری جہاز، خلائی سفر، چاند اور مریخ کا سفر یہ سب انھی معلومات کی بنا پر پروگرام کیا جاتا ہے، لیکن ابھی تک یہ حضرات اتنا بھی طے نہیں کر سکتے کہ صبح اور شام کے کیا کیا اوقات ہوتے ہیں وہ دن کے حصوں سے بھی مکمل واقفیت نہیں رکھ پائے۔ یعنی صبح، دن، شام اور رات کے روزمرہ کے بدلتے ہوئے اوقات کو بھی ابھی تک سمجھ نہیں پائے۔ اس وجہ سے صبح صادق یعنی فجر کا وقت جب صبح شروع ہوتی ہے اور رات کا وقت یعنی جب شام کا خاتمہ ہوتا ہے اس کا حساب لگانے کے لیے ابھی تک زمانہ قبل از سائنسی علوم کے اندازوں سے لگایا جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر رمضان کے مہینے میں سحری کے اوقات ہر جگہ کے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور اس میں تیس منٹ تک کا فرق ہوتا ہے حالانکہ اس کا صحیح حساب معلوم ہو چکا ہے۔

اسی طرح سے بینک کاری کے نظام، زکوٰۃ کے طریقہ کار ابھی تک نہیں طے پا سکے اور اس کی سب سے بڑی وجہ علم کا نقصان نہیں بلکہ علم کا حاصل نہ کرنا ہے۔ آج کے معاملات ہزار سال پرانے مفروضوں پر طے کیے جاتے ہیں جبکہ اس وقت تک زمین کا نقشہ بھی نہیں بنایا جا سکا تھا۔ بینکاری کا نظام نہیں تھا، کرنسی کا طریقہ کار کچھ اور تھا دنیا ایک دوسرے کے لیے بہت دور تھی۔ آج دنیا ایک ہی ہو گئی ہے فاصلوں کی دوری مٹ گئی ہے اور ایک خبر آناً فاناً دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ وہیں اٹکے ہوئے ہیں اور یہ صرف اس لیے کہ اجتہاد کے دروازے بند ہیں اور علماء نے اس علم کو حاصل ہی نہیں کیا جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خود سکھلایا تھا اور اسے عالم بنانے کے بعد فرشتوں سے بڑا درجہ عطا فرمایا تھا۔ وہی علم ہم نے چھوڑ رکھا ہے، جس کے نتیجے میں عزت اور وقار نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنے لیے علم کے دروازے کھول لیں اور علم و حکمت کو دانش کا ذریعہ بنا لیں۔ قرآن اور سنت بھی ہماری رہبری صرف اسی حالت میں کریں گے جب ہم اپنے آپ میں سوچ اور سمجھ، ادراک اور استخراج کی قوتوں کو بیدار کریں گے، ابھی وقت ہے آیئے کوشش کریں۔

(۲۰۴) جہالت ایمان کی روشنی کو تاریکی میں بدل دیتی ہے

علم سے لاعلمی جہالت ہے اور جہالت ایمان کی روشنی کو تاریکی میں بدل دیتی ہے اس لیے

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق اعلیٰ کو حکم دیتا ہے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو جاننے کی کوشش کرے۔ یعنی کہ تخلیق آدم میں اللہ کے مقصد کا ادراک حاصل کرے اور پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے اسے سب سے پہلے اپنی ذات کو نور کی روشنی سے منور کرنا ہوگا اور اس نور کو حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے ایمان کو صحیح راہ پر لانا ہوگا اور وہ راہ اسے الہامی علم ہی کے ذریعہ سے مل سکتی ہے۔

انسان کو ایمان اور الہام کی روشنیوں سے دور رکھنے کے لیے دو بڑی رکاوٹیں ہیں یعنی دو بڑی برائیاں۔ جس سے عام طور پر لوگ لاپرواہ رہتے ہیں اور یہ دو برائیاں جہالت اور تکبر کی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو بنیادی طور پر ہر برائی کی جڑ ایک ہی ہے یعنی جہالت کی برائی اور دوسری تکبر کی برائی جہالت کے نتیجے سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ اسلامی طرز زندگی صرف اسی حالت میں اعلیٰ درجہ حاصل کر سکتی ہے جب ایمان کی حرارت یا کیفیت کو علم اور منطق کی روشنی سے دل میں اتارا جائے یعنی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے اقوال، احکامات، ہدایات اور فکر کو دور حاضر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن بدقسمتی سے انسان نے ابھی تک جہالت اور تکبر کا مطلب ہی نہیں سمجھا اور نہ ہی اس نے اللہ تعالیٰ کے اختیارات Authority اور خصوصیات Attributes کو ہی سمجھا ہے اس لیے وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو جو ایک غلام کے اپنے مالک کے لیے ہوتے ہیں نہیں سمجھ سکا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان اپنے مالک کی اصل حقیقت تو خیر سمجھ ہی نہیں سکتا، لیکن وہ اپنے مالک کی ظاہر حقیقت جو اللہ نے بیان کی ہے اسے بھی نہیں سمجھتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو جس طرح سے بیان فرمایا ہے ہمیں من و عن ویسے ہی اسے جاننا چاہیے اور قرآن کے مطلب میں اختراع کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن شیطانی وسوسوں اور اپنی جہالت کی بنا پر انسان کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی کو اللہ کی ذات سے ملانے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور اس طرح سے شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور توحید کے معنی اور روح کو سمجھنے میں غلطی کر جاتا ہے۔ توحید کے مختصر ترین معنی یہ سمجھ میں آتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ اپنی اکائی میں، اپنی صفات میں، اپنے حکم کے اجراء میں اور اپنے اختیار میں اور اپنے حکم میں کسی بھی دوسرے عنصر کو شریک نہیں کرتا اور وہ یہ چاہتا بھی ہے کہ اس کی مخلوق اعلیٰ اس کی اکائی کو سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر اللہ کو اپنا مالک کل جانے اور اس کے سامنے اپنی ذات کو ایک وفادار اور تابعدار غلام کی

حیثیت سے پیش کرے بلکہ اپنی ذات کو اس کی ذات کے لیے نچھاور کرے۔ صرف اسی حالت میں وہ اپنی بندگی کا اظہار کر سکتا ہے اور اس کی قربت اور محبت حاصل کر سکتا ہے۔ جب اسے ایسی حالت نصیب ہو جائے گی تو اس وقت نہ اس میں جہالت رہے گی نہ تکبر بلکہ اس کی ذات میں بندگی ہی بندگی نظر آئے گی۔

یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ شرک کی وجہ صرف جہالت ہے۔ یہ جہالت کسی بھی انسان میں کارفرما ہو سکتی ہے۔ ایسے مسلمان جو مسلمان ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن ایمان ہنوز ان کے دلوں میں سرایت نہیں کرتا اور وہ خالق اور مخلوق کے رشتے کو سمجھنے کا شعور نہیں رکھتے تو پھر شرک کی لعنت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ صرف اللہ کو خدا یا معبود ماننا کافی نہیں، یہ کام تو تمام مشرکین بھی کرتے ہیں یعنی کبھی اللہ کے نائب بنا دیتے ہیں، کبھی اس کی اولاد بنا دیتے ہیں اور پھر مدد حاصل کرنے کے لیے دوسروں کو پکارتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی سفارش اللہ سے کر دیں گے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عقیدے کی صریحاً تردید کر دی ہے، مثلاً سورۃ انعام (۶) آیت (۶۳-۶۵) میں فرمایا گیا کہ:

"کہو (اے محمدؐ) کون ہے جو تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے نجات دیتا ہے جب تم اسے پکارتے ہو عاجزی کے ساتھ، چپکے چپکے (اور کہتے ہو اللہ سے) کہ اگر وہ ان کو اس خطرے اور مصیبت سے بچا لے تو پھر وہ ضرور اس کے مشکور اور تابعدار ہو جائیں گے۔ آپ کہہ دیں کہ اللہ ہی تمہیں اس سے نجات دیتا ہے اور ہر مصیبت سے بھی۔ لیکن اس کے بعد تم پھر شرک کرنے لگتے ہو۔ کہو (اے محمدؐ) کہ وہی قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب بھیجے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا پھر تمہیں فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے سے لڑا دے (یعنی پھر تم ایک دوسرے کو قتل کرنے لگو) دیکھو کہ ہم مختلف طریقوں سے اپنی آیات بیان کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ سمجھ جائیں"۔

یہ آیات کوئی معمولی آیات نہیں ہیں یہ فرمان رب ذوالجلال ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کو تنبیہ یعنی وارننگ ہے، کہ اس کے بندے اللہ کی کامل وفاداری اور بندگی کی طرف آ جائیں، ورنہ جو کچھ ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان آیات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب رسالت مآبؐ ان کی تلاوت فرما رہے تھے تو آپؐ نے دو

مرتبہ اپنے مالک کے حضور عرض کیا "میں پناہ مانگتا ہوں آپ (اللہ) کے چہرہ مبارک کی"۔ (یا اللہ ہمیں اپنی کامل بندگی عطا فرما)۔

امام احمدؒ نے خبیب بن آراتؓ کے حوالے سے لکھا ہے جو بدر کے صحابی تھے، کہ "میں اللہ کے نبی سے ملا ایک شب جس میں آپؐ کے ساتھ صبح تک صلوٰۃ ادا کی۔ جب رسالت مآبؐ صلوٰۃ سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا 'اے اللہ کے نبیؐ! اس رات آپ نے ایسی صلوٰۃ ادا کی ہے کہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا"۔

اللہ کے نبیؐ نے فرمایا "ہاں یہ صلوٰۃ تھی شوق تمنا، اور خوف کی حالت میں۔ اس صلوٰۃ کے دوران میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کی درخواست کی اور اس نے مجھے دو عنایت کیں اور تیسری کے لیے انکار کر دیا۔ میں نے عرض کیا اپنے رب سے کہ ہمیں اس طرح تباہ و برباد نہ کرے جیسے اس نے گزشتہ قوموں کو کیا ہے اور اس نے قبول فرمایا۔ میں نے عرض کیا اپنے رب کو کہ ہمارے دشمنوں کو ہمارے اوپر غالب نہ فرمائے تو اللہ نے اسے قبول فرمایا۔ میں نے عرض کیا اپنے رب سے، کہ ہمیں پشیمانی، گھبراہٹ اور آپس کی تقسیم میں نہ ڈالے لیکن اس بات کے لیے میرے مالک نے انکار کر دیا"۔

قرآن اور جناب رسالت مآبؐ کے قول سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ ہر اس قوم کو چاہے وہ مسلمان کہلائے یا نہ کہلائے جب وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی حکم عدولی کریں گے اور اس میں حد سے گزر جائیں گے تو پھر انہیں اس سزا سے دوچار ہونا پڑے گا، یعنی وہ آپس میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے سے لڑائی کریں گے اور اس طرح سے ایک دوسرے کا قتال کریں گے۔ یہ معاملات تاریخ آپ کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ اگر یہاں کچھ پرانے وقتوں کے قتال کا ذکر کر دیا تو قارئین کہا کو ناگوار گزرے گا۔ لیکن آج کے دور کی صرف دو مثالیں دینا ضروری سمجھا گیا ہے اور وہ یہ کہ، اس بات پر کیا آپ نے غور کیا کہ ایک مسلمان ملک میں اٹھارہ لاکھ سے زائد مسلمانوں کو مسلمانوں نے ہی قتل کیا اور اسی ملک کے پڑوس میں دو مسلمان ریاستوں نے آپس میں لڑ کر بارہ لاکھ مسلمانوں کا مسلمانوں نے ہی قتل کیا۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ یہ کیوں ہوا؟

اللہ تعالیٰ نے مزید تکبر کے بارے میں سورۃ اعراف (۷) کی آیت (۱۴۶) میں فرمایا:

"میں ان کو اپنی آیات سے دور ہی رکھوں گا، جو زمین پر تکبر کرتے پھر رہے ہیں جس کا انھیں کوئی حق نہیں۔ اگر وہ اللہ کی تمام نشانیوں کو دیکھ بھی لیں تب بھی وہ ان پر ایمان نہ لائیں گے اور اگر وہ راہ ہدایت دیکھ لیں تو اسے اپنا طریقہ نہ بنائیں گے اور یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا اور ان سے بے پرواہ ہو گئے"۔

اس کے علاوہ مزید سورۃ الصف (۶۱) آیت (۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"جب موسیٰ نے اپنی قوم کو فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ کو کیوں ایذا پہنچاتے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں اللہ کا رسول بنا کر۔ پھر جب وہ اس واضح تنبیہ کے باوجود، وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ نے ان کے دلوں کو اور ٹیڑھا کر دیا اور اللہ تعالیٰ ایسے نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سمجھانے کی غرض سے اپنے پیغمبروں کی کہانیاں اپنی کتاب میں مذکور فرمائیں یعنی آدمؑ اور ابلیس کی کہانی، جناب نوحؑ کی قوم کی کہانی، جناب ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، شعیبؑ کی اقوام کی نافرمانیاں اور فرعون اور نمرود کی نافرمانیاں ان سب نے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اللہ کے انبیاء کے احکامات سے منہ موڑا، انبیاء کا تکبر سے مذاق اڑایا، انھیں تکلیفیں پہنچائیں اور اپنے گھمنڈ میں رہ کر اللہ کے حکم سے منہ موڑ لیا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو ان پر عذاب نازل کر کے انھیں سزا دینی پڑی۔

ان کہانیوں کے ذکر کا مقصد آلِ محمدؐ کو یہ جتانا مقصود تھا، کہ دیکھو تکبر اور نافرمانی کی سزا بہت شدید ہوتی ہے۔ تم گزشتہ نافرمان اقوام سے عبرت حاصل کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی پیروی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کو وہی سلوک کرنا پڑے جو گزشتہ نافرمان اقوام سے کیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ عاجزی پسند فرماتا ہے اور عاجزی کو عزت بخشتا ہے اور متکبر کو ذلت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ ہمیں ہر قسم کی جہالت اور تکبر سے بچائے رکھے (آمین)

(۲۰۵) انسان کا انسان کو غلام بنانا

غلامی کا ادارہ انسان کا سب سے زیادہ غیر انسانی رویے کا مظہر اور انسانیت سوز کام ہے۔ غلامی انسانی تمدن کی سب سے پرانی بیماری ہے۔ حتیٰ کہ اس فعل بد کا ذکر کتب الہامی میں بھی ملتا

ہے۔ اس فعل کا وجود دنیا کی تمام ترقی یافتہ تہذیبوں اور تمدنوں میں پایا جاتا تھا، مثلاً مصر، روم، یونان، چین اور ہندوستان وغیرہ۔ فراعین مصر نے قوم یہود کو کلی طور پر اپنا غلام بنا رکھا تھا اور انہوں نے انہی سے عجائبات اہرام بنوائے تھے۔ جناب اسمٰعیلؑ کی والدہ سیدہ ہاجرہ جو جناب ابراہیمؑ کی زوجہ تھیں وہ قبل ازیں جناب ابراہیمؑ کی زوجہ اول سیدہ سارہ کی کنیز تھیں۔ جناب یوسفؑ جو جناب یعقوبؑ کے فرزند تھے، انھیں غلام بنا کر مصر کے بازار میں فروخت کیا گیا۔

یونان میں صرف دو ہی طبقے تھے، ایک حکمران طبقہ اور دوسرا کام کرنے والا طبقہ اور سلطنت روم میں غلامی بہت بڑی لعنت تھی۔ حکمران طبقہ غلاموں کی لڑائیوں سے اس وقت تک لطف اندوز ہوتا رہتا جب تک دو میں سے ایک اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھتا۔ وہ غلاموں کو ایک پنجرے میں شیر کے ساتھ بند کر دیتے اور پھر ان کی بے کسی اور بے بسی اور ان کی چیخ و پکار میں زندگی بچانے کی ناکام کوششوں سے لطف اندوز ہوتے اور ان کی اس بے بسی کے عالم میں موت ان امراء کے لیے باعث مسرت ہوتی۔

اہل روم اپنی ازواج کو اپنی ملکیت سمجھتے اور جب چاہتے فروخت کر دیتے، ایک شوہر اپنی بیوی کو قتل کرنے کا حق محفوظ رکھتا اور عورت ضرورت کا سامان سمجھ کر اپنے پاس رکھی جاتی۔ یورپ میں عیسائی راہبوں میں کچھ عرصہ عورت کی حیثیت پر بحث و مباحثہ بھی جاری رہا کہ کیا خواتین انسانوں کی صف میں بھی آتی ہیں کہ نہیں؟

ہندوستانی معاشرے میں طاقتور طبقے نے اپنے معاشرے کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ سب سے کمتر جماعت شودر کہلاتی تھی یعنی خدمت گار جو دوسری تین جماعتوں کی خدمت میں ہی اپنا وقت گزارتے تھے۔ ان لوگوں کو وہ کمین یا کمینے کہا کرتے تھے، یعنی کام کرنے والے نچلے درجے کے لوگ۔ یہ لوگ دوسرے طبقوں کی رہائش گاہوں اور شہروں کی سڑکوں کی صفائی کرتے، انسانوں کی غلاظت اور گندگی اور نجاست اٹھاتے۔ ان کی اپنی زندگی جانوروں سے بدتر ہوتی، گویا وہ اپنے لیے تو زندگی گزارتے ہی نہ تھے۔ بلکہ ذلت اور مجبوری کے ساتھ وہ دوسروں کے لیے زندہ رہتے اور اپنی اولاد کو بھی دوسروں کے لیے ہی وقف رہنے دیتے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ طبقہ آج بھی موجود ہے۔

جہاں تک ہندوستانی عورتوں کا تعلق ہے، وہ تو تا حال یعنی اکیسویں صدی میں بھی حق وراثت

سے محروم ہیں ان کی بدبختی کی بدترین مثال یہ ہے کہ ایک ہندو بیوہ کو اپنے مردہ شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور اسے مرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ ہوتا۔ پھر ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے قانون کے ذریعہ اس ظلم کو بند کیا، انیسویں صدی عیسوی میں۔

یہ تھیں مختصر ترین کارفرمائیاں دورِ غلامی کی۔ اب ہم غلامی کے مختلف پہلوؤں پر بھی مختصراً غور کریں گے اور اس کا جائزہ لیں گے:

(الف) غلامی کیسے وجود میں آئی:

غلامی کا رواج تمام دنیا کی اقوام نے اپنایا ہوا تھا، غلام بنانے کے طریقے مختصر طور پر درج ذیل کیے جا رہے ہیں۔

i) معاشرے کو طاقتور گروہ نے مختلف جماعتوں میں منقسم کیا اور پھر سب سے نچلی جماعت کو اس درجہ نیچے گرا دیا، کہ اسے مجبور ہونا پڑا کہ وہ دوسری جماعتوں کی خدمات سرانجام دیں، یعنی وہ خدمات جنہیں حقارت اور غلاظت کی وجہ سے کوئی نہیں کرنا پسند کرتا تھا۔ اور جو کوئی بھی اس جماعت میں آ جاتا وہ اس سے باہر آنے کا راستہ نہ پاتا اور ان کی اولاد کو بھی انہی کی زندگی کو اپنانا پڑتا۔ خدمت کرنے کے اعتبار سے اور معیارِ زندگی کے اعتبار سے اور اختیار و عزت کے اعتبار سے وہ غلام ہوتے۔

ii) جنگی قیدیوں کو فاتح قومیں اپنا غلام بنا کر آپس میں تقسیم کر لیتیں۔

iii) غربت اور ناداری سے تنگ آ کر کچھ لوگ اپنی اولاد کو فروخت کر دیتے تھے اور وہ غلام بن جاتے، یہ معاملہ تو آج بھی اکیسویں صدی عیسوی میں ہو رہا ہے جنوبی ایشیا میں۔ اور افریقی ممالک میں تو باقاعدہ انسانوں کی تجارت نصف صدی قبل تک ہوتی رہی۔

iv) تنہا یا کمزور لوگوں کو پکڑ کر بے بس کر دینا اور پھر انہیں فروخت کر دینا بھی ایک رواج تھا۔ تاریخ میں اس کی سب سے بڑی مثال جناب یوسفؑ کی ہے پھر جناب سلمان فارسیؓ، جناب صہیب رومیؓ، زید بن حارثہؓ وغیرہ بہت مشہور مثالیں ہیں، یہ حضرات معززین سے تعلق رکھتے تھے، انہیں اغوا کیا گیا اور فروخت کر کے غلام بنا دیا گیا۔

v) اہل یورپ نے جب غیر مہذب اقوام پر اپنی حکومتیں قائم کر لیں تو کچھ لوگوں کو تو اپنی فوج میں بھرتی کرنے کے بعد ان سے اپنے مفاد کے لیے لڑائی لڑوائی اور وہ اپنی جان کا

نذرانہ پیش کرتے رہے۔ اس کے علاوہ افریقہ کے پسماندہ اور غیر مہذب لوگوں کو پکڑ پکڑ کر فروخت کرنا شروع کر دیا اور مہذب دنیا میں غلاموں کی منڈیاں اور بازار لگنے لگے جہاں انسان خریدے اور بیچے جاتے تھے۔ بیسویں صدی عیسوی تک امریکہ جیسے مہذب معاشرے میں غلامی کی لعنت موجود تھی اور اس کی تجارت کھلے عام ہوتی اور یہی حال آسٹریلیا میں بھی تھا۔ پھر امریکن معاشرے کا مہذب پن اور تعلیم تھی، کہ غلاموں کو بھی شعور آیا اور ان میں سے چند لوگوں نے غلامی کے خلاف نعرہ لگایا اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ اس کا سہرا سابق امریکی صدر ابراہم لنکن کو بھی جاتا ہے کہ اس نے غلاموں کی آزادی کے سلسلے میں بہت بڑا کردار ادا کیا، جس کا نتیجہ آج یہ برآمد ہوا کہ غلاموں نے آقاؤں کی جگہ سنبھال لی اور آقاؤں کی نسل غلاموں کی جگہ لیتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یورپ کی تحریک اصلاح نو اور نشاۃ ثانیہ کے بعد بھی تین صد سال تک پالتو جانوروں کی قدر و قیمت، خوراک اور رہائش غلاموں سے بدرجہا بہتر تھی۔ جانوروں کے لیے باقاعدہ ایک سرکاری محکمہ تھا بلکہ ہے جس کی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ وہ دیکھیں کہ کسی جانور پر کوئی ظلم تو نہیں ہو رہا۔ اور ایسے ہی گھٹیا یورپی کالونیوں میں بھی انصاف نظر آتے۔ لیکن ایسا کوئی محکمہ نہ تھا جو غلاموں کی دیکھ بھال کر سکتا، غلاموں سے نفرت کی جاتی تھی ان سے حقارت کے ذریعہ کام لیا جاتا۔ انہیں گالیاں دی جاتیں ان کے کھانے، رہنے اور پینے کا خاطر خواہ بندوبست نہ ہوتا اور نہ ہی ان کے علاج معالجے کا خاطر خواہ بندوبست ہوتا۔ آج اکیسویں صدی میں بھی انسانوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ علاج کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی کھانے کا بندوبست۔ افریقہ اور ایشیا میں تو ایسے بے شمار افراد ملیں گے، لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ امریکہ جیسے ملک میں جو کھربوں ڈالر خرچ کر کے جنگ کی آگ پھیلاتا ہے، اس ملک میں بھی بے شمار ایسے افراد ہیں جن کا کوئی گھر نہیں، جن کا علاج کرنے والا کوئی نہیں، جنہیں یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ کھانا کہاں سے کھائیں گے۔ جبکہ یہاں پر جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے ایک بہت بڑا منظم ادارہ موجود ہے جو ہمہ وقت بے گھر، بیمار اور لاوارث جانوروں کی تلاش میں لگا رہتا ہے اور انہیں تلاش کر کے جانوروں کی پناہ گاہوں میں لے جاتا ہے۔ جہاں

ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ وہاں لاوارث انسانوں کے لیے ابھی تک کوئی پناہ گاہ موجود نہیں ہے۔

(ب) ساتویں صدی عیسوی میں عرب میں غلامی:

دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح خطہ عرب میں بھی اسی طرح سے غلامی کا دور دورہ تھا۔ اہل عرب چونکہ زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قبائل میں بٹے ہوئے تھے، اور صحرا کے مختلف چھوٹے چھوٹے نخلستانوں میں ڈیرے جمائے ہوئے تھے یا جہاں پر بھی انہیں پانی کا کوئی ذریعہ مل جاتا تو وہاں آباد ہو جاتے۔ چنانچہ وہ زیادہ تر دشوار گزار علاقوں میں رہائش پذیر ہوتے اور انہیں جہاں بھی موقع ملتا وہ کاروانوں پر حملہ کر کے انہیں لوٹ لیتے اور بے سروسامان لوگوں کو جنہیں وہ سمجھتے کہ ان کا کوئی حامی اور مددگار ان تک رسائی حاصل نہ کر سکے گا تو وہ اس شخص کو غلام بنا کر یا تو بیچ دیتے یا اسے اپنی غلامی کے لیے استعمال کرتے۔ وہاں پر ایک غلام کی قیمت اس کی عمر اور طاقت کے مطابق لگائی جاتی جو چار صد سے لے کر آٹھ صد درہم تک ہوتی۔ جبکہ ایک اچھے اونٹ کی قیمت چار صد درہم ہوتی، یوں ایک جانور اور ایک انسان کی قیمت میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ غلاموں سے ہر طرح کا کام لیا جاتا حتیٰ کہ وہ ان کی مدد کی خاطر دشمن سے لڑائی بھی کرتے تھے۔ بدقسمتی سے کچھ لوگ غلام لڑکیوں سے بدکاری کا پیشہ بھی اختیار کراتے اور ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے۔ غلام وراثت میں مال کی طرح سے تقسیم ہوتے، مالک اگر ان سے ناراض ہوتا تو حسب ناراضی اسے قتل بھی کر دیتا۔ غرض کہ غلاموں کو اپنی زندگی پر بھی کوئی حق نہ تھا۔ حتیٰ کہ ان کی موت مالکوں کے محظوظ ہونے کا ذریعہ بھی تھی۔ ابو جہل نے جناب رسالت مآبؐ کی دشمنی میں اپنی کنیز جو مسلمان ہو گئی تھی اسے اس بات کی سزا میں کعبہ کے سامنے اس دردناک و شرمناک طریقے سے شہید کیا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان محترمہ کا اسم گرامی سیدہ سمیہ تھا۔ غلاموں کو جانوروں کی طرح رکھا جاتا۔ حالانکہ جانوروں کو داغنا بھی جائز معلوم نہیں ہوتا۔ آج کی مہذب اقوام جنہوں نے جانوروں کے حقوق کی حفاظت کے لیے محکمے تو قائم کیے ہوئے ہیں، ان کے ہاں بھی جانوروں کو داغنے کا رواج عام ہے۔ اسی طرح سے غلاموں کے جسم کے حصوں کو کاٹ دیا جاتا ہے جیسے کہ جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے، بہر حال غلام جانوروں کی طرح ملکیت کا ایک حصہ ہوا کرتے تھے۔

(ج) اسلام میں غلامی کا تصور اور غلاموں کے حقوق:

ساتویں صدی عیسوی میں دنیا میں جن حالات کے تحت غلاموں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا اور جس طرح سے ان کا کاروبار ہو رہا تھا، ویسے ہی حالات غلاموں کے سلسلے میں خطہ عرب میں بھی تھے۔ وہاں پر بھی بہت سے مرد اور عورتیں غلامی کی ذلت آمیز زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس لیے اس وقت یہ ممکن نہ تھا کہ یکسر غلامی کا نظام ختم کرنے کا حکم دیا جاتا۔ کیونکہ صرف خطہ عرب میں غلامی ختم کرنے سے دنیا سے غلامی دور ہونے کے کوئی امکانات نہ تھے۔ اور جو غلام موجود تھے ان کی ذمہ داری لینے کے لیے فوری طور پر ایسے ذرائع بھی موجود نہ تھے۔ چنانچہ اسلام نے ایسے قوانین کا اجرا کر دیا کہ جس کے ذریعے مزید غلام بنانے ناممکن ہو گئے اور موجودہ غلاموں کی رہائی باعث اجر و ثواب قرار دے دی گئی۔ مزید یہ کہ ان کے حقوق مقرر کرنے سے غلام کا رکھنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ اس لیے مسلمان معاشروں سے غلامی بہت جلد ناپید ہو گئی۔ لیکن غیر مسلمان معاشروں میں چونکہ غلاموں کے لیے کوئی حقوق نہیں رکھے گئے تھے، اس لیے وہاں بیسویں صدی تک غلامی کا دور دورہ رہا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں کے حقوق اور مالکوں پر غلاموں کی ذمہ داری جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دیا، اس کا مختصراً جائزہ لیا جائے:

i) سورۃ النساء (۴) کی آیت (۳۶) میں حکم دیا گیا ہے کہ:

۱) اللہ واحد کی عبادت کرو بغیر کسی شرک کے۔

۲) اپنے والدین کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرو اور اپنے قرابت داروں سے اور یتیموں سے اور غریبوں سے اور نزدیک و دور والے پڑوسیوں سے اور اپنے ساتھیوں سے اور مسافروں سے۔

۳) اور اپنے ملازموں سے اور غلاموں سے۔

یعنی کہ اپنے ملازموں اور غلاموں سے بھی ویسا ہی سلوک اور برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جیسا کہ معاشرے کے دیگر لوگوں سے اور گھر والوں سے۔

ii) جناب رسالت مآبؐ نے بھی غلاموں کے بارے میں فرمایا کہ:

”وہ تمہارے بھائی اور ملازم ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے ماتحت کر رکھا ہے تو پھر جو کوئی

بھی اپنے بھائی کا مالک بن جائے اس پر لازم ہے، کہ وہ اسے وہی کھلائے جو وہ خود کھاتا ہے اور اس کو وہی کپڑے پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے اور وہ اس کی طاقت سے زیادہ اس سے کام نہ لے اور اس کی خاطر خود مدد کرے''۔

iii) جناب رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ:

''جو کوئی بھی اپنے غلام کو طمانچہ مارے یا اسے کسی اور طرح سے مارے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس غلام کو آزاد کرے۔ یعنی یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہے، ورنہ اللہ کے ہاں وہ سزا کا مستحق رہے گا''۔ (مسلم)

iv) نسائی نے جناب رسولؐ اللہ کی ایک مستند حدیث لکھی ہے جو آپؐ نے اپنی وفات کے قریب علالت کے دوران فرمائی تھی اس میں آپؐ نے اپنی امت کو نصیحت فرمائی اور آپؐ کے آخری الفاظ تھے کہ ''اپنی صلوٰۃ کی حفاظت کرو، اپنی صلوٰۃ کی حفاظت کرو اور ان غلاموں کو جو تمہارے قبضے میں ہوں''۔ اور پھر آپؐ کی زبان مبارک خاموش ہو گئی۔

v) سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''یہ غلام تمہارے دوست ہیں اور بھائی ہیں مذہب میں''۔

یہ حکم اس وقت صادر ہوا جب اللہ تعالیٰ نے نے فرمایا تھا، کہ زید رسولؐ اللہ کا بیٹا نہیں بلکہ وہ آپؐ کا دوست اور بھائی ہے۔

جناب رسالت مآبؐ کا اپنے غلام کو اپنا بیٹا قرار دینا اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ وہ تمہارا بیٹا تو نہیں بلکہ دوست اور بھائی ہے۔ اب اس فرمان سے اللہ اور اس کے رسولؐ کا غلاموں کے بارے میں قطعی حکم مل جاتا ہے کہ غلام بالکل اسی طرح کے سلوک اور برتاؤ کے حقدار ٹھہرائے گئے ہیں جیسا کہ دوست اور بھائی۔

(د) غلاموں کے لیے حکم مکاتبت:

i) اللہ تعالیٰ نے سورۃ نور (۲۴) کی آیت (۳۳) میں درج ذیل چار احکامات صادر فرمائے ہیں، جس میں سے تین غلاموں کے بارے میں ہیں:

۱) ایسے لوگ جن کے پاس نکاح کرنے کے ذرائع نہیں، وہ اپنے آپ کو پاک دامن رکھیں، اس وقت تک، جب تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی نہ کر دے۔

۲) تمہارے ایسے غلام جو چاہتے ہیں مکاتبت (یعنی ایک طے شدہ معاوضے کے عوض رہائی)، ان کو یہ حق دو اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ دیانتدار ہیں (یعنی وہ معاشرے میں برائی کے مرتکب نہ ہوں گے)۔

۳) ان کو یعنی غلاموں کو دو، کچھ اس دولت میں سے جو اللہ کی ہے اور اس نے تمہیں عطا کر دی ہے۔

۴) مجبور مت کرو اپنی غلام عورتوں کو حرام کاری کے لیے بالخصوص اگر وہ پاک دامنی اختیار کرنا چاہتی ہیں لیکن اگر کوئی انہیں مجبور کرے گا تو پھر اللہ (ان عورتوں کو) معاف کرنے والا مہربان ہے۔

اس آیات کریمہ میں آقاؤں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ غلاموں کی اس پیشکش کو قبول کریں، کہ وہ انہیں آزادی دیں گے طے شدہ معاوضوں کے عوض، اگر وہ اچھا کردار رکھتے ہیں۔ اچھے کردار سے مراد یہاں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ قابل اعتبار ہوں اور ان کے پاس کوئی ہنر بھی ہو، جس سے وہ اپنے لیے روزگار کما سکیں اور معاشرے پر بوجھ نہ بن جائیں۔ یا معاشرے میں کسی برائی کا سبب نہ بن جائیں۔

اس کے علاوہ ان کے مالکین کو یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی دولت میں سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کر رکھی ہے، اس میں سے کچھ خیرات اور زکوٰۃ کی مد میں سے نکال کر اس غلام کو دیں تاکہ وہ اپنی مکاتبت میں طے شدہ رقم ادا کر سکے۔

ii) ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالے سے لکھا ہے کہ سیرین نے انس بن مالک سے مکاتبت کے لیے کہا لیکن انس نے اس معاملے میں رغبت کا اظہار نہیں کیا۔ جس پر جناب عمر بن خطابؓ نے حکم دیا کہ وہ لازمی طور پر مکاتبت لکھ کر دیں اور آپؓ نے سورۃ نور (۲۴) کی آیت (۳۳) کا حوالہ دیا۔

iii) سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۶۰) میں فرمایا گیا ہے کہ زکوٰۃ و صدقات صرف حق ہے (۱) غریبوں کا (۲) محتاجوں کا (۳) جو لازم ہیں، زکوٰۃ اکٹھا کرنے کے لیے (۴) اور ان غریب غیر مسلمانوں کا جن کی اسلام کے لیے دلجوئی منظور ہو (۵) اور غلاموں کو آزاد کروانے کے لیے (۶) قرضداروں کا (۷) اور اللہ کی راہ میں (۸) ضرورت مند مسافر کا۔

۱۷) ابن کثیر نے جناب رسولؐ اللہ کی ایک حدیث جو روایت کی براء بن عازب نے بیان کی ہے کہ ایک شخص نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کوئی کام بتائیں جو مجھے جنت کے قریب لے جائے اور جہنم سے دور کر دے"۔ آپؐ نے فرمایا "مکاتبت کرو اور گردن آزاد کرو"۔ اس شخص نے کہا "یا رسولؐ اللہ! کیا یہ دونوں ایک ہی نہیں؟" آپؐ نے فرمایا "نہیں! تم مکاتبت کرتے ہو جس میں غلام کو معاوضے کے بعد آزادی ملتی ہے جبکہ تم گردن چھڑاتے ہو اس کی جبکہ تم اس کی مدد کرتے ہو اس کی معاوضے کی ادائیگی میں"۔

(د) غلاموں کی آزادی کا حکم کیوں نہیں دیا گیا؟

غیر مسلم دنیا میں بھی اور مسلمانوں کے آزاد خیال طبقے میں بھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ آخر اسلام نے غلاموں کی آزادی کا حکم کیوں نہیں دیا؟ اس کا بہت ہی آسان جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے الہامی مذاہب جو اسلام سے پہلے گزرے ہیں انہوں نے کیوں یہ کام نہیں کیا؟ جبکہ ان کے علم میں یہ بات تھی کہ پیغمبروں کو بھی بازار میں لا کر بیچا گیا۔ یہ جواب تو صرف جواب دینے کی حد تک تو صحیح کہا جا سکتا ہے، لیکن مناسب معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اس جواب میں جواب کی وجہ نہیں بتائی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام غلامی جناب ابراہیم سے لے کر جناب اسمٰعیل اور اسحاقؑ، یعقوبؑ، سلیمانؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے لے کر بیسویں صدی عیسوی تک رہا۔

لیکن اسلام نے ایسے قوانین و قواعد اس سلسلے میں وضع کر دیے اور لاگو بھی کیے کہ ان کی وجہ سے غلامی کا آئندہ کے لیے معاشرے میں قائم رہنا اور پھر بالکل قطع ہو جانا ممکن ہو گیا۔ یہاں تک کہ اقوام اور تمام مذاہب کے فقراء نے اس نظام سے ناپسندیدگی کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ عوام الناس نے اس کے خلاف احتجاج کر کے معاشرے کو اس کی ناپسندگی کی وجوہات سے آگاہ کیا۔ اور آخر کار معاشرے نے اس نظام کو انسانیت کے خلاف تسلیم کر لیا۔

اسلامی معاشرے میں چونکہ غلاموں کے حقوق اس طرح سے نافذ کیے گئے تھے جن کا پورا کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا، اس لیے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکامات کی پابندی کرتے ہوئے غلاموں کا رکھنا بہت مشکل تھا۔ اس کے علاوہ اسلام نے ایسے حالات بھی پیدا کر دیے تھے، جن کی وجہ سے غلاموں کو آزاد کرنا بہت ہی نیک کام سمجھا گیا اور اسے باعث خوشنودی رب الاعلیٰ سمجھا گیا۔

دنیا کے دستور کے مطابق خطہ عرب میں بھی بہت سے غلام موجود تھے اگر ان تمام کے تمام غلاموں کو یکسر ایک ہی قول کے ذریعہ آزادی دے دی جاتی تو اس سے اچھے نہیں، بلکہ بہت سے برے نتائج برآمد ہوتے۔ مثلاً یہ کہ ان تمام غلاموں کے روزگار کا معاملہ ایک مشکل کام تھا، ان کے رہنے کی جگہ فوری طور پر مہیا کرنا مشکل تھا۔ اگر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہوں پر منتقل ہوتے تو وہاں کے لوگ انہیں اپنے قبضے میں لا کر پھر غلام بنا لیتے۔ بوڑھی عورتیں، مرد، اور بچے کہاں جاتے اور کہاں سے کماتے؟ اس لیے غلاموں کے لیے اس وقت اسی بات میں بہتری تھی کہ وہ اپنے مالکوں کے پاس ہی رہیں، جہاں پر ان کی دیکھ بھال، رہنا سہنا، کھانا پینا وغیرہ مالکوں پر فرض تھا اور جو غلام اس قابل تھے کہ وہ اپنی روزی کما سکیں تو ان کے لیے قانون موجود تھا کہ وہ اپنے مالکوں سے آزادی کا معاہدہ کر لیں، جس سے وہ انکار کرنے کا مجاز نہ رکھتے تھے۔

مثال کے طور پر اُم ایمن جناب رسالت مآبؐ کی خاتون غلام جو آپؐ کے والد کی طرف سے آپؐ کو وراثت میں ملی تھیں اور انہوں نے آپؐ کی دیکھ بھال چھ برس کی عمر سے ہی شروع کر دی تھی، جبکہ آپؐ کی والدہ ماجدہ رحلت فرما گئی تھیں۔ آپؐ نے سیدہ خدیجہؓ سے نکاح کے فوراً بعد ام ایمن کو آزاد کر دیا تھا لیکن آزادی کے بعد وہ معاشرے میں خوش دلی سے رہ نہ پائیں۔ اور پھر واپس جناب رسولؐ اللہ کے پاس آ گئیں اور آپؐ نے انہیں اپنے پاس اپنے گھر کے فرد کی حیثیت سے تا دم حیات رکھا۔ اسی طرح سے سیدہ خدیجہؓ نے جناب رسالت مآبؐ سے نکاح کے فوراً بعد آپؐ کو اپنا ایک غلام زید بن حارث ہبہ کر دیا۔ جناب زید عراق کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، جب ان کے والد کو پتا چلا کہ ان کا بیٹا ایک غلام کی زندگی بسر کر رہا ہے تو وہ جناب رسالت مآبؐ کے پاس آئے اور زید کی رہائی کے لیے معاوضے کی پیشکش کی جس پر آپؐ نے فرمایا "اسے لے جاؤ! اگر یہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے مجھے کسی معاوضے کی ضرورت نہیں"۔ جب زیدؓ کے والد نے بیٹے سے جانے کے لیے کہا تو جناب زیدؓ نے فرمایا کہ "میں جناب محمدؐ جیسے شخص کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا"۔ زیدؓ کے اس جواب پر جناب رسالت مآبؐ زیدؓ اور ان کے والد کو اپنے ساتھ کعبہ لے گئے اور وہاں اس بات کا اعلان فرمایا کہ "آج کے بعد زید ان کا بیٹا ہے"۔ اور آپؐ کا یہ اعلان زیدؓ کی آپؐ سے محبت اور عزت کے سلسلے میں قدر دانی کا اعتراف تھا۔ اس کے بعد سے مکہ کے لوگ جناب زید بن حارثؓ کو زید بن محمدؐ پکارنے لگے۔ اور

بھی نہیں بلکہ جناب رسالت مآبؐ نے زیدؓ کی شادی اپنی پھوپھی زاد سے کرادی۔ زیدؓ اور ان کے بیٹے اسامہ نے اسلامی معاشرت میں بہت اہمیت اور عزت پائی اور تاریخ میں ان دونوں کا نام سنہری حروف سے لکھا گیا۔ یعنی زیدؓ تو معرکہ موتہ اول کے سپہ سالار رہے اور مقام موتہ پر جام شہادت نوش فرمایا، جبکہ ان کے بیٹے اسامہ معرکہ موتہ دوم کے سپہ سالار رہے اور انہوں نے مقام موتہ پر انہی رومی سپاہ کو شکست دی جنہوں نے ان کے والد کو شہید کیا تھا۔

اس کے علاوہ جناب بلال حبشی کی مثال بھی قابل قدر و قابل فخر ہے، جنہوں نے ایمان قبول کرنے کی وجہ سے سختیاں برداشت کیں، انہیں جناب ابوبکرؓ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ بعد میں دوسری صدی ہجری میں انہیں جناب رسالت مآبؐ نے اذان دینے کا منصب عطا کیا تھا اور جناب عمرؓ اپنے زمانہ خلافت میں انہیں سیدنا بلال کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

(و) غلاموں کو آزاد کرنے کی نصیحت:

حالانکہ اسلام نے غلامی کو سراسر ختم نہیں کیا، لیکن ایمان والوں کو یہ ہدایت ضرور دی گئی ہے کہ وہ اپنے غلاموں سے مہربانی سے پیش آئیں اور ان کی آزادی کے لیے ان کی ہر ممکن مدد کریں۔ ان کے ساتھ مہربانی کی مثال تو اس سے قبل پیش کی جا چکی ہے اور ان کے لیے حق مقابت کی بھی تاکید کی گئی ہے لیکن مزید ان کی خوشنودی اور بھلائی کے لیے بہت سے احکامات دیے گئے جو درج ذیل کیے جاتے ہیں:

i) سورۃ البلد (۹۰) آیت (۱۲ تا ۱۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"تمہیں کیسے پتا چلے گا راستہ اس گھاٹی کا (یعنی جنت کا)۔ کسی گردن کا غلامی سے چھڑا دینا۔ بھوک اور افلاس (یعنی قحط) میں لوگوں کو کھلانا۔ کسی رشتہ دار یتیم۔۔۔ یا کسی مسکین کو جو بالکل لاچار ہو"۔

ii) امام احمدؒ نے سعید بن مغیرہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ابوہریرہؓ سے سنا ہے کہتے ہوئے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "جو کوئی بھی ایک باایمان غلام کو آزاد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ آزاد فرمائیں گے اس غلام کے ہر اعضاء کے بدلے، اس شخص کے ہر عضو کو آگ سے"۔

پھر علیؓ بن حسینؓ نے سعیدؓ سے کہا "کیا تم نے سنا ہے ابوہریرہؓ سے؟"

سعیدؓ نے کہا: "ہاں!"۔ علیؓ نے پھر اپنے ایک غلام لڑکے کو بلوایا، جو اس کے غلاموں میں سب سے پھرتیلا تھا، سو جب وہ غلام ان کے سامنے لایا گیا تو اس نے کہا "جاؤ! تم آزاد ہو، اللہ کے چہرہ مبارک کے طفیل"۔ (بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے بھی نقل کیا ہے)

iii) سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۲۲۱)، سورہ نساء (۴) کی آیت (۲۵) اور سورہ نور (۲۴) کی آیت (۳۲) میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ ایمان والے غلاموں سے شادی کی جائے، اس طرح سے انہیں اچھی زندگی کے ساتھ ساتھ آزادی بھی ملتی ہے۔

iv) اس سلسلے میں خلیفہ دوم جناب عمرؓ کا ایک فرمان بھی ہے جس میں فرمایا گیا کہ "اگرچہ ماؤں نے انہیں ایک آزاد انسان کی طرح جنم دیا ہے پھر کس طرح سے لوگوں نے انہیں غلام بنا لیا"۔

(ز) کسی آزاد کو فروخت کرنا گناہ کبیرہ ہے:

اسلام میں کسی کو غلام بنانا یعنی کسی آزاد انسان کو خریدنا اور بیچنا حرام ہے۔ امام بخاریؒ نے ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ میں روز قیامت تین قسم کے لوگوں کے خلاف ہوں گا' ایک وہ جو میرا نام لے کر کوئی وعدہ کرے لیکن اس وعدے کے خلاف کرے، دوسرا وہ جو کسی آزاد شخص کو غلام بنا کر بیچے اور اس کی قیمت کھائے اور تیسرا وہ جو کسی کو ملازم رکھے اور اس سے پورا کام لے اور اسے اس کی اجرت نہ دے"۔

(ح) اسلام میں داشتہ اور کنیز کی حیثیت:

داشتہ کا مطلب ہے کسی عورت اور مرد کا بغیر نکاح کے اکٹھا رہنا، جبکہ کنیز کی حیثیت ایک غلام عورت کی ہوتی ہے۔ داشتائی نظام کا منبع روس اور دوسری تہذیبوں سے ملتا ہے جو ابھی تک یورپ اور امریکہ کے سماج میں پایا جاتا ہے، لیکن اس نظام کا تعلق اسلام سے قطعی طور پر نہیں، بلکہ یہ قطعی حرام ہے یعنی اسلام میں کسی عورت اور مرد کا بغیر نکاح کے ایک ساتھ رہنا حرام ہے۔ ہاں کنیزوں کی جگہ اسلام میں جوں کی توں رہی ہے جیسے غلاموں کی تھی۔ لیکن اسلام میں کنیزوں کے کچھ اصول اور حقوق مقرر کر دیے گئے ہیں، جبکہ داشتائی نظام میں ایک دوسرے کی رضامندی کے ساتھ ہی یہ تعلق بنتا ہے اور اسی طرح ختم ہو جاتا ہے، کسی کا دوسرے فریق پر کوئی دباؤ یا

قانونی حق نہیں ہوتا۔

رومی اور مصری تہذیب میں عورت کو ایک ملکیت کی صورت میں رکھا جاتا تھا اور عورت کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ داشتہ کے بچے اپنے باپ کا نام اپنانے کے قانونی حقدار نہیں ہوتے، اگر باپ پسند کرے تو وہ اپنا نام دے سکتا ہے۔ اس لیے مغربی تہذیب میں بچوں کے نام کے ساتھ ماں کا نام لکھنا ضروری ہوتا ہے جبکہ باپ کا نام لکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ قدیم داشتاؤں میں اور آج کی داشتاؤں میں صرف یہ فرق ہے کہ قدیم داشتائیں وراثت میں تقسیم ہو جاتی تھیں، نہ ان کا کوئی حق ہوتا تھا اور نہ ہی ان کی مرضی۔ حتیٰ کہ ان کا قتل بھی جرم نہ تھا۔ جبکہ آج کی داشتہ اپنی مرضی کی مالک ہے لیکن وہ جس مرد کے ساتھ رہتی ہے، اس پر کوئی حق نہیں جتا سکتی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اسلام میں داشتائی نظام کی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن غلاموں کی طرح ہی غلام عورتیں تھیں جنہیں کنیزیں کہا جاتا تھا جن کے چند حقوق مقرر تھے۔ ایک مالک اپنی کنیز کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم رکھنے کا مجاز تھا، لیکن اس کنیز کے ساتھ نہیں جو اسے اپنے والد کی وراثت سے ملی ہو، اس معاملے میں وہ اس کی ماں کا ہی درجہ رکھتی تھی۔ جیسا کہ جناب رسول اللہؐ جب چھ سال کے تھے اور سفر کے دوران آپؐ کی والدہ ماجدہ انتقال فرما گئیں تو آپؐ کی دیکھ بھال آپؐ کے والد کی چھوڑی ہوئی کنیز ام ایمن نے کی اور وہ انیس سال تک آپؐ کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ پھر جب آپؐ کا نکاح سیدہ خدیجہؓ کے ساتھ ہوا تو اسی وقت آپؐ نے ام ایمن کو آزاد کر دیا۔ لیکن آزادی کے بعد وہ کچھ زیادہ دیر آپؐ سے دور نہ رہ سکیں اور واپس آپؐ کے پاس آ گئیں اور تمام زندگی آپؐ کے گھر آپؐ کے گھر کے فرد کی حیثیت سے رضاعی والدہ کا درجہ پاتے ہوئے آپؐ کے پاس رہیں۔ ام ایمن کے صاحبزادے جناب اسامہ بن زیدؓ جناب رسول اللہؐ کو اپنے بیٹوں کی طرح پیارے تھے۔

جب ایک کنیز اپنے مالک کے بچے کی والدہ بن جاتی تو اسے پھر آزادی کا حق بھی مل جاتا اور وہ وراثت میں تقسیم نہیں کی جا سکتی تھی۔ جناب رسالت مآبؐ کے صاحبزادے ابراہیم جب آپؐ کی کنیز ماریہ قبطیہ سے تولد ہوئے تو آپؐ نے اعلان فرمایا کہ اس نے (یعنی بیٹے نے) تمہیں آزاد کرا دیا۔ اس کے برعکس جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ داشتہ اسلام میں جائز ہی نہیں اور جہاں وہ جائز ہے وہاں ان کا یا ان کی اولاد کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اس لیے کنیزوں کے بارے میں جو الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ داشتائیں ہیں کلی طور پر غلط ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عیسائیوں میں بھی داشتاؤں کا رکھنا ممنوع ہے اور یہ عمل زنا کے مترادف ہے اور یہودیوں میں بھی یہی قانون ہے۔ (دیکھئے دستور بائبل ڈکشنری (۱۸۹۷)

(ط) کنیزوں سے ازدواجی تعلقات کی وجہ:

سورۃ المومنون (۲۳) آیت (۵) اور (۶)، سورۃ معارج (۷۰) آیت (۲۹۔۳۰) میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ مالک اپنی کنیز کے ساتھ ازدواجی تعلقات رکھ سکتا ہے جبکہ کنیزوں کے بچوں کو اپنے والد کا نام بھی ملتا ہے اور وہ قانونی اولاد تصور کی جاتی ہے اور اس کے بعد ماؤں کو بھی چند حقوق مزید مل جاتے ہیں۔ یہ اجازت انسانی جبلت کے مطابق ہے، ورنہ معاشرے میں برائیاں جنم لیتیں اور وہ حقوق جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیے ہیں ان کی قانونی نفی ہو جاتی اور ان کی اولاد کو معاشرہ قبول نہ کرتا اور وہ ناجائز اولاد کہلاتی۔ کنیز کے بچوں کے بارے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ والد کا نام تو پاتے ہیں لیکن وراثت نہیں پاتے، تاہم اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، کہ اگر کنیز باپ کی وراثت میں سے ملی ہے یا کنیز شادی شدہ ہے تو پھر ازدواجی تعلقات قطعی طور پر حرام ہیں۔

(ی) کنیزوں کے حقوق:

کنیزوں کو جو حقوق اللہ تعالیٰ نے دیے ہیں، ان میں سے دو تو بیان کیے جا چکے ہیں دیگر درج ذیل ہیں:

i) غلام عورتیں یعنی کنیزیں جب اپنے مالک کی اولاد کی ماں بن جاتی ہیں تو درج ذیل حقوق پا لیتی ہیں:

(۱) مالک کی وفات کے بعد آزاد ہو جاتی ہیں۔

(۲) ان کو فروخت نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) مالک کی قدرتی محبت اور شفقت حاصل کر لیتی ہیں، اس کے بچے کی ماں بننے کے بعد۔

ii) ایک غلام عورت جو باپ کی وراثت سے ملی ہو وہ ماں جیسی مراعات حاصل کر لیتی ہیں اس لیے اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنا منع ہیں

iii) ایک غلام جنسی تجارت کے لیے استعمال نہیں کی جا سکتی، جیسا کہ جہالت کے زمانہ میں کیا

جاتا تھا۔

(ک) غلاموں سے شادی:

اللہ تعالیٰ کے چند احکامات ہیں جو ایمان والوں کو غلاموں سے رشتہ ازدواج جوڑنے کے لیے ہمت افزائی کرتے ہیں

i) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۲۲۱) میں کہا گیا ہے کہ:

"بے شک ایک ایمان والی غلام عورت بہتر ہے (شادی کے لیے)، ایک (آزاد) غیر ایمان والی سے"۔

ii) سورۃ النساء (۴) آیت (۲۵) میں فرمایا گیا کہ:

"اور جس کے پاس ذرائع نہ ہوں ایک آزاد ایمان والی عورت سے نکاح کرنے کے لیے تو اسے غلام عورت سے نکاح کر لینا چاہیے"۔

iii) سورۃ النور (۲۴) آیت (۳۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور تم میں سے وہ، جو غیر شادی شدہ ہیں، شادی کر لیں اور اپنے پاکدامن مرد اور عورت غلاموں میں سے بھی شادی کریں"۔

(ل) اختتامی نتیجہ:

غلاموں کے لیے اصول اور قواعد جو اسلام نے مقرر کیے ہیں اور غلاموں کو آزاد کرنے کا اجر اور ثواب جو بتلایا گیا ہے اور کسی بھی آزاد کو غلام بنانے کی ممانعت کی وجہ سے اور غلاموں کی مناسب دیکھ بھال کی تاکید اور ان سے شادی کرنے کی تاکید، یہ سب کچھ بنیادی طور پر باعث بنے اس بات کے کہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں غلامی اسلامی معاشرے سے ختم ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں اگر غلامی کے فوری طور پر ختم کرنے کا حکم آ جاتا تو اس کے نتائج بالکل اس کے برعکس نکلتے، غلاموں کی معاشی اور سماجی زندگی میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا، نہ ان کے لیے فوری رہائش کا بندوبست ہو سکتا تھا اور نہ ہی ان کی خوراک کا اور اگر وہ خطہ عرب سے باہر جاتے تو پھر فوری طور پر دوسری اقوام انھیں اپنی گرفت میں لے کر پھر سے غلام بنا لیتیں اور یوں ان کی آزادی بے معنی ہو جاتی۔

جناب رسالت مآبؐ نے بذات خود ان قوانین پر عمل درآمد فرمایا، جو غلاموں سے محبت اور

شفقت اور ان کی آزادی کے متعلق تھے۔ اور پھر امت کو تاکید کی کہ غلاموں سے اچھا سلوک کریں بلکہ غلاموں کی آزادی اللہ تعالیٰ کی قربت اور محبت کا ذریعہ بتلایا گیا۔

(۲۰۲) اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی اقوام نے نظام غلامی کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنے نبیؑ کے احکام کی خلاف ورزی دو ہزار سال تک کرتے رہے اور پھر کہیں نظام غلامی کو غیر قانونی حیثیت دی۔ جب کہ مسلمانوں میں ان کے نبیؐ کے دور میں ہی غلامی کو خیرباد کہہ دیا گیا تھا اور پھر غلاموں اور کنیزوں کی مثالیں صرف شاہی محلات تک ہی محدود رہیں۔ مغربی اقوام نے تو غلاموں کی عام تجارت کا رواج ڈالا۔ ایک دکان افریقہ میں غلام خریدنے کے لیے تو دوسری دکان یورپ اور امریکہ کے ممالک میں غلام فروخت کرنے کے لیے قائم کی۔ ایک زمانہ میں تو انہوں نے افریقہ اور ایشیاء، امریکہ اور آسٹریلیا کی پوری پوری اقوام کو غلام بنا لیا تھا۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی میں غلام اور آقا اقوام کی مشترکہ کوششوں سے، جبکہ وہ دو عظیم جنگوں کی وجہ سے قتل و غارت سے عاجز آ گئے تھے تو غلاموں کو آزادی نصیب ہوئی اور نتیجتاً آج اکیسویں صدی عیسوی میں ان غلاموں کی اولاد میں سے کوئی جرنیل بنے کوئی جسٹس اور اب تو دنیا کی سب سے بڑی قوم کا صدر بھی انہی کی اولاد میں سے ہے۔

اس تہذیب یافتہ معاشرے میں جہاں غلاموں کو آزادی نصیب ہوئی۔ وہیں ایک دوسری لعنت نے بھی جنم لیا، آزادی کے نام پر اور وہ ہے عورتوں کی آزادی، جہاں خواتین کو آزادی کے نام پر بے حرمت کر دیا گیا۔ ان کی پاکیزگی کو پامال کر دیا گیا اور ان کی شرم و حیا ان سے چھین لی گئی۔ ان کا لباس مختصر سے مختصر ترین کر دیا گیا۔ ان کو عیاشی کا ایک نمونہ بنا دیا گیا۔ انھیں جنسی تسکین کا آلہ بنا دیا گیا اور ان سب غلاظتوں کو آزادی اور فیشن کا نام دے دیا گیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ تمام فیشن اور آزادی دنیا کے تینوں بڑے مذاہب یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

حالانکہ نظام غلامی قانونی طور پر ختم ہو چکا ہے لیکن ابھی تک دنیا کے بیشتر علاقوں میں خاص طور پر جنوبی ایشیا میں انسان کو آج بھی بے کسی اور بے بسی کے عالم میں لا کر فروخت کیا جا رہا

ہے۔ لڑکیوں کو شادی کے نام پر اپنے قبضے میں لا کر فروخت کیا جاتا ہے اور پھر ان سے عصمت فروشی کا گھناؤنا کاروبار کر لیا جاتا ہے۔ نو عمر بچے اغوا کر کے زنجیروں میں باندھ کر رکھے جاتے ہیں اور ان سے مشقت جبری لی جاتی ہے، ان بچوں سے بھیک منگوائی جاتی ہے جرائم کرائے جاتے ہیں اور اس تہذیب یافتہ معاشرے کے شرفاء ایسے ذلیل اور گھناؤنے کاروبار کرتے ہیں کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس مہذب دنیا میں پانچ سے بارہ برس تک کے معصوم بچے خرید کر عرب کے صحراؤں میں فروخت کیے جاتے ہیں اور انہیں اونٹوں کی دوڑ میں جانوروں کے ساتھ شامل کر کے محظوظ ہونے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس میں ان بچوں کو اونٹ پر بٹھا کر باندھ دیا جاتا ہے اور جب اونٹ بھاگتے ہیں تو وہ معصوم بچے خوف سے چیختے ہیں اور ان چیخوں سے اونٹ اور تیز بھاگتے ہیں، پھر ان بچوں کی چیخوں سے وہ مہذب لوگ جن میں غیرت اور شرم و حیا کا فقدان ہوتا ہے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کیا یہ ساری باتیں اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے لیے کافی نہیں؟

(۴۷) اللہ کے قوانین کے خلاف رسم و رواج

چند ظالمانہ اور غیر اخلاقی جرائم جن کا اس سے پہلے مضمون میں ذکر کیا گیا ہے کو کہ وہ قانونی اور سماجی طور پر تسلیم نہیں کیے جاتے، لیکن ان کا تدارک اور ان کے خلاف جنگ بھی اس طرح سے نہیں ہو رہی جو کہ اخلاقی اور مذہبی اور قانونی طور پر ہونی چاہیے۔ یہ شرمناک واقعات ارباب اختیار پر بھی واضح ہیں، معاشرے بھی ان سے اچھی طرح واقف ہیں، لیکن اہل اختیار لوگوں میں سے کچھ اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں اور کچھ بذات خود بالواسطہ یا بلاواسطہ اس گھناؤنے جرائم میں ملوث ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ شرم کی ذرہ برابر رمق ان میں باقی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کام کو برا ضرور گردانتے ہیں۔

اس سے بھی شرمناک بات یہ ہے کہ معاشرے میں کچھ شرمناک اور انسانیت سوز رواج ایسے بھی ہیں، جن کو معاشرے کے لوگ بڑے فخر سے قبول کرتے ہیں، جیسا کہ معاشرے کے ایک بااثر حصے میں ابھی تک خواتین جن میں بہنیں اور بیٹیاں بھی شامل ہوتی ہیں، انہیں ان کے جبلی تقاضوں کو پورا کرنے سے روکا جاتا ہے۔ جس کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں دی

گئی ہے اور انہیں اس طرح روکنے کے لیے انہوں نے چند ظالمانہ، مکارانہ، جبر و تشدد، غیر اخلاقی، غیر قانونی اور غیر شرعی رسم و رواج معاشرے میں جاری و ساری کر رکھے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا بیان یہاں کیا جا رہا ہے اس امید کے ساتھ کہ شاید کوئی مرد صالح و مرد مومن ایسے مذموم ظلم کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرے۔

(الف) خواتین کا قرآن کے ساتھ نکاح:

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں ایک ناقابل یقین ناقابل فراموش اور ذلت آمیز رواج چلا آ رہا ہے، جس کی بنیاد ظالمانہ، شاطرانہ، مکارانہ، غیر شرعی اور سراسر بد فعلی اور بدنیتی پر مبنی ہے۔ جس میں جاگیردار، زمیندار اپنی بیٹیوں اور بہنوں کا نکاح قرآن سے کر دیتے ہیں۔ جس کے بعد مظلوم خاتون کو تمام زندگی تنہائی میں غم اور اذیت میں اپنی آرزوؤں، خواہشوں اور جبلی فطری تقاضوں کی آگ میں جلنا پڑتا ہے اور وہ ایک خاندان کی بنیاد بننے کی خواہش پورا نہیں کر سکتیں۔

انہیں اس طرح سے جہنت جھونکنے کا مقصد اس کے باپ کا، چچا یا چچاؤں کا بھائی یا بھائیوں کا، جو اس جرم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں صرف یہ ہوتا ہے کہ اس خاتون کی وراثت اور جائیداد پر وہ یا ان کی نسل قابض ہو سکے۔ کیونکہ شادی کی صورت میں وہ لڑکی اپنا حق حاصل کر لے گی اور اس کے وارث اسے حق دینا نہیں چاہتے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل ہر سال ایسے جرائم کی رپورٹ شائع کرتا ہے اور ان کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ جرم جائیداد چھپانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہاں صرف ایک ایسی رپورٹ کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے سن ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کے مطابق ایک اندازے پر مبنی یہ بتایا گیا ہے کہ سن ۲۰۰۰ء تک تقریباً پانچ ہزار لڑکیاں اس جہنم میں دھکیلی گئی ہیں اور ان کی شادیاں بڑے دھوم دھام سے قرآن کے ساتھ کر دی گئی ہیں جس کے بعد وہ تاحیات کسی انسان سے شادی نہیں کر سکتیں۔

یہ غیر اخلاقی اور شر انگیز نظریہ اشعریہ اسکول کی فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، جسے الاشعری (۳۳۰-۲۶۰ء) جو بصرہ عراق کا رہنے والا تھا اس کا نظریہ تھا کہ قرآن اللہ کی مخلوق ہے گو کہ اس نے اس نظریے سے سن ۳۰۰ھ میں توبہ کر لی تھی، لیکن نظریہ تو پھر بھی قائم رہا۔ اس خیال سے جو بہر حال و بلاشبہ ایک غلط خیال ہے ایک تفرقہ پا ہو گیا۔ چونکہ یہ تفرقہ سیاسی جوڑ توڑ کے سلسلہ میں پیدا کیا گیا تھا اور اس کے ذریعہ سے بادشاہ وقت کا اپنے مخالفوں کو راستے سے ہٹانا مقصود

تھا۔ کسی بھی ذی شعور عالم نے اس کی حمایت نہ کی، اس وقت کے سب سے بڑے عالم جناب امام احمد بن حنبل اس کے بہت بڑے مخالف تھے جس کی پاداش میں حکمران وقت نے انھیں اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔

یہ تفکر اور فکر عراق سے دجلہ کے راستے سرزمین سندھ میں ٹھٹھہ کے مقام پر آیا اور پھلا پھولا اور پھر وہاں کے لوگوں نے قرآن کی آڑ میں اپنی شریر اور شیطانی آرزوؤں کو پورا کیا۔ کہ قرآن چونکہ مخلوق ہے اور ظاہر ہے بہت محترم اور بہت معزز مخلوق، ان کے خیال کے مطابق۔ لہٰذا ایک مقدس مخلوق سے وہ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی شادی رچاتے تھے اور اس ظلم کے ذریعہ ان کی ملکیت پر قبضہ کر لیتے تھے۔ آج اس دور میں یعنی اکیسویں صدی عیسوی میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔

(ب) غیرت کے نام پر عورتوں کا قتل:

یہ ایک اور بدقسمتی بداخلاقی، انتہائی جہالت اور ظلم پر مبنی رواج ہے جو ابھی تک معاشرے میں بڑے فخر اور بہت بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ جس کے مطابق بہنوں اور بیٹیوں کو ان کے فطری، دینی اور قانونی حق سے محروم رکھ کر انھیں ان کی پسند کے مطابق شادی کی اجازت نہیں دی جاتی اور انھیں ان کے حق سے محروم رکھنے پر فخر بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ ایسی خواتین جو کسی ایسے شخص سے شادی کی خواہاں ہو، جسے اس کے خاندان والے پسند نہ کرتے ہوں، ایسی خاتون اور اس کے پسندیدہ مرد کو نہ صرف ان کے حق سے محروم کیا جاتا ہے بلکہ انھیں خاتون کے خاندان والے بہت ہی بیدردی سے اور ظلم سے قتل کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ خاتون اور مرد کے اس فیصلے سے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے چن لیا ہے، وہ ذلیل ہو گئے ہیں۔ ان کا یہ بھی جواز ہوتا ہے، کہ انھیں اس حق سے محروم کیا گیا ہے کہ وہ خود اس خاتون کے لیے کسی مرد کو پسند کریں یا نہ کریں اور اس طرح سے ان کی غیرت اور عزت مجروح ہوتی ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ ان کی مکروہ خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے بعض دفعہ تو انہوں نے اس خاتون کی شادی کرانی ہی نہیں ہوتی بعض دفعہ اس خاتون کو کسی بچے سے خواہ وہ کسی بھی عمر کا کیوں نہ ہو یا وہ خاتون سے بہت بڑی عمر کا ہی کیوں نہ ہو بیاہنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ ان بے قصور انسانوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اور نتیجتاً مقتول کی جائیداد کا حصول ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور وہ اس قتل کا جواز بنانے

کے لیے پہلے ان پر بدچلنی کا الزام لگاتے ہیں اور پھر قتل کر دیتے ہیں۔ یہ بھیانک جرم اس حالت میں بھی سرزد ہوتا ہے جب ایک عورت اور مرد اپنی مرضی سے شادی کر لیں۔ اس ملن کو لڑکی کے رشتے دار مرد اپنی توہین سمجھتے ہوئے اسے قتل کر دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہیومن رائٹس کمیشن پاکستان اور ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسی ادارے تفصیلی رپورٹس شائع کر چکا ہے، بلکہ ہر سال اس کی رپورٹ شائع ہوتی ہے۔ ان رپورٹس میں سے چند ایک مثال کے طور پر درج ذیل کی جا رہی ہیں:

i) غیرت کے نام پر قتل ایسے لوگ کرتے ہیں، جن کا خیال ہوتا ہے کہ ان کی بیویاں، بہنیں اور بیٹیاں کسی نہ کسی طریقے سے ایسے خود ساختہ قوانین کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوئی ہیں، جس کی وجہ سے ان کے خاندان کے مردوں کی عزت مجروح ہوئی ہے۔ حالانکہ ان مردوں میں جو عزت دار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تمام جہاں کی خباثتیں موجود ہوتی ہیں۔

ii) دوران سال ۱۹۹۸ء ایک جگہ یعنی علاقے میں (۲۸۲) عورتیں قتل کی گئیں اور دوسری جگہ (۲۵۵) غیرت کے نام پر۔

iii) دوران سال ۲۰۰۳ء چھ صد سے زائد خواتین قتل کی گئیں غیرت کے نام پر۔ بہت سے واقعات کی تو رپورٹ ہی درج نہیں ہوتی اور مظلوم موتوں میں چھپالی بھی ہوتی ہیں۔ ان مقتولین میں ایک سات سالہ بچی بھی شامل تھی جسے ایک جرگے نے قتل کرنے کا حکم دیا، حالانکہ وہ خود قتل سے پہلے ظلم کا شکار ہوئی تھی۔

(ج) ونی اور سوارا کی رسم:

اسی معاشرے میں ایک رسم ونی کے نام سے بھی موسوم ہے جو معاشرے کی جہالت اور ذلالت پر دلالت کرتی ہے۔ اس رسم کے تحت کسی بھی لڑکی کو قصاص یا دیت کے عوض نکاح کے نام پر دے دیا جاتا ہے۔ یعنی کسی قتل کے بدلے وہ لڑکی یا لڑکیاں مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ ویسے تو وہ نکاح کے نام پر ہی دی جاتی ہیں، لیکن ان کی حیثیت کنیزوں جیسی ہوتی ہے لیکن انھیں کنیزوں کے حقوق بھی میسر نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں لڑکیوں کی عمر کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ واقعات اس بات کے گواہ ہیں، کہ پانچ برس کی لڑکی پچاس برس کے مرد کے حوالے کر دی گئی۔ ایسی لڑکیاں یا خواتین تمام زندگی کسمپرسی، بے رحمی و بے دردی والا چاری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور

کرادی جاتی ہیں۔ یہ رسم و رواج اور ان کی نذر میں آنے والی خواتین تا حال کسی مردِ مومن کے انتظار میں ہیں، جو انہیں اس بے دردی سے نجات دلائے اور وہ بھی اس مسلمان معاشرے میں۔

اس کے علاوہ ایک اور رسم سوارا کے نام سے رائج ہے جس کا ذکر بھی ایمنسٹی انٹرنیشنل نے کیا ہے۔ اس کے مطابق خواتین کو کسی بھی جرم یا قرض کے بدلے میں دیا اور لیا جاتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ایک چھ برس کی بچی ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کے ساتھ شادی کے نام پر دے دی گئی قرض کے بدلے میں۔ یہ واقعہ بہت ہی زیادہ خوفناک اور شرمناک اور بیہودہ ہے کہ اس بچی کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو کسی بھی شادی شدہ خاتون کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح سے ایک گیارہ سالہ بچی ایک انتالیس سالہ مرد کے حوالے کی گئی، شادی کے نام پر، ایک قتل کا جھگڑا نپٹانے کے لیے۔

(د) بیواؤں کے ساتھ سلوک:

بیواؤں کی عام طور پر شادی کے معاملے میں بہت سختی کی جاتی ہے۔ اگر کوئی ان کی شادی کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کرتا بھی ہے تو فوراً بیوہ کے رشتہ دار کہہ دیتے ہیں کہ اس کے سامنے اس بات کا ذکر بھی نہ کرو یہ تو ایسے نہیں کرے گی۔ دراصل انہیں ان کی خواہش کے مطابق زندہ رہنے کا حق ہی نہیں دیا جاتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہندوؤں میں تو بیوہ کو اپنے مردہ شوہر کے ساتھ زندہ جلنا پڑتا تھا، لیکن یہاں صرف زندہ رہنے کا حق دیا جاتا ہے یا اگر شادی کا حق دیا بھی جاتا ہے تو وہ اس کے سسرالی مرد اپنے حالات اور مرضی کے مطابق دیتے ہیں یا نہیں دیتے۔ کیونکہ ان کا اصل مقصد بیوہ کی وراثت ہڑپ کرنے کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اسے اس کے شوہر کے بھائیوں میں سے کوئی بھائی مجبور کرتا ہے کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ اس میں نہ تو ان کی عمر مدنظر رکھی جاتی ہے نہ مرضی۔ ورنہ انکار پر وہ خاتون قتل کرا دی جاتی ہے یا تمام زندگی ان کی زیرِ نگرانی تنہائی میں گزارتی ہے۔

(ہ) شغار کی شادی:

شغار کی شادی اصل میں بدلے کی شادی ہوتی ہے، اس شادی میں یہ شرط ہوتی ہے کہ لڑکی کی شادی اس شرط پر کی جائے گی کہ اس کے بدلے لڑکے والے بھی اپنی کسی بھی لڑکی کو شادی کے لیے پیش کریں۔ اس بدلے میں لڑکی کی عمر مانع نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر ایک شخص کہیں شادی

کرنے کا خواہاں ہے تو اس کے بدلے اسے اپنی بہن یا بیٹی لڑکی کے خاندان والوں کو شادی کے نام پر دینی ہوگی، خواہ اس کی عمر چند برس ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر وہ پانچ برس کی ہے اور دوسری طرف مرد کی عمر چالیس برس ہے اور وہ شادی شدہ بھی ہے تو معاملہ طے پا جاتا ہے اور جیسے ہی لڑکی تقریباً بارہ برس کے قریب ہو جاتی ہے تو اس کی رخصتی ہو جاتی ہے۔

اس بارے میں جناب رسول اللہ کا قول مبارک ہے کہ "اسلام میں شغار نہیں ہے"۔ (مسلم)

(و) عورتوں کے خلاف سماجی جرائم اور تشدد:

مسلمان معاشروں میں عورتوں کے خلاف سماجی جرائم اور تشدد کے واقعات عام ہیں۔

اس سلسلے میں ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹ کمیشن کے چند حوالے درج کیے جا رہے ہیں، تا کہ سماجی جرائم اور تشدد جو عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

1) عورتوں اور لڑکیوں کو دھوکے اور تشدد کے ذریعہ اغوا کیا جاتا ہے اور فروخت کر دیا جاتا ہے پھر انہیں دوبارہ اور کئی بار خریدا اور بیچا جاتا ہے اور یہ خرید و فروخت عموماً شادی کے نام پر ہی ہوتی ہے۔ ایسی شادیوں میں بعض دفعہ تو لڑکیوں کی اپنی مرضی بھی شامل ہوتی ہے جس میں انہیں دھوکہ دیا جاتا ہے اور بعض دفعہ ان کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ ان کی شادی کے معاملے میں ان کی اولاد کو بھی مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ اس طرح سے وہ ایک کنیز کی طرح سے زندگی گزارنے پر مجبور کی جاتی ہیں۔ اس طرح کا کاروبار کرنے کے لیے باقاعدہ منظم گروہ اس معاشرے میں پائے جاتے ہیں اور قانون کی اندھی آنکھیں اور گونگی زبان اس جرم میں برابر کی شریک ہوتی ہے۔

2) یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ عورتوں کی باقاعدہ خرید و فروخت کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔

3) لڑکیوں کو اغوا کر کے طوائفوں کے کاروبار میں ڈال دیا جاتا ہے۔

4) سال ۹۹-۱۹۹۴ کے دوران سولہ سو عورتوں کو گھریلو جھگڑوں کے دوران جلا دیا گیا اور یہ کام جاری ہے۔ جہاں بھی کوئی عورت ساس یا شوہر کو پسند نہیں آئی وہ گھر کا چولہا پھٹنے سے ہلاک ہو جاتی ہے اور اس کے مجرموں کو پکڑنے کی کوئی تکلیف گوارا نہیں کی جاتی۔ آج تک چولہا پھٹنے سے جتنی بھی عورتیں ہلاک ہوئی ہیں وہ سب کی سب بہوئیں ہی تھیں، کبھی بھی کوئی ساس یا نند ایسے حادثے کی زد میں نہیں آئی۔

(۲۰۸) علم الحدیث کی اہمیت وتعارف

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ جناب رسالت مآب کو دو طرح کا الہام موصول ہوا تھا۔ ایک وہ الہام جو قرآن حکیم کا حصہ ہوا تھا اور دوسرا الہام جو قرآن کریم کا حصہ نہ ہوا تھا، ایسے الہام کو حدیث قدسی کہا جاتا ہے۔ یعنی جناب رسول کریم کا فرمان مبارک جو بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک تیسری قسم الہام کی وہ ہے جو بلاواسطہ تھی۔ جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت کے نام سے بیان فرمایا ہے، کہ اللہ نے اپنے رسول کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی، یہ حکمت بھی جناب رسالت مآب کی زندگی کے اقوال اور افعال کا حصہ تھی۔ چنانچہ ان تینوں اقسام کے الہامی علم کو قرآن اور سنت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سنت میں دو باتیں آتی ہیں، قول اور فعل۔ یہ دونوں معاملات امت کے لیے جاننا از حد ضروری ہیں اور اقوال نبوی کے لیے احادیث نبوی کے متعلق جاننا ضروری ہے۔ آپ کی حیات مبارکہ کے متعلق تو کافی تعداد میں کتب موجود ہیں اور احادیث کے بارے میں بھی لیکن علم حدیث بقدرے مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس کے متعلق مختلف طبقات میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں اور کچھ طبقوں میں تو شکوک و شبہات بھی موجود ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری خیال کیا گیا ہے کہ علم الحدیث کے بارے میں مختصراً اس طرح سے واضح کر دیا جائے کہ عام قاری حدیث کے بارے میں درست معلومات حاصل کر کے اس سے خاطر خواہ افادہ حاصل کر سکے۔ اور عام طور پر اس علم کے بارے میں جو شکوک و شبہات پیدا کیے گئے ہیں یا جن احباب کو اس علم کے بارے میں درست معلومات حاصل نہیں ہیں، انہیں اس بارے میں تسلی اور تشفی ہو جائے اور وہ صحیح طور پر علم الحدیث کے متعلق آگاہی حاصل کر سکیں۔

(الف) علم الحدیث کی اہمیت:

چند مسلمان جن کا علم الحدیث کے بارے میں سرسری علم ہے، وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے لیے صرف قرآن ہی کافی ہے اور حدیث کا جاننا ان کے لیے ضروری نہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ احادیث ہمیشہ اپنی درست حالت میں نہیں ہوتیں۔ اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ علم الحدیث کی اہمیت بیان کی جائے۔ اور یہ کہ کس طرح سے احادیث کو قلمبند کیا گیا تھا، ان کی جانچ کی گئی ان کی اصل کو پرکھا گیا اور پھر انہیں قلمبند کیا گیا اس وقت کے بہترین علماء نے جو

حدیث کے امام مانے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان بہت واضح ہے۔ یعنی سورہ الجمعہ (۶۲) کی آیت (۲) میں فرمایا گیا کہ: "وہ (اللہ) ہے جس نے بھیجا ان پڑھ لوگوں میں سے ایک پیغمبر جو پڑھ کر سناتا رہا اس کی (اللہ کی) آیات ان کو پاکیزہ کرتے ہوئے اور پڑھاتا رہا ان کو کتاب اور حکمت، اور بے شک! وہ لوگ اس سے پہلے بہت بڑی گمراہی میں مبتلا تھے"۔

اس آیت مبارکہ میں لفظ "کتاب" جو صاف طور پر قرآن کی طرف اشارہ کرتا ہے اور لفظ "حکمت" کا مطلب ہے علم و دانش جو جناب رسول کریم پر نازل ہوا قرآن کے علاوہ۔ اس لیے یہ تینوں عنصر یعنی "قرآن اور رسول اللہ کے اقوال و افعال" "کتاب و حکمت" کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا جناب رسول اللہ کا ہر لفظ اور ہر قول اور آپ کی زندگی کا ہر عمل اور ہر فعل، اللہ تعالیٰ کے حکم، منشا اور مرضی کے عین مطابق ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ محمد (۴۷) آیت (۳۳) میں حکم دیا کہ:

"اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا تاکہ تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں"۔ پس یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اللہ کے رسول کے اقوال کی اطاعت اختیاری نہیں بلکہ لازمی ہے۔ جناب رسول اللہ کے اقوال کی اطاعت سے ایک پاکیزہ زندگی میسر ہوتی ہے۔ جبکہ اس کا انکار اللہ کے اقوال کی توہین اور اللہ کے رسول کی اطاعت کی نفی تصور کیا جائے گا۔ یہ انکار یا کوتاہی صرف گناہ ہی میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ یہ اس منکر کی اچھائیوں کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔ اس لیے جناب رسالت مآب کی پیروی یعنی آپ کی سنت یعنی اقوال و افعال کی پیروی امت کے لیے بہت اہمیت کا باعث ہیں۔

اس بات کی مزید اہمیت قرآن کی سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۳۱، ۳۲) سے سامنے آجاتی ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"کہیے (اے محمد، لوگوں سے)! اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا اور اللہ بہت معاف کرنے والا بہت رحم والا ہے۔ کہو (اے محمد) اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی۔ لیکن اگر تم نے اپنا منہ موڑا تو اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو پسند نہیں فرماتا"۔

یہ آیات بہت ہی چونکا دینے والی اور بہت بڑی حقیقت سے خبردار کرنے والی آیات ہیں۔

اگر ایمان کی ذرہ برابر بھی رمق باقی ہو تو ہوشمندی کا تقاضا ہے کہ ان آیات پر غور کر کے فوری طور پر اپنی اصلاح کر لی جائے۔ اور ان آیات کے مطلب و مقصد کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا جائے کہ وہ احباب جو اللہ کی محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن جناب رسالت مآب کی پیروی کا حق ادا نہیں کرتے یعنی آپؐ کے افعال و اقوال کی پیروی کا اہتمام نہیں کرتے۔ کیوں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ ایسے لوگ ایمان والے نہیں ہیں، جو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول کے احکام سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

(ب) احادیث کی ترسیل کا طریقہ کار:

حدیث کی ترسیل جناب رسالت مآب کے دہن مبارک سے اس شخص تک جو اُسے اکٹھا کر کے قلمبند کر رہا ہے اس تمام ذریعہ ترسیل کو "روایت" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت اہم عنصر ہے کسی بھی قول رسولؐ کو جانچنے اور اس کی سچائی کی تصدیق کرنے کا۔ اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ ترسیل کا یہ طریقہ کار قول رسولؐ کے بارے میں آپؐ کی حیات مبارک میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ مختلف قبائل اور مقامات سے لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور شرف قبول اسلام لاتے اور قرآن کے علاوہ آپؐ سے مزید کچھ نہ کچھ سیکھتے اور نصیحت حاصل کرتے یا کوئی سوال پوچھتے اور پھر واپس اپنی جگہوں اور قبیلوں میں چلے جاتے، جہاں پر ان کی ذمہ داری ہوتی کہ وہ تمام باتیں وہاں کے لوگوں تک پہنچا دیں۔ اور مزید یہ کہ وہ جس حال میں جناب رسالت مآب کو دیکھتے اور جو واقعات یا گفتگو وہاں ہوتی وہ تمام کی تمام دوسرے لوگوں تک پہنچ جاتی۔

جناب رسالت مآب اپنے اصحاب میں سے اہل دانش اصحاب کو اسلام کا پیغام پہنچانے کی غرض سے بھیجا کرتے تا کہ وہ اس علم کو جو انہوں نے آپؐ سے سیکھا ہو دوسروں تک پہنچا دیں۔ خطۂ عرب میں اسلام پہنچنے کے بعد جناب رسول اللہؐ اور آپؐ کے نائبین، جیسا کہ تحسین، قاضی اور دینی تعلیم دینے والے لوگوں کو دور دراز علاقوں میں بھیجتے تو انہیں یہ باور کرا دیتے کہ وہ قرآن کی اور سنتِ رسولؐ کی پیروی کریں گے، اپنے ہر معاملہ میں۔ یعنی اپنی تعلیم میں، اپنی قیامت میں اور اپنی قضات میں۔ لیکن اگر انہیں کسی معاملے کے جاننے میں قرآن اور حدیث یا سنت رسولؐ میں کوئی مثال نہ ملے یا ان کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر ان ہی دو اصولوں کی روشنی میں وہ اپنی عقل و دانش کو استعمال کرتے ہوئے فیصلہ کریں یا اپنی رائے کا اظہار کریں۔

ایک مرتبہ بنی عبدقیس کا ایک وفد بحرین سے جناب رسول اللہؐ کے پاس آیا، جب وہ لوگ واپس ہونے لگے تو ان کو جناب رسالت مآب نے چند الفاظ اس سلسلے میں فرمائے اور تاکید کی کہ وہ ان الفاظ کو اپنے لیے محفوظ کر لیں اور اپنے دیگر لوگوں کو بھی ان سے مطلع کر دیں تا کہ یہ نصیحت ان تک بھی پہنچ جائے۔ اسی طرح سے آپؐ نے اپنے خطبہ حج میں خاص طور پر تاکید فرمائی تھی کہ جو لوگ وہاں موجود ہیں اور وہ تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار کے قریب تھے وہ غور سے آپؐ کا پیغام ذہن نشین کر لیں اور ان لوگوں تک اس پیغام کو پہنچا دیں جو وہاں موجود نہیں تھے۔ آپؐ نے اس بات کی بھی نصیحت فرمائی کہ آپؐ کی غیر موجودگی میں قرآن اور سنت ان کی رہبری کریں گے، انہیں راستہ پر گامزن کرنے کے لیے اور انہیں برائی سے محفوظ رکھیں گے۔

حالانکہ آپؐ کے اقوال زریں آپؐ کی حیات مبارک میں ہی غیر موجود لوگوں تک پہنچ رہے تھے لیکن انہیں اس طرح سے محفوظ نہیں کیا جا رہا تھا، جس طرح سے کہ قرآن کو محفوظ کیا جا رہا تھا۔ جناب رسول اللہؐ کے پیروکار آپؐ کے اقوال دوسروں تک پہنچانے کا کام بہت احتیاط کے ساتھ کر رہے تھے لیکن مجموعہ احادیث کو اکٹھا کرنے والے اور انہیں قلمبند کرنے والے اس بات کے پابند تھے کہ وہ اپنے مجموعہ احادیث کی تصدیق کر لیں اور اس بات کا یقین کر لیں، کہ واقعی وہ صحیح طور پر جناب رسالت مآب ہی کے الفاظ ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور بڑی اہم بات ہے کہ ایسی احادیث جو جناب رسالت مآب کے فرمان کی وجہ سے یا قرآن کی آیات کی وجہ سے منسوخ ہو گئی ہوں یا ان کے احکامات میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہو، ایسی احادیث کو پھر منسوخ ہی سمجھا جائے۔ بلاشبہ یہ کام کوئی معمولی کام تو نہ تھا، بلکہ یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا اہل دانش و اہل تقویٰ کے لیے جنہوں نے اس مشکل ترین کام کا بیڑا اٹھایا تھا کہ وہ ان احادیث کی جانچ پڑتال کریں، جو ان کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔

(ج) احادیث کی صداقت جانچنے کی ضرورت:

جناب رسالت مآب اپنے پیروکاروں کو اس بات کی ہدایت فرمایا کرتے تھے، کہ آپؐ کے اقوال کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔ لیکن ساتھ ہی سختی کے ساتھ یہ تلقین بھی فرماتے کہ اگر کوئی بھی آپؐ کے نام سے منسوب کر کے کسی قول کو بیان کرے جو آپؐ کا نہ ہو وہ آگ کی سزا کا مستحق ہو گا۔ اس لیے اہل دانش اور اہل علم حضرات جو اسلامی قوانین اور احادیث رسولؐ سے منسلک تھے،

انہیں اس بارے میں بہت ہی زیادہ محتاط رہنا پڑتا تھا، جب وہ احادیث کی جانچ پڑتال کرتے اور انہیں قلمبند کرتے۔ اس لیے انہوں نے اس مقصد کے لیے چند قواعد و ضوابط طے کر کے مقرر کر لیے تھے اور ایک منطقی نتیجہ اخذ کرنے کے لیے جانچنے کا عمل اور قول کی صداقت جاننے کے لیے جناب رسول اللہ کے اقوال کو قرآن کی مناسبت سے جانچنا اور اقوال کا آپس میں تکراری امتحان اور جرح بہت ضروری تھا۔ دوسری وجہ اس جانچ پڑتال کی منافقین کی اسلامی معاشرے میں موجودگی تھی جو جناب رسالت مآب کے دشمن تھے لیکن اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ایسی تعداد بھی تھی جو عقل و دانش اور یادداشت میں کم حیثیت رکھتی تھی، لیکن ان کے ایمان کے بارے میں شک کی گنجائش نہیں۔ اس طرح منافقین سے تو یقینی توقع ہے کہ انہوں نے غلط بیانات جناب رسالت مآب سے منسوب کیے ہوں گے۔ جبکہ کم علم اور کم یادداشت والے حضرات بیان کرتے وقت صحیح الفاظ ادا نہ کر سکے ہوں گے یا کچھ بھول گئے ہوں یا کچھ اپنی دانش کے مطابق سمجھے ہوں جو اصل سے ہٹ کر ہو۔ اس لیے احادیث کے اکٹھا کرنے اور قلمبند کرنے کے وقت جو جناب رسالت مآب کی وفات کے نوے برس بعد شروع ہوا یعنی ۱۰۰ ھ میں، جس وقت بہت بڑی تعداد احادیث کے نام سے محققین اور محدثین کے سامنے پیش کی گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ساڑھے بائیس لاکھ احادیث سامنے آئیں۔

ایک عام شخص کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ رسالت کا زمانہ تئیس (۲۳) برس پر محیط تھا۔ جسکے پہلے تین سال میں تقریباً کوئی شخص دعوت قبول نہ کر سکا، سوائے جناب رسالت مآب کے گھر والوں کے اور بہت ہی قریبی ساتھیوں کے اور تین برس آپؐ نے مکہ سے باہر شعب ابو طالب میں سماجی بائیکاٹ کی حالت میں گزارے۔ اس لیے جناب رسالت مآب کو صرف سترہ برس رابطے کے لیے میسر آئے اور اس میں سے بھی مزید سات برس جو مکہ میں گزرے وہ قریش کی دشمنی میں گزرے۔ لہٰذا فرض کریں کہ اگر رسول اللہؐ کے دس اقوال روزانہ کے منقول ہوئے ہوں تو کل اقوال کی تعداد ۵۰،۰۰۰ یعنی پچاس ہزار ہو پاتی ہے۔

اس لیے ان حالات کے پیش نظر جبکہ علماء حدیث کے سامنے ساڑھے بائیس لاکھ کی کثیر تعداد میں احادیث پیش کی جائیں تو ان احادیث کے متن، مضمون اور روح کی جانچ پڑتال بہت ضروری ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے لیے چند اور وجوہ جو درج ذیل کیے جا رہے ہیں، ہو سکتے ہیں۔

۱) ایک ہی قول کے بہت سے راوی ہو سکتے ہیں جو ایک مجلس میں بیٹھے ہوں۔
۲) کسی قول کی منسوخی، کسی دوسرے قول کے آجانے کی وجہ سے، وہ دوسرا قول اللہ کا بھی ہو سکتا ہے اور اس کے رسول کا بھی۔
۳) کسی قول کو دیکھنا کہ اس سے کوئی حکم عام صادر ہوتا ہے یا حکم خاص۔ یعنی وہ قول کسی خاص واقعہ یا شخص کی نشاندہی کرتا ہے یا سب کے لیے ہے۔
۴) یہ جانچنا کہ وہ قول کسی کا خودساختہ یا کسی منافق کا تو نہیں۔
۵) یہ جانچنا کہ وہ قول کسی سنی سنائی بات پر مبنی تو نہیں۔

اس لیے امام بخاریؒ نے اپنی عقل و دانش کے مطابق چھ لاکھ اقوال کی چھان بین کی۔ اور اس میں اپنی انتھک محنت اور کاوش کے بعد صرف (۹۸۸۲) اقوال کو قابل قلمبندی سمجھا، جو ان کی جانچ پر پورے اترے۔ پھر بھی ان میں چند ایک دہرائے جانے والے اقوال ہیں، مختلف روایتوں کی وجہ سے اور ان میں سے چند ایک کا مشکوک ہونا بھی ممکن ہے۔ لیکن زیادہ تر علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اقوال رسول اللہؐ کے بارے میں کتاب بخاری نہایت قابل اعتبار ہے۔

اسی طرح سے امام مسلمؒ نے تین لاکھ اقوال جو انہیں پیش کیے گئے، ان کی چھان بین کر کے صرف چار ہزار اقوال کو قابل اعتبار سمجھا اور قلمبند کیا۔ اس میں بھی (۲۳۲۶) احادیث ایسی ہیں جو بخاری میں شامل ہیں۔ اس طرح سے کل نو لاکھ اقوال میں سے کل (۱۱۵۵۶) اقوال کو قابل اعتبار اور قابل قلمبندی سمجھا گیا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ساڑھے سات لاکھ اقوال میں سے تیس ہزار منتخب کیے، ابو داؤد نے پانچ لاکھ میں سے چار ہزار آٹھ، امام مالک نے ایک لاکھ میں سے ایک ہزار ستائیس منتخب کیے۔ اس طرح سے کل پیش کیے گئے ساڑھے بائیس لاکھ اقوال میں سے کل (۴۷۳۸۳) اقوال قلمبند کیے گئے۔ اور یہ تعداد دو اعشاریہ دو فیصد بنتی ہے۔ یہاں یہ بات عرض کر دینا ضروری سمجھا گیا ہے کہ یہ تمام تفصیل فقہ اور حدیث کے بڑے عالم جناب شاہ عبدالعزیز دہلوی جو شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے تھے ان کی کتاب میں سے اور جناب عبدالصارم الازہری کی کتاب میں سے لی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان امام احادیث نے انتھک محنت و کوشش کے بعد یہ بے مثال کارنامہ سرانجام دیا، جس کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہوگی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اُن کے علاوہ دیگر بہت سے علماء مثلاً ترمذی، نسائی وغیرہ بھی ہیں جو اس مشن میں شریک تھے۔

اس ساری تفصیل بیان کرنے کا مقصد قارئین کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ احادیث کو قلمبند کرنے، ان کو جانچنے اور منتخب کرنے کا طریقہ کار ایک باقاعدہ فن تھا، جس کا اختیار کرنا بے شک بہت مشکل لیکن اہم کام تھا، جو امت کے لیے رہتی دنیا تک سود مند ثابت رہے گا۔

(و) جانچ کا طریقہ کار:

علمائے اسلام نے بلاشبہ نہایت محنت اور مشقت انگیز منزلوں کو طے کر کے ایک بہت ہی وسیع اور جامع طریقہ کار تجویز کیا، جسے پیش کی گئی احادیث کی صداقت کو جانچنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اور اس طرح سے حتی الامکان انہی احادیث کو قلمبند کر کے ریکارڈ پر لایا گیا جو وضع کردہ امتحان پر پوری اتریں۔ اس امتحان کے سلسلے میں درج ذیل تین امور قابل قدر ہیں جو ان کی جانچ میں مدد دیتے ہیں۔

(۱) روایت

اس امر میں پیش کیے گئے اقوال کے مضمون کو مدنظر رکھا جاتا ہے جس میں الفاظ تو مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن مطلب و مقصد وہی ہو۔

(۲) درایت

اس کا تعلق حدیث کے مضمون کے بنیادی خیال کا امتحان مقصود ہوتا ہے کہ کیا اس مضمون کا اطلاق وقتی ہے یا کہ مستقل اصول کی شکل اختیار کرتا ہے۔

(۳) تادیل

اس کا تعلق اس شخص کے کردار سے ہے جو حدیث بیان کرتا ہے۔ یعنی یہ دیکھنا کہ بیان کا تعلق اس کے ذاتی مفاد میں تو نہیں۔ اس میں بیان کرنے والے کے کردار، سچائی، دانائی، یادداشت اور صحیح طور پر بیان کرنے کی صلاحیت کے متعلق ہے۔

(ہ) احادیث کی قلمبندی کے سلسلے میں کاوشیں:

اسلام کے ابتدائی دور میں زندگی گزارنے کے ضابطہ حیات کی تکمیل کے سلسلے میں ہدایات اور احکامات کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔ اس دور میں احکامات ربانی اور پھر ان کی روشنی میں احکامات رسول اللہؐ میں اضافات اور تبدیلیاں جاری تھیں۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ

پہلے صرف دو نمازیں تھیں پھر پانچ ہو گئیں۔ پہلے نبوت کے چودہ برس تک روزے نہیں تھے، پندرہویں سال فرض ہو گئے۔ پہلے زکوٰۃ نہیں تھی، پھر زکوٰۃ فرض ہو گئی۔ پہلے حج نہیں تھا پھر اس کی اجازت ہو گئی۔ پہلے خمر منع نہیں تھی پھر حرام ہو گئی۔ پہلے روزہ افطار کے بعد پھر شروع ہو جاتا تھا، اس میں سحری نہیں تھی پھر افطار کے ساتھ سحری بھی شامل ہو گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ قبول اسلام کے بعد ایک مسلمان کو ایک انتہا سے دوسری انتہا تک جانا ہوتا تھا۔ جو یقینا بہت مشکل کام تھا۔ اس لیے اسلام میں قوانین یک لخت لاگو نہیں کیے گئے بلکہ بتدریج تیئیس برس کے عرصے میں ان کے نفاذ کا اہتمام کیا گیا۔ اور اس عرصہ میں مسلمانوں کے دلوں میں ایمان اس طرح سے راسخ ہو گیا تھا جیسا کہ زمین میں پہاڑ۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ نیا دستور قوانین کا نفاذ مدنی دور میں ہوا، چونکہ مسلمان ایک مستحکم اور با اختیار جماعت کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ قرآن کا نزول بھی چونکہ تیئیس برس میں ہوا اور اس کا اندراج بھی ایک کتابی شکل میں نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ مختلف موقعوں پر جب قرآن حکیم کی مختلف آیات کا ضرورت کے مطابق نزول ہوتا تو جناب رسالت مآب مختلف اصحاب کو ان آیات کی املا لکھوا دیتے۔ جناب رسول اللہؐ کے کچھ اصحاب ان آیات کو زبانی یاد کر لیتے۔ یا تو وہ لکھ لیتے اور یاد کر لیتے یا جناب رسول اللہؐ سے سن کر ہی یاد کر لیتے۔

چنانچہ یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اس امر میں شدید احتیاط برتی جائے کہ اسلام کے ابتدائی دور کی احادیث رسول اللہؐ کی قلمبندی میں اس بات کا شائبہ بھی نہ رہے، کہ کسی قرآنی آیت اور حدیث کے الفاظ آپس میں مل جائیں۔ اسی احتیاط کے پیش نظر جناب رسول اللہؐ نے اس وقت آپؐ کے اقوال یعنی احادیث کی قلمبندی سے منع فرما دیا تھا۔ اور اصحاب کرام نے بھی ویسے ہی اس معاملے میں احتیاط برتی اور اس حکم پر عمل کیا اور کرا لیا، کہ قرآن اور حدیث رسولؐ کے بیان میں واضح فرق رکھا جائے۔ یعنی خاص طور پر باور کرا لیا جائے اور نا کیداً کہا جائے کہ یہ الفاظ جو بیان کیے جا رہے ہیں قرآن کے نہیں یا وہ الفاظ قول رسولؐ ہیں۔

امام مسلم نے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا تھا کہ:

''مجھ سے کوئی بات سننے کے بعد اسے قلمبند مت کرو سوائے قرآن کے اور اگر کسی نے لکھ لیا ہو تو وہ اُسے مٹا ڈالے''۔

جب مدینہ شریف میں مسجد نبوی کی تعمیر ہو گئی اور وہ ایک اسلامی مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی اور علم حاصل کرنے کی درس گاہ بن گئی تو اس وقت جناب رسالت مآب نے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ اب آپؐ کے اقوال کو بھی قلمبند کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں ثابت بن سعدکی ایک روایت جو ابو داؤد نے لکھی ہے، اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسول کریمؐ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کو فرمایا کہ:

"جو کچھ تم مجھ سے سنو اسے لکھ لو" اور اس کے بعد جناب رسول اللہؐ نے اپنی انگلی کا اشارہ اپنے دہن مبارک کی طرف کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دہن کبھی بھی کوئی الفاظ ادا نہیں کر سکتا سوائے سچائی کے۔

امام بخاری نے لکھا کہ علی بن ابی طالبؓ کے پاس لکھائی کا ایک مجموعہ تھا، جس میں زکوٰۃ کے قوانین، جرائم کے متعلق ہدایات اور چند دیگر معاملات کے متعلق اندراجات تھے۔ اس بات کی گواہی بھی ملتی ہے اور اسے امام مالک نسائی اور احمد نے لکھا ہے، کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھوائی تھی جس میں قرآن کی تلاوت کے قانون صلوٰۃ، روزہ، طلاق اور قصاص اور دیت کے قوانین لکھوائے تھے۔ اور یہ کتاب یمن کے مسلمانوں کی رہبری کے لیے عمرو بن حزم کے ہاتھ بھجوائی گئی تھی۔ اس کتاب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ احادیث کی پہلی کتاب تھی۔ ابن قیم جو اسلام کے بڑے عالم تھے، انہوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ کتاب ایک بہترین ذریعہ ہے ان ہدایات کو جاننے کا جو جناب رسول اللہ کی طرف سے موصول ہوئی تھیں۔

جناب رسول اللہؐ نے بہت سے موقعوں پر قانونی ہدایات لکھوائیں۔ تحریراتی اور دیوانی معاملات کے متعلق قانون وراثت اور زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق جو آپؐ نے مختلف وفود اور سربراہان کو بھجوائیں ان کی رہنمائی کے لیے۔ یہ بھی اقوال رسولؐ کے جاننے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر حمیداللہ جو ایک مشہور عالم تھے انہوں نے کہا کہ اس قسم کے (۲۸۱) خطوط ملے ہیں جن میں ایسی رہنمائی ملتی ہے۔

اس بات کا احساس قوی تھا کہ اقوال رسول اللہؐ کو جمع کر کے ان کا ایک ریکارڈ بنایا جائے کیونکہ اس کی اہمیت اور ضرورت امت مسلمہ کے لیے بہت زیادہ تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن پھر

بھی اس بات کو ترجیح دی گئی کہ سب سے پہلے آیات قرآن حکیم کو جمع کر کے اس کی ترتیب کے مطابق ایک جگہ اکٹھا کیا جائے یعنی ایک کتابی صورت دی جائے۔ اور جب تک یہ کام مکمل نہ ہو جائے اس وقت تک احادیث رسول اللہؐ کو اکٹھا کرنے کے عمل کو معطل رکھا جائے۔ تاکہ دونوں کے کسی ایک حصے کو دوسرے حصے سے غلط ملط ہونے کا امکان ہی نہ رہے۔ اس لیے نائب رسول اللہؐ جناب عمرؓ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ قرآن کی کتابی شکل اختیار کرنے کی تکمیل تک کسی شخص کو کسی بھی حدیث رسول اللہؐ کو قلمبند نہیں کرنا چاہیے۔

اس لیے تکمیل قرآن کا کام دور عثمانی میں پورا ہو گیا۔ جبکہ تکمیل جمع اقوال رسول اللہؐ کا کام سن ۱۰۱ھ میں جناب عمر ثانی عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں انہی کے زیر نگرانی پایہ تکمیل تک پہنچا۔ یعنی جناب رسالت مآبؐ کے وصال کے نوے برس بعد۔ اس مقصد کے لیے اس زمانے کے علماء علم و تقویٰ یعنی امام مالک اور امام اوزاعی جیسے بزرگ منتخب کیے گئے، خلیفہ جناب عمر ثانی کی ہدایت پر کہ وہ اس مشکل اور کٹھن کام کو یعنی احادیث رسولؐ کو اکٹھا کر کے جمع کریں۔ چونکہ جناب رسالت مآبؐ کا ہر فرمان اللہ کے حکم کے عین مطابقت میں تھا اس لیے اس خزینہ علم کو قرآن کے بعد اس کی اصلی حالت میں پیش کرنا مقصود تھا، معلوم ہوتا ہے کہ مالک اعلیٰ رب الکریم کی منشاء و مرضی بھی یہی تھی کہ اللہ کے رسولؐ کے اقوال بھی قرآن کے بعد محفوظ ہو جائیں، تاکہ انسان ان سے بھی مستفیض ہو سکیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے علماء کی ایک جماعت پیدا فرمائی جو عقل و دانش کے مالک، تقویٰ میں سبقت لے جانے والے یادداشت کے عمل میں اعلیٰ یادداشت کے مالک، اپنی لگن کے پکے عاجز اور پرہیزگار اور صبر والے اور اپنے مالک کے تابعدار اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرنے والے تھے۔ ان حضرات نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا کہ وہ بہت احتیاط کے ساتھ احادیث رسول اللہؐ کو اکٹھا کریں، ان کی جانچ پڑتال کریں اور پھر ان میں سے قابل اعتبار اقوال کو ایک جگہ اکٹھا کر کے قلمبند کر لیں۔

ان علماء نے اس بارے میں کچھ قوانین و قواعد و ضوابط مرتب کیے تاکہ ان اصولوں کے مطابق ہر اس قول کو جانچا اور پرکھا جائے جو ان کے سامنے حدیث رسول کے طور پیش کیا جائے، تاکہ انہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ اس قول کے تمام راوی اور پھر قول کے الفاظ سچے ہیں اور واقعی وہ فرمان رسول اللہؐ ہیں اور یہ ایسا منطقی طریقہ کار تھا کہ جس کی کسی زبان کی

تاریخ ادب میں مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ علم حدیث ایک بہترین علم فن کی حقیقت کو جانچنے کا پیمانہ بن گیا اور اسی علم کے ذریعے ساڑھے بائیس لاکھ اقوال میں سے صرف دو اعشاریہ دو فیصد اقوال ان قواعد کے مطابق پائے گئے۔

(و) حدیث کے راوی کی جانچ:

اس سے پہلے کہ علمائے حدیث کسی بھی قول کو قبول کریں کہ واقعی وہ قول رسولؐ اللہ ہے ان کے لیے لازم تھا کہ وہ اس قول کے راوی کو درج ذیل نقطوں پر جانچیں:

i) اس راوی کے پاس وہ روایت کیسے پہنچی؟

ii) اس روایت کے تسلسل کے ساتھ کتنے راوی تھے؟ وہ پہلا راوی کون تھا جس نے خود اپنی سماعت سے ان الفاظ کو جناب رسولؐ اللہ کے دہن مبارک سے نکلتے ہوئے سنا اور روایت کے سلسلے میں روایت کی کوئی کڑی کم تو نہ تھی۔

iii) راوی کی درج ذیل خاصیتوں کو جانچنا:

۱) اس کا تعلیمی معیار۔

۲) عمر (یعنی عمر کی پختگی)

۳) ذہنی وجسمانی صحت جس وقت اس نے روایت وصول کی اور روایت بیان کی۔

۴) راوی کا کردار، خاصیتیں اور اس کی عقل کا معیار۔

۵) راوی کا تقویٰ، پرہیزگاری، خلوص، تابعداری، وفاداری اور محبت اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے۔

۶) قوت یاداشت۔

۷) روایت بیان کرنے کا مقصد۔

۸) کیا بیان کردہ روایت کے الفاظ وہی تھے، جو جناب رسولؐ اللہ کے دہن مبارک سے نکلے یا وہ الفاظ راوی نے اپنی زبان میں ادا کیے تھے۔

۹) کیا روایت کا مقصد وروح قرآن اور سنت کی مطابقت میں تھا یا اس میں کوئی جھول نظر آرہا تھا؟

اس طرح سے یہ تمام طریقہ کار آزمانے کے بعد اور اس راوی کے بارے میں تمام تنقیدی

جائزے لینے کے بعد اس روایت کو قابل غور سمجھا جاتا تھا۔ اور اس بات کا فیصلہ حدیث اکٹھا کرنے والے علماء کرتے تھے، کہ وہ روایت قابل قبول بھی جائے کہ نہیں۔

یہ درج بالا مختصری تفصیلات علم الحدیث کے بارے میں اس لیے بیان کی گئی ہیں، کہ عام قاری جسے احادیث کے علم کے بارے میں معلومات تو نہیں لیکن وہ اس کے متعلق اپنی آراء کا اظہار بھی کرتا ہے اسے یہ معلوم ہو سکے کہ علم الحدیث کی اہمیت اور اس کی اصل کیا ہے۔ یہ احادیث جو علماء حدیث نے امت کے سامنے مطالعے کے واسطے رکھی ہیں وہ کتنی شدید محنت اور کاوش، جانچ پڑتال اور بہت سے متعلق قواعد وضوابط کی منزلیں طے کرنے کے بعد قاری کے سامنے آئیں۔ لہٰذا ان کے لیے لازم ہے کہ وہ علم الحدیث کے بارے میں تنقید کرنے سے پہلے، ان کی جانچ پڑتال کے امور پر بھی غور کرلیں اور پھر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

(۲۰۹) اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحم کا مستحق کون؟

اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ چند آیات قرآن الحکیم یہاں بیان کی جائیں، جن سے اہل عقل ودانش کو یاد ہو جائے کہ ایسے شخص کی کیا اہلیت ہونی چاہیے جو اللہ تعالیٰ کے رحم اور بخشش کا مستحق قرار پائے اور اسے کامیابی حاصل ہو جائے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ علاوہ ازیں عوام الناس کی یاد دہانی بھی ہو جائے اور وہ اس اہلیت کو حاصل کرنے کی کوشش کرلیں۔

الف) سورۃ بقرہ (۲) کی آیات (۲ تا ۵) میں بیان کیا گیا ہے، کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم ورحم وبخشش کے مستحق ہیں:

"جو یقین رکھتے ہوں غیب پر (یعنی اس الہام پر جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر فرمایا ہے) اور قائم رکھتے ہوں صلوٰۃ (پانچ وقت تسلسل کے ساتھ) اور خرچ کرتے ہوں، جو ہم (اللہ) نے انہیں عطا فرمایا ہے (اپنے گھر والوں پر اور ضرورت مند رشتے داروں پر اور غربا و مساکین پر)، اور وہ جو یقین رکھتے ہیں جو ہم (اللہ) نے نازل کیا ہے آپؐ پر (رسولؐ پر) اور اس پر جو نازل کیا گیا تھا آپؐ سے پہلے (جناب عیسیٰ پر، جناب موسیٰ پر اور جناب ابراہیم پر اور دیگر انبیاء پر) اور وہ یقین رکھتے ہیں آخرت پر۔ یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ، اپنے رب کی طرف سے اور وہی

لوگ ہیں کامیاب قرار دیے گئے"۔

ب) سورۃ احزاب (۳۳) کی آیت (۳۵) میں فرمایا گیا ہے کہ: وہ لوگ جو اللہ کی بخشش و مغفرت کے مستحق ہیں وہ درج ذیل خواص کے حامل ہوں گے:

"بے شک وہ مسلمان (جو اللہ کے آگے یعنی اس کا حکم ماننے کے لیے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں) عورتیں اور مرد۔ ایمان والے مرد اور عورتیں (جو اللہ کی وحدانیت، جناب محمدؐ کی نبوت آخری نبی کی حیثیت سے اور روزِ حساب پر یقین کامل اور اس کا ثبوت عملی پیش کرتے ہیں)، مرد اور عورتیں جو تابعدار ہیں (اللہ اور اس کے رسولؐ کے)، مرد اور عورتیں جو سچے ہیں۔ مرد اور عورتیں جو صبر والے ہیں۔ مرد اور عورتیں جو عاجزی اختیار کرتے ہیں مرد اور عورتیں جو خیرات دیتے ہیں۔ مرد اور عورتیں جو روزے دار ہیں۔ مرد اور عورتیں جو اپنی عصمتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مرد اور عورتیں جو زیادہ تر اللہ کی یاد میں رہتے ہیں، اپنی زبانوں اور اپنے دلوں سے۔ تو ان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے تیار رکھی ہے مغفرت اور بہت بڑا انعام"۔

ج) سورۃ مومنون (۲۳) کی پہلی گیارہ آیات میں بھی ان لوگوں کی قابلیت کا ذکر کیا گیا ہے جنھیں جنت میں داخل کیا جائے گا ان کے انعام کے طور پر:

i) "بے شک کامیاب ہیں ایمان والے"۔

ii) "وہ جو ادا کرتے ہیں صلوٰۃ، نہایت عاجزی کے ساتھ اور انکساری کے ساتھ"۔

iii) "وہ جو منہ پھیر لیتے ہیں ہر قسم کی برائی اور بیہودہ گفتگو اور کاموں سے"۔

iv) "وہ جو ادا کرتے ہیں زکوٰۃ"۔

v) "وہ جو اپنی عصمتوں کی حفاظت کرتے ہیں"۔

vi) "سوائے اپنی ازواج اور کنیزوں سے اور پھر ان پر کوئی ملامت نہیں"۔

vii) "لیکن جو کوئی اپنی حدود کو عبور کر جاتے ہیں وہ ہیں خطا کار"۔

viii) "اور وہ جو ہیں، سچے اور دیانتدار، امین (یعنی امانتوں کے پاسدار) اور اپنے وعدوں کے بھی پکے ہیں"۔

ix) "وہ جو تسلسل کے ساتھ اپنی صلوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی خلا پیدا نہیں ہونے دیتے"۔

x) "وہی لوگ ہیں بے شک وراثت کے حقدار"۔

xi) اور وہی لوگ وراثت پائیں گے فردوس کی اور اسی میں رہیں گے ہمیشہ کے لیے"۔

(۲۱۰) انسان کے بدترین دشمن

اچھی طرح سے غور کرنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ انسان کے تین بڑے اور بنیادی دشمن ہیں جو انسان کو اکساتے رہتے ہیں بدکرداری کی طرف اور جہالت کی طرف تا کہ وہ اپنی تخلیق کے مقصد سے ہٹ جائیں اور بھول جائیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے کیوں کر پیدا فرمایا۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی پیدائش کا مقصد ان کی انتہائی عاجزی اور انکساری میں پنہاں ہے۔ یعنی وہ اپنی انکساری اور عجز سے اپنے مالک کو راضی کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

چونکہ انسان اپنے مقصد سے ہٹنے کے بعد اتنے بڑے خسارے میں آ جاتا ہے کہ اس کا تصور بھی ممکن نہیں کہ وہ کتنی بڑی ذلت اور رسوائی کا سامنا کرے گا۔ اس لیے اسے گمراہی سے بچنے کے لیے سب سے پہلے تو اپنے ان دشمنوں سے بچنا پڑے گا اور اس کے لیے ان دشمنوں کو جاننا پڑے گا جن سے غفلت میں رہ کر انسان ان کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ دشمن ہیں:

الف) ابلیس

ب) جہالت

ج) تکبر و غرور

آخری دو عنصر یعنی جہالت اور تکبر انسان میں مزید کمزوریاں اور برائیاں پیدا کرتے ہیں اور یہ برائیاں انسان کو مزید برائیوں کی طرف لے جاتی ہیں اور وہ ہیں

i) غصہ (یہ پیدا کرتا ہے نفرت اور انتقام کو جو انسانی معاشرے میں تذبذب و ہیجان برپا کرتا ہے)

ii) شہوت (یعنی نفسانی خواہشات، جو انسان کو ذلالت اور گمراہی کی طرف دھکیلتی ہے۔

iii) غیر منصفانہ رویہ (جو حق داروں کا حق غصب کر کے معاشرتی بے کسی اور بے بسی کے بعد ظلم کی طرف لے جاتا ہے)

iv) غیر اللہ پر توکل (جو اللہ کی محبت سے دور لے جاتا ہے اور بے راہ روی کا باعث بنتا ہے)

ان میں سے پہلے تین عنصر سوسائٹی میں غیر متوازی عمل پیدا کرتے ہیں اور پھر اس کی وجہ سے

سوسائٹی میں فساد برپا ہوتا ہے اور اس فساد کے ذریعے عوام الناس میں سازشی رجحان، کینہ پروری اور شرارت، تشدد، بے چینی، چالاکی، جنگ اور خوف کے حالات اور معاملات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر انسان اپنے مقصد سے اتنا دور ہو جاتا ہے، کہ اسے اپنا مقصد کبھی یاد نہیں آتا۔

پھر چوتھا عنصر یعنی غیر اللہ پر توکل سوسائٹی میں متکبرانہ تبدیلی لاتا ہے یعنی کہ انسان اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوائد وضوابط سے انکار کر دیتا ہے اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہو جاتا ہے اور یہ حالت اسے اللہ کے عذاب کی طرف لے جاتی ہے اس لیے ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم کیا ذرائع اختیار کریں، کہ ہم اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچا سکیں۔

(۲۱۱) شیطانی ترغیب کا محور

حقیقت میں انسان سے دشمنی کا محور شیطانی ترغیب ہے کیونکہ شیطان خود اپنی ہی جہالت کی وجہ سے جو اس کے تکبر کا باعث بنی بذات خود بہک گیا اور ان حالات میں آمادۂ بغاوت ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کا مرتکب ہوا۔ یہ کہا گیا ہے کہ شیطان یعنی ابلیس اپنی عبادات اور ریاضت کی وجہ سے بطور انعام فرشتوں کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ اس میں اور فرشتوں میں فرق یہ تھا، کہ اسے یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اعمال کو اختیار کر لے، اسی لیے وہ اللہ کے حکم کا انکار کر گیا۔ حالانکہ یہ اس کی بدبختی کی انتہا تھی کہ وہ اپنے رب کی حضوری میں رہتے ہوئے بھی حد ادب قائم نہ رکھ سکا۔ جبکہ فرشتے شروع ہی سے مالک کی حضوری میں رہتے ہوئے اپنے انتہائی لطیف نفس کے ساتھ اپنے مالک کی حکم عدولی کا تصور بھی اپنے ذہن میں نہیں لا سکتے۔

اللہ تعالیٰ کی منصفانہ صفات پر غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو فوری طور پر سزا نہیں سنائی، بلکہ اسے اپنی صفائی کا موقع بھی دیا۔ اور اس کے لیے اسے باقاعدہ چارج شیٹ بھی دی اور پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ ابلیس نے اس چارج شیٹ کا جواب اپنی جہالت اور تکبر کی وجہ سے جاہلانہ دیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے چونکہ انسان سے اعلیٰ بنایا اس لیے وہ اس کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے۔ اس کا یہ جواب سراسر جہالت پر مبنی تھا، کیونکہ تخلیق کے اعتبار سے بھی وہ انسان سے اعلیٰ نہیں اور تخلیق کے بعد تربیت کے اعتبار سے بھی انسان ہی اعلیٰ ہے، کیونکہ بقول ابلیس وہ ناری مخلوق ہے اور انسان خاکی۔ تو اس جاہل کو یہ بھی علم نہ تھا کہ خاک فضیلت

میں نار سے اعلیٰ ہے، کیونکہ خاک نار کا حصہ نہیں بلکہ نار خاک کا حصہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے علم جہالت دینے کے بعد خود علم سکھایا لہٰذا آدمؑ کی برتری تو واضح ہو گئی۔ اور حقیقت میں یہ ابلیس کا امتحان تھا جو اس میں فیل ہو گیا اور ہمیشہ کے واسطے راندۂ درگاہ ہو گیا۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کا امتحان لینے میں بھی دیر نہ کی اور آدمؑ بھی اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کے مرتکب ہو گئے۔ لیکن آدمؑ کی عاجزی، انکساری، تابعداری اور اللہ کے دیے ہوئے علم کی وجہ سے انہیں اللہ کے عذاب سے بچا لی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کی معافی کے حقدار ہو گئے۔ جبکہ ابلیس اپنی جہالت اور تکبر کی وجہ سے اللہ کے عذاب کا مستحق ہو گیا۔ حالانکہ اسے موقع دیا گیا تھا اور اس وقت بھی وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اللہ کے عذاب کو رکوا سکتا تھا۔ لیکن وہ بدبخت اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے تکبر میں بڑھتا چلا گیا۔ پھر اس نے اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ وہ انسان کو بہکا سکے اور اسے یہ مہلت مل گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو اچھی طرح سے باور کرا دیا کہ ان میں سے جو بھی اللہ کی تابعداری اختیار کر کے اس کے احکامات کا پابند رہے گا وہ شیطان کے فریب میں نہ آ سکے گا۔ اور اس کے برعکس جو ایسا نہیں کر سکے گا پھر اس کا ٹھکانہ شیطان کے ساتھ جہنم میں ہوگا۔

لہٰذا شیطان نے اپنی اولاد کے ساتھ مل کر اپنا مقصد حیات بنا لیا کہ وہ انسان کو بہکائے گا اور اسے اس کی منزل کی راہ سے ہٹا دے گا اور اس کے لیے اس نے انسان کی انا اور تکبر کا سہارا لیا کیونکہ تکبر جہالت کے سبب انسانی قلب میں بسیرا کر لیتا ہے اور پھر انسان کو راہِ حق سے ہٹا کر راہِ ابلیس کی طرف لے جاتا ہے۔

اس صفت کے برعکس وہ لوگ جن میں تکبر کے بجائے تابعداری، عاجزی، علم اور ایمان ہوتا ہے اور وہ انہی صفات کے ساتھ اپنے رب کی حضوری میں پیش رہتے ہیں وہ اپنے رب کی ہدایت پاتے ہیں اور ابلیس کی شیطانی سے بچ جاتے ہیں۔

لہٰذا مختصراً عرض ہے کہ ہمیں اپنی ذات کو شیطانی ترغیب سے بچانے کے لیے اور اس طرح سے اللہ کے غضب سے بچنے کے لیے درج ذیل نسخے پر عمل کرنا ہوگا:

الف) شیطانی ترغیب سے بچنے کے لیے اللہ پر ایمان کامل رکھے۔

ب) اپنے آپ کو تکبر سے بچانے کے لیے کامل یقین کے ساتھ سر تسلیم خم کر لے۔

ج) اپنی جہالت دور کرنے کے لیے علم حاصل کرے وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو سکھایا تھا اور پھر پرہیزگاری اختیار کر لے۔

د) اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے پاکیزگی اور صبر کا سہارا لے۔

ہ) اپنی نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنے آپ کو پاک رکھے اور اگر پھر بھی ضرورت محسوس کرے تو روزہ رکھے۔

و) نا انصافی کا مرتکب ہونے سے بچے اور تقویٰ اختیار کرے اور اسوہ حسنہ کو اختیار کرے۔

(۲۱۴) شیطانی ترغیب کے تدارک کا محور

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ "ایمان" اور "علم" دو اہم عنصر ہیں تدارک کے برائی سے بچنے کے لیے۔ لیکن پھر بھی اگر غور کیا جائے تو تمام تدارک کا محور ایمان ہی ہے، جو شیطانی ترغیبات اور دوسری برائیوں کو روک سکتا ہے۔ ایمان کا مطلب ہے ایمان کامل، یعنی ایمان کی روح کو سمجھ کر اسے کامل طور پر اپنے نفس پر مسلط کر دینا، صرف اس طرح سے نہیں، کہ ہم صرف اعلان کر دیں کہ ہم ایمان والے ہیں یا مسلمان ہیں۔

اس سلسلے میں سورۃ الحجرات (۴۹) کی آیت (۱۴) میں فرمایا گیا:

"بدو کہتے ہیں: کہ ہم ایمان لے آئے، (ان سے) کہیں (اے محمدؐ) تم ایمان نہیں رکھتے۔ تم تو صرف کہتے ہو کہ ہم تابع ہوئے (اسلام کے)۔ اور ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ لیکن اگر تم اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی، تو وہ کچھ کم نہیں کرے گا انعام میں تمہارے اعمال میں سے اور اللہ تو بہت معاف کرنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے"۔

یہ آیت کریمہ ان جاہل بدوؤں کے طرزِ عمل کو بیان کر رہی ہے، جو صرف مسلمانوں کی مخالفت چھوڑ کر ان کے ساتھ مل گئے اور کہہ دیا کہ ہم بھی تمہاری طرح سے ایمان لے آئے اور مسلمان ہوگئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بس کہہ دینے سے کہ "میں مسلمان ہوں" کوئی بھی شخص مسلمان نہیں ہو جاتا۔ بلکہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے بعد تو وہ شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی غلامی کا جوا اپنے گلے میں ڈال کر مکمل طور پر ان کے احکامات کا تابع ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو کلی طور پر ان احکامات کے تابع کر دیتا ہے۔

اسی طرح سے آج اکیسویں صدی عیسوی کے مسلمان کا کردار بھی ان سوا چودہ سو برس پہلے والے بدو مسلمانوں سے بہتر نہیں ہے، یہ بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن کردار تو بہت دور کی بات انہیں یہ بھی علم نہیں کہ "مسلمان" کا مطلب کیا ہے اور ان کا ایمان بھی بدوؤں کے ایمان کی طرح کامل، نہیں کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت قرآن اور اقوالِ رسولؐ سے واقف ہی نہیں۔ اور جو کوئی قرآن کا مطلب جانتے بھی ہیں تو اس پر عمل نہیں کرتے اور ان کے علاوہ کروڑوں کی تعداد میں ایسے مسلمان ہیں، جو قرآن تو پڑھتے ہیں لیکن اس کا مطلب نہیں جانتے اور نہ ہی وہ اس کا مطلب جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے وہ تمام قوانین، رسم و رواج اپنا رکھے ہیں، جو زمانہ جاہلیت میں رواج تھے اور وہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکامات سے بےخبر اور بےپرواہ زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ بہت ہی شرم کی بات ہے کہ ابھی تک عورتیں اپنے باپوں، بھائیوں، چچاؤں اور خاوندوں کے ذریعے قتل کی جا رہی ہیں اور وہ اس قتال کو غیرت کا نام دیتے ہیں، حالانکہ وہ بےغیرتی کی ایک مکروہ شکل ہے۔ جب کہ حقیقت میں بےغیرتی اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی نافرمانی کرنا ہے۔ بچوں کو اغوا کر کے فروخت کیا جاتا ہے ان کو بھیک منگوانے کے لیے اپاہج کیا جاتا ہے اور ان کو عصمت فروشی کے لیے تیار کیا جاتا ہے ان کو لطف اندوزی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی بیٹیوں اور بہوؤں کو ان کے شرعی حقوق سے محروم رکھتے ہیں، ان کو قتل کر دیتے ہیں، ان کی جائیداد ہتھیانے کے لیے۔ کبھی ان کو قصاص اور دیت کے نام پر بیچا جاتا ہے کبھی قرض کے عوض انہیں پیش کیا جاتا ہے، کبھی انہیں کنیز بنا کر رکھا جاتا ہے۔

ایسے تمام مکروہ اور ظالمانہ جرائم پیشہ لوگ معاشرے کے مہذب لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس معاشرے کے لوگوں کے لیے جو یہ کام کرتے ہیں شرم کا مقام ہے اور ان کے لیے بھی جو اس ملک کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں اور باعث شرم ہے ان لوگوں کے لیے جو اس شرمناک کام کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھاتے۔ یہ تمام کے تمام لوگ شیطانی ترغیب سے ہی تو متاثر ہوتے ہیں یہ شیطان ہی کے تو پیروکار ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو عملی طور پر یہ ان بدو جاہلوں سے زیادہ جاہل اور زیادہ ظالم ہیں اور ایمان ان کے قلوب میں ابھی تک داخل تو کیا نزدیک ہی نہیں گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لیے اپنا فیصلہ سنا رکھا ہے جو نافرمان ہیں، متکبر ہیں، جاہل

ہیں اور ظالم ہیں وہ یا تو جانتے نہیں یا وہ پرواہ نہیں کرتے اور نظر انداز کرتے ہیں اللہ کے احکامات کو اور اس کے رسولؐ کے احکامات کو۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو وارننگ دی ہے کہ اب بھی ان میں اگر ذرہ برابر شعور ہے اس بات کو سمجھنے کا، کہ وہ کیا کیا نافرمانیاں کر رہے ہیں اور کیسے کیسے فتنے پھیلا رہے ہیں اللہ کی سرزمین پر، تو وہ اس سے باز آ جائیں اور اللہ کی طرف رجوع کر کے اس کی تابعداری اختیار کر لیں۔ ورنہ یہ موقع ان کے ہاتھ سے گزر جائے گا اور وہ شیطان کے ساتھ اس کے مکین بن جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے چند احکامات اس سلسلہ میں درج ذیل ہیں:

i) سورۃ الانعام (۶) کی آیت (۶۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"کہو (اے محمدؐ!) وہ (اللہ) طاقت رکھتا ہے، تم پر عذاب بھیجنے کی، تمہارے اوپر سے تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں وہ گھبراہٹ اور پریشانی میں ڈال دے اور فرقوں میں اور گروہوں میں تقسیم کر دے اور پھر تمہیں مزہ چکھائے ایک دوسرے کے تشدد کا (یعنی ایک دوسرے کی لڑائی اور قتال)۔ دیکھو کہ کس طرح سے ہم (اللہ) بیان کرتے ہیں اپنی نشانیاں اس لیے کہ وہ سمجھ جائیں"۔

ii) سورۃ الاعراف (۷) آیت (۳۳) میں بیان کیا جاتا ہے کہ:

"کہو (اے محمدؐ!) وہ چیزیں جو میرے رب نے بلاشبہ منع کی ہیں وہ ہیں "الفواحش" (یعنی تمام بیہودہ کام اور باتیں) خواہ وہ کھلے عام کیے گئے ہوں یا خفیہ طور پر۔ "گناہ" (ہر قسم کے)، "ناحق ظلم" (کسی کے ساتھ) اور "شرک" یعنی اللہ کی ذات، ملکیت اور حکومت میں کسی کو بھی شریک ٹھہرانا۔ جس کا اللہ نے تمہیں کوئی اختیار نہیں دیا اور اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی بات کرو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے"۔

iii) سورۃ الاعراف (۷) کی آیت (۳۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہ لوگ جو جھٹلا دیں ہماری آیات کو اور ان سے تکبر کر کے منہ پھیر لیں، وہ لوگ ہیں جہنم کے مکین اور وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے"۔

iv) سورۃ محمد (۴۷) آیت (۱۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"تو جو لوگ اپنے پروردگار کے واضح راستے پر ہوں کیا وہ ان کی طرح ہو سکتے ہیں جن کی بد

اعمالی انہیں بھلی معلوم ہوتی ہو اور جو اپنی نفسانی خواہشات پر چلتے ہیں"۔

v) سورۃ الزمر (۳۹) آیت (۵۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور اطاعت کرو اپنے رب سے آئے ہوئے اچھے اچھے احکامات کی، اس سے پہلے کہ اچانک تم پر اللہ کا عذاب آ جائے اور تمہیں اس کا گمان بھی نہ ہو"۔

vi) سورۃ الحشر (۵۹) آیت (۱۸) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کی تابعداری میں رہو۔ اور ہر کوئی شخص اس بات کی اچھی طرح سے خبر رکھے، کہ اس نے آخرت کے لیے کیا بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے جو تم کرتے ہو"۔

اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم تمام انسانوں کے لیے ہوتا ہے، لیکن وہ اشخاص جو اپنے آپ کو اللہ کے غلام کہتے ہیں انہیں اس بات کے لیے اور زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور احکامات کا بغور مطالعہ کریں اور پھر ان پر نہایت تابعداری کے ساتھ عمل پیرا ہوں۔ یہ بات بہت حیران کن ہے کہ تینوں بڑے مذاہب کے پیروکار یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ وہ اللہ کے احکامات کے سچے پیروکار ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے ہر کوئی اللہ کے سامنے اپنے اعمال کے بارے میں جواب دہ ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ کے احکامات سے نافرمان لوگ سزا کے مستحق ہوں گے۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ سنگین سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہے کہ لوگ فرقوں میں بٹ جائیں اور ایک دوسرے کے دشمن بن کر ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں۔

آپ ذرا ایک لمحے کے لیے غور تو فرمائیں کہ کون سی قوم یا اقوام اللہ کے عذاب میں مبتلا نظر آتی ہیں یا ماضی قریب میں نظر آئی ہیں، جنہوں نے ایک دوسرے کا قتال کیا۔ کیا ہمیں اس بات کا یا اس حقیقت کا ذرہ برابر بھی احساس ہے کہ گزشتہ صدی یعنی بیسویں صدی عیسوی میں کتنی اقوام نے آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کے کتنے نفوس قتل کیے اور کیوں کیے؟ کیا یہ معاملہ ایسا نہیں کہ اس کی وجہ پر غور کیا جائے۔ بے شک اس وقت کے دانشوروں نے یہ کوشش کی تھی کہ ان اقوام کے معاملات طے ہو جائیں، تاکہ جنگ کی مصیبت سے بچا جا سکے لیکن کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے بعد "لیگ آف نیشن" کا

قائم عمل میں لایا گیا جس میں ڈیڑھ کروڑ افراد قتل ہوئے تھے لیکن یہ لیگ ان معاملات کو حل نہ کرسکی آئیے ہم دیکھتے ہیں کہ اولادِ آدم نے اپنے کتنے بھائی بہنوں کو قتل کیا۔ چند مثالیں ملاحظہ کے لیے پیشِ خدمت ہیں:

۱)	جنگِ عظیم اول (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء)	۱۵۰ لاکھ
۲)	روس کی سول وار (۱۹۱۷-۱۹۲۰ء)	۹۰ لاکھ
۳)	روس لینن کی حکومت (۱۹۲۴-۱۹۵۳ء)	۲۰۰ لاکھ
۴)	جنگِ عظیم دوئم (۱۹۳۷-۱۹۴۵ء)	۵۵۰ لاکھ
۵)	جنگِ عظیم دوئم میں جرمن بمباری سے قتل ہوئے	۲۱ لاکھ
۶)	چین سول وار (۱۹۴۵-۱۹۴۹ء)	۲۵ لاکھ
۷)	ریپبلک آف چائنا (۱۹۴۹-۱۹۷۵ء)	۴۰۰ لاکھ
۸)	امریکہ میں قتل ہوئے (۱۹۱۵-۱۹۲۳)	۱۵ لاکھ
۹)	کوریا (۱۹۵۳ - ۱۹۵ء)	۲۸ لاکھ
۱۰)	نارتھ کوریا (۱۹۴۸-۱۹۸۷ء)	۱۲،۲ لاکھ
۱۱)	افغانستان جنگ (۱۹۷۹-۲۰۰۱ء)	۱۸ لاکھ
۱۲)	ایران-عراق جنگ (۱۹۸۰-۱۹۸۸ء)	۱۰ لاکھ
	کل میزان	۱۵۲۳،۲

خیال رہے کہ یہ بہت ہی معمولی مثالیں ہیں ورنہ قتل تو چار ارب سے زیادہ ہوئے ہیں، گذشتہ صدی میں اور ابھی تک ہو رہے ہیں۔

جب لیگ آف نیشن کسی خاطر خواہ کارکردگی کو حاصل نہ کرسکی تو اس کا خود بخود خاتمہ ہوگیا اور پھر جنگِ عظیم دوئم کے بعد ایک اور تنظیم امن قائم کرنے کی غرض سے یو این او کے نام سے قائم ہوئی جو ابھی تک قائم ہے لیکن اس تنظیم کو چونکہ چند طاقتور اقوام نے قائم کیا تھا اور جو نہ ان ہی کے رحم و کرم پر ہے۔ اس لیے یہ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کے لیے کچھ نہ کرسکی۔ ہاں جہاں ان بڑی اقوام کا کوئی مفاد ہوتا ہے یہ تنظیم فوراً متحرک ہو جاتی ہے ورنہ اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کمزور اقوام کو جینے کا حق ہی حاصل نہیں اور طاقتور

ہمیشہ کمزوروں پر حکومت کرتا رہے گا اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ طاقتور اقوام کا یہی رویہ رہا ہے۔

یہ ظلم اور بربریت دنیا میں اس وقت تک قائم رہے گی جب تک کہ انسانی معاشرہ خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو، وہ معاشرتی نظام قائم کرنے کے لیے اللہ کے احکامات کی پابندی نہیں کرے گا۔ جیسے ہی کوئی معاشرہ الہامی قوانین کو معاشرتی طور پر لاگو کر دیتا ہے، وہاں امن و چین قائم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بنیادی معاشرتی قوانین اولادِ آدم کے درمیان محبت، امن اور بھائی چارہ کا درس دیتا ہے۔ جب تک ان قوانین کا احترام نہیں کیا جاتا امن قائم نہیں ہوگا۔ بلکہ ان پر اللہ کا غضب نازل ہوتا رہے گا اور وہ غضب بے چینی، بربادی اور قتل و غارت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تنبیہہ بھی اولادِ آدم کو کر دی ہے۔

اس سلسلے میں قرآن حکیم کی سورہ الانعام (۶) آیت (۷۰) میں فرمانِ ربی ہے کہ:

"اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنا رکھا ہے اور جن کو دنیا کی اس زندگی نے دھوکے میں رکھا ہے، لیکن انھیں یاد کراتے رہیں اس (قرآن) کے ذریعے سے کہ ڈر یں اس بربادی سے جو ان کے اعمال کے نتیجے میں آنے والی ہے جہاں وہ کوئی مددگار یا سفارشی نہ پائے گا سوائے اللہ کے۔ اور اس وقت اگر وہ کوئی معاوضہ اس سے بچنے کے لیے دینا بھی چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ یہی لوگ ہوں گے جو بربادی کی طرف دھکیلے جائیں گے اس وجہ سے کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہوگا۔ ان کے لیے ہوگا کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب کیونکہ وہ تھے اللہ کے نافرمان"۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ قتل و غارت جو انسانی معاشروں میں ایک دوسرے کا ہوتا ہے پایا کیا جاتا ہے وہ ان کی جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے اور جہالت ہی کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے غفلت برتتے ہیں اور پھر تکبر میں آکر ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۶۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"پس پھر ہم نے اس سزا کو بنا دیا ایک عبرت کا نشان ان کی قوم کے لیے اور ان کی آنے والی نسلوں کے لیے بھی اور نیک لوگوں کے لیے بھی نصیحت کا سبب بنایا"۔

یہ آیت اس آیت کے بعد کی آیت ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ جب اہلِ یہود (کے گروہ) نے اللہ تعالیٰ کی کھلی نافرمانی کی تو انھیں سزا کے طور پر بندر بنا دیا گیا تھا۔

لیکن ہماری مہذب دنیا اور خاص طور پر وہ لوگ جو اپنے آپ کو اللہ کے غلام اور اللہ کے تابعدار بندے کہلواتے ہیں انہوں نے ابھی تک کسی بھی اللہ کے عذاب سے کوئی سبق نہ سیکھا اور خاص طور پر جبکہ پچھلی صدی عیسوی اولادِ آدم کے قتال سے بھری ہوئی ہے اور جس میں چار ارب سے زیادہ مخلوق قتل کی گئی۔ اور یہ لوگ ابھی تک ویسے ہی ایک دوسرے کی قتل و غارت میں مشغول ہیں، وہی جہالت، وہی تکبر اور وہی نافرمانی اور وہی بے ایمانی، جھوٹ، بے رحمی، ظلم اور ناانصافی کا دور دورہ ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے وہ آنے والے عذاب سے بے خبر ہیں، جو ان سے چند قدم کے فاصلے پر ہے اور ان پر نشانہ لگائے بیٹھا ہے۔

(۲۱۴) شیطانی پنجے سے بچنے کے لیے علم حاصل کرو

ایسا علم جو ہمیں مدد دیتا ہے، ایک اچھا انسان بننے کے لیے اور ہمیں شیطانی چنگل سے بچنے میں مدد دیتا ہے، وہ علم ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے انبیاء کے ذریعے ملا ہے۔ اس علم کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور اس سے فائدہ حاصل کرنا ہر انسان پر فرض ہے تاکہ وہ شیطانی ہتھکنڈوں سے بچ جائے۔

اس قسم کا علم پہلے بیان تو کیا جا چکا ہے لیکن یہاں اس کا خلاصہ بیان کر دینا ضروری سمجھا گیا۔ انسان کو دیگر مخلوق سے اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل کرنے کی غرض سے ہمیں وہ علم حاصل کرنا ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص انسانوں پر انسانوں کے واسطے الہام فرمایا اور اللہ نے وہی علم الہام فرمایا جو انسان کے لیے ضروری سمجھا کہ وہ اس علم کے ذریعہ سے اپنے آپ کو شیطان کی دشمنی اور سازشوں سے بچا سکے گا۔

اس علم کا نزول اس وقت انسان پر شروع ہوا جب آدمؑ اور حواؑ شیطان کی گرفت میں آ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف عمل کر بیٹھے۔ اس وقت جب آدمؑ کو یہ احساس ہوا کہ اس نے تو ایسا کام کر لیا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو گئے ہیں تو وہ فوراً خوف اور شرم کی حالت میں آ گیا اور اللہ کے حضور نادم ہو گیا۔ لیکن آدمؑ کو یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا، کہ وہ اپنے رب سے کیسے معافی مانگے اور اس کو کس طرح سے راضی کر لے۔ آدمؑ کی یہی عجز و انکساری و شرمساری اور ندامت اللہ تعالیٰ کو پسند آ گئی اور اس کی معافی کا باعث بن گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آدمؑ

پر اپنا پہلا الہام عطا فرمایا اور وہ الفاظ سکھائے جو معافی اور توبہ کے تھے۔ اس کے بعد آدمؑ کو زمین پر بھیج دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ زمین پر تمہاری اور تمہاری اولاد کی آزمائش ہوگی اور جو کوئی بھی اس میں پورا اترے گا وہ واپس اپنے مقام جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ لہٰذا وہ سلسلہ الہام جو جنت میں حضرت آدمؑ پر شروع ہوا تھا وہ ان پر زمین پر بھی جاری رہا اور پھر ہر نبی پر بھی الہام کے ذریعے ہدایت کا سلسلہ جاری رہا، تاکہ انسان ابلیس کی گمراہی سے بچ سکے اور آخر کار یہ الہامی سلسلہ عالی جناب محمدؐ پر مکمل ہوا اور اب قیامت تک کے لیے اہل انسان کے لیے وہ ہدایت کافی رہے گی۔

(الف) سائنس کے اصولوں پر مبنی علم:

تخلیق آدمؑ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے وہ علم عطا فرمایا جس کی بنیاد سائنس پر تھی۔ یعنی سائنسی اصول آدمؑ کو سکھائے گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علوم اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی جین (Jene) میں ڈال دیے، جو اولادِ آدمؑ میں تسلسل کے ساتھ منتقل ہو رہے ہیں۔ اس جین کے خواص کو جب کوئی آدمؑ کا بیٹا کوشش کر کے اپنی ذہنی مشق میں لاتا ہے اور اللہ کی قدرت سے اسے سازگار ماحول بھی میسر آ جاتا ہے تو اس مدفون خزانے میں سے یعنی جین سے وہ علم اس شخص پر افشاں ہو جاتا ہے۔ یہ عمل صرف اس وقت ظہور پذیر ہوتا ہے کہ جب زمانے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے دنیا کا ماحول بھی سازگار ہوتا ہے جیسا کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ دنیا میں سائنسدان، فلسفی، سیاسی لیڈر، مصلح، مفکر وغیرہ ہمیشہ نہیں پیدا ہوتے۔ لیکن ان سے متعلق علوم یعنی سائنس، فلسفہ اور دیگر ہر قسم کے علوم ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ آدمؑ کو فرشتوں پر جو عزت عطا ہوئی اور جس کی بنا پر فرشتوں کو آدمؑ کے روبرو جھکنا پڑا، اسی طرح سے وہ قومیں یا اقوام وہی علم حاصل کر لیتی ہیں جو آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔ پھر ان اقوام کو دوسری تمام اقوام پر فضیلت اور برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو اقوام ان علوم سے محروم رہ جاتی ہیں وہ زمانے کی ذلت اور پستی میں گم ہو جاتی ہیں۔

(ب) اخلاقی اصولوں پر مبنی علم:

اس قسم کے علم کے ذریعے سے انسان اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ اس کا درجہ حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانوں کی سطح پر آ جائے، ورنہ وہ حیوانی سطح پر ہی رہتا ہے بلکہ اس کی اقدار

حیوانات سے بھی پست درجے پر چلی جاتی ہیں۔ یہ علم انسان کو اس قابل بھی بناتا ہے، کہ وہ انسان میں سے ان خواص کو دور کر دے جن کی وجہ سے وہ خواص ان کے کردار کو داغدار کرتے ہیں اور انہیں انسان بننے سے روکتے ہیں۔ یہ علم بالکل اسی طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں، جیسا کہ انسانی خون میں اچھا کولیسٹرول برے کولیسٹرول کو کم کرتا ہے۔ اس قسم کا علم بھی الہامی اصولوں سے سیکھا جاتا ہے اور یہ علوم بھی بتدریج انسانی تاریخ کے پورے دور میں نازل ہوتے رہے ہیں یعنی آدمؑ کے دور سے لے کر جناب محمدؐ کے دور تک۔

ان الہامی اصولوں کی بنا پر انبیاء کے گروہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ اپنے دیگر بندوں کو بھی یہ شرف عطا فرماتا ہے، کہ وہ عوام الناس میں اخلاقی علم پھیلاتے رہیں اور تسلسل کے ساتھ اخلاقیات کا درس دیتے رہیں۔

(ج) دینی مشقیں:

علم کا تیسرا رکن یا ذریعہ جو ضروری سمجھا گیا ہے وہ ہے جس کے ذریعہ سے انسان شیطانی وسوسے اور ذہنیات سے بچ سکتا ہے اور وہ طریقہ ہے ایسی دینی مشقوں کا اپنانا، جو انسان کو اس قابل بناتی ہیں یا بنانے میں مدد دیتی ہیں کہ انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی حضوری میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ پیش کرے تا کہ اس ذریعہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی قربت اور محبت حاصل کر سکے۔

حقیقت یہی ہے کہ ہمارے پاس صرف ایک ہی ذریعہ ایسا ملتا ہے جو ہمیں شیاطین کی گرفت سے بچا سکتا ہے اور وہ ہے قرب سبحانہ تعالیٰ۔ کیونکہ اس حالت میں شیطان کی رسائی انسان تک ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ اس علم کو آپ مذہبی عبادات اور مشقوں سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور اس میں عام دینی عبادات اور قوانین کی پابندی کے علاوہ صوفیانہ مشقیں بھی شامل ہوتی ہیں اس علم سے ہماری روحانی سطح بلند ہوتی ہے اور یہ علم بھی ہمیں انبیاء ہی سے ملتا ہے۔

ماخذ:

درج بالا اصولوں کا ماخذ یہ نکلتا ہے کہ عوام الناس کی زیادہ تعداد ان علوم کے پہلے درجے میں کمال حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ صرف وہی لوگ اس میدان میں آگے نکلتے ہیں جن میں خداداد صلاحیتیں موجود ہوں یا ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا گیا ہو۔ لیکن ہر انسان کے لیے یہ تو ضروری ہے کہ وہ اتنا علم ضرور حاصل کر لے کہ اپنے آپ کو انسانیت کے درجے

تک لے جائے جس کے لیے اسے خود اپنی نچلی سطح کے جانوروں کی خصوصیات کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ اس واسطے اس شخص کو کم از کم اتنی صلاحیت ضرور حاصل کر لینی چاہیے کہ وہ صحیح اور غلط، اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کر سکے۔ وہ پاکی اور ناپاکی، حلال اور حرام کے درمیان فرق کر سکے تا کہ وہ الہامی نصیحتوں اور شیطانی وسوسوں کے درمیان تمیز کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہ بہت ہی ضروری اور اہم عنصر ہے یہ جاننے کے لیے کہ اس کا بنیادی مقصد اس دنیا میں جنم لینے کا یہ ہے کہ وہ اپنے رب کو راضی کر لے اور اپنے آپ کو شیطانی گرفت سے دور رکھے اور اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کر لے۔

(۲۱۴) انسان کو ہمیشہ کی محبت اور اطمینان کیسے مل سکتا ہے

انسان کی زندگی کا مقصد ہمیشہ کی محبت، امن اور اطمینان حاصل کرنا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے، کہ ہم اپنے طرز عمل، برتاؤ اور کردار کو ایسی ہنرمندی اور مہارت کے ساتھ اس راہ پر لے آئیں جو ہمیں اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے میں مدد کرے اور ساتھ ہی ہمیں خود اپنی ذات کے شر اور شیطانی شر اور وسواس سے بچائے رکھے۔ چنانچہ ہمیں اپنے نفس کو اس راہ پر گامزن کرنے کے لیے ایسے ہنر اپنانے پڑیں گے اور اپنے نفس کا جائزہ لینا ہو گا تا کہ نفس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کے تابع کر کے اسے راہ مستقیم پر گامزن کر سکیں۔ آیئے ہم اپنے نفس کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

(الف) جہالت کا عنصر:

پہلے انسان کو جان ہی لینا ہو گا کہ جہالت ایک ایسا عنصر ہے جس کی وجہ سے ابلیس نے اپنے رب کے غصے کو دعوت دی اور اس جہالت کی وجہ ہی سے ابلیس نے اپنے نفس میں تکبر، غصہ، اور انتقام کے بیج بوئے۔ جب اس نے ان عناصر کا نتیجہ اپنی ذلت اور بدبختی کی صورت میں دیکھ لیا تو اس پر واضح ہو گیا کہ یہی عنصر ایسے ہیں جو کسی کی بربادی کا سبب بن سکتے ہیں۔ لہٰذا اس نے یہی عناصر استعمال کیے اپنے سب سے بڑے اور کھلے دشمن آدم اور اس کی اولاد کو برباد کرنے کے لیے۔

لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ زمانے بھر کے مفکر مثلاً سقراط، افلاطون، ارسطو، ڈیکارٹ، نطشے،

کانٹ، برگسان اور ایسے ہی سینکڑوں لوگ علم کے سفر کے طے کرنے کے بعد بھی الہامی علوم سے محروم رہے اور انہوں نے کبھی تکلیف گوارا نہ کی کہ وہ ایک نظر ادھر بھی ڈال لیتے۔ اسی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکے یہ جاننے کے لیے کہ آخرکار انسانی تخلیق کا مقصد کیا تھا۔ اور ان کی اپنی زندگی کا بھی کیا مقصد تھا؟ ان مفکروں نے مابعد الطبعیاتی معاملات پر بھی غور کیا اور اپنی بنیادی زندگی کے مقصد پر بھی غور و خوض کرتے رہے۔ لیکن انہیں اپنی آخرت کی فکر نہ رہی اس لیے انہوں نے اپنی زندگی کے مقصد کا محور بھی اپنی زندگی کو ہی رکھا۔ جبکہ الہامی علوم ہماری زندگی کے مقصد کا محور آخرت بتاتے ہیں اور زندگی میں ہر تیاری کے لیے یوم آخرت کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کے سوچتے ہیں۔ یہ مفکر خدا کے وجود کے بارے میں تو سوچتے ہیں، لیکن رسالت کی فکر نہیں کرتے، اسی لیے انہوں نے رسالت سے کوئی فائدہ حاصل نہ کیا۔ چنانچہ وہ مقصدیت کے اعتبار سے اس بعد کی روحانی طاقت اور اس کی عقل اور سوچ کی خاک تک بھی نہ پہنچ سکے جو چند لمحات میں اپنی روح کو بہت بلند مقام تک لے گیا۔ تاریخ میں ایسی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ مفکر صرف انہی محرکات کا جائزہ لے سکے جو سائنسی ریکارڈ میں دستیاب تھے، اسی لیے کچھ نے کہا کہ انسانی زندگی کا مقصد صرف "زندہ رہنے کی خواہش" ہے۔ کسی نے کہا "موجود رہنے کی خواہش"۔ کسی نے کہا "حکومت کرنے کی خواہش" اور کوئی تنہائی کی جانب راہ فرار اختیار کر گیا اور کسی نے اپنے نفس پر سختی کی اور تکلیف دہ تجربات کی جانب راغب ہو گیا اور کسی نے نفس کشی کی کوشش کی اور کسی نے سقراط کی طرح یہ کہا کہ "میں تو کچھ نہیں جانتا اور بس یہی میرا علم ہے" اور کسی نے برگسان کی طرح سے ادراک کا سہارا لیا۔ لیکن ان کی بے وقوفی کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ الہام کے دریچے کھول کر اس کے اندر کے خزائن پر نظر نہ ڈال سکے۔ اسی لیے وہ اس بات میں کامیاب نہ ہو سکے کہ انسانی تخلیق کے مقاصد کو صحیح طور پر پہچان سکیں اور نہ ہی انہوں نے زندگی کے مقاصد کو جانا۔

کانٹ نے محض یہ فرض کر لیا کہ ہمیں خدا کے وجود کو تسلیم کر لینا چاہیے، ورنہ ہم اخلاقی اقدار حاصل نہ کر سکیں گے، لیکن اس نے بھی کبھی خزینہ الہام کی طرف توجہ نہ کی، جس کی بنیاد ہی اخلاقیات پر ہے۔ الہامی علم کا جاننا انسان کے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ تخلیق انسان کا مقصد اور اس کو زمین پر بھیجنے کا مقصد سوائے اللہ کی ذات کے جو خالق ہے اور کسی کو معلوم ہو ہی

نہیں سکتا۔ ایک میز یہ نہیں بتا سکتی کہ بڑھئی نے اسے کیوں بنایا ہے؟ اس کے لیے میز کو بڑھئی ہی بتا سکتا ہے کہ اسے کس غرض کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشا تخلیق انسانی کے بارے میں معلوم ہونی چاہیے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کے پاس ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھیجے تاکہ وقتاً فوقتاً وہ ہر زمانے میں ہر قوم کو یہ بتا سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کیوں پیدا فرمایا اور وہ ان سے کیا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی جہالت دور کرنے کے لیے علم حاصل کریں اور اپنے اندر انسانیت کی تکمیل کر لیں جو فرشتوں سے بھی زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ ورنہ ہم اپنی شخصیت کو کم ترین درجے پر لے جائیں گے اور زیادہ تر تو اپنی سطح کو جانوروں کی سطح سے بھی کم مقام پر لے جا چکے ہیں، اگر غور کیا جائے تو نباتاتی اور مادی مخلوق کے درجے سے بھی کم۔ اس سلسلے میں ایک بہت چھوٹی سی مثال پیش خدمت ہے وہ یہ کہ مادی اور نباتاتی مخلوق اللہ کے حضور سجدہ کرتی ہے، اس کی تسبیح کرتی ہے، اگر انسان اشرف المخلوقات ہو کر بھی یہ کام نہیں کرتا تو کیا وہ مادی اور نباتاتی مخلوق سے کم تر نہیں؟

(ب) تکبر کا عنصر:

تکبر کا سب سے بڑا سبب جہالت ہوتی ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جہالت سب سے پہلے تکبر کو فروغ دیتی ہے اور جہالت تمام برائیوں کی ماں ہے۔ یہ وہ عنصر ہے جس کی وجہ سے ابلیس خود اپنے ہی جال میں پھنس کے رہ گیا کیونکہ اس کی جہالت ہی وجہ بنی اس کے تکبر کی اور پھر اس نے اپنے مالک کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لیے انسان کے لیے شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ یا ناپسندیدہ فعل تکبر ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شرک بھی جہالت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے متکبر انسان کے بارے میں سورۃ الحج (۲۲) آیت (۹) میں فرمایا ہے کہ:

"غرور میں اپنی گردن اکڑاتے ہوئے اور دوسروں کو بھی ساتھ لے کر اللہ کی راہ سے پھرتے ہیں اس کے لیے تیار ہے ذلت اس دنیا میں اور روز قیامت اور ہم چکھائیں گے اسے مزہ جلتی ہوئی آگ کا"۔

جناب عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے، اسے مسلم نے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "جس کے دل میں ذرہ برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا"۔

جناب رسول اللہؐ کے اس قول کو سن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ: "اگرچہ کہ ایک شخص اپنے

لباس کو پسند کرتا ہو کہ وہ خوبصورت ہو اور اس کے جوتے بھی''۔

اس پر جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ: ''بے شک اللہ سب سے زیادہ خوبصورت ہے اور وہ خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔ جبکہ غرور سچائی کی پرواہ نہیں کرتا اور لوگوں کی بے عزتی کرتا ہے''۔

امام مسلمؒ نے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہؐ کا ایک قول جس میں آپؐ نے فرمایا کہ: ''اللہ نے مجھ پر واضح کیا ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھنا چاہیے اور کسی کو کسی پر فخر نہیں کرنا چاہیے اور نہ کسی کو کسی سے زیادتی کرنی چاہیے''۔

بخاری اور مسلم نے ایک اور حدیث رسول اللہؐ قلمبند کی ہے، کہ فرمایا جناب رسول اللہؐ نے ''کیا میں تمہیں ایسی بات کی خبر نہ دوں جس سے پتا چلے کہ دوزخ کے رہنے والے کون ہیں؟ وہ ہیں نہایت سخت مزاج، بے صبرے اور مغرور شخص''۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جناب ابوہریرہؓ ایک دفعہ بازار سے واپس جا رہے تھے اور انہوں نے لکڑیوں کا ایک گٹھر اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا تھا جبکہ وہ مدینہ میں مروان کے مقرر کردہ گورنر تھے اور وہ کہتے ہوئے جا رہے تھے کہ ''گورنر آ رہا ہے اس کو راستہ دو تا کہ اسے آسانی ہو جائے لکڑیوں کا گٹھر لے جانے کے لیے''۔

پس یہاں یہ ذکر کرنا مقصود تھا، کہ تکبر وجہ بنتا ہے اللہ کے غصے کا اور متکبر کو سچائی سے دور رکھتا ہے۔ یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہی موزوں ہے جو بڑی شان والا ہے، جاہ و جلال والا ہے، تمام قوتوں کا منبع ہے جو قابل عزت و احترام ہے، مالک ہے کائنات کا اور جو کچھ بھی اس میں ہے۔

(ج) اللہ کی تابعداری اور اس پر بھروسہ:

تابعداری اور عاجزی کے مارے تکبر اور غرور کے عنصر کے مخالف ہیں اور جب کہ ہمیں اپنے سب سے بڑے دشمن ابلیس کا سامنا رہتا ہو تو ہمیں اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ ہم ہمیشہ اللہ کی پناہ میں رہیں کیونکہ ہم تنہا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اللہ چونکہ ہر وقت و ہر جگہ اور ہر ایک کو اپنی دسترس میں رکھتا ہے اور ہر شے پر حکمرانی اسی کی ہے، اس لیے ہمیں اس کی محبت اور قربت حاصل کرنی چاہیے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے جتنا ہم اس کا ذکر کریں گے اپنی انتہائی عاجزی اور انکساری کے ساتھ اتنا ہی ہم اس کے نزدیک ہوتے چلے جائیں گے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جو کچھ بھی موجودات میں ہے یعنی: ''ساری اور تمام باقی مخلوقات، کیڑے مکوڑے اور جانور، جنات اور فرشتے، وہ سب کے سب تابع ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں اللہ کے حضور اور بیان کرتے ہیں اس کی بڑائیاں اور اس کی تعریفیں۔ تو پھر اس کی سب سے زیادہ علم رکھنے والی مخلوق جسے اس نے اپنی نیابت عطا فرمائی زمین پر جہاں وہ ہر دوسری مخلوق پر حکمرانی کرتا ہے کیا اسے اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی، کہ وہ اپنے مالک کی بڑائیاں بیان کرے اور اس کے سامنے اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتا ہوا اس کے سامنے جھک جائے اور سجدہ ریز ہو کر اسے اپنا معبود اور خود کو اس کا غلام بنا کر پیش کرے اور اس کی عنایتوں، نعمتوں اور اس کی مہربانیوں کا شکر ادا کرے۔

اس سلسلے میں سورۃ النحل (۱۶) آیت (۵۰۔۴۹) میں مالک کل نے فرمایا ہے کہ:

''اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں وہ تمام جو ہیں آسمانوں میں اور وہ تمام جو ہیں زمین پر۔ ان میں سے ہیں حرکت کرنے والی مخلوقات اور فرشتے اور وہ ذرہ برابر بھی تکبر نہیں کرتے۔ وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو ان پر مسلط ہے اور وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے''۔ (السجدہ)

اس کے علاوہ سورۃ الحج (۲۲) کی آیت (۱۸) میں بیان کیا جا رہا ہے کہ:

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو کوئی بھی ہے آسمانوں میں اور جو کوئی بھی ہے زمین پر اور سورج اور چاند، اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور دواب (تمام جگر والے جانور) اور بہت سارے انسانوں میں سے، سجدہ میں چلے جاتے ہیں اللہ کے سامنے لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر سزا واجب ہے اور اللہ جسے بے عزت کرنا چاہے، اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا۔ بے شک اللہ کرتا ہے جو وہ چاہے''۔ (یہ آیت سجدہ ہے اس کے پڑھنے کے بعد سجدہ واجب ہے)

یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ سجدہ تو ایسا فعل ہے کہ اس کے بغیر تو کوئی چارہ ہی نہیں۔ لیکن انسان کے لیے محض سجدہ کر لینا بالکل کافی نہیں۔ یعنی انسان کا اللہ کے حضور سجدہ کر لینے سے اس کی تابعداری کا عمل پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تو تابعداری کا اظہار ہے اور تابعداری کا صرف ایک پہلو ہے اللہ تعالیٰ تو انسان سے مکمل تابعداری چاہتا ہے یعنی کہ اللہ کے ہر حکم کی تہہ دل سے تعمیل کرنا۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کی چند آیات درج ذیل ہیں:

i) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۱۳۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''کہیں (اے محمدؐ!) ہم ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور جو کچھ اتارا ہے ہمارے اوپر (یعنی الہامی حکم) اور جو کچھ اتارا گیا ابراہیمؑ پر، اسماعیلؑ پر، اسحاقؑ پر، یعقوبؑ پر اور یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں کی اولاد پر اور جو کچھ موسیٰؑ کو دیا گیا (تورات) اور عیسیٰؑ (انجیل) اور جو کچھ دیا گیا انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اس (اللہ) کے تابعدار اور مطیع ہیں''۔

ii) سورۃ النساء (۴) آیت (۱۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور جو کوئی بھی نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور ان کی بتائی ہوئی حدود کو نظر انداز کرے گا تو وہ (اللہ) انہیں ڈال دے گا (جہنم کی) آگ میں۔ ہمیشہ رہنے کے لیے اور اس کے لیے دردناک عذاب ہوگا''۔

جب اللہ کا کوئی غلام اپنے آپ کو اللہ کی غلامی میں پیش کر دے ہر طرح سے تو پھر اس پر فرض بنتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل توکل بھی کرلے اور کسی ماسوا اللہ کی طرف امید لگا کر نہ بیٹھے۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات قابل غور ہیں:

i) سورہ المائدہ (۵) آیت (۲۳) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اللہ پر ہی بھروسہ رکھو اگر تم واقعی سے اس پر ایمان رکھتے ہو''۔

ii) سورۃ آل عمران (۳) آیت (۱۷۳) میں کہا گیا ہے کہ:

''انہوں نے کہا اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہی سب کاموں کے سپرد کرنے کے لیے بہتر ہے''۔

iii) سورۃ آل عمران (۳) آیت (۱۵۹) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں''۔

پس ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی تابعداری اور اس پر بھروسہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ اللہ ایسے شخص کو پسند فرماتا ہے اور اس شخص میں عاجزی کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے اور تکبر اس سے دور ہو جاتا ہے اور اس طرح انسان شیطانی ترغیب سے بچ جاتا ہے۔

(د) تقویٰ و پرہیزگاری کا اختیار کرنا:

عام طور پر لفظ ''تقویٰ'' کا ترجمہ ''اللہ کا خوف'' کیا جاتا ہے اور ''پرہیزگاری'' بھی کیا جاتا

ہے لیکن اگر اس لفظ کا ذرا غور کے ساتھ مطالعہ کریں تو اس کا مطلب ہوگا کہ:

''اللہ کی محبت حاصل کرنے کی خاطر جدوجہد کرنا، اس کے تمام احکامات کی تکمیل و تابعداری کرے اور اس تابعداری میں ایسا خوف شامل کرنا کہ کہیں اللہ ہمارے کسی کام کی وجہ سے ناراض نہ ہو جائے''۔

آیئے دیکھیں کہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا کیا فرمان ہے:

i) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۱۷۷) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''یہ تقویٰ نہیں ہے کہ تم اپنے منہ کو مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو (صلوٰۃ میں) بلکہ ایمان والوں کی صفت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف اللہ پر ایمان لائیں (اس کی مکمل حاکمیت میں) اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر (کہ وہ اللہ کی تابعدار مخلوق ہیں) اور کتابوں پر (جو پیغمبروں پر نازل کی گئیں) اور پیغمبروں پر اور وہ اپنی دولت خرچ کریں (اللہ کی خاطر) جس سے انہیں بے حد محبت ہے اپنے خاندان والوں پر، یتیموں پر، غرباء پر، مسافروں پر، اور ان پر جو سوال کرتے ہیں اور غلاموں کو آزاد کروانے پر اور ادا کرے صلوٰۃ (پانچوں وقت) اور ادا کرے زکوٰۃ (مقرر کردہ) اور پورا کرے اپنے وعدوں کو (جو وہ کرتے ہیں) اور جو صبر اختیار کرتے ہیں غربت میں اور بیماری میں اور لڑائی (جہاد) میں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں اور یہی ہیں متقی''۔

ii) سورۃ النساء (۴) آیت (۳۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک مت کرو اور بھلائی کرو والدین کے ساتھ، خاندان والوں کے ساتھ، یتیموں، غریبوں، پڑوسیوں کے ساتھ اور جو تمہارے قرابت دار ہوں اور ان پڑوسیوں کے ساتھ جو اجنبی ہوں اور تمہارے ساتھ والے ہمسائے اور مسافر (جو تمہیں سفر میں ملیں) اور وہ غلام یا لازم جو تمہارے ماتحت ہوں۔ بے شک اللہ پسند نہیں فرماتا ایسے لوگوں کو جو تکبر کرتے ہیں اور شیخی خورے اور غرور کرنے والے ہوں''۔

iii) سورۃ النحل (۱۶) آیت (۹۰) و (۹۱) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے انصاف کا اور صبر کا اور گھر والوں کی مدد کا اور منع فرماتا ہے برائی

سے اور بے شرمی اور بیہودہ کاموں اور ہر اس بات سے جو منع کی گئی ہو اور ہر قسم کے ظلم سے۔ وہ متنبہ کرتا ہے تمہیں کہ تم توجہ دو اور پورا کرو، اپنے وعدے کو جو تم نے اللہ سے کیے ہوں اور اپنی قسموں کو نہ توڑو جبکہ تم نے اللہ کو ضامن بنایا ہو، ان کے لیے۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو"۔

(د) تجدید ایمان:

تجدید ایمان تو بعد کی بات ہے اس سے پہلے تو یہ جان لینا ضروری ہے کہ ایمان ہے کیا چیز؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ ایمان کا مطلب ہے کہ کسی بات کا اپنی زبان سے اقرار کرنا اور اس بات کا دل کی گہرائیوں سے یقین کرنا اور اس پر عمل کرنا اور اپنے قول و فعل میں اس بات کو جاری و ساری کرنا۔ اس کا اظہار کرنا، اس کو باور کرانا، کہ آپ اس بات پر عمل پیرا ہیں جس کا اقرار یا اعلان اپنی زبان سے کرتے ہیں۔

اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ، پیغمبر، قرآن، قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تو اس بات کا کوئی مطلب بھی ہوتا ہے اور اسی مطلب کو عقیدہ کہتے ہیں۔ یوں تو ہر کوئی یعنی ہندو، عیسائی، یہودی اور مسلمان وغیرہ سب اللہ کی حاکمیت تو تسلیم کرتے ہیں اقرار بھی کرتے ہیں، لیکن ان کے قول اور اقرار کا مطلب علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سے کروڑوں افراد اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایمان والے ہیں، لیکن وہ سمجھتے ہی نہیں کہ ایمان کا مطلب کیا ہے۔ جو شخص ایمان کا اقرار کرتا ہے وہ اس اقرار کی وجہ سے کچھ ذمہ داریاں بھی قبول کرتا ہے اور جب تک انہیں پورا نہیں کرتا اس کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے جو شخص بھی اس بات کا دعوے دار ہے کہ وہ ایمان رکھتا ہے اسے اس بات پر غور کر لینا چاہیے کہ:

(۱) وہ کس چیز پر ایمان (یقین) رکھتا ہے؟ اور

(۲) وہ کیا یقین رکھتا ہے؟

(۳) اور جس بات پر وہ یقین رکھتا ہے کیا وہ اس کا اظہار اپنے اقوال و افعال سے کرتا بھی ہے کہ نہیں؟

لفظ ایمان گزشتہ مضمون نمبر (۳۸) میں بیان کیا جا چکا ہے، اسے دہرا لیا جائے۔

ایمان دراصل عمل کا نام ہے صرف قول کا نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات (۴۹) کی آیت (۱۴) میں فرمایا کہ:

"یہ بدو کہتے ہیں کہ: ہم ایمان لے آئے۔ (ان سے) کہیں کہ: تم ایمان نہیں لائے۔ بلکہ تم تو صرف یہ کہتے ہو کہ ہم طابع ہو گئے (اسلام) کے، اور ایمان تو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو گے، تو وہ تمہارے اعمال کے انعامات میں سے کچھ کم نہ ہوگا بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے"۔

اب یہ منحصر ہے ان قارئین پر جو اس کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں کہ وہ اس بات پر غور فرمائیں کہ اب اس دور میں یعنی اکیسویں صدی میں، انہیں ان لوگوں میں جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کتنے بدو نظر آ رہے ہیں جو کہ ابھی تک ایمان کا مقصد ہی نہیں جانتے اور نہ ہی جاننے کی تکلیف گوارا کرنا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات (۴۹) کی آیت (۱۵) میں فرمایا ہے کہ:

"صرف وہی ایمان والے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول پر یقین کے ساتھ ایمان قبول کیا اور پھر اس کے بعد کسی قسم کا شک نہیں کیا اور اللہ کی خاطر اپنی دولت سے اور اپنے نفوس سے جہاد کیا۔ اور وہی ہیں سچے"۔

انہی آیات کے تسلسل میں آیت (۱۶) اور (۱۷) میں کہا گیا ہے کہ:

"کہو! کیا تم اللہ کو اپنے دین کے بارے میں مطلع کرو گے؟ جبکہ اللہ جانتا ہے جو کچھ بھی ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ وہ لوگ تم پر احسان جتا رہے ہیں (اے محمدؐ) کہ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ (ان سے) کہیں: 'اپنا اسلام مت جتاؤ مجھے نہیں! بلکہ یہ تو تمہارے اوپر اللہ کا احسان ہے، کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت بخشی، اگر تم سچے ہو، (تو یہ تمہیں سمجھ لینا چاہیے)"۔

درحقیقت ایمان پر دلجمعی سے قائم رہنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ ابلیس ہمہ وقت ایمان کے درپے رہتا ہے اور اپنی شر پھیلانے کی فکر کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہدایت کی ہے، کہ وہ اپنے ایمان کی تسلسل کے ساتھ تجدید کرتے رہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم میں ایمان کی تجدید کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا، صرف یہی فرمایا ہے کہ "اے ایمان والو! ایمان لے آؤ" یہ چھوٹا سا جملہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کا اپنے اندر حکم کا ایک تسلسل رکھتا ہے بغیر کسی وقت کی قید کے، جو صلوٰۃ کے ذریعہ سے ادا ہو جاتا ہے یعنی ہر صلوٰۃ ایمان کی تجدید کرتی ہے۔ لیکن

اگر صلوٰۃ سمجھ میں بھی آ رہی ہو اور واقعی ہم یہ سمجھ رہے ہوں کہ ہم اللہ کی حضوری میں پیش ہو کر اس کے حضور اپنی غلامی کا اقرار کر رہے ہیں اور اپنے مالک کو راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی صلوٰۃ چھوڑنے کا مطلب ہے کہ ہم مالک کی حضوری سے غیر حاضر ہو گئے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء (۴) کی آیت (۱۳۶) میں فرمایا ہے کہ:

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور کتاب پر جو اس کے رسول پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل کی گئیں۔ اور جو کوئی بھی انکار کرے گا اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا تو پھر بے شک وہ بہت بڑی گمراہی میں پڑ گیا۔

یہ بہت ہی اہم آیت ہے اور بہت ہی واضح، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے ہر دور کے ایمان والوں کو خطاب فرمایا ہے اور ایمان والوں سے ہی ایمان لانے کے لیے کہا ہے یعنی حکم دیا۔ چنانچہ ہر ایمان والے پر اس حکم کا اطلاق ہر وقت ہر لمحے ہوتا ہے۔ یعنی جب تک وہ زندہ رہتا ہے اُسے بار بار ایمان لانے کا حکم مل رہا ہے اور یہ تسلسل کبھی ختم نہ ہونے والا ہے۔ اسی لیے مصنف نے اسے تجدید ایمان کے نام سے تعبیر کیا ہے یعنی کہ تجدید ایمان تمام زندگی تسلسل کے ساتھ کرنا، اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر فرض کر دیا ہے۔ اور یہی صورت معلوم ہوتی ہے شیطان کی شر اور وسوسے سے بچنے کی۔

اس آیت شریفہ کے بارے میں چند علماء کی تفسیر کے مطابق اس آیت کے مقصد پر ضرب کاری لگتی ہے۔ یعنی ان کا فرمان ہے کہ یہ آیت یا اس کا حکم اہل کتاب کے لیے تھا جو اپنی کتب اور انبیاء پر ایمان رکھتے تھے۔ لیکن اس آیت کی یہ تعبیر درست نہیں۔ بلکہ یہ حکم ان ایمان والوں کے لیے ہی ہے جو جناب رسالت مآب محمدؐ پر ایمان لائے۔ لیکن اہل کتاب پر جو پہلے بھی ایمان رکھتے تھے، انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے جناب محمدؐ پر ایمان لانے کے لیے تاکید کی ہے۔ اور وہ حکم سورۃ الحدید (۵۷) کی آیت (۲۸) میں دیا گیا ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمدؐ) پر ایمان لاؤ۔ وہ (اللہ) تمہیں دو گنا ثواب دے گا۔ اور تمہیں ایسی روشنی عطا فرمائے گا، جس کے ذریعے سے تم چلو گے (سیدھی) راہ۔ وہ تمہیں معاف فرما دے گا۔ اور اللہ معاف کرنے والا اور بہت رحم والا ہے"۔

اس آیت کو سورہ الحدید کی گزشتہ آیت (۲۶) اور (۲۷) کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو مطلب مزید واضح ہو جائے گا۔

(و) ایمان سے غفلت اور بھٹکنے کا عنصر:

ایسے لوگ جو اتفاقی یا حادثاتی طور پر مسلمان تو ہیں یعنی پیدائشی مسلمان اور وہ اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے احکامات سے غفلت میں ہیں اور راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی تنبیہ کی ہے کہ ان کے لیے ابھی وقت ہے راہ راست اختیار کرنے کا ورنہ ان کے لیے بہت بڑا عذاب بھی اللہ نے تیار کر رکھا ہے۔ اگر اب بھی وہ توبہ کر کے اپنے مالک کی حضوری میں پیش ہو جاتے ہیں تو اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔

اس سلسلے میں قرآن کریم کی چند آیات درج ذیل ہیں۔

۱) سورۃ الانعام (۶) آیت (۷۰) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور ان کو اکیلا چھوڑ دو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنایا ہوا ہے اور جن کو دنیا کی اس زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ لیکن (انہیں) یاد دلاؤ، اس (قرآن) سے تاکہ کوئی شخص برباد نہ ہو جائے اپنے اعمال کی وجہ سے اور پھر اسے کوئی مددگار یا سفارشی نہ ملے سوائے اللہ کے اور اگر وہ کچھ معاوضہ بھی دینا چاہے تو قبول نہ کیا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی وجہ سے برباد ہو گئے اور ان کے لیے ہوگا کھولتا ہوا پانی پینے کے واسطے اور دردناک عذاب کیونکہ وہ کفر میں مبتلا تھے"۔

۲) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۶۵)۔(۶۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

اور بے شک تم جانتے تھے انہیں جو تم ہی میں سے تھے اور جنھوں نے ہفتے والے دن میں تجاوز کیا تھا (اللہ کے حکم سے) ہم (اللہ) نے ان سے کہا: "ہو جاؤ تم بندر، ذلیل اور دھتکارے ہوئے۔ سو ہم نے یہ سزا اور یہ نشان عبرت ان لوگوں کی اپنی (قوم) کے لیے اور آئندہ آنے والی اقوام کے لیے۔ اور ان کے لیے جو پرہیزگار ہیں تنبیہ تھی"۔

۳) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۱۸) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہ (نافرمان لوگ) گونگے بہرے اور اندھے ہیں، سو اب یہ واپس نہیں آئیں گے (راہ راست پر)"۔

(۲۱۵) مسلم معاشرے میں احیائے علوم و نشاۃ ثانیہ کی ضرورت

یہ بات تو ہمارے علم میں ہے کہ سیاسی، معاشی اور سماجی ترقی کا دور دورہ اقوام یورپ میں چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اس وقت شروع ہوا، جب مسلمان معاشرہ زوال پذیر ہو رہا تھا۔ اہل یورپ کی ترقی کی اصل وجہ حصول علم تھا، جبکہ مسلمانوں کے زوال کی وجہ ترک علم تھا۔ علم حاصل کرنے کا دور تین صدیوں پر محیط تھا اور ترک علم کا بھی وہی دور رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں، کہ یورپ میں علم حاصل کرنے اور معاشرے میں ترقی کے رجحان کی وجہ ایک باقاعدہ تحریک سے ہوئی جسے (Reformation & Renaissance) کہا جاتا ہے۔

Reformation تو ایک مذہبی تحریک تھی، جسے سولہویں صدی عیسوی میں پروٹسٹنٹ چرچ کے ادارے نے شروع کیا جبکہ Renaissance ایک معاشرتی ترقی کا احیا اور ترقی یافتہ سائنس کا ابتدائی دور تھا۔ جس میں بہت سی سائنسی ایجادات ہوئیں اور صنعتی ترقی میں انقلاب آگیا، اس ترقی و تبدیلی کا دور بہت طویل یعنی پندرھویں سے سترھویں صدی عیسوی تک محیط تھا۔ یہ دور علم و دانش اور سائنس و آرٹ کی ترقی کا بہترین دور تھا، جو کسی بھی ابھرتی ہوئی تہذیب میں ہونا چاہیے۔

اس زمانے میں جو بنیادی کام ہوا، جس کی وجہ سے یہ ترقی کا دور دورہ شروع ہوا، وہ یہ تھا کہ مفکروں اور اصلاح کرنے والوں اور اصلاح کی ترغیب دینے والوں کی ایک جماعت وجود میں آئی۔ جن کی کاوشوں کی وجہ سے مذہبی پنڈتوں اور پادریوں کی معاشرتی گرفت سے رہائی ملی اور اس کے ساتھ ساتھ جاگیرداروں کے عمل دخل سے بھی چھٹکارا ملا، جنہوں نے تمام دنیا کی معاشرت کو اپنے شکنجے میں لیا ہوا تھا۔ ان دونوں معاشرتی شکنجوں سے چھٹکارے کی وجہ سے جمہوری اداروں اور سوچ کی احیا ہوئی اور معاشرے میں فکر کے عنصر نے جنم لیا اور انسان نے اپنی زندگی کو اپنے طور پر بسر کرنے کا ہنر سیکھنا شروع کر دیا۔

کیونکہ کلیسائی اور جاگیرداری برتری نے ایک مضبوط ملوکیتی نظام کو جنم دے رکھا تھا۔ اور ملوکیت کے سب سے بڑے وکیل جاگیردار اور کلیسائی پنڈت ہی ہوتے ہیں اور ان کا ملوکیت کو مضبوط کرنا خود اپنے آپ کو مضبوط کرنا ہی تھا۔ اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ان دونوں اداروں کے متعلق اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔

(الف) کلیسائیت کا جنون:

کلیسائیت یعنی (Claricalism) کا مطلب ہے کہ مذہبی اداروں یا گروہوں یا کلیسا کا سماجی، سیاسی اور معاشرتی اداروں پر اثر انداز ہونا اور ان کے معاملات میں دخل اندازی کرنا۔ جب عوام الناس نے اور اہل اختیار نے یہ محسوس کیا کہ کلیسا ان کے خلاف ایک طاقت بنتا چلا جا رہا ہے اور ان اداروں کی باگ ڈور اپنے قبضے میں لینا چاہتا ہے بلکہ ایک لحاظ سے لے ہی چکا تھا۔ تو حکومت کے اداروں اور عوامی اصلاحی اداروں نے ان کی مداخلت کو دخل در معقولات سمجھا اور اُن کی مخالفت شروع کر دی۔ ان کی مداخلت اس قدر بے جا اور نامناسب ہو گئی تھی، کہ ایک بادشاہ مملکت بغیر ان کی اجازت کے بغیر طلاق دے سکتا اور نہ ہی کسی سے شادی کر سکتا تھا۔ ایک پادری اللہ کی طرف سے بخشش کا سرٹیفکیٹ چھپوا کر عوام الناس کو فروخت کر سکتا تھا اور عوام اتنے بے وقوف بن چکے تھے کہ وہ اس سرٹیفکیٹ کو خرید کر بخشش کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے۔ یہ معاملہ خاص طور پر انگلینڈ کے بادشاہ ہنری ہشتم (۱۵۰۹-۱۵۴۷) کے زمانے میں پیش آیا۔ جب اس کا خزانہ خالی ہو گیا تو اس نے اپنے وزیر اعظم وولزے کو آمدنی کی تدبیر کے لیے کہا تو وولزے (Woolsey) نے چرچ کے ساتھ معاملہ کر کے اس قسم کے اتنے زیادہ معافی نامے فروخت کیے کہ حکومت کا خزانہ بھر گیا۔ لیکن ایک موقع پر وولزے کو سزائے موت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ قصہ شیکسپیئر (۱۵۶۴ء-۱۶۱۶ء) نے اپنی ایک نظم میں بھی قلمبند کیا ہے۔ بادشاہ نے اس کے بعد چرچ کے اختیارات کم کر دیے اور شاہی دربار میں چرچ کا اثر ختم کر دیا، اس وقت کیتھولک چرچ کا راج تھا اور اس کا ایک بڑا اختلاف بادشاہ کی طلاق اور شادی کے بارے میں ہوا تھا۔ جس کے بعد بادشاہ نے چرچ کے خلاف سازش کر کے ایک نیا فرقہ پروٹسٹنٹ کے نام سے ان کے مقابلے میں لا دیا اور اسے اپنی حمایت میں استعمال کیا۔

اس زمانے میں چرچ کے کرتا دھرتا اپنی من مانی کرتے اور بڑے بڑے غیر اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے۔ اس کی سب سے بڑی مثال روس کے پادری Rasputin کی ملتی ہے جس نے شاہی خاندان کی تمام فیملی کو بد اخلاقی کے جرائم میں ملوث کر دیا تھا۔ ان مذہبی پیشواؤں میں بھی دو بڑے گروہ متقابل تھے۔ وہ تھے Clericalism اور Theocracy ایک گروہ نے تو انتظامی معاملات کو اپنے شکنجے میں لیا ہوا تھا اور دوسرے مذہبی انتہا پسندی کی طرف مائل تھے۔

جبکہ الہامی مذاہب ہمیشہ معتدلانہ رویہ اختیار کرتے ہیں جو فطرت کے نہایت قریب ہوتا ہے۔

کم وبیش یہی تگ و دو مذہبی پیشواؤں کی ہر دور میں اور ہر مذہب میں رہی ہے جس کے ذریعے انسانی نسلوں میں جھگڑے اور فساد پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

(ب) جاگیرداری نظام:

ہزاروں برس پرانا نظام جو جاگیرداروں اور جنگجو سرداروں پر منحصر تھا، بدقسمتی سے جنوبی ایشیا کی ایک ارض پاک میں بھی یہی ظالمانہ اور بیہودہ نظام رائج ہے۔ یہ جاگیردار اور سردار بادشاہ کو اور آجکل کی بیہودہ جمہوریت کو کنٹرول کرتے اور پروان چڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ بادشاہت میں تو خیر بادشاہ اپنی ہی شاہی کی فکر میں رہتا ہے لیکن جمہوریت میں چند جاگیرداروں کا ٹولہ چند بے راہ رو طاقتوں کو اپنے ساتھ لے کر لیکن عوام الناس کا نام لے کر انہیں کا خون چوسنے میں محو رہتا ہے۔ یہ لوگ قوم کے خدمت گار اور خادم ہیں کہ اپنے ہی غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ جیسا کہ یہ جاگیردار بھیڑ بکریاں پالنے والے غریب لوگوں سے خراج وصول کرتے ہیں جنہیں چھ چھ ماہ تک اپنے کپڑے دھونے نصیب نہیں ہوتے، جن کے رہنے کے لیے چھت اور کھانے کے لیے مناسب روٹی نہیں ہوتی۔ وہ عزت دار سرداران بھکاریوں سے خراج وصول کر کے عیاشی کرتے ہیں اور یہی کام کلیسائی نظام کے سرپرست ایسے ہی غرباء سے نذرانے وصول کر کے کرتے ہیں۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ ہمیشہ تین گروہوں پر مبنی رہا ہے۔ جاگیردار جنگجو سردار اور ملائیت جو شاہوں یا سربراہان مملکت کے زیر سایہ پھلتے پھولتے ہیں اور دوسرے کام کرنے والے غلام اور تیسرے ان دونوں کے درمیان جو مملکت کا کاروبار چلاتے ہیں۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کسی مسیحا کو انسانیت کی فلاح کے لیے بھیجا تو اسے درمیانی کلاس کے لوگوں میں سے منتخب کیا اور اسی نے سماج کے محتاج اور کسمپرسی میں مبتلا لوگوں کی بھلائی کے لیے آواز بلند کی اور اسی نے ان سرداروں اور جاگیرداروں کے خلاف علم بلند کیا۔ اسی وجہ سے ہر پیغمبر کی مخالفت قوم کے سرداروں کی طرف سے ہی کی گئی۔ جبکہ قوم کے مظلوموں نے ان کی طرف رجوع کیا۔

بہر حال ان سرداروں اور مذہبی پیشواؤں نے ہمیشہ ان غرباء کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھا اور وہ شاہوں کے وفادار رہے اور اسی طرح سے سماجی ناانصافی، معاشی بحران اور ظلم کی ترویج کرتے رہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے دنیا کی سیاسی و جغرافیائی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تمام دنیا کی مہذب اقوام میں انہی تین بڑے عناصر کا عمل دخل رہا ہے جو پچھلے مضمون میں بیان کیے گئے ہیں، یعنی حکمران، جاگیردار، جنگجو سردار اور ملائیت۔ ترقی یافتہ اقوام تو اس مقصد میں کامیاب ہو چکی ہیں اور انہوں نے ان غیر جمہوری طاقتوں کا خاتمہ کر کے ایک جمہوری نظام قائم کر لیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے زیادہ تر مسلمان اقوام ایسی ہیں، جہاں جمہوری نظام کا قیام ابھی تک قائم نہیں ہو سکا۔ اور جہاں کہیں بھی جمہوریت نام کی کوئی چیز ہے وہاں جمہوری آمر جمہوریت کے نام پر حکومت کر رہے ہیں اور ان کے اندر گرد ہی ایک خاص گروہ گدھوں کی طرح منڈلاتا پھرتا ہے اور کبھی تو یہ گدھ ہیں ہی اکٹھے ہو کر اپنے میں سے ایک بڑی گدھ کو اپنا سربراہ بنا لیتے ہیں اور پھر وہ مل جل کر عوام الناس کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ یہ طرز حکومت نہ تو عوام کو اختیارات دیتا ہے اور نہ ہی ان کی مرضی کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ ہی اسلام کے اصول و قواعد و ضوابط خاطر میں لاتا ہے۔ لوگوں کو نہ انصاف ملتا ہے نہ معاش ملتا ہے اور نہ امن ملتا ہے اور نہ ہی علم حاصل کرنے کے ذرائع میسر ہوتے ہیں۔ معاشرے کے بااثر لوگ عوام الناس کو غلام بنا کر رکھتے ہیں۔ حکمرانوں کو اپنی حکومت کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں، وہ قومی دولت کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اور اپنے حکم کو عدالت کا حکم۔ دراصل مسلمان دنیا میں چند ایک ہی تو حکمران آئے ہیں جنہیں خوف خدا بھی تھا اور انتظامی شعور بھی اس سلسلے میں ہندوستان کے ایک عالم جناب ابو الحسن ندوی نے لکھا ہے کہ مسلم دنیا میں آج تک صرف سات حکمران ایسے آئے ہیں جنہیں صحیح حکمران کہا جا سکتا ہے ورنہ کوئی بھی اسلامی معیار پر یا انسانیت کے اعلیٰ معیار پر پورا نہیں اترتا۔ وہ سات حضرات ہیں جناب رسالت مآب کے چار خلیفہ اور پھر ان کے بعد جناب عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ھ) جناب نورالدین زنگی (۵۴۱ھ) اور جناب صلاح الدین ایوبی (۵۸۹ھ) ان کے علاوہ قرآن و سنت کی پیروی میں پورے نہیں اترتے۔

اہل یورپ کے دانشمندوں نے کلیسائی اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی، حالانکہ اس کے لیے انہیں کافی تگ و دو کرنی پڑی لیکن ساتھ ہی انہیں اس آزادی کی بہت بڑی قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ اور وہ قیمت تھی ان کی حیا اور ان کی عصمت جو انہیں اپنی مقرر کردہ

آزادی حاصل کرنے کے لیے قربان کرنی پڑی۔ انہوں نے اپنے ہی مذہب کی اخلاقیات اور قوانین کو اپنے معاشرے سے نکال باہر پھینک دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی سوسائٹی کو انصاف، امن، برابری، سچ، دیانتداری جیسے قوانین بھی عطا کر دیے جو نہایت قابل ستائش ہیں۔

مسلمان اقوام قومی و دینی بھائی چارہ قائم نہ رکھ سکیں۔ آپس میں امن کے بجائے نفرت اور گروہی و سماجی طبقات اور ذات پات کی بڑائی لے کر بیٹھ گئے۔ ان کی آپس کی نفرت، تکبر، ذات پات کی تفریق اسلامی معاشرے کو تباہی کے کنارے پر لے آئی۔ مذہبی طبقے نے اپنی برتری جتا کر یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں پر حکمرانی شروع کر دی۔ اور ان غریب لوگوں سے مذہب کے نام پر خراج لینا شروع کر دیا اور اپنی نسل اور ذات کو اونچا رکھ کر دوسروں کو نچلے درجے کا انسان بنا دیا۔ اس طبقے نے جناب رسالت مآب کے اس خطاب کی دھجیاں بکھیر دیں جو آپؐ نے فتح مکہ کے بعد کعبہ کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر دیا تھا اور اس وقت کے چودھریوں کو یعنی اہل قریش کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ آج کے بعد نسل اور خاندان کی برتری میرے پاؤں کے نیچے۔ اور اسی سلسلے میں حجۃ الوداع کے موقع پر اپنی اونٹنی قصوہ پر سوار ہو کر عرفات کے میدان میں ۹ ذوالحجہ کو خطاب فرمایا کہ کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ سوائے تقویٰ کے۔ اسی بنا پر جناب عمرؓ ایک سابقہ حبشی غلام کو سیدنا بلال کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ لیکن آج کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو اعلیٰ نسل کا ظاہر کر کے اپنے لیے اعلیٰ رتبہ منتخب کر لیا۔ حالانکہ اس طبقے کا اپنے لیے خاص برتری کو منتخب کر لینا نسل کی بنیاد پر اسلام اور اس کے رسول کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ اور طرہ امتیاز یہ کہ وہ اپنی نسبت جناب رسول اللہ سے بھی لاتے ہیں اور پھر ان ہی کے حکم کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ نسب کے اعتبار سے جناب رسول اللہؐ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں تو پھر آپؐ کی نسل کیسی یہ تو قرآن کے بھی منافی بات ہوگی۔

جناب رسالت مآب کے جانشین قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے پیشوا بننے کے بعد بھی ایسی زندگی گزارتے تھے جیسا کہ ایک فقیر زندگی گزارتا ہو۔ مسلمانوں کے معاشرے کی یہ پستی ان کے پیش نظر تھی، یہی وجہ تھی کہ جب دین اسلام کے کمال کی خبر اللہ تعالیٰ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے نبی کو دی، تو جناب عمرؓ نے یہ خبر سن کر چیخ ماری اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ اب کمال کے بعد مسلمان قوم پستی کی طرف جائے گی۔ مسلمان قوم نے جب اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس

کے رسول کی سنت کو چھوڑ دیا تو وہ ذلیل و خوار ہو گئے اور ابھی تک ہیں۔ اور اللہ کی نافرمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ قوم فرقوں میں بٹ گئی اور یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک دوسرے کے قتل پر آمادہ ہو گئی۔ پچھلے تیس برس کے دوران تیس لاکھ مسلمان آپس کی لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو بیان کر کے خوش ہونے کے عادی ہو گئے ہیں حالانکہ تاریخ سبق سیکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ملک اسپین میں سات سو برس حکمرانی کرنے کے بعد مسلمان وہاں سے نیست و نابود ہو گئے۔ صرف اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ اپنا فرضی رشتہ رکھا صرف نام کا رشتہ رکھا اور حقیقت میں ان کے احکامات سے بے بہرہ ہو گئے۔ اسی طرح سے وسطی ایشیا کے مسلمان ممالک اور مشرقی یورپ کے مسلمان ممالک بھی اپنا نام و نشان کھو بیٹھے، صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔ جہالت اور تکبر کے نشے میں انہوں نے سب کچھ بھلا دیا۔ قرآن ہماری زبان پر ہے لیکن دل میں نہیں بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برصغیر کے مسلمان، خاص طور پر ایمان کی روح کو نہیں جانتے، لفظ مسلمان کا مطلب نہیں سمجھتے، قرآن سجا کر رکھتے ہیں پڑھتے نہیں اور پڑھتے ہیں تو سمجھتے نہیں اور اگر سمجھ بھی لیتے ہیں تو عمل پیرا نہیں ہوتے۔

افسوس کہ اقوام مسلمان نے اللہ کے احکامات کو نظر انداز کر کے اور اللہ کے رسول کا اسوہ حسنہ بھلا کر انسانیت سوز اور غیر مسلمانوں کے رسم و رواج اپنا کر اپنے آپ کو جہالت کے اندھیروں میں غرق کر دیا۔ تکبر اور غرور کے نشے میں سرشار ہو گئے، دیانت و امانت سے بے بہرہ ہو گئے۔ جھوٹ، بدگمانی اور غیر منصفانہ رویوں کو اپنا کر اپنے آپ کو فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر لیا اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور تعصب کے جذبے ابھارنے لگے یہاں تک کہ ایک دوسرے کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ افسوس صد افسوس کہ ہم نے اپنی برائیوں کو نظر انداز کر دیا اور اپنے بڑوں کی جھوٹی تعریفوں میں لگ گئے۔ اپنی غلطیوں پر فخر کرنے لگے اور اپنی کمزوریوں کے الزامات دوسری قوموں پر لگانے لگے اور تنزلی کے گڑھے میں جا گرے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم آنے والے عام عذاب سے بچنے کی کوشش کریں، اپنی غلطیوں کو محسوس کریں اور ان پر نادم ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی پابندی کریں اور اپنی آنے والی نسل کو صحیح تاریخ اور علم کی روشنی سے منور کریں۔ قانون کو اپنا حکمران بنا لیں اور ذاتی طور پر اپنا احتساب کرنا شروع کر دیں تو

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرما کر ہمیں ذلت اور رسوائی سے نکلنے میں مدد فرمائیں گے۔

(۲۱۷) مسلم معاشرے کے بگڑنے کی وجوہات

بہت ہی مختصر طور پر مسلم معاشرے کے بگڑنے کی وجوہات جاننے کے لیے مندرجات ذیل کو جان لینا ہی بہت مناسب ہوگا، جن کی وجہ سے اصول دین مسخ کر دیے گئے جس کی وجہ سے اسلامی معاشرہ اپنی پٹری سے اتر گیا۔ اور یہ بات بارہا بتائی جا چکی ہے کہ اسلام کی پٹری قرآن اور سنت رسول اللہؐ پر ہی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب بھی کسی معاشرے نے الہامی اصولوں سے منہ موڑا تو وہ آسانی کے ساتھ شیطانی شکنجے میں آ گیا اور پھر خود ہی انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر اور پھر اس سے بھی نچلے درجے پر۔ اور جب انہوں نے انسانی اقدار کو خود ہی پامال کرنا شروع کر دیا تو پھر انہیں اشرف المخلوقات کا درجہ دینے والے مالک نے سزا دی وہ یہ کہ ان کو آپس میں فرقہ بندی میں مبتلا ہو کر آپس میں قتال کرنا پڑا یا پھر کسی دوسری قوم کو ان پر مسلط کر کے ان کا قتل ہوا۔ ایسے واقعات تاریخ میں جا بجا ملتے ہیں۔ لیکن ہم اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے انہیں نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ آئیے چند چیدہ چیدہ محرکات پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو ہمارے معاشرے کے بگاڑ کی بنیاد رہے۔

(الف) مسلمانوں میں ملوکیت اور ملائیت کی ابتداء:

یہ ایک بہت ہی بدقسمت لمحہ تھا، کہ جب مسلمان معاشرے کے سربراہ جناب رسول اللہؐ کے نائبین جو کہ راشد الصفت خلفاء تھے ان کی سنت پر عمل پیرا ہونے کے بجائے بادشاہی اختیار کر گئے اور انہیں اقتدار ہوس نے آ دبوچا۔ نتیجتاً جناب رسول اللہؐ کے خلیفہ چہارم کے ایک گورنر نے علم بغاوت بلند کر کے اپنی متوازی حکومت قائم کر لی تو اس وقت مسلمان معاشرے نے مملکت کے نظام میں دو بنیادی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ ایک طرف خلفائی یا مذہبی اجارہ داری کو جنم دیا جس کا اسلام میں کوئی تصور نہیں اور نہ ہی جناب رسول اللہؐ نے اس کا تصور پیش کیا، نہ ہی آپؐ کے خلفاء نے۔ جبکہ دوسری طرف بادشاہت کا تصور پیش کیا گیا۔ اور ان دونوں اداروں میں سب سے بڑی خرابی یا برائی یہ ہے کہ یہ وراثت کا تصور پیش ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا سب سے بڑا استدلال ہی وراثت ہوتا ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنی طاقت اور اپنی آسائشوں کو اور اپنی حکومت کو

اپنے وارثوں تک منتقل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ملائیت اور بادشاہت آپس میں ایک دوسرے کے استحکام کے لیے مدد کرتے ہیں تاکہ دونوں کی حیاتی چلتی رہے۔ پھر ان دونوں کے مجموعے سے ایک تیسری جماعت وجود میں آئی جو جاگیرداروں کی جماعت ہے۔ ان کا کردار ملائیت کے متوازی بادشاہت کی نشوونما اور اپنی ذاتی حیاتی پر منحصر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے قانون قائم رکھنے اور پھیلانے چند راشد الصفت عالم بھی ان طاغوتی قوتوں سے ٹکرانے کے لیے موجود رہے۔ جن کی وجہ سے دین آج تک قائم ہے اور رہے گا۔

(ب) قرآن وسنت کے خلاف نظریات:

اسلامی معاشرے میں ایسے بہت سارے نظریات نے جنم لیا جن کا ماخذ یا بنیاد یہ ایرانی اور ایرانی تہذیبیں تھیں۔ اور جس کی وجہ سے اسلامی معاشرتی نظام میں بہت سی خرافات نے جنم لیا اور اسلامی معاشرے کو پراگندہ کیا۔ یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ کوئی بھی بدعت یا ایجاد یا تبدیلی جو قرآن وسنت کے منافی ہو وہ اسلامی معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ لیکن ایسے کئی ایک نظریات مسلمان مفکروں اور عالموں نے بھی پیش کیے جن کی وجہ سے اسلامی معاشرے میں خرابیاں پھیلیں۔ ان میں سے چند ایک تو ابھی تک اس معاشرے کو دیمک کی طرح کھا رہے ہیں۔ جو درج ذیل کیے جا رہے ہیں تاکہ معاشرہ ان سے اب ہی بچنے کی کوشش کرے۔

(ا) نظریہ جبریہ وقدریہ

اس نظریہ کے مطابق دو تصورات ایک دوسرے کے متقابل پیش کیے گئے۔ ایک خیال تو یہ پیش کیا گیا کہ انسان محض مجبور ہے اور اچھائی یا برائی کا کرنا اس کے اختیار میں نہیں، بلکہ حالات اس کو کسی خاص فعل کے سرزد کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح سے وہ بے اختیار ہو جاتا ہے، اپنے افعال اور اپنی قسمت کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے اس خیال کو پیش کرنے والے نے انسان کے تمام غیر قانونی اور غیر اخلاقی امور کو جائز بنانے کی مذموم کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی حکمران طبقے کے ناجائز امور کو جائز قرار دے دیا۔ اس طرح سے اس نظریہ کا مقصد صاف طور پر بدنیتی کو ظاہر کر رہا ہے۔ جو شاہوں کی خاطر ان کے مصاحبوں میں سے کسی ایک نے عوام کے سامنے پیش کی ہوگی۔ درحقیقت یہ نظریہ پہلی صدی ہجری میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ نظریہ قرآن اور سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

انسان کو اچھائی اور برائی میں سے اپنے لیے کچھ بھی اختیار کرنے کا اختیار دے دیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اچھائی اور برائی میں کیا فرق ہے اور اچھائی ان کے لیے ہمیشہ کی خوشی کا باعث بنے گی اور برائی انہیں ہمیشہ کے لیے جہنم رسید کرے گی۔

ایک مشہور صوفی بزرگ مولانا روم نے اس نظریہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ انسان تو انسان بلکہ ایک جانور بھی اس نظریے کے محرکات کو جان سکتا ہے۔ ایک جانور بھی یہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے کہ وہ کس قدر آزاد یا مجبور ہے کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے لیے۔ وہ اپنی اس بات کو سمجھانے کے لیے فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی کتے کی طرف ایک پتھر پھینکے وہ کتا اس پتھر پر ناراض نہیں ہوگا بلکہ وہ اس شخص پر ناراضی کا اظہار کرے گا جس نے پتھر اس کی طرف پھینکا ہوگا۔ کیونکہ وہ سمجھ سکتا ہے کہ پتھر خود بخود اسے نقصان پہنچانے نہیں آیا۔ اس لیے مولانا فرماتے ہیں کہ اگر وہ جانور انسان کی مرضی یا شرارت کو سمجھ سکتا ہے تو پھر ایک انسان یہ کیوں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کس حد تک اپنی مرضی کا استعمال کر سکتا ہے اور کہاں پر وہ اللہ کی مرضی کا تابع ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں قرآن حکیم کی چند آیات درج ذیل ہیں۔

۱) سورۃ آل عمران (۳) آیات (۱۱۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور قیامت کے دن پر اور حکم دیتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں برائی سے اور جلدی کرتے ہیں اچھے کاموں کے لیے اور وہ نیک لوگوں میں سے ہیں"۔

۲) سورۃ احزاب (۱۸) آیت (۷) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بے شک ہم نے بنایا ہے جو کچھ بھی ہے زمین پر ایک زینت، اس لیے کہ ہم جان سکیں ان لوگوں کو کہ ان میں سے کون ہیں اچھے اعمال کے حساب سے"۔ یعنی یہ مال و دولت اور دیگر دل لبھائی اور عیش و عشرت کے اسباب انسان کی آزمائش کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

۳) سورۃ نمل (۲۷) آیت (۹۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں تو پھر جو کوئی بھی آگاہی حاصل کرے تو وہ اپنے ہی لیے بھلائی حاصل کرے گا۔ جو کوئی بھی اس سے پھر جائے تو اسے کہو کہ میں تو صرف ڈرانے والا خبردار ہوں"۔

(۴) معبود بادشاہوں کی تمنا

قبل از اسلام ایرانی بادشاہت کے تصور کے مطابق ایران کے نومسلموں نے اس تصور کو نظر انداز نہیں کیا اور ان کی یہ تمنا اور خواہش رہی کہ ان کے حکمران یا بادشاہ دیوتائی صفات کے حامل ہونے کے دعویدار ہوں۔ یہ تصور ایرانیوں میں اس طرح تھا جیسا کہ یونانیوں میں، ان کے عقیدے کے مطابق جو بادشاہ دیوتا ہونے کا دعویٰ نہ کرتا ہو، وہ حقیقت میں اس حیثیت کا مالک ہی نہیں ہوتا اس لیے وہ بادشاہت کے قابل بھی نہیں ہوتا۔ ان کا یہ تصور عباسی دور حکومت میں زیادہ تقویت پکڑ گیا۔ جبکہ غیر عرب لوگ امیہ خاندان کی حکومت کے ظلم سے خوش نہیں تھے۔ اس لیے ایرانی نژاد مسلمان جو ایمان کی روح سے ابھی تک ناآشنا تھے، انہوں نے مسلمان بادشاہوں کو (جو خلیفہ کہلاتے تھے) دیوتائی طاقت کے مالک بادشاہ ہی تصور کرنا شروع کر دیا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ خدائی روح بادشاہوں کے اجسام میں حلول کر جاتی ہے۔ اس لیے ایران کے ایک طبقے نے سن ۱۴۱ - ۱۴۲ ھ کے دوران یہ نظریہ بادشاہ تک پہنچا دیا۔ جس پر بادشاہ نہ صرف ناراض ہوا، بلکہ ان کے خلاف سزا بھی سنائی۔ بادشاہ کی اس بات کو اس گروہ کے پیروکاروں نے ناپسند کیا یہ لوگ راوندیہ کہلاتے تھے۔ اور اس کے ردعمل کے طور پر، جیسا کہ پروفیسر ڈی۔ اولیری "D.O Leary" جو انگلستان کی برسٹل یونیورسٹی میں استاد تھا اس نے اپنی کتاب "THe Philisophy of Islam" میں لکھا ہے کہ اس گروہ نے مسلمانوں میں ایک بڑے فرقے کو جنم دیا جن کا یہ خیال ہے کہ خدائی روح ان کے امام میں حلول کر جاتی ہے۔ بہرحال یہ نظریہ عقیدہ اور خیال قرآن کے منافی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی درج ذیل آیات کریمہ پیش خدمت کی جارہی ہیں۔

۱) سورۃ النساء (۴) کی آیت (۱۱۶) میں فرمایا گیا ہے کہ

"بے شک اللہ معاف نہیں کریں گے (اس گناہ کو) کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے۔ لیکن وہ معاف فرمادیں گے جسے وہ چاہیں گے، ان گناہوں کو جو اس کے علاوہ ہوں گے۔ اور جو کوئی بھی شرک کرتا ہے اللہ کے ساتھ بے شک وہ بہت بڑی گمراہی میں پڑ گیا"۔

۲) سورۃ الاحزاب (۳۳) آیات (۳) میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"اللہ پر اپنا بھروسہ رکھو۔ اور اللہ ہی کافی ہے کاموں کو نمٹانے کے لیے"۔

۳) سورۃ المائدہ (۵) آیت (۱۲۰) میں کہا گیا ہے کہ:

"اللہ ہی کے لیے ہیں (یعنی اسی کی ملکیت ہیں) آسمان اور زمین اور جو کچھ بھی ان میں ہے اور وہ ان تمام پر حاکم ہے"۔

۴) اب سب سے زیادہ اہم ہے سورۃ اخلاص (۱۱۲) جس میں اللہ تعالیٰ کی کامل واحدانیت بیان ہے یعنی "کہو (اے محمدؐ) وہ ہے اللہ واحد اور احد۔ بے نیاز مالک جس کی ہر مخلوق کو ضرورت ہے۔ جسے کسی نے پیدا نہیں کیا اور نہ اس کو کسی نے جنا۔ اور اس کے برابر کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی اس کی مماثلت کرسکتا ہے"۔

(۳) فتنۂ باطنیت

جب مسلمانوں کے فکر میں فلسفیانہ انداز فکر متعارف ہوا اور اس بنا پر مسلمان علماء و مفکرین نے اپنے فکر کا محور قرآن اور سنت کے علاوہ کرنا شروع کر دیا تو اس وقت ایک ایسا شر انگیز فکر قرآن کے الفاظ کے متعلق پیش کیا گیا کہ قرآنی الفاظ کے مطلب میں دوئی کا عنصر شامل کر دیا۔ یعنی ان کا ایک مطلب تو ظاہر ہوتا ہے جو عوام سمجھ لیتے ہیں اور دوسرا مطلب ان الفاظ میں پنہاں ہوتا ہے جسے عوام الناس سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، بلکہ صرف امام ہی اسے سمجھ کر عوام کو بتا سکتے ہیں۔ اس طرح سے انہوں نے قرآن کو اپنے طور پر بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے مطالب جناب رسول کریمؐ کے بیان کردہ مطالب سے مختلف تھے۔ اس فکر میں یہ خیال بھی شامل تھا، کہ امام کو الہامی آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے۔

پروفیسر ڈی اولیری آف برسٹل یونیورسٹی انگلینڈ نے لکھا ہے کہ امام جعفر (۸۳-۱۴۸ھ) وہ پہلا شخص تھا، جناب علی کے بیٹوں میں سے جس نے دعویٰ کیا کہ ان میں خدائی روح ہے۔ بہرحال فلسفہ باطنیت قرآن کے قطعی خلاف ہے اور ناقابل قبول ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی چند آیات درج ذیل ہیں۔

۱) سورۃ بقرہ (۲) آیت (۱۵۹) میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"بے شک وہ چھپاتے ہیں واضح ثبوت، شہادتیں اور آگاہی جو ہم نے بھیجی ہے اس کے بعد کہ ہم نے اسے صاف صاف بیان کیا ہے لوگوں کے لیے کتاب میں، ان پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں"۔

۲) سورۃ دخان (۴۴) آیت (۵۸) میں کہا گیا ہے کہ:

"یقیناً ہم نے بنایا اسے (قرآن کو) آسان تمہاری زبان (عربی) میں اس لیے کہ وہ اسے (سمجھیں اور) یاد رکھ سکیں"۔

۳) سورۃ القمر (۵۴) آیت (۱۷) میں فرمایا کہ:

"اور بے شک ہم نے بنایا ہے قرآن کو آسان سمجھنے کے لیے اور یاد کرنے (اور نصیحت) کے لیے تو پھر کوئی ہے جو اسے یاد کرے؟"

۴) سورۃ محمد (۴۷) آیت (۲۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"تو کیا وہ پھر نہیں سمجھتے غور کر کے قرآن میں یا کیا ان کے دلوں کو قفل پڑا ہے (کہ وہ سمجھتے نہیں)؟"

(۴) فتنۂ خلق القرآن

قرآن کے نام پر ایک ایسا شر انگیز اور مکروہ نظریہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں پیش کیا گیا۔ اور اس کا مقصد سیاسی طور پر مامون اور معتصم جیسے بادشاہوں کو مستحکم کرنا تھا اور ساتھ ہی سچے اور سچے قسم کے علماء جیسے امام احمد بن حنبل کی ساکھ کو نقصان پہنچانا مقصود تھا اور ان کے ایمان کو متزلزل کرنا بھی۔ لیکن امام پر تو اللہ کی رحمت ہوئی اور وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے اور بادشاہ وقت کا ظلم برداشت کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

ان مکار علماء نے جنہوں نے یہ نظریہ پیش کیا، جو بہت ہی مضحکہ خیز احمقانہ اور ان کی مکاری اور شرارت پر مبنی تھا، وہ یہ کہ قرآن اللہ کی مخلوق ہے۔ جب بادشاہ نے امام احمد سے اس نظریے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اس نظریہ کی فوری تردید کی اور کہا کہ قرآن صرف اللہ کے الفاظ ہیں، جسے اللہ نے انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ اس لیے یہ الفاظ ہمارے لیے بہت معتبر اور اہمیت کے حامل ہیں۔

اس نظریے کے شرمناک اور حیا رانہ نشانات تا حال مسلمانوں کی تہذیب میں ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکروہ نظریہ بغداد سے دہلی (بھنبھور) کی بندرگاہ سے ٹھٹھہ کے اسلامی مرکز میں پہنچا اور آج تک سندھ کی تہذیب میں اپنے پنجے گاڑے ہوئے وہاں کی مظلوم لڑکیوں کو اپنی نظر بندی میں جکڑے ہوئے قائم ہے۔ بارہ صد سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، کہ اس

نظریے کا ظلم جاری و ساری ہے۔

اس کے تحت چند سفاک اور خبیث اور مکار لوگ، جنہیں قرآن اور سنت کی کوئی پروا نہیں وہ دولت کے لالچ میں اپنی ہی بہنوں اور بیٹیوں کو ان کے قانونی، مذہبی اور جبلی حق سے محروم کر دیتے ہیں اور کبھی بھی انہیں شادی نہیں کرنے دیتے۔

قرآن کے ساتھ شادی کے نظریے کا ایک محرک تو نظریہ خلق القرآن ہے کہ قرآن ایک مخلوق ہے۔ جبکہ دوسرا محرک ہندوؤں کا نظریہ ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کی مصنوعی شادی اپنے بتوں سے درختوں سے یا جانوروں سے کر دیتے ہیں تا کہ انہیں بدقسمتی سے بچایا جائے اور پھر اس کے بعد جس سے بھی شادی کرنی ہوتی ہے کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ شادی رسمی طور پر کرتے ہیں۔ جبکہ یہ نام نہاد مسلمان حقیقت میں ایسا کرتے ہیں تا کہ ان کی جائیداد ہڑپ کر سکیں۔ ان کے اس فعل سے وہ عورت ہمیشہ کے لیے رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں ہو سکتی۔ مختلف میڈیا چینل نے بھی اس بارے میں رپورٹس جاری کی ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ قرآن قرآن کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

۱) سورۃ اعراف (۷) آیت (۵۲) میں کہا گیا ہے کہ:

”ہم نے ان کے پاس ایک کتاب پہنچا دی جو علم پر مبنی ہے جسے ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے ایک آگاہی اور ایک رحمت تا کہ ان لوگوں کے واسطے جو ایمان رکھتے ہیں“۔

۲) سورۃ تکویر (۸۱) آیت (۲۷) میں بیان ہے کہ:

”بے شک یہ (قرآن) تو دنیا والوں کے لیے ایک نصیحت کی کتاب ہے“۔

۳) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۹۷) میں فرمایا کہ:

کہو (اے محمدؐ) جو کوئی بھی دشمن ہے جبرئیل کا (اسے غصے میں مر جانے دو) وہ (جبرئیل) تو بے شک لایا ہے اسے (قرآن کو) تمہارے قلب پر اللہ کی اجازت و حکم سے، جو تصدیق کرتا ہے اس کی جو اس سے پہلے آیا (تورات و انجیل) اور ہدایت اور خوشخبری ایمان والوں کے لیے)“۔

(۵) نظریہ وحدت الوجود

ایک فلسفیانہ تجربہ کہ جب کوئی شے بھی وجود میں نہ تھی تو اس وقت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وجود میں تھی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے تخلیق فرمائیں تمام اشیاء اپنے الفاظ سے کہ ”ہو جاؤ“

تو ہر شے ہو گئی اس (اللہ) کی ذات میں سے ہی۔

اس نظریے کا لانے والا اور اس کو قبول کرنے والا مجدد دین اسلام میں نظریہ دوئی ”Duality“ کو داخل کرنے والا تھا۔ یعنی ایک اللہ سے ہی تمام مخلوق پیدا ہوئی، بنیادی طور پر نظریہ دوئی اسلام کے نظریہ واحدانیت کے خلاف ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی نظریہ دوئی کی علاوت میں ایک مشہور زمانہ صوفی بزرگ منصور حلاج (پیدائش ۳۰۹ھ) نے اپنے آپ کو ہی خدا کہہ دیا۔ جس کی پاداش میں اسے سولی چڑھنا پڑا۔ اس نظریہ کے حامی صوفی بزرگوں میں شامل ہیں۔ جنید بغدادی (و۔ ۲۹۷ھ)، بایزید بسطامی (و۔ ۲۴۰ھ) اور ابن العربی (ب۔ ۲۳۸ھ) اور بہت سے دیگر مثلاً شہباز قلندر (۱۱۷۷۔ ۱۲۷۴)، بھلے شاہ (۱۶۵۷۔ ۱۲۸۰) وغیرہ۔ حالانکہ سکھوں نے تو نظریہ تثلیث بھی ظاہر کیا ہے جو عیسائیت سے مختلف ہے اور اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

برعکس ان نظریوں کے اسلام نے اس سلسلے میں صرف ایک ہی نظریہ پیش کیا ہے۔ اور وہ ہے نظریہ واحدانیت یعنی ”Divinity“ یا ”Unity“۔ اس لیے وہ تمام نظریے جو واحدانیت کے خلاف پائے جاتے ہیں وہ صریحاً غلط اور غیر مناسب ہیں۔ کیونکہ اللہ اور اس کے رسول نے ہمیشہ واحدانیت ہی کی تعلیم دی ہے۔ اور اس تعلیم کی وجہ سے ہی جناب رسول اللہ کی آپ کے کنبے اور قبیلے نے مخالفت کی اور آپؐ کی جان کے دشمن ہوئے۔

اس لیے چند آیات قرآن جو اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کے بارے میں ہیں، درج کی جا رہی ہیں۔ کیونکہ ہمارے لیے کوئی بھی نظریہ جو اللہ اور اس کے رسول کے قول کے خلاف ہو قابل قبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اقوال بہت ہی صاف اور سادے الفاظ میں بیان فرمائے ہیں۔ جنہیں سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

۱) سورۃ اخلاص (۱۱۲) آیت (۱) اور (۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

”کہو (اے محمدؐ) وہ اللہ ہے، اکیلا اور اس کے برابر یا اس جیسا اور کوئی نہیں“۔

۲) سورۃ شوریٰ (۴۲) آیت (۱۱) میں بیان ہے کہ:

”اس (اللہ) جیسا کوئی نہیں اور وہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے“۔

۳) سورۃ طٰہٰ (۲۰) آیت (۵) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق کہ وہ ہے

"بہت رحم والا عرش پر مقیم"

۴) سورۃ فاتحہ (۱) آیت (۲) میں ہے۔

"تمام تعریفیں اور شکر صرف اللہ ہی کی ذات کے لیے ہیں، جو مالک ہے ہر شے کا جو موجودات میں ہے"۔

۵) سورہ طٰہٰ (۲۰) آیت (۱۴) میں فرمایا

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بے شک، میں اللہ ہوں! اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے، سوائے میرے (اللہ کے)، پس میری پرستش کرو اور صلوٰۃ ادا کرو میری یاد قائم رکھنے کے لیے"۔

۶) سورۃ رعد (۱۳) آیت (۱۶) میں فرمایا ہے کہ:

"کہو (اے محمدؐ) کون ہے مالک آسمانوں اور زمین کا؟ کہو اللہ کہو: تو پھر تم نے اختیار کیا (عبادت کے لیے) اولیاء کو اس کے علاوہ جن کے پاس کوئی طاقت نہیں خود انہیں نفع یا نقصان پہنچانے کی! کہو کیا اندھے بہتر ہیں دیکھنے والوں سے؟ یا اندھیرا بہتر ہے روشنی سے؟ یا کہ وہ اللہ کے شریک ٹھہراتے ہیں اور کیا انہوں نے اللہ کی مخلوق کی طرح تخلیق کیا ہے۔ اور کیا ان کی تخلیق اور اللہ کی تخلیق ایک جیسی ہے۔ آپ کہہ دیں کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی واحد ہے غالب ہے"۔

اس لیے کوئی بھی اللہ جیسا نہیں اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ ہمارا رب ہے یعنی مالک ہے اور ہر شے کا جو ظہور میں ہے وہ مالک ہے اور ہر شے اس کے اختیار اور قابو میں ہے۔ کوئی شے اس کا حصہ نہیں ہو سکتی کسی بھی طریقے سے۔ بلکہ جو بھی اشیاء موجود تھیں، موجود ہیں یا موجود کی جائیں گی وہ اللہ ہی کی مخلوق تھیں اور ہوں گی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ یہ ہمارا مسئلہ نہیں، جب اللہ نے فرمایا کہ وہ یکتا ہے تو بس ہے۔

(۲۱۸) اللہ کے احکامات کی نافرمانی کا نتیجہ

اللہ تعالیٰ ذوالجلال والاکرام چاہتا ہے کہ تمام انسان اس کے احکامات کی تعمیل کریں۔ اور وہ علم و حکمت حاصل کریں جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا۔ جب

انسان اللہ کے احکامات کی طرف رجوع نہیں کرتے اور ان کی تعمیل سے غفلت برتتے ہیں تو پھر اللہ بھی ان سے غافل ہو جاتا ہے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور پھر وہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر وہ اپنی گمراہی کو جان لیں اور انہیں اپنی غلطیوں، کوتاہیوں کا احساس ہو جائے اور وہ اللہ سے معافی کے طلبگار ہو جائیں اور پھر راہ راست کی طرف رخ پھیر لیں تو پھر اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس کا بندہ جب بھی اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ کبھی بھی اسے ٹھکراتا نہیں۔ یہ یاد رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ ماسوا اللہ کے رجوع کرنا، ان سے مانگنا اور مدد طلب کرنا اور ان کے احکامات ماننا یہ بھی اللہ کے احکامات کی نافرمانی ہے۔

یہ بات یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ اللہ سے غفلت اور اس کی نافرمانی ہمیشہ تکبر اور غرور کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور تکبر و غرور ہمیشہ جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی لیے جہالت کو دور کرنے کے لیے علم کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے اور علم حاصل کرنا اللہ کا حکم بھی ہے۔ چنانچہ جہالت بھی ایک گناہ ہے، علم کا حاصل نہ کرنا بھی اللہ کے حکم کی نافرمانی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی آیات مبارکہ پیش کی جاتی ہیں:

۱) سورۃ الانعام (۶) آیات (۶۴)، (۶۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"کہو (اے محمدؐ) اللہ تمہیں بچاتا ہے اس سے اور دوسری تمام مصیبتوں سے اور پھر بھی تم دوسروں کی پرستش کرتے ہو (اور حکم مانتے ہو) اللہ کے سوا۔ کہو اس کے اختیار میں ہے کہ تم پر عذاب بھیجے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے یا تمہیں مبتلا کر دے فرقوں میں اور تمہیں مزہ چکھائے آپس کی لڑائی (قتال) کا۔ دیکھو ہم کس طرح بیان کرتے ہیں نشانیاں تاکہ تم سمجھ سکو"۔

۲) سورۃ الانعام (۶) آیت (۴۹) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"لیکن وہ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں تو ان کے اس انکار کی وجہ سے انہیں ضرور عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا"۔

۳) سورۃ فاطر (۳۵) آیت (۲۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"پھر میں (اللہ) نے ان نافرمانوں کو اپنی گرفت میں لے لیا جو ایمان نہیں لائے اور پھر کتنی خوفناک ہوئی میری نافرمانی (کی سزا)"۔

۴) سورۃ جن (۷۲) آیت (۱۷) میں کہا گیا ہے کہ:

”اور جو کوئی بھی اپنے پروردگار کی یاد (یعنی اطاعت) سے روگردانی کرے گا۔ اللہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا“۔

۵) سورۃ نازعات (۷۹) آیت (۳۷-۳۹) میں فرمایا گیا کہ:

”تو اس روز یہ حالت ہوگی، جس نے سرکشی کی ہوگی اللہ کے احکامات کی، اس زندگی کی خاطر سو دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگا“۔

۶) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۱۰۳) میں فرمایا گیا ہے کہ:

”اگر انہوں نے حق مانا ہوتا اور اپنے آپ کو برائیوں سے بچایا ہوتا اور اللہ کی تابعداری کی ہوتی تو ان کے لیے کتنا بہتر انعام ہوتا ان کے رب کی طرف سے اگر وہ جان لیتے“۔

۷) سورۃ قمر (۵۴) آیت (۱۷) میں فرمایا گیا کہ:

”ہم (اللہ) نے بے شک ہدایا قرآن کو آسان یاد کرنے کے لیے اور سمجھنے کے لیے تو کوئی ہے جو اس سے ہدایت پا سکے“۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے نتیجہ کو مزید مختصراً سمجھنے کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کوئی بھی اللہ کے حکم کی اطاعت نہیں کرے گا وہ اللہ کا نافرمان ہوگا۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا اور عذاب کا حقدار ہوگا اور وہ عذاب درج ذیل طریقوں سے بھی دیا جا سکتا ہے اور دیا جاتا رہا ہے۔

۱) حادثات، زلزلہ، طوفان، وبا، قحط وغیرہ کی صورت میں نافرمان لوگوں پر مصیبت آ سکتی ہے اور انہیں بربادی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

۲) آپس کی نفرت اور تقسیم، گروہوں میں، فرقوں میں یا کسی اور بنیاد پر۔ رہن سہن پر یا زبان کی بنیاد پر اور یہ نفرت آپس کی لڑائیوں میں حتیٰ کے قتل و غارت میں تبدیل ہو کر نافرمان لوگوں کی بربادی کا باعث بن سکتی ہے۔

۳) کوئی دوسری قوم ان کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔

۴) ایسے نافرمانوں کے لیے آخرت کی سزا بھی محفوظ ہے۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ تمام واقعات جن کے ذریعہ گزشتہ نافرمان اقوام کو سزا دی جا چکی ہے اور اس طرح کی سزا کے واقعات سے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب میں آگاہ فرمایا ہے تا کہ عوام الناس عبرت پکڑ سکیں۔ لیکن بیشتر لوگ اب بھی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ جبکہ

چھتیس لاکھ سے زائد مسلمان، مسلمانوں کے ہاتھوں ہی ماضی قریب میں قتل ہو چکے ہیں۔ یہ ہمارے لیے باعث شرم ہے کہ ہم اس بات پر غور ہی نہیں کرتے کہ آخر کیوں ہم ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ دراصل ہم اس سزا کو سزا سمجھ ہی نہیں رہے اپنی بد اعمالیوں کو بری نگاہوں سے دیکھ ہی نہیں رہے بلکہ الٹا گلا شکوہ کرتے ہیں کہ آخر یہ مصیبت ہمارے لیے کیوں؟

ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ہم اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے ہیں ہم معاشرتی طور پر جھوٹے، بے ایمان، بدگمان، بے حیا، خائن و ظالم، چور، ڈاکو، کم تولنے والے، ملاوٹ کرنے والے غرض کہ کوئی برائی ایسی نہیں جسے ہم نے اپنایا نہ ہو۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنی برائیوں کی ساجی طور پر نشان دہی کریں۔ پھر اجتماعی توبہ کریں اور پھر اجتماعی اصلاح کر کے راہ راست پر آ جائیں، ورنہ اس حال سے بھی بدتر حال کے امکانات ظاہر ہو رہے ہیں۔ اب تو حال یہ ہے کہ حکمران علی الاعلان جھوٹ بولتا ہے، اپنے وعدوں سے مکر جاتا ہے امانت میں خیانت کرتا ہے اور اخلاقیات سے گویا اس کا کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔

(۲۱۹) بارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کا پہلا اجتماعی زوال

ساتویں صدی ہجری یعنی بارہویں صدی عیسوی میں شہر بغداد دنیا کے ترقی یافتہ شہروں میں سے ایک علم و ادب کا مرکز تھا۔ (۲۳) لاکھ کی آبادی کا شہر جو مسلمانوں کے فخر کی جگہ اور مسلمان دنیا کا دارالخلافہ تھا۔ لیکن اس کی بدبختی کی انتہا کہ وہاں کے علماء بیکار فلسفیانہ بحث و مباحثے میں الجھے ہوئے قرآن اور سنت رسول کے فکر سے بے خبر نہ جانے کہاں جا رہے تھے۔ انہیں یونانی فلسفہ اور ایرانی افسانوی داستانیں اس علم سے بہت دور لے گئیں، جو علم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے انسان تک پہنچایا تھا۔ علماء نے اپنی سوچ اور غور و فکر کے دروازے بند کر دیے تھے۔ لہٰذا قیاس اور اجتہاد کی کسی کو کوئی خبر نہ تھی۔ خانقاہی نظام پھل پھول رہا تھا اور عملی زندگی میں دین نہ ہونے کے برابر تھا۔ علماء اپنے پرانے زمانے کے استادوں کے فتاویٰ پر قناعت کر کے بیٹھ گئے تھے اور تقلید کا دور دورہ تھا۔ جو اب تک یعنی اکیسویں صدی عیسوی تک جاری ہے۔ آج بھی علماء اجتہاد کے دروازے کھولنے کو تیار نہیں ہیں۔

مسلمانوں کی اس بے راہ روی نے پھر اللہ کے عذاب کو دعوت دے ہی دی۔ لیکن اللہ تعالیٰ

نے دین کو تو بہرحال برقرار رکھنا ہی ہے، چنانچہ اس عذاب کے ساتھ ہی کچھ ایسے علماء بھی اس سرزمین پر موجود تھے جنہوں نے اللہ کے دین کو مضبوطی کے ساتھ تھاما ہوا تھا۔ ان علماء میں ایک نام سرفہرست ہے جن کی اللہ کے دین کے لیے بہت سی قربانیاں تاریخ میں رقم ہیں۔ اس مرد مومن کا نام ابن تیمیہ ہے اور پھر ان کے شاگردوں کی ایک جماعت بھی قرآن و سنت کی طرف متوجہ ہوئی۔

یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قوم کی نسل نو کی رہبری اور غور و فکر کے لیے ہم انہیں مختصراً بتائیں کہ ان کے اجداد نے کس طرح سے زوال کو دعوت دی۔ اس وقت چین اور روس کے درمیان ریاست منگولیا کے مکین چنگیز خان نے ایرانی حکمران خوارزم شاہ کی حکومت پر حملہ کیا اور اسے تہس نہس کر دیا۔ ایران کی مملکت میں خراسان بشمول ترکمانستان اور ازبکستان شامل تھا اور اس وقت وہ بغداد پر حملہ کرنے کی فکر میں تھے۔ جبکہ چنگیز خان چین پر حکمران تھا اور اس کی سرحدیں ایرانی مملکت سے ملتی تھیں۔ دونوں ممالک کے اچھے تعلقات تھے لیکن خوارزم شاہ نے اپنے تکبر کے عالم میں چین کے دو سوداگروں کو کسی بات سے ناراض ہو کر قتل کرا دیا جس کی وجہ سے چنگیز خان نے غصے کے عالم میں پوری مسلمان مملکتوں کو تباہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس لیے وہ اپنے بیٹوں جوچی خان، چغتائی خان اور اوگتائی خان کو لے کر ۶۱۵ھ میں تباہی مچانے کی غرض سے نکلا اور ہر کسی مسلم ریاست میں قتل و غارت کرتا ہوا یعنی بخارا، سمرقند، بلخ، ہرات، نیشاپور، مرو، ترمذ، ایران، رے، ہمدان، قم، قزوین، اردبیل، تبریز، طفلس اور مراغہ جیسے مشہور اور پر رونق علاقوں کو تہہ و بالا کرتا ہوا چلا گیا۔ اس کی درندہ فوجوں نے نوجوانوں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو ظلم اور درندگی سے موت کے گھاٹ اتار دیا، اور کوئی بھی فوج ان کے مقابلے میں ان کے سامنے نہ آسکی۔ خوارزم شاہ کے محل اور اس کے مکینوں کو بھی تہس نہس کر دیا۔ اور آخر کار بغداد کا پر شکوہ شہر بھی نیست و نابود کر دیا گیا۔ اور وہاں کے چوبیس (۲۴) لاکھ مکینوں میں سے اٹھارہ (۱۸) لاکھ مکین تہہ تیغ کر دیے گئے۔ اس طرح سے تقریباً تمام مسلمان بھیڑ بکریوں کی طرح قتل کر دیے گئے۔ یہ تھی سزا ان لوگوں کی جنہوں نے اپنے مالک کے حکم سے منہ موڑا اور اس کی نافرمانیوں میں محو ہو گئے۔

لیکن اتنے بڑے قتال اور تباہی کے باوجود اللہ کو اپنے دین کے وجود کو قیامت تک برقرار رکھنا ہی تھا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار لوگوں کو اللہ ہی کے حکم سے قیامت تک موجود رہنا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ ان کے قائم رہنے کے اسباب بھی پیدا کرتا رہے گا۔ اگر ایک قوم یا

ایک نسل اللہ کے حکم کی نافرمانی کرے گی تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا، جو اس کی تابعداری کرے گی، اور اس کے لیے ایسا کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہی ظالم و جابر چنگیزیوں سے ایک ایسی قوم اٹھائی جس نے پھر سے دین اسلام کے پیروکاروں میں ایک نئی روح پھونک دی۔

اس سلسلے میں متعلقہ قرآنی آیات درج ذیل ہیں۔

۱) سورۃ المائدہ (۵) آیت (۵۴) میں فرمایا گیا ہے:

”اے ایمان والو! تم میں جو کوئی بھی اپنے دین پر کاربند نہیں رہے گا (تو) اللہ تعالیٰ لے آئے گا دوسرے لوگوں کو جن سے وہ محبت کرے گا۔ اور وہ اس سے محبت کریں گے اور ایمان والوں سے عاجزی اختیار کریں گے اور غیر ایمان والوں سے سختی سے پیش آئیں گے۔ اور اللہ کے واسطے لڑیں گے اور کبھی بھی خوف زدہ نہ ہوں گے، الزام لگانے والوں کے الزام سے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے جس پر وہ چاہے کرتا ہے۔ اور اللہ کافی ہے اپنی مخلوق کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اور وہ سب کچھ جانتا ہے“۔

۲) سورہ ابراہیم (۱۴) آیت (۱۸) تا (۲۰) میں فرمایا گیا ہے:

”ان لوگوں کا جو اپنے رب پر ایمان نہیں رکھتے، ایسا معاملہ ہے کہ ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے راکھ، کہ جب ہوا چلتی ہے کسی طوفانی دن تو ان کی کمائی میں سے انہیں کچھ نہیں ملتا۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ سیدھے راستے سے ہٹ جاتے ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان اور زمین سچائی کے ساتھ بنائے؟ اگر وہ چاہے تو تمہیں ہٹا سکتا ہے اور تمہاری جگہ نئی قوم لا سکتا ہے اور اللہ کے لیے یہ کچھ مشکل کام نہیں ہے“۔

جب اللہ تعالیٰ نے نافرمان اقوام پر اپنا عذاب پورا کر لیا تو پھر اسی سخت گیر اور ظالم اور وحشی قوم کو اپنے وفاداروں اور تابعداروں میں بدل دیا۔ جب مسلمان نافرمانوں پر عذاب ہو رہا تھا تو اس کے ساتھ ہی کچھ تابعدار اور وفادار غلام بھی موجود تھے جو اللہ کے عذاب سے دوسرے مسلمانوں کو بچنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ کام کرنے والوں میں اللہ تعالیٰ کے چند وفادار اور تابعداروں کا نام لے کر بتانا یہاں ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ اس نسل کو صحیح صورت حال کا علم ہو جائے۔ ان حضرات میں چند یہ ہیں۔

امام تقی الدین ابن تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) اور ان کے محبوب شاگرد جناب عماد الدین ابن کثیر اور ابن قیم وغیرہ جنہوں نے تجدید روح اسلام کی اور غلط قسم کے فلسفیانہ نظریات کو ختم کیا اور معاشرے سے گندے رسم ورواج کا اخاطہ کیا۔

(۲۴۰) مسلمان معاشرے میں دوسرا اجتماعی زوال

اس کوشش کے باوجود مسلمان انقلابی مفکرین نے اسلام کی صحیح روح اجاگر کرنے کی انتھک جدوجہد کی لیکن پھر بھی وہ معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ بہت افسوس اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک معاشرے میں مکروہ اور ذلیل قسم کے رسم ورواج جن کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں وہ رائج ہیں۔ ہمارے علماء ابھی تک اپنے مدرسوں کے نصاب کو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور علم کے کھلتے ہوئے دریچوں کے باوجود مطلوبہ سطح تک نہ لاسکے۔ ابھی تک جاگیرداری اور خانقاہی نظام معاشرے کو شکنجے میں لیے ہوئے ہے جو حاکم وقت کو سہارا دیے رہتا ہے۔ ابھی تک معاشرے کی حکومت با اختیار حکمران کے پاس ہوتی ہے کبھی وہ ڈکٹیٹر بن جاتا ہے کبھی وزیر اعظم یا صدر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جاگیردار اور مذہبی پیشوا عوام کا نام لے کر عوام پر ہی حکمرانی کرتے ہیں۔ انصاف کے دروازے صرف بڑے لوگوں کے لیے کھلتے ہیں اور عوام الناس بس ذلیل ہونے کے لیے کافی ہیں۔ مذہب سے کھیلا جارہا ہے، مملکت کا سارا نظام اسلام کے خلاف اصولوں پر چلتا ہے۔ رشوت اور بے ایمانی، چوری اور راہزنی عام ہے۔ حکمران اور ان کے ادارے قومی خزانہ بے دردی سے لوٹ رہے ہیں۔ عام آدمی کے لیے انصاف میسر نہیں، علماء آج بھی ہزار سال پرانے فتوؤں پر کام چلا رہے ہیں۔ معیشت اور سائنس سے بے بہرہ شخص فتوے جاری کرتا ہے۔ علم سے بے بہرہ عالم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ فیشن اور آزادی کے نام سے بے حیائی عام ہوگئی ہے، حلال اور حرام میں تمیز مٹ گئی ہے۔ چونکہ علمائے دین مذہبی اصولوں کے قواعد وضوابط کو منطقی، سائنسی نظریات اور تجربات اور معلومات کی بنا پر پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں استخراج اور فلسفے کا فن، مالیاتی نظام، بنکاری، معاشیات، تجارتی لین دین، سرکاری ترسیلات کے معاملات وغیرہ سے واقفیت ہے۔ انہیں نظام شمسی کی گردش کے اصولوں کا علم نہیں ہے، جب تک علماء تمام معاملات کی تحقیق

اور ان کے اثرات کے متعلق اکٹھے بیٹھ کر ہر معاملے پر اجتہاد نہیں کریں گے، اس وقت تک صحیح قانون سازی نہیں ہو سکتی۔ ٹیلی ویژن کی حیثیت کے متعلق ابھی تک یہ طے نہیں کر پائے، حالانکہ ٹیلی ویژن بالکل ایسے ہی ایک نعمت ہے جیسے مثال کے طور پر ہمارے ہاتھ پاؤں۔ اگر ہم انہیں جائز امور کے لیے استعمال کریں گے تو ان کا استعمال نیکی میں شمار ہوگا بصورت دیگر گناہ میں۔ اسی طرح سے ٹیلی ویژن کا کوئی قصور نہیں بالکل ایسے ہی جیسا کہ چور کے ہاتھوں کا قصور نہیں ہوتا بلکہ چور کا اپنا قصور ہوتا ہے کہ اپنے ہاتھوں کا ناجائز استعمال کرتا ہے۔

لیکن یہاں تو ہر اس بات پر فتویٰ لگ جاتا ہے جو فتویٰ لگانے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً شیخ اقبال پر کفر کا فتویٰ، سر سید احمد خان پر جدید تعلیم پھیلانے کے الزام میں کفر کا فتویٰ۔ لاؤڈ اسپیکر کے حرام ہونے کا فتویٰ، تصویر اور ٹیلیویژن کے حرام ہونے کا فتویٰ وغیرہ وغیرہ۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ کبھی بھی کسی مذہبی جماعت یا شخصیت نے عورتوں کے اغواء، ان سے بھیک منگوانا، انہیں طوائف بنانا، بچوں کو فروخت کرنا، بچوں کو اپاہج کر کے ان سے بھیک منگوانا، بچوں کو زنجیروں سے باندھ کر مزدوری کروانا، ان سے منشیات کا کاروبار کروانا، قرآن و سنت کے خلاف قوانین کا اجراء وغیرہ، ان تمام امور کے متعلق انہوں نے کبھی کوئی آواز بلند نہیں کی۔ ویسے مذہب کے نام پر بڑے بڑے جلوس اور جلسے تو ہوتے ہیں لیکن مظلوم کی مدد کے لیے کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ حکومت کے کارندے اور منتظم اس کارروائی اور برائی سے واقف ہی نہیں، بلکہ اس میں شریک ہیں اور عالم فاضل خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

علم کی دھجیاں بکھیری جارہی ہیں، استاد علم تقسیم کرنے کے بجائے علم فروخت کر رہے ہیں۔ دینی مدرسوں میں اورنگزیب (۱۲۵۸ - ۱۰۱۷ء) کے زمانے کے ملا نظام الدین کا تیار کردہ درس نظامی آج اکیسویں صدی میں بھی جوں کا توں رائج ہے۔ دنیا کی تمام بحری افواج اور چاند اور مریخ پر پہنچائے جانے والے سائنسی آلات کے تحقیقاتی ادارے اور موسمی معلومات رکھنے والے ادارے، زمین اور چاند سورج کی گردشوں کا پورا حساب کتاب لگا کر عوام الناس تک پہنچا چکے ہیں اور تمام بحری کاروبار اور خلائی تحقیقاتی اداروں کا تمام تر دارومدار اسی حساب کتاب پر ہے لیکن ہم لوگ اب بھی چاند کے نظر آنے یا نہ آنے کی بحث میں پڑے رہتے ہیں۔ ابھی

تک رمضان کے مہینے میں سحر کے اوقات پر اس قوم کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ یہ لوگ تو ابھی تک یہ بھی نہیں جان سکے کہ اللہ تعالیٰ نے جناب آدمؑ کو کیا علوم سکھائے تھے۔

قوم صرف دو باتوں کی ماہر ہے ایک تو علم کے نہ حاصل کرنے میں اور دوسرے تکبر میں اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ بے حد ناپسند فرماتے ہیں اور اسی وجہ سے مسلمان پستی کی طرف گامزن ہیں۔ یہ قوم قرآن کی بات تو بہت جذبے سے کرتی ہے اور جناب رسول ﷺ کی محبت کا دعویٰ بھی بھرپور انداز میں کرتی ہے لیکن قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے قوانین کو اپنی زندگی میں لاگو کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں اور جب تک ہم اپنی زندگی کو ان قوانین کے تابع نہیں کر لیں گے ہم فلاح نہیں پا سکیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امت کے زوال کے ساتھ ساتھ امت کا امتحان بھی بیک وقت ہو رہا ہے۔ اسی لیے شیخ اقبال نے فرمایا:

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا پھر کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

چند اصلاحی تجویزیں

آخر میں مسلمان اقوام کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے سماجی، ثقافتی اور دینی معاملات کی تجدید نو کریں اور اس تجدید میں مملکت، سماجی و انقلابی مفکر و دیگر علم و فنون کے اساتذہ شامل ہو کر درج ذیل نقاط پر غور کریں۔

(الف) سماجی اصلاح:

i) غیر انسانی، غیر فطری، غیر اخلاقی اور غیر اسلامی رسم و رواج کی قرآن و سنت کے مطابق تجدید نو کی جائے۔

ii) جاگیرداری نظام اور چنگیز سرداری نظام کا خاتمہ کر کے جمہوری نظام تشکیل دیا جائے۔

iii) نظام ملائیت اور خانقاہی اداروں کو علم و ادب کا گہوارہ بنایا جائے اور روایتی ملاؤں کے بجائے علماء تیار کیے جائیں اور اجتہاد کے دروازے کھول دیے جائیں۔

iv) عوام الناس میں علم کو اس طرح سے آسان کر کے پھیلایا جائے کہ وہ قرآن اور جناب رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کو سمجھ سکیں۔

v) عوام الناس میں شعوری علم پھیلایا جائے۔ خاص طور پر وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندۂ اول جناب آدمؑ کو سکھایا تھا۔

vi) عوام الناس کو ایسی آزادی حاصل ہونی چاہیے جس میں اخلاقی قوانین برقرار رہ سکیں۔

vii) انسانی حقوق کا ہر سطح پر تحفظ کیا جائے، قانونی اور سماجی طور پر۔

viii) ہر شخص کو امن، انصاف، حفاظت اور روزگار مہیا کی جائے بغیر کسی قیمت کے۔

ix) وکلا کے نظام کو اخلاقی اور قانونی رنگ دیا جائے۔ عوام الناس کو عدالت میں جانے کا حق بغیر کسی قیمت کے ہونا چاہیے۔ اور انصاف کے دروازے مملکت کے ہر شہری کے لیے بغیر کسی قیمت کے کھلے رہنے چاہییں۔

x) تمام قوتیں اور خود ساختہ القابات استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ صرف وہی القابات نام کے ساتھ استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے جو کسی شخص نے اپنی محنت

سے کمائے ہوں۔ مثلاً عہدے کی صورت میں اور تعلیمی بنیاد پر حاصل کیے گئے القابات استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

(ب) دینی اور اخلاقی اصلاح:

i) سماجی تہذیبوں کو مذہب کے نام پر یا مذہبی فرقوں یا مذہبی رسم و رواج کے نام پر استحصال نہیں کرنے دینا چاہیے۔

ii) ہمیں قرآن کو اس طرح سے سمجھنا اور سکھانا چاہیے کہ گویا اس کے الفاظ اور احکامات آج اور اسی وقت ہمارے پاس پہنچے ہیں۔ اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر آج کے حالات میں قرآن نازل ہوتا تو اس وقت جناب رسول اللہ ﷺ قرآنی قوانین کا کس طرح سے نفاذ فرماتے۔

iii) ہمیں ان تمام قوانین کے سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کا جائزہ لے کر انہیں درست سمت کی طرف موڑنا ہوگا۔

iv) ہمیں سماجی طور پر سچائی، دیانت اور امانت کا مطلب سمجھنا اور سکھانا اور نافذ کرنا ہوگا۔

v) ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ ہم حیوانی سطح عبور کر کے کس قدر انسانی مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔

vi) ہمیں خود احتسابی کے عمل پر غور و فکر کو رائج کرنا ہوگا اور خود احتسابی حکمران طبقے سے شروع ہو کر نچلی سطح پر آنی چاہیے۔

vii) ہمیں دیانتدارانہ معاشی نظام قائم کرنا ہوگا۔ ہمیں معاشرے میں انصاف، امن، غیرت اور آزادی کا دور دورہ لانا ہوگا۔

شکر

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ نبی الکریم

تمام تعریفیں اور ہر طرح کا شکر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک و بابرکت کے لیے سزاوار ہے جو تمام مخلوقات کا مالک ہے علم و دانش کا منبع ہے، اپنی مخلوق سے بہت ہی زیادہ محبت کرنے والا اور بہت مہربان ہے۔ اللہ کا فضل و کرم اور رحمتیں اور سلامتی ہو اللہ کے رسول جناب محمدؐ پر اور آپؐ کی قوم پر۔

یہ تمام محض رب کریم کی مہربانی ہی ہے کہ اس کی ذات پاک نے اس غلام کو یہ استطاعت بخشی اور اس بندے کی عزت افزائی فرمائی کہ وہ اس قابل ہوا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے پیغامات کو اور جناب رسولؐ اللہ کی حیات مبارکہ کو قلمبند کر کے اللہ کے بندوں کے سامنے پیش کر سکے۔

میری دعا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اللہ کے بندے ان حق و دانش کے الفاظ سے استفادہ حاصل کر سکیں، جو بہت ہی آسان اور عام فہم تحریر کیے گئے ہیں اللہ تعالیٰ اس عاجز بندے کے اس کام کو قبول فرما کر مقبول عام فرما دے۔ (آمین)

مصنف و مترجم